برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکیں

اور

ان کے اثرات کا تنقیدی جائزہ

ngs\Rehana\Desktop\Graphic
not found.

مقالہ نگار

ریحانہ قریشی

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر مہر محمد سعید اختر

ڈاکٹر آف فلاسفی (ایجوکیشن) کی ڈگری کے تقاضوں کی تکمیل کیلئے پیش کیا گیا مقالہ

ادارہ تعلیم وتحقیق ، جامعہ پنجاب ، لاہور

2009ء

تصدیقی سرٹیفکیٹ

میں مسمی پروفیسر ڈاکٹر مہر محمد سعید اختر (چیئر مین، شعبہ اسلامک ایجوکیشن، ادارہ تعلیم وتحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور) تصدیق کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان "برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکیں اور ان کے اثرات کا تنقیدی جائزہ" مقالہ نگار ریحانہ قریشی نے میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ اور یہ مقالہ کسی اور جامعہ میں حصول سند یا کسی اور مقصد کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

تصدیق ودستخط نگران مقالہ

حلف نامہ (Declaration)

میں ریحانہ قریشی حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ!

☆ مقالہ بعنوان "برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکیں اور ان کے اثرات کا تنقیدی جائزہ" میں نے ازخود تحریر کیا ہے۔

☆ مقالہ امکانی حد تک ماخذ و منابع پر مشتمل ہے۔

☆ مقالہ ہذا نگران کی زیر نگرانی کیا گیا ہے۔

☆ مقالہ ہذا کسی اور جامعہ یا ادارے میں کسی سند یا کسی اور مقصد کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔

مقالہ نگار

ریحانہ قریشی

اظہار تشکر

حمد لامحدود ہے رب العلیٰ کے واسطے کیونکہ وہ قادر ہے اور قدیر بھی، وہ حاکم ہے اور حکیم بھی، وہ حافظ ہے اور حفیظ بھی، وہ اعظم ہے اور عظیم بھی نیز وہ عالم ہے اور علیم بھی۔ اس نے انسان کو نہ صرف جمے ہوئے خون سے پیدا کیا بلکہ اس خون کے لوتھڑے میں جان ڈال کر اسے قلم سے علم بھی سکھلایا۔ اسی قوت علم نے جب میرے قلم کو جنبش تحریر عطا کی تو خیالات وواقعات نے الفاظ کے لبادے میں اس مقالہ کا روپ دھارا۔

لاکھوں درود اور کروڑوں سلام　　　　بہ روح محمد علیہ السلام

کہ جن پر علم کی تکمیل ہوئی۔ وہ معلم اعظم ہیں۔ جنہوں نے خود فرمایا بُعِثتُ مُعلّماً۔ وہ معلمین کی تسبیح کے امام اور تمام معلمین اس تسبیح کے دانے ہیں۔ وہ خود امی لیکن ان کا علم کامل، طریقہ تدریس لاثانی، حکمت تدریس بے مثال اور نظام تعلیم لافانی۔ آپ ﷺ کی ہدایت فرمودہ تدریس کی روشنی میں مقالہ ہذا ایک کوشش ناتمام ہے خداوند کریم قبول فرمائے (آمین)

معلم اعظم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے یسّروا ولا تعسّروا، بشروا ولا تنفروا۔ (البخاری: ج 68) یعنی آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو، بشارت دینے والے ہو نفرت دینے والے نہ ہو۔ بفضل خدا یہ تمام خصائص جس ہستی میں بدرجہ اتم موجود ہیں وہ ہیں میرے نگران مقالہ پروفیسر ڈاکٹر مہر محمد سعید اختر، چیئرمین شعبہ اسلامک ایجوکیشن، ادارہ تعلیم وتحقیق، جامعہ پنجاب لاہور۔ میں نے مشکل میں انہیں آسانی پیدا کرنے والا، حصول علم کے وقت علم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اور مایوسی کے عالم میں ایک مینارہ نور پایا۔ بلاشبہ وہ ایک نرم خو، کم گو مگر بااختیار اور مشفق ولائق استاد ہیں۔ خدا تعالیٰ اس مینارہ نور کو اسی طرح تابندہ وپائندہ رکھے۔ (آمین)

خداوند کریم اور نبی مصطفی ﷺ کے بعد اس دنیا میں ایک انسان کے لئے جو ہستیاں نہ صرف واجب الاحترام ہوتی ہیں بلکہ بے لوث خدمت وتعاون کا جذبہ بھی رکھتی ہیں وہ والدین اور بہن بھائی ہیں۔ مجھے بجا طور پر فخر ہے کہ اس مقالہ کی تکمیل میں مرحوم والدین کی دعائیں میرے شامل حال رہیں۔ بہنوں بہنوئیوں، بھائی بھابھی، بھانجے بھانجیوں کے تعاون ودعاؤں کا شکریہ خصوصاً شکریہ ننھی منھی بھتیجی پاکیزہ کا جس نے نہ صرف اپنی آپی (مقالہ نگار) کو مقالہ لکھنے کا موقعہ فراہم کیا بلکہ معصوم دعاؤں سے نوازتی بھی رہی۔

ہدیہ تہنیت اپنے ان تمام کرم فرماؤں کے لئے جن کی صرف تعداد ہی لاتعداد نہیں بلکہ راہ تحقیق میں جن کی دعائیں بھی میرے لئے ان گنت وبے شمار ہیں۔ ان سب کا فرداً فرداً شکریہ تو دعاؤں میں کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی انشاء اللہ مگر یہاں ان سب کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کرتی ہوں کہ: اے اللہ جنہوں نے مجھ پر احسان کیا تو ان پر احسان فرما۔ (آمین)

وما علینا الا البلاغ

ریحانہ قریشی

خلاصہ

Dissertation Abstract

زیرِ نظر تحقیق بعنوان "برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکیں اور ان کے اثرات کا تنقیدی جائزہ" کا مقصود برطانوی عہد میں مسلمانوں کی مختلف تعلیمی تحریکوں کے پس منظر، مقاصد، نصاب، حکمت تدریس، ہیت تعلیم، وسائل و مسائل اور نظام امتحانات و جائزہ کی نشاندہی کر کے ان کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لینا، تمام تحریکوں کو اسلامی نظام تعلیم کے متعین کردہ معیارات پر پرکھ کر پاکستان میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم تعلیم کی تشکیل کے لئے سفارشات مرتب کرنا نیز تحریک پاکستان و پاکستان کے نظام تعلیم پر ان تحریکوں کے اثرات کی نشاندہی کرنا تھا۔

یہ تحقیق چونکہ ایک تاریخی دستاویزی تحقیق ہے لہٰذا اس کے لئے متعلقہ کتب، اخبارات، رسائل و جرائد کے لئے اندرون ملک یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کے علاوہ مختلف افراد کی ذاتی لائبریریوں، پبلک لائبریریوں اور دینی مدارس کی لائبریریوں سے بھر پور استفادہ کیا گیا۔ تحاریک کے متعلق دستاویزات، تصاویر اور نقشہ جات کے حصول کے لئے بذریعہ ڈاک، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ اندرون ملک و بیرون ملک رابطے کئے گئے۔ علاوہ ازیں اکابرین، علماء اور اہل علم سے سینہ بہ سینہ معلومات حاصل کر کے تبادلہ خیال بھی کیا گیا۔ ان اہم شخصیات میں اندرون ملک اہل علم و دانش کے علاوہ بیرون ملک جامعہ ملیہ اسلامیہ (ہندوستان) کے وائس چانسلر مشیر الحسن اور پروفیسر ڈاکٹر رخشندہ بھی شامل ہیں۔

تحقیقی مواد کو گیارہ ابواب میں مرتب کر کے مقالہ ہذا کی تکمیل کی گئی۔ ابواب کی مزید وضاحت کے لئے مختلف ضمیمہ جات بھی مرتب کئے گئے ہیں۔ یہ ضمیمہ جات مختلف ذرائع سے حاصل کردہ دستاویزات، تصاویر اور قیمتی معلومات پر مشتمل ہیں۔ مقالہ ہذا کے باب نمبر گیارہ میں حاصلات پر بحث کر کے نتائج اخذ کئے گئے پھر ان نتائج کی روشنی میں سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ آخر میں تمام مصادر و مراجع پر مشتمل کتاب نامہ درج کیا گیا ہے۔

فہرست

باب اوّل

تعارف

1.1 محرک تحقیق

تعلیمات اور مطالعہ پاکستان کی طالب علم اور کارکن معلّمہ ہونے کی حیثیت سے تحقیق کنندہ کو برطانوی ہند میں مسلمانوں کی سیاسی حالت اور اس میں تعلیم کے کردار سے گہری دلچسپی رہی۔ اس ضمن میں برطانوی ہند کی مختلف تعلیمی تحریکوں کے مطالعے کا بھی موقع ملتا رہا لیکن ان تحریکوں کے تفصیلی پس منظر اور پیش منظر کے متعلق ایک تجسس وقت، وسائل اور جرأت تحقیق کا خاص کیف و کم تسکینِ تحقیق کے عملی اقدام کو موخر کرتا رہا حتیٰ کہ تحقیق کنندہ نے اسے پی ایچ ڈی کا مقالہ بنانے کا عزم کرلیا۔

موضوع زیر تحقیق میں تعلیم کے نظری پہلو اور برصغیر کی سیاسی حالت دونوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ "علم" (ع ل م) ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا ادراک حاصل کرنا۔ اس سے باب تفعیل میں "تعلیم" آتا ہے۔ تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ اس طرح خبر دینے کے ہیں کہ طالب علم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔ انگریزی زبان کا لفظ Education لاطینی زبان کا لفظ Edex بہ معنی نکالنا اور Ducer-Duc بہ معنی رہنمائی سے ماخوذ ہے۔ لفظی طور پر اس کے معنی "معلومات کا جمع کر دینا ہے" اور "مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا" ہیں۔ (جوزف ٹی شپلے 1957ء، ص 114)

اصلاً یہ لفظ معلومات فراہم کرنے اور متعلم کی مخفی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ نظری اعتبار سے تعلیم ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک فرد اور ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس و شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نئی نسل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو اسے زندگی گزارنے کے طریقوں کا شعور دیتی ہے اور اس میں زندگی کے مقاصد و فرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی، ذہنی اور فکری ورثے کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرتی ہے اور ان میں زندگی کے ان مقاصد سے لگاؤ کے حصول کیلئے تڑپ پیدا کرتی ہے جنہیں اس نے اختیار کیا ہے۔ تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے۔ اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے تہذیب یافتہ مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہے جو اچھے انسانوں کی حیثیت سے کسی ریاست میں بطور ذمہ دار شہری اپنے فرائض انجام دینے کے اہل ہوں۔ (خورشید احمد (س ن)، ص 16-17)

کارٹر، وی۔ گڈ تعلیم کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تعلیم ان تمام اعمال کا مجموعہ ہے جن کے ذریعے کوئی شخص قابلیتیں، رویے اور کردار کی ایسی صورتوں کی تشکیل کرتا ہے جو اس معاشرے میں مثبت قدر کی حامل متصور ہوں جس میں کہ وہ رہتا ہے (کارٹر، وی۔ گڈ 1950ء ص 202)۔اس تعریف کے مطابق تعلیم معاشرے کی تابع قرار پاتی ہے۔ اس کے بالمقابل پروفیسر منور ابن صادق نے تعلیم کی مندرج تعریفات کا تنقیدی جائزہ لے کر تعلیم کا کردار متحرک، مجتہدانہ اور تکمیلی قرار دیا ہے ان کے نزدیک تعلیم کا صحیح منصب یہ ہے کہ ثقافتی ورثے کا تنقیدی جائزہ لے، اس میں سے ناپسندیدہ عنصر کو چھانٹ کر الگ کر دے اور پسندیدہ حصے کو خوب سنوار نکھار کر اگلی نسل کو منتقل کر دے۔ (مسرت شوکت، چیمہ 1995ء ص 68)

تعلیم کے مفہوم کے متعلق مختلف ماہرین تعلیم کی آراء نقل کرنے کے بعد محمد سلیم لکھتے ہیں کہ فلسفہ تعلیم کے یہ تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ قومی نظام تعلیم قابل انتقال شے نہیں ہے۔ یہ ایسا درخت نہیں ہے جسے کسی بھی دوسرے ملک میں لے جا کر اگایا جاسکتا ہے۔ ہر قوم کا نظام تعلیم اس کے تصور جہانی (World View) اور اس کے نظریہ حیات کی سرزمین پر پھوٹتا ہے۔ برگ و بار لاتا ہے اور پروان چڑھتا ہے (محمد سلیم، پروفیسر سید 1998ء ص 20) محمد مصلح الدین کے نزدیک تعلیم کی ایک جامع تعریف یوں ہو سکتی ہے کہ: انسان کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھار کر اسے علم اشیاء کے حصول کے قابل بنایا جائے (محمد مصلح الدین 1988ء ص 15)۔ یہ عام تعلیم کا مفہوم ہے جبکہ دینی تعلیم حقیقت اشیاء کے علم کی تحصیل کا نام ہے۔

شفیق الرحمٰن ہاشمی نے سادہ مشینی نظام (Mechanism) کی تمثیل کے ذریعے سے نظام تعلیم کی ماہیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

نظام تعلیم تین قسم کے عناصر کا مجموعہ ہوتا ہے اور وہ ہیں (1) مادی (2) انسانی (3) ذہنی۔ مادی عناصر میں عمارات، ساز و سامان اور آلات تدریس شامل ہیں۔ انسانی عناصر استاد، طالب علم، سربراہ ادارہ اور دوسرے ان افراد پر مشتمل ہوتے ہیں جو عمل تعلیم سے بلا واسطہ تعلق تو نہیں رکھتے لیکن کسی نہ کسی حیثیت میں اسے کم و بیش حد تک متاثر ضرور کرتے ہیں۔ ذہنی عناصر ان تمام روایات، خیالات، تصورات اور اقدار کا احاطہ کرتے ہیں جو معاشرے میں جاری و ساری ہوتے ہیں اور جو نظام تعلیم کے مختلف اجزاء کو مربوط کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ذہنی عناصر کی حیثیت بعینہ وہی ہوتی جو ایک زندہ جسم میں روح کو حاصل ہوتی ہے۔ مشینی نظام اور تعلیمی نظام میں دو بنیادی فرق ہیں۔ ایک تو یہ کہ مشینی نظام کے اجزاء مادی ہوتے ہیں اور ان میں وقوع پذیر ہونے والے روابط کا قائم کرنا اور انہیں جاری رکھنا بہت آسان ہوتا ہے جبکہ نظام تعلیم کے اجزاء میں روابط کا ادراک کرنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ مشینی نظام میں یکساں پرزوں کا اہتمام کرنا آسان ہوتا ہے اور جونہی پرزوں کا باہمی ربط کمزور ہو بعینہ ویسے ہی پرزے فراہم کر کے ربط بحال کر لیا جاتا ہے جبکہ نظام تعلیم کے پرزے یا تو انسانی ہوتے ہیں یا ذہنی اور ان میں مسلسل تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے اسلئے روابط کا قیام اور بحالی ہمیشہ مسائل پیدا کرتی رہتی

ہے۔(شفیق الرحمٰن ہاشمی (س ن) ص 15-16)

ماہیت تعلیم کے سلسلے میں تکنیکی انداز میں تعلیم کے عمل میں پانچ ذیلی اعمال یا عناصر کا ذکر ضروری ہے اور وہ ہیں: مقاصد تعلیم کا تعین، نصابیات، حکمت تدریس کی تنظیم، امتحانیات اور انتظامیات۔ مقاصد کی اساسی حیثیت واضح ہے۔ نصابیات کا تعلق مقاصد کے حصول کیلئے مطلوبہ لوازمے کے انتخاب و تنظیم سے ہے۔ حکمت تدریس کے ذریعے اس لوازمے کی طلبہ کو ترسیل کی جاتی ہے اور پھر امتحانیات کے ذریعے اس امر کا اطمینان کرلیا جاتا ہے کہ اس ترسیل سے کس حد مقاصد کی تحصیل ہوئی ہے۔ انتظامیات اس پورے عمل کیلئے مادی اور افرادی وسائل کی فراہمی اور موثر استعمال کا اہتمام کرتی ہے (علی احمد چوہدری 2001ء ص 127)۔ نظام امتحانات اور معیار تعلیم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ امتحان پیمانہ ہے معیار تعلیم کا۔ اگر تعلیم و تدریس با قاعدہ اور معیاری ہوگی، طلبہ کی مشاورت اور رہنمائی کا معقول انتظام ہوگا، داخلے، ترقی اور جزا و سزا کے معاملے میں حق و انصاف برتا جائے گا تو پھر یہ نہیں ہوگا کہ امتحانات مذاق بن کر رہ جائیں۔ امتحانی نظام کی چولیں کس دی جائیں۔ نقل، سفارش، دھاندلی وغیرہ کے راستے مسدود کردیئے جائیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ معیار تعلیم پر آنچ آئے۔(محمد اکرم طاہر 1991ء ص 163)

تعلیمی عمل کی ماہیت کے بارے میں بڑے متنوع تصورات پائے جاتے ہیں۔ ان میں تین تصوارت درج ذیل ہیں:

- تعلیم اگلی نسلوں کی طرف ثقافتی ورثے کی منتقلی کا عمل ہے۔
- تعلیم فرد کے معاشرتی تسویہ کا عمل ہے۔
- تعلیم فرد کی تکمیل ذات کا عمل ہے۔

ان میں سے پہلی دو تعریفیں لفظاً مختلف مگر معناً مشترک ہیں۔ ان دونوں میں معاشرے کی بالادستی کا تصور ہے جبکہ تیسری تعریف میں معاملہ بالکل برعکس ہوجاتا ہے اور فرد کی بالادستی کا تصور سامنے آتا ہے۔ منور ابن صادق نے ان دونوں انتہاپسندانہ تصورات پر تنقید کی ہے۔ انھوں نے تعلیم کو "ابدی صداقت" کے تابع نیز فرد اور معاشرے دونوں کی بالادستی سے آزاد قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ: تعلیم افراد کو خلافت ارضی کیلئے تیار کرنے کا عمل ہے۔(منور ابن صادق 1969ء ص 28)

الفاظ سے قطع نظر، معنوی لحاظ سے مسلمانوں کے سامنے ہمیشہ تعلیم کا یہی تصور رہا ہے۔ برصغیر جنوبی ایشیاء میں اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں نے جو نظام تعلیم قائم کیا، اس کی تہہ میں بالکل یہ تصور کارفرما رہا۔ لیکن جب اقتدار ان سے چھن گیا تو نئے حکمرانوں نے مسلمانوں کو محض سیاست و حکمرانی کے میدان سے بے دخل کرنے پر اکتفا نہیں بلکہ تعلیم کے میدان میں بھی اپنا تسلط قائم کر کے ان کے ذہنی و روحانی وجود کو بھی مضمحل کر ڈالا۔ یہ اضمحلال انگریزوں کی صد سالہ غلامی کے بعد اب اکسٹھ سال کی آزادی کے باوجود ہم پر طاری ہے۔ 1857ء کے بعد مسلمانوں کے نامور علمی و تعلیمی ادارے قائم ہوئے جن میں بریلی، اعظم گڑھ، دیوبند، علی گڑھ مشہور و معروف ہیں۔(قدیر الدین احمد 1979ء ص 597)

برطانوی دور میں برصغیر کی تعلیمی تحریکات میں تحریک دیوبند تحریک علی گڑھ اور تحریک ندوہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی قابل داد ہے جبکہ دارالاسلام کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ انجمن حمایت اسلام کی خدمات تاریخ میں ثبت ہیں، سندھ مدرستہ الاسلام اور اسلامیہ کالج پشاور کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں دیوبند قدیم طرز کا نمائندہ ہے، علی گڑھ جدید کا ، ندوہ دونوں کے امتزاج کا۔ جامعہ ملیہ ندوی تحریک کا تتمہ کہلاتا ہے اور انجمن حمایت اسلام ، سندھ مدرستہ الاسلام، اسلامیہ کالج پشاور، بالعموم علی گڑھ کا تکملہ سمجھا جاتا ہے۔ اس تناظر میں دارالاسلام پٹھان کوٹ کسی حد تک منفرد نظر آتا ہے۔ یہ وہ متفرق حقائق ہیں جو حالیہ منظم تحقیق کا محرک ثابت ہوئے۔

قدیم طرز کے ادارے اسلامی علوم وفنون کے تحفظ کا سبب بنے لیکن ایک بہت زیادہ قابل قدر بات یہ تھی کہ یہ مدارس برطانوی استعمار کے خلاف سیاسی تربیت گاہوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، قاسم العلوم (مدرسہ شاہی مسجد) مرادآباد، مظہر العلوم کراچی، مدرسہ امینیہ اور مدرسہ فتح پوری دہلی، مدرسہ تقویۃ الاسلام (دارالعلوم غزنویہ) امرتسر، دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا، حیدرآباد کے علاوہ صوبہ بنگال کے متعدد دینی مدارس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بیشتر مدارس کسی نہ کسی طرح دارالعلوم دیوبند سے وابستہ رہے۔ ان مدارس کے بانیوں، مُدرِّسوں اور ان کے طلبہ نے تحریک آزادی میں بیش از بیش حصہ لیا اور ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ ڈابھیل (سورت) بدایوں، کانپور، لاہور وغیرہ کے متعدد عربی مدارس نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قدیم طرز کے دینی مدارس اور جدید علوم وفنون کے مدارس کی اس کشمکش اور ردعمل سے بھی بعض مدارس پیدا ہوئے۔ جنھوں نے دینی و دنیاوی ہر دو طرح کے علوم وفنون کو اپنے نصاب میں سمیٹنے کی کوشش کی۔ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو اسی کشمکش اور ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، مدرسہ اسلامیہ کلکتہ اور اس قبیل کے متعدد چھوٹے چھوٹے مدارس قومی وسیاسی تحریکات کے نتیجے میں قائم ہوئے جن میں اکثر و بیشتر تحریکات کے سرد پڑتے ہی ختم ہو گئے۔ ندوہ اور جامعہ ملیہ نے طلبہ کی علمی وسیاسی تربیت میں حصہ لیا۔ ان اداروں نے نہایت بلند پایہ علمی شخصیات اور اعلیٰ درجے کے قومی خدمت گزار، سماجی وسیاسی کارکن پیدا کئے جامع عثمانیہ (دکن) اور اورینٹل کالج (لاہور) درس گاہوں کے علاوہ علمی مرکز اور تصنیف وتالیف کے ادارے بھی بن گئے۔ (ابوسلمان شاہجہان پوری 1973ء ص 19)

انگریزوں کے تسلط کے بعد مسلمان پس ماندگی اور جہالت کا شکار ہو گئے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے فہمیدہ افراد میں دو ردِعمل پیدا کئے۔ ایک تو یہ کہ انگریزی نظام تعلیم کو اپنا لیا جائے۔ البتہ قومی تشخص برقرار رکھنے کیلئے غیرسرکاری مسلم اداروں میں دینیات کو بطور ایک مضمون تدریس شامل نصاب کرلیا جائے۔ دوسرا یہ کہ مسلمانوں کیلئے ایک الگ نظام وضع کیا جائے جس کا انگریزی نظام تعلیم سے کوئی تعلق نہ ہو اور اسکے فارغ التحصیل لوگ سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا تصور نہ کریں۔ چنانچہ پہلے نقطہ نظر کے مطابق علی گڑھ کالج وجود میں آیا جو بعد میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر گیا اور دوسرے نقطہ نظر کے مطابق مدرسہ دیوبند قائم ہوا۔ بعد میں انہی دونمونوں کے مطابق اور بہت سے تعلیمی ادارے قائم

ہوئے۔علی گڑھ نمونے پر قائم ہونے والے مدارس انگریزی نظام تعلیم کا ہی جز و تھے۔فرق صرف یہ تھا کہ ان میں دینیات بطور ایک مضمون تدریس شامل تھا۔اگر چہ وہ امتحانی مضمون نہ تھا۔دیو بند نمونے پر قائم ہونے والے ادارے دینی مدارس کہلائے۔ان کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ انگریزوں کے تسلط سے فی الحال چھٹکارا پانا ممکن نہیں اسلئے انگریزی تہذیب کی دستبرد سے جو کچھ ہو بچایا جائے اور انگریزی حکومت سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔اس مقصد سے وہی نصاب جو مسلم معاشرے کی اٹھارہویں صدی کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا بعینہ اختیار کرلیا گیا۔

یہ ایک دفاعی نقطہ نظر تھا۔اس نقطہ نظر کے تحت تعلیم کا جو نظام قائم کیا گیا اس میں یہ گنجائش ہی موجود نہ تھی کہ نصاب تعلیم معاشرتی تبدیلیوں سے کوئی مطابقت پیدا کرسکے۔اس تصور سے جو روایت قائم ہوئی وہ یہ تھی کہ نصاب تعلیم معاشرتی تبدیلیوں سے بے نیاز رہتا ہے اور اسلام کا تعلق ایک محدود دائرہ حیات سے ہے۔دوسری طرف انگریزی نظام تعلیم اور علی گڑھ تصور کے تحت قائم شدہ ادارے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت سے یکسر بے نیاز اور لاتعلق تھے۔یہ دو تعلیم یافتہ گروہ کُل مسلمان آبادی کا قلیل سا جز و تھے۔ان میں آپس میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔غیر تعلیم یافتہ آبادی پر ان کے اثرات بھی مختلف نوعیت کے تھے۔دینی تعلیم یافتہ گروہ کی کوشش سے لوگ ناظرہ قرآن پڑھ سکتے تھے۔مذہب کی محدود سی واقفیت رکھتے تھے۔اسلام کے ساتھ شدید جذباتی لگاؤ بھی رکھتے تھے۔انگریزی تعلیم یافتہ گروہ اقتدار کے سرچشموں پر قابض تھا اور معاشرے کی ثقافتی نشو ونما مغربی تہذیب کے انداز واطوار سے ہو رہی تھی۔غیر تعلیم یافتہ لوگ محدود مذہب کے دائرے سے باہر ان تہذیبی اقدار سے متاثر ہو رہے تھے۔چنانچہ برصغیر کے مسلم معاشرے میں شدید ثقافتی تصادم واقع ہوگیا۔(عبدالرشید ارشد،ڈاکٹر 1995ء،ص 30)

برصغیر میں مسلمانوں کی اس المناک حالت کے پس منظر میں ان کی ایک ہزار سالہ تاریخ کے درخشاں پہلو بھی نظر آتے ہیں لیکن 1857ء کا سال برصغیر کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سال آخری مغل شہنشاہ کو تخت دہلی سے معزول کردیا گیا اور برصغیر پر سات سمندر پار سے آئے ہوئے فرنگی مکمل طور پر حکمران ہوگئے۔(صفدر محمود،ڈاکٹر 1986ء،ص 12)

انگریزوں کو برصغیر میں اقتدار حاصل ہوگیا تو انہوں نے بڑے منظم طریقے سے مسلمانوں کی تعلیمی،معاشی اور سماجی زندگی کو مفلوج کردیا۔برطانوی حکومت کی واضح پالیسی یہ تھی کہ مسلمانوں کو منظم طریقے سے کمزور اور تباہ کردیا جائے۔وہ مسلمان جنہیں معاشرے میں گذشتہ چھ،سات صدیوں سے ایک باعزت مقام حاصل تھا،ان میں اب اتنی سکت نہ رہی تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف کوئی اقدام کرسکتے۔مسلمانوں کی اس خستہ حالی سے متاثر ہو کر ایک انگریز آفیسر ہنٹر،ڈبلیو۔ڈبلیو نے "دی انڈین مسلمانز" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔وہ کہتا ہے کہ:

ہر شخص کو یقین ہوگیا ہے کہ ہم نے ملک کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے نہیں کئے اور ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جسکی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے۔اپنے آپ کو برطانوی حکومت کے تحت تباہ وبرباد ہوتے دیکھ رہا ہے۔اسکو

شکایت ہے کہ جولوگ کل تک اس ملک کے فاتح اور حکمران تھے ۔آج روکھے سوکھے ٹکڑوں کو بھی ترس رہے ہیں ۔اسکے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے انکے اپنے انحطاط کا،عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ہوگا، کیونکہ ان کا انحطاط بھی تو ہماری سیاسی غفلت اور لاپرواہی سے مرتب ہوا۔جب تک اس ملک کی عنان حکومت ہمارے ہاتھ نہیں آئی تھی تب بھی مسلمانوں کا یہی مذہب تھا۔وہ ایسا ہی کھانا کھاتے اور ویسا ہی طرز طور رکھتے رہتے تھے جیسا کہ اس زمانے میں ہیں ۔وہ اب بھی وقتاً فوقتاً اپنے احساسِ قومیت اور جنگی اولوالعزمیوں کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں ۔بایں ہمہ یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت تباہ وبرباد کردیا گیا ہے۔(ہنٹر،ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء ،ص 128)

اگر تمام دنیا کی اقوام کے عروج وزوال کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جس قوم نے علم میں جتنی ترقی کی ہے۔اسی قدر دنیا میں اسکا جھنڈا بلند ہوا ہے ۔اسے خوشحالی واستحکام نصیب ہوا اور اس نے دوسروں کی رہنمائی کی ۔قومی ترقی کا انحصار پوری قوم کی علمی ترقی پر منحصر ہے اور اس بات کی قرآن نے دعوت دی ہے۔انسان تسخیر کائنات کی طاقت رکھتا ہے تو صرف علم کے ذریعے سے ۔جس قسم کا جتنا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے،اسی مرتبے کا وہ انسان ہوتا ہے ۔انسان کی عظمت علم کے مدارج سے مرتب ہوتی ہیں ۔لیکن علم جب تک ظاہر نہ ہو کسی کام کا نہیں ہوتا۔علم کا اظہار عقل کے استعمال سے ہوتا ہے ۔اسی کا نام عمل ہے۔کہا جاتا ہے کہ خدا نے جب خود کو دیکھنا چاہا تو کائنات پیدا کی۔ کائنات اس کے اظہار کا نام ہے ۔گویا کائنات علم کا عمل اور اسکا اظہار ہے ۔انسان اس کائنات کی تسخیر کرتا ہے ۔اللہ کے کمالات،احسانات،عنایات اور کرشموں کو اپنی تہذیب وثقافت سے اجاگر کرتا ہے۔بقول اقبال:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم
(محمد اقبال ،علامہ 1989ء ،ص 114)

علامہ اقبال نے ان الفاظ میں ''علم کی حکمرانی '' پر زور دیا ہے:اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا' موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لئے کہ ان سب کے اندر یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان اپنے وسائل سے کام لے،اس کے قوائے عمل بیدار رہیں اور وہ اپنے اعمال وافعال کا جواب دہ ٹھہرے ۔(محمد اقبال ،علامہ 1986ء ،ص 193)

من حیث القوم برطانوی ہند کے مسلمان تعلیم کے میدان میں اپنا تشخص کیونکر پیدا اور برقرار رکھ سکتے ہیں؟تعلیم

کے ذریعے سے اسلام دشمن قوتوں یعنی ہندوؤں اور فرنگیوں سے کہاں تک نبرد آزما ہوا جاسکتا ہے۔ مسلمان طلبہ کیوں کر انگریزی چیلنج کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جدید اور سائنسی تعلیم پا کر نوجوان نسل کیوں کر اپنی جداگانہ حیثیت کو منوا سکتی ہے اور غلامی کے بندھن توڑ سکتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے مختلف تنظیمیں، معلّمین، ماہرین تعلیم اور سیاسی شخصیتیں سامنے آئیں۔ انہوں نے انفرادی اور اجتماعی طور سے ان عظیم مقاصد کے حصول کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں میں علمی اعتبار سے حرکت پیدا ہوئی تو مطلوبہ مقاصد کے حصول کے سلسلے میں مختلف تحریکوں کا آغاز ہوا۔ ان میں سے درج ذیل تحریکیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں:

- تحریک دیوبند
- تحریک علی گڑھ
- تحریک ندوۃ العلماء
- تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ
- پنجاب، سندھ اور سرحد کی تعلیمی تحریکیں
- تحریک دارالاسلام

1.2 بیان مسئلہ

مفصلہ بالا صورت کے پیش نظر تحقیق کنندہ نے "برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکیں اور ان کے اثرات کا تنقیدی جائزہ" کو موضوع تحقیق بنایا۔

1.3 مقاصد تحقیق

- اسلامی نظام تعلیم کے معیارات کا تعین کرنا۔
- برصغیر میں مسلمانوں کے تعلیمی انحطاط کے اسباب کی نشاندہی کرنا۔
- برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیمی کاوشوں اور نظام کے خدوخال کا خاکہ معلوم کرنا۔
- مختلف تعلیمی تحریکوں کے پس منظر، مقاصد اور تنظیم و طریقہ کار کی نشاندہی کرنا۔
- برطانوی ہند میں مسلمانوں کی تعلیمی تحاریک میں اسلامی نظام تعلیم کی نشاندہی کرنا۔
- مختلف تحریکوں کا موازنہ کر کے مشترکہ امور کی نشاندہی کرنا۔

– تمام تحاریک کو اسلامی نظام تعلیم کے متعین کردہ معیارات پر پرکھنا۔
– تحریک پاکستان اور پاکستان کے نظام تعلیم پر تعلیمی تحاریک کے اثرات کی نشاندہی کرنا۔
– پاکستان میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم تعلیم کی اسلامی تشکیل کیلئے سفارشات مرتب کرنا۔

1.4 اہمیت موضوع

علم وہ جوہر ہے جس کی تلاش اور جستجو میں لوگ مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کرتے ہیں۔ یہ وہ بیش بہا خزانہ ہے جس کے جمع کرنے کیلئے لوگ عزیز و اقارب، دوست احباب کو چھوڑ کر منبع علم کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ یہ وہ سرچشمہ ہے جس سے پیاس بجھانے کیلئے تشنگان علم کو محنت و مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اسی تحصیل علم کیلئے مسلمانوں نے چین سے آئیس لینڈ تک کی سیر کی اور مشرق و مغرب میں وہ دارالعلوم قائم کئے جن کی روشنی سے یورپ کی تاریک فضائیں منور ہوئیں۔ قرطبہ، غرناطہ، الازہر اور بغداد وغیرہ وہ تعلیمی سرچشمے تھے جن سے صد ہا نہریں بہ نکلیں اور ہزاروں انسانوں نے علم کی پیاس بجھائی۔ کندی، فارابی، ابن بیطار، امام رازی، بوعلی سینا، ابن رشد وغیرہ جیسی ہستیاں پیدا کیں۔ اسی جذبہ کے تحت یورپ کی بڑی بڑی ہستیوں نے نامعلوم ممالک کے دریافت کی سعی کی اور بحر ذخار میں مصائب و آلام برداشت کر کے گنجینہ علم کو مالا مال کیا۔ اگر ایک طرف نیوٹن، ڈارون، آئن سٹائن نے اپنے نظریہ کشش، نظریہ ارتقاء اور نظریہ اضافیت سے انسانی علوم میں اضافہ کیا تو دوسری طرف کولمبس، ڈریگ، واسکوڈی گاما، کیپٹن کک، اسکاٹ وغیرہ نے اپنے اپنے بحری و بری سفر سے نئے ممالک اور نئے راستوں کا انکشاف کیا۔ اس طرح مشرق و مغرب کے بہترین دماغوں نے اپنی بساط کے مطابق چمنستانِ علم میں رنگ برنگ کے پھول سجائے اور انواع و اقسام کی خوشبوؤں سے تمدنِ انسانی کو معطر کرنے کی کوشش کی ہے۔ الغرض ہر عہد اور ہر زمانہ میں قوموں اور ملکوں نے ارتقائے تمدن انسانی کو اوج کمال تک پہنچانے کی کوشش کی۔

صرف چند کتابوں کا پڑھ لینا اور کسی کالج یا یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر لینا ہی تعلیم نہیں۔ بلکہ تعلیم وہ ہے جو ایک انسان کو اس قابل بنائے کہ وہ فطرت اور انسانیت کا مطالعہ کر سکے اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے آپ کو کامیاب بنا سکے۔ اس کے اندر جمود کے بجائے حرکت، سکون کے بجائے جنبش، مایوسی کے بجائے امید، تاریکی کے بجائے روشنی اور غلامی کے بجائے آزادی کے جذبات موجزن ہوں اور وہ دنیائے مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے میں عزم و ثبات، استحکام و استقلال اور حکمت و دانائی سے کام کرے۔ اس میں معاشرہ کے لائق فرد بننے کی کامل صلاحیت موجود ہو۔ وہ اس طرح اپنی زندگی کو درست کرے کہ ماحول اور معاشرہ کی برائیوں کو مفید اصلاحات میں تبدیل کر دے تاکہ ملک و قوم کی ترقی کافی سرعت کے ساتھ جاری رہ سکے۔

تعلیم کا اولین مقصد معرفتِ الٰہی کا حصول ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کی اس طرح نشوونما

کی جائے کہ وہ معاشرے کیلئے مفید اور کارآمد ہو۔ تعلیم بذاتِ خود ایک ایسا عمل ہے جو اجتماعی تحریکات کو جنم دیتا ہے۔ یہ تحریکات معاشرہ، ریاست اور خود تعلیم کو متاثر کرتی ہیں۔ اس طرح ایک باہمی عمل اور اس کے نتیجے میں تعلیم و تعلیمی اداروں میں تبدیلی و تغیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ ریاست چلانے کیلئے جن مردان کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ان تعلیمی اداروں ہی سے تربیت پا کر نکلتے ہیں۔ اس امر کا امکان تقریباً نہیں کہ جو شخص اس تعلیمی عمل سے نہ گزرا ہو وہ قیادت کے مناصب حاصل کرے۔ یہی افراد طے کرتے ہیں کہ ملک کو اجتماعی زندگی کے کسی دائرہ میں کیا پالیسیاں اختیار کرنا ہیں قومی اور بین الاقوامی تقاضوں کے تحت ضروریات و ترجیحات کا تعین ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے افراد کار کی تیاری کے لئے تعلیمی منصوبے بنائے جاتے ہیں اور ادارے کھولے جاتے ہیں۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ: تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کیلئے ہے تو فصل کاشت کرو، دس سال کیلئے ہے تو درخت اگاؤ، دائمی ہے تو افراد پیدا کرو۔ (خورشید احمد، پروفیسر 1991ء ص 9)

زیر بحث موضوع اسی لئے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں برطانوی ہند میں اسلامی تعلیمی احیاء کی تحاریک کے جامع خاکے کو ایک مربوط و منظم صورت میں یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ ان تحاریک کی نشاندہی کی جاسکے اور پھر ان کی روشنی میں مستقبل کیلئے بہتر و مفید خطوط استوار کیے جائیں۔ اس تحقیقی مقالہ میں تحقیق کنندہ نے یہی سعی کی ہے کہ برطانوی عہد میں تعلیمی احیاء کی تحاریک کا نہ صرف جامع خاکہ پیش کیا جائے بلکہ متعلقہ ملی تاریخ کے ریکارڈ میں سارے واقعات اور کام اپنی حقیقی تعمیر و حیثیت کے مطابق محفوظ ہو جائیں نیز یہ کہ ارباب حل وعقد کیلئے ایسا رہنما مواد فراہم ہو جائے جو تعلیم اسلامی کیلئے اساس کا کام دے سکے۔

1.5 تحقیقی سوالات

1.5:1 اسلامی تعلیمی نظام کے نمایاں خدوخال کیا ہیں؟

1.5:2 برصغیر میں مسلمانوں کے زیر حکومت تعلیمی نظام کیا تھا؟

1.5:3 برصغیر میں برطانوی حکومت کی تعلیمی پالیسی کے نمایاں خدوخال کیا تھے؟

1.5:4 برطانوی عہد کے برصغیر میں تعلیمی احیاء کی تحاریک کے محرکات کیا تھے؟

1.5:5 برصغیر میں تعلیمی احیاء کی تحاریک کا طریق کار کیا تھا؟

1.5:6 تعلیمی احیاء کی تحاریک کے مسائل کیا تھے؟

1.5:7 تعلیمی احیاء کی تحاریک کے وسائل کیا تھے؟

1.5:8 تعلیمی احیاء کی تحاریک کہاں تک کامیاب ہوئیں؟

1.5:9 تعلیمی احیاء کی تحاریک کی فروگزاشتیں کیا تھیں؟

1.5:10 تعلیمی احیاء کی تحاریک سے اسلامی تعلیمی نظام کی تشکیل کیلئے کیا رہنمائی حاصل ہوتی ہے؟

1.6 طریق تحقیق

زیر نظر تحقیق چونکہ ایک تاریخی موضوعاتی تحقیق ہے لہٰذا اس کیلئے مندرجہ ذیل طریق اختیار کیا گیا۔

1.6:1 متعلقہ کتب، اخبارات اور رسائل و جرائد سے استفادہ کیا گیا اور اس غرض کیلئے مندرجہ ذیل لائبریریوں سے تحقیقی مواد حاصل کیا گیا۔

- پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور
- ڈی۔ پی۔ آئی (پنجاب) لائبریری لاہور
- بیت الحکمۃ لاہور
- قائد اعظم لائبریری لاہور
- لائبریری ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور
- ادارہ اسلامیات، لاہور
- دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور
- ادارہ طلوع اسلام لاہور
- لائبریری جامعہ اشرفیہ لاہور
- لائبریری شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور
- لائبریری انجمن حمایت اسلام لاہور
- لائبریری جامعہ دارالعلوم اسلامیہ، لاہور
- لائبریری ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور
- لائبریری اسلامیہ کالج پشاور
- لائبریری بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان
- لائبریری زرعی یونیورسٹی فیصل آباد
- لائبریری شعبہ اسلامیات زرعی یونیورسٹی فیصل آباد
- لائبریری شعبہ علوم عمرانی ولسانیات زرعی یونیورسٹی
- لائبریری جی سی یونیورسٹی فیصل آباد
- لائبریری یونیورسٹی آف ایجوکیشن، فیصل آباد کیمپس
- لائبریری سندھ مدرستہ الاسلام کراچی
- لائبریری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی
- لائبریری انجمن تحریک اردو پاکستان، کراچی
- بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
- مختلف افراد کی ذاتی لائبریریاں

1.6:2 تحاریک سے متعلق مخطوطات، دستاویزات، تصاویر اور نقشہ جات کے حصول کے لئے بذریعہ ڈاک، ٹیلی فون اور انٹرنیٹ اندرون ملک و بیرون ملک رابطے کئے گئے۔

1.6:3 تبادلہ خیال اہم شخصیات بشمول ڈاکٹر مشیرالحسن وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور ڈاکٹر رخشندہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

باب دوم

پس منظر

برطانوی ہند کا اصل آغاز 1857ء میں اہل ہند کی جنگ آزادی میں انگریزوں کی فتح کے بعد سے ہوتا ہے۔اس کے پس منظر میں 1757ء کی جنگ پلاسی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد ایک سو سال میں انگریز مسلسل برصغیر میں اپنا اثر نفوذ اور رفتہ رفتہ تسلط حاصل کرتے رہے تھے۔اس سے بھی مزید پیچھے مسلمانوں کا ایک ہزار سال کا طویل دورِ عروج ہے۔زیر تحقیق موضوع کے صحیح تاریخی تفصیل اور جائزے کیلئے یہ پورا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ برصغیر میں اسلام کا آغاز محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے ہوا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہاں دور صحابہ ہی میں اسلام کی ابتداء ہوگئی تھی (محمود، مولانا مفتی 1976ء ص 458)۔خورشید احمد کی وضاحت کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی دعوت 'دور رسالت ﷺ' اور عہد خلافت راشدہؓ میں پہنچ چکی تھی۔پھر بنو اُمیہ کے عہد میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ اور اس کا ملحقہ علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی۔اسلامی تعلیم کا آغاز اسی زمانے میں ہوگیا تھا اور سندھ کے پرانے لٹریچر اور ثقافت کے مطالعے میں نہ صرف اس کے ثبوت ملتے ہیں بلکہ اسکے نقوش آج بھی نظر آتے ہیں۔برصغیر میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کا آغاز سلطان شہاب الدین غوری کے عہد سے ہوا جس نے اپنے معتمد علیہ غلام قطب الدین ایبک کو یہاں کا حکمران مقرر کیا۔قطب الدین ایبک سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان برصغیر پر حکمران رہے۔(خورشید احمد (س ن) ص 69)

2.1 مسلمانوں کے دورِ عروج کا سیاسی تناظر

مسلمانوں کی عملداری میں برصغیر کی سیاسی حالت کے تجزیے کیلئے یہ حوالہ ضروری ہے کہ برصغیر کی قدیم تاریخ میں اشوک (269ق م) نے ہندوستان کی سب سے عظیم سلطنت قائم کی تھی۔اس کے بعد پورا ہندوستان کبھی ایک سلطنت کی حیثیت حاصل نہ کرسکا اور ہرش (متوفی 649ء) کے بعد تو یہ خطہ طوائف الملوکی کا شکار ہوگیا اور مسلمانوں کی برصغیر میں آمد کے وقت یہاں مکمل سیاسی انتشار تھا (محمد اسمٰعیل ذبیح 1989ء ص 18'19)۔محمد اسلم نے برصغیر میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا جامع جائزہ لیتے ہوئے یہ انکشاف کیا ہے کہ مسلمانوں کے دورِ عروج میں جہاں بھی اور جب بھی ہندوؤں کا داؤ لگتا تھا وہ مسلمانوں پر ظلم و ستم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے تھے۔مثلاً سیّد حکمرانوں کی کمزوری کی وجہ سے

ہندوؤں نے سرکشی اختیار کی (محمد اسلم (س ن)' ص 25) جنوبی ہند کی ایک ہندو ریاست وجیانگر کے حکمرانوں نے بڑی قوت فراہم کر لی اور اپنی مملکت میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان وجیانگر سے ہجرت کر کے انڈونیشیا چلے گئے۔ وجیانگر کے ہندو حکمرانوں نے جنوبی ہند کی طرف مسلمانوں کی پیشقدمی اور اسلام کی اشاعت روک دی۔ یہ سلسلہ ڈیڑھ صدی تک ریاست وجیانگر کے خاتمے تک جاری رہا۔ (عفیف 1890ء' ص 274)

1450ء میں سید حکمران عالم شاہ کی تخت سے دستبرداری کے بعد بہلول لودھی تخت نشین ہوا۔ اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا تھا' اس لئے مرکز میں مضبوط حکومت قائم کرنے سے قاصر رہا۔ اس کے جانشین سلطان سکندر لودھی کو 29 سال عنان اقتدار سنبھالنے کا موقع ملا۔ اس کے عہد میں مسلمانوں کو دہلی اور اسکے گرد و نواح میں قدرے سنبھالا ملا۔ لیکن جو علاقے دارالحکومت سے دور تھے، وہاں ہندو کھل کے کھیلے۔ بہار کے علاقے میں تو انہوں نے مسلمانوں کو زبردستی شدھ کرنا شروع کر دیا۔ عثمانی نسل کے جن مسلمانوں نے ارتداد کرنے سے انکار کیا ہندوؤں نے انہیں بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ ان میں سے ایک فرد کسی نہ کسی طرح جان بچا کر سکندر لودھی کے دربار میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ہندوؤں کے مظالم کی رپورٹ پیش کی لیکن بُعد مسافت کی بنا پر سلطان ظالموں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کر سکا۔ (محمد قاسم' فرشتہ (س ن)' ص 643)

اسی زمانے میں موجودہ اتر پردیش کے مشہور شہر کالپی کے ضابطہ دار نصیر خان نے اسلام کو خیر باد کہتے ہوئے ہندو دھرم قبول کر لیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو مرتد کرنے کے لئے ان پر مظالم ڈھانے لگا۔ سکندر لودھی کی وفات کے بعد 1517ء میں اس کا بیٹا ابراہیم لودھی تخت پر بیٹھا۔ اس کا دربار امراء کی باہمی رقابتوں کی وجہ سے سازشوں کا مرکز بن کر رہ گیا۔ اس کے دور حکومت میں بھوپال سے قریب رائے سین کے ہندو حکمران پورن مل نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا۔ وہ بدبخت کئی مسلمان خواتین کو اٹھا کر لے گیا۔ ابراہیم لودھی کے دربار میں اس ظلم کے خلاف فریاد کی گئی لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ (ہاشم علی خان 1985ء' ص 125)

اسی دوران راجھستان میں میواڑ کے حکمران رانا سانگا کو اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کا موقع مل گیا۔ اس نے ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنے کا خواب دیکھا اور نوے ہزار شہسواروں کا ایک لشکر لے کر اس ملک سے مسلمانوں کے اخراج کے ارادے سے اپنی راجدھانی سے نکلا۔ اس نے سب سے پہلے راجھستان کے قدیم اسلامی اور روحانی مرکز ناگور پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور جو چند خوش نصیب مسلمان اپنی جان بچا کر گجرات اور کاٹھیاوار پہنچنے میں کامیاب ہوئے ان میں ابوالفضل اور فیضی کا والد شیخ مبارک بھی تھا۔ (ایشوری پرشاد 1932ء' ص 193)

رانا سانگا نے دوسرا حملہ ہندوستان کے سب سے بڑے روحانی مرکز اجمیر پر کیا اور مقدس شہر کو جلا کر کھنڈر بنا دیا۔ پروفیسر اسلم نے بابر کو برصغیر کے مسلمانوں کا بہت بڑا محسن قرار دیا ہے کیونکہ اس نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظالمانہ غلبے سے بچا لیا۔ رانا سانگا اپنی کامیابی کے سنہرے خواب دیکھ رہا تھا کہ 1526ء میں بابر نے پانی پت کے تاریخی میدان میں

ابراہیم لودھی کوشکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرلیا۔ رانا سانگا اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ بابر اپنے جدامجد امیر تیمور کی طرح لوٹ مار کر کے کابل چلا جائے گا اور اس کے جاتے ہی وہ دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر کے ہندو ریاست کی بنیاد رکھ دے گا۔ جب بابر نے مستقل طور پر یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا تو رانا سانگا کو اپنا منصوبہ خاک میں ملتا نظر آیا۔ وہ 1527ء (جنگ کنواہہ) میں بابر کو برصغیر سے نکالنے کے ارادہ سے اپنے لاؤلشکر سمیت فتح پور سیکری پہنچ گیا۔ وہاں سے بابر کا دارالحکومت آگرہ صرف بائیس میل دور تھا۔ ایسے وقت میں بابر جیسا شیر دل جرنیل بھی گھبرا گیا۔ (محمد قاسم فرشتہ (س ن)؛ ص 600-604)

رانا سانگا نے میدان جنگ میں کبھی پیٹھ نہ دکھائی تھی لیکن اس موقع پر وہ اپنی راجپوتی آن بان خاک میں ملا کر میدان سے فرار ہو گیا۔ بابر کے سپاہیوں نے اس کا تعاقب کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور یوں برصغیر کے مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بننے سے بچا لیا۔ بابر کو اس ملک پر چار سال سے زیادہ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ وہ 1530ء میں فوت ہو گیا۔ اس کا جانشین ہمایوں شیر شاہ سوری کے ہاتھوں مات کھا گیا۔ شیر شاہ سوری بڑا قابل حکمران اور اعلیٰ پایہ کا منتظم تھا لیکن اسے اس وقت حکومت ملی جب اس کی زندگی کا آفتاب غروب ہونے والا تھا۔ 1540ء تا 1545ء حکومت کرنے کے بعد شیر شاہ سوری کالنجر کا قلعہ فتح کرتے ہوئے بم کے دھماکے سے فوت ہو گیا۔ اس کا جانشین سلیم شاہ نو سال تک اس ملک کا فرمانروا رہا۔ لیکن وہ اپنے عظیم باپ کے مقابلے میں صفر تھا۔ (وی اے سمتھ 1917ء؛ ص 20)

اس کے انتقال کے بعد اس کے برادر نسبتی مبارز خان نے سلیم شاہ کے فرزند فیروز کو قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کرلیا اور عادل شاہ کا لقب اختیار کر کے داد عیش لینے لگا۔ عادل شاہ کی انتظامی امور میں عدم دلچسپی کی بنا پر ریواڑی کے ایک بنیئے ہیموں نے بڑا اقتدار حاصل کرلیا۔ اس نے مسلمانوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ جلد ہی ہمایوں نے سرہند کے مقام پر سکندر سُوری کو شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اسے چھ ماہ سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوئی۔ ہمایوں کی اچانک موت کے بعد ہیموں نے افغانوں کے ساتھ مل کر دوبارہ حصول اقتدار کی کوشش کی اور اس بار اس کا مقابلہ بیرم خان کے ساتھ پانی پت کے تاریخی میدان میں ہوا۔ بیرم خان نے ہیموں کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ (محمد اکرام شیخ 2003ء؛ ص 25)۔ سکندر لودھی کی وفات سے اکبر کی تخت نشینی تک 39 سال کے عرصے میں ہندوؤں میں کئی جارحانہ تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اکبر کا وزیر مال راجہ ٹوڈرمل بڑا پکا ہندو تھا (ایس آر شرما 1940ء؛ ص 27)۔ وہ جب تک ٹھاکروں کی پوجا نہ کر لیتا اس وقت تک ناشتہ نہ کرتا تھا۔ تاریخ بنارس میں الٹیکر لکھتا ہے کہ اس نے بنارس میں ایک عالیشان مندر تعمیر کرایا اور اس میں شولنگ نصب کرنے کی تقریب میں ہندو راجوں اور پنڈتوں کو دور دور سے مدعو کیا۔ (شاہ نواز خان 1888ء؛ ص 127)

اکبر کی مذہبی حکمت عملی سے برصغیر میں اسلامی اقتدار کو بڑا نقصان پہنچا (عبدالقادر بدایونی 1869ء؛ ص 108 و متفرق)۔ اس نے باغی مسلمان گورنروں کی سرکوبی کیلئے ہندو راجوں کو بھیج کر ان کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب ختم کر دیا۔

اکبر نے دینِ الٰہی جاری کر کے اسلامی شعائر کو نقصان پہنچایا (محسن فانی 1843ء ص 26)۔ہندو رانیوں نے شاہی محلات میں دیوالی، دسہرہ، جنم اشٹمی، رام نومی، رکھشا بندھن اور شوارتری جیسے ہندووانہ تہوار بڑی دھوم دھام سے منانے شروع کیے۔ اس زمانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف بڑا جارحانہ رویہ اختیار کیا۔(محمد اکرام شیخ (س ن) ص 121-126)

اکبر کی وفات کے بعد 1605ء میں جہانگیر تخت نشین ہوا۔اس کے زمانے میں ہندو کافی مضبوط ہو چکے تھے (ایشوری پرشاد 1930ء ص 562)۔دوسری جانب سکھوں نے امرتسر اور ترنتارن میں گوردوارے تعمیر کر لئے۔گرو ارجن کے جانشین گرو گوبند سنگھ (1595ء-1644ء) نے بادشاہوں جیسے طور طریقے اپنا لئے اور وہ سکھوں سے مالیہ اور دوسرے سرکاری واجبات وصول کرنے لگا۔جہانگیر کے جانشین شاہ جہاں کے زمانے میں کشمیر میں مسلمانوں کی حالت بڑی پتلی تھی۔ ایک بار شاہجہان کشمیر جاتے ہوئے بھمبر سے گزرا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں مسلمانوں کے گھروں میں ہندو عورتیں آباد ہیں اور ہندوؤں کے گھروں میں مسلمان عورتیں بستی ہیں۔ان کا یہ معاہدہ ہے کہ مسلمان کے گھر میں جو عورت مرے گی اسے مسلمانوں کے طریقے کے مطابق دفن کیا جائے گا اور جو مسلمان عورت کسی ہندو کے گھر میں مرے گی اسے ہندوؤں کے رواج کے مطابق جلایا جائے گا۔اس کے علاوہ پانچ ہزار کے قریب بے نکاحی مسلمان عورتیں ہندوؤں کے قبضے میں تھیں۔ شاہجہان نے ان ہندوؤں کو بلا کر کہا کہ وہ مسلمان ہو جائیں ورنہ ان عورتوں کو ان کے "قابض" خاوندوں سے آزاد کروالیا جائے گا۔چنانچہ اس موقع پر بہت سے ہندو مسلمان ہو گئے اور ان کے نکاح پڑھوا دیے گئے اور جنہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا ان کی "بی بیوں" کو ان کے قبضے سے آزاد کروالیا گیا۔(ہاشم علی خان 1985ء الف ص 99)

شاہجہان کے عہد میں اس کے ولی عہد شہزادہ دارا شکوہ کا جھکاؤ نظریہ وحدت الوجود کی طرف ہو گیا اور یہ نظریہ اسے وحدت ادیان تک لے گیا۔اس نے ہندوؤں کی متعدد مذہبی کتابوں کے فارسی میں متراجم کرائے اور یوں ہندوؤں کی دیومالا مسلمانوں میں متعارف کرائی (شاہ ولی اللہ 1897ء ص 28)۔دارا شکوہ کے مذہبی رجحانات نے مسلمانوں کو چوکنا کردیا (تاراچند 1943ء ص 397-413)۔وہ یہ سمجھنے لگے کہ اگر وہ شاہجہان کے بعد تخت پر بیٹھ گیا تو اکبر کے عہد کی یاد تازہ کردے گا ان حالات میں صحیح العقیدہ مسلمان اورنگ زیب کے طرفدار ہو گئے۔پروفیسر اسلم کی روایت کے مطابق مولانا شبلی نعمانی نے اُپنشدوں کے فارسی ترجمے "سرِ اکبر" پر دارا شکوہ کا لکھا ہوا دیباچہ پڑھ کر یہ کہا تھا کہ وہ ہندو ہو چکا تھا۔ (محمد اسلم پروفیسر (س۔ن) ص 33)

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں دکن میں مرہٹوں نے سرکشی اختیار کی اور انہوں نے شیواجی کی قیادت میں ہندو ریاست قائم کرلی (جادوناتھ سرکار 1952ء ص 390)۔اسی زمانے میں نارنول، بھرت پور اور الور کے علاقے میں ستنامی فرقے کے ہندوؤں نے بغاوت کردی (لین پول 1893ء ص 155-168)۔پنجاب میں سکھوں نے شورش بپا کردی۔جہانگیر کے عہد میں سکھوں کے پانچویں گرو ارجن دیو نے جہانگیر کے باغی بیٹے خسرو کی حمایت کر کے بادشاہ کو ناراض کرلیا۔جہانگیر نے خسرو کی بغاوت کرنے کے بعد گرو ارجن کو گرفتار کرلیا اور اُسکا کا انتقال اُسکا ایک مخالف ہندو کے

ہاتھوں جیل میں تکالیف اٹھا کر ہوا۔ اسکے جانشین گرو گوبند سنگھ نے پیری کے ساتھ "میری" کا جھنڈا گاڑ کر ریاست کے اندر ریاست قائم کرلی اور بادشاہوں جیسے طور طریقے اختیار کر لیے (خشونت سنگھ 1953ء ص 27-29)۔ یہیں سے سکھوں نے مغلوں کے خلاف صف آرائی شروع کردی (رشید احمد ندوی 1957ء ص 139)۔ نویں گرو تیغ بہادر کو کشمیری پنڈتوں نے اپنے مفادات کی خاطر حکومت کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ گرو تیغ بہادر گرفتار ہو کر بجرم بغاوت قتل ہوا۔ اس کے جانشین گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کو 13 اپریل 1699ء کو آنند پور میں خالصہ کا لقب دے کر فوجی تربیت دینا شروع کردی۔ مجبوراً اورنگ زیب کو ہتھیار اٹھانے پڑے۔ گرو گوبند نے کئی مقامات پر مغل فوج کا مقابلہ کیا، بالآخر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ (جہانگیر (راجرس) 1909ء ص 72-73)

اورنگ زیب کی وفات کے جلد بعد گرو گوبند کے ایک چیلے بندا (بیراگی) نے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر قیامت ڈھا دی۔ اس نے کیتھل سے لے کر بٹالہ تک مسلمانوں کی بستیاں جلا ڈالیں۔ وہ مسلمانوں کو زندہ جلانے میں روحانی سکون حاصل کرتا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں کو ہوا میں اچھالتا اور جب وہ نیچے کی طرف آتے تو انہیں تلوار کی دھار یا نیزے کی انی پر لیتا۔ وہ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ ساڈھورہ کے جن سادات نے ایک آڑے وقت میں گرو گوبند سنگھ کی جان بچائی تھی، بندہ نے انہیں بھی معاف نہ کیا۔ اس کے مظالم کے سامنے چنگیز و ہلاکو کی داستانیں ماند پڑ گئیں۔ (آرچر 1946ء ص 232)

مغل حکمرانوں نے اس کے مقابلے کو کئی قابل جرنیل بھیجے لیکن وہ اسے زیر کرنے میں ناکام رہے۔ بالآخر فرخ سیر کے عہد میں پنجاب کے شیر دل ناظم عبدالصمد خان نے اسے کئی معرکوں میں شکست دے کر گرفتار کیا۔ برصغیر میں مسلم اقتدار کی روداد بیان کرتے ہوئے حسن ریاض نے لکھتے ہیں کہ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد سندھ 39 سال خلافت امویہ کے زیر انتظام رہا اور ایک صدی خلافت عباسیہ کے۔ 240ھ میں خلیفہ متوکل نے عمران عبدالعزیز ہباری قرشی کو حاکم سندھ مقرر کیا۔ اس کا مورث 121ھ میں سندھ آیا تھا اور سندھ ہی میں اس نے سکونت اختیار کرلی تھی۔ عمر بن عبدالعزیز ہباری کے تقرر کے بعد سندھ کی حکومت ایک مقامی عرب خاندان میں آ گئی اور خلافت بنو عباس کا سندھ سے تعلق برائے نام رہ گیا۔ اس عرب خاندان کی حکومت 143 سال رہی۔ مجموعی طور پر سندھ میں عربوں نے 282 سال حکومت کی اور پھر سومرو خاندان کی حکومت قائم ہوگئی اور انہوں نے باطنی مذہب اختیار کرلیا۔ اس طرح سندھ اور ملتان بجائے خلافت عباسیہ بغداد فاطمین مصر کے زیر اثر آ گئے اور بجائے اسلام کے یہاں باطنیت والحاد کی جہالت پھیل گئی۔ خلافت عباسیہ اور ان کے زیر اثر سلاطین کیلئے یہ بڑی تشویش کا باعث تھا جبکہ سندھ اور ملتان کے صحیح العقیدہ مسلمان باطنیوں کے مظالم اور زبردستیوں سے پریشان تھے۔ (حسن ریاض 1967ء ص 4)

الپتگین نے جو دولت سامانیہ بخارا کا حاجب الحجاب رہا تھا، 880ء میں غزنی فتح کیا اور اس کا بادشاہ بن گیا۔ امیر بخارا نے الپتگین سے صلح کی اور جو علاقے اس نے فتح کر لئے تھے ان پر اس کی بادشاہت تسلیم کرلی۔ اس کے بعد اس نے

بست اور کابل کے بعض علاقے فتح کئے۔ ان حملوں میں یا دوسرے مواقع پر جے پال سے بھی اس کی لڑائیاں ہوئیں مگر ان کی تفصیل کہیں درج نہیں۔ الپتگین کا انتقال ہوگیا۔ پہلے اُسکا بیٹا ابو اسحاق تخت غزنی پر بیٹھا پھر بلکاتگین اور اس کے بعد پری تگیں۔ یہ دونوں الپتگین کے غلام تھے۔ ان تینوں بادشاہوں کا زمانہ حکومت مختصر رہا۔ آخر 20 اپریل 977ء کو امرائے دربار نے اتفاق رائے سے سبکتگین کو غزنی کا بادشاہ منتخب کیا۔ ایک یا دو سال کے اندر ہی سبکتگین نے بست اور قزدار فتح کر لئے۔ اب سبکتگین اور راجہ جے پال کی سرحدیں مل گئیں۔ جے پال کو سبکتگین کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر وحشت ہوئی اور دونوں کے درمیان جھڑپیں ہونے لگیں۔ (ابوظفر' سیّد ندوی 1947ء ص 288)

986ء میں جے پال بڑی طاقتور فوج کے ساتھ ریاست غزنی پر حملے کیلئے آگے بڑھا۔ سبکتگین نے غزنی اور لمغان کے درمیان غوزک پہاڑی پر اس کا مقابلہ کیا۔ ہندو بہادری سے لڑے مگر سخت برفباری شروع ہوگئی۔ اس وجہ سے جے پال کو صلح کی درخواست کرنی پڑی اور وہ اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر صلح منظور نہ کی تو اپنے تمام سازو سامان میں آگ لگادیں گے اور خود بھی جل کر مر جائیں گے۔ سبکتگین نے محمود کی مخالفت کے باوجود صلح کر لی۔ جے پال نے دس لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی تاوان جنگ دینا منظور کیا اور اپنے چند رشتہ داروں کو یرغمال کے طور پر چھوڑ گیا۔ مگر اپنے ملک میں پہنچ کر اس نے سبکتگین کے ان سرداروں کو گرفتار کرلیا جو تاوان جنگ وصول کرنے آئے تھے۔ (محمد اسماعیل' ذبیح 1989ء ص 23)

سبکتگین کو جب جے پال کی اس بدعہدی کا علم ہوا تو وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ لمغان پر حملہ آور ہوا اور بہت سے علاقے پر قابض ہوگیا۔ جے پال نے اس کو مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی قومی جنگ قرار دیا اور ہندو راجوں سے مدد کی درخواست کی۔ قنوج، کالنجر، دہلی اور اجمیر تک کے راجوں نے فوجیں بھیجیں اور مالی مدد کی۔ اس متحدہ فوج کا سالارِ اعلیٰ بن کر جس کی تعداد ایک لاکھ سوار اور پیادے بتائی گئی جے پال نے غزنی پر چڑھائی کر دی، سخت جنگ ہوئی۔ جے پال نے شکست کھائی۔ سبکتگین نے لمغان سے پشاور تک تمام ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس مقبوضہ علاقے میں پٹھان، افغان اور خلجی آباد تھے۔ انہوں نے سبکتگین کی اطاعت کی اور اکثر اسلام لائے۔ سبکتگین نے ان کیلئے مسجدیں تعمیر کروائیں اور نو مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ (محمد ناظم' ڈاکٹر 1931ء ص 29-30)

اگست 997ء میں سبکتگین کا انتقال ہوگیا۔ 998ء میں تخت نشینی کی جنگ کے بعد محمود سلطان بنا۔ خلیفہ بغداد نے 999ء میں "یمین الدولہ و امین الملت" کا خطاب دیا اور اس کو تمام مفتوحہ علاقوں کا خودمختار سلطان تسلیم کرلیا۔ اس اثناء میں جے پال نے اس علاقے پر دوبارہ قبضہ کرلیا جو سبکتگین نے اس سے چھینا تھا۔ اس لئے اب محمود کو اس طرف توجہ کرنی پڑی۔ متعدد معرکوں کے بعد 1022ء میں محمود نے پنجاب پر براہ راست اپنی حکومت قائم کر دی۔ قنوج، کالنجر اور گجرات تک کے وہ راجہ اس کے باجگوار تھے جن کو اس نے میدان جنگ میں زیر کیا تھا۔ محمود نے کسی شخص کو اس لئے قتل نہیں کیا کہ وہ ہندو تھا اور نہ اس نے کسی ہندو کو جبراً مسلمان کیا۔ مندر بھی اس نے صرف وہی منہدم کئے جن کو ہندوؤں نے سازش کے مرکز بنالیا تھا یا جن کی حیثیت جنگی قلعوں کی ہوگئی تھی۔ (محمد علی چراغ 1986ء ص 114)

غزنوی خاندان کی حکومت کل (189) سال رہی۔اس میں 16 بادشاہ ہوئے۔ بالآخر حکومت میں ضعف آیا وسطی ایشیاء کی غزنوی سلطنت ان ہمسایوں میں تقسیم ہوگئی جو سب مسلمان تھے۔38، 39 سال لاہور غزنوی سلاطین کا پایہ تخت رہا۔لاہور میں غزنوی حکومت پونے دو سو سال رہی۔مختلف خدمات پر یہاں مسلمان متعین رہے۔ہزاروں کی تعداد میں افواج رہیں۔بہت سے ترک، افغان، ایرانی اور عرب خاندانوں نے یہاں سکونت اختیار کی اور غزنوی حکومت ہی کے تحت ان کی کئی پشتیں گزریں۔ملتان اور سندھ میں پہلے ہی عرب خاندان آباد تھے اور بہت سے مقامی باشندے مسلمان ہو چکے تھے۔اسطرح اس علاقے میں قابل ذکر اسلامی زندگی پیدا ہو چکی تھی۔(ہاشم علی خان 1985ء ص 31)

غزنوی کے بعد غوری خاندان پھر خاندانِ غلاماں میں التمش، ناصرالدین، بلبن جیسے نامور اور نیک سلاطین تخت نشین ہوئے۔اس کے بعد خلجیوں، تغلقوں، سیّدوں اور لودھیوں کی حکومت رہی (محمد علی چراغ 1985ء ص 32)۔ بالآخر 1526ء میں بابر کی فتح کے بعد لودھیوں کی حکومت ختم ہوگئی۔بابر کے جانشین ہمایوں کو شکست دے کر چند سال کیلئے سوریوں کی بادشاہت قائم ہوئی اور ہمایوں کو ایران میں جلاوطن رہنا پڑا۔ہمایوں نے واپس آ کر مغل بادشاہت قائم کی جو 1857ء تک جاری رہی اس میں 1707ء تک کا عرصہ عظیم بادشاہوں کا ہے جبکہ 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد 1857ء تک زمانہ انحطاط کا ہے۔(عشرت رحمانی (س ن) ص 20-23)

جس زمانے میں (1608ء) میں انگریزوں نے برصغیر کا رخ کیا اس زمانے میں برصغیر علم و فن، تحقیق و اکتشاف اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا جبکہ انگلستان کی تصویر انتہائی بھیانک تھی۔مسلمان حکمران ہر طبقے کے ساتھ منصفانہ سلوک، عوام کی خوشنودی اور ملکی ترقی و خوشحالی کیلئے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔مزید براں وہ خود برصغیر کی قومیت میں اسطرح گھل مل گئے تھے کہ اجنبیت کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا۔انھوں نے برصغیر کے اصلی باشندوں کو امور حکومت میں اسطرح شریک کرلیا تھا جیسے ایک قوم کے افراد آپس میں ہوتے ہیں۔لہٰذا اس زمانے میں جبکہ مغربی یورپ میں غیر مہذب قبائل آباد تھے، ہندوستان اپنے حکمرانوں کی دولت اور اپنے کاریگروں کی اعلیٰ مہارت کیلئے مشہور تھا۔(شمس القمر قاسمی 1973ء ص 14-18)

ابوالاعلیٰ مودودی نے واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کے دور اقتدار کی اس تمدنی ترقی کے باوجود اس دور میں برصغیر کے معاشرے کو "مسلمان معاشرہ" تو کہا جا سکتا ہے، "اسلامی معاشرہ" نہیں کہا جا سکتا ہے۔جو لوگ برصغیر کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتداء ہی سے کمزور رہی۔اُس اور اس سے متصل بعد کے دور میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں۔اس لئے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دارالاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے عموماً بھاگ بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے۔چنانچہ سندھ، کاٹھیاوار اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد

1964ء،ص 43)

اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کی طرف رخ کیا تو وہ خود عجمی کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔امراء میں روح جہاد سرد ہو چکی تھی ۔ہمارے حکمران زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو خراج اور توسیع مملکت کی فکر تھی اور ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی، نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض سرانجام دیے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے، نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعت اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہئے تھی ویسی ہو سکی۔علماء اور صوفیاء کے ایک مختصر گروہ نے بلاشبہ نہایت زریں خدمات انجام دیں اور ان ہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ تو علم دین اور کچھ اتباع شریعت پایا جاتا ہے۔لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا جبکہ قوم کے عوام جاہل اور ان کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں ۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 1981ء،ص 41)

برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں نے کم وبیش ہزار سال تک نہایت رواداری، عدل وانصاف اور اپنی روایتی فراخدلی کے ساتھ حکومت کی ۔اگر ان میں یہ صفات نہ ہوتیں تو ان کیلئے ایک ہزار سال تک حکمرانی کرنا کبھی ممکن نہ ہوتا۔ لیکن پھر نفاق ،اخلاقی گراوٹ، داخلی سازشوں اور دارا شکوہی رویے کی بنیاد پر حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل گئی۔اگر چہ اس زیاں کا احساس ان میں بہر حال باقی رہا اور ملی احیاء کیلئے علمی اور عملی دونوں قسم کی کوششیں جاری رہیں لیکن ہوتے ہوتے وہ ایک ایسی منزل پر آ گئے جہاں ایک طرف ان کا مقابلہ ہندوؤں سے تھا جو تعداد میں ان سے چار گنا زیادہ تھے اور اپنی ہزار سالہ غلامی کے انتقامی جذبے سے چور تھے تو دوسری طرف ان کا سامنا ہندوستان کے نئے انگریز حاکموں سے تھا جو اقوام مغرب میں صرف عیاری کی ایک مثال ہی نہ تھے بلکہ اسلام اور مسلم اقوام کے ازلی دشمن بھی تھے۔(سمیع اللہ قریشی 1981ء،ص 33)

ابتدائی دور کے بعد اسلام برصغیر میں بادشاہوں کے ذریعے سے پہنچا۔ان ملوک میں اچھے بھی تھے اور برے بھی، نیک بھی تھے اور ظالم بھی لیکن بنیادی طور پر ان کی حیثیت بادشاہوں کی تھی داعی کی نہ تھی۔ یہ خدا کی حاکیت، انسان کی خلافت اور قرآن کی حکومت قائم کرنے کیلئے نہیں آئے تھے ان کے پیش نظر اپنی سلطنت کو وسیع کرنا اور اس علاقے کو اپنے زیر انصرام لانا تھا۔ان میں سے متعدد سلاطین کی ذاتی زندگیاں تو اسلام کے مطابق تھیں ۔خود اس وجہ سے اور دوسرے مسلمان معاشرہ کے دباؤ کی وجہ سے انہوں نے نظام حکمرانی میں بھی اکثر اچھے اخلاق کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے اسلام یہاں تک پہنچا لیکن یہاں کا نظام حکومت اسلامی اصول وقواعد پر قائم نہیں ہوا۔مسلمان حکمرانوں کے ساتھ جو فوجیں آئی تھیں ان کے ذریعے سے بھی اسلام پھیلا وہ لوگ یہاں آ کر بسے ۔انہوں نے اپنی بودوباش ترک نہ کی لہٰذا مقامی

غیر مسلموں نے انہیں دیکھا اوران سے اثر قبول کیا۔(ابوالحسن' سیّد ندوی (س ن)' ص 58-67)

اسطرح ان لوگوں نے بھی تبلیغ کا کام سرانجام دیا اور اسلامی دعوت عوامی سطح تک پہنچائی۔لیکن یہاں بھی اس کے اندروہی خامی تھی کہ ایمان کی حرارت اوردین کا بنیادی مزاج اپنی معیاری شکل میں موجود نہ تھا جو قرن اوّل میں داعیان حق کی زندگیوں اوران کے معاشرے میں نظر آتا تھا یا ان مقامات پر ملتا تھا جہاں اسلام کی دعوت ان کے ہاتھوں پہنچی۔ پھر صوفیاء اور علماء نے اس ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصّے میں دین اسلام پھیلایا۔حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ دائرہ اسلام میں آئے ان کی اکثریت انہی نفوسِ قدسیہ کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئی۔ان حضرات نے اپنی پاکیزہ زندگیوں' گھر گھر اپنی دعوتی وتبلیغی سرگرمیوں اوراپنی پیہم قربانیوں کے ذریعے اسلام کا پیغام پہنچایا۔لیکن ان کے پاس صرف زبان کی قوت تھی حکومت کی طاقت نہ تھی۔وہ اس نظام کو زندگی کے تمام شعبوں میں قائم کرکے دکھا نہیں سکتے تھے اورنہ مدینہ کی ریاست کا نمونہ پیش کرسکتے تھے۔(خورشید احمد 1963ء ص 46)

دوراول میں مسلم مجاہدین کی سرگرمیوں کا مقصد دنیا میں خدا کا کلمہ بلند کرنا تھا اوروہ طلب دنیا کی بجائے آخرت کے نشہ سے سرشار تھے۔انہوں نے جو ممالک فتح کیے،چونکہ ان کے پیچھے حصول غنائم یا ملک گیری کے جذبات نہیں تھے،اس لیے مفتوحہ علاقوں کے باشندے فاتحین کے اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہوکر اسلام کے رنگ میں رنگ گئے۔اس دور میں برصغیر کا بہت تھوڑا حصہ فتح ہوا۔اس حصے میں اسلامی تعلیم وتہذیب کے جو اثرات پڑے انہیں باطنیت کے سیلاب نے ملیا میٹ کردیا اورجب برصغیر کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا تو فاتحین میں پہلے دور کے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ انہیں اشاعت اسلام سے زیادہ توسیع مملکت میں اپنی قوتیں صرف کرنے سے دلچسپی تھی اورانہوں نے لوگوں سے اللہ اوررسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی بجائے اپنی اطاعت کا مطالبہ کیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرمانروائی کے بعد بھی برصغیر کی عظیم اکثریت غیر مسلم رہی اوراس میں اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی۔(حسن ریاض' سیّد 1970ء' ص 16)

اس خطے کے جن باشندوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم وتربیت کا کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا۔نومسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اوررسم ورواج کم وبیش باقی رہے اور جو مسلمان باہر سے آئے وہ بھی برصغیر کے پرانے باشندوں کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتتے اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زمانے میں بھی اس خطہ میں اسلام کے اثرات کمزور تھے۔ یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا۔ہندوؤں کا مذہب اوران کی ثقافت کمزور تھے۔محکوم ومغلوب قوم کی حیثیت سے اُن کا مذہب، اُن کی ثقافت اور زیادہ کمزور ہوگئے لیکن مسلمان حکمرانوں کی رواداری اورغفلت کی بدولت ہندو یہاں کی بھاری اکثریت پر چھایا رہا۔اسطرح مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنے عقائد اوراپنی تہذیب میں اتنا صحیح، پختہ اورکامل نہ ہوسکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہوسکتا تھا۔(عبدالرشید ارشد' ڈاکٹر 1995ء' ص 20)

بلاشبہ برصغیر کے مسلمان حکمرانوں کے انداز جہاں بانی کو خالص اسلامی معیاروں کے مطابق تو قرار نہیں دیا جاسکتا

لیکن ان کے اقتدار کے زیر اثر برصغیر میں جو اخلاقی و تمدنی ترقی ہوئی اسے بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بشیر احمد نے اس ضمن میں چند جھلکیاں پیش کی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ: مسلمانوں کی آمد پر ہندوستان کی معاشری، تمدنی اور مذہبی حالت بہت خراب تھی۔ مسلمان جب یہاں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے اور ہندوؤں کے مابین مذہب و معاشرت میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے پوری رواداری سے کام لیا اور ہندوؤں کے مذہب میں مطلق مداخلت نہ کی۔ خود اورنگ زیب تک نے ان کے مندروں کیلئے جاگیریں عطا کیں محمود غزنوی کے ہندوستان پر حملوں سے بھی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جب تک پنجاب کے راجہ جے پال نے غزنی پر متعدد حملے نہ کئے محمود نے ہندوستان کا رخ نہ کیا (شیر محمد گریوال 1989ء ص 18-20)۔ ہندوستان میں جب مسلمان فاتحین کا قدم آیا تو یہ سویا ہوا ملک بیدار ہو گیا، ڈرا، گھبرایا، کانپا اور ایک نئی زندگی سے دوچار ہوا۔ برابری، بھائی بندی، آزادی، کوئی پروہت، شودر، اونچا اور نیچا نہیں، نہ مورتیوں کا پوجنا، نہ بھینٹ چڑھانا، نہ آوا گون کا مسئلہ، صرف ایک خدا اور اس زمین پر اس کے بندے سب آپس میں اور خدا کے سامنے برابر، ان خیالات نے بے شمار لوگوں اور بالخصوص نچلے طبقے مذہبی آدمیوں اور نیچ ذاتوں پر بے حد اثر کیا اور وہ خود بخود اس سادہ اور آزادی بخشنے والے مذہب کی طرف کھنچے چلے آئے۔ (بشیر احمد 1940ء ص 49-51)

وحدانیت کی تلوار نے خداؤں اور دیوتاؤں کی گتھیاں کاٹ کے رکھ دیں۔ مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کا پہلی بار بیرونی دنیا سے ایک گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ مسلمانوں کا عہد شروع ہوتے ہی تاریخ کا رخ بدل جاتا ہے۔ ایک دلیر فاتح زندہ قوم کا سیلاب آتا ہے جو صدی ڈیڑھ صدی میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر جاتا ہے۔ لیکن یہ لوگ نرے فاتح نہ تھے۔ فتوحات کے بعد انہوں نے نہ صرف یہاں قیام کیا بلکہ ایک باقاعدہ حکومت قائم کر کے ملکی نظم و نسق اور رفاہ عام کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ مثال کے طور پر فیروز تغلق کے عہد میں ایک سو نہریں، دو سو سرائیں، پانچ سو شفاخانے، ایک سو پل اور بیسیوں قسم کے مفید ادارے قائم ہوئے۔ فیروز آباد میں اس نے ایک بڑا گھنٹہ گھر بنایا جو ہندوستان میں غالباً سب سے پہلا گھنٹہ گھر تھا (اخلاص حسین زبیری 1965ء مترجم ص 73)۔ محمد تغلق کے عہد میں صرف دہلی کے شہر میں ایک ہزار چھوٹے بڑے مدرسے اور ستر شفاخانے تھے جن میں غرباء کا مفت علاج ہوتا تھا (خلیق احمد نظامی 1958ء ص 322)۔ شیر شاہ نے صرف پانچ سال حکومت کی لیکن اس کی انتظامی اصلاحات سے فی الحقیقت مغلیہ عظمت کی بنیاد پڑی (احمد مرتضی 1934ء ص 21-22)۔ مغلوں کی سلطنت نے تاریخ ہند کا ایک نیا ورق پلٹا۔ یکے بعد دیگرے چھ زبردست فرماں روا تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے جن کے عہد میں دو سو سال تک ہندوستان میں ایسا امن و امان قائم رہا اور ملک نے ایسی ترقی کی کہ صدیوں تک دیکھنے میں نہ آئی۔

برصغیر میں خالص اسلامی تہذیب کی ترویج میں حائل سب سے بڑا عنصر یہ تھا کہ فاتحین کے دلوں میں جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر ملک گیری کی ہوس جاگزیں ہو گئی تھی۔ انہوں نے یہاں اشاعت اسلام کے بجائے توسیع مملکت میں اپنی قوتیں صرف کیں اور لوگوں سے اطاعت خدا و رسول کے بجائے اپنی اطاعت اور باجگزاری کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرماں روائی کے بعد بھی ہندوستان کی اکثریت غیر مسلم رہی، یہاں اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی، یہاں کے

باشندوں میں سے جنھوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم وتربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا ،نو مسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اور رسم ورواج کم وبیش باقی رہے اور خود باہر کے آئے ہوئے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہل ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے ۔(ابو الاعلیٰ مودودی ،سیّد 1993ء ،ص 24)

برصغیر میں مسلمانوں کے شاہانہ نظام میں اسلام کا معیاری نظام تلاش کرنا درست نہیں لیکن مسلمان حکمرانوں کی ذاتی خدا ترسی ،تقویٰ اور احساس ذمہ داری انہیں ہر غیر اسلامی فعل سے روکتی اور قانون شریعت کے اجراء ونفاذ پر آمادہ کرتی تھی ۔اس طرح ان نیک بندوں نے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے گویا دو متضاد چیزوں کے درمیان سمجھوتہ کی کوشش کی (مسعود عالم ندوی 1987ء ،ص 16)۔افسوس کی بات ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے سیاحوں اور مصنفوں نے اسلامی عہد کی تاریخ ایک خاص نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کے قوانین اور معاشرتی تصورات کی تصویر مسخ کرنے کی جو روایات قائم کی تھیں ان کا اثر ہمیں جدید مورخوں کے بیانات اور تحریر میں ہر قدم پر ملتا ہے ۔اس کے نتیجہ میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں ان کا ازالہ نہایت ضروری ہے ۔اس سلسلے میں عالمگیری اصلاحات کا حقیقت پسندانہ مطالعہ اہم ہے۔ اسلامی معاشرہ کا جو انحطاط اکبری عہد کے آخری دور میں شروع ہوا تھا اس کے اثرات مصلحین کی کوششوں کے باوجود ختم نہیں ہوئے تھے ۔عالمگیر نے اپنی اصلاحات اِن ہی کا قلع قمع کرنے کی غرض سے جاری کیں ۔اسے اپنے منصوبے میں مکمل کامیابی تو نہ ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی معاشرہ کی عمارت کو استحکام بخشنے میں اس کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں ۔(معین الحق 1965ء ،ص 422)

بہبود عامہ کے کاموں کے سلسلے میں مسلمان حکمرانوں کے کارناموں کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔چنانچہ ڈاکٹر بکینن جس نے لارڈولزلے (Wellesley) گورنر جنرل ہند کے فرمان ،24فروری 1800ء کے مطابق جنوبی ہندوستان کی سیاحت کے بعد 1818ء میں اپنی سیاحت مکمل کر کے رپورٹ پیش کی اس میں وہ مدراس کے آخری گاؤں اورلو کے متعلق لکھتا ہے کہ :یہاں دریائے پالر کی نہر سے آبپاشی ہوتی تھی (محمد یوسف بھٹہ 1984ء ،ص 151-153)۔برصغیر میں مسلمانوں کے دور اقتدار پر اختتامی تبصرے میں یہ اعتراف ضروری ہے کہ سیاسی اقتدار کے باوجود برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی کے بڑے حصّے کو صحیح اسلامی عقائد وتہذیب کا نمائندہ قرار نہیں دیا جاسکتا ۔(حسن ریاض ،سیّد 1970ء ،ص 14)

اٹھارہویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھن گیا جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی پھر مرہٹوں ،سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کردیا اس کے بعد قضائے الٰہی سے انگریز اس ملک پر قابض ہو گئے ۔اور ایک صدی گزری تھی کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب ومحکوم ہو گئے جس پر انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی ۔اِس نے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا ۔(محمد علیؒ

چراغ 1986ء ص 176)

اسلامی قوانین منسوخ کیے، شرعی عدالتیں توڑیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کیے، اسلامی قانون کا نفاذ خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح وطلاق وغیرہ تک محدود کر دیا اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی قاضیوں کی بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیئے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے تھے اور جن کے ہاتھوں "محمڈن لا" روز بروز مسخ ہوتا چلا جارہا تھا۔ اس پر مزید یہ کہ ابتدا سے انگریزی حکومت کی یہ پالیسی رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے اس قومی فخر وناز کو کچل ڈالا جائے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت اس قوم کو مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق اور ذلیل وخوار کر دیا گیا۔ (ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 1985ء ص 25)

2.2 مسلمانوں کے دورِ سقوط کا سیاسی منظر نامہ

برصغیر میں مسلمانوں کا انحطاط 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے شروع ہوا اور 1857ء میں اختتام پذیر ہوا (محمد اسماعیل، ذبیح 1989ء ص 18)۔ یورپی لوگوں کی سازشوں اور اثر و رسوخ کا دور تو پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہو گیا تھا جبکہ 1857ء تو انگریزوں کے غلبے کا سال ہے۔ برصغیر پر یورپی یلغار کا سلسلہ دراصل پرتگیزی سیاح واسکوڈی گاما کی مہم سے ہوتا ہے جس کا بحری بیڑا 20 مئی 1498ء کو جنوبی ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر لنگر انداز ہوا۔ (محمد سرور 1991ء ص 11)

واسکوڈی گاما کوئی سیاح نہیں تھا بلکہ صلیبی دہشت گردوں کا سرغنہ تھا جو مسلمان علاقوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ کالی کٹ ایک دفاعی شہر تھا۔ گاما نے اس شہر پر گولہ باری کرائی۔ ایک موقع پر اس نے 700 حاجیوں کا جہاز گولہ باری کر کے ڈبو دیا۔ وہ مسلمانوں کو درختوں کے ساتھ باندھ کر نشانہ بازی کی مشق کیا کرتا تھا۔ گاما کے جانشین الفانسو نے گوا میں چار دن تک لوٹ مار اور قتل و غارت کی اور مساجد کو نمازیوں سمیت جلا دیا۔ (ہمایوں دین پوری 2003ء ص 35)

دراصل پرتگیزی ایک مذہبی جنون لے کر مشرق کی طرف بڑھے تھے۔ یہ اسلام کو ختم کرنے کا مذہبی جنون تھا۔ اسپین اور پرتگال سے مسلمانوں کو نکالنے اور لاکھوں کی تعداد میں ان کو بے دریغ شہید کرنے سے ان صلیبی دہشت گردوں کے انتقام کی پیاس نہ بجھتی تھی (مارش مین، جے۔ سی 1873ء ص 6)۔ وہ دل میں پوری دنیا سے اسلام کا نام ونشان مٹانے کا عزم لے کر نکلے تھے۔ ان کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو مشرق کی تجارت سے محروم کر کے انہیں بھوکا مارا جائے۔ یوں اسلام کو دنیا سے ختم کر دیا جائے۔ ایک مورخ کے الفاظ میں یورپ کے سات صلیبی حملے گواہ ہیں جو 1097ء کے بعد دو سو سال تک اسلامی مشرق قریب کے ملکوں پر ہوتے رہے اور یہ اہل یورپ کا آٹھواں صلیبی حملہ تھا جس کا آغاز پندرہویں

صدی میں ہوااور جس کی تکمیل 1857ء میں کی گئی۔یورپ نے اس کیلئے پروانہ دیااور پورے مذہبی جوش وخروش کے ساتھ اس کی ابتدا کی گئی۔پرتگیزی حملہ آوروں نے ہند میں آنے جانے والے جہازوں کو بے دریغ لوٹنا شروع کردیا۔اس کے علاوہ انہوں نے جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں پر بھی تاخت وتاراج کی۔ان کے ظلم وستم کا سب سے بڑا نشانہ مسلمان ہوتے تھے۔(محمد سلیم، پروفیسر سید 1993ء ص 20)

انہوں نے گوا کو مستقل طور پر اپنا بحری مرکز بنالیا اور یہاں سے انہوں نے سنگا پور اور انڈونیشیا کی طرف دراندازیاں شروع کردیں۔پرتگیزی امیر بحر الفانسو البوقرق خود ایک بیڑے کے ساتھ 1511ء میں آبنائے ملاکا میں لنگر انداز ہوا(جواہر لال، نہرو 1992ء ص 336) اور پہنچتے ہی بندرگاہ میں عرب اور گجراتی مسلمان تاجروں کے جہازوں کو جلادیا لیکن اس نے چینیوں اور دوسرے غیر مسلموں کے جہازوں کو نہیں چھوا۔اس کے بعد جب اس نے ملاکا کے سلطان پر حملہ کیا تو اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر جوش وخروش دلایا کہ "ہم اس ملک سے مسلمانوں کو نکال کر اور محمد ﷺ کے فرقے کی آگ کو اس طرح بجھائیں گے کہ پھر وہ دوبارہ کبھی نہ بھڑک سکے گی۔میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے ملاکا کی گرم مصالحوں کی تجارت کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھین لیا تو مکہ اور قاہرہ دونوں تباہ وبرباد ہوجائیں گے"۔(محمد سرور 1991ء ص 11)

ملاکا کے سلطان نے شروع میں تو حملہ آوروں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن بعد میں اسے پسپا ہونا پڑا۔پرتگیزوں نے جزیرے پر قبضہ کرکے وہاں کے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا اور جو بچے انہیں غلام بنا کر بیچ دیا لیکن جو وہاں ہندو چینی اور برمی تھے۔انہیں کچھ نہیں کہا۔باقی شہر کو خوب لوٹا اور جو کچھ ہاتھ آیا اسے ساتھ لے گئے۔اس طرح مسلمان تجارت سے محروم ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی ان کا سیاسی، معاشی، معاشرتی اور فکری زوال شروع ہوگیا۔(محمد اسماعیل، ذبیح 1989ء ص 118)

پرتگیزوں کی یلغار کو تاریخ میں کبھی اہم نہیں سمجھا گیا۔بہر حال مشہور مورخ غلام رسول مہر کے نزدیک پاک وہند کی معلوم ومتعارف تاریخ میں بلحاظ نتائج اس سے بڑھ کر منحوس ونامبارک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔چنانچہ انہوں نے 20 مئی 1498ء(28 رمضان المبارک 903ھ) کو برصغیر کی تاریخ میں قومی ماتم کا تاریک دن قرار دیا ہے۔ان کے نزدیک انسانیت کی تاریخ میں پرتگیزوں کے ظلم وستم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔بے دردانہ قتل وغارت، محسن کشی، انسانی حقوق سے لاپروائی، جبری تبدیلی مذہب اور بردہ فروشی پرتگیزوں کے تحفے تھے۔یہ تاریخ کی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس پہلی یورپی بحری مہم کی رہنمائی ایک عرب ماہر بحریات احمد بن ماجد نجدی نے کی تھی جو مسقط کا رہنے والا تھا۔(غلام رسول، مہر 1971ء، ص 16-18)

پرتگیزیوں کے بعد جب ولندیزی مشرقی سمندروں میں پہنچے تو ان میں مذہبی جنون قدرے کم اور تجارت کا جذبہ زیادہ تھا۔فرانسیسی اور انگریز بھی زیادہ تر تجارت ہی کے شوق میں بحر ہند کی طرف بڑھے تھے لیکن اسلام سے نفرت اور

عیسائیت کی ترویج کا جذبہ ان میں بھی موجود تھا۔ انگریزوں کو پہلے پہل گرم مصالحوں کی تجارت نے اپنی طرف کھینچا تھا۔ لیکن بعد میں وہ برصغیر پاک وہند سے کپڑا اور دوسری اشیاء بہت بڑی مقدار میں یورپ برآمد کرنے لگے۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے انہوں نے 1608ء میں سورت میں اپنی پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ 1615ء میں برطانوی بادشاہ جیمز کا ایک سفیر طامس رو جہانگیر کے دربار میں پہنچا۔ بعد ازاں انہوں نے مدراس میں اپنا تجارتی اڈا قائم کرلیا۔ (طفیل احمد سید منگلوری (س ن)، ص 62)

1665ء میں ان کو بمبئی مل گیا اور 1690ء میں دریائے ہگلی کے کنارے مچھیروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں انگریزوں نے اپنا تجارتی مرکز قائم کیا جو آگے چل کر کلکتہ کے نام سے مشہور ہوا۔ شروع شروع میں انگریزوں کی تمام تر سرگرمیاں تجارت تک محدود رہیں اور اس سے انہوں نے خوب کمایا۔ ان دنوں برصغیر کے بنے ہوئے کپڑے کی یورپ اور بالخصوص برطانیہ میں بہت مانگ تھی اور یہ تجارت زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تک ان کا ملک کی سیاست میں کوئی عمل دخل نہ تھا اور وہ اس معاملے میں بے حد محتاط بھی تھے کیونکہ ایک دفعہ بنگال میں ایک انگریز تجارتی افسر نے مغل حکومت کے خلاف بدتمیزی کی تھی۔ جس کی سزا انگریزوں کو بہت سخت ملی اور انہیں بڑی مشکل سے منت سماجت کے بعد معافی دی گئی۔ چنانچہ جرمانہ ادا کرنے کے علاوہ انہیں آئندہ ٹھیک طرح رہنے کا یقین بھی دلانا پڑا تھا۔ یہ واقعہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کا ہے۔ (محمد سرور 1991ء ص 13)

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے جلد بعد مرکزی حکومت میں ضعف کے آثار نظر آنے لگے۔ مرکز کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبے خود مختار ہوگئے (قاضی جاوید 1986ء ص 86)۔ دکن میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ بھرت پور اور الور میں جاٹوں نے بغاوت کرکے دہلی اور آگرے کے درمیان آمدورفت بند کردی۔ چُورامَن جاٹ، سورج مَل جاٹ اور جواہر مَل جاٹ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے (خلیق احمد نظامی 1950ء ص 172، حاشیہ 24)۔ جاٹوں نے آگرے اور سکندرے پر حملہ کرکے ان شہروں کو لوٹ لیا اور اکبر کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا ڈالیں۔ جاٹوں کی ان کاروائیوں کو اب تک "جاٹ گردی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ 1739ء میں نادر شاہ نے کرنال کے مقام پر مغل بادشاہ محمد شاہ کو شکست دے کر دہلی کی جانب پیشقدمی کی۔ اس نے دہلی سے اسی کروڑ روپے مالیت کا سامان لوٹا اور شہر میں خون کی ندیاں بہادیں۔ نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے دس بار پنجاب پر حملہ کیا اور مغل حکمرانوں کی ساکھ خاک میں ملادی۔ (محمد علی چراغ 1986ء ص 155)

1753ء میں پنجاب کے ناظم میر معین الملک کی وفات کے بعد پنجاب کا امن تہ و بالا ہوگیا۔ سکھوں کی بارہ مِسلوں نے پنجاب کے مختلف علاقوں میں اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ مرکز کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنوبی ہند میں مرہٹوں نے دوبارہ قوت پکڑلی۔ 1759ء مرہٹوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا (حیرت مرزا 1895ء ص 130-131)۔ دہلی، پنجاب اور دریائے گنگا و جمنا کے درمیانی علاقے پر مرہٹوں کے تسلط نے یہاں کے مسلمانوں کیلئے جینا دوبھر کردیا (غلام

حسین، طباطبائی 1276ھ، ص 402)۔مرہٹوں کے زیر تسلط علاقوں میں اسلامی شعار کو نقصان پہنچ رہا تھا۔اس لئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی ،نواب احمد خان بنگش والئ فرخ آباد، نواب نجیب الدولہ فرمانروائے روہیل کھنڈ، نواب شجاع الدولہ تاجدار اودھ کو مرہٹوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی دعوت دی۔انہوں نے 1761ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی کے تاریخی میدان میں مرہٹوں کو فیصلہ کن شکست دی اور مسلمانوں کو تنگ دل ہندوؤں کی غلامی سے نجات دلائی۔(جی۔سی نیرنگ 1956ء، ص 178)

مسعود عالم ندوی نے اورنگ زیب کی وفات کے بعد سیاسی صورت حال کو یوں بیان کیا ہے: اورنگ زیب کی وفات 1707ء میں ہوئی۔وہ جسے ہندوستان میں "ناموسِ ملت کا آخری پاسبان" کہا جاتا ہے اس کے جانشین ایسے کمزور اور بودے ثابت ہوئے کہ نصف صدی کے اندر دیکھتے دیکھتے مغلیہ حکومت کا اقتدار جاتا رہا۔نظم ونسق حکومت میں بالکل ابتری پیدا ہوگئی۔ہر طرف بغاوت اور خود مختاری کا جھنڈا بلند ہونے لگا۔مختلف صوبوں میں مقامی سیاسی طاقتیں سر اٹھانے لگیں۔پھر ان سیاسی طاقتوں کے ساتھ مقامی تہذیبوں نے بھی بال و پر نکالنا شروع کردیئے۔وہ سب بدعات اور ہندوانہ رسم و رواج جو اورنگ زیب کی کوششوں سے دب گئے تھے۔از سر نو منظر عام پر آنے لگے۔شیعیت بھی آخری کمزور بادشاہوں کی سرپرستی میں پھر سر چڑھنے لگی۔(مسعود عالم ندوی، 1987ء، ص 17)

تعلیم وتربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعۃً درہم برہم ہوگیا۔قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا۔انفرادیت اور خودغرضی پوری طرح ان پر مسلط ہوگئی (آبادشاہ پوری 1989ء، ص 40)۔ان میں ہزاروں غدار پیدا ہوگئے۔جن کا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جاسکتا تھا اور جو اپنے ذاتی فائدے کیلئے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ان میں لاکھوں غلامانِ شکم پیدا ہوئے جن سے ہر دشمن اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کیخلاف بد سے بدتر خدمت لے سکتا تھا۔ان کے سوادِ اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اس کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔غیروں کے بخشے ہوئے خطابات میں انہیں عزت محسوس ہونے لگی۔دین اور ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی تو وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آئی۔جب کبھی کوئی غیرت مند شخص اقتدار قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے کیلئے اٹھا۔اس کا سر اس کی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کردیا۔اس طرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا اور سیاسی اقتدار مٹتے ہی یہ قوم افلاس، غلامی، جہالت اور بد اخلاقی میں مبتلا ہوگئی۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 1981ء، ص 43)

اورنگ زیب کے بعد کی طوائف الملوکی کو انگریز طالع آزماؤں نے غنیمت سمجھا اور وہ ملک کی سیاست میں دخل دینے لگے۔اس میں انہیں تجارت سے کہیں زیادہ نفع نظر آیا۔اور اس طرح انہیں اس کی چاٹ پڑ گئی۔چنانچہ اب انہوں نے

یہ وطیرہ اختیار کیا کہ ایک نواب کو دوسرے نواب سے لڑواتے، جیتنے والے سے اپنا حصہ وصول کرتے اور دولت کے ساتھ ساتھ زمین کا رقبہ بھی اس سے ہتھیا لیتے۔ یہ 1700ء کا واقعہ ہے کہ جب ایک مغل گورنر انگریزوں کے تجارتی مرکز مدراس پہنچا۔ تو وہاں کے انگریزوں نے اسے بڑے تحفے تحائف دے کر ٹالا۔ اس کے بعد سال کے سال مغل نواب کا مدراس جانا ایک معمول ہو گیا (محمد سرور 1991ء ص 14)۔ اس طرح بنگال میں جو انگریز تھے وہ وہاں کے مغل گورنر کو نہایت ہی عاجزانہ زبان سے خط لکھا کرتے تھے اور ہمیشہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ لیکن جیسے ہی ملک میں طوائف الملوکی پھیلی انگریزوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ ملک گیری کی مہم بھی شروع کر دی۔ اس کا سب سے پہلا موقع انہیں مدراس میں ملا۔ ارکاٹ کے نواب کی موت پر اس کے بیٹوں میں تخت نشینی پر جھگڑا ہوا۔ انگریزوں نے ایک بیٹے کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد یہی صورت حال حیدر آباد میں پیدا ہوئی اور انہوں نے ایک مدعی سلطنت کی سرپرستی کی۔ بعد ازاں بنگال میں یہی کھیل کھیلا گیا جس کے نتیجے میں پلاسی کی جنگ ہوئی اور انگریزوں کے قدم باقاعدہ طور پر بنگال میں جم گئے۔ (دت 1956ء ص 99)

انگریزوں نے مسلمان حکمرانوں کی اجازت سے 1608ء میں برصغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی اور تجارت کرتے رہے لیکن ان تذلیلِ انسانیت کے خوگر ظالموں نے اپنی سرشت کے مطابق فتنہ پردازیاں اور جعلسازیاں جاری رکھیں۔ سرمایہ داروں کی موروثی ذہنیت سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ ابن الوقت لوگوں پر ڈورے ڈالتے رہے اور رفتہ رفتہ دیوانی کی ملازمت حاصل کر کے انتظامی امور میں داخل ہوئے (تھامسن اور گیریٹ 1934ء ص 90، 91، 104)۔ بالآخر 1765ء سے 1857ء تک پورے برصغیر کے بادشاہ بن بیٹھے اور زمانے بھر کے حراف درندہ صفت انگریز نے نظام سلطنت پر قبضہ کرتے ہی اپنے آباؤاجداد کی روایات کے عین مطابق خلاف معاہدہ کاروائیاں شروع کر دیں اور اپنی ازلی تنگ نظری میں سچے ثابت ہوئے۔ (شمس القمر قاسمی 1973ء ص 19)

مشرقی ہندوستان میں بنگال، بہار اور اڑیسہ بہت بڑے اور زرخیز صوبے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے ان ہی میں قدم جمائے۔ کلکتہ بھی یہیں واقع تھا۔ جسے مدت دراز تک انگریزی مقبوضات میں مرکزی حیثیت حاصل رہی ان صوبوں میں انگریزوں کی عیاری اور فریب کاری اتنی مرتبہ دہرائی جا چکی تھی کہ اب اس میں کوئی ندرت نہیں رہی تھی۔ دیسی حکمرانوں میں سے میسور کا فرمانروا حیدر علی پہلا شخص تھا جس نے انگریزوں کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا۔ اس کی دوررس نگاہ نے بھانپ لیا کہ اگر انگریزوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تو ملک خوفناک آفات کا ہدف بن جائے گا (جمیل احمد، خواجہ 1974ء ص 132)۔ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جا سکتا ہے، قوت کے خلاف قوت لائی جا سکتی ہے۔ دھوکے، فریب اور دغابازی سے عہدہ برا ہونے کیلئے حیدر علی جس حقیقت پر پہنچ چکا تھا اس سے نظام، مرہٹوں اور ناظم کرناٹک کو بھی بار بار آگاہ کرتا رہا۔ اس کے فرزند ٹیپو سلطان نے بھی زندگی اس مقصد کی نذر کر دی لیکن نظام اور مرہٹے کوئی بھی شایانِ شان کام نہ کر سکے۔ صرف اس وہم میں مبتلا رہے کہ انگریزوں کے ساتھ ہو کر سلطنت میسور ختم کر دیں۔ جس

سے ان پر خوف طاری تھا وہ سلطنت ختم ہوگئی تو انگریزوں نے نظام کو اس درجہ پابند بنا دیا کہ اس کا عدم اور وجود برابر رہ گیا اور مرہٹوں کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ (غلام رسول مہر 1971ء ص 23)

حکومت برطانیہ کی مسلمانوں کے اثر و اقتدار کو ختم کرنے کی منظم حکمت عملی ہندوستان کے تین صوبوں بالخصوص بنگال میں اقتدار حاصل کرنے کے فوراً بعد شروع ہوگئی تھی۔ دوسرے علاقوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام نے ریاستوں کو ختم کرنے کے مسلسل عمل سے اپنے علاقوں کی توسیع کی کوششیں جاری رکھیں۔ اور اس سلسلے میں لارڈ کلائیو، وارن ہیسٹنگز اور کارنوالس نے حکومت برطانیہ کی سرحدوں کو بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ پہلے دونوں اشخاص دیدہ و دانستہ ایسے مواقع پیدا کرنے اور اپنے مقاصد کے حصول کیلئے قابل اعتراض طریقے اختیار کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ لارڈ ویلز لے جس نے گورنر جنرل کا عہدہ 1798ء میں سنبھالا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے جنگ و جدل، فتوحات، سفارتی گفت و شنید، سیاسی دھمکی اور عیاری کو اپنا ہتھیار بنایا۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو ایک وسیع رقبہ پر پھیلا دیا۔ (علی اظہر برلاس، مرزا 1984ء ص 56)

لارڈ ہیسٹنگز (Hastings) نے جو 1813ء سے 1823ء تک رہا مرہٹوں کی طاقت کو بالکل کچل دیا اور اپنے نامزد وزیر نواب اودھ کو بادشاہ کا منصب اختیار کرنے کی جرأت دلا کر مغل شہنشاہ کی توہین کی۔ چوتھائی صدی گزرنے کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے (جو 1848ء سے 1856ء تک گورنر جنرل رہا) سکھوں کو شکست دے کر اور اودھ کے نواب واجد علی شاہ کو 1856ء میں جبراً معزول کر کے ان کے علاقوں کو ہتھیا کر کمپنی کی توسیع پسندانہ حکمت عملی کی تکمیل کی (بی۔ ڈی باسو میجر 1922ء ص 335-339)۔ اب پورا برصغیر سلطنت برطانیہ کے اقتدار میں آ گیا۔ اور وہ ریاستیں جن کا انتظام نہیں کیا گیا تھا وہ ایک بالا دست طاقت کے زیر اثر رہنے پر مجبور ہوگئیں۔ برطانوی توسیع پسندوں نے ایک غیر ملکی طاقت کی حیثیت سے لوگوں کا معاشی استحصال بڑے پیمانہ پر کیا۔ (ممتاز معین، پروفیسر مسز 1982ء ص 38-39)

انگریز نے 1843ء میں سندھ پر قبضہ کیا۔ 1799ء میں میسور پر اور 1817ء تک مرہٹوں کی آزاد حکومتیں ختم کر دیں۔ 1849ء میں سکھوں کو شکست دے کر پنجاب کا الحاق کیا۔ اور 1856ء میں اودھ کا (علی اظہر برلاس، مرزا 1984ء ص 55)۔ اس کے بعد پورے ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوگئی۔ مسلمانوں کے انحطاط کے دور میں اس حکومت میں جس پر انگریز قابض تھا مسلمانوں کا کوئی سیاسی نظام نہ تھا۔ اہل علم کے طبقے سے حضرت شاہ ولی اللہ منظر عام پر آئے۔ انھوں نے اصلاح احوال کی ناتمام کوششیں کیں۔ ان کے بعد ان کا مدرسہ ان کے شاگرد اور ان کی اولاد رہ گئی۔ ان کے پاس نہ تو فوج تھی، نہ خزانہ تھا، نہ اختیارات تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں جنگ کرتے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند شاہ عبدالعزیز محدث نے فتویٰ دے دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ یا تو مسلمان انگریزوں سے جنگ کریں یا ہجرت کر کے کہیں چلے جائیں۔ (عبدالعزیز، شاہ 1322ھ ص 16-17)

حضرت سیّد احمد شہید بریلوی، شاہ عبدالعزیز ہی کے شاگرد تھے اور مرید بھی۔ ان کی رائے بھی یہی تھی لیکن ان کا

جہاد بھی کامیاب نہ ہوا اور انگریزی تسلط وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ سید احمد شہید بریلوی کی تحریک جہاد پنجاب میں عمل میں آئی لیکن اس کے اثرات پورے برصغیر میں پھیل گئے تھے (نوشہروی' ابو یحییٰ امام خان 1938ء' ص 87)۔ بنگال میں اس نے فرائضی تحریک کی شکل اختیار کی۔ یہ بھی مسلمانوں کے تحفظ اور اسلام کے احیاء کی تحریک تھی۔ حاجی شریعت اللہ اس کے بانی تھے۔ انکے بعد ان کے بیٹے محمد محسن عرف دودھومیاں، سید احمد شہید کے ایک مرید نثار علی عرف تیتو میر (متوفی 1832ء) اس تحریک کے نامور قائدین ہوئے (اشرف 1983ء' ص 90' 91)۔ اس تحریک میں تبلیغ و جہاد کی جامعیت تھی۔ اس نے 30' 35 سال تک بنگال میں بڑا موثر کام کیا اور انگریزوں کیلئے دردِ سر بنی رہی۔ (خورشید احمد 1963ء' ص 54)

1857ء میں میرٹھ سے جنگ آزادی شروع ہوئی۔ دہلی، جھانسی اور لکھنؤ اس کے اہم مراکز تھے۔ عوام میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ لیکن مرکزی قیادت نہ ہونے کی وجہ سے حریت پسندوں کا آپس میں کوئی رابطہ نہ تھا۔ ان کے مقابلے میں انگریزوں کے پاس باقاعدہ فوج اور جدید اسلحہ تھا۔ ذرائع آمدورفت بھی ان کے کنٹرول میں تھے۔ ان حالات میں انگریز تحریک آزادی کو دبانے میں کامیاب ہوگئے (جمیل احمد' خواجہ 1974ء' ص 168-182)۔ انگریزوں کے خلاف جنگ یا بغاوت کرنے کیلئے مسلمانوں کو صرف یہ ایک سبب کافی تھا کہ انگریزوں نے بدعہدی، سازش اور فریب سے ہندوستان پر قبضہ کیا اور انہیں حکومت، آزادی اور اختیار سے محروم کیا۔ اپنی گئی ہوئی آزادی اور خودمختاری واپس لینے کیلئے اگر کوئی قوم ایسی طاقت کے خلاف بغاوت کرے تو یہ قابل عذر و معذرت نہیں بلکہ قابل فخر ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کا ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف معاندانہ احتجاج بھی تھا کہ اس نے انہیں معاشی حیثیت سے تباہ کر دیا، تعلیم کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں کہ اپنے مزاج اور اپنی پسند کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ان کے لئے ناممکن ہوگیا۔ مذہب کے معاملے میں بھی انگریز نے مداخلتیں کیں اور یہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ (حسن ریاض' سیّد 1967ء' ص 22' 23)

1857ء کے بعد مسلمانوں پر بے اعتمادی اور مسلمانوں کے اقتدار کو ملیا میٹ کرنے کی مساعی خاص طور پر انگریزی پالیسی کا مقصد رہا ہے۔ وہ تمام مادی قوتیں جو مسلمانوں کو حاصل تھیں ان سے چھین لی جاتی تھیں۔ ان کی زمینوں پر قبضہ کرلیا جاتا' روزگار سے محروم کردیے جاتے' عدالتوں سے نکال دیے جاتے اور دربار میں ان کی ملازمتیں ختم کردی جاتیں۔ اس کے مقابلہ میں ساری عنائتیں یا ان ضمیر فروشوں پر تھیں جو مسلمانوں سے غداری کرتے اور بیرونی قوت سے سازباز کرتے یا ان ہندوؤں پر جنہیں یہ احساس دلایا جاتا کہ تم اکثریت میں تھے لیکن دیکھو تمہارے اوپر ایک ہزار سال سے مسلمان حکمران ہیں۔ تم ان سے آگے بڑھو۔ تم اس ملک کے حکمران بنو گے۔ (ٹیمپل 1882ء' ص 502)

1857ء سے بہت پہلے انگریز اپنی چالبازیوں سے مسلمانوں کی تذلیل میں مسلسل پیش دستیاں کر رہے تھے اور 1857ء کے بعد تو انھوں نے اسے انتہا کو پہنچا دیا۔ 1857ء میں مغل دور کے خاتمے سے ذرا قبل تک انگریز مغل شہنشاہیت کے "انتہائی وفادار ملازم" تھے اور ان کا گورنر جنرل اطاعت گزاری کی علامت کے طور پر ہر سال مغل شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر پیش کیا کرتا تھا۔ ایڈورڈ، ولیم نے آخری مغل شہنشاہ کے حضور میں انگریزوں کی آخری نذر کا حال

شدید احساس کمتری کے ساتھ درج ذیل الفاظ میں کیا ہے:

جس روز ہمارا کیمپ دہلی میں ہوا ہمیں معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہند بیمار ہیں اور قدیم رواج کے مطابق گورنر جنرل ہند یا اس کے نمائندوں کو مزاج پرسی کیلئے حاضر ہونا اور کچھ مبلغات بطریق ''نذرانہ'' پیش کرنا ضروری ہے۔ کمپنی کے پرانے ریکارڈ نکال کر دیکھے گئے اور ان میں مختلف حالات پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا ثبوت مل گیا کہ اگرچہ گورنر جنرل ہند اور بادشاہ دہلی کے درمیان اعلیٰ وادنیٰ کا رابطہ نہیں تھا لیکن پھر بھی گورنر جنرل ہند کو ہر سال بادشاہ دہلی کے حضور میں ایک نذر پیش کرنی ضروری ہوتی تھی۔ نذر پیش کرنا اور اعلیٰ حضرت مغل شہنشاہ کی مزاج پرسی کرنا دراصل اس بات کا ثبوت تھا کہ ہم ہندوستان کے حصص واقطاع پر بادشاہ کے کارندے اور باجگوار کی حیثیت سے حکومت کرتے ہیں اور بادشاہ کے سامنے عقیدت ومحکومیت کا ثبوت پیش کرنا ہمارے لئے ازحد ضروری تھا۔ نیز کچھ طلائی مہروں کا ''نذرانہ'' بھی رواج کے مطابق ضروری تھا۔ چونکہ یہ ایک قدیم رواج اور ہماری اطاعت گزاری ایک مانی ہوئی بات تھی اسلئے گورنر جنرل سے استفسار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ میں اور مسٹر تھامسن بادشاہ عالی جاہ مغل شہنشاہ ہند کے حضور میں طلائی مہروں کی ریشمی تھیلیاں اور دیگر تحائف لے کر بصد آداب وخصوصیات مشرقی اپنے کیمپ سے روانہ ہوئے۔ جلوس کی روانگی کی صورت یہ قرار پائی کہ اعلیٰ افسران وفد اور طلائی مہروں کی تھیلیاں ہاتھیوں پر بار کی جائیں۔ ان کے آگے اور پیچھے کور دستہ اور نشان انگلشیہ ہو۔ ہمیں یہ بھی ہدایت تھی کہ بادشاہ کے حضور جوتے اتار کر اور جھک کر پہنچنا چاہیئے اور مشرقی دربار میں اس آداب کی پابندی نہایت ضروری ہے۔ اگرچہ ہمارے کیمپ کے لوگ بے دست وپا بادشاہ کے سامنے اس تذلیل کو قطعی غیر ضروری سمجھتے تھے لیکن اس وقت جو رواج قائم تھا اسے دور کرنا ایک دم بغاوت کر کے اسے پس پشت ڈال دینا بھی ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ اس لئے بادل ناخواستہ میں نے اور سب نے یہ بات منظور کر لی اور نذر پیش کرنے والا یہ جلوس قلعہ دہلی کی جانب بڑھنا شروع ہوا۔ ہم نے اپنے جوتوں پر ریشمی غلاف چڑھا لیے لیکن دربار عام میں پہنچنے اور ''کورنش'' ادا کرنے کے لوازم سے جب بھی مفر نہ ہوا۔ (ایڈورڈ ولیم 1991ء ص 19)

ستم ظریفی کی انتہا کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے ساتھی ''اطاعت گزار'' انگریزوں نے اسی اسیر شہنشاہ کو اس کے بیٹوں کے کٹے ہوئے سروں کی نذر پیش کی تھی۔

2.3 مسلمانوں کے دورِ تغلیب میں تعلیمی کیفیت

دور جدید میں تعلیم کا فروغ مغربی ترقی کے حوالے سے دیکھا جاتا ہے اور اس تقابل کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ برصغیر پر برطانوی تسلط سے قبل کا زمانہ جہالت کا دور تھا۔ یہ سراسر تاریخی ناانصافی ہے۔ انگریزوں سے قبل اس برصغیر پر ایک طویل عرصہ تک مسلمانوں کی حکومت رہی ہے اور مسلمان قوم مزاجاً تعلیم پسند ہے۔ تاریخ انسانی میں یہ منفرد مقام اسلام ہی کو

حاصل ہے کہ وہ مکمل علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیام بر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسان نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی اور جہالت سے نہیں بلکہ علم اور روشنی سے کیا۔ تخلیق آدم کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اشیاء تھا۔ یہ اشیاء کا علم ہی ہے جو انسان کو باقی مخلوق سے ممتاز کرتا ہے اور جو قرآن کریم کے فرمان کے مطابق تمام دوسری مخلوقات پر اس کی برتری قائم کرتا ہے۔ علم کو ایک نمایاں امتیاز حاصل ہے، یہ ان محرکات میں سے ایک ہے جو کسی تہذیب کے صحت مند ارتقاء اور نشوونما کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے دوسرے ادیان اور نظاموں نے تعلیم کو محض بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھا وہاں اسلام نے اسے اولین ضرورت قرار دیا ہے۔ (خورشید احمد (س ن)، ص 15)

تعلیم اور اشاعت علم کی یہ اعلیٰ روایات مسلمان اپنے ساتھ ہر اس ملک میں لے گئے جہاں وہ بحیثیت فاتح یا بغرض تبلیغ و تجارت وغیرہ گئے۔ برصغیر میں بھی اسلامی فتوحات کے پہلے دور یعنی سندھ و ملتان کی فتح کے بعد اسلامی علوم کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس زمانے کے علماء و فضلاء کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ درس و تدریس کا سلسلہ یہاں کس قدر وسیع تھا۔ ان فضلاء و علماء میں بعض نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی (براؤن 1951ء، ص باب دوم)۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ مفتوحہ علاقوں میں کافی تعداد میں مسجدیں تعمیر کی گئی ہوں گی اور ان میں سے اکثر کے ساتھ ملحقہ مدارس ہوں گے کیونکہ مسجد کے ساتھ مدرسہ کا رواج مسلمانوں کے معاشرہ میں عام تھا۔ چچ نامہ اور دیگر تاریخی تصانیف میں ہمیں حجاج بن یوسف اور محمد بن قاسم کی وہ مراسلت ملتی ہے جس میں حجاج نے اشاعت اسلام اور تعلیم سے متعلق واضح ہدایات دی ہیں۔ مرکز خلافت میں سازشوں کی وجہ سے محمد بن قاسم کو تو جلد ہی واپس بلا کر قید کر دیا گیا لیکن سندھ میں علمی و تعمیری کاموں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس سلسلے میں دو شہروں منصورہ اور محفوظہ کی تعمیر قابل توجہ ہے۔ یہ مکمل اسلامی شہر تھے۔ عباسی حکومت کے بعد یہاں بھی نئے حاکم مقرر ہوئے۔ اس مختصر سے دور میں علمی زندگی نے یہاں کافی ترقی کر لی تھی۔ (البلاذری، ابوالعباس احمد 1866ء، ص 444)

فتح سندھ کے بعد مسلمانوں نے اشاعت تعلیم کے سلسلہ میں جو کوشش کی اس کے متعلق ہمارے پاس بہت محدود معلومات ہیں۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سلسلہ میں وسیع پیمانہ پر کوششیں کی گئیں۔ یہی سبب تھا کہ یہاں کے علماء و فضلاء نے ہی نہیں بلکہ اس علاقہ نے عالم اسلام میں ایک مقتدر مقام حاصل کر لیا (معین الحق 1965ء، ص 423، 425)۔ تہذیبی اعتبار سے برصغیر کے شمالی خطے عرب فاتحوں کے دم قدم سے محروم رہے۔ ان کی جگہ یہاں ایسے فاتح اور کشور کشا آئے جو خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہ ترک اور مغل تھے جو اسلام بھی اس وقت لائے جب خود ان کے تہذیبی مرکزوں (حجاز، عراق، شام) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا۔ درہ خیبر کی طرف سے آنے والی اکثر قوم میں اسلامی تعلیمات سے اکثر بے بہرہ رہیں۔ (عبدالقادر بدایونی 1869ء، ص 268، 325)

ان بادشاہوں اور کشور کشاؤں کے کارنامے ملک گیری اور جنگی صلاحیتوں کے لحاظ سے جو بھی قدر و قیمت رکھتے

ہوں، مگر اسلامی تعلیم اور اسلامی نظام حکومت وعدل کے عملی مظاہرے کے اعتبار سے ان کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ تلخ بیانی معاف، ان بادشاہوں کی عملی زندگی اور ان کے سیاسی طرزِ عمل نے اسلام کے متعلق ایسی بے شمار غلط فہمیاں پیدا کردیں جو ایک مدت کی مسلسل اور پیہم کوششوں کے باوجود آج تک دور نہیں ہوسکیں۔ خلاصہ یہ کہ اس ملک کے بڑے حصے میں اسلام کے ایسے پیام بر آئے جو خود اسلام کی تعلیم سے اچھی طرح واقف نہ تھے اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی تو انہیں اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق کم ہی میسر ہوئی (جواہر لال نہرو 1992ء ص 345)۔ نتیجہ ظاہر تھا' وہ دین جو ایک عقیدہ اور ہمہ گیر نظام زندگی کی حیثیت سے تمام ادیان اور نظام ہائے حیات پر غالب ہونے کیلئے آیا تھا، ہندوستان پہنچ کر شرک اور جاہلیت کے انبار میں دب گیا۔ حجاز سے توحید کا جو صاف وشفاف چشمہ رواں ہوا تھا، گنگا اور جمنا کی آمیزش نے اسے گدلا کردیا۔ توحیدی عقائد شرک کی آلودگیوں میں لت پت ہوگئے اور دین حق کا ستھرا نظام زندگی جاہلیت کے طور طریقوں سے بری طرح مسخ ہوا۔ (مسعود عالم ندوی 1987ء ص 4'3)

محمود غزنوی بھی درۂ خیبر کی طرف سے آنے والا فاتح تھا لیکن مسعود عالم ندوی نے اس کے اقتدار سے قبل کی صورتِ حال کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ جہاں تک بعد کی صورت حال کا تعلق ہے تو مورخین نے محمود کی علمی خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مورخ فرشتہ کے بیان کے مطابق محمود نے ایک ایک مدرسے کیلئے کئی کئی دیہات کی جاگیریں وقف کردی تھیں اور ایسے مدارس کی تعداد حد وحساب سے باہر تھی۔ محمود کے جانشین بھی بڑے علم پرور بادشاہ تھے۔ ان میں سلطان مسعود اور سلطان ابراہیم تو اپنے جاہ وجلال کی وجہ سے بھی مشہور تھے۔ ان کے بعد بہرام شاہ کے زمانے میں سیاسی انحطاط رونما ہوگیا تو بھی علم و ادب کا میدان خالی نہ رہا۔ غزنویوں کے دورِ زوال میں سلطان معز الدین محمد بن سام المعروف شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو شکست دے کر دہلی سے راجپوتانہ تک کا علاقہ فتح کرلیا اور یہاں مساجد اور مدارس تعمیر کرائے۔ (محمد قاسم فرشتہ (س ن)' ص 123)

سلطان محمد غوری کے تربیت یافتہ غلام اس کے جانشین ہوئے۔ ان میں قطب الدین ایبک، ناصر الدین قباچہ اور محمد بختیار خلجی برصغیر میں مشہور ہوئے۔ قباچہ سندھ اور محمد بن بختیار بنگال میں سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ علمی ترقی کیلئے مشہور رہیں۔ ایبک سے برصغیر میں باقاعدہ مسلم سلطنت کا آغاز ہوا کیونکہ اس سے قبل یہ غزنی مقبوضات کا حصہ تھا۔ ایبک کا جانشین سلطان شمس الدین التمش نہایت علم دوست اور ہنر پرور بادشاہ تھا۔ اسکے بعد میں دہلی علماء وفضلاء کا مرکز بن گئی۔ التمش کا بیٹا سلطان ناصر الدین بے حد سادہ مزاج اور علم دوست سلطان تھا۔ ناصر الدین کا جانشین غیاث الدین بلبن اور اس کے بیٹے سلطان محمد شہید کی علم پروری بہت مشہور ہے۔ غرض ان سلاطین کے دور میں دہلی ہمسرِ بخارا ہوگیا تھا۔ (شیر محمد' گریوال 1989ء ص 196)

دورِ مغلیہ تو برصغیر میں علمی اور تمدنی ترقی کیلئے بے حد مشہور ہے۔ اس سے قبل جن خاندانوں نے برصغیر پر حکومت کی ان میں خلجیوں کا دور بڑا مختصر تھا لیکن توسیع سلطنت اور ترقی وخوشحالی میں ان کا کردار بڑا نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ شیخ

نظام الدین اولیاء کا نام نمایاں ذکر کا مستحق ہے۔ اس سلسلے میں یہ نشان دہی بھی ضروری ہے کہ ان کے خانقاہی نظام میں روحانی تربیت اور تصوف کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ظاہری تعلیم پر بھی زور دیا جاتا تھا۔ تغلق دور میں تعلیمی ترقی کے ریکارڈ کا یہاں سے اندازہ لگائیں کہ محمد بن تغلق کے عہد میں صرف شہر دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے۔ محمد بن تغلق کے جانشین فیروز شاہ کا عہد تعلیم وتدریس کے لحاظ سے سلطنت دہلی کی تاریخ میں یادگار عہد کی حیثیت رکھتا ہے (نریندرا ناتھ لا 1915ء ص 25)۔ تغلقوں کے بعد سیّد خاندان کے چار بادشاہوں کی مختصر حکومت کے دوران میں کوئی خاص قابل ذکر علمی کارنامہ رونما نہیں ہوا۔ اس کے بعد لودھیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس دور میں دہلی کی بجائے آگرے کو دارالحکومت بنایا گیا اور جلد ہی یہ شہر بھی دہلی کی طرح علم وفن کا مرکز بن گیا۔ (ضیاءالدین احمد، پروفیسر 1995ء ص 116-118)

عہد مغلیہ کے مادی و علمی کارنامے اب تک برصغیر کی معاشرتی زندگی کا جزو بنے ہوئے ہیں۔ برصغیر میں خوراک، لباس، طرز بود و باش، گفتگو، آداب مجلس یہ جو کچھ آج ہیں، بہت حد تک مغلیہ وقتوں ہی سے ان کا تعلق ہے۔ پھر فنون لطیفہ میں مغلیہ نقاشی، مغلیہ فن تعمیر، علم وادب اور شاعری، موسیقی اور مصوری کا مذاق یہ سب مغلوں ہی کے زمانے کی تخلیق ہے۔ ان کی شائستگی اور علم پروری داد کے لائق ہے۔ اورنگ زیب کے عہد میں صرف ٹھٹھہ (سندھ) میں 400 مدرسے تھے (شبلی نعمانی 1958ء ص متفرق)۔ بنگال میں انگریزوں کی آمد کے وقت اسی ہزار مدرسے تھے۔ میجر باسو نے لکھا ہے کہ دولتمندی، آرام اور چین کا جو نقشہ شاہجہان کے وقت میں دیکھنے میں آتا تھا بلاشبہ بے مثل و بے نظیر تھا (بی۔ ڈی باسو 1974ء ص 40)۔ ایک انگریز سیاح کہتا ہے کہ اس زمانے میں شہر آگرہ شہر لندن سے زیادہ بڑا تسلیم کیا جاتا تھا۔ ملک میں قسم قسم کی صنعتیں پھولیں پھلیں جن سے ہندوستان ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ ہندوستان میں جہاز تک بنتے تھے۔ یہاں تک کہ انگریز اور ڈچ لوگوں نے اپنے کچھ جہاز یہاں بنوائے۔ (غلام مصطفیٰ، بسمل (س ن)، ص 600)

سورت کا ایک تاجر عبدالصمد کئی سو تجارتی جہازوں کا مالک تھا۔ ملک کا طلائی سکہ اس وقت کے تمام یورپی سکوں سے زیادہ خالص اور قیمت میں بہتر تھا۔ مغلیہ سلطنت اس قدر شاندار نظم ونسق کی وجہ سے لوگوں کے دل میں اتنا گھر کر چکی تھی کہ اورنگ زیب کے بعد ایک صدی تک کوئی بھی قابل بادشاہ اور دور اندیش وزیر پیدا نہ ہوا اس سلطنت کے زوال اور تباہی میں ایک سو سال کا عرصہ لگ گیا۔ جب کوئی قوم گر جائے یا جب کسی تہذیب میں گھن لگ جائے تو زمانہ جسے نوع انسان کی بہبود مدنظر ہے اور محض کسی ایک فرد یا جماعت کی بہتری مقصود نہیں، انسان کی ترقی کیلئے نئے اسباب پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک نیا انقلاب برپا کر دیتا ہے خواہ اس انقلاب کی تبدیلیاں کتنی ہی دل شکن بلکہ لرزہ خیز کیوں نہ ہوں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت اپنا کام کر چکی تھی۔ اب مسلمان خواب غفلت میں سو رہے تھے اور ہندو ابھی بیدار نہ ہوئے تھے۔ یہ حال تھا کہ قدرت زمانہ شناس انگریز قوم کو ہندوستان کے ساحل کی طرف کشاں کشاں لے آئی۔ (بشیر احمد 1940ء ص 52)

برصغیر میں برطانوی تسلط سے قبل تعلیم کا دور دورہ عام تھا۔ مسلمانوں کی مقامی زبانوں کا علم معاشرے میں پھیلا ہوا تھا۔ عربی فارسی پڑھانے والے مکاتب اور مدارس ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ مشہور علماء اعلیٰ اسلامی تعلیم کا اہتمام کرتے

تھے اور اس کی کوئی فیس نہ لی جاتی تھی ۔ بے شمار لوگوں نے محض دینی خدمت اور نیکی کے جذبے سے اپنی زندگیاں فروغ تعلیم کیلئے وقف کر رکھی تھیں (ضیاء الدین احمد، پروفیسر 1997ء ص i)۔ جس طرح توسیع حدود کے لحاظ سے مغلیہ سلطنت عہد عالمگیر میں اوج کمال پر پہنچی اس طرح اشاعت تعلیم کے معاملے میں بھی یہ دور اس کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ مستعد خاں کے یہ الفاظ کہ جس قدر خیرات و مبرات اورنگ زیب کے عہد میں ہوئی اور جس قدر وظائف علماء و فقراء اور دیگر اہل احتیاج کو عطا کیے گئے اس کا عشر عشیر بھی کسی سابقہ حکومت میں رونما نہ ہو سکا (سعید احمد رفیق، پروفیسر 1982ء ص 160)۔ مشہور انگریز مورخ کین نے اس بیان کی بہت موثر الفاظ میں تصدیق کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: اورنگ زیب نے سزائے موت کو بند کیا، زراعت کی حوصلہ افزائی کی، لاتعداد کالج اور سکول قائم کئے اور باقاعدگی کے ساتھ سڑکیں اور پل بنوائے۔ (معین الحق 1965ء ص 463)

جادوناتھ سرکار نے برصغیر پر مسلمانوں کی حکمرانی کے درج ذیل فوائد کی نشاندہی کی ہے:

- بیرونی دنیا سے تعلقات کی بحالی اور بحری فوج اور بحری تجارت کا احیاء جو چولا راجاؤں کے زوال کے بعد ختم ہوگئی تھی۔
- ہندوستان کے بڑے حصے بالخصوص بندھیا چل کے شمال میں اندرونی امن وامان۔
- ایک ہی طرح کے نظم ونسق قائم ہونے کی وجہ سے انتظامی یکسانیت۔
- تمام قوموں کے اعلیٰ طبقوں میں طرز معاشرت اور لباس کی یکسانیت۔
- انڈو اسلامک آرٹ جس میں ہندوستانی اور چینی مصوری کے نمونے شامل ہوگئے تھے۔ فن تعمیر کا نیا طرز اور اعلیٰ قسم کی صنعتوں کا فروغ (مثلاً شال سازی، ململ، قالین سازی وغیرہ)۔
- ایک عام لنگوافرینکا (ملکی زبان) جسے اردو، ہندوستانی یا ریختہ کہتے تھے اور سرکاری نثر لکھنے کا خاص طرز جو فارسی نویس ہندو منشیوں نے ایجاد کئے۔
- بادشاہان دہلی کے ماتحت امن وامان اور اقتصادی بہبودی کی وجہ سے صوبہ جاتی ادبیات کا آغاز۔
- توحید کا احیاء اور تصوف کی ترقی۔
- تاریخی کتب کی تصنیف کا آغاز۔
- فنون جنگ اور عام تہذیب وتمدن میں ترقی۔ (جادوناتھ سرکار 1938ء ص 50)

یہ دور اس لحاظ سے اہمیت کا حامل تھا کہ قرن اولیٰ کی طرح تعلیم کو دینی فریضہ سمجھا جاتا رہا۔ مسجدیں بطور مکاتب کے استعمال ہوتی تھیں۔ اس طرح طلبہ میں دینی حس کی نمو ہوتی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار مدارس قائم تھے۔ تعلیم عام اور مفت تھی۔ تعلیمی نصاب میں دینی تعلیم کے علاوہ ہندسہ، جغرافیہ، منطق، تاریخ، طب اور طبیعات کے مضامین شامل تھے۔ اس کے علاوہ تجارتی، صنعتی اور تکنیکی تعلیم کیلئے علیحدہ ادارے قائم تھے۔ کتابت، خطاطی، فن کوزہ گری، فن تعمیر،

پارچہ بافی وغیرہ کی تعلیم وتربیت کیلئے الگ مکتب کھلے ہوئے تھے۔حکومت تعلیم کو دیگر تمام کاموں سے زیادہ اہمیت دیتی تھی اوراس کے فروغ کیلئے بے پناہ رقوم مختص کرتی تھی مگر اس کے باوجود تعلیمی نظام حکومت تابع نہ تھا بلکہ بالکل آزاد تھا۔مدرسے اپنے انتظام وانصرام اورنصاب علوم کے بارے میں خودمختار تھے۔(منظور احمد جاوید 1979ء ص 57'58)

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر حکومت کے اوّلین فرائض اور بنیادی اصولوں میں سے یہ امر لازم ہے کہ وہ رعایا میں علم کی روشنی زیادہ سے زیادہ پھیلائے اوراس کے ذریعہ ان کے اخلاق انسانیہ اوراعمال معاشیہ میں ترقی دے'ان کی جہالت اور بدکرداری کو دور کرے،انہیں مہذب،شائستہ اور متمدن بنائے اور رعایا کے ہر فرقہ اور ہر خاندان کے افراد کے لئے تعلیمی مواقع اور سہولتیں یکساں طور پر پیدا کرے۔چنانچہ زمانہ سابق میں برصغیر میں ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام بغیر فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا۔بادشاہوں،نوابوں،امراءاوراہل ثروت کی طرف سے جائدادیں تعلیمی مصارف کیلئے وقف کر دی گئیں تھیں(ہنٹر'ڈبلیو۔ڈبلیو 1945ء ص 176-178)۔اس طرح صوبہ بنگال میں صوبہ کا چوتھائی حصہ تعلیم کے لئے وقف تھا۔جیسا کہ صاحب روشن مستقبل لکھتا ہے:

اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ والیان ملک اورامراءتعلیم کی پوری سرپرستی کرتے تھے۔اس کیلئے جاگیریں دیتے اور جائیدادیں وقف کرتے تھے۔دہلی کی مرکزی حکومت ٹوٹ جانے پر بھی صرف اضلاع روہیل کھنڈ میں جو دہلی سے قریب تر تھے پانچ ہزار علماءمختلف مدارس میں درس دیتے تھےاور حافظ رحمت خاں کی ریاست سے تنخواہیں پاتے تھے(الطاف علی' بریلوی سیّد' 1997ء ص 1-2)۔ہر ہر قریہ اور دیہات میں ایسے مدارس موجود تھے جن میں پڑھنے لکھنے حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی۔اورنگ زیب کے زمانہ میں صرف ٹھٹھہ شہر میں مختلف علوم وفنون کے چار سو کالج تھے۔(الگزینڈر ہملٹن 1907ء ص 117)

میکس مولر لکھتا ہے:انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھےاس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کیلئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا(میکس مولر 1899ء ص 16)۔نیز لڈلو(Ludlow)نے تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ: ہندوؤں کے ہر موضع میں جو اپنی قدیم حالت پر رہے بچے عموماً لکھ پڑھ سکتے ہیں مگر جس جگہ ہم نے بنگال کی طرز کا پرانا نظام توڑ دیا ہے وہاں کا اسکول غائب ہوگیا ہے۔(بی۔ڈی باسو 1922ء جلد 5' ص 14)

خورشید احمد نے مسلمانوں کے دورعروج کی تعلیمی حالت کے تجزیے کے بعد درج ذیل اہم نکات کی نشان دہی کی ہے:

- تعلیم کا مرکز دین اسلام رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں۔تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا۔
- برصغیر میں شروع سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا لیکن تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے۔ابتدائی تعلیم گھروں میں ہوتی تھی۔لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی گھروں پر ہی تھا۔پھر قدیم اسلامی روایت کے مطابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں۔اہل علم کے مکانات بھی مستقل تعلیمی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔کتب خانے محض

لائبریری کی حیثیت نہ رکھتے تھے بلکہ اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھے۔نیز بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس کا ثبوت تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

- ہر چند کہ دینی تعلیم پورے نظام کا محور ومرکز تھی مگر ضرورتوں سے کسی زمانے میں بھی اور کسی سطح پر بھی صرفِ نظر نہیں کیا گیا۔صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا۔تجارتی تعلیم کیلئے مہاجنی سکول تھے جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔فنون سپہ گری کی تعلیم کیلئے بے شمار ادارے تھے۔کتابت ،خطاطی، فن کوزہ گری، فن تعمیر وغیرہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔اہل فن کے گرد طالبان علم کا ہجوم رہتا اور وہ اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار فن کار تیار کرتے۔ان کیلئے باقاعدہ مدارس کا بھی پتہ چلتا ہے۔تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مدارس میں جو نصاب تعلیم رائج تھا اس میں اگر ایک طرف قرآن، فقہ، منطق اور کلام کو اہمیت دی گئی تھی تو دوسری طرف تاریخ،طبیعات، علم ہندسہ اور جغرافیہ کو بھی ایک بنیادی مقام دیا گیا تھا۔(خورشید احمد(س ن)؛ص 70-76)
- اس دور میں جس پیمانے پر تعلیم پھیلی ہوئی تھی آج اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے۔اس ملک میں جہاں تعلیم صرف پنڈتوں کا اجارہ تھی اور جہاں اگر شودر کے کان میں مذہبی کتب کے الفاظ پڑ جاتے تو سننے کی پاداش میں اس کے کانوں میں پگھلا ہوا گرم سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔ایسے علم دشمن ماحول میں مسلمانوں نے ہر طرف تعلیم کو عام کیا اور پورا ملک علوم وفنون کا گہوارہ بن گیا تھا۔
- مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ خالص عوامی تھا۔حکومتیں تعلیم کے فروغ کیلئے بے پناہ روپیہ خرچ کرتی تھیں اور ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی تھیں لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیم کا نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔
- ایک طرف یہ آزادی تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا یہ عالم تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔(نذیر احمد، خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی، ڈاکٹر 1987ء؛ص 13)
- نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی بلکہ طلبہ کے بود وباش اور خورد ونوش کا بھی پورا انتظام کیا جاتا تھا۔جیب خرچ کیلئے غریب طلبہ کو سرکاری ذرائع اور امراء کی طرف سے وظائف دیئے جاتے تھے۔کچھ مدرسے تو ایسے تھے جو نہایت شان وشوکت کے ساتھ یہ ضروریات پوری کرتے تھے۔مدرسوں اور مساجد میں بڑی تعداد میں حجرے ہوتے تھے جو ہاسٹل کا کام دیتے تھے۔
- اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد اور شاگرد کا قلبی تعلق تھا۔تعلیم کا محور استاد تھا۔استاد کی حیثیت معلم اور مربی کی تھی۔اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ان کے ایثار وقربانی ،اخلاص اور تعلیمی انہماک کا حال پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کیسے کیسے قابل رشک نمونے تیار کر سکتا ہے اور کس کثیر تعداد میں۔(خرم جاہ مراد 1999ء؛ص 41)
- استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے تھے۔انھیں ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبہ کا

معیار علم ہی بلند نہ ہو ان کا معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں۔ اگر اس معاشرے میں تقویٰ، ایفائے عہد، عصمت وعفت، ایثار وقربانی، صلہ رحمی، اخلاق ومروت، ہمدردی واخوت کا دور دورہ تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا کردار ادا کرتی تھی۔

- اس دور کے سماج کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام میں جمود نہ تھا۔ یہ نظام نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد محض مسجدوں کے حجروں کی زینت نہ تھے بلکہ نظام حکومت حکمت ودانشمندی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ اگر درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے تو یہ نظام ان شخصیات سے پرکھا جاسکتا ہے جنھیں اس نے تیار کیا اور جنھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نام پیدا کیا۔ (مسلم سجاد 1992ء ص 195-197)

2.4 مسلمانوں کے دور انحطاط میں تعلیمی تصویر

1707ء میں عالمگیر کی وفات کے بعد اس عظیم الشان سلطنت میں دراڑیں پڑنے لگیں اور آہستہ آہستہ اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ حیدرآباد دکن میں دولت آصفیہ قائم ہوئی۔ روہیل کھنڈ میں حافظ رحمت خان فرخ آباد میں بنگش حکمران، بریلی ورام پور میں نواب علی محمد خاں اور نجیب الدولہ نے خودمختار ریاستوں کی بنیاد رکھی۔ ان تمام حکمرانوں نے علوم وفنون کی خوب سرپرستی کی اور علم کی شمع جہالت کے اندھیروں کو برابر مٹاتی رہی۔ سر تھامس منرو کے بقول جنوبی ہند میں ہر پانچ سو افراد کی آبادی کیلئے ایک سکول موجود تھا۔ (نوراللہ، سیّد اور نائیک 1951ء ص 4)

بمبئی کے بارے میں آر۔ وی۔ پرولیکر (R.V.Prulaker) لکھتا ہے کہ: کنڈیش کے علاقے میں ہر گاؤں میں ایک سکول موجود ہے۔ یہی حالت بنگال اور پنجاب کے بارے میں تھی (آر وی، پرولیکر 1939ء ص xiv)۔ مسلمانوں کے عہد میں نظام تعلیم کے بارے میں ہنٹر نے سب سے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: ملک ہمارے ہاتھوں میں آنے سے پہلے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہن وفراست کے اعتبار سے ہندوستان میں بڑی قوت رکھتے تھے ان کا نظام تعلیم اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا اور مسلمانوں کا نظام ہندوستان کے دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا۔ (ہنٹر، ڈبلیو۔ ڈبلیو 1968ء ص 157)

مغلیہ سلطنت کے دور عروج میں علم وفن کی اشاعت اس قدر وسیع پیانے پر ہوچکی تھی اور تعلیمی زندگی کی بنیادیں اتنی مضبوط ہوگئی تھیں کہ سیاسی انحطاط کے باوجود تعلیمی درس گاہیں زندہ ہی نہیں رہیں بلکہ بعض نے ترقی کی۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز جیسی بلند پایہ شخصیتیں اسی دور انحطاط کی پیداوار ہیں۔ سیاسی طور پر مرکز تو برابر کمزور ہوتا چلا گیا لیکن جو نئی سلطنتیں وجود میں آئیں ان میں اکثر حکمرانوں نے علم کی سرپرستی کی۔ انفرادی طور پر بھی بعض علماء نے اپنی زندگیاں

درس و تدریس کیلئے وقف کردیں (معین الحق 1965ء ص 464)۔ یہی نظام تعلیم تھا جس کے سانچوں میں ڈھل کر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسا اسلامی مفکر اور فلسفی نکلا۔ جس کی تعلیم نے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر جیسے علماء کرام پیدا کئے۔ (بحوالہ منظور احمد جاوید 1979ء ص 61)

شاہ اسمٰعیل شہید اور سیّد احمد بریلوی جیسے مجاہد اور اسلام کے سرفروش و محافظ، رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے بالغ نظر علمائے دین پیدا کیے۔ جن کی تعلیم و تربیت کی بدولت سرسید، نذیر احمد، حالی، شبلی، آزاد، ذکاء اللہ جیسے صاحب کمال، اہل علم، ایثار پیشہ افراد ملت اسلامیہ کو میسر آئے۔ برصغیر میں انگریزوں کے تسلط کے بعد تعلیم کا جو دور شروع ہوا وہ فی الحقیقت جدید علوم و فنون کا دور ہے لیکن اس دور میں بھی جدید علوم و فنون کی تعلیم کے جو قافلے تیار ہوئے ان کی رہنمائی کی باگ ڈور انہی بزرگوں کے ہاتھ میں تھی جنھیں دور گذشتہ کے دست تعلیم و تربیت نے بنایا اور سنوارا تھا۔ ان ہی بزرگوں نے علی گڑھ، لکھنو، لاہور، کلکتہ، کراچی، دکن وغیرہ میں جدید علوم فنون کی درس گاہیں قائم کیں۔ (ابو سلمان شاہجہان پوری 1973ء ص 17)

مسلمانوں کے دور میں مدرسوں میں عربی زبان ذریعہ تعلیم تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں مدرسے ملک میں قائم تھے جن سے ہر سال بے شمار لڑکے فارغ ہو کر نکلتے تھے۔ وہ سب عربی اچھی طرح جانتے تھے ان میں سے بہت سے اس کے بولنے پر قادر تھے۔ اس کے علاوہ لاکھوں مسلمان ہر سال حج کیلئے جاتے تھے۔ انہیں وہاں پر عربی ہی بولنی اور لکھنی پڑتی تھی۔ مسلمان اس زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ کچھ ہندو بھی اسے پڑھتے تھے اس لئے اسے ان معنوں میں غیر ملکی زبان نہیں کہہ سکتے جن معنوں میں اس زمانے میں انگریزی تھی جس کے جاننے والے پورے ملک میں گنتی کے چند ایک ہندوستانی تھے۔ سنسکرت بھی غیر ملکی زبان نہیں تھی لیکن مُردہ رہنے کی وجہ سے عوام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا صرف برہمن اسے سیکھتے تھے۔ (شبیر احمد 1983ء ص 195)

انگریز کے نافذ کردہ نظام تعلیم سے قبل اسلامی ہند میں خواندہ افراد کا اوسط پچاسی فیصد تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے زمانے میں صرف روہیل کھنڈ کے چند اضلاع میں پانچ ہزار علماء درس و تدریس میں مصروف تھے۔ اسی ہزار سے زائد مدرسے انگریزوں کی عملداری سے قبل صرف صوبہ بنگال میں قائم تھے۔ سندھ کے صرف ایک شہر ٹھٹھہ میں چار سو سے زائد دارالعلوم تھے۔ شہروں اور قصبوں میں ہر چار سو کی آبادی پر اور ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں ایک مدرسہ ضرور ہوتا تھا۔ (محمد نسیم عثمانی 1983ء ص 284)

انگریزی تعلیم کی تاریخ 1797ء سے شروع ہوتی ہے اس سے قبل جو نظام تعلیم مسلمانوں کا تھا وہ عمومیت و افادیت کے لحاظ سے اتنا وسیع تھا کہ کمپنی کے عہدے داروں نے بھی عرصہ تک اسے قائم رکھا۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی اس سے کامل طور پر مستفید ہوتے تھے۔ تعلیمی زبان عموماً فارسی تھی اور ہندوؤں کی قوم میں جو طبقہ تعلیم کا اجارہ دار بنا وہ بلا تامل یہ تعلیم حاصل کرتا اور فارسی میں نہیں بلکہ عربی میں بھی اسے دسترس ہوتی۔ انگریز کمپنی کی حکومت میں ملکی زبان فارسی اور فقہ اسلامی

بطور قانون حکومت رائج تھی اور عدالتی عہدوں پر تقریباً مسلمان ہی مامور ہوتے تھے۔(الطاف علی' بریلوی سیّد 1995ء' ص113)

دورِانحطاط میں سیاسی کمزوری کے ساتھ ساتھ فکری اور تعلیمی انحطاط کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔1707ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے ساتھ ہی مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ملک بھر میں والیانِ صوبہ جات اپنی اپنی جگہ خودمختار حکمران بن بیٹھے۔سعادت خان نامی ایک ایرانی امیر اودھ اورالہ آباد کا خودمختار حکمران بن بیٹھا (تھارن ٹن 1823ء' ص230 وبعدہ)۔یہ شخص شیعہ عقائد رکھتا تھاچنانچہ اس کے بعض اقدام سنی مکتب فکر کیلئے نقصان دہ ثابت ہوئے جس کے باعث ان علماء کی آواز دب کر رہ گئی جن کی زیادہ تعداد حنفی عقائد رکھتی تھی اور یوں پہلی بار ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہی دینی تعلیم کا وہ سلسلہ جو صدیوں سے جاری تھا ٹوٹتا ہوا معلوم ہونے لگا۔اودھ اورالہ آباد کے علاوہ جونپور، غازی پور،کوڑہ اور جہاں آباد ایسے شہر تھے جہاں دینی تعلیم کا اعلیٰ پیمانے پر اہتمام موجود تھا لیکن جب یہ علاقے سعادت خان کی قلمرو میں شامل ہوئے تو اس نے علماء اور مدرسین کو عطا کی گئی جاگیریں ،درسگاہوں کے اوقاف اور معافیاں وغیرہ بیک جنبش قلم ضبط کر لیں لہذا جو علماء صرف تعلیم وتعلم میں ہی مصروف رہتے تھے اور جاگیریں مل جانے کے باعث فکر معاش سے آزاد تھے اب نان جویں کو ترسنے لگے۔(طباطبائی'غلام حسین 1276ھ'ص484)

معاشی بدحالی نے انھیں دیگر ذرائع معاش کی تلاش پر مجبور کر دیا اور یوں مذہبی درسگاہیں ویران ہو کر رہ گئیں۔ درس وتدریس کا رواج اور رجحان بتدریج کم ہوتا چلا گیا اور لوگ مذہبی کتابیں پڑھنے کی بجائے فن سپاہ گری اور دیگر معاشی مشاغل کی طرف متوجہ ہو گئے۔مذکورہ بالا علاقوں میں چونکہ متعصب حکومت قائم تھی لہذا شیعیت کے فروغ کیلئے جبر واقتدار کا ہر جائز و ناجائز حربہ روا رکھا گیا(محمد مصلح الدین 1988ء'ص 53-54)۔اوقاف اور جاگیریں صرف ان مدارس اور اساتذہ کیلئے مختص ہو کر رہ گئیں جنھوں نے حکومت کے حسب منشاء عقائد کو اپنایا۔حنفی العقیدہ علماء اور مدرسین ان سہولتوں سے ہمیشہ کیلئے محروم کر دئے گئے۔ان اقدامات کے نتیجے کے طور پر پوری ریاست اودھ میں تعلیمی مراکز ویران ہو گئے۔اہل علم افلاس کی چکی میں پسنے لگے۔تعلیم وتعلم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔علماء کی ایک بڑی تعداد نے بے روزگاری سے تنگ آ کر شیعیت اختیار کر لی۔چنانچہ وہ ریاست جہاں حنفی ہی حنفی تھے یکسر شیعوں سے بھر گئی۔(شاہ ولی اللہ 1887ء'ص2)

ریاست اودھ کی صورت حال سے قطع نظر ،بحیثیت مجموعی برصغیر میں شیعہ علماء کی تعلیمی خدمات بھی یکساں قابل تحسین ہیں۔ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں شیعہ مدارس قائم ہوئے۔ان میں شیعہ سنی طلبہ بلاتفریق عقاید تعلیم حاصل کرتے تھے(طفیل احمد منگلوری 1945ء'ص 131)۔مسلمانوں کا دورِانحطاط برصغیر میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مسلسل سیاسی عروج کا دور تھا۔کمپنی نے اپنے اقتدار کے ابتدائی دور میں رعایا کی تعلیم پر کوئی توجہ نہ دی۔حقیقتاً کمپنی اس وقت تعلیمی فرائض کو اپنے انتظامی معاملات کا حصہ تصور نہ کرتی تھی۔اول تو وہ کسی واضح سیاسی برتری سے محروم اور دوم یہ کہ اس کی علاقائی خودمختاری کا حتمی طور پر تعین نہ ہوا تھا۔اس کا زیادہ تر کاروبار ریاست شاہ عالم کی بخشی ہوئی دیوانیوں کے سہارے انجام

پاتا تھا یہی وجہ تھی کہ کمپنی نے تعلیمی امور کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔البتہ 1780ء میں وارن ہسٹنگز نے کلکتہ میں مدرستہ العالیہ کے قیام اور 1791ء میں بنارس میں سنسکرت کالج کا آغاز کر کے یہ سکوت توڑا جو کمپنی نے اختیار کر رکھا تھا (شارپ 1920ء ص 7-9)۔ان مدارس کا نصاب خالص مشرقی نوعیت کا تھا اوران کے قیام کا مقصد بالترتیب مسلمانوں اور ہندوؤں کو کمپنی کی عدالتی انتظامیہ میں مختلف عہدوں پہ کام کرنے کیلئے تربیت دینا تھا۔(عبدالرشید خان 1986ء ص 40)

اٹھارہویں صدی کے خاتمہ پر 1797ء میں سر چارلس گرانٹ نے جو کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کا ممبر اور عرصہ تک ہندوستان میں رہ چکا تھا اس ملک میں اشاعت تعلیم پر ایک رسالہ لکھ کر 1797ء میں کورٹ کے سامنے پیش کیا جس کا موضوع تھا کہ ابتداءً برصغیر میں ہندوستانی زبان کے ذریعے تعلیم دی جائے اور انگریزی بتدریج رائج کی جائے۔جس طرح مسلمانوں نے فارسی جاری کی تھی ۔اسی طرح کمپنی کو انگریزی جاری کرنی چاہیے (نوراللہ' سیّد اور نائیک 1956ء ص 66)۔اسی زمانے میں ایک مشنری ولیم کیری (William Carey) نامی نے سیرام پور میں یورپین اور ہندوستانی لڑکوں کیلئے مدرسے جاری کئے اور ایک مطبع قائم کر کے ہندوستانی زبانوں میں انجیل کی اشاعت کی ۔(ایل' پی روات 1917ء ص 182)

پھر ایک انگریز نے جو 1800ء سے کلکتہ میں مقیم تھا، راجہ رام موہن رائے کی شرکت عمل سے ایک کالج قائم کیا جو ہندو کالج کے نام سے مشہور رہا۔یہ کالج ابتدائی زمانے میں قطعی طور پر ایک مذہبی اکھاڑا تھا۔اس کے اساتذہ مذہب میں آزادخیالی کو ترقی دینے کے حامی اور مبلغ تھے ۔یہ کالج ہندو مذہب پر کاری ضرب لگانے کا ایک مورچہ بن گیا۔اس کے اساتذہ اور ہندو، مذہب پر جارحانہ انتقاد کرتے تھے۔خود بانی کالج (ڈیوڈ) تمام مذہبی عقائد کا منکر تھا۔راجہ رام موہن رائے ہندو مذہب کا سخت نکتہ چیں تھا ۔وہ عرصہ تک عیسائی اور موحدین کی عبادت میں شریک ہوتا رہا اور بالآخر ایک جدید مذہب ''برہموسماج'' کا بانی ہوا ۔وہ مغربی تعلیم کا سرگرم حامی اور قدیم علوم کے احیاء کا سخت مخالف تھا۔(الطاف علی بریلوی سیّد 1995ء ص 114' 115)

دور انحطاط میں تعلیمی خدمات کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اوران کا خانوادہ خاص طور سے ممتاز ہیں۔ اس آخر زمانے میں مسلمانوں کی انتہائی خوش نصیبی تھی کہ شاہ کے صاحبزادے بھی ستاروں کی مانند درخشاں اور تاباں ہوئے۔ چنانچہ سب سے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز آفتاب ہند کے لقب سے مشہور ہوئے دیگر صاحبزادوں کے اسماگرامی شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالغنی ہیں جنہوں نے اپنے علوم کی روشنی سے ہندوستان کو منور کیا اور سب سے پہلے قرآن پاک کا ترجمہ اردو میں کیا جو اس وقت تک صرف فارسی میں تھا۔ان بھائیوں کے بعد بھی اس خاندان میں نہایت اعلیٰ پایہ کے علماء گزرے جن میں سے شاہ محمد اسحاق ،شاہ محمد یعقوب ،شاہ عبدالحیٔ اور محمد اسمٰعیل شہید زیادہ نمایاں ہیں۔دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ کلکتہ، مدارس اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہر اور قصبات علمی زندگی کے سرچشمے تھے ۔اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں کوئی قصبہ نہ ہوگا جو علماء اوران کی درس گاہوں سے خالی رہتا ہو۔(طفیل احمد منگلوری 1945ء

ص130، 131)

شاہ ولی اللہ کی مجددانہ مساعی کو درج ذیل نکات کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے:

- ہمایوں کے زمانے ہی سے شیعیت کا زور شروع ہوگیا تھا اور روز بہ روز بڑھتا ہی رہا۔شاہ ولی اللہ نے ''ازالۃ الخفا'' لکھ کر عملی طور پر حجت تمام کردی،نیز اسلامی حکومت کی خصوصیات اجاگر کیں۔
- اب تک علماعلم کلام ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔شاہ ولی اللہ نے انہیں فقہ کی طرف توجہ دلائی اور اسرار شریعت پر ''حجۃ اللہ البالغہ'' لکھ کر ان کے خیالات کی تصحیح کی۔(شاہ ولی اللہ 1953ء ص114-116)
- بارھویں صدی ہجری سے پہلے ہندوستان کے علمی و دینی حلقوں میں قرآن کریم کی تعلیم گویا نصاب سے خارج تھی۔انہوں نے اصول تفسیر میں ایک گران قدر کتاب ''الفوز الکبیر'' لکھ کر کتاب اللہ کے درس و مطالعہ کی دعوت دی۔ساتھ ساتھ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کرکے عام لوگوں کیلئے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی راہ کھول دی۔
- تقلید جامد کے خلاف آواز بلند کی اور تحقیق واجتہاد کے عملی نمونے پیش کیے۔نیز مجتہدین کے باہمی اختلافات پر روشنی ڈالی اور ائمہ کے مختلف فیہ اقوال کے درمیان تطبیق کی کوشش کی۔حجۃ اللہ البالغہ اور الانصاف میں اس باب کے خاص مباحث ہیں۔ان کتابوں کے مطالعہ سے ذہن خود بخود کتاب وسنت کی طرف مائل ہوتا ہے اور طبیعت تقلیدِ جامد سے انکار کرتی ہے۔(خلیق احمد نظامی 1950ء ص42-44)
- حدیث نبوی ﷺ کا خزانہ عام کرنے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کیا۔موطا امام مالک کی عربی و فارسی میں دو شرحیں لکھیں، دوسری چھوٹی تصنیفات کے علاوہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑ گئے جن کے فیض علم سے ہندوستان کا چپہ چپہ ''حَدَّثَنَا اور اَخبَرَنَا'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔
(مسعود عالم ندوی 1987ء ص18-19)

مسلمانوں کی تعلیم کو ان کی قومی جڑوں سے کاٹ ڈالنے کی ذمے داری میکالے پر عائد ہوتی ہے۔1844ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں انگریزی تعلیم یافتہ افراد کو ترجیح دی جائے گی۔اس سے مسلمانوں کی حالت مزید مخدوش ہوگئی۔مسلمان اپنے روایتی مکاتب کی حاصل کردہ تعلیم پر مطمئن رہے اور مغربی تعلیم کی طرف دھیان نہ دیا۔ان کے برعکس ہندوؤں نے بڑی تعداد میں مغربی تعلیم سے استفادہ شروع کردیا۔اس طرح برطانوی نظام تعلیم مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کیلئے زیادہ مفید ثابت ہوا۔(ضیاءالدین احمد،پروفیسر 1997ء ص vi)

انگریزی تعلیم کا اجارہ اس امر کی واضح علامت تھا کہ کمپنی کی حکومت عیسائیت کو فروغ دینا چاہتی ہے۔شہنشاہ ہند سے کمپنی کے معاہدہ 1765ء کی رو سے کمپنی فارسی کو دفتری زبان بنانے کی پابند تھی۔کمپنی کی حکومت کا طرزِ عمل اس معاہدے کے منافی تھا۔مزید برآں کمپنی نے مسلمانوں کے مدارس کے طلبہ کے وظائف بند کرڈالے اور پابندی لگادی کہ تمام روپیہ انگریزی تعلیم کی اشاعت پر خرچ کیا جائے۔اس پر مسلمانان کلکتہ نے جمع ہوکر ایک درخواست تیار کی جس پر قریب آٹھ ہزار

آدمیوں نے دستخط کیے(الطاف حسین' حالی مولانا 1903ء ص 64)جن میں جملہ معزز عالم،مولوی اور رئیس شامل تھے اور اسے گورنمنٹ میں پیش کیا۔اس عرضی میں بعد بیان ان دلائل اور اصولوں کے جو گورنمنٹ نے اس نئی تدبیر تعلیم میں اختیار کیے تھے انہوں نے یہ صاف بیان کیا: ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی کرنے کا ہے اور انگریزی تعلیم پر اس قدر کلیتاً توجہ کرنے اور علوم اہل اسلام اور اہل ہند کو بند کرنے سے صرف یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو عیسائی ہو جانے کی ترغیب دیں اور اس طرح کلیتاً انگریزی پر توجہ کرنا صرف ایک تدبیر اشاعت دین عیسوی کی قرار دی ہے۔ (الطاف علی' بریلوی سید 1995ء،ص 124،125)

انگریزوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت اگر ہندوستان میں رہی تو وہ ہماری حکومت فنا کر دیں گے۔اس لئے انہوں نے تعلیم گاہوں کو ملیا میٹ اور تعلیم کو نیست و نابود کر دیا اور تعلیم کی تمام موقوفہ زمینوں کو 1838ء میں سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ولیم ڈگبی پراسپرس برٹش انڈیا میں لکھتا ہے:میرے خیال میں انسانی تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ معدودے چند اغیار چھ کروڑ آبادی کے ملک پر حکمرانی کر سکیں جسے آجکل رائے کی بادشاہت کہتے ہیں اس لئے جوں ہی وہ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تعلیم کی تاثیر سے ان کے قومی اور مذہبی تفرقے دور ہو جائیں گے جس کے ذریعہ سے اب تک ہم نے یہ ملک اپنے قبضہ میں رکھا ہوا ہے۔یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف کرنا اور علی ہذا القیاس تعلیم کا اثر یہ ضرور ہوگا کہ ان کے دل بڑھ جائیں گے اور انہیں اپنی طاقت سے آگاہی ہو جائے گی۔(لالہ لاج پت رائے 1927ص 109)

اسی بناء پر انگریزوں نے تعلیم اور تعلیم گاہوں کو برباد کیا اور چونکہ ان کا نصب العین زیادہ سے زیادہ مالی منافع حاصل کرنا تھا اس لئے بھی انہوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینا اپنے مقاصد کے خلاف سمجھا۔بہر حال تھوڑے ہی عرصہ میں جبکہ تعلیم گاہیں مٹ گئیں اور ان کی جگہ دوسرے اسکول اور کالج وغیرہ قائم نہ کئے گئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگ آہستہ آہستہ وفات پا گئے تو چاروں طرف ہندوستان میں جہالت اور نادانی کا دور دورہ ہو گیا۔چنانچہ 1823ء میں الفنسٹن اور الیف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کا اقتباس یہ ہے:انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے۔ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹا لیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے یہ الزام دور کرنے کیلئے کچھ کرنا چاہیے۔(طفیل احمد منگوری 1945ء ص 109)

ہندوستان کو ہمیشہ غلام رکھنے کی ہوس اور اسے ہمیشہ لوٹتے رہنے کی ملعون خواہش کی وجہ سے انگریز ہمیشہ یہی پالیسی رکھتے رہے کہ ہندوستانیوں کی ذہانت بالکل برباد کر دی جائے ان میں علمی بیداری پیدا نہ ہونے دی جائے ان کے ہر قسم کے کمالات فنا کر دیئے جائیں اور انکو غلامی کی بدترین خدمت گزاریوں اور کاشتکاریوں وغیرہ ہی میں ہمیشہ مبتلا رکھا جائے تا کہ ان کی برتری ہمیشہ قائم رہے اور وہ ہندوستان کے اعلیٰ حاکم بنے رہیں۔یہی وجہ ہے کہ 1792ء میں جب مسٹر ولبر فورس نے پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقیدے کی عبادت اور تعلیم کے

ذرائع مہیا کئے جائیں اوراس مقصد کیلئے وقتاً فوقتاً پادری بھیجے جائیں تو مالکان ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان تجاویز کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ: ایک مذہب کے قائم ہوجانے سے انسانوں کے مقاصد متحد ہوجاتے ہیں اور اگر یہ ہوگیا تو ہندوستان میں انگریزوں کی برتری کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لوگوں کو اپنے مذہب میں لانے کا اصول اس اٹھارہویں صدی میں خلاف مصلحت ہے۔ اگر چند لاکھ عیسائی بھی وہاں ہوگئے تو اس سے سخت مصیبت آجائے گی۔ امریکہ میں درسگاہیں اور کالج قائم ہونے کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس طرح جب نوجوان پادری اندرون ہند میں پھیلیں گے تو کمپنی کے فوائد کا خاتمہ ہوجائے گا۔ جس ہندوستانی کو تعلیم حاصل کرنی ہو وہ انگلستان چلا آئے۔ (میجر باسو 1930ء، ص 203)

گویا سب سے بڑا مقصد ان ممبران کا یہ رہا کہ انگریز حکام کو اپنے دفاتر میں کلرک اور ترجمان مہیا ہوجائیں۔ انگریزی تہذیب وکلچر ہندوستانیوں میں رائج ہوکر انہیں اخلاق قدیمہ اور روحانیت ومذہبیت سے دور جبکہ انگریزی اخلاق خبیثہ اور ان کے دوغلے پن سے نزدیک کردے۔ ان میں دنیا طلبی، خودغرضی اور نفاق کی ایسی سپرٹ آجائے جس کی علمبردار تمام یورپین اقوام سے بڑھ کر برطانیہ ہے۔ چنانچہ لارڈ میکالے اور اس کی کمیٹی اپنی تعلیمی اغراض ومقاصد اور ان کی اسکیم کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل کلمات تحریر کرتی ہے: ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔ (میجر باسو 1931ء، ص 105)

اسی کے ساتھ ساتھ وہ رائے جو لارڈ میکالے کے قلب کے اندر چھپی ہوئی تھی وہ وہ تھی جو اس نے اپنی والدہ کو ایک چٹھی میں لکھ کر بھیجی تھی اس کے الفاظ ہیں: اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے۔ کوئی ہندو جو انگریزی داں ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت کے ساتھ قائم نہیں رہتا۔ بعض لوگ مصلحت کے طور پر ہندو رہتے ہیں مگر بہت سے یا تو مواحد ہوجاتے ہیں یا مذہب عیسوی اختیار کرلیتے ہیں میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر تعلیم کے متعلق ہماری تجاویز پر عملدرآمد ہوا تو تیس سال بعد بنگال میں ایک بت پرست بھی باقی نہ رہے گا۔ (تھامسن اور گیریٹ 1934ء، ص 319)

چنانچہ ان مقاصد کا نتیجہ بہت تھوڑے عرصہ میں مل گیا اور ان کالجوں، اسکولوں، یونیورسٹیوں سے جوڑ کے فارغ ہوکر نکلے وہ اپنے اسلاف کے مذہب اور ان کے طریقوں سے بیزار اور متنفر تھے۔ چونکہ عیسائی مذہب میں ایسی معقولیت اور جاذبیت نہ تھی کہ وہ اپنی طرف ان کو کھینچ سکے نیز خود انگریز بھی عموماً اس مذہب پر قائم نہیں تھے انکی عیسائیت صرف قومیت کے درجہ تک تھی۔ عمل اور عقیدہ میں کوئی میل یا تاثر نہیں تھا۔ اس لئے وہ الحاد اور لادینیت کی دلدل میں پھنس کر اخلاق حسنہ اور خداترسی سے بالکل دور ہوگئے۔ ہنٹر، ڈبلیو۔ ڈبلیو کہتا ہے: ہمارے اینگلو انڈین اسکولوں سے کوئی نوجوان خواہ ہندو ہو یا مسلمان ایسا نہیں نکلتا جو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو ایشیاء کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس بستہ حقائق کے مقابلہ میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہوجاتے ہیں۔ (ہنٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو 1968ء، ص 202)

الغرض باوجود اس شوراشوری اور اتنی تعلیمی جدوجہد کے مظاہروں، کمیشنوں، کمیٹیوں، اسکیموں کے اعلانات،

کالجوں، یونیورسٹیوں اوراسکولوں کی بندباگی کے جب 35برس کے بعد مردم شماری ہوئی تو تمام ہندوستان میں خواندہ لوگوں کا تناسب خواہ وہ اُردو جانتے ہوں یا انگریزی یا فارسی یا ناگری وغیرہ 3.2فیصد پایا گیا۔ وہ انگریزی نظام جو نہایت بلند بانگ دعووں کے ساتھ 1763ءیا اس کے قریبی زمانہ سے شروع کیا گیا تھا جس کے محاسن اور انسانی خدمات کے ہمیشہ راگ گائے جاتے رہے سو برس سے زائد مدت میں ہندوستان میں خواندہ لوگوں کی تعداد صرف 3.2 فیصد پیدا کر سکا۔اس سے انگریزوں کی سچائی اور انسان دوستی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔حالانکہ بقول مسٹر لڈلو (Ludlow) اورڈاکٹر لیٹنر ودیگر ماہرین تعلیم انگریزی حکومت سے پہلے عام طور پر بکثرت لوگ خواندہ تھے۔پس کم از کم 51فیصد خواندہ کا اوسط ہونا چاہیے۔(لڈلو1958ء ص208-209)

پھر 1871ء میں اس اوسط کا پایا جانا کیا صریح طور پر دلالت نہیں کرتا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی اغراض کیلئے علم اور اس کی درس گاہوں کو دشمنی کی نظر سے دیکھ کر برباد ہی کرنے کا سلسلہ ہمیشہ رکھا اور جو کمیشن وکالج وغیرہ کی حکایات سامنے رکھی جاتی تھیں وہ محض دکھاوے اور طفل تسلی کیلئے تھیں۔1871ء سے 1921ء تک پچاس برس کے عرصہ میں خواندہ لوگوں کی تعداد کا اوسط اگر جو کچھ بڑھا تو وہ صرف 4فیصد تھا۔کیونکہ 1921ء میں خواندہ لوگوں کی تعداد 7.3فیصد تھی۔سوویت روس نے صرف پچیس برس میں یعنی 1918ء سے لے کر 1941ء تک 8فیصد سے 80فیصد یا اس سے زائد تعلیم یافتہ بنا دیئے۔جاپان نے ایک صدی سے کم میں اپنے ملک میں 90فیصد سے زیادہ تعلیم یافتہ بنا دیئے اور ایسی حیرت انگیز ترقی کی کہ یورپ کی حکومتیں اس سے لرزہ براندام ہوگئیں مگر انگریزی حکومت تقریباً پونے دوسو برس میں یعنی 1765ء سے لے کر 1931ء تک دس فیصد تعلیم یافتہ نہ بنا سکی۔(روزنامہ مدینہ'9۔جون 1943ء ص2)

کافی عرصہ تک ہندوستان میں جبریہ تعلیم کا مسئلہ چلتا رہا مگر سب سے بڑی رکاوٹ اس کے راستہ میں یہی رہی کہ اس کام کیلئے کافی سرمایہ نہیں ملا۔جب بھی تعلیم پر سوال اٹھایا گیا تو یہی جواب ہوتا تھا کہ بجٹ میں گنجائش نہیں ہے حالانکہ ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ کے قریب فوج پر اور اسی طرح بڑی بڑی رقوم پولیس وغیرہ پر صرف کی جاتی رہیں جن کی غرض صرف اس قدر تھی کہ برطانوی حکومت کی سطوت اور جبروت قائم رہے اور اس سے رعایا کا ایک ایک فرد حکام کے چنگل میں پھنسا رہے۔سر جان سائمن اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے:ہندوستان کے مشکلات کی جڑ بالیقین فوج ہے۔مرکزی حکومت ہند کے موجودہ اخراجات کا ساڑھے باسٹھ فیصد دفاع پر صرف ہوجاتا ہے جو دنیا بھر سے زائد صرفہ ہے۔تمام مملکت برطانیہ کی نسبت دوسے تین گنا تک ہندوستان دفاع پر زائد صرف کرتا ہے۔یہ بھی قابل ذکر ہے کہ 1913ء اور 1928ء میں برطانیہ عظمیٰ کے مصارف جنگ 49فیصد بڑھے۔نوآبادیات کے 33فیصد مگر ہندوستان کے اعداد اس مدت میں دوگنے ہوگئے۔واقعہ یہ ہے کہ انگریزی افواج کے اخراجات ہندوستان میں ہیبت ناک ہیں۔ایک انگریز سپاہی کا صرفہ ہندوستانی سپاہی سے چوگنا بلکہ پانچ گنا زیادہ ہوتا ہے۔توپ خانہ اور ہوائی فوج میں ہندوستانی کو کمیشن ملنا ممنوع ہے۔(ہندوستانی ٹائمز'جولائی 1936ء ص4)

یوں کمپنی کی حکومت ہی کے دوران مسلمانوں کی تعلیم خطرے سے دوچار ہوگئی۔ پھر 1857ء میں جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار بالکل ختم ہوگیا اور وہ انگریزوں کی غلامی میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے تو ان کی تعلیم وتہذیب کو لاحق خطرہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اس صورت حال میں مسلمانوں نے تعلیمی میدان میں استقلال کی مختلف کوششیں کیں جن کی تفصیل آئندہ ابواب میں پیش کی گئی ہے۔ اس صورت حال کے پس منظر میں جھانکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جبکہ مسلمان سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے۔ ایک یہ کہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔ دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام عیوب کے ساتھ ان کے جسم اور قلب و روح پر مسلط ہو چکی تھی اور وہ ان قوتوں سے محروم کر دیے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنی تہذیب وثقافت برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس حالت میں مسلمانوں نے دیکھا کہ انگریز حکومت نے معاشی ترقی کا صرف ایک راستہ باقی رہنے دیا ہے اور وہ انگریزی تعلیم کا راستہ تھا۔ (عبدالرشید ارشد' ڈاکٹر 1995ء ص 21)

الختصر انگریزوں کی اس طویل مہم کا آخر کار وہی نتیجہ برآمد ہوا جو منطقی طور پر متوقع تھا یعنی علمائے دین نے دینی تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور دینی مدارس اُجڑ کر رہ گئے۔ خود مسلمان دینی تعلیم کے حصول سے کترانے لگے اور اپنے غیر ملکی آقاؤں کی خوشنودی کی خاطر مغربی علوم کی تحصیل کی جانب متوجہ ہوگئے۔ یوں ولیم ہنٹر کا یہ جملہ سچ ثابت ہوا کہ جو کام ہماری تلوار سے نہ ہو سکا وہ ہماری ڈپلومیسی نے کر ڈالا۔ حکومت تو خیر دینی تعلیم کا انقطاع چاہتی ہی تھی لیکن جب عامۃ الناس نے بھی سرپرستی سے ہاتھ اُٹھالیا تو دینی تعلیم کو زوال آ گیا۔ حکومت ایک قدم اور آگے بڑھی اور دینی علوم سے بہرہ مند حضرات پر ملازمتوں کے دروازے بند کر دیے۔ صرف انگریزی خواں طبقہ ہی ملازمتوں کا اہل قرار پایا۔ عربی، فارسی میں بدرجہ کمال ادراک رکھنے والے لوگ کلرکی تک حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ ملازمتوں کیلئے ہندو نامزد کئے جانے لگے۔ (ہنٹر' ڈبلیو۔ ڈبلیو 1945ء ص 162)

دینی مدارس کے مصارف اہل ثروت اور مخیّر حضرات کے تعاون سے پورے ہوتے تھے۔ جاگیریں اوقاف اور معافیوں کی صورت میں مدارس کے نام تھیں۔ اس کے علاوہ مسلمان حکمران بھی دینی مدارس کو بطور امداد عطیات وغیرہ دیتے رہتے تھے۔ یہ دینی مدارس کا ایک خودکار نظام تھا جس کے باعث دینی مدارس کو کبھی مالی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا جب انگریز برصغیر پر غالب آئے تو دینی مدارس کا یہی خودکار نظام دینی تعلیم کو ختم کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا۔ چنانچہ 1793ء میں ایک قانون بازیافت نمبر 19 وضع کیا گیا جس کی رو سے دس بیگھہ سے زائد زمین جو شاہی سند کے بغیر ہو وہ بحق سرکار کمپنی بہادر بازیافت سمجھی جائیگی۔ قانون نمبر 37 کے مطابق 1765ء سے پہلے کے عطیات شاہی جن کی سند دخیل کار کے پاس ہو بحال رہیں گے بصورت دیگر سب زمینیں بحق سرکار "بازیافت" کر لی جائیں گی۔ (محمد مصلح الدین' ڈاکٹر

1988ء ص 60، 61)

بازیافت بظاہر بےضرر سالفظ تھا لیکن اس میں چھپی انگریزوں کی مکاری اس وقت ظاہر ہوئی جب معافیاں اوراوقاف ضبط کئے جانے لگے۔وہ خاندان جوصد ہا سال سے شغل درس وتدریس کی وجہ سے ممتاز تھےاور جن کی معاشی ضروریات دینی مدارس سے منسلک جاگیروں سے پوری ہوتیں تھیں، آنِ واحد میں مفلس اور قلاش ہوکررہ گئےاس ضمن میں مشنری پادریوں نے اہم رول ادا کیا انہوں نے ایسی تمام چھوٹی چھوٹی معافیاں اوراوقاف جوحکومت کی نظر سے بچ رہے تھے ضبط کروانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔حکومت کےان اسلام دشمن حربوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ تعلیم خصوصاً دینی تعلیم بالآخر مفقود ہوکرنہ ہونے کےبرابر رہ گئی۔(خوندکار فضل ربی ؔمفتی 1973ء ص 99)

باب سوم

برطانوی دور میں مسلمانوں کے حالات

مسلمانوں کا تعلیمی و سیاسی پس منظر جان لینے کے بعد برطانوی دور میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریکوں کا جائزہ لینے کے لئے ان کی عمومی و تعلیمی حالت کا ادراک بھی ضروری ہے کہ اس سے نہ صرف ان تحریکوں کا فہم و شعور واضح ہو جاتا ہے بلکہ ان تحریکوں کے اسباب و علل بھی سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

3.1 برِصغیر پر برطانوی تسلط

اس دور میں سیاسی و مذہبی اعتبار سے اہم ترین عنصر اجنبی قوم انگریزوں کا برصغیر پر سیاسی تسلط تھا۔ اس تسلط کا پس منظر پوری تفصیل سے گزشتہ باب میں بیان ہو چکا ہے۔ نظر مکرر کے طور سے اس کا حاصل یہ ہے کہ انگلستان کی ملکہ الزبتھ نے 1600ء میں لندن کے تاجروں کو مشرقی ممالک بشمول ہندوستان میں تجارت کا چارٹر دیا۔ اسی کے ساتھ انھیں متعلقہ ممالک میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے اور ان کی حفاظت کیلئے فوج رکھنے کا اختیار دیا گیا۔ کمپنی نے تجارت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں عیسائیت کی اشاعت بھی شروع کردی۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں مقبوضات حاصل کر کے سیاسی اختیارات بھی استعمال کرنے لگے اور انگریزی تعلیم نافذ کر کے ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو کمپنی میں ملازم رکھنا شروع کر دیا۔ (خالد یار خاں 1963ء ص 228)

1608ء میں پہلی مرتبہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے شہنشاہ جہانگیر سے سورت کے مقام پر اپنی تجارتی کوٹھی کھولنے کی اجازت حاصل کی۔ یہ اجازت کچھ عرصے کے بعد واپس لے لی گئی لیکن 1612ء میں دوبارہ دیدی گئی۔ 1615ء میں سر تھامس رو جہانگیر کے دربار میں آیا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے واسطے مراعات حاصل کرنے کے لئے تین سال تک دہلی میں مقیم رہا۔ شاہجہان کے دور میں ایک انگریز ڈاکٹر کی خدمات کے صلہ میں کمپنی کو تجارتی سہولتیں حقیقی معنی میں حاصل ہوگئیں۔ اس لحاظ سے 1650ء وہ سال تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی بغیر ٹیکس ادا کئے تجارت کرنے لگی۔ اس کے دفاتر ہگلی، سورت اور دیگر مقامات پر قائم ہوگئے۔ کمپنی نے کلکتہ کی بنیاد 1690ء میں ڈالی۔ (مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1970ء ص 120)

انگریزوں کا مدراس شہر اور اس کے نواح پر تسلط اٹھارہویں صدی کے پہلے ربع کے آخر تک قائم ہوگیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتداء ہی سے یہ پالیسی تھی کہ ہندوؤں کو عیسائی بنایا جائے تاکہ انہیں یہاں حکومت قائم کرنے میں مقامی لوگوں کا مخلصانہ تعاون حاصل رہے (ہنٹر ڈبلیو۔ڈبلیو 1945ء ص 188)۔ چنانچہ 1609ء میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے

صاف صاف اعلان کر دیا تھا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان میں ہر ممکن طریقے سے عیسائیت کو فروغ دیا جائے۔ 1698ء جب چارٹر کی تجدید ہوئی تو چارٹر ایکٹ کی ایک شق کے ذریعہ کمپنی پابند کر دی گئی کہ وہ اپنے ہر جہاز میں جو 500 ٹن یا اس سے زیادہ وزن کا ہو ایک پادری ضرور رکھے اور ہندوستان میں اپنی ہر کوٹھی میں بھی ایک پادری ملازم رکھے جس کے فرائض میں یہ بات شامل ہو کہ وہ ہندوستان میں جہاں رہیں وہاں کی زبان سیکھیں اور ہندوؤں کو جو کہ کمپنی کے ملازم یا محکوم ہوں، پروٹسٹنٹ فرقہ کے عیسائی بنائیں۔(نوراللہ' سید اور نایک 1951ء ص 52-53)

یہ لگ بھگ 1659ء کی بات ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے باہم صلاح مشورے سے یہ طے کیا کہ برصغیر میں عیسائیت کا پرچار کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ یورپ بھر سے پادری اور مشنری حضرات کی آمد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جنہیں حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور جنہیں مکمل تبلیغی سہولتیں مہیا کی گئیں (نوراللہ' سید اور نایک 1951ء ص 44)۔ انگریز کے اس پروگرام میں ہندوستان کی دیگر اقوام کیلئے تو کشش تھی اور انہوں نے عیسائیت اختیار کرنا بھی شروع کر دی تھی لیکن مسلمانوں کیلئے یہ معاملہ بالکل ہی مختلف تھا۔ مسلمان جو آخری الہامی کتاب کے حامل تھے جو اپنا ایک مخصوص طرز تمدن رکھتے تھے، جن کی اپنی ثقافت تھی، جو اپنا الگ اور منفرد سیاسی نظام رکھتے تھے اور جو بلا شرکت غیرے ایک ہزار سال تک ہندوستان کے حاکم رہے تھے وہ انگریز کی یہ چال ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کیلئے عیسائیت میں کوئی کشش نہ تھی چنانچہ مسلمانوں کے باب میں اپنی ناکامی کا بدلہ انہوں نے یوں لیا کہ اپنی تمام تخریبی سرگرمیوں کا رخ انہوں نے مسلمانوں کی طرف موڑ دیا۔ برصغیر میں انگریز ہمیشہ اپنی اس پالیسی پر کاربند رہے کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر ہمیشہ دبا کر رکھا جائے۔ علمی لحاظ سے جاہل اور معاشی نقطہ نظر سے قلاش رکھا جائے تا کہ ان کی جملہ صلاحتیں دب کر ختم ہو جائیں اور برطانوی اقتدار کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ ہو سکے۔(محمد مصلح الدین 1988ء ص 57)

مدراس کے کچھ حصوں پر قبضے کے بعد عیسائی مبلغوں کی ہمت افزائی ہونے لگی لیکن مشکل یہ تھی کہ خود عیسائی عقائد میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جن کے قدیم اور وحشی قبائل قائل ہوں۔ پندرہویں صدی ہی سے یہ کوششیں شروع ہو چکی تھیں لیکن جب دال بالکل نہ گلی تو فریب سے کام نکالنے کی کوشش کی گئی۔ مسیحی عیسائیوں نے سنسکرت میں ایک نیا اور پانچواں وید تیار کر کے پیش کر دیا۔ خود کو سفید برہمن ظاہر کیا اور بتایا کہ نیا وید بھگوان کی طرف سے ان پر اترا ہے اس میں عیسائیت کی خوبیاں بیان کی گئی تھیں۔ چند روز تو ہندوؤں کو بڑا اچنبھا رہا۔ اور اس کی تعلیم کے چرچے ہوتے رہے پھر غالباً بھانڈا پھوٹ گیا اور پادریوں کا داؤ خالی گیا۔ پھر 'ز' سے شروع ہونے والے الفاظ سے بھی کافی کام لیا گیا۔ یہ حربہ انگریزی حکومت کے اختتام تک چلتا رہا۔(شبیر احمد 1983ء ص 182)

1765ء میں جب شاہ عالم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک نمک خوار خدمت گزار کی حیثیت سے بنگال کا مالیہ وصول کرنے کی خدمت سونپی تو اسے بنگال میں ایک وفادار ملازم سرکار ہونے کی وجہ سے آئینی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اب اس کی ساری کاروائیاں جو کہ شہنشاہ دلی کے نام پر کی جاتی تھیں، عوام کی نظروں میں جائز ہو گئیں نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال حقیقی معنوں میں

انگریزوں کے اقتدار میں چلا گیا اس کے بعد ہی سے انگریزوں نے ہر شعبہ زندگی سے متعلق دوررس پالیسیاں مرتب کرنی شروع کردیں تا کہ پورے برصغیر کے وسائل کم از کم ایک سال تک انگلستان کیلئے مخصوص کئے جا سکیں۔ متعلقہ شاہی فرمان میں واضح الفاظ تھے کہ انگریزی کمپنی کی 'فدویت اور خدمات کی مراعات ہمارے مدِ نظر ہیں" گویا ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت دراصل بنگال میں مغل شہنشاہ کے وفادار حاکم کی تھی۔ مغل شہنشاہ عالم نے 12 اگست 1765ء کو ایک فرمان کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کے دیوانی اختیارات عطا کئے تھے۔ (تھامسن اور گیریٹ 1934ء، ص 90-91)

چنانچہ اس 'فدوی" کمپنی کیلئے کسی اخلاق اور قانون کی رو سے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے مہربان آقا کی نافرمانی کرتی۔ اس کے رائج کردہ نظام حکومت، نظم و نسق، سیاسیات، مالیات، تعلیم وغیرہ میں ادنیٰ درجہ کا تغیر بھی روا رکھتی۔ شہنشاہ دہلی کی منظوری کے بغیر کمپنی کی حکومت کے جاری کردہ تمام احکام، ضوابط اور قوانین کا کوئی آئینی جواز نہیں تھا۔ نسلی غرور انگریز کی فطرت ثانیہ ہے (ٹیمپل 1882ء ص 502)۔ اقوام عالم میں برہموں کے بعد انگریز ہی ایسی قوم ہے جس نے ہر جگہ نسلی منافرت کو ہوا دی ہے۔ انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی اعتراف کرتا ہے کہ: ساری دنیا میں یہ لعنت ہماری ہی لائی ہوئی ہے (محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ص 193-197)۔ اس وجہ سے اہل ہند کو انگریز کمتر اور ذلیل سمجھتا تھا۔ مزید ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ایشیاء میں پیہم فتوحات کی وجہ سے انگریز کے دماغ پر انتہائی تیز حاکمانہ نشہ چڑھ گیا۔ سفید فام اقوام کی برتری کا مزعومہ عقیدہ اس کے ایمان کا جزو بن گیا۔ وہ اپنی عالمگیریت کی مہم اور اس میں ہر قسم کے ظلم و ستم اور فریب و دغا کو جائز بلکہ برحق قرار دیتا تھا۔ اس لئے کہ ان فتوحات کا مقصد ایشیاء اور افریقہ کی اقوام کو "مہذب اور شائستہ" بنانا تھا۔ مہذب بنانے کا مفہوم اس کے نزدیک یہ تھا کہ تمام اقوام مسیحیت قبول کرلیں اور مغربی تہذیب میں پوری طرح رنگ جائیں۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس بات کی وضاحت کردی کہ ان کی یہ دلی خواہش ہے کہ ہر ممکن ذریعہ سے مسیحیت کو ہندوستان کے لوگوں میں پھیلایا جائے۔ (ساورکر وی۔ڈی 1909ء ص 51-52)

بقول سرسید رعایا کو یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ انگریزی حکومت ان کا دین مٹانے کے درپے ہے۔ اور انہیں مفلس کرکے عیسائی بنائے گی۔ سرسید کے نزدیک نوکریوں سے محرومی کی شکایت خاص طور سے مسلمانوں کو تھی کیونکہ ان کی روزی کا سب سے بڑا ذریعہ سرکاری نوکریاں تھیں یا وہ صوبہ داروں، سرداروں اور امیروں کے ہاں کام کرکے گزارا کرتے تھے۔ جب یہ لوگ نہ رہے اور ان کی صوبہ داریاں اور امارتیں چھن گئیں تو ملازمت پیشہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بیکار ہو گئی (اشتیاق حسین، قریشی 1987ء ص 286)۔ پھر جن اشخاص کو انگریزوں کے ہاں نوکری مل جاتی تھی وہ بھی خوش نہ تھے۔ اس بارے میں سرسید نے لکھا ہے: گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کو نہایت بے وقعت کردیا ہے۔ صاحب کا پیش کار صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی سے دل میں روتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ دراصل انگریز اور ہندوستانی مثل آگ اور سوکھی گھاس کے ہیں یا مثل پتھر کے دو ٹکڑوں کے ہیں۔ سفید اور کالے جن میں فاصلہ روز بہ روز

زیادہ ہوتا جاتا ہے۔اور یوں تصور کیا جاتا ہے کہ گویا ہندوستان میں کوئی جنٹلمین نہیں ہے ۔(احمد خان' سیّد سر 1955ء' ص 34)

انگریزوں کی ان سختیوں اور زیادتیوں کے سب سے بڑھ کر مسلمان ہی نشانہ بنے تھے کیونکہ 1857ء کے ہنگامے میں وہی پیش پیش تھے ۔چنانچہ سرسید نے اپنے رسالے میں جو اسباب بغاوت ہند گنوائے تھے۔ان کے متعلق ایک انگریز مسٹر لیکی نے بالکل ٹھیک لکھا تھا:اس دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت تھی (محمد سرور 1991' ص 18)۔جنگ پلاسی کے بعد بنگال پر کمپنی کا غاصبانہ قبضہ ہوتے ہی ملک کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ بہار، بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی ہاتھ آجانے پر سونے پر سہاگہ ہوگیا (محمد علی چراغ 1985ء' ص 46)۔بنگال کو کنگال بنادینے کی المناک داستان کا ایک باب یہ بھی ہے کہ دیوانی ملتے ہی کمپنی نے 1765ء میں لگان بڑھا کر ایک لاکھ چوہتر پونڈ کردیا جو کہ پہلے صرف اکیاسی لاکھ پونڈ تھا۔اس طرح جو روپیہ کھینچا گیا وہ کمپنی کے تمام مقبوضات بڑھانے میں کام آیا۔ چنانچہ جنگ پلاسی سے 1857ء تک کمپنی نے بیس جنگیں لڑیں، بے شمار ریاستوں کو ہضم کیا۔قتل وغارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔آخر یہ سلسلہ اودھ کے الحاق پر ختم ہوا۔(تھامپسن اور گیریٹ 1934ء' ص 102)

ادھر یہ ہورہا تھا کہ 1770ء میں قحط نے آدبایا جس کی ہولناکیاں اُن ہی زرخیز علاقوں کو برداشت کرنا پڑیں جو چند سال سے انگریزی چنگل میں تھے ۔اس قحط کی بدولت بنگال کا بدنصیب خطہ 20 سال بعد بھی غیر آباد جنگل کی مانند تھا (جواہر لال نہرو 1992ء' ص 386)۔بہار کے علاقوں کی حالت یہ تھی کہ روزانہ مرنے والوں کی تعداد خاص پٹنہ میں ڈیڑھ سو تک پہنچ گئی تھی ۔اطراف ونواح کا حال اس سے بدتر تھا۔پردہ نشین عورتیں اپنی اور بچوں کی جان بچانے کیلئے سربازار بھیک مانگتی تھیں ۔روزانہ سڑکوں پر ہزاروں نفوس مرتے تھے جن کی لاشیں کتے، گیدڑ اور گدھ کھاجاتے تھے ۔ندی میں لاشوں کی کثرت سے مچھلی بھی کھانے کے لائق نہ رہی تھی ۔اکثر جگہوں کی نصف آبادی اور اوسطاً تمام علاقوں میں ایک تہائی آبادی اس قحط سے کم ہوگئی ۔(عبدالرشید' خان پروفیسر 1986ء' ص 39-40)

یہ حال صرف بنگال یا بہار کا ہی نہ تھا بلکہ تمام انگریزی مقبوضات کا یہی عالم تھا۔برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے میسور کے متعلق کہا تھا کہ میسور کے باشندے ہندوستان میں سب سے زیادہ خوش حال ہیں ۔یہاں ٹیپو کی حکمرانی ہے۔ اس کے برعکس انگریزی مقبوضات صفحہ عالم پر بدنما دھبوں کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں کی رعایا قانونی شکنجوں میں جکڑی ہوئی پریشاں حال ہے (محمود احمد' بنگلوری (س۔ن)' ص 450 وبعدہٗ)۔1793ء میں کارنوالس نے آکر "بندوبست دوامی" رائج کیا جس سے کسان، کاشتکار اور زمیندار تباہ ہوگئے ۔اس بندوبست کا مقصد لگان بڑھانا تھا اور اس کی رو سے لگان ادا نہ ہونے کی صورت میں حکومت کو زمین فروخت کرنے یا قرق کرا لینے کا اختیار حاصل تھا۔اگر زمیندار مقررہ وقت پر سرکاری خزانے میں لگان کی رقم داخل کرنے میں ناکام رہتا تو اس سے کوئی سوال نہ پوچھا جاتا اور کوئی نوٹس یا مہلت دیے بغیر تمام جائیداد نیلام کرلی جاتی تھی ۔(ہنٹر' ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء' ص 159)

ہندوستان کی دولت وصنعت کے افسانے دنیا میں مشہور تھے اور بیرونی ممالک کے لالچی تاجروں اور سیاحوں کو یہ دل فریب داستانیں ہی کھینچ لاتی تھیں مگر "سفید درندوں" نے اس سونے کی چڑیا کو نہ صرف بے جان کیا بلکہ ہڈیاں اور گوشت بھی نوچ لیا (خورشید مصطفیٰ رضوی 1990ء ص 71)۔ بنگال پر تسلط سے پہلے انگلستان کے لوگ حکومت کو معمولی ٹیکس دینے کی صلاحیت سے بھی محروم تھے۔ اگر عوامی لیڈروں کو ملائے بغیر کوئی ٹیکس لگا دیا جاتا تھا تو اس کا وصول کرنا انتہائی دشوار ہو جاتا تھا۔ بنگال پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹنی شروع کردی جس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ حد تو یہ کہ کسانوں سے وصول کیے جانے والا لگان بطور نفع انگلستان منتقل کردیا جاتا تھا۔ (دت، رومیش 1950ء ص 263)

کمپنی کے تمام افسران راشی اور بے ایمان تھے۔ برطانوی حکومت کے علم میں لا کر اور اُس کی مرضی سے کروڑوں روپے یہاں سے لے جاتے اور انگلستان میں عیش کرتے۔ ایسے تمام افسران وہاں "نباب" (نواب) کہے جاتے۔ انھیں لوگوں میں چارلس گرانٹ بھی تھا۔ ابتدا میں وہ کسی کا نجی ملازم ہو کر بنگال پہنچا۔ پھر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کرلی۔ دولت میں خوب ہاتھ رنگے، بنگال ہی میں خوب داد عیش دی۔ یکا یک سخت بیمار ہو گیا۔ اچھا ہوا تو عاقبت بنانے کی سوجھی۔ مسیحی مبلغوں کی مدد کرنی شروع کر دی۔ 1790ء کے قریب ریٹائرڈ ہو کر انگلستان پہنچا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصص خرید کر ڈائیریکٹر بن گیا۔ بعد میں کئی مرتبہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کا چیئرمین اور ڈپٹی چیئرمین بنا۔ اس نے ایک جماعت بنائی جس کا مقصد ہندوستان میں عیسائیت کا فروغ تھا۔ (رحمٰن علی طیش، منشی 1910ء ص 127-129)

اس جماعت نے برطانوی حکومت پر زور ڈالنا شروع کیا کہ مسیحی مبلغوں کو ہندوستان روانہ کیا جائے تاکہ ہندوؤں کو عیسائی بنایا جا سکے۔ اس نے اس سلسلہ میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا۔ اس رسالہ میں اس نے انگریز قوم کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے ہندو اخلاقی پستی میں پڑے ہوئے ہیں اگر انھیں انگریزی کی تعلیم دے کر ان کے سامنے عیسائیت کے اصول رکھے جائیں تو وہ خوشی سے عیسائی ہو جائیں گے۔ اس سے برطانوی حکومت کو بھی فائدہ پہنچے گا اور ہندوؤں کو یہ فائدہ ہوگا کہ ہماری روشنی اور علم ان کو حاصل ہو جائے گا۔ انگریزی پڑھ کر وہ اپنی زبان چھوڑ کر انگریزی کو مادری زبان بنالیں گے پھر وہ ایک ایسی حکومت کی مخالفت کبھی نہیں کریں گے جو مذہباً عیسائی ہو اور جس کی زبان انگریزی ہو۔ (مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1971ء ص 75)

غرض ایسٹ انڈیا کمپنی کا ظاہری مقصد تجارت اور اصل مقصد ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ اور اقتدار کا حصول تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ کمپنی اسلامی ہند کے انتظامی معاملات میں مداخلت کرنے لگی حتیٰ کہ برطانوی استعمار کے پنجے ہندوستان کے سیاسی نظام میں پوری طرح گڑ گئے۔ استعمار کے اس عفریت سے ملک کو نجات دلانے کیلئے سید احمد شہید بریلوی میدان میں آئے لیکن ان کی تحریک جہاد بیگانوں کی ریشہ دوانیوں اور اپنوں کی عاقبت نااندیشیوں کی بدولت مئی 1831ء میں بالاکوٹ کے میدان میں ناکام ہوگئی (محمد نسیم عثمانی 1983ء ص 283)۔ 1857ء کی جنگ آزادی کا عظیم انقلاب انیسویں

صدی کی تاریخ کا اہم باب ہے تقریباً سو سال تک انگریز سیاستدان اور مورخ اس کی اصل حقیقت پر پردہ ڈالتے رہے اورغلط طور پر اس کو فوج کے سپاہیوں کے غدر کا نام دیتے رہے۔اب یہ کم وبیش ایک معروف حقیقت ہے کہ 1857ء کی جنگ غدر نہ تھی بلکہ یہ لوگوں کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانے کی قومی جدوجہد تھی۔(عبدالباری' پروفیسر (س۔ن)' ص545)

اس تحریک کا سب سے دل چسپ پہلو یہ تھا کہ سیاسی اور فوجی قائدین کے علاوہ اسے صوفیاء اور علماء کی بھی حمایت حاصل تھی جنھوں نے یہ بغاوت منظم کرنے میں اَن تھک کوششیں کی تھیں ۔انھوں نے مسلمانوں کو جہاد کیلئے آمادہ کیا، متعدد ہندو سرداروں اور فوج کے سپاہیوں کا تعاون حاصل کرنے اور اُنہیں اس میں شامل کرنے میں کامیاب ہوئے (محمد میاں' سیّد 1991ء ص40)۔ بے شک یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔اگر انقلابی اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تو اس سے ان کی قربانیوں کی اہمیت کسی بھی طرح کم نہیں ہوئی ۔ان ہزاروں نوجوانوں کے علاوہ جو لاتعداد مسلمان خاندان انگریز سپاہیوں اور افسران کے تشدد کا شکار ہوئے،وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں نے بغاوت کو منظم کیا تھا۔لہذا بغاوت کے بعد حکومت کی انتقامی پالیسی کا شکار بھی وہی تھے۔(ممتاز معین' پروفیسر مسز 1982ء ص111)

برصغیر پر برطانوی تسلط کے ارتقاء میں انگلستان کے بادشاہ ولیم چہارم کا دور(1830ء-1837ء) خاص طور سے قابل ذکر ہے۔اس عہد میں 1833ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی جو تجدید ہوئی اس کے ذریعے کمپنی کی تجارتی حیثیت ختم کرکے حکمران جماعت میں بدل دیا گیا (باری 1969ء ص286)۔ہندوستان کے تاج برطانیہ کے اختیار میں آجانے کے بعد مسلمانوں کیلئے اپنے وجود کا تحفظ اور بھی مشکل ہوگیا۔ 1871ء حکومت کے سیکرٹری ای ۔سی ۔بے ۔لے (E.C.Bayley) نے اپنے جائزے میں لکھا: کلکتہ میں مشکل سے کوئی ایسا دفتر ہے جس میں کوئی خلاصی، ہرکارے یا دفتری سے زیادہ کسی عہدے کی توقع کرسکتا ہے۔یہی بات ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں دہرائی ہے۔ (ہنٹر ڈبلیو۔ڈبلیو 1945ء ص162)

مسلمانوں کے لئے یہ ناگزیر اور ناقابلِ برداشت حالات برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور انتقال اختیار کے ساتھ ہی پیدا ہوگئے تھے۔ان ہی سے متاثر ہوکر حاجی شریعت اللہ اور حاجی محمد محسن نے فرائضی تحریک کے نام سے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا بلکہ بنگال کے مسلمانوں کو سنبھالا دیا تھا (طفیل احمد' منگلوری سیّد (س ن)' ص126)۔ حاجی شریعت اللہ کے مطابق نہ صرف سب انسان خدا کے سامنے مساوی ہیں بلکہ خود انسانوں کے اپنے درمیان بھی مساوات ہونی چاہئے ۔انہوں نے جاگیرداری کے ادارے پر بڑی کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ جاگیروں اور زمین کا اصل مالک خدا اور حکومت الٰہیہ ہیں ۔فرائضی تحریک نے مسلمانوں میں جاگیرداری، غیر ملکی حکومت کے استبداد اور ہندوؤں کے خلاف بحیثیت قوم شدید جذبات پیدا کردیئے ۔انہوں نے مسلمان مزارعین کو اس جرأت پر آمادہ کرلیا کہ وہ ہندو زمیندار کو دُرگا پوجا ٹیکس، داڑھی ٹیکس اور کوئی دوسرا ٹیکس ادا نہیں کریں گے۔انہوں نے بنگالی مسلمانوں کو ہندوانہ رسوم سے نجات دلانے کی

مقدور بھر کوشش کی۔(پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی جلد اول' 1970ء' ص 545 وبعدۂ)

حقیقت یہ ہے کہ بنگال کے مسلمانوں کو وقار اور عزت نفس کا سبق انہوں نے ہی سکھایا(ایم اے رزاق' ڈاکٹر 1986ء' ص 44-45) اور ان کا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں سے تحریک جہاد کے واسطے سے روحانی رابطہ قائم کر دیا سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں بے شمار بنگالی اور بہاری مسلمان شریک تھے۔انگریز نے اس کا انتقام یوں لیا کہ فرائضی تحریک کے زعماء پر مقدمے چلائے گئے(غلام رسول' مہر 1956ء' ص 371-425)۔بنگال پر انگریزوں نے محصول عائد کیا تو اسکا صاف یہ مطلب تھا کہ مسلمان شرفاء کے مقابلے میں انگریز ہندو مہاجنوں کو خوشحال بنانا چاہتے تھے۔اس کے ردعمل کے طور پر مسلمانوں میں انگریزوں اور ہندوؤں دونوں کے خلاف فرقہ وارانہ جذبات ابھرے اور انیسویں صدی کی تحریک احیائے اسلام برصغیر کی تحریک کا ایک اہم واقعہ بن گئی اور غیر معروف بنگالی مسلمان کاشتکاروں کا بویا ہوا بیج تناور درخت بن کر مشرقی بنگال پر چھا گیا۔یہ اسی کا اثر تھا کہ بیسویں صدی کے نصف اول میں جب مسلمان قوم نے اپنی جدوجہد کی آخری منزل پاکستان کو قرار دیا تو برصغیر کے تمام ترحصّوں کے مسلمانوں نے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر اس قومی جہاد میں حصہ لیا۔1840ء سے 1857ء تک کے درمیانی حصّہ میں مسلمان تعلیم یافتہ طبقے میں وسیع پیانے پر بیداری کی لہر اٹھی۔اس بیداری کا اظہار اردو زبان وادب اور صحافت کے ذریعہ ہوا۔اس دور کے اردو جرائد غیر ملکی حکومت کے بارے میں مسلمانوں کے روّیے کے بہترین مظہر ہیں۔(محمد میاں' سیّد 1991ء' ص 221 وبعدۂ)

1857ء میں جنرل بخت خاں، جنرل عظیم الدین، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی اور بے شمار سرفروشوں نے ملی غیرت کا ثبوت دینے کیلئے آزادی کی جنگ لڑی لیکن ہار گئے۔اس ہار میں غیروں سے زیادہ اپنوں کی کارفرمائیوں کو دخل تھا جبکہ ہندوؤں کی دو ایک شخصیتوں کے سوا باقیوں نے بالعموم ظاہری تعاون کے بہانے بغلی وار کئے۔رہی سہی کسر انگریزوں نے چوراہوں پر پھانسیاں گاڑ کر اور جلا وطنی کی سزائیں دے کر پوری کر دی(رسل 1957ء' ص 161)۔یوں مسلمانوں کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی نے 1857ء کی تحریک آزادی کو کامیاب بنانے کی ہر کوشش آزمائی اور اس قومی مقصد کی خاطر جان دے دی۔فرنگی سے نفرت انہیں وراثت میں ملی تھی۔ان کی حوصلہ مندی اور ایمان کی پختگی کا اعتراف ان کے دشمنوں نے بھی کیا۔جنرل بخت خاں تحریک مجاہدین کے معتقد تھے۔انگریز کے ملازم تھے۔تحریک کی روح کو سمجھنے کے بعد اس ملازمت پر تھوک دیا۔ان کے خلوص اور خدمت سے خوش ہو کر بہادر شاہ ظفر نے انہیں جنرل کا خطاب اور عہدہ عطا کیا مگر غداروں نے ایک نہ چلنے دی۔انہیں نیپال کی ترائیوں میں خاموشی کے ساتھ اور ہمیشہ کیلئے گم ہو جانا پڑا۔(گرانٹ' جیمس 1880ء' ص 240)

جنرل بخت خاں سید احمد شہید کی تحریک جہاد سے اس قدر متاثر تھے کہ دوران جنگ آزادی جو اشتہارات تقسیم ہوئے یا فتاویٰ جاری ہوئے ان میں سید احمد شہید ہی کی فکر کارفرما تھی۔مولانا لیاقت علی خیر آبادی کے اشتہار میں ستائیس ایسے اشعار بھی نقل کیے گئے تھے جو مجاہدین بالاکوٹ اپنے معرکوں میں پڑھا کرتے تھے۔مولانا فضل حق خیر آبادی جب ایک

مرتبہ جنگ آزادی میں کود گئے تو آخری لمحے تک رسم وفا نبھائی اور اس راہ میں ہر ظلم وستم برداشت کیا (فضل حق خیر آبادی 1957ء ص 91-92 و متعدد)۔بالاکوٹ میں تحریک مجاہدین کی ناکامی پر آپ نے جہاد کا فتوئی جاری کیا۔سقوط دہلی پر جب انگریز حاکم کے سامنے پیش ہوئے تو ان کے جلال سے متاثر ہو کر ایک گواہ نے بے ساختہ کہہ دیا کہ یہ وہ فضل حق نہیں جس نے فتوئی پر دستخط کئے تھے۔اس پر آپ نے خود عدالت سے کہہ دیا: گواہ نے پہلے سچ کہا تھا اب میری صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا ہے۔اور جھوٹ بول رہا ہے۔فتوئی صحیح ہے اور میرا ہی لکھا ہوا ہے۔انگریز کے بارے میں میری آج بھی یہی رائے ہے۔پھانسی کی بجائے انہیں کالے پانی کی سزا ہوئی اور وہیں خدا کو پیارے ہو گئے۔(سمیع اللہ قریشی 1981ء ص 37-40)

مسلمانوں کو مغل سلطنت کے احیاء کی امید تھی لیکن مرہٹوں نے سلطنت مغلیہ کے خلاف اپنی حکمت عملی سے کام لیا۔مرہٹوں کا پیشوا باجی راؤ اپنے ہندو ساتھیوں اور سپاہیوں سے ہندوستان کی چھوٹی بڑی مسلمان ریاستوں اور دوسری طرف زوال آمادہ مرکزی سلطنت مغلیہ کو ذہن میں رکھ کر صاف صاف کہا کرتا تھا کہ :شاخوں کی قطع و برید سے کیا فائدہ؟ تنے پر وار کرو شاخیں خود بخود نیچے آ گریں گی۔(مارش مین 1873ء ص 100)

3.2 تعلیمی پالیسی

رسمی طور پر برصغیر میں برطانوی دور کا آغاز 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے شمار کیا جاتا ہے۔لیکن عملاً برطانوی تسلط کا آغاز بہت پہلے ہو گیا تھا اور کسی نہ کسی شکل میں کمپنی کے تعلیمی اقدام اور اُن کے اثرات محسوس ہونے لگ گئے تھے۔لہٰذا اس جائزے میں بھی انہیں سامنے رکھا گیا ہے۔برصغیر میں برطانوی تعلیمی مساعی کے سلسلے میں یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان کا اصل محرک عیسائیت کی تبلیغ واشاعت تھا۔چنانچہ برصغیر میں تعلیم کے نام پر جو کچھ کیا گیا وہ تعلیم نہیں مغربی تہذیب میں ذہن سازی کی تحریک تھی جو بلاشبہ کامیاب رہی۔

ایک نادار قوم تعلیم وتہذیب میں صرف اس وقت ترقی کر سکتی ہے جب اس قوم کا مذہب تعلیم کو لازمی قرار دے جیسا کہ ساتویں صدی (صدرِ اسلام) کے عرب میں مظاہرہ ہو چکا تھا۔انگلستان سولھویں صدی تک عیسائیت کے رومن کیتھولک فرقہ سے وابستہ تھا جس میں غریبوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی ۔وہ بائبل بھی نہیں پڑھ سکتے تھے۔پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لینے کے بعد بھی وہاں تعلیم میں کوئی ترقی نہ ہو سکی ۔اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ انگلستان کا اعلیٰ طبقہ سمجھتا تھا کہ غریبوں کو قدرت نے جس حالت میں پیدا کیا ہے اس حالت کے بدلنے کی کوشش کرنا گویا قدرت کی مرضی کے خلاف کام کرنا ہے اور غریبوں میں تعلیم کا پھیلنا خطرناک بھی سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس سے عوام میں باغیانہ خیالات کے پھیلنے کا اندیشہ تھا۔اس وجہ سے انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک انگلستان کے غریبوں میں تعلیم بہت کم تھی۔(شبیر احمد 1983ء

ص 183، 184)

ایک عرصے تک انگریز برصغیر میں تعلیم کی ترویج سے اجتناب برتتے رہے (سیّد محمود 1895ء ص 64)۔ ان کا یہ اجتناب دوراندیشی پر مبنی تھا۔ ایک مرتبہ لارڈ ایلین برانے دوارکا ناتھ ٹیگور سے کہا تھا: اگر دیسیوں کو تعلیم دینے میں یہ لوگ کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم تین ماہ سے زیادہ اس ملک میں نہیں رہ سکتے۔ اس پر دوارکا ناتھ نے کہا: تین ماہ تو زیادہ ہیں تین ہفتوں سے زیادہ نہیں رہ سکتے اور اُس کا یہ کہنا بالکل درست تھا۔ 1793ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹر سر تھامس ٹریمس نے کہا تھا: تم ہندوستانیوں کو تعلیم دینا چاہتے ہو؟ تعلیم دے کر تم انھیں اپنی بے انصافیوں سے آگاہ کرو گے۔ تم نے ان کا ملک لوٹ لیا ہے۔ تم نے ان کے ہم وطنوں کو برباد اور ذلیل کیا۔ تم نے ان کے بادشاہوں کو قتل کر ڈالا ہے۔ لہٰذا تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ انہیں اسی طرح غریب خوردہ، خود فراموش اور جاہل رہنے دو۔ (مصطفیٰ علی، بریلوی سید 1970ء ص 133)

1765ء کا سیاسی تسلط ہندوستان میں دُور دُور تک قائم ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود کمپنی ہندوستانیوں کی تعلیمی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لینے سے اس لیے گریز کرتی رہی کہ اس وقت تک خود انگلستان میں عوام کی تعلیم کیلئے سرکاری سطح پر تعلیمی درس گاہیں قائم کرنے اور اُنہیں چلانے کا رواج نہیں پڑا تھا۔ سارے ملک میں دس بیس آدمی بھی ایسے نہیں تھے جنہیں تعلیمی مسائل کا ادراک اور تعلیمی ادارے کامیابی سے چلانے کا تجربہ ہوتا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ کمپنی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جس سے ہندوستان کے عوام بالخصوص مسلمانوں کیلئے تعلیمی آسانیاں مہیا ہو جائیں اور مسلمانانِ بنگال و دیگر صوبہ جات بھی آسانی سے تعلیم حاصل کر لیں جس طرح بنگال کے ہندو باشندے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر نہ صرف سرکاری مناصب پر فائز ہو رہے تھے بلکہ تجارت و صنعت میں بھی ان کا اثر و نفوذ روبہ ترقی تھا۔ مسلمانوں کے مکمل تعلیمی بلیک آؤٹ کی بہترین تدبیر یہ سوچی گئی کہ نظامِ قدیم (روائتی نظامِ تعلیم) کے ادارے جو غیر ملکیوں کی دستبرد سے اس وقت تک بچ گئے تھے اور جن سے مسلمان پورا استفادہ کر رہے تھے اُنہیں کسی طرح بالکل بند کر دیا جائے تا کہ مسلمان کسی طور بھی چشمہ تعلیم سے سیراب نہ ہو سکیں۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کا ابتدائی نصف حصہ اسی کوشش میں صرف ہوا۔ (محمد حامی الدین 1983ء ص 291)

اس نظامِ تعلیم میں وقتاً فوقتاً توسیع ہوتی رہی حتیٰ کہ 1855ء-1856ء میں مختلف صوبوں میں تعلیمی محکمے قائم ہوئے اور 1857ء میں پریزیڈنسی شہروں (کلکتہ، مدراس، بمبئی) میں یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ کمپنی کے زمانہ میں تعلیم کی بنیاد ہی عیسائیت پر تھی۔ مشنریوں نے انہیں خیالات اور عقائد کو تعلیم کا جزو لاینفک بنایا تھا۔ کمپنی کے عہدہ داروں کی حوصلہ افزائی سے ان کو بڑی مدد ملتی تھی (الطاف علی بریلوی سیّد 1995ء ص 122)۔ غرض کہ کمپنی کے بیرونی تاجروں کے زیر اثر تعلیم کی اشاعت و ترویج کا اصل منشاء مسیحیت کا پرچار جبکہ دوسری اہم غرض یہ تھی کہ ان ہندوستانی علاقوں میں جہاں انگریز آباد ہو گئے تھے رومن کیتھولک فرقے کی وجہ سے جن خطرات کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، اُنہیں زائل کیا جائے۔ (این این لا

1972ء ص 27)

انگریزوں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں کا سارا ماحول مسیحیت نواز تھا۔درسگاہ کا نام کسی مسیح بزرگ پر ہوتا تھا۔سینٹ جوز،سینٹ سٹیفن وغیرہ۔اسکول اور کالج کی عمارت کے اندر گرجا تعمیر کیا جاتا تھا۔ایک نمایاں مقام پر کنواری مریم اور حضرت عیسیٰؑ کے مجسمے نصب ہوتے تھے۔تمام اساتذہ پادری اور بشپ ہوتے تھے۔جو اپنا مخصوص مذہبی لباس پہن کر کلاس روم میں آتے تھے۔سینہ پر صلیب نمایاں ہوتی تھی۔طلبہ انہیں استاد کی بجائے فادر کہہ کر پکارتے تھے۔طلبہ کیلئے انگریزی لباس لازمی ہوتا تھا۔گلے میں ٹائی لازمی تھی۔تعلیم کا آغاز بائبل خوانی سے ہوتا تھا۔نصاب میں بائبل کا ایک گھنٹے کا درس اس کے علاوہ ہوتا تھا جو ہر طالب علم کیلئے لازمی تھا۔(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء الف ص 13)

عیسائی مذہب کی تبلیغ واشاعت کے فتنے نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عنوان سے ہندوستان کے اندر اپنے قدم رکھنے کی راہ ہموار کی اور رفتہ رفتہ تجارتی اداروں وسیاسی محاذ پر اپنی بالا دستی قائم کرنی شروع کردی۔پھر برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائی بنائے جانے کی قرارداد پاس ہونے کے بعد اس مشن میں مزید زور پیدا ہوگیا۔اس قرارداد میں یہ منظور کیا گیا تھا کہ مسیحی پادری و مبلغین ہندوستان جاکر وہاں کے مسلمانوں میں عیسائیت کے فروغ کی جدوجہد کریں۔قرارداد کے پاس ہوتے ہی تبلیغی واشاعتی وفود اپنے مشن لے کر ہندوستان آنے لگے اور انیسویں صدی کے اختتام تک عیسائیت کے اس سرزمین پر 42 تبلیغی ادارے قائم ہوگئے۔یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی تعداد ڈھائی سو تک جا پہنچی (این این لا 1916ء ص 807)۔

یہ سرگرمیاں اس قدر تیزی سے بڑھیں کہ انھوں نے یہاں نرسری سکول اور تعلیمی ادارے کھولنے شروع کردیئے۔ہاسپٹل اور نرسنگ ہوم قائم کرنے لگے اور عیسائیت سے دلچسپی رکھنے والوں کا ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا۔صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے مذہب کی اشاعت کا مفید ذریعہ سمجھتے ہوئے ہندوستانی زبانوں میں اخبارات و رسائل بھی شائع کرنے لگے۔اس میدان میں اپنی تگ و تاز سے وہ اس قدر اطمینان اور خوش اعتقادی میں مبتلاء ہوگئے۔کہ انھوں نے یہ پیش گوئی شروع کردی کہ ہندوستان جلد ہی عیسائیت میں تبدیل ہوجائے گا۔نیز ہندوستان میں عیسائیت کا مستقبل بہت ہی روشن اور تابناک ہے۔دوسری طرف ملک کے علماء اور داعیان اسلام،ان اسلام مخالف سرگرمیوں سے بے پرواہ ہوکر غفلت کی زندگی بسر کررہے تھے، انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔(آبادشاہ پوری 1989ء ص 83)

ان سرگرمیوں کے ذکر میں ایک مبلغ "ہنری ایلیٹ" نے دو اہم نکتوں کی طرف توجہ مرکوز کی۔ایک نبوت محمدی ﷺ کے سلسلے میں مسلمان نوجوانوں کے اندر مختلف طرح سے شکوک وشبہات پیدا کرنا (رسل 1957ء ص 179-180)۔دوسرے مسلم بادشاہوں کی تاریخ مسخ کرنا،ان پر ظلم و سرکشی،خونریزی،عصبیت و شہوانیت اور نفس پرستی کے الزامات عائد کرنا۔دوسرے مقصد کے حصول کیلئے انھوں نے خاص کر صالح اور انصاف پسند مغل بادشاہ اورنگ زیب کو نشانہ بنایا جس نے بادشاہت و حکمرانی سے کہیں زیادہ ایک مصلح،عادل اور مخلص داعی اسلام کا کردار ادا کیا تھا۔(سعید الرحمن اعظمی 2000ء

ص 8)

کمپنی نے ہندوستانیوں کی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے دیسی تعلیم کے مدرسے بھی قائم کیے گئے مثلاً 1780ء میں کلکتہ مدرسہ اور 1791ء میں بنارس میں ہندو مدرسہ قائم کیا گیا (ٹریول یان 1838ء ص 1)۔ ان مدارس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ فلسفہ، دینیات، فلکیات، علم ہندسہ، ریاضی، منطق، فن تقریر و تحریر کی بھی تعلیم دی جاتی تھی (مصطفیٰ علی بریلوی سید 1971ء ص 116)۔ تعلیم کی مدت سات سال تھی۔ اس طرح ہندوستان میں ایسے تعلیمی اداروں کی بنیاد پڑی جو اورینٹل یعنی مشرقی علوم کی تعلیم دیتے تھے۔ سیاسی مصلحت کی بنا پر کمپنی کو مشن اسکولوں کی اعانت سے ہاتھ اٹھانا پڑا اور اس نے عیسائی مذہب کی تعلیم پر پابندی شروع کی۔ کمپنی نے مذہبی معاملات میں غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کی۔ اس طرح 1765ء سے 1813ء تک کمپنی کا رویہ تعلیم کے معاملہ میں یہ رہا کہ ہندوستانیوں کو مشرقی علوم کی تعلیم دی جائے اور تبلیغ سے گریز کیا جائے۔ مشن اسکول تعلیم کے ساتھ ساتھ تبلیغ بھی کر رہے تھے اور وہ ہندوستانی بچوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن جب کمپنی نے تبلیغ کی ممانعت کی اور مشن اسکولوں کو مالی امداد دینا بند کر دیا تو مشن اسکولوں اور کمپنی کے درمیان تنازعے شروع ہو گئے۔ حتیٰ کہ 1813ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید کا وقت آ گیا۔ (خالد یار خاں 1963ء ص 228)

برصغیر میں جدید تعلیم کا دور 1797ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب سر چارلس گرانٹ نے اشاعت تعلیم کے موضوع پر ایک رسالہ لکھ کر کمپنی کے ڈائریکٹروں کو پیش کیا (پی کے، بہرام 1942ء ص 1)۔ یہی دستاویز 1812ء کے برطانوی پارلیمنٹ کے چارٹر ایکٹ کی بنیاد بنی جس کے ذریعے تعلیم کی ذمہ داری حکومت کے سپرد ہوئی۔ با قاعدہ بجٹ بنایا گیا۔ اس کی رُو سے تعلیم کا اولین مقصد اہل ہند تک عیسائیت کا پیغام پہنچانا تھا۔ اس کیلئے حکومت نے مشنری اداروں کی ہر ممکن سرپرستی کی (منظور احمد جاوید 1979ء ص 63)۔ گرانٹ کی تجویز آسانی سے منظور نہیں ہوئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک طبقے نے اس کی سخت مخالفت کی۔ خود برطانوی حکومت اس تجویز کی تائید میں نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ کی امریکی نو آبادیات نے برطانیہ کی دھاندلیوں سے تنگ آ کر 1775ء میں بغاوت کر دی تھی۔ 1783ء میں برطانیہ کو مجبوراً ان کی آزادی تسلیم کرنا پڑی۔ (عبدالباری، پروفیسر (س ن)، ص 502)

حکومت برطانیہ اور ان کے باشندوں کو یقین تھا کہ یہ بغاوت صرف اس لئے ہوئی ہے کہ امریکیوں کو اسکول کھولنے اور تعلیم حاصل کرنے کی آزادی تھی چنانچہ پارلیمنٹ کے اراکین اور ڈائریکٹر ایسٹ انڈیا کمپنی اس بات پر مصر تھے کہ ہمیں اپنی امریکی نو آبادیات سے صرف اس لئے ہاتھ دھونا پڑا ہے کہ ہم نے وہاں تعلیم شروع کر دی تھی۔ ہمیں ہندوستان میں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا (پی۔ ڈی باسو 1922ء ص 14)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تجویز رد کر دی گئی۔ لیکن چارلس گرانٹ اس سے بددل نہیں ہوا۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہ خود پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو گیا۔ اب اس کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ لہٰذا جب 1813ء میں کمپنی کا چارٹر تجدید کیلئے پیش ہوا تو اس میں شق 13 اور شق 43 کا اضافہ مان لیا گیا۔ شق 13 کی رو سے مسیحی مبلغوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ ہندوستان جائیں اور وہاں اپنا کام وسیع ترین معنوں میں انجام

دیں۔ شق 43 کی رو سے کمپنی کو قانوناً پابند کیا گیا تھا کہ خزانے میں بچت ہونے کی صورت میں ایک لاکھ روپے سالانہ ہندوستانیوں کی دینوی تعلیم پر خرچ کرے۔ (خورشید احمد، پروفیسر 1977ء، ص 76)

چارٹر ایکٹ 1813ء ہندوستان کی سیاسی اور علمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس ایکٹ نے کمپنی کی تجارتی حیثیت ختم کر کے اسے حکمران جماعت بنا دیا۔ یہیں سے کمپنی کی تعلیمی سرگرمیاں باقاعدہ شروع ہوتی ہیں (باری 1969ء، ص 286)۔ 1813ء کے چارٹر ایکٹ میں ایک لاکھ کی رقم ہندوستان میں ادبی تخلیقات کے احیاء اور ارتقاء کے لئے مختص کی گئی۔ اس کے متعلق میکالے نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ اس رقم کا مصرف صرف "ہندوستان میں ادب کا احیاء" ہی نہیں بلکہ حکومت برطانیہ کے زیر نگیں علاقوں کے باشندوں میں سائنسی علوم کی ترقی بھی ہے۔ پھر اس نے طرح طرح کی مثالیں دے کر ہندوستان کے قدیم ادب کو مضحکہ خیز ثابت کرنے کی اس قدر کوشش کی اور کہا کہ ایسے ادب کے احیاء پر رقم صرف کرنا کسی طرح معقول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے استدلال کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ اگر چارٹر کے الفاظ کو "ہندوستانی ادب کے احیاء" ہی پر محمول کیا جائے تو بھی آئندہ ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا۔ میکالے کہتا ہے: فرض کیجئے ہم نے ایک دارالصحت کی بنیاد ایک ایسے مقام پر رکھی جسے ہم نے صحت بخش سمجھا لیکن وہاں نتائج ہماری توقع کے مطابق برآمد نہیں ہوئے تو کیا اس صورت حال میں ہم پابند ہیں کہ اس عدم افادیت کے باوجود یہ صحت گاہ وہیں برقرار رکھیں۔ (شبیر بخاری، سید 1986ء، ص 25-28)

1813ء سے 1835ء کا درمیانی وقفہ تعلیمی اعتبار سے تعطل کا دور ہے۔ اس دور میں کمپنی زیادہ سیاسی توسیع میں مصروف رہی۔ تاہم کہیں 1823ء میں جا کر جنرل کمیٹی برائے تعلیم قائم ہوئی اور یوں کمپنی کے تحت تعلیم کا آغاز ہوا (الطاف علی، بریلوی سید 1995ء، ص 15)۔ میکالے گورنر جنرل کی کونسل کا قانونی رکن تھا۔ اس کی رائے تھی کہ انگریزی تعلیم حکومت کا ایک فرض ہے، انگریزی ہندوستانیوں کیلئے مغرب کے ترقی یافتہ اور وسعت پذیر علوم کا دروازہ کھول دے گی اور ایک زمانہ آئے گا جب ہندوستان مغربیت کا جامہ اختیار کر لے گا۔ اس طریقہ سے امید ہے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوگا مگر خیالات اور تمدن میں انگریز ہوگا۔

میکالے کی سکیم بڑے غور و خوض کی مستحق ہے اسے سمجھنے کے بعد ہی رائج الوقت نظام تعلیم سمجھ میں آ سکتا ہے۔ میکالے اہل مشرق کے علوم و فنون سے باعتراف خود ناواقف تھا۔ اس کے باوجود اہل مشرق اور ان کے علوم کی سخت مذمت کرتا تھا۔ اس نے یہاں تک لکھا کہ:

A single shelf of a good European library was worth the whole native literature of India and Arabic (Selection from Educational Records, Lahore Directorate of Education Library)

یعنی یورپ کے کسی اچھے کتب خانے کی محض ایک الماری ہندوستان اور عرب کے تمام علمی ذخیرہ پر بھاری ہے۔ جس شخص کی

یہ رائے ہو وہ مشرقی نظام تعلیم کے ساتھ کیا حسن ظن رکھ سکتا ہے۔اور اہل ہند کا اس کی نگاہ میں کیا وقار ہو سکتا ہے۔(خالد یار خان 1963ء ص 234-235)۔ادھر حکومت کی شہ پر 10 فروری 1835ء کو ہندوؤں نے 6947 دستخطوں پر مشتمل ایک عرضداشت حکومت کو پیش کی جس میں مطالبہ کیا کہ فارسی زبان کی سرکاری حیثیت ختم کردی جائے۔اور اردو بطور سرکاری زبان رائج کی جائے۔اس عرضداشت پر رادھا کانت مکرجی اور پرسنا کمار ٹیگور جیسے مشہور اشخاص کے دستخط تھے۔(ملک' اے۔آر 1961ء ص 231)

بہر حال ،لارڈ ولیم بینٹک ، گورنر جنرل ہندوستان نے اختلاف کے باوجود میکالے کی تجویز قبول کرلی۔ 7 مارچ 1835ء کو گورنر جنرل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں ہمیشہ کیلئے برطانوی ہند میں تعلیم کے خطوط متعین کردیے گئے۔اسے Bentick Resolution کہتے ہیں۔یہ قرارداد پانچ نکات پر مشتمل تھی:

(1) سرکاری تعلیم کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم وسائنس کی اشاعت ہے۔

(2) آئندہ سے ملک کی سرکاری زبان انگریزی ہوگی۔

(3) علوم وفنون کی تدریسی زبان بھی انگریزی ہی ہوگی۔

(4) مشرقی علوم کی اشاعت پر آئندہ سے کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا جائیگا۔

(5) طلبہ کو وظیفہ دینے کا قدیم طریقہ ختم کردیا گیا۔

اس قرارداد کو بعد میں ایکٹ نمبر 29 مجریہ 1837ء کے ذریعہ ملکی قانون کا درجہ دے دیا گیا اس کے نتیجے میں مشرقی تعلیم کا رشتہ معاشرے سے ختم ہوگیا۔(نوراللہ' سیّد اور نایک 1951ء ص 139)

چارلس وڈ کا مراسلہ 1854ء برصغیر میں برطانوی تعلیمی پالیسی کی انتہائی اہم دستاویز ہے۔وڈ کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کا صدر تھا۔اس نے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کو مراسلہ ارسال کیا۔مراسلہ میں تعلیم کی ایک نئی اسکیم پیش کی گئی جس کے اہم نکات یہ تھے:

- ہر صوبہ میں ایک محکمہ تعلیم قائم کیا جائے جس کا افسر اعلیٰ ڈائریکٹر تعلیمات عامہ کہلائے گا۔اس کے ماتحت انسپکٹر ہوں گے جو تعلیم کی نگرانی کریں گے۔ڈائریکٹر تعلیمی ترقی کی سالانہ رپورٹ حکومت کو دیا کرے گا۔
- ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کیلئے یونیورسٹیاں قائم کی جائیں گی۔
- ہندوستان میں مختلف مدارج کے دارالعلوم قائم کئے جائیں گے۔اعلیٰ تعلیم کیلئے یونیورسٹیاں اور کالج جبکہ ثانوی تعلیم کیلئے مدرسے جن میں انگریزی اور دیسی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دی جائے گی نیز ابتدائی تعلیم کیلئے پرائمری اسکول جن میں دیسی زبانوں کے ذریعے تعلیم دی جائے گی۔
- مراسلہ میں نادار اور مستحق طلبہ کو وظائف دینے کی سفارش کی گئی۔یہ وظائف ابتدائی ،ثانوی اور یونیورسٹی تینوں درجوں کے لئے تجویز کیے گئے۔

- گرانٹس ان ایڈ (Grants-in-Aid) کا نظام رائج کیا جائے گا تا کہ حکومت کے علاوہ دوسری ایجنسیاں بھی تعلیم پھیلانے میں مدد دے سکیں۔ گرانٹ صرف ان ہی اداروں کو ملے گی جن میں (الف) لادینی تعلیم دی جائے گی۔ (ب) انگریزی ذریعہ تعلیم ہوگی۔ (ج) انسپکٹر کو معائنہ کرنے کی اجازت ہوگی۔ (د) جو گرانٹ کی مقرر کردہ شرائط پوری کریں گے۔ (ایم اے عزیز 1965ء ص 21-23)

وڈ کا مراسلہ اس لحاظ سے اہم ترین تعلیمی دستاویز ہے کہ اس نے بنیادی تعلیمی امور سمیت کر انہیں قانونی حیثیت دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین اسے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا میگنا کارٹا (عظیم چارٹر) قرار دیتے ہیں (خورشید احمد 1963ء ص 90)۔ اس سکیم کے تحت تعلیمی ترقی کا جائزہ لینے کے لئے 1882ء میں ولیم ہنٹر کی سربراہی میں انڈین ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا جس میں پچیس چھبیس سفارشات کیں۔ ان کا خلاصہ یوں ہے:

- اعلیٰ تعلیم سرکاری نگرانی سے نکال لی جائے اور لوگوں کو اپنے طور پر کوشش کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔
- دیسی زبانوں کے ذریعے عوام کو پرائمری تعلیم دی جائے۔
- پرائمری سکولوں کا نظم ونسق میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے سپرد کر دیا جائے۔
- لڑکیوں کا نصاب مختلف ہونا چاہئے اور لڑکیوں کو حتیٰ الامکان معلمات ہی پڑھائیں۔
- دیسی اسکولوں کی مالی امداد کے سلسلے میں کمیشن نے سفارش کی کہ مالی امداد امتحان کے نتائج پر دی جائے۔
- حکومت پرائیویٹ اسکولوں کو زیادہ سے زیادہ مدد دے اور سرکاری مدرسے رفتہ رفتہ پرائیویٹ ایجنسیوں میں منتقل کر دے۔
- وظائف صرف سرکاری اداروں کے طلبہ تک محدود نہیں ہونے چاہئیں بلکہ پرائیویٹ اداروں کے طلبہ کو بھی وظائف دیئے جائیں۔
- مختلف سطحوں پر تدریسی مضامین میں تنوع پیدا کیا جائے۔ (نوراللہ، سید اور نائیک 1951ء ص 289)

تعلیمی حیثیت سے یہ زمانہ جدید تعلیم کی وسعت وفروغ کا زمانہ تھا۔ پرانا نظام تعلیم اس دور میں تقریباً ختم ہو گیا اور صرف وہ سخت جان مدرسے رہ گئے جو سیاست، تمدن اور معاش کی مار کے بعد بھی اپنے مقام سے نہ ہٹے۔ نیا نظام اس زمانے میں برابر نشو ونما پاتا رہا اور اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان اداروں میں بھی زیادہ اہمیت ثانوی تعلیم کو دی گئی۔ پرائمری تعلیم اس پورے دور میں عدم توجہی کا شکار رہی۔ 1882ء کے تعلیمی کمیشن نے اس بات کا پرزور الفاظ میں اظہار کیا کہ پرائمری تعلیم کے حالات بہت غیر تسلی بخش ہیں۔ نیز یہ کہ ثانوی تعلیمی اداروں کی تعداد میں تو ضرور اضافہ ہوا ہے لیکن معیار تعلیم میں کمی واقع ہوئی ہے۔ (خورشید احمد (س ن) ص 93)

قومی نقطۂ نظر سے اس زمانے میں چند اہم رجحانات رونما ہوئے۔ ہندوؤں نے نئی تعلیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں دو مختلف میلانات دیکھنے میں آئے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے نئی تعلیم کا بائیکاٹ کیا جبکہ اقلیت نے

مفاہمت کی روش اختیار کرتے ہوئے نئی تعلیم کو قبول کرلیا۔نیز اس بات کی کوشش کی کہ جس حد تک ممکن ہو اسلامیات کو شامل نصاب کرلیا جائے۔(نذیر احمد، خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی، ڈاکٹر 1987ء، ص 43)

برصغیر میں برطانوی تعلیم کے ارتقاء کا چوتھا مرحلہ 1900ء سے شروع ہوتا ہے۔لارڈ کرزن وائسرائے تھا۔اس نے تمام تر کوششیں تعلیمی اصلاحات پر صرف کیں۔ایک تعلیمی مشیر مقرر کیا گیا جو ڈائریکٹر جنرل یا ناظم تعلیمات کہلاتا تھا اور بعد ازاں اسے کمشنر تعلیمات کہا گیا۔ایک تحقیقاتی کمیشن نے ہندوستان کا دورہ کیا اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کی حالت اوران کی ضروریات کے متعلق ایک نہایت قابل قدر رپورٹ تیار کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1904ء میں یونیورسٹی کا قانون پاس ہوگیا۔1911ء میں تعلیمی ضروریات اس قدر بڑھ گئیں کہ گورنر جنرل کی کونسل میں ایک ممبر تعلیم کا اضافہ کیا گیا۔ 1919ء میں چھ صوبوں کی یونیورسٹیاں بمقام کلکتہ، مدراس، بمبئی، الہ آباد، لاہور اور پٹنہ قائم تھیں۔کلکتہ یونیورسٹی میں تو خود گورنر جنرل چانسلر ہوتا تھا اور باقی یونیورسٹیوں میں صوبہ کے اعلیٰ حاکم یعنی گورنر یا لیفٹیننٹ گورنر چانسلر ہوتے تھے۔ یونیورسٹی کی انتظامی جماعت سنڈیکیٹ کہلاتی تھی۔اس کا صدر وائس چانسلر ہوتا تھا۔جسے سرکار نامزد کرتی تھی۔ناظم تعلیمات سرکاری ممبر شمار ہوتا تھا۔مگر سنڈیکیٹ کے باقی ممبر اہل علم کی مختلف جماعتوں کی طرف سے منتخب ہوتے تھے۔رجسٹرار کو سینٹ مقرر کرتی تھی۔علاوہ بریں ایسی مجالس قائم تھیں جو کتب نصاب تجویز کرتی تھیں اوراُن کی عام نگرانی کرتی تھیں۔یونیورسٹی کی قانون ساز مجلس سینٹ کہلاتی تھی۔اس کے بیشتر رکن تو حکومت نامزد کرتی تھی اور کچھ گریجویٹوں کی طرف سے بھی منتخب ہوتے تھے۔سینٹ یونیورسٹی کے کام کے متعلق قواعد وضوابط بناسکتی تھی لیکن ان کیلئے متعلقہ حکومت کی منظوری لازم تھی۔(محمد الیاس برنی 1924ء، ص 141)

بعد ازاں سیڈلر کمیشن یا کلکتہ یونیورسٹی کمیشن (1917ء۔1919ء) کی رپورٹ بھی ایک اہم تعلیمی دستاویز ہے۔ اس کمیشن کی خاص سفارشات درج ذیل تھیں:

- حکومت نئے قسم کے تعلیمی ادارے قائم کرے جو انٹرمیڈیٹ کالج کہلائیں۔ان کالجوں میں آرٹس، سائنس، طب اور انجینئرنگ کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔یہ کالج علیحدہ بھی چلائے جاسکتے ہیں اوران کا ثانوی مدارس سے الحاق بھی کیا جاسکتا ہے۔
- انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ دیا جائے۔
- ایک ثانوی اور انٹرمیڈیٹ بورڈ قائم کیا جائے جس میں حکومت، یونیورسٹی، ہائی سکول اور انٹر کالجوں کے ممبر شامل کیے جائیں اور یہ بورڈ ثانوی تعلیم کا بندوبست کرے۔
- ڈھاکہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جو امتحانات لینے کے علاوہ تدریس کا کام بھی انجام دے۔
- کلکتہ کی یونیورسٹی بھی تدریسی یونیورسٹی بنادی جائے اور مضافات کے تمام کالجوں کو اس میں شامل کردیا جائے۔
- زیادہ قابل طلبہ کے لئے آنرز کورس مرتب کیا جائے جو پاس کورس سے مختلف ہو۔

- انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ڈگری کورس تین سال کا ہونا چاہئے۔
- یونیورسٹی کے معلمین کا تقرر ایک مخصوص کمیٹی کرے اور اس کمیٹی میں بیرونی ماہرین بھی شامل کئے جائیں۔
- ہر یونیورسٹی میں جسمانی تربیت کا ایک ڈائریکٹر مقرر کیا جائے جو طلبہ کی صحت اور جسمانی بہبود کا بندوبست کرے۔
- لڑکیوں کے لئے ایسے مدارس قائم کئے جائیں جہاں پردے کا انتظام ہو۔کلکتہ یونیورسٹی میں تعلیم نسواں کا بورڈ قائم کیا جائے۔جو لڑکیوں کے لئے مناسب نصاب تجویز کرے۔
- کلکتہ اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایجوکیشن کا محکمہ وقف کیا جائے۔انٹرمیڈیٹ، بی۔اے اور ایم۔اے کے مضامین میں ایجوکیشن جیسے مضمون کا اضافہ کیا جائے۔
- یونیورسٹی میں مخصوص کورس شامل کیے جائیں اور ایسی تعلیم و ترتیب کا انتظام کیا جائے جو ملکی صنعتی ترقی میں کارگر ثابت ہو۔
- یونیورسٹیاں پروفیشنل اور ووکیشنل تعلیم کا بھی انتظام کریں۔(محمد اقبال 1967ء ص 55-56)

چنانچہ 1902ء میں لارڈ کرزن نے ایک تعلیمی کمیشن قائم کیا جس کی رو سے اعلیٰ تعلیم کے اخراجات بڑھا دیے گئے اور ایسی پابندیاں لگائی گئیں کہ زیادہ پرائیویٹ کالج قائم نہ ہوسکیں۔بظاہر یہ اعلیٰ تعلیم کے فروغ کی پالیسی نظر آتی ہے کیونکہ ہر صوبے میں الگ الگ یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور یوپی میں پانچ یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں لیکن آخر وہ وقت آ گیا کہ ہندوستان کے لوگ اعلیٰ تعلیم سے بیزار ہوگئے۔اسمبلیوں میں بھی یونیورسٹی ایجوکیشن کی مذمت کی جانے لگی (طفیل احمد منگلوری 1945ء ص 148-151)۔1929ء میں ہارڈنگ (Harding) کمیٹی نے تعلیم پر ایک مکمل رپورٹ تیار کی جس میں پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی اصلاح کے لئے مفصل سفارشات پیش کی گئیں۔یونیورسٹیوں کی تعلیم کو کمیٹی نے خاص طور سے ہدف تنقید بنایا اور اس کی اصلاح کے لئے درج ذیل اصلاحات پیش کیں:

- اعلیٰ تعلیم کیلئے بہترین یونیورسٹی وہی ہے جو تدریس کے فرائض بھی انجام دے۔
- یونیورسٹیوں کو تدریس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔
- آنرز کورس کی اجازت بہت کم طلبہ کو دی جائے اور ان کی تدریس کے لئے بہترین اساتذہ مقرر کئے جائیں۔
- اکثر یونیورسٹیوں میں معقول کتب خانے نہیں ہیں۔عمدہ کتب خانہ یونیورسٹی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔جس کے بغیر یونیورسٹی اپنے فرائض اچھی طرح انجام نہیں دے سکتی۔اعلیٰ تعلیم اور تحقیقات کیلئے بہت اعلیٰ قسم کی لائبریریاں ہونی چاہئے۔
- یونیورسٹی کی تعلیم پروانہ سرکاری ملازمت بن گئی ہے اس لیے ہر طالب علم ملازمت حاصل کرنے کیلئے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔حکومت کو چاہئے کہ وہ ایسی آسامیوں کیلئے جن میں اعلیٰ تعلیم کی ضرورت نہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا تقرر نہ کرے۔اعلیٰ تعلیم کی بجائے حکومت کو مقابلہ کے امتحانات کے ذریعہ تقرر کرنے چاہئے۔

- یونیورسٹی کی تعلیم محض کتابی رہ گئی ہے۔عملی زندگی سے اس کا بالکل تعلق نہیں رہا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ یونیورسٹیاں ایسے مشاغل کا بندوبست کریں جن کے ذریعہ طلبہ میں باہمی تعاون و ذمہ داری کا احساس، فرض شناسی اور سماجی خدمت کا نہ صرف جذبہ نشوونما پائے بلکہ وہ عملی طور پر اس میں شرکت کرنے کے عادی ہوں۔ (خالد یار خان 1963ءص 279-278)

آزادی سے قبل دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر حکومت برطانیہ نے 1944ء میں سارجنٹ سکیم کے تحت ہندوستان کیلئے ایک نئی تعلیمی پالیسی تیار کی اس کے نکات یہ تھے:

- چھ برس کی عمر کے بچوں کے لئے پرائمری سے قبل کی تعلیم۔
- چھ برس سے چودہ برس کی عمر کے بچوں کے لئے مفت لازمی تعلیم جس کے دو حصے ہوں گے۔اول حصہ ابتدائی بنیادی تعلیم کہلائے گا اور یہ تعلیم چھ برس سے گیارہ سال کی عمر تک دی جائے گی۔دوسرا حصہ مزید بنیادی تعلیم کہلائے گا اور یہ تعلیم گیارہ سال سے چودہ سال تک دی جائیگی۔
- گیارہ سال کی عمر سے لیکر سترہ سال کی عمر تک ہائی اسکول کی تعلیم جو کہ چنیدہ بچوں کو دی جائے گی۔
- انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد تین سال یونیورسٹی کی تعلیم۔
- ٹیکنیکل، تجارتی آرٹ کی تعلیم دن میں پورے وقت اور اضافی اوقات میں دی جائے گی۔
- تعلیم بالغاں کا انتظام اور پبلک کتب خانوں کا قیام۔
- اساتذہ کی تربیت کے ادارے اور تربیت کا معقول انتظام کیا جائے۔
- جسمانی تربیت، طبی معائنہ، حسب ضرورت علاج، بچوں کو اسکول میں ناشتہ۔
- ملازمت کے دفاتر جو لوگوں کو ان کی قابلیت کے مطابق کام پر لگائیں۔
- اپاہجوں کی تعلیم۔
- سماجی اور تفریحی مشاغل کا مناسب انتظام۔(مصطفیٰ علی بریلوی سید 1971ءص 270-271)

برصغیر میں برطانوی تعلیمی پالیسی کے درج ذیل اہم نکات سامنے آتے ہیں:

انگریزوں کو اس ملک کی تعلیم میں کوئی حقیقی دلچسپی نہ تھی۔انھوں نے یہاں کا صحت مند اور ترقی پذیر نظام تعلیم ختم کیا اور نیا نظام تعلیم قائم کیا۔اس میں نہ ملک کی ضروریات کا خیال رکھا اور نہ اعلیٰ تعلیمی مقاصد کے تحت اسے پروان چڑھایا گیا۔ لارڈ ہیسٹنگز اور ڈنکن (Duncon) یہی کہتے رہے کہ تعلیم کو متحارب سیاسی گروہوں کے درمیان ربط و مصالحت کا کردار ادا کرنا چاہئے۔1813ء کے "چارٹر" میں مشرقی ادب کے احیاء اور مقامی اہل علم کی حوصلہ افزائی کا ذکر کیا گیا۔لیکن 1835ء کی "یادداشت" میں یہ تصور بھی مٹا دیا گیا اور صاف صاف یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ صرف مغربی فنون، مغربی سائنس اور مغربی فلسفہ و ادب کی ترویج کی جائے۔حد یہ ہے کہ 1882ء کے تعلیمی کمیشن نے مقاصد تعلیم اور اُس کی نوعیت کی کسی چیز کا ذکر تک

نہیں کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں لارڈ کرزن یہی کہتا رہا کہ تعلیم کو تو دراصل ہندوستانی ذہن کی فکری خامیاں درست کرنے کا کام سرانجام دینا چاہئے۔ گویا کسی دور میں بھی اور کسی سطح پر بھی نہ ہندوستان کے مسائل پر غور کیا گیا نہ یہاں کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لیا گیا اور نہ ہی مغربی تصورات تعلیم کی روشنی میں مقاصد تعلیم پر کوئی توجہ صرف کی گئی۔ اس کے مقابلے میں جو کچھ کیا گیا وہ یہ کہ تعلیم کو فلسفہ حیات، مقاصد تعلیم، اخلاقی اقدار اور حقائق زندگی سے کاٹ کر محض تمدنی خوشہ چینوں اور ادنیٰ ملازمین کی ایک نئی فوج تیار کرنے میں استعمال کیا گیا۔ یہ ہندوستان ہی کا المیہ نہیں خود تعلیم کا بھی المیہ ہے۔ تعلیم کو یہ پستی شاید ہی کسی اور دور میں دیکھنا نصیب ہوئی ہو۔ اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ درحقیقت تعلیم کے مسئلے کی طرف حقیقی توجہ دی ہی نہیں گئی بلکہ تعلیم کو محض سیاسی اغراض کیلئے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ (خورشید احمد (س ن) ص 127-130)

3.3 برطانوی حکمرانوں کا رویہ

مسلمانوں نے 712ء میں سندھ پر حملہ کیا۔ محمد بن قاسم نے سندھ فتح کر کے اس کے باشندوں سے ایسی رواداری برتی اور ان سے ایسا فیاضانہ سلوک کیا کہ وہ اسے اپنا نجات دہندہ اور محسن سمجھنے لگے۔ سندھ کی فتح برصغیر کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہی فتح برصغیر پر مسلمانوں کی حکمرانی کی بنیاد بنی۔ اسی فتح سندھ کی بدولت برصغیر پر سلاطین دہلی اور مغلوں نے صدیوں حکمرانی کی اور یہی فتح بالآخر برصغیر میں مسلمانوں کی الگ مملکت کے قیام کی بھی بنیاد ثابت ہوئی۔ (اشتیاق حسین، قریشی 1958ء ص 2-3)

مسلمانوں کا یہ حاکمانہ پس منظر 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد دور غلامی میں ان کے لئے طرح طرح کی آزمائشوں اور مصیبتوں کا باعث بنا۔ گو جنگ آزادی میں ہندو بھی شریک تھے لیکن جنگ کی ناکامی کے بعد انھوں نے نئے حکمرانوں سے ساز باز کر لی (سمتھ، آر۔ باس ورتھ 1885ء ص 146-147)۔ مسلمان واقعی جنگ میں پیش پیش تھے۔ پھر انگریز ہندو اتحاد نے صورت حال کو مزید ہوا دی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے بہت زیادہ نقصان اٹھایا۔ مسلمانوں کو گروہوں کی شکل میں پھانسیاں دی گئیں۔ ان کی جائیدادیں چھین لی گئیں یا سستے داموں ہندوؤں کے ہاتھوں فروخت کر دی گئیں۔ ملازمتوں میں ہندوؤں کو ترجیح دی جانے لگی اور مسلمانوں کو تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور ہر لحاظ سے پسماندہ رکھنے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ ان بے انصافیوں اور زیادتیوں کا ان حالات پر بہت گہرا اثر پڑا۔ (رسل 1957ء ص 161)

ہنٹر نے "ہندوستانی مسلمان" کے نام سے کتاب لکھی۔ اس نے بنگال کے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے: سارا صوبہ مسلمان امراء سے جو کبھی طاقتور اور برسر اقتدار تھے بھرا پڑا ہے۔ وہ گزشتہ عظمت کی نشانیاں ہیں۔ اس

وقت بھی مرشد آباد میں اسلامی ریاست ایک نقلی سلطنت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ہر ضلع میں کسی نہ کسی شہزادہ کی اولاد بے بام محلات اور پُراز خار نالاہوں کے درمیان نہایت تکبر اور ترش روئی سے خون جگر پیتی نظر آتی ہے۔اس قسم کے بہت سے خاندانوں کو میں بذات خود جانتا ہوں۔ان کے گھروں میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں۔لیکن اس فاقہ مست گروہ میں ایک بھی ایسا نہیں جسے اپنے ہی لیے زندگی میں کام کرنے کا کوئی موقع حاصل ہو۔وہ غلیظ برآمدوں اور ساتھ کے ٹپکتے ہوئے مکانوں میں اداس زندگیاں بسر کررہے ہیں اور روز بہ روز قرض کے تباہ کن گڑھوں میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ (ہنٹر ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء ص 131)

1857ء کی جنگ آزادی کی شکل میں مسلمانوں نے اپنا سیاسی مستقبل بچانے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے اور انگریز کے غلام ہوگئے۔انگریز کے سامنے سب برابر تھے لیکن چونکہ انھوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی اس لئے انہیں مسلمانوں سے خطرہ تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو دبا کر رکھا (صفدر محمود 1989ء ص 14)۔ ہندوؤں،سکھوں اور عیسائیوں کیلئے یہ ایک خوشگوار صبح تھی اور انھیں ایک ہزار برس بعد پہلی بار یہ احساس ہوا کہ اب مسلمان ان پر حاکم نہ ہو سکیں گے اور صرف وہ آدمی درجہ پائے گا جو نئے حاکم کی پیروی کرے گا۔ہندوؤں نے انگریزیت اپنانی شروع کی اور آگے بڑھ گئے۔مسلمانوں نے اسے کفر کا فتویٰ دے کر بائیکاٹ کر دیا اور پیچھے رہ گئے۔ادھر انگریز کا ذہنی پس منظر جمہوری تھا۔وہ اکثریت واقلیت کا قائل تھا۔ہندو سکھ اکثریت تھے۔انڈیا کی سپریم کونسل کے رکن سرچارلس ٹریویلین نے کہا کہ جس طرح ہمارے بزرگ کُل کے کُل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح ہندوستان میں بھی لوگ ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے۔مسٹر منگلس نے 1857ء میں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام میں صرف کرنی چاہئے (سرفراز خان (س ن) ص 260)۔انگریزوں کی متفقہ رائے تھی کہ اسلام ہندوستان میں صرف چند سالوں کا مہمان ہے۔(محمد اکرام شیخ 1965ء ص 108)

مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے۔تجارت ہو یا صنعت،اس استیصال کا اصل سبب کمپنی کا وہ اختیار تھا جس کی رُو سے وہ ایک ہی وقت میں تاجر بھی تھی اور حاکم بھی۔برطانوی پارلیمنٹ کی کاروائیوں میں کمپنی کے جابرانہ اور ظالمانہ طرز عمل پر تنقید و احتجاج کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔صاحب احساس ارکان نے کمپنی کا ظلم وستم بے مثال قرار دیا ہے (محمد الیاس فارانی 1968ء ص 97)۔ہندوستان پر غاصبانہ قبضے کی وجہ سے نفسیاتی طور سے انگریزوں کے اندر ایک چور تھا جیسا کہ مدراس کے ایک گورنر نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: انگریز عقاب،ہندو چڑیاں اور مسلمان شاھین ہیں۔چڑیوں کی چہ چہ ایک عقاب کو ہرگز پریشان نہیں کرسکتی لیکن کوئی شاھین اس کی مخالفت کرتا ہے تو عقاب اس کی گردن توڑ دیتا ہے۔(محمد مجاہد فاروق (س ن) ص 11)

انگریزوں نے 1773ء میں روہیل کھنڈ 1799ء میں میسور 1843ء میں سندھ،1856ء میں اودھ اور 14 اگست 1857ء کو دہلی کو اپنی ہوس انتقام کا نشانہ بنا کر صدیوں کی اسلامی سلطنت کے نشانات مٹا دیے۔اس کے باوجود وہ مسلمانوں

سے ہمیشہ خائف اورلرزاں رہے(بحوالہ محمد اسماعیل ذبیح 1989ءص114-115)۔انہیں ڈر تھا کہیں دبی چنگاریاں پھر سے شعلۂ جوالا نہ بن جائیں اوران کے خرمن اقتدار کوجلا کر خاکستر کردیں۔کیپٹن ڈی میکن نے برطانوی پارلیمانی کمیٹی کو اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: مسلمان انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکنے کیلئے کسی بھی یورپی طاقت سے مل جائیں گے خواہ انہیں اس میں کامیابی کاذرہ برابر بھی امکان نہ ہو۔ایک انگریزی جریدے نے 1883ء میں مسلمانوں کی باغیانہ روش کے بارے میں لکھا: ایک مسلم اخبار نے حال ہی میں انگریزی حکومت پر اتنی تنقید کی ہے کہ کوئی بھی شخص یہ فرض کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس نے سندھیا رہمارے سیاسی مخالفین سے سازباز کررکھی ہے۔لارڈ ایلن بارو گورنر جنرل نے 1843ء میں ڈیوک آف ویلنگٹن کوایک خط کے ذریعہ مطلع کیا: میں اس یقین سے چشم پوشی نہیں کرسکتا کہ مسلمان بنیادی طور پر ہمارے مخالف ہیں۔ہماری صحیح پالیسی ہندوؤں کی خوشنودی کاحصول ہے۔(محمد امین زبیری 1941ء ص5)

انگریزی تسلط سے قبل مسلمان اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔سرکار کے دربار میں انھیں بالادستی حاصل تھی لیکن بعد میں انہیں تمام مراعات اور ہر قسم کے اقتدار سے محروم کردیا گیا۔ہندوؤں کوادنیٰ درجہ سے اعلیٰ مدارج پر فائز کیا جاتا رہا۔انگریز نے مسلمانوں کو معاشی محاذ پر گزند پہنچانے کیلئے بنگال میں مالیہ کی وصولی کا مغل طریقہ کار یکسر بدل کر نیلامی کا طریق کار نافذ کردیا۔پہلے مسلمان جاگیردار مالیہ کی وصولی کا کام انجام دیتے تھے۔مالی پسماندگی کی وجہ سے مسلمانوں نے نیلامی میں شرکت نہ کی اس طرح انگریزوں کے ادنیٰ ہندو ملازمین اس نئے طریقہ کار سے مسلمان زمینداروں کے مالک بن گئے۔رہی سہی کسر 1793ء میں لارڈ کارنوالس نے بندوبست دوامی کے ذریعہ ہندو ٹھیکیداروں کو مالکان اراضی قرار دے کر پوری کردی۔اس طرح مسلمان زمیندار جاگیرداراور شرفا گداگر،فقیر اور مفلوک الحال ہوگئے۔یہ ایک بھیانک سازش تھی۔جس کاواحد مقصد مسلمانوں کو فکر معاش میں سرگرداں رکھ کر ہندو کے ذریعے فرنگی لوٹ کھسوٹ سے توجہ ہٹانا تھا(ولی مظہر 1983ء ص38)۔کارنوالس کے بندوبست دوامی کو ہنٹر نے پُرفریب "ضرب" قرار دیا ہے۔(ہنٹر،ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء ص137)

برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے ساتھ ان کی اخلاقی وفکری زندگی بھی زوال کاشکار ہوگئی اور فوجی قوت میں بھی فرق آ گیا۔اپنے دورِ حکومت میں وہ سول اور فوجی عہدوں پر متعین تھے۔اس لئے وہ عام طور پر تجارت سے نابلد تھے۔حکومت گئی تو سرکاری آسامیاں بھی گئیں۔جاگیریں اور زمینداریاں ضبط ہوئیں۔نئی انگریزی حکومت نے چونکہ حکومت مسلمانوں سے لی تھی اس لئے اس نے ان کازور توڑنے کیلئے اوران کے ذہنوں سے حکومت کی بو نکالنے کیلئے انھیں چن چن کر نشانہ ءستم بنایا اور ذلیل کیا۔مسلمانوں کے پاس نہ اختیار رہا،نہ دولت،نہ عہدے۔مغربی تہذیب کے علمبرداروں نے بالعموم اور عیسائی مشنریوں نے بالخصوص ان کے عقائد اور دین پر بھی حملے شروع کردیئے۔(عبدالرشید،میاں 1989ء ص97)

انگریزوں نے مسلمانوں کے اندازِ فکر بدلنے کیلئے ملک میں مغربی افکار وخیالات اور انگریزی زبان وادب کی ترویج ضروری ولازمی سمجھی اوراس سلسلے میں سرکاری وغیر سرکاری سطح پر کوششیں عمل میں آئیں۔انگریزوں نے سب سے

پہلے اس کا تجربہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دہلی کالج کے ذریعے کیا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ لیکن جابرانہ نظام حکومت اور لوٹ کھسوٹ کے باعث انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بڑھتا رہا تا آنکہ یہ "لاوا" جنگِ آزادی 1857ء کی صورت میں پورے ملک میں پھوٹ پڑا مگر بدقسمتی سے اس جنگ کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا اور پورے برصغیر پاک و ہند پر "تاج برطانیہ" کا غلبہ ہوگیا (الطاف علی بریلوی سید 1994ء ص 14)۔

تعلیم کے میدان بھی مسلمان پسماندگی کا شکار ہوگئے۔ 1813ء سے جو انگریزی تعلیم کی ترویج شروع ہوئی تو اس کے بعد تقریباً پچاس سال تک مسلمان تعلیم سے بہت حد تک بے توجہی کا شکار نظر آتے ہیں۔ دراصل اس دور میں وہ زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اپنی ساری قوتیں اور توجہات اس مقصد پر مرکوز کئے ہوئے تھے کہ انگریزوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ تعلیمی امور کی بات تو اس وقت پیدا ہوتی جب وہ ذہناً یہ بات مان لیتے کہ انگریز یہاں کی حکمران قوت ہیں اور اب بہ امر مجبوری انہیں اس حقیقت کی مناسبت سے اپنا رویہ وضع کرنا ہے۔ اس دور میں ان کی کوشش یہ تھی کہ ہر مورچے پر انگریزوں سے لڑائی مول لی جائے اور کسی طرح اپنا اقتدار باقی رکھا جائے۔ وہ مَردوں کی طرح لڑے، زخمی شیر کی طرح حملہ آور ہوئے لیکن اس سامراجی قوت کے آگے زیادہ دیر تک ٹھہر نہ سکے۔ تعلیمی میدان میں یہ زمانہ مسلمانوں کیلئے زخم کھانے اور چوٹیں سہنے کا زمانہ تھا۔ جو دنیا انھوں نے تعمیر کی تھی وہ لٹ رہی تھی۔ جو بساط انہوں نے بچھائی تھی وہ الٹ رہی تھی۔ انہوں نے تعلیمی مدارس بچانے کی ہر ممکن حد تک کوشش کی لیکن تاریخ نے اب ان کے اور ان کے مخالفین کے مقامات کو بدل دیا تھا۔ ان کی حیثیت ایک ہاری ہوئی فوج کی تھی جسے افق پر دور تک تاریکی ہی تاریکی نظر آرہی تھی۔ وہ ایک صدی کی کشمکش کے بعد اپنے ہی دیس میں اجنبی اور غلام بنتے چلے جارہے تھے۔ (خورشید احمد 1963ء؛ ص 91)

میکالے کی رپورٹ 1835ء ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم اور اس کے نتیجے میں ان کے معاشرتی مرتبہ و مقام کی بربادی کا ذریعہ بنی۔ پہلے تو انگریزوں نے بہ امر مجبوری اسلامی نظام تعلیم جوں کا توں رہنے دیا تا کہ انتظام چلانے والے افسران تیار ہوتے رہیں۔ اس عرصے میں عوامی تعلیم کی سکیم بھی جاری رکھی لیکن جب اس جدید تعلیم سے ایک نئی نسل تربیت پا کر تیار ہوئی تو اسلامی نظام تعلیم دُور پھینک دیا۔ اسطرح مسلمان نوجوان کے لئے زندگی کے تمام راستے مسدود ہوگئے۔ دینی تعلیم ختم کرنے کیلئے انگریزوں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی تھی جس پر کافی لمبے عرصہ تک مستقل مزاجی کے ساتھ کام ہوتا رہا حتیٰ کہ مدارس کو تالے لگ گئے۔ دینی مدارس کے اوقاف پر حکومت نے قبضہ کرلیا لیکن یہ ساری کاروائی اتنی خفیہ اور غیر محسوس انداز میں انجام پائی کہ مسلمان اس صریح ظلم کے خلاف آواز تک نہ اٹھا سکے۔ (محمد مصلح الدین 1988ء، ص 58)

برصغیر کی تاریخ میں 1838ء مسلمانوں کی تعلیم کے اعتبار سے بڑا منحوس ہے۔ اسی سال مسلمانوں کے اوقاف کمپنی نے اپنے قبضے میں لے لئے اور ان کی آمدنیوں کے مصارف (دینی مدارس) کو ان سے کاٹ کر اپنی موت آپ مرنے کیلئے

چھوڑ دیا۔مشرقی ہند میں جو انقلاب 1838ء میں آیا تھا شمالی ہند میں وہ 1857ء میں آیا۔اگر چہ اس کے ثمرات اسی وقت سے سامنے آرہے تھے۔ 1857ء کے بعد شاید ہی کوئی مدرسہ ہوگا جو باقی رہا ہو۔(ابوسلمان شاجہان پوری 1973ء' ص 21)

انگریز نہ صرف سیاسی لحاظ سے بلکہ مذہبی لحاظ سے بھی مسلمانوں کو حریف تصور کرتا تھا۔آغاز میں تو انھوں نے مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت کرنے کی کوشش کی لیکن 1813ء کے بعد باقاعدہ منصوبے کے تحت مسلمانوں کے مذہب میں مداخلت کی تحریک چلائی گئی اور حکومت برطانیہ نے اس کی سرپرستی کی ۔اس مقصد کیلئے عیسائی مشنریوں کو تبلیغ کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی ۔جب 1837ء میں زبردست قحط پڑا تو ان مشنریوں نے لاتعداد مسلمانوں یتیم بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ان کا مقصد رحم کرنا تھا نہ انسانی ہمدردی بلکہ مکروہ مقصد یہ تھا کہ ان بچوں کو مسلمان سے عیسائی بنادیا جائے (احمد خان' سیّد سر 1955ء' ص 14)۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹر کے ایک اجلاس میں برملا کہا گیا کہ انگلستان کی حکومت کو موقع ملا ہے کہ وہ پورے ہندوستان پر فتح کا پرچم لہرائے۔یسوع مسیح کا پرچم آج ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لہرا رہا ہے۔لہٰذا ہم پر فرض ہے کہ ہندوستان کے ایک ایک شخص کو عیسائی بنانے کیلئے پوری قوت صرف کردیں۔(صلاح الدین' ناسک (س ن)' ص 158)

قانون کے محکمہ میں شروع ہی سے مسلمان چپکے چلے آرہے تھے۔پھر اس کا بھی نمبر آ گیا۔1864ء میں گورنمنٹ نے ''قاضی ایکٹ'' نافذ کیا جس کے بعد سے مسلمان قاضی ختم کر دیے گئے اور مسلمانوں کے نکاح اور طلاق کے مقدمات کا فیصلہ بھی غیر مسلم جج کرنے لگے ۔1866ء میں صدر عدالت کا نام بدل کر ہائی کورٹ رکھا گیا اور عدالتی کاروائی انگریزی زبان میں ہونے لگی ۔بقول سرسید احمد خان: وکالت پیشہ علماء عدالتوں میں بیٹھے اونگھتے تھے اور ان کے منہ پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں (احمد خان' سیّد سر 1962ء ب' ص 46)۔قید وبند اور قتل و ہلاکت کا سلسلہ اس کے علاوہ زوروں پر تھا۔1857ء کی بغاوت کا سارا الزام مسلمان علماء کے سر رکھا گیا۔سینکڑوں علماء خاک وخون میں نہا گئے ۔بقول غالب: کوئی سفید پوش باقی نہیں بچا۔ پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ہزاروں علماء کو انڈمان میں نظر بند کردیا۔(احمد خان' سیّد سر 1961ء' ص متعدد)

ابھی غصہ فرو نہیں ہوا تھا کہ 1864ء میں ''وہابی مقدمات'' کے نام سے علماء پھر زغے میں آ گئے ۔سینکڑوں کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں اور کالے پانی یعنی جزائر انڈمان کی سزا ملی ۔ان تدابیر کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ بقول ہنٹر 1869ء تک ایک بھی شریف اور آسودہ حال مسلمان باقی نہ رہا جو کسی سرکاری عہدہ پر موجود رہا ہو۔علماء، فضلاء، نوابین اور امراء کی اولادیں لکڑہارے اور سقے بن جانے پر مجبور ہوگئیں (ہنٹر' ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء' ص 145)۔کیا غضب تھا کہ وارن ہیسٹنگز کا شریک کار بنیا کنتو بابو دولت میں کھیلے اور شاہان مغلیہ کی اولاد فاقوں مرے۔کنتو بابو نے اپنی ماتا کے کریا کرم پر نوے لاکھ روپے صرف کیے تھے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کنتو بابو کتنا مالدار تھا اور پھر خود وارن ہیسٹنگز کتنا مالدار ہوگا؟ وارن ہیسٹنگز کا جمعدار کلکتہ میں لاکھوں کی جائیداد کا مالک بن گیا تھا اور امرائے بنگال کی اولادیں خیرات کے ٹکڑوں پر پل رہی

تھیں۔(عبداللہ یوسف علی (س ن)، ص 218)

ہنٹر نے پرائیویٹ مراسلت اور اخباری مضامین کے حوالے سے مسلمانوں کے بارے میں برطانوی حکمرانوں کے رویے کا نقشہ کھینچتے ہوئے فارسی اخبار "دوربین" کا حوالہ دیا ہے۔ یہ اخبار 14 جولائی 1869ء کو لکھتا ہے کہ: آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی چھنی جارہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جارہی ہے لیکن وقت ایسا آ گیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندربن کے دفتر میں چند آسامیاں خالی ہوئیں تھیں۔ اس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔(ہنٹر، ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء، ص 149)

ہنٹر نے اڑیسہ کے مسلمانوں کی کمشنر کے نام ایک درخواست اپنی کتاب میں نقل کی ہے جو اس صوبے کے سابق حکمرانوں کی "روٹی کیلئے التجا" کی المناکی کی مظہر ہے:

ہر میجسٹی! ملکہ معظمہ کی وفادار رعایا ہونے کی حیثیت سے ہم یقین رکھتے ہیں کہ حکومت کی ملازمتوں میں ہمارا بھی مساویانہ حق ہے۔ اگر سچ پوچھیے تو اڑیسہ کے مسلمانوں کو روز بروز تباہ کیا جارہا ہے اور ان کے سربلند ہونے کی کوئی امید نہیں۔ مسلمان اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اب بالکل نادار ہیں اور ہمارا بھی کوئی پرسان حال نہیں۔ اب ہماری حالت ماہی بے آب کی طرح ہورہی ہے۔ مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو ہم جناب عالی کے حضور پیش کرنے کی جرات کررہے ہیں اس یقین کے ساتھ کہ جناب عالی ہی اڑیسہ کے ڈویژن میں ہر میجسٹی ملکہ معظمہ کے واحد نمائندہ ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ نسل و رنگ کے امتیاز سے بالاتر ہو کر ہر قوم کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے گا۔ اپنی سابقہ سرکاری ملازمتوں کے چھن جانے سے ہم اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ صمیم قلب سے دنیا کے دور دراز گوشوں کا رخ کرنے کیلئے تیار ہیں۔ ہم ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کیلئے مستعد ہیں۔ ہم سائبیریا کے بے آب و گیاہ حصوں میں مارے مارے پھرنے کیلئے آمادہ ہیں بشرطیکہ ہمیں یقین دلایا جائے کہ ایسا کرنے سے ہمیں 10 شلنگ (ساڑھے سات روپے) ہفتہ کی ملازمت سے سرفراز کیا جائے گا۔(ہنٹر، ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء، ص 150)

برطانوی حکمرانوں کو مسلمانوں کے دو طبقات کا مقابلہ کرنا پڑا' ایک طبقہ امراء کا تھا اور دوسرا طبقہ علماء کا۔ امراء کے طبقے کو تو جبر اور لالچ سے رام کرلیا گیا لیکن علماء اپنے قلندرانہ مزاج کی وجہ سے اس طرح قابو میں آنے والے نہ تھے۔ انگریزوں کو احساس تھا کہ مسلمانوں پر علماء کی گرفت کو کمزور کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ انھوں نے علماء کے اثرات ناکارہ بنانے کے لئے ایک خفیہ سازش تیار کی۔ لہٰذا اس طبقہ کو بدنام کرنے اور صحیح و غلط ہر قسم کے الزامات ان کے سر تھوپنے اور ہمیشہ انہیں مکروہ شکل میں پیش کرنے کی ایک مہم چلادی۔ بار بار ایک ہی نوعیت کے الزامات ہر پلیٹ فارم سے دہرائے گئے۔(مصطفیٰ علی بریلوی سید 1970ء، ص 58)

یہ پروپیگنڈا اس زور وشور سے کیا گیا کہ سارے ملک نے اور خود مسلمانوں کے ایک بڑے حصے نے باور کرلیا کہ

واقعی یہ علماء تنگ نظر، متعصب ہیں، جامد ہیں، ترقی کے دشمن ہیں، سائنس کے خلاف ہیں، انگریزی زبان کے خلاف انھوں نے کفر کے فتوے دئے ہیں۔ان کا وجود ہی قوم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔علماء کو صفائی کا کبھی موقعہ نہیں فراہم کیا گیا اور اگر انھوں نے حقیقت حال کبھی پیش کی تو ان کی شنوائی نہیں ہوئی، نہ اس کی اشاعت ہو سکی۔اس نفسیاتی مہم کا یہ نتیجہ نکلا کہ مولوی اور مُلّا کا لفظ تنگ دلی اور خرابیوں کا ہم معنی بن گیا۔بلکہ ایک گالی ہی بن کر رہ گیا۔آج کوئی جدید تعلیم یافتہ فرد اپنے آپ کو مولوی یا ملا کہلانے کا روادار نہیں تھا۔مُلّا عبدالحکیم سیالکوٹی اور مُلّا جیون امیٹھی کے ساتھ لفظ "مُلّا" سے چڑ پیدا ہونے لگی۔(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ب ص 204)

مسلمانوں کے خلاف برطانوی حکمرانوں کی مخالفانہ سکیموں کے ہجوم میں وائسرائے ارل آف میو (1869ء-1872ء) کے زمانے میں حکومت کا ریزولیوشن نمبر 300، 1871ء کچھ عجیب سا لگتا ہے کہ اس میں صوبائی حکومتوں کو مسلمانوں کے تعلیمی سرمایہ ادب اور انگریزی تعلیم میں مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی سفارش کی گئی تھی (عبدالرشید خان 1986ء ص 47)۔اس ریزولیوشن کے ذریعے درج ذیل ہدایات جاری کی گئیں۔

- گورنمنٹ سکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کی کلاسیکی اور مقامی زبانوں کی مزید اور زیادہ منظم حوصلہ افزائی اور اعتراف و تحسین پر توجہ دی جائے۔
- مسلمانوں کے اضلاع میں قائم مخصوص انگلش سکولوں میں مطلوبہ قابلیت کے مسلمان اساتذہ کے تقرر کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
- مسلمانوں کو گرانٹس دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ وہ اپنے سکول قائم کریں۔
- مسلمانوں کے مقامی ادب کی تخلیق کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے۔
- یونیورسٹی نصاب میں عربی اور فارسی ادب کی زیادہ حوصلہ افزائی کی جائے۔

13 جون 1873ء کو لارڈ نارتھ بروک (1872-1876ء) کے زمانے میں ایک ریزولیوشن کے ذریعے اس پر علمدرآمد کی تدابیر تجویز کی گئیں لیکن 1882ء کی ایک انکوائری رپورٹ سے منکشف ہوا کہ مختلف صوبوں میں جدید تعلیم حاصل کرنے والے مسلمانوں کا تناسب ان علاقوں کی مسلم آبادی کے حساب سے بہت کم تھا۔(الطاف علی، بریلوی سیّد 1997ء ص 3-4)

انگریزوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے منافی سب سے بڑی حکمت عملی یہ اختیار کی کہ ان کی غالب زبان فارسی کی بجائے انگریزی زبان کو غالب کر دیا اور مقامی زبانوں بنگلہ اور ہندی کا رسم الخط بدل دیا۔1876ء میں بنگال میں ہندو بنگلہ اور بنگالی رسم الخط نافذ کر دیا۔صوبہ بہار میں 1871ء میں جبراً اردو کی بجائے ہندی کو نافذ کیا اور ہندی کو بھی فارسی خط کی بجائے ناگری خط میں بدل دیا۔صوبہ پنجاب اور سرحد میں گورمکھی، پنجابی اور ہندی نافذ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن مسلمانان پنجاب کی کوششوں سے اردو کو تعلیمی و دفتری زبان کے طور پر جاری رکھا گیا۔صوبہ سندھ کے مسلمانوں کا فارسی

اور عربی سے اتنا ہی گہرا تعلق تھا جتنا دیگر صوبجات ہندوستان کے عام مسلمانوں کا تھا لیکن 1852ء میں انگریزوں نے یہ تاریخی رشتہ منقطع کر دیا۔ مسلمانان سندھ نے اس سازش کے خلاف خاصی جدوجہد کی لیکن ناکام رہے نتیجہ یہ ہوا کہ جب قیام پاکستان عمل میں آیا تو سندھ بھی انتہائی پسماندہ صوبوں میں سے ایک تھا۔ (مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1970ء ص 55'56)

سر سید نے ہنٹر کی کتاب "دی انڈین مسلمانز" کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک پوری کتاب "ہنٹر پر ہنٹر" تصنیف کی۔ اس میں ان کا موقف یہ ہے کہ ہنٹر نے بظاہر مسلمانوں کے خیر خواہ کی حیثیت سے انگریزی حکومت کی زیادتیوں کی تفصیل بیان کی ہے لیکن اس سے مسلمانوں کے بارے میں انگریز حکمرانوں کے دلوں میں کوئی نرم گوشہ پیدا ہونے کی بجائے یہی خیال پختہ ہوگا کہ مسلمان واقعی انگریزوں کے مخالف ہیں۔ بالفاظ سر سید: ڈاکٹر ہنٹر صاحب کے خیالات سے بجز اس کے کہ یہ مغائرت زیادہ ہو اور کچھ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ (احمد خان' سیّد سر 1949ء ص 110)

ہندوستان کے ساتھ استیصالی تجارت سے انگریزوں کو اتنا فائدہ ہوا کہ انگلستان کا ہر بچہ ہندوستان آنے کی خواہش کرتا تھا۔ تھوڑے عرصہ میں وہ بڑی دولت کما کر واپس ہوتا۔ چنانچہ لارڈ میکالے نے ایسے ہی موقع پر کہا تھا کہ: دولت کے دریا یہاں سے انگلستان بہے چلے جاتے ہیں (طفیل احمد' منگوری سیّد (س ن)' ص 80)۔ ہندوستان کی تباہی کا نقشہ انگلستان کی پارلیمنٹ میں تقاریر کی صورت میں بڑی اچھی طرح محفوظ ہے۔ خاص طور پر مشہور برطانوی مقرر ایڈمنڈ برک کی تقریر۔ جس میں وہ کہتا ہے:

عربوں، ایرانیوں اور تاریوں نے ہندوستان پر بہت حملے کئے جن سے انتہائی تباہی اور خونریزی ہوئی۔ ان کے مقابلے میں عموماً ہمارے قدم اس ملک میں اپنا خون بہا کر نہیں بڑھے البتہ دغا اور فریب کی مختلف صورتوں کے ساتھ پیش قدمی کی اور اس اندھی اور احمقانہ عداوت سے فائدہ اٹھایا جو ان کے درمیان لاعلاج مرض کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے کھلے میدان میں قوت آزمائی نہیں کی لیکن سابقین فاتحین میں اور ہم میں ایک فرق تھا وہ یہ کہ ان کی خوشحالی اور بربادی ان کے نئے وطن (یعنی ہندوستان) کی خوشحالی اور بربادی کے ساتھ وابستہ ہو جاتی تھی۔ ان کے ماں باپ سوچتے تھے تو یہ کہ اسی سرزمین میں ان کی اولاد پھلے پھولے گی۔ زمانۂ سابق کے فاتحین کاشتکار اور صناع سے بھاری محصول تو لیتے تھے لیکن وہ یہ جتیں جن سے دوبارہ فائدہ اٹھانا تھا از سر نو ابھر بھی دیتے تھے۔ تاریوں کی یورش سے بیشک ہندوستانیوں کو نقصان پہنچا تھا۔ مگر ہماری حفاظت ہندوستان کو تباہ کئے ڈالتی ہے۔ نو عمر لونڈے ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔ جہاں کے باشندوں سے ان کا میل جول ہے اور نہ ہی ان سے ہمدردی ہے۔ دولت کی ہوس اور تیز مزاجی جتنی کسی جوان میں ہو سکتی ہے وہ ان لوگوں میں بھری ہوئی ہے۔ ملک میں ان کی آمد کا تانتا بندھا ہوا ہے ایک کھیپ لوٹتی ہے تو دوسری پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستانی رعایا کے سامنے مستقبل کی صرف ایک مایوس کن صورت ہے اور وہ یہ کہ ایک غیر محدود زمانے تک ان موسمی شکاری پرندوں کے غول اسی طرح آتے جاتے رہیں گے، جن کی بھوک ہر مرتبہ اور زیادہ تیز ہوتی رہے گی اور جس چیز کے وہ بھوکے ہیں وہ کمیاب ہوتی جائے گی۔ (محمد الیاس فارانی 1968ء ص 94-95)

المختصر گذشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر جو نتائج ظاہر ہوئے وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی وہ اب روٹیوں کو محتاج ہو چکی ہے۔ اُسے معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے اور اب اس کی 90% آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی کی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برطانوی سامراج کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام عدالت اس کے لئے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سود خور پٹھان کیلئے اس کا ڈنڈا دیتا ہے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی سیّد 1964ء ص 47-48)

3.4 غیر ملکی تہذیب و تعلیم اور مسلمان

برصغیر میں برطانوی اثر و نفوذ کے ساتھ ہی یہاں غیر ملکی تعلیم اور تہذیب کا نفوذ شروع ہو گیا جو برطانوی تسلط کے بعد خاصی جارحانہ شکل اختیار کر گیا۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا وجود میں آ گیا جس نے غیر ملکی تہذیب و تعلیم اختیار کر لینے ہی کو "قومی" ترقی کا ذریعہ سمجھا اور اس کیلئے ہم قوموں کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ بالآخر کامیابی اسی طبقے کو حاصل ہوئی لیکن مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے یہ تصور کبھی قبول نہ کیا۔ مسلمانوں کے اس سوادِ اعظم میں بڑے بڑے علماء اور دانشور بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے کسمپرسی کے عالم میں برصغیر میں مسلمانوں کے حقیقی استقلال کے لئے تعلیمی اور تہذیبی میدان میں بڑی جدوجہد کی اور غیر ملکی تہذیب اور اس کی تعلیمی چھتری کو کبھی سند قبولیت نہیں بخشی۔ (محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء الف، ص 15)

اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر کی سیاسی مطلع کی ابر آلودگی کے ساتھ ہی ملکی تعلیمی اداروں پر ایک آفت آئی۔ عوامی عطیات سے محروم ہونے کے علاوہ یہ ادارے امن و اطمینان کی فضاء سے بھی محروم ہو گئے۔ اسلامی درگاہوں کو زیادہ نقصان پہنچا۔ وارن ہیسٹنگز نے 1780ء میں علوم کے ان مختلف شعبوں کیلئے جو اسلامی مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے کلکتہ مدرسہ قائم کیا۔ اسطرح 1791ء میں سنسکرت کالج بنارس کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ ہندوؤں کے قوانین علم و ادب کو حکومت کی سرپرستی میں ترقی دی جائے۔ نتائج کے لحاظ سے کلکتہ کا مدرسہ اور بنارس کا پاٹ شالہ دونوں ناکام ثابت ہوئے اور ان کی حیثیت بتدریج کم ہو گئی۔ وہ اینگلو اورینٹل درسگاہ بن گئے۔ جنہیں مشرقی علوم یا قانونی عدالتوں کیلئے عملہ تیار کرنے سے کوئی سروکار نہ رہا۔ بنیاد ڈالتے ہی یہ درسگاہیں اعتراض کا نشانہ بن گئیں۔ (بی۔ ڈی باسو 1931ء ص 22)

ایک طرف عیسائی مشنریوں اور ان کے سرپرستوں نے یہ اعتراض کیا کہ حکومت کی طرف سے سنسکرت یا عربی میں غیر عیسائی تعلیم کی حوصلہ افزائی نہ ہونی چاہئے۔ دوسری طرف چند حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا جس میں صداقت بھی تھی کہ تعلیم کا مجوزہ نصاب بہت وسیع ہے اور طلبہ کی تعداد کے مقابلے میں اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تیسرا اعتراض ان لوگوں کی طرف سے ہوا جن کی یہ رائے تھی کہ عیسائی اصول پر انگریزی زبان میں تعلیم کا ہونا ضروری اور مناسب ہے۔

عیسائیت کی طرف میلان کے اظہار کا ہندوستان کے مذہبی حلقوں پر یہ اثر ہوا کہ انگریزی تعلیم کے خلاف تعصب کا ایک زبردست طوفان پیدا ہو گیا۔ قدیم تحریک کی لہریں کبھی آگے بڑھیں اور کبھی پیچھے ہٹیں، یہاں تک کہ علمی فوائد کے نقطہ خیال کا سہرا انگریزی کے سر رہا۔(عبداللہ یوسف علی 1936ء ص 104)

ہنٹر نے اپنی کتاب میں کلکتہ مدرسہ کا خاکہ بڑی طنز و حقارت کے ساتھ پیش کیا ہے:

کالج کے طالب علم ادنیٰ طبقے کے مسلمان گھرانوں میں نکاح خوانی کرتے' وراثت کے قضیے حل کرتے اور غلط سلط فتوے فروخت کرتے پھرتے ہیں۔ان نادار طلبہ سے بڑھ کر نوجوانوں کی کوئی جماعت صحیح رہنمائی کی محتاج نہیں۔ ہماری تربیت کا یہ انداز کہ ان کے ہر سال اپنے محدود طریقہ تعلیم پر اور زیادہ مطمئن،ان کے اخلاق کو اور زیادہ معیوب، زندگی کے کسی شعبے میں سرگرمی سے حصہ لینے کے اور زیادہ نا قابل اور زیادہ بے وفائی کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔یہاں کافروں کے خلاف جہاد کی "پسندیدہ" تعلیم دی جارہی ہے۔ایک باغیانہ تعلیم دینے والی مسجد اسی کالج کے سائے میں پرورش پا رہی ہے۔سات سال کے بعد طالب علم کو چند کتابیں حفظ ہو جاتی ہیں۔ان کے محدود نصاب سے باہر کوئی معمولی سی تحریر بھی ان کے سامنے آ جائے تو وہ اسے بالکل نہیں سمجھتے۔ان کا کچھ نہ جاننا ہی اُنہیں زیادہ خود پسند بنا دیتا ہے۔وہ اسے قطعی حقیقت سمجھتے ہیں کہ عربی، صرف و نحو، فقہ، علم انشاء اور منطق ہی دنیا میں پڑھنے کے لائق ہیں۔(ہنٹر' ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء' ص 174-177)

انگریزوں نے جو ہندوؤں کے لئے سنسکرت اور مسلمانوں کیلئے عربی ذریعہ تعلیم کے اداروں کا منصوبہ بنایا تو اس میں ان کے پیش نظر یہ امر تھا کہ سنسکرت ایک مردہ زبان ہے جسے صرف چند برہمن جانتے ہیں۔سنسکرت ذریعہ تعلیم کی وجہ ہندوؤں میں سے عملاً چند برہمن ہی تعلیم حاصل کر سکیں گے جنہیں قابو میں رکھنا آسان ہو گا۔اسی طرح ان کا خیال تھا کہ عام مسلمان عربی نہیں سمجھتے لہٰذا عربی ذریعہ تعلیم کی وجہ سے ان میں تعلیم عام نہ ہو سکے گی۔اُن کی یہ بھی اسکیم تھی کہ سرکاری سرپرستی میں عربی ذریعہ تعلیم کے اداروں میں کمتر درجے کا نصاب رائج کر کے مسلمانوں کا معیار تعلیم پست کر دیا جائے نیز اس نصاب کے ذریعے مسلمانوں میں جہاد کی روح ختم کر دی جائے (شبیر احمد 1983ء ص 187)۔یاد رہے کلکتہ مدرسہ عربی ذریعہ تعلیم اور ہندو کالج بنارس سنسکرت ذریعہ تعلیم کی مثال تھا۔

1811ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل ارل آف منٹو جو منٹگمری کی طرح ہندوستانی علوم و فنون کا بہت زیادہ دلدادہ تھا اور ان کی ترقی اور اشاعت کو ضروری تصور کرتا تھا، نے کمپنی کے ڈائریکٹروں کو ایک اہم مراسلہ بھیجا جس میں اس نے ڈائریکٹروں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہندوستان میں پرانے علوم و فنون تیزی سے رُو بہ زوال ہیں اور اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔اسلامی حکومت کے زوال سے جو تعلیمی خلا پیدا ہوا وہ کمپنی کے عہد میں اور اس کی بے توجہی کی وجہ سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اسلئے کہ کمپنی نے مسلمانوں کے جانشین کی حیثیت سے اس سمت کوئی قدم نہیں اٹھایا۔اس غفلت اور بے توجہی کا اثر مسلمان قوم پر زیادہ پڑا ہے۔(طفیل احمد' منگوری سیّد (س ن)' ص 167)

کمپنی کو چاہئے کہ وہ اشاعت تعلیم میں مثبت اقدام کرے اور ملک میں جو علوم وفنون اب مٹتے جا رہے ہیں انھیں از سر نو زندہ کرے۔ارل آف منٹو نے بہت سے مقامات کی نشاندہی کی جہاں اس کی رائے میں تعلیمی ادارے قائم کرنا ضروری تھے تا کہ مسلمان بھی تعلیم سے بہرہ ور ہوسکیں ۔یہ مراسلہ جدید ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔کمپنی کے سب سے بڑے ذمہ دار افسر کی طرف سے اس میں تعلیمی پالیسی کے خدوخال مرتب کئے گئے تھے اور ایک ایسی قوم کی تعلیمی پسماندگی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جس پر سیاسی تباہی کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشرتی ہلاکت خیزی بھی طاری ہورہی تھی۔افسوس کہ لارڈ منٹو کے مشورے کے تحت مسلمانوں کی تعلیم پر کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ (محمد حامی الدین 1983ء ص 292)

1853ء تک مسلمانوں نے جدید تعلیم میں بہت کم حصہ لیا۔مسلمان عام طور پر انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم دونوں کے خلاف تھے۔مسلمانوں کے بچے زیادہ تر دیسی مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم پاتے تھے۔مسلمانوں کو انگریزی کی تعلیم دینے کی کوششیں کم رہیں۔کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ جدید تعلیم میں چونکہ مذہبی تعلیم شامل نہیں کی گئی تھی اس لئے مسلمان اس تعلیم کی طرف سے لاپرواہ تھے اور کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ انگریزی کی تعلیم بچوں کو بے دین بنا دیتی ہے۔بچوں کی عادات واطوار اور اخلاق خراب ہوجاتے ہیں۔بہر حال مسلمان زیادہ تر اپنے بچوں کو مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم دیتے تھے یا گھر پر۔(خالد یار خان 1963ء ص 243)

1857ء کے المیہ کے نتیجے میں مسلم ثقافت کو زبردست دھچکا لگا اور بہت سے ادارے بند ہوگئے۔مختصراً وہ قوم جو تعداد میں کم ہونے کے باوجود زندگی کے ہر ایک شعبے میں نمایاں مقام کی حامل تھی اُس پر مایوسی محرومی کے تاریک بادل چھا گئے۔ان مصائب کے علاوہ مسلمانوں کو ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان کے بہت سے رہنما جنھوں نے انقلاب میں سرگرم حصہ لیا تھا یا تو شہید کردیئے گئے یا جلاوطن کردیئے گئے اور جو لوگ حکومت کے وفادار تھے ان میں سے بہت کم رہنمائی کرنے کے قابل تھے۔(ممتاز معین، پروفیسر مسز 1982ء ص 41)

انگریزوں کی تعلیمی پالیسی مسلمانوں کیلئے بڑی خطرناک ثابت ہوئی۔انگریزی تسلط کے ساتھ ہی دیسی نظام تعلیم کے پیداشدہ اہل علم کی بے قدری تیزی سے بڑھتی گئی اور جلد ہی پرانا نظام بالکل ہی برباد کردیا گیا۔مسلمانوں نے جدید نظام سے گریز کی پالیسی اختیار کی تو اس سے انگریز حکمرانوں اور مسلمان رعایا کے درمیان مخالفت کے جذبات بڑھتے گئے جو بالآخر مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔(الطاف علی، بریلوی سید 1997ء ص 2)

جدید تعلیم مسلمانوں کے مذہبی نظریات کے منافی تھی۔یہ تعلیم بنیادی طور سے عیسائی مشنری اداروں پر مشتمل تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق مدراس میں صرف چرچ مشنری سوسائٹی تقریباً 107 سکول چلا رہی تھی جن میں 2882 طلبہ زیر تعلیم تھے (لیاول تھروپ سی 1965ء ص 14)۔خاص اڑیسہ میں باپٹسٹ مشنری سوسائٹی کے زیر اہتمام بارہ اسکول کام کررہے تھے جن میں 619 طلبہ زیر تعلیم تھے اور انھیں اڑیسہ کی زبان میں ترجمہ کرکے عیسائیت کے سبق پڑھائے جاتے تھے۔ان

مشنریوں کا ظاہری مقصد ہندوستانیوں کو جدید تہذیب سے روشناس کرانا تھا لیکن ان کی اصل منشا عیسائیت کو فروغ دینا تھا۔ چنانچہ مسلمان ان کی سرگرمیوں سے خائف تھے۔(ولیم آدم 1868ء،ص 38)

انیسویں صدی کے نصف اول میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار ہندوستان پر مسلّم ہو چکا تھا۔ مگر ان کا تہذیبی اقتدار ہنوز قائم نہیں ہوا تھا۔ مغربی تہذیب کے مادّی وسائل ریل، تار وغیرہ تو ملک کے بڑے حصے میں پھیل گئے اور ہندوستانیوں کے دل میں حیرت اور تعریف کے جذبات پیدا کر رہے تھے لیکن ان کے اس ذہن کی تبدیلی کا اثر بہت محدود تھا اور وہ بھی کلکتے یا معدودے چند مقامات میں ایک چھوٹے سے حلقے تک۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ اوّل یہ کہ ابھی تک ہندوستانی اپنی پرانی تہذیب سے مطمئن تھے اور اس میں کوئی تبدیلی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اُنھیں یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ان کا سیاسی انحطاط دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہے۔ دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کے ساتھ نئے زمانے اور نئی زندگی کے جو فرحت بخش جھونکے آئے تھے ان میں اہل ہند کو سیاسی اور معاشی غلامی کی زہریلی گیس کی بو آتی تھی۔ اس لئے وہ اس سے دور بھاگتے تھے۔(خلیق الزماں چوہدری 1961ء،ص 137-138)

مغربی تہذیب کے نمائندے یا تو نفع کمانے والے تھے جو ان کی آزادی اور دولت چھیننا چاہتے تھے یا عیسائی مبلغ جو اِن کی عزیز ترین متاع یعنی مذہب کے درپے تھے۔ اس لئے اس تہذیب کو بے تعصبی کی نظر سے دیکھنا اور اس کی خوبیوں کی قدر کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ تیسرے یہ کہ لارڈ میکالے جیسے افراد کو چھوڑ کر بحیثیت مجموعی ان انگریزوں پر جو ہندوستان میں رہتے تھے انیسویں صدی کی نئی انگریزی ذہنیت کا اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ دولت اور قوت کا لالچ ضرور رکھتے تھے مگر نسلی اور قومی غرور سے پاک تھے اور ایشیائی قوموں کو غیر مہذب یا نیم مہذب اور اپنے آپ کو اُنھیں مہذب بنانے کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے تھے مثلاً سلیمن جیسا انگریز جس نے قوت کے نشے میں سرشار ہو کر اودھ کے تاجدار سے انتہائی حقارت اور ذلت کا برتاؤ کیا(علی اظہر برلاس، مرزا 1984ء،ص 25-26)۔ قدیم طرز کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمان امراء کی تہذیب وشائستگی کا قائل تھا اور ان کی ذہنی برتری کا اعتراف کرتا تھا۔ غرض حکومت کی تہذیبی پالیسی کچھ بھی ہو مگر عام انگریز اس وقت تک اپنی تہذیب ہندوستانیوں پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ ایک حد تک خود اس سے متاثر تھا۔ 1857ء کے بعد دفعتاً نقشہ بدل گیا۔ ہندوستانیوں کو اپنی بے بسی کے احساس سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس نے ان کے راسخ عقیدت کو جو وہ اپنی تہذیب سے رکھتے تھے متزلزل کر دیا۔(عابد حسین 1984ء،ص 127)

ابوالاعلیٰ مودودی نے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی پھر سے چاہت پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ تھا مغربی تعلیم کا دروازہ۔ روٹی اور عزت کے لاکھوں بھوکے ادھر لپکے۔ وہاں ہاتفِ غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کیلئے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو مسلمان بن کر نہ آؤ، اپنے دل و دماغ، اپنے دین، اخلاق، اپنی تہذیب اور آداب،

اپنے اصول حیات اور اپنی طرز معاشرت، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو، تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تمہیں دیئے جائیں گئے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت مہنگی چیز مل رہی ہے۔ بیچو اس کباڑ خانے کو، یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب و منصب جیسی بے بہا چیزوں کے معاوضے میں مانگی جارہی ہیں آخر ہیں کس کام کی؟ انہیں تو رہن رکھ کر بنئے سے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے۔(ابوالاعلیٰ مودودی سید 1964ء ص 48)

ہنٹر کی کتاب ''دی انڈین مسلمانز'' میں طنز و تحقیر کی نیش زنی کے باوجود اس حقیقت کا اعتراف موجود ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے قبل مسلمان ملک کی نہ صرف سیاسی بلکہ ذہنی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے لیکن انگریزی سکول ایسی مسلمان جماعت پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جو یونیورسٹی کے امتحان مقابلہ میں کامیاب یا کسی پیشے ہی میں داخل ہو سکے۔اس نے واضح طور سے اعتراف کیا ہے کہ ہمارا طریقہ تعلیم مسلمانوں کی روایات کے بالکل خلاف اوران کی ضروریات کے بالکل غیر مطابق ہے بلکہ ان کے مذاہب کی تحقیر کرتا ہے۔(ہنٹر' ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء ص 151)

انگریزوں کی لسانی پالیسی مسلمانوں کیلئے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی۔اس کا تجزیہ کرتے ہوئے سندھ یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر پروفیسر حسن علی عبدالرحمٰن کہتے ہیں:

سب سے بڑا صدمہ جو ہمارے تعلیمی نصاب کو پہنچا وہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے پہنچا۔ہمارے استادوں اور طالب علموں کی برسوں کی محنت جسے تحصیل علم میں صرف کرنا چاہئے تھا، محض ایک غیر زبان کی تحصیل میں رایگاں گئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے طالب علموں کی اکثریت نے مقررہ مضامین اور کتب نصاب بغیر سمجھے رٹنے اور ایک رسمی امتحان پاس کر لینے کو تعلیم کا مترادف سمجھ لیا۔اس تعلیم نے انہیں ایک سند تو دلا دی اور سرکاری ملازمتوں کے ان کے لئے دروازے بھی کھول دیئے لیکن علوم و فنون کے اصل خزانوں تک ان کی رسائی ناممکن ہوگئی۔سوچنے اور سمجھنے کی قوت کمزور پڑ گئی۔کسی علم یا فن میں جو اصلی لیاقت اور مہارت پیدا ہوتی ہے وہ مفقود ہوگئی۔یہی سبب ہوا کہ برائے نام جدید علوم و فنون کے باوجود انگریزوں کے اقتدار کے کم و بیش دوسو سالہ دور میں ہم کوئی موجد، کوئی محقق اور کوئی سائنس دان یا ماہر ایسا پیدا نہ کر سکے جو کسی حد تک بین الاقوامی شہرت کا مالک ہوتا۔ہماری تعلیم اور تحقیق علمی دونوں کا معیار ایسا پست ہوا کہ ہم اپنے سارے قدرتی ذرائع اور وسائل کے باوجود ترقی کی دوڑ میں دنیا کے بعض چھوٹے چھوٹے ملکوں سے بھی پیچھے رہ گئے۔(بحوالہ مصطفیٰ علی' بریلوی سید 1970ء ص 52)

انگریزی تہذیب سے مسلمانوں کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ انگریزی فن طب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اوراسے حجام اور جراحوں کا پیشہ سمجھتے تھے۔پرانے مسلمان طبیب جو یہ فن عربی اور فارسی کتابوں سے حاصل کرتے تھے' گوشہ نشین ہوگئے۔جہاں حکومت نے طب کی تعلیم کا انتظام کیا وہاں یہ فن سیکھنے کیلئے اعلیٰ خاندان کے مسلمان داخل ہی نہیں ہوتے تھے۔(ہنٹر' ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء ص 148)

دوصد سالہ غلامی کے دور میں مسلمانوں میں وہ ساری خامیاں اور قباحتیں پیدا ہوگئیں جنہیں غلامی کا لازمی اثر کہنا

ناموزوں نہیں ۔غلاموں کے کرداری خصائص میں خوف زدگی ،احساس کمتری ،مرعوبیت، جہالت ،ناخواندگی اور عزت نفس کا عدم ادراک بنیادی اہمیت کے حامل ہیں اور برصغیر کے مسلمانوں میں یہ سارے خصائص بدرجہ اتم موجود تھے ۔مسلمانوں کا انتہائی وسیع تعلیمی نظام جس میں ناخواندہ مسلمان کا کوئی تصور موجود نہ تھا، دو صدی پہلے تباہ ہو چکا تھا۔غلامی کی دو صدیوں میں تو وہ علمی پسماندگی کی عمیق تر غار میں اترتے چلے گئے اور گھروں میں بچے کھچے علمی تاثرات بھی کم وبیش کلیتہً مٹ گئے۔ 1875ء سے پہلے کی آزادی کی تحریکوں اور 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور انگریزوں کی شدید ترین انتقامی کاروائیوں نے مسلمانوں کے صف اول اور صف دوم کے رہنماؤں کا صفایا کر دیا اور تیسرے درجے کے وہ لوگ باقی بچے جو ہمت وحوصلہ کے خصائص سے کم وبیش خالی تھے ۔(محمد یوسف بھٹہ 1984ء ص 41)

اوپر سے انگریزوں کا جابرانہ نظام حکومت جس میں سرکاری اہلکاروں کی درجہ بندی میں پست ترین سطح پر کمتزین تعلیم یافتہ اہلکار، جن کے خصائص میں اخلاق سے بے نیازی، کمترین تنخواہ، زیادہ اختیارات اور اس پر مستزاد اختیارات کے ناجائز استعمال کے وسیع مواقع اور رشوت بطور جزو لازم شامل تھے جو انہیں احساس برتری بلکہ فرعونیت کے احساس میں مبتلا کرنے کیلئے کافی تھے ۔انہیں خصائص کو پختہ کرنے کیلئے جاگیرداروں، سرداروں اور ذیلداروں کا ایک وسیع سلسلہ قائم تھا جن کے مفادات انگریزوں کے ساتھ وابستہ تھے اور وہ اپنے اوپر انگریز کو اپنا رب سمجھتے تھے اور نیچے عام لوگوں کو کمتر نسل کی ایسی مخلوق، جس کے وجود کا جواز محض ان کی خدمت گزاری اور ان کے ظلم واستیصال کو بے چون وچرا قبول کرنا تھا۔ (عبدالرشید ارشد ،ڈاکٹر 1995ء الف ،ص 15)

گویا جدید تعلیم ،اپنے تاثرات کے لحاظ سے مسلمان کی کندن جیسی خودی کیلئے ایک خطرناک تیزاب کا درجہ رکھتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اقبال کے نقطہ نظر سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان اپنی خودی سے انکاری اور اپنے آقاؤں کی خودی کا اقراری بن گیا ہے ۔وہ اپنے آپ سے "منکر" اور مغربی آقاؤں کا "مومن" ہے اور اس انکار واقرار کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مٹی میں ملا رہا ہے تا کہ اس اینٹ اور گارے سے اس کے آقاؤں کے فلک بوس ایوان وکسریٰ تعمیر ہوں (محمد احمد ،خان 1978ء ،ص 70) ۔جدید تعلیم سے "آراستہ" لوگوں کی شخصیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

اسلامی تعلیم سے وہ قطعی کورے ہیں ۔ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے ۔اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گذرتی ۔وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں ۔اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے ۔خواہشات نفس کو انھوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے ۔اور یہ معبود اس مغربی تہذیب کی طرف انہیں لئے جا رہا ہے، جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے ۔وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں ۔وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں ۔لباس، معاشرت، کھانے ،پینے، میل جول اور بات چیت، حتیٰ کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں ۔انہیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جس کا حکم مذہب نے انہیں دیا ہے اور ہر اس کام سے رغبت ہے جس کی طرف مغربی تہذیب انہیں بلاتی ہے۔

(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 1964ء،ص 49)

انگریزوں کے نسلی غروراوران کی بیگانگی کی وجہ سے ہندوستانیوں کو یہ تہذیب بھی اچھی طرح اپنانے کا کوئی موقع نہیں ملا۔حاکم ومحکوم کے درمیان استادی شاگردی کا رشتہ یوں بھی بڑی مشکل سے نبھتا ہے اور جب حاکم قوم کا احساس برتری اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ وہ محکوم سے معاشرتی تعلقات رکھنا اپنی کسر شان سمجھے تو ظاہر ہے اس میں وہ ذہنی قرب ناممکن ہے جس کے بغیر آج تک کوئی شاگرد استاد کی حقیقی روح کا محرم نہیں ہو سکا چنانچہ جب ہندوستانیوں نے انگریزوں کی تہذیب ان کی زندگی میں مجسم دیکھنے کی کوشش کی تو انہیں دور سے صرف اس کی ظاہری اور سطحی چیزیں ہی نظر آئیں یعنی وضع اور لباس، ان کے رہنے سہنے کا طرز،ان کی مادیت پرستی اور ان کی مذہبی تشکیک اور انہیں چیزوں کے حاصل کرنے میں وہ ساری کوشش صرف کرتے رہے۔(عابد حسین 1984ء،ص 131)

انگریزی تہذیب وتعلیم کے بارے میں تحفظات کی نفسیات اوپر کے جائزے سے معلوم ہو سکتی ہے۔اسے جاہلانہ تعصب پر محمول نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ بعض ناقدین ظاہر کرتے ہیں۔پروفیسر محمد سلیم نے "مغربی زبانوں کے ماہر علماء علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے" کے عنوان سے مسلمانوں کے ان اصحاب علم وفضل کا تذکرہ مرتب کیا جنہوں نے مغربی زبانوں اور مغربی علوم وافکار میں دلچسپی لی،مغربی علوم کا مطالعہ کیا اور مغربی علوم کے تراجم پیش کئے،مغربی زبان میں تصانیف کیں اور دیار مغرب کا مشاہدہ کیا۔انہوں نے واضح کیا کہ مسلمانوں نے انگریزی زبان اور انگریزی علوم کے حق میں اس وقت آواز بلند کی جب نہ سرسید احمد خان کا کہیں پتہ تھا نہ راجہ رام موہن رائے کا۔(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ءالف،ص 18)

جدید تعلیم سے مسلمانوں کے گریز کا بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں مذہبی تعلیم سرے سے نظر انداز کی گئی تھی۔مسلمانوں کے دور کی تعلیم میں دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا انتظام ہوتا تھا۔انگریزی حکومت کے قائم کردہ سکولوں اور کالجوں میں مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا جبکہ مسلمان تعلیم کو مذہبی فریضہ سمجھتے تھے اور مذہب کی تعلیم کے بغیر ان کے نزدیک تعلیم بے معنی تھی۔علی گڑھ کالج والوں نے مسلمانوں کی اس نفسیات سے کام لے کر مذہبی تعلیم کے نام ایک مضمون نصاب میں شامل کر دیا اور کالج کے ساتھ عبادت گاہ کا انتظام کر دیا۔چنانچہ عام سرکاری کالجوں کے مقابلے میں علی گڑھ کالج میں مسلمان طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔سرکاری اداروں میں مذہبی تعلیم کا انتظام نہ ہونے سے مسلمانوں کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ وہ بچوں کو آٹھ دس برس تک گھروں میں تعلیم دیتے تھے اور جب انہیں اسکولوں میں داخل کیا جاتا تھا تو نوعمری کا زمانہ گزر جاتا تھا۔مسلمانوں پر ہندوؤں کی تعلیمی برتری کی ایک وجہ یہی تھی کہ ہندو اپنے بچوں کو چھ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کروا دیتے تھے۔(عبدالرشید خان 1986ء،ص 56)

مسلمانوں کی نفسیات کے حوالے سے بنگال کی خصوصی صورت حال سامنے رکھتے ہوئے ہنٹر نے لکھا کہ: جدید تعلیم سے مسلمانوں کے اشراف کے گریز کا ایک واضح سبب یہ تھا کہ اس کا ذریعہ تعلیم بنگالی زبان تھی جسے مسلمان حقیر سمجھتے

ہیں۔ان کے نزدیک عربی اور فارسی اشراف کی زبانیں تھیں۔یہ دونوں زبانیں جدید تعلیم میں کلی طور سے نظر انداز کی گئی تھیں۔مزید براں ان سکولوں میں ہندو ماسٹر پڑھاتے تھے جن کا "عاجزانہ اور بزدلانہ طور طریق" مسلمان بچوں میں قیام ضبط کے لحاظ سے ناکام تھا۔اس وجہ سے بھی شریف مسلمان اپنے بچے ایسے استادوں کی شاگردی میں دینے کیلئے تیار نہ تھے۔(ہنٹر،ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء،ص 153)

3.5 ہندوؤں کا مسلمانوں کے ساتھ رویہ

برطانوی دور میں مسلمانوں کی حالت زار کے عناصر وعوامل میں ہندوؤں کے رویے کی بھی نمایاں حیثیت ہے۔مسلمانوں کے دور حکومت میں انھوں نے مسلمانوں کی رواداری اور فراخ دلی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا لیکن انگریزوں کا اثر ونفوذ دیکھتے ہوئے وہ خواہ مخواہ مسلمانوں کے مخالف بن گئے۔تحریک آزادی کے سلسلے میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کے تمغے بھی حاصل کرتے رہے اور انگریزوں کی نوازشات سے فائدے بھی اٹھاتے رہے۔اسے ڈپلومیسی کہا جائے یا منافقت، بڑی فنکاری کی بات ہے۔(الطاف علی بریلوی سیّد 1982ء،ص 11)

اسلام کے دور سے قبل برصغیر کے ہندو معاشرے کا یہ حال تھا کہ تعلیم معدودے چند برہمنوں کا اجارہ تھی۔مسلمانوں نے تعلیم عام کی تو ہندوؤں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔مسلمان حکمرانوں نے سنسکرت ادب کے ترجموں کی بھی سرپرستی کی اور مندروں سے ملحق تعلیمی اداروں کیلئے بڑے بڑے اوقاف قائم کئے۔ہندوؤں نے اپنے علوم کے علاوہ فارسی زبان کی تحصیل میں بھی بڑے ذوق شوق کا مظاہرہ کیا۔دونوں قوموں کے قریبی میل ملاپ اور فارسی ہندی امتزاج کی وجہ سے اردو زبان وجود میں آئی (ضیاءالدین احمد 1997ء،ص vi,v)۔مسلمانوں کا ہندوؤں پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے علوم وفنون میں وسعت پیدا کی۔مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں میں کتب خانوں کا شوق پیدا ہوگیا۔بڑے بڑے ہندو امراء کے ایوانوں میں دیگر سامان آرائش کے ساتھ ساتھ کتب خانے کا وجود بھی لوازم ریاست میں سے ایک سمجھا جانے لگا۔(سلیمان ندوی،سیّد 1958ء،ص 27، 29، 42)

اورنگ زیب عالمگیر کو عموماً ہندوؤں کے بارے میں شدید سمجھا جاتا ہے۔حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے عہد میں بنگال کے ہندوؤں کو منصب داری اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں اور وہ بڑے بڑے زمیندار بنا دیے گئے۔اس نے ہندوؤں کو گورنر اور نائب السلطنت بنایا، یہاں تک کہ اس نے خالص مسلم صوبہ افغانستان پر بھی جو نائب السلطنت مقرر کیا وہ ہندو راجہ جسونت سنگھ آف جودھ پور تھا۔(شمس القمر قاسمی 1973ء،ص 15)

مسلمانوں کے تمام تر احسانات کے باوجود ہندو ہمیشہ ایسے "مہابھارت" کا خواب دیکھتے رہے۔جس کی حدود دہلی سے شام تک وسیع ہوں۔لاہور کے راجہ جے پال اور آنند پال نے سلطان سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی پر ان ہی ادھورے

خوابوں کی تکمیل کیلئے کابل جا کر بلا اشتعال وبلا جواز متعدد حملے کئے ۔یہ کہنا تاریخی حقائق کا مذاق اڑانا ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے برصغیر پر بلا جواز یلغار کی۔ یہ حقیقت پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ ہندوراجاؤں نے "عظیم بھارت" کا سہانا سپنا پورا کرنے کیلئے کابل پر حملہ آور ہو کر اس کی ابتداء کی تھی ۔مسلمانوں کے دور انحطاط میں ہندوؤں نے مرہٹوں کی شکل میں برصغیر میں مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن 1761ء میں پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں شکست کھا کر آئندہ کیلئے انگریز کی حاشیہ برداری کر کے مسلمانوں کے خلاف دشمنی اور بغض کا اظہار کرتے رہے ۔(ولی مظہر 1983ء ص 33)

1780ء میں وارن ہسٹنگز نے مسلمانوں کے تعلیمی فروغ کیلئے کلکتہ مدرسہ قائم کیا تو جلد ہی حکومت کو خیال ہوا کہ ہندوؤں کی تالیفِ قلوب کیلئے بھی ایسا اقدام کیا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ مسلمان تعلیمی دوڑ میں ہندوؤں سے آگے بڑھ کر بحیثیت قوم کوئی خاص سیاسی امتیاز یا تفوق حاصل کر لیں ۔چنانچہ جلد ہی بنارس میں گورنمنٹ کے حکم سے ایک ہندو سنسکرت کالج قائم کیا گیا جو ہندوؤں کیلئے مخصوص تھا۔اس ادارے پر حکومت کی خاص توجہ رہی اور اس نے جلد سے جلد ترقی حاصل کر لی جب کہ کلکتہ مدرسہ انگریز حکام کی بے پروائی اور عدم ہمدردی کی وجہ سے مسابقت میں پیچھے رہ گیا۔یہ دونوں ادارے سیاسی اغراض کے تحت وجود میں آئے تھے اور ان کے انتظام وانصرام ترقی اور سرکاری امداد دینے کیلئے جو پالیسیاں مرتب کی جاتی تھیں ان کے پس منظر میں تعلیمی بہبود سے زیادہ سیاسی اور استعماری محرکات کارفرما ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ کلکتہ مدرسہ، بنارس ہندو کالج کے مقابلے میں پیچھے رہ گیا۔(محمد حامی الدین 1983ء ص 292)

مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی سرپرستی کی پالیسی انگریزوں کے اس تصور پر مبنی تھی کہ مسلمانوں کی قوم "اصولاً" ان کی دشمن ہے(سمیع اللہ قریشی 1981ء ص 27)۔انگریزوں نے ہندوؤں کی "رضا جوئی" پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہیں مسلمانوں کے خلاف آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ہندو بنیوں نے سرکاری سرپرستی میں خوب لوٹ مار کی۔ ایڈمنڈ برک نے اس صورت حال کی یوں نقشہ کشی کی ہے :بنیا دیوان انگریز کے گھر کا منتظم ہوتا ہے ۔وہ تمام چالبازیوں، فریب اور عیاریوں سے واقف ہوتا ہے۔ استیصال بالجبر اور غارت گری کرتا ہے اور اس میں سے جس قدر مناسب سمجھتا ہے اپنے صاحب کو بھی دے دیتا ہے ۔ان بنیوں نے بڑے بڑے گھر الٹ دیے ہیں ۔ملک برباد کر دیا ہے اور سرکاری مالگذاری کو سخت نقصان پہنچایا ہے ۔(محمد الیاس فارانی 1968ء ص 96)

انگریزوں نے شاہ عالم ثانی سے بنگال کے "دیوانی حقوق" حاصل کئے تو بے شمار مسلمان جو مالی اور دیوانی محکموں سے وابستہ تھے اپنا روزگار کھو بیٹھے۔کمپنی نے ان عطایا اور معافیات پر بھی قبضہ کر لیا جو مسلمان بادشاہوں نے مسلمان مدارس کو بخشی تھیں ۔اس سے مسلمانوں کا تعلیمی نظام اپنا استحکام کھو بیٹھا۔1793ء میں لارڈ کارنوالس نے بنگال میں بندوبست دوامی نافذ کیا تو وہ ہندو محصلین جو اس وقت صرف چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرتے تھے زمیندار بن گئے ۔زمین پر انہیں مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے اور انہیں اجازت مل گئی کہ اس تمام دولت پر قبضہ کر لیں جو خود اپنی حکومت کے تحت مسلمانوں کے پاس

تھیں ۔اس طرح مسلمان زمیندار تنگ دست ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان زمیندار کا تناسب 95فیصد سے گھٹ 5فیصد رہ گیا۔1837ء میں فارسی کی بجائے دفاتر کی زبان انگریزی کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو تعلیم وتربیت دے کر اور تہذیب کے نئے معیار کے سانچے میں ڈھال کر صرف ان ہی پر اعتماد کیا جائے اور مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔(سمیع اللہ قریشی 1981ء ص 36)

ہندوؤں نے انگریزوں کے تسلط اور اقتدار کا خوب فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں پر ظلم وستم کے معاملے میں انگریزوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔دراصل عیسائیوں اور ہندوؤں دونوں نے اپنی چھپی ہوئی اسلام دشمنی کو کھل کھیلنے کا خوب موقع دیا۔برصغیر پاک وہند کا پرانا نظام بتدریج ٹوٹ رہا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا "تجارتی سرمایہ دارانہ" نظام لے رہا تھا۔بے شک اس نظام کا کرتا دھرتا انگریز تھا لیکن اسے ایک نئے ملکی طبقے سے بڑی تقویت مل رہی تھی اور یہ طبقہ تھا نو دولتیے بنیوں اور مارواڑیوں کا۔اٹھارہویں صدی کے دوران جب یو۔پی اور بہار کا سامانِ تجارت بنگال کے ذریعے باہر جانے لگا تو شمالی ہند کے تجارت پیشہ لوگ مرشد آباد اور کلکتہ کا رخ کرنے لگے اور بنگال میں مارواڑی لکھ پتیوں کا زور بہت بڑھ گیا۔(محمد الیاس فارانی 1968ء ص 92)

بے شک نواب اور سپہ سالار کبھی کبھی ان سے جو بن پڑتا تھا نچوڑ لیا کرتے تھے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں صوبوں کی معاشی زندگی کا اقتدار زوال پذیر مغل نوابوں کے ہاتھ سے ان بنیا سرمایہ داروں کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔اگرچہ نواب اپنے درباروں میں اُن کی اکثر ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتے تھے لیکن خزانے کی کنجیاں انہی کے پاس ہوتی تھیں۔بنیوں کا یہ طبقہ ہندو تھا۔انگریز حاکموں اور تاجروں سے ان کی خوب چھنتی تھی۔اور مسلمانوں کی حکومت سے اس طبقے کو موروثی نفرت تھی۔اس نئے طبقے کی آمد سے ہندوستان کی ہیئت اجتماعی میں ایک بہت بڑا تغیر آیا۔پرانا نظام دم توڑنے لگا۔انگریز اور بنیئے کا مخلوط نظام برسر اقتدار آنے لگا۔(محمد سرور 1991ء ص 16)

انگریزی دور میں ہندوؤں نے ملازمتوں میں داخل ہونا شروع کیا اور رفتہ رفتہ سرکاری زندگی کے تمام شعبوں پر چھا گئے۔یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ کلکٹری میں جہاں اب بھی پرانے طریقہ کے مطابق دوستی کی بنا پر ملازمت مل جانے کا امکان تھا بہت کم مسلمان افسر تھے۔جو مسلمان ابھی اس محکمہ میں باقی تھے وہ بہت بوڑھے تھے اور ان کا کوئی جانشین مسلمان نہیں تھا۔ناظر یا مالگواری کے افسر کی آسامیاں مسلمانوں کے بعد مسلمانوں ہی کو ملا کرتی تھیں مگر اب جیل کی ایک دو غیر معتمد آسامیوں کے علاوہ ہندوستان کے یہ سابق فاتح کسی ملازمت کی امید نہیں رکھ سکتے تھے۔مختلف دفاتر میں کلرکوں کا عملہ عدالت کی ذمہ دار آسامیاں اور تو اور پولیس کی اعلیٰ ملازمتیں بھی سرکاری سکول کے چالاک ہندو لڑکوں سے پُر کی جاتی تھیں۔(ہنٹر ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء ص 141-142)

ہندومت نے شروع ہی سے انگریزی حکومت اور یورپی تہذیب دونوں سے تعاون کیا اور اس طرح سرکاری عہدے بھی حاصل کیے اور مسلمانوں کی جاگیروں اور زمینداریوں پر بھی ہاتھ صاف کیا۔یہی نہیں بلکہ ہندو شروع ہی سے یہ

بھانپ گئے کہ مغربی جمہوری نظام کے ذریعہ وہ سارے برصغیر پر اپنا سیاسی اقتدار بھی قائم کر سکتے ہیں۔ پھر انگریز پادریوں کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی اسلام پر رکیک حملے شروع کر دیئے کیونکہ انہیں بھی اسلام کے خلاف صدیوں پرانا بغض تھا (عبدالرشید، میاں 1989ء، ص 95)۔ انگریزوں نے ہندوؤں میں قومیت کا احساس پیدا کرنے کی غرض سے سنسکرت زبان زندہ کرنے کی سعی لاحاصل کی اور نئی ہندی کو جنم دیا۔ بنارس اور کلکتہ میں ہندو مسلمانوں کی علیحدہ علیحدہ درسگاہیں بنا کر مختلف نقطہ ہائے نگاہ کی پرورش کی۔ سر ایڈورڈ آرنلڈ لارڈ ڈلہوزی کے دور پر رقم طراز ہے: ہم ہندوستان میں ایک قوم بنا رہے ہیں، یہاں اب تک ہزاروں قبائل تھے مگر ایک واحد قوم نہ تھی۔ انگریزوں کا ہندوؤں میں جذبہ قومی کا احیاء کرنا بادی النظر میں کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن دراصل یہ مسلمانوں کے مقابلے میں ایک زبردست اکثریتی قوت لانے کا پروگرام تھا۔ طویل مسلم عہد حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کی بنیادی ہیئت کو نہیں بدلا گو فارسی زبان کی وجہ سے ہندو مسلمانوں میں ایک خاص وحدت فکر پیدا ہو گئی تھی۔ (مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1970ء، ص 57)

خود مسلمانوں میں یورپی تہذیب کا ردعمل دو صورتوں میں ظاہر ہوا۔ ایک طبقہ جس میں زیادہ تر علماء تھے انگریزی حکومت کے مسلمانوں پر مظالم اور عیسائی مشنریوں کے اسلام پر سوقیانہ حملوں کے باعث یورپی تہذیب ہی سے برگشتہ ہو گیا۔ اس نے اسے قابل نفرت چیز سمجھا۔ ان لوگوں نے انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کی سختی سے مخالفت کی اور اسے غیر اسلامی کہہ کر مسلمانوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں نے غالباً انگریز دشمنی ہی کے زیر اثر مغربی تہذیب کے تصور وطنیت کو اپنا لیا اور تحریک وطنیت میں ہندوؤں سے تعاون پر آمادہ رہے۔ اس سے دو گونہ نقصان پہنچا ایک تو یورپی افکار سے الگ رہ کر قوم نئی فکری قوت سے محروم ہوئی اور دوسری طرف ہندو سے سیاسی تعاون کے باعث مسلمان اپنے الگ سیاسی وجود سے محروم ہوا اور ہندو کا تابع مہمل بنا۔ (عبدالرشید، میاں 1989ء، ص 95)

ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں جس طرح فارسی کو اختیار کر لیا تھا اسی طرح انگریزی کو بھی بلا تامل قبول کیا لیکن مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ بڑے دوررس نتائج کا حامل تھا۔ انہوں نے خیال کیا (یہ خیال کچھ ایسا غلط نہ تھا) کہ انگریزی تعلیم کو رائج کرنا مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور ان کے مذہب کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے چنانچہ وہ انگریزی زبان سے دور ہی رہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1880ء-1881ء میں جہاں انگریزی ہائی سکولوں میں 366.86 ہندو طلبہ زیر تعلیم تھے وہاں ان کے مقابلے میں مسلمان طلبہ کی تعداد صرف 363 تھی۔ (فرمان فتح پوری 1990ء، ص 63)

سرسید نے بلا تفریق مذہب و ملت برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ان کے دوستوں میں ہندو بھی شامل تھے۔ وہ جگہ جہاں آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شاندار عمارت کھڑی ہے مشہور انقلابی رہنما راجہ پرتاب کے بزرگوں کی ملکیت تھی۔ جب سرسید نے علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کرنے کا ارادہ کیا تو ہندو مالکان نے یہ زمین سرسید کی نذر کر دی۔ اس زمانے میں سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ 1867ء میں ہندوؤں نے خود افتراق کی بنا ڈالی۔ اس وقت اردو سرکاری دفاتر کی زبان تھی۔ لوگ اُردو میں ہی

سرکاری محکموں میں درخواستیں پیش کرتے اور اسی زبان میں انہیں جواب دیا جاتا تھا۔ دفاتر کا ریکارڈ بھی اُردو میں رکھا جاتا تھا۔(ایم۔اے رزاق ڈاکٹر 1986ء ص 62)

یکا یک یو۔پی کے تنگ نظر اور عاقبت نا اندیش ہندووں نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ سرکاری دفاتر میں اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ دیں اور اس زبان کے لئے دیوناگری رسم الخط اپنائیں۔اس مطالبے نے جلد ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی اور ہندو رہنما گورنر سے ملنے اور اس پر دباؤ ڈالنے لگے۔سرسید احمد خان، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک جیسے اصحاب فکرونظر جو ہندو مسلم اتحاد کا خواب دے رہے تھے وہ ہندووں کے اس غیر دانشمندانہ مطالبے پر بڑے حیران ہوئے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئے کہ ہندووں نے افتراق میں پہل کر دی ہے۔اس لئے اب ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں گی۔اس کے بعد سرسید نے اپنی تمام تر توانائی اور صلاحیت مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر لگا دی اور جب 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو سرسید اور ان کے رفقاء نے مسلمانوں کو ہندووں کی اس سیاسی تنظیم سے الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیا۔(محمد اسلم، پروفیسر (س ن) ص 64)

دور غلامی کی وجہ سے ہندو احساس کمتری میں مبتلا تھا۔اس احساس کے ازالے کیلئے انہوں نے بہت سی چالیں چلیں۔ان ہی میں سے ایک اردو زبان اور رسم الخط کی مخالفت تھی۔ہندی پرچارک مجلس کے سیکرٹری بابو سنڈل پال نے اس سلسلے میں سرسید احمد خان سے خط کتابت شروع کی سرسید احمد خان نے ان خطوط کا منہ توڑ اور دندان شکن جواب دیا۔سرسید کی بالغ نظری اور ان تھک کوششوں نے ہندووں کی یہ تحریک کامیاب نہ ہونے دی۔1882ء میں ایجوکیشن کمیشن میں ہندووں نے اردو کی بھرپور مخالفت کی۔شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندووں نے مل کر تجاویز، یادداشتیں اور محضرنامے تیار کئے اور کمیشن کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ زبان کے بارے میں مطلق غور نہ کرے کیونکہ یہ تعلیمی معاملہ نہیں بلکہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔سرسید احمد خان کی وفات سے کچھ دن پہلے مارچ 1898ء میں یو۔پی کے ہندووں نے پھر بڑی شدت کے ساتھ ہندی مسئلے کو اٹھایا اور حکومت کے سامنے پیش کیا کہ عدالتوں میں ہندی رائج کی جائے۔(قدرت نقوی 2002ء ص 7، 8)

جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے تو اب یہ بات تاریخ کی روشنی میں واضح ہوچکی ہے کہ اس کے قیام کے پس پشت انگریز کی حکمت عملی کا پوشیدہ ہاتھ کارفرما تھا۔کانگریس کے پہلے صدر ڈبلیو سی بیز جی کا یہ اعتراف ریکارڈ پر موجود ہے کہ:

کانگریس کی بنیاد لارڈ ڈفرن کے اشارے پر ہوئی جس نے مسٹر ہیوم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ کانگریس کی تنظیم کے سلسلہ میں جب تک وہ خود ہندوستان میں موجود ہے اس کا نام کبھی درمیان میں نہ لایا جائے۔چنانچہ ہیوم نے گورنر جنرل کی اس خواہش کا احترام کیا۔(سمیع اللہ قریشی 1981ء ص 42)

سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا کیونکہ انہوں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ کانگریس بنیادی طور پر ہندووں کی تنظیم ہے۔اس لئے مسلمان کانگریس میں شامل ہو کر سیاست ہند میں کوئی اہم کردار ادا نہ کرسکیں گے۔ اُنہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کو اپنے عزائم کے حصول کیلئے استعمال کریں گے۔ان کے خدشات من و عن درست

ثابت ہوئے۔کانگریس نے نہ صرف اردو کے خلاف تحریک چلائی بلکہ 1905ء میں جب بنگال تقسیم کیا گیا تو کانگریس نے تنسیخ تقسیم بنگال کے لئے باقاعدہ عوامی تحریک شروع کردی جس کے سامنے آخرکار 1911ء میں حکومت برطانیہ کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔کانگریس کا فرقہ وارانہ روپ اس وقت کھل کر سامنے آ گیا جب اس نے "بندے ماترم" جیسا گیت جس میں مسلمانوں کی کھل کر مخالفت کی گئی، اپنا قومی ترانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔وقت نے ثابت کردیا کہ کانگریس ہر اعتبار سے ایک ہندو تنظیم تھی جس کا مقصد نمائندہ اداروں کی آڑ میں ہندو راج کا قیام تھا۔(صفدر محمود ڈاکٹر 1989ء ص 16)

انگریزی نظام ہندوؤں کے لئے بڑا سازگار تھا۔وہ انگریزوں کے ساتھ تعاون واشتراک کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ہندوستان میں جہاں کہیں ان کی اکثریت تھی، وہاں بڑی آسانی کے ساتھ ہندو معاشرہ اور تہذیب وتمدن کے قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ایک طرف کانگریس متحدہ قومیت کے نعرے لگا رہی تھی اور دوسری طرف ہندو مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تبلیغ میں مصروف تھے۔مشہور کانگریسی لیڈر گنگادھر تلک نے گنپت کا میلہ شروع کردیا تھا، اس کے جلسوں میں مسلمانوں کے خلاف گیت گائے جاتے۔اس میلے میں ہندوؤں نے ایک مسجد پر حملہ کیا۔1893ء میں انجمن انسداد ذبیحہ گاؤ قائم ہوئی مہاراجہ جگت کی قیادت میں بھگوت گیتا تحریک چلائی گئی۔دہلی میں مہابھارت منڈل کا ایک میل لمبا جلوس نکالا گیا۔جس میں دس لاکھ کے قریب ہندو تھے۔اسی طرح اردو کے خلاف تحریک چلی۔مذہبی میدان میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے جنم لیا، ان تمام کا نشانہ صرف اور صرف مسلمان تھے۔(محمد الیاس فارانی 1968ء ص 116)

ہندوؤں کا رویہ مسلمانوں کے متعلق معاندانہ اور انگریزوں کے متعلق خوشامدانہ تھا۔انگریزوں کی خوشامد کا مقصد یہ تھا کہ انگریز ہندوستان میں برطانوی طرز کی پارلیمینٹری گورنمنٹ قائم کردیں، مرکز اور صوبوں کی کونسلوں کیلئے انتخابات ہوں اور بڑی ملازمتوں کیلئے مقابلے کے امتحانات ہوں۔بادی النظر میں یہ بڑی روشن خیالی کی باتیں تھیں اور بڑی ترقی پسندی کی، مگر ہندوستان جیسے ملک کیلئے جس میں تمام دوسری اقوام سے قطع نظر مسلمان بھی تھے جو انگریزوں کے تسلط سے پہلے ہندوستان کے حکمران رہے اور اپنی یہ امتیازی حیثیت بھولے نہ تھے یہ ایک عظیم فتنہ تھا اور ایک ہولناک صورت حال کی تمہید تھی۔انگریزوں کو اپنے طرز حکومت کے اتباع کی خواہش تھی۔اپنا اتباع سب کو پسند آتا ہے نیز ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق بڑھانے کی اس سے بہتر اور کوئی تدبیر بھی نہیں ہوسکتی تھی اور اپنی سلطنت کے استحکام کیلئے انگریزوں کو اس کی ضرورت تھی۔نیابتی اداروں اور ان میں سادہ مخلوط انتخاب کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہونے والا تھا کہ ہندو جو اکثریت میں تھے، وہ منتخب ہوں اور مسلمان ناکام۔پھر ان اداروں سے جو اختیارات حاصل ہوں وہ برطانوی طاقت کی پشت پناہی کے ساتھ ہندو برتیں اور مسلمان ان کی غلامی کریں۔(حسن ریاض 1967ء ص 34)

3.6 مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، اقتصادی حالت

اوپر کے مباحث کے ضمن میں مسلمانوں کی عمومی حالت کے ساتھ ساتھ مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حالت کا ذکر بھی ہوا ہے۔ اس حصے میں کسی قدر تفصیل سے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سیاسی اعتبار سے اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مسلمانوں کے انحطاط کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی پر یہ انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور مسلمان غلامی کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ درمیانی ڈیڑھ سو سال کے دوران قدرت نے مسلمانوں کو سنبھلنے اور از سر نو قدم جمانے کے لئے کئی مواقع عطا کئے۔ ان میں سے پہلا موقع 1761ء میں آیا جب احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں چھ لاکھ مرہٹہ فوج کو ذلت آمیز شکست دے کر ہندوؤں کی ابھرتی ہوئی قوت کو پاش پاش کر دیا۔ اس عظیم اور فیصلہ کن تاریخی جنگ کے بعد احمد شاہ ابدالی واپس افغانستان چلا گیا جس سے مسلمان اس عظیم الشان فتح سے کسی طرح فائدے کے بجائے نقصان میں رہے کیونکہ ہندو سامراج کی شکست سے سفید سامراج کے راستے سے ایک بہت بڑی رکاوٹ دور ہو گئی۔ (جادوناتھ سرکار 1949ء ص 353)

دوسرا موقع دکن میں سلطان حیدر علی اور سلطان فتح علی ٹیپو کے عروج کی صورت میں نمودار ہوا۔ اگر ہندوستان کے کچھ مسلمان حکمران ہی ان دونوں باپ بیٹے کے مددگار بنتے تو برطانوی سامراج کے بڑھتے پھیلتے ہوئے درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چنداں مشکل نہ تھا۔ مگر کئی مسلمان نوابوں نے ان دونوں مجاہدوں کی حمایت کی بجائے ان کے خلاف انگریزوں کو مدد دی۔ سلطان ٹیپو جب ہندوستانی حکمرانوں سے مایوس ہوا تو اس نے مدد کے لئے اپنے سفیر افغانستان، ایران، ترکی اور نپولین کے پاس بھیجے (محمود حسین 1957ء ص 451-480)۔ نپولین نے جلد از جلد ہندوستان پہنچنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ایران کی طرف سے کوئی جواب ہی نہ آیا اور ترکی کے سلطان نے ٹیپو سلطان کو انگریزوں کے ساتھ صلح صفائی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ صرف زمان شاہ والئی کابل پہنچا لیکن انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کی وجہ سے اس کے اپنے بھائی محمود شاہ نے ایران سے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ (جواہر لال نہرو 1992ء ص 355)

1857ء کا ہنگامہ دراصل ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی اقتدار کھو رہا تھا اس زمانہ میں اس کی انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی لیکن جب وہ سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات کو مٹانے شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی، حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا گیا۔ ستر برس پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کیلئے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب کھونا نہیں چاہتے۔ اصل واقعہ بھی یہ تھا کہ اس وقت تک یہ چیزیں ان کی نگاہ میں کافی اہمیت رکھتی تھیں۔ (آبادشاہ پوری 1989ء ص 39-41)

وہ بنیادی کمزوریاں جنھوں نے انہیں حکومت کے منصب سے ہٹایا تھا ان میں پہلے سے موجود تھیں بلکہ وہ نئی کمزوریاں جو غلامی وافلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین واخلاق کی اہمیت تو دوسری طرف قومی تہذیب وتمدن کی قدروعزت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی۔دوسری طرف خودغرضی ونفسانیت کے روز افزوں غلبے نے انہیں ہراس شخص کی غلامی پر آمادہ کردیا جو انہیں کچھ مال وجاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کرسکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلے میں وہ انسانیت کے جس گوہر بے بہا کو چاہے خرید لے۔تیسری طرف انفرادیت اور خود پرستی جو ڈھائی سو برس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی تھی انتہائی حد کو پہنچ گئی۔یہاں تک کہ اجتمائی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہ رہی۔(ابوالاعلیٰ مودودی1964ء ص 45-47)

انگریزوں کے یہاں آنے سے پہلے اس برصغیر کے مسلم معاشرہ کی یہ حالت یہ تھی کہ عوام کے ذہنوں پر تنگ نظر ملاؤں کا قبضہ تھا جو دن رات فروعی مسائل میں الجھے رہتے تھے اور اعلیٰ فکر وعمل سے عاری تھے۔سیاسی لحاظ سے یہ برصغیر چھوٹے چھوٹے نوابوں اور راجاؤں میں بٹا ہوا تھا جو یا تو ایک دوسرے سے دست وگریبان رہتے یا دن رات عیش وعشرت میں پڑے رہتے۔یہ باہمی لڑائیاں اور عیش انہیں اپنے عوام کی بہتری کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہ دیتے۔ہر طرف دوست پروری اور اقرباءنوازی کا زور تھا۔معاشی لحاظ سے یہاں کے عوام اور کاشت کار جاگیردارانہ نظام تلے کراہ رہے تھے۔(عبدالرشید،میاں1989ء ص 91)

غرض مسلمانوں کی تعلیمی پستی کی اہم ترین وجہ ان کی عام اقتصادی بدحالی اور افلاس تھا۔حقیقت میں مسلمانوں کی معیشت کچھ تو پہلے خراب تھی اور کچھ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج سے اور زیادہ خراب ہوگئی۔مسلمان بعض علاقوں مثلاً جنوبی بنگال میں حد درجہ پستی کا شکار تھے۔لارڈ کارنوالس کا بندوبست دوامی 1793ء اگر چہ بنیادی طور پر کاشت کاروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مرتب کیا گیا تھا مگر عملاً یہ حقوق ان ہندو زمینداروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیے گئے (رضی واسطی،سیّد 1968ء ص 188) جن کی تخلیق خود انگریزوں نے کی تھی۔اس پالیسی کے نتیجے میں بنگال کے مسلمان کاشت کار گوناگوں پریشانیوں کا شکار ہوگئے۔1835ء میں مسلمانوں کے بعض تعلیمی اوقاف اور وقف جاگیروں کی ضبطی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مسلمانوں کی اقتصادی مشکلات میں اضافہ کردیا۔محسن وقف کے سرکاری تحویل میں جانے سے مسلمانان بنگال ایک اہم ذریعہ تعلیم سے محروم ہوگئے۔(محمد اکرام،شیخ1958ء ص 606)

حکومت نے مقامی مدارس کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ساتھ ہی فارسی زبان کی بالادستی کو بھی ہمیشہ کیلئے ختم کردی۔ہنٹر اپنی حکومت کی تعلیمی پالیسی اس طرح بیان کرتا ہے: اپنی حکومت کے ابتدائی 75 سال تک ہم اس نظام تعلیم (اسلامی نظام تعلیم) سے استفادہ کرتے رہے۔تاکہ انتظام چلانے والے افسران تیار ہوتے رہیں۔اس عرصہ میں ہم نے اپنی عوامی تعلیم کی اسکیم بھی جاری کردی تھی۔جب اس جدید تعلیم سے ایک نئی نسل تربیت پاکر تیار ہوگئی تو ہم نے اسلامی نظامِ

تعلیم دُور پھینک دیا۔اب مسلمان نوجوان زندگی کے تمام راستے اپنے سامنے مسدود پاتا ہے۔(ہنٹر' ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء؛ ص 152)

برصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی قوت کے انہدام کے باوجود 1864ء تک علمائے اسلام برصغیر کے "دارالسلام" ہونے کے قائل رہے کیونکہ اس وقت تک ملک میں مسلمانوں کا شرعی قانون نافذ تھا اور ان کا دارالقضیاء قائم تھا۔اس سے قبل مرہٹوں کے تسلط کے باوجود علمائے جون پور نے ملک کو اسی لئے دارالسلام قرار دیا تھا کہ مسلمانوں کو جمعہ وعیدین کی اجازت تھی اور شریعت کے نفاذ کیلئے مسلمانوں کے قاضی کے تقرر کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔1864ء میں مسلمان قاضیوں کے قانون کی تنسیخ اور قاضیوں کی برطرفی سے صورت حال یکدم بدل گئی۔اب فتوٰی کی رو سے ملک دارالحرب بن گیا تھا اور مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے مسلمانوں میں بے روزگاری پھیل گئی تھی۔عہدۂ قضا کے علاوہ اور بھی بڑے بڑے عہدے مثلاً کلکٹری مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔فوج اور پولیس کے افسران بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوتے تھے۔یوں دولت کے چشمے جو ہمیشہ جاری رہتے تھے مسلم گھرانوں کے صندوقوں کو ہمیشہ لبریز رکھتے تھے۔(طفیل احمد منگلوری 1945ء ص 156-159)

سیاسی اور اقتصادی بدحالی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو مذہبی تشکیک سے بھی دوچار کیا گیا۔ان کے ایمان اور عقیدے پر حملے کئے گئے تا کہ وہ اپنے مذہبی تشخص سے بھی بیزار ہو جائیں۔انگریزوں (مثلاً ہنٹر) کو مسلمانوں کی قومی برتری اور برتر صلاحیتوں کا اعتراف تھا لہٰذا وہ مسلمانوں سے خائف رہتے تھے۔وہ نہ صرف شجاعت اور سپاہیانہ صلاحیت کے اعتبار سے برتر تھے بلکہ سیاسی نظم و عملی حکومت کے لحاظ سے بھی فوقیت رکھتے تھے۔پھر وقت آیا کہ وہ نہ صرف سرکاری ملازمتوں سے بلکہ اعلیٰ غیر سرکاری پیشوں سے بھی بے دخل کر دیئے گئے۔(سمیع اللہ قریشی 1981ء ص 40)

انگریزوں نے بڑے غور و فکر کے بعد دینی تعلیم کے خلاف ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔پھر اس پر رازداری اور مستقل مزاجی سے برسوں عمل ہوتا رہا۔اس کے بعد ملک میں ایسے حالات پیدا کر دیے گئے جن کی وجہ سے دینی مدارس بند ہوتے چلے گئے۔ان کے قدردان بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ان کے ذرائع وسائل پر حکومت قابض ہوگئی۔یہ سب کچھ مخفی طریقہ پر ہوتا رہا۔نتیجہ انگریز کے حسب پسند نکلا۔مدارس ویران ہو گئے لیکن ان پر دو آنسو بہانے والا بھی نہ ملا۔کسی نے اس صریح ظلم کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔یہ مخفی منصوبہ بہت کامیاب رہا۔(محمد سلیم' پروفیسر سیّد 1993ء ب' ص 203)

حکومت نے اپنی پالیسی کے مطابق سب سے بڑا ظلم یہ ڈھایا کہ مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند اور رزق کے ذرائع مسدود کر دیئے۔انہیں نانِ شبینہ کا محتاج بنا کر چھوڑا۔یہ ظلم چنگیز خان کی تباہی و غارت گری سے کسی طرح کم نہ تھا۔مسلمان علماء، فضلاء اور شرفاء انگریز کے مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے اور ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت حوادث کی چکی میں بڑی طرح پسے چلے جا رہے تھے۔استمراری بندوبست کے ذریعے کروڑوں کی زمینداری کوڑیوں کے مول ہندو ٹھیکیداروں کے حوالے کر دی گئی۔مسلمانوں کے لئے روٹی کا ٹکڑا حاصل کرنا بھی دشوار بنا دیا گیا۔افلاس مسلمانوں پر مسلّط ہو گیا۔ہندوؤں کے گھروں میں مَن برسنے لگا۔یہ چٹرجی، بنرجی، مُکرجی، سین، داس، گپتا اور ٹیگور سب استمراری بندوبست

کی پیداوار ہیں ۔ان ہندو ٹھیکیداروں کی سنگ دلی کا یہ عالم تھا کہ مسلمان مزارعین سے چولہا ٹیکس، شادی ٹیکس اور بعض مقامات پر داڑھی ٹیکس بھی وصول کرتے تھے ۔عدم ادائیگی کی صورت میں سخت اذیت دی جاتی تھی ۔(خوندکار فضل ربی، منشی 1973ء،ص 99)

1940ء کی دہائی مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کی بنا پر مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کے قیام کی جدوجہد کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے ۔لیکن سالہا سال کی غلامی، اقتصادی پستی اور مذہبی بے توجہی کی وجہ سے ان کی جو حالت ہوگئی تھی اس کا نقشہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے ۔آپ نے سنا کہ انہیں کھینچنے کیلئے جو صدا بلند کی جارہی ہے وہ کون سی صدا ہے؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خودغرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے ۔ان سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟ اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز یا جامے اور داڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا؟ اس میں اس کی زیادہ اہمیت ہے؟ اصلی سوال قومیت کا سوال ہے؟ یہی سوال حل کرنے کیلئے ہم اٹھے ہیں ۔اب اگر دہریت اور کیمونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا ہر نوالے کے ساتھ پیٹ میں اتر جائے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں جو قوم اس سے پہلے ان ہی نوالوں کے ساتھ الحاد اور فرنگیت کا زہر بھی اتار چکی ہے اس کے حلق میں ویسی ہی چند چنیاں کیوں پھنسنے لگیں۔
(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 1981ء،ص 50-51)

باب چہارم

اسلامی نظام تعلیم کے معیارات

آئندہ ابواب میں جن تعلیمی تحریکات کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے، ان سب میں اسلام اور مسلمان بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گویا اصولی طور سے یہ تمام تحریکیں تعلیمی تحریکوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عملی طور سے وہ اسلامی تعلیمی معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہیں اس کیلئے اسلامی نظام تعلیم کے معیارات کا واضح تصور ضروری ہے۔ چنانچہ حالیہ باب اس جائزے کیلئے وقف کیا گیا ہے تاکہ آئندہ ابواب میں پیش کی گئیں مسلم تعلیمی تحریکوں کے معیار کو پرکھنے کیلئے اس جائزے کو سامنے رکھا جائے۔

4.1 نظام تعلیم کی ماہیت

ہمارے ہاں نظام تعلیم کی اصطلاح ڈھیلے ڈھالے انداز میں استعمال کی جاتی ہے۔ ان پہلوؤں پر بالعموم غور نہیں کیا جاتا کہ نظام تعلیم ہوتا کیا ہے؟ اس کے اجزاء کیا ہوتے ہیں؟ ان اجزاء کا باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔ اور اس تعلق کے تقاضے کیا ہیں؟ نتیجہ یہ ہے کہ وقتی سوچ کی لہروں پر سوار ہو کر اقدامات تجویز کر لئے جاتے ہیں۔ ان پر عمل درآمد بھی ہو جاتا ہے۔ تاہم جب عملی نتائج مجوزہ نتائج سے مختلف بلکہ بسا اوقات الٹ نکلتے ہیں تو الزام دینے کیلئے کوئی اور کندھے تلاش کر لئے جاتے ہیں۔ یہ بھدا چکر جاری رہتا ہے۔ فہم میں سہولت کیلئے ہم اسے ذیلی حصّوں میں تقسیم کر کے معانی اخذ کریں گے۔

نظام کی نوعیت

دو یا دو سے زائد اشیاء کے ایسے مربوط مجموعے کو نظام کہا جاتا ہے جس میں ایک شے کی حرکت یا سکون دوسری اشیاء میں حرکت یا سکون کا ردِ عمل پیدا کرے۔ نظام کی اس تعریف میں دو تصورات شامل ہیں۔ ایک اشیاء کا مجموعہ، دوسرا ربط کی خاص نوعیت۔ دیوار بہت سی اینٹوں اور گارے یا سیمنٹ کا مجموعہ ہے۔ ان سب اشیاء کا آپس میں ایک ربط ہے اس لئے یہ مربوط مجموعہ تو ہے لیکن اس میں ربط کی مخصوص نوعیت موجود نہیں ہے۔ دیوار میں سے دو چار یا دس اینٹیں اکھاڑ دی جائیں تو بھی دیوار قائم رہتی ہے اور یہ اینٹیں اکھاڑنے سے دوسری اینٹوں میں حرکت یا سکون کا ردِ عمل پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے دیوار میں کوئی نظام موجود نہیں۔ اس کے برعکس سلائی مشین میں جو بہت سے پرزے آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں

باہم اس نوع کا تعلق موجود ہوتا ہے کہ ایک پرزے کی حرکت دوسرے پرزوں میں حرکت یا سکون کا ردِعمل پیدا کرتی ہے۔اس لئے سلائی مشین میں ایک نظام موجود ہوتا ہے۔اس طرح سائیکل بھی بہت سے پرزوں کا ایسا مربوط مجموعہ ہے جس کے ایک پرزے میں حرکت یا سکون، دوسرے پرزوں میں حرکت یا سکون کا ردِعمل پیدا کرتی ہے۔اس لئے بائیکل کے اندر بھی ایک نظام موجود ہے۔(عبدالرشید ارشد ڈاکٹر 1995ء ص 13)

سلائی مشین یا بائیسکل یا کوئی بھی اور نظام اس وقت ہی مطلوبہ نتائج دے سکتا ہے جب اس کے اجزاء میں ربط و تعلق کا درست انداز موجود ہو۔کسی جزو کی شکل گھس کر تبدیل ہو جائے یا وہ ٹوٹ جائے یا گر جائے تو ربط ٹوٹ جاتا ہے اور اس وقت تک وہ نظام مطلوبہ نتائج فراہم نہیں کرسکتا جب تک ربط بحال نہ کر دیا جائے اسی طرح کسی نظام کے ایک جزو کی ساخت میں تبدیلی کر دی جائے تو بھی ربط ٹوٹ جاتا ہے۔پھر جب تک دوسرے اجزاء میں اس سے ہم آہنگ تبدیلیاں نہ کی جائیں ربط بحال نہیں ہوتا۔نظام کسی مطلوب نتیجے کے حصول کیلئے وجود میں لایا جاتا ہے۔یہ نتیجہ مقصد کہلاتا ہے۔نظام میں اصلاح کی ضرورت بھی مقصد کے حوالے سے متعین ہوتی ہے۔

یہ صورت تو سادہ مشینی نظام کی ہے جو کام میں سہولت یا تیز رفتاری پیدا کرنے کیلئے وجود میں لایا جاتا ہے۔یہ نظام نسبتاً بہت سادہ ہوتا ہے۔اس میں عناصر کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔کام میں جتنی زیادہ سہولت یا جتنی زیادہ تیز رفتاری کی ضرورت ہو اس کیلئے جو نظام بنایا جائے وہ اسی نسبت سے پیچیدہ ہوتا چلا جاتا ہے۔اس میں عوامل و عناصر کی تعداد اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔موٹر سائیکل، کار اور ہوائی جہاز کے اندر موجود مشینی نظام سے درجہ بدرجہ بڑھتی ہوئی پیچیدگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سید 1987ء ص 272)

اشیاء کی پیداوار کیلئے جو نظام بنایا جائے وہ محض مشینی نظام نہیں رہتا۔اس میں مشینی عوامل و عناصر کے ساتھ دوسرے مادی اور انسانی عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔اس لئے وہ انتہائی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔اس میں اصلاح کیلئے مشین کے اجزاء کے داخلی ربط کے ساتھ دوسرے مادی اور انسانی عناصر کو مربوط کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔تب ہی وہ نظام اپنا مقصد پورا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔بالفاظ دیگر اس سے مطلوبہ ساخت اور خصوصیات کی حامل اشیاء پیدا ہو سکتی ہیں۔

نظام تعلیم کی ماہیت

نظام کی نوعیت پر گفتگو میں سادہ مشینی نظام کو پیش نظر رکھا گیا ہے تا کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ظاہر ہے کہ اگر تعلیم بھی نظام ہے تو اس کی ماہیت بھی لازماً یہی ہونی چاہیے۔تاہم نظام تعلیم میں نظام کا ادراک سادہ مشینی نظام کے ادراک کی نسبت کہیں زیادہ تفکر و تدبر کا متقاضی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نظام کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے اور اس میں غیر مادی عوامل و عناصر کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ مختلف النوع ربط سیدھے سادے انداز میں وقوع پذیر ہوتے نظر نہیں آتے۔نظام تعلیم میں تین قسم کے عناصر شامل ہوتے ہیں مادی، انسانی اور ذہنی۔مادی عناصر میں عمارات، سازوسامان اور آلات تدریس شامل ہیں۔انسانی عناصر استاد، طالب علم، سربراہِ ادارہ اور دوسرے ان افراد پر مشتمل ہوتے ہیں جو عمل تعلیم سے

بلاواسطہ تعلق تو نہیں رکھتے لیکن کسی نہ کسی حیثیت میں اسے کم وبیش حد تک متاثر ضرور کرتے ہیں ۔ذہنی عناصر ان تمام روایات،خیالات،تصورات اور اقدار کا احاطہ کرتے ہیں جو معاشرے میں جاری وساری ہوتے ہیں اور جو نظام تعلیم کے مختلف اجزاء کو مربوط کرتے ہیں ۔اس لحاظ سے ذہنی عناصر کی حیثیت بعینہ وہی ہوتی ہے جو ایک زندہ جسم میں روح کو حاصل ہوتی ہے۔(عبدالرشید ارشد،ڈاکٹر 1995ء ص 30)

عناصر کی یہ سہ گانہ تقسیم ،نظام تعلیم کی ماہیت کو آسانی سے سمجھنے کیلئے ہی کی جاسکتی ہے ورنہ یہ مختلف عناصر ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ اور باہم مربوط ہوتے ہیں کہ انہیں کلیتاً الگ الگ کیا ہی نہیں جاسکتا ۔مثلاً مادی عناصر میں عمارات کی ساخت، سازو سامان کی نوعیت اور آلات تدریس کی ماہیت اور ان کے استعمال کا انحصار کلی طور پر معاشرتی اقدار اور روایات پر ہوتا ہے ۔اسی طرح استاد اور شاگرد کا آپس میں تعلق اور ان دونوں کے دوسرے افراد سے تعلق کی نوعیت بھی معاشرے کی اقدار و روایات کی بنیاد پر ہی متعین ہوتی ہے ۔(نعیم صدیقی 1999ء ص 12)

نظام تعلیم ،نظام پیداوار سے مشابہ ہوتا ہے جس طرح کسی نظام پیداوار میں خام مال کو کسی خاص عمل یا عملوں کے مجموعے سے گزار کر مطلوبہ ساخت اور خصوصیات کی حامل یکساں اشیاء حاصل کی جاتی ہیں ۔اس طرح نظام تعلیم میں نئی نسل کے خام افراد کو مخصوص عملوں سے گزار کر مطلوبہ کردار وخصوصیات کے حامل افراد میں ڈھالا جاتا ہے اور جس طرح نظام پیداوار میں کارکن کی تربیت وکردار پیداشدہ اشیاء کے معیار کو اچھا یا برا بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں ۔اسی طرح نظام تعلیم میں بھی کارکن یعنی استاد کے تربیت وکردار بھی زیر تعلیم افراد کے کردار کو اچھا یا برا بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں ۔

تاہم نظام تعلیم کسی مشینی نظام پیدوار سے کلیتاً مختلف بھی ہوتا ہے کہ مشینی نظام میں جو خام مال استعمال ہوتا ہے اس کو توڑا،پھوڑا اور کاٹا پیٹا جاسکتا ہے ۔اسے حسب خواہش ہر ممکن انداز میں ڈھالا جاسکتا ہے لیکن نظام تعلیم کے خام مال یعنی طالب علم کو توڑا،پھوڑا اور کاٹا پیٹا نہیں جاسکتا ہے ۔وہ جاندار ہوتا ہے اور اس میں احساسات موجود ہوتے ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک ذہن سے بھی آراستہ ہوتا ہے جو انسانی نگاہوں سے اوجھل رہتے ہوئے جسم کو کنٹرول کرتا ہے ۔استاد اور نظام تعلیم کو اس نظر نہ آنے والے ذہن ہی کی تربیت کرنا ہوتی ہے ۔(عبدالرشید ارشد 1995ء ص 16)

مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں نظام تعلیم کی تعریف اب ہم یوں بیان کرسکتے ہیں ۔نظام تعلیم ایک کلی وحدت کا نام ہے جس کے تمام عناصر باہم مربوط، منظم ،مرتب ،متعامل اور متعاون ہوتے ہیں ۔جن کی روح ایک ہوتی ہے اور وہ سب عناصر مشترک مقاصد تعلیم کے حصول کے لئے باہم متحد ہوتے ہیں (محمد امیر ،ملک پروفیسر 2000ء ص 84)۔گویا نظام تعلیم کے واضح اجزاء یہ ہیں ۔نئی نسل کے افراد جنہیں طالب علم کہا جاتا ہے ۔تہذیب وثقافت کے ترجمان یعنی استاد،تہذیب وثقافت کی ترسیل کا پروگرام یعنی نصاب،ترسیل کی ترتیب یعنی مدارج تعلیم ،اثرات کا جائزہ یعنی امتحان اور دیکھ بھال کا نظام یعنی انتظام۔

4.2 اسلامی نظام تعلیم اور اس کی خصوصیات

تعلیم کے عناصر کا ایسا مجموعہ جو باہم متعاون، مربوط اور منظم و متحامل ہو کر اسلامی مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں ہوں اور ہم آہنگ ہو کر ایک واحدہ کی حیثیت اختیار کر لیں تو یہ عناصر کا مجموعہ اسلامی نظام تعلیم کہلائے گا (حمیرا اقبال 1996ء ص 62)۔قدیم ہندوستان کی تاریخ میں صرف برہمن کو تعلیم کا کلی استحقاق تھا۔یہاں تک کہ وید مقدس کا کوئی فقرہ اگر کسی شودر کے کان میں پڑ جاتا تو اس میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے

In time the Shudras and the outcastes were completely debarred from education and in medieval India education became an exclusive privilege of the Brahmans.

(انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، ج7، ص 1010)

عصر حاضر میں امریکہ کی نام نہاد ترقی یافتہ مملکت کی بیس (20) ریاستوں میں رنگدار یا سیاہ فام قوموں کو اجازت نہیں کہ وہ سفید فام اقوام کے ساتھ ایک ہی مدرسہ یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر سکیں لیکن عہد نبوی کے نظام تعلیم کی یہ شان تھی کہ ہر قسم کے نسلی تعصبات سے پاک تھا۔جہاں مسجد نبوی میں ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسے زعمائے قریش تعلیم پاتے تھے وہاں سلمان فارسیؓ، بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ علم و عرفان کی دولت سے بہرہ مند ہوتے تھے۔ایتھنز کے نظام تعلیم پر نظر ڈالی جائے تو یہاں صرف آزاد مرد علم کے اجارہ دار تھے۔عورتیں، بچے، لونڈی، غلام سب دولت علم سے محروم تھے۔ہندوستان میں بھی آریہ جاتی کے برہمن مرد تعلیم حاصل کرتے تھے۔ان کی عورتیں بچے بھی تعلیم سے بہرہ مند نہ تھے۔بعثت نبوی کے وقت عرب میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد بھی بڑی محدود تھی (شبیر احمد، خان غوری 1984ء ص 518)۔خود یورپ میں پندرہویں صدی میں جا کر ماہر تعلیم کامینس (COMMENIUS) نے آواز اٹھائی کہ تعلیم ہر شخص کا پیدائشی حق ہے (سعید اختر 1988ء ص 89)۔لیکن سیّد الکونین نے تقریباً ایک ہزار برس پہلے تحصیل علم کو ہر مسلمان (مرد اور عورت) کا فریضہ قرار دے دیا تھا۔(ابن ماجہ، السنن، کتاب السنۃ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، ص 34، ح 224)

اس سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کا مقالہ نگار یوں رقم طراز ہے:۔ مسلمانوں کی تعلیم کے مقاصد میں یکساں تعلیمی مواقع کا تصور اور اس کی عمومی ترویج کا اصول شامل تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، جلد 6، ص 332)۔آگے چل کر یہ مقالہ نگار لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی روایت کی اوّلین خصوصیت یہ تھی کہ تعلیم کو جمہوری کر دیا گیا تھا۔مسجد کی طرح مدرسہ میں بھی سب برابر ہوتے تھے اور یہ اصول قائم کر دیا گیا تھا کہ غریبوں کو بھی تعلیم دی جائے (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، جلد 6، ص 340)۔آنحضورﷺ پر خداوند کریم کی طرف سے بھیجی جانے والی پہلی وحی "اقرأ" تھی جس میں حضور

نبی ﷺ کو پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کے وصال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جبکہ دنیا جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، بغداد، قاہرہ، قرطبہ، دمشق اور نیشاپور میں اسلامی اور سائنسی علوم کی عظیم الشان درسگاہیں قائم ہو چکی تھیں۔ اس تعلیمی ترقی کا ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی آمد کے بعد بڑا گہرا اثر پڑا۔ (عبدالرشید خان 1986ء، ص 24)

سائنسی نقطۂ نظر سے دنیا کو اسلام ہی نے روشناس کرایا ہے۔ بعض لوگ جن میں بڑے بڑے علماء بھی شامل ہیں غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ اسلامی تعلیمات سائنس کے خلاف ہیں۔ فرانس کے مشہور فلسفی ارنسٹ رینان نے انیسویں صدی کے اواخر میں اسلام کو اس حوالے سے ہدف تنقید بنایا تو سیّد جمال الدین افغانی (1839ء تا 1898ء) نے پیرس میں رینان سے بالمشافہ ملاقات کر کے اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ رینان سیّد موصوف کی عظمت اور اپنی غلط فہمی کا معترف ہوا (محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1981ء، ص 219)۔ بقول محمد علی جوہر مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات عقائد اسلامی کی صداقت، احکام اسلام کی عملی سودمندی اور ان پر سختی کے ساتھ عمل کرنے پر مبنی تھیں اور ہم اگر اپنی گم شدہ عظمت کا اعادہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ عقائد اور احکام اسلامی پر کاربند ہو جائیں نیز رسول مقبول ﷺ اور خلفائے راشدین کے نقش قدم پر چلیں۔ (بحوالہ رئیس احمد جعفری 1950ء، ص 358)

ازمنۂ قدیم میں دنیا کی اکثر و بیشتر اقوام کسی دوسری قوم کے علماء اور دانشوروں کے افکار عالیہ سے علمی استفادہ کو پسند نہ کرتی تھیں اور دوسری قوموں کی زبانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ عصرِ حاضر میں بھی وطنیت و قومیت کے فتنے نے جہاں قوموں اور نسلوں کو اپنے علوم و فنون پر فخر کرنا سکھایا ہے وہاں انہیں دوسری قوموں کے علوم اور ادبیات سے لاتعلق و بے زار کر رکھا ہے۔ لیکن سیّد الانبیاء ﷺ نے اپنی امت کو یہ تعلیم دی کہ: الكلمة الحكمة ضالة المومن فحيث وجدها فهو احق بها — ترجمہ: حکمت کا کلمہ مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں کہیں اس کو پائے اخذ کرے کیونکہ وہی اس کا زیادہ حقدار ہے (الترمذی، الجامع، ابواب العلم، باب فی فضل الفقه علی العبادة، ص 610، ح 2687) اور یہ محض نظری تعلیم نہ تھی بلکہ عملی مثالیں بھی عہد نبوی میں ملتی ہیں کہ:

الف۔ سیّد المرسلین ﷺ نے انصار کے بچوں کو غیر مسلم جنگی قیدیوں سے تعلیم سیکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (عبدالحیّ الکتانی 2001ء، ص 131)

ب۔ اسی طرح کتب سیرت میں یہ واقعہ درج ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے میر منشی حضرت زید بن ثابتؓ کو دوسری اقوام کی زبانیں سیکھنے کی ترغیب دلائی (الترمذی، الجامع، ابواب الاستئذان، باب ماجاء فی تعلیم السريانية، ص 615، ح 2715)۔ تعلیم اسلام کیلئے لازمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہو۔ عہد رسالت میں صرف اظہار ایمان پر اکتفا نہ کیا جاتا تھا بلکہ تاکید تھی کہ ہر ایک مسلمان بقدر ضرورت تعلیم حاصل کرے۔ (ابوالکلام آزاد 1979ء، ص 123)

تعلیم میں ذہنی عوامل کی اہمیت کے ضمن میں اہم ترین امر یہ ہے کہ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے معلّم کو حقیقت اصلیہ کے

بارے میں سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس حوالے سے معلّم کے پاس ایک ایسا مستحکم فلسفۂ تعلیم کا ہونا ضروری ہے جو صحیح مابعد الطبعیاتی اساس پر قائم ہو (انسائیکلوپیڈیا آف برٹینیکا، جلد 7، ص 1070) حقیقتِ اصلیہ کے تصور کی طرح حقیقتِ علم کا تصور بھی تعلیمی عمل و نظام کی تشکیل میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔اسلام دونوں مسئلوں کو اس نکتے میں حل کر دیتا ہے کہ علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔علمِ اشیاء اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اس کی طرف سے ہے۔حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع ہیں لیکن "وحی" سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے۔علم کا تعلق محض لوازماتِ حیات سے ہی نہیں ہے، مقاصدِ حیات سے بھی ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہئے۔یہی وہ تصور ہے جس سے اسلامی نظام تعلیم کا پورا امزاج بنتا ہے۔(شہباز خان، ڈاکٹر 1997ء ص 110)

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے، اس میں تعلیم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے۔ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔تعلیم، کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کو ساتھ ساتھ سرانجام دینا ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم میں تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو رہے ہیں۔اس کا اظہار "علم و فضل" کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم، نیکی اور اخلاقِ حسنہ میں بڑھے ہوئے ہونے کے مفہوم کو بخوبی ادا کرتی ہے۔(خورشید احمد، پروفیسر 1968ء ص 405)

اوپر کی بحث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے۔کہ ہم جس دائرۂ علم میں بھی کام کر رہے ہوں۔جو ذہن، فکر، سوچ اور انداز وہاں پیدا ہو وہ اسلام کی اقدار سے مطابقت رکھتا ہو۔اس کے لئے بلاشبہ ہمیں قرآن پاک بھی پڑھانا ہے، ہمیں دینیات کی تعلیم بھی دینی ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر ہمیں اس بات کی کوشش کرنی ہے کہ ہر علم کے اندر ہم اسلام کے نقطۂ نظر اور اسلام کی فکر کو جاری و ساری کریں۔اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم دنیوی علوم ترک کر دیں۔اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو وہ اسلام کی روح سے آشنا نہیں ہے۔سائنسی علوم اور سوشل سائنسز سارے ہمارے علم ہیں۔یہ تاریخ کا ایک سانحہ ہے کہ آج لادینی تمدن اُن کا علمبردار بنا ہوا ہے اور اس سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ان علوم کو جو خدا کی بندگی اور انسانیت کی خدمت کیلئے تھے۔انہیں لادینی تمدن اور تہذیب نے خدا سے بغاوت اور انسان کُشی کیلئے استعمال کیا۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 2008ء ص 210، 216)

اسلامی نظام تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر شعبۂ زندگی میں اسلامی اقدار کی روشنی میں سوچنے اور ان بنیادوں پر فکر انسانی کی تشکیل جدید کرنے کا کام سرانجام دیں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جدید معاشیات کو جانیں۔ایڈم سمتھ سے لے کر ہیرالڈ اور فیلڈ مین تک جو باتیں کہی گئی ہیں ان سے ہم واقفیت پیدا کریں لیکن صرف واقفیت ہی پیدا نہ کریں بلکہ اس کا ہم تنقیدی جائزہ لیں اور نہ سمجھیں کہ جو کچھ وہاں سے آتا ہے وہ حق ہی حق ہے بلکہ ہم قرآن اور حدیث کی دی ہوئی اقدار کی روشنی میں اس کو پرکھیں کہ اس میں کیا صحیح اور کیا غلط ہے اور پھر معاشی فکر کو اسلام کی بنیادوں پر مرتب و مدون کریں۔اس کی روشنی میں اپنے معاشی مسائل اور انسانیت کے معاشی مسائل کا حل تلاش کریں۔یہی کام ہمیں سیاسیات میں کرنا ہے۔یہی

ہمیں عمرانیات میں کرنا ہے۔یہی ہمیں فلسفہ میں کرنا ہے ۔یہی ہمیں ادب میں کرنا ہے۔یہی ہمیں ڈیمو کریسی میں کرنا ہے۔ہر شعبۂ زندگی میں ہمیں یہ کام انجام دینا ہے۔(خورشید احمد، پروفیسر 1999ء ص 40)

غرض اسلامی نظام تعلیم کا مزاج یہ ہونا چاہئے کہ:

- پرائمری سطح سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم کے تمام مراحل بلکہ فنی، عمرانی اور عسکری تمام شعبہ ہائے تعلیم کا بنیادی عنصر اسلام کو قرار دیا جائے اور اس عنصر کی بنیا قرآن و سنت پر رکھی جائے۔علم و معرفت کے ان سر چشموں کی تفہیم و تشریح کے لئے متاخرین کے مشتبہ اور مبہم اقوال کے بجائے سلفِ متقدمین کی رہنمائی کی طرف رجوع کیا جائے۔اس معاملہ میں جزئیات و فروعات اور تفصیلات میں جانے سے پہلے بنیادی اصول و مبادی کی طرف توجہ دی جائے۔اس طرز تعلیم کے ہر تعلیمی مرحلہ کو مناسب وسعت اور گہرائی دی جائے۔اس بنیاد پر مندرجہ ذیل باتوں کو نگاہ میں رکھا جائے۔
- قرآن و سنت کی روشنی میں آسان اور سادہ انداز میں اسلام کا صحیح عقیدہ پیش کیا جائے اور متکلمین کی موشگافیوں اور سخن سازیوں میں نہ الجھا جائے۔
- فقہی مذاہب کے اختلافات سے اجتناب کرتے ہوئے فقہی مسائل کو دلیل اور حکمت کے ساتھ بیان کیا جائے اور زندگی کے ساتھ ان کے ربط و تعلق کو روشن کیا جائے۔
- نبی اکرم ﷺ، صحابہ کرام، امت مسلمہ کے قائدین، علماء اور صلحاء کی سیرتوں کی طرف توجہ دی جائے۔ (یوسف القرضاوی 1988ء ص 19)

اسلامی نظام تعلیم سے مراد ایسا نظام تعلیم ہے جس میں ایک مسلمان بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے خاص علم و فن میں مہارت اور قابلیت حاصل کرنے کے ساتھ ایک اچھا مسلمان بھی بنے۔جس کا قلب ایمان اور تقویٰ سے سرشار ہو۔ضروری عقائد سے واقف ہو، ضروریات دین اور فرائض کا علم رکھتا ہو، اسلامی اعمال و اخلاق کا صحیح نمونہ ہو۔ایسا نظام تعلیم جس میں اگر کسی نے اپنے لئے ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کیا ہے تو وہ اپنے فن میں ایک مسلمان ڈاکٹر کا کردار ادا کرے، اگر اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا ہے تو وہ اپنی تجارت میں ایک مسلمان تاجر کا کردار ادا کرے۔اگر اس نے اپنے لئے فوجی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ اپنی عسکری زندگی میں ایک مسلمان مجاہد کا کردار ادا کرے۔اسی طرح زندگی کے جس شعبے سے اس کا تعلق ہو بحیثیت مسلمان اپنا فرض سرانجام دے اور اس شعبہ سے متعلق جو بھی اسلام کے احکام و آداب ہوں، انہیں بجالائے۔کیونکہ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق کچھ احکام و آداب بیان کئے ہیں۔جن کی پابندی مسلمان کیلئے ضروری ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 2004ء ص 228)

ایک تجارت کو بطور مثال لے لیں۔اسلام نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور اس سے کمائی ہوئی روزی کو رزق حلال اور کسب طیب کہا اور اس کے لئے کچھ احکام و آداب بیان کئے ہیں۔جن کی پابندی سے تجارت سے کمایا ہوا مال

حلال اور طیب کہلاتا ہے۔ مثلاً جس چیز کی تجارت مقصود ہو وہ حلال اور مباح ہونی چاہئے۔ مسلمان کیلئے کسی حرام چیز کی تجارت جائز نہیں جیسے شراب اور مردار وغیرہ، تجارت میں دھوکہ اور ملاوٹ کو حرام قرار دیا گیا۔ ایک مسلمان کو تجارت میں سچا اور صاف گو ہونا چاہئے جس چیز کی مسلمانوں کو ضرورت ہے اس کی ذخیرہ اندوزی سے روکا گیا ہے وغیرہ۔ تو جب ایک شخص اپنی تجارت میں مسلمان تاجر کا کردار ادا کرتا ہے تو اس کی شان دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور وہ تجارت کے راستہ سے غیر مسلم قوموں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ مشرق بعید میں زیادہ تر اسلام مسلمان تاجروں کے ذریعے سے پھیلا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے جہاں نصاب تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے وہاں طرز تعلیم کی اصلاح کی بھی ضرورت ہے۔ (عبدالرزاق سکندر الازھری 1979ء ص 445)

معاش ہو یا معاد، دین ہو یا دنیا، سب کا دارومدار علم پر ہے۔ علوم وفنون کی کوئی حد اور شمار نہیں لیکن اصل علم وہ ہے کہ جو اوپر سے آیا ہو اور جس سے خداوند ذوالجلال کی معرفت، اس کی اطاعت اور عبودیت کا طریقہ معلوم ہو۔ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمِ دین اور دوسرا علمِ دنیا۔ علمِ دین سے مراد وہ ہے جس سے اللہ کی معرفت اور اس کے احکام کا علم حاصل ہو اور اس کی اطاعت کا طریقہ معلوم ہو اور علمِ دنیا سے مراد وہ ہے جو دنیاوی منافع کے حصول کا ذریعہ ہو۔ علمِ دنیویہ کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں سے بعض تو شریعت کی نظر میں مباح اور جائز ہیں بعض مکروہ اور بعض حرام ہیں۔ مسلمان کا مسلمان ہونے کی حیثیت سے علم دین مقصودِ اوّل ہے اور علم دنیا مقصود ثانوی کے درجہ میں ہے۔ مومنوں اور کافر میں فرق یہی ہے کہ مومن صرف آخرت کو اپنا مقصود سمجھتا ہے اور دنیا کو آخرت کا تابع اور خادم سمجھتا ہے۔ جبکہ کافر کا مقصود بلکہ معبود ہی دنیا ہے۔ اس کے دماغ میں آخرت کا کوئی تصور ہی نہیں۔ اسی وجہ سے کافر دنیوی ترقی کے حصول میں کسی جائز، ناجائز اور کسی حلال وحرام کی تقسیم کا قائل نہیں کیونکہ حلال وحرام کی تقسیم اغراض دنیویہ کے حصول میں ایک روڑا ہے۔ (محمد ادریس کاندھلوی 1979ء ص 207)

اسلامی نظام تعلیم کی اساس توحید ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا مالک خالق کائنات ہے۔ نظام ربوبیت کو چلانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب مقرر کیا ہے۔ اسلام نے اپنے تمام انقلابی پروگراموں کی بنیاد تعلیم پر رکھی ہے۔ اسلام تعلیم کے ذریعے عقائد کو تقویت دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے سرچشمے قرآن مجید اور اسوۂ حسنہ ہیں۔ اسلام انسان کی روحانی اور مادی زندگی میں توازن قائم کرنے کا حامی ہے اور دونوں کی تربیت کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ قرآن مجید میں وہ تمام احکامات اور ہدایات موجود ہیں جن کی روشنی میں بچے کی تربیت کر کے اسے اسلامی معاشرہ کا کارآمد فرد بنایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا راستہ وہی ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس طرح اسلام دینِ فطرت ہے۔ (گل محمد مہر 1988ء ص 57)

کسی قوم کا تعلیمی نظام اس کے فلسفۂ حیات کا عکاس ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ایک "کُل" کا جز قرار پاتا ہے۔ اس کُل کے دیگر اجزاء میں تہذیب وتمدن کے دیگر شعبہ جات جیسے اخلاقیات، سیاسی نظام، قانون، فنون، نظامِ معاشیات وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سب مل کر کسی قوم کے اجتماعی تشخص کا تعین کرتے ہیں اور یہی وہ امور ہیں جو اس قوم کو دیگر اقوام اور گروہوں

سے ممتاز کرتے ہیں۔اجتماعی نصب العین اور تشخص فلسفۂ حیات سے پیدا ہوتا ہے۔اس کی تکمیل کیلئے تعلیم چونکہ بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔اسلئے کسی قوم کے فلسفۂ حیات سے اس کے تعلیمی نظام کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام ایک واضح ضابطہ اور فلسفۂ حیات پیش کرتا ہے۔اس لئے فکری، فنی اور تہذیبی زندگی کے دیگر امور کی طرح مسلمانوں کا نظامِ تعلیم اس ضابطۂ حیات اور فلسفۂ زندگی کے ایک اہم ثانوی پہلو کی صورت میں سامنے آتا ہے۔اس تعلیمی نظام کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ اسلامی ضابطۂ حیات کو دلوں میں راسخ کیا جائے۔اس کے نقش و نگار اجاگر کئے جائیں بلکہ یہ مقصد بھی تھا کہ اسلامی ضابطۂ حیات کی عالمگیر برتری کی راہ ہموار ہو جائے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کا فرض سرانجام دیا جائے۔اپنے تخلیقی دور میں اس نظام نے جو کامیابیاں حاصل کیں وہ اب نسل انسانی کی ثقافتی تاریخ کا سنہری باب ہیں۔اس نے نہ صرف قدیم علوم کی حفاظت کی اور انہیں پروان چڑھایا بلکہ بہت سے نئے علوم کی داغ بیل بھی ڈالی۔ جہالت، توہمات اور تعصبات کے اندھیروں کو کم کردیا۔عقل و دانش کے چراغ روشن کئے۔تاریخی واقفیت کے اعتبار سے کسی مبالغہ آرائی کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی جدید دنیا اپنے وجود کے لئے قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی، تہذیبی، فکری اور فنی جدوجہد کی مرہون منت ہے۔نئے شعور کے سوتے اسلامی تعلیمی نظام سے ہی پھوٹے تھے۔یہ امر اس نظام کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے چنانچہ خود یورپی اقوام عمرانی علوم کا باوا آدم ابن خلدون کو قرار دیتی ہیں۔(ثناء الحق صدیقی 1986ء؛ ص 11)

مسلمانوں کا تعلیمی ذوق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء رہا ہے۔جہاں کہیں انہیں سیاسی اور تہذیبی غلبہ حاصل ہوا علم و دانش کی شمعیں جگمگانے لگیں۔چنانچہ ہندوستان میں بھی ان کے دور عروج میں ایک نہایت مستحکم اور ہمہ گیر نظامِ تعلیم ارتقاء پذیر ہوا۔اس نظام کی ہمہ گیری اور گہرائی کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں جبکہ ہندی مسلمان سیاسی، تہذیبی اور معاشی زوال کا بُری طرح شکار ہو چکے تھے۔ایک سفید فام مبصر "جنرل سلی مین" نے ان کی علمی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ: دنیا میں شاید ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں ہندوستان کے مسلمانوں سے زیادہ تعلیم کا عام رواج ہو۔ہر وہ شخص جسے بیس روپے ماہوار کی ملازمت حاصل ہوتی ہے۔عام طور پر اپنے بیٹوں کو کسی وزیراعظم کے برابر تعلیم دلواتا ہے۔جو کچھ ہمارے لڑکے یونانی اور لاطینی زبانوں کی وساطت سے سیکھتے ہیں۔یہاں کے نوجوان وہی باتیں عربی اور فارسی سے سیکھتے ہیں ہفت سالہ مطالعہ کے بعد یہاں کا مسلمان نوجوان علم کی ان شاخوں، گرامر، بلاغت، منطق وغیرہ سے قریب قریب اتنا ہی واقف ہو جاتا ہے جتنا آکسفورڈ کا کوئی تعلیم یافتہ نوجوان۔یہ بھی اس کی طرح سقراط، افلاطون، ارسطو، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا کے متعلق بڑی روانی سے گفتگو کر سکتا ہے۔(سلی مین 1844ء؛ ص523)

ہمارا نظام تعلیم ہی تھا جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کے سات سو سالہ عہد اقتدار کے ستون فراہم کئے۔ بے شمار عظیم الشان دانشور، علمائے دین، سرکاری کارندے، مدبر، سیاست دان، ادیب، شاعر، مورخ اور فنکار پیدا کئے۔ان

کے کارنامے تاریخ کے صفحات کی زینت ہیں۔گویا اسلامی نظام تعلیم سے مراد تعلیم کے عناصر کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو آپس میں مربوط، منظم، متعاون اور متعامل ہو کر اور ایک ایسی وحدت کی شکل اختیار کرلیں کہ وہ ایک اکائی کی حیثیت سے اسلامی مقاصد تعلیم کے حصول کیلئے کوشاں ہوں ۔اسلامی نظام تعلیم کی خصوصیات کے چند پہلو یہ ہیں:

- علم الاشیاء کی تعلیم سے انسان کے دنیوی سفر کا آغاز ہوتا ہے نیز ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی اوّلین ضرورت اور انسان کو انسان بنانے والی چیز تعلیم ہے۔
- علم کا صحیح تصور یہ ہے کہ اس کا حقیقی سر چشمہ رب السموات الارض کی ذات ہے۔حقیقت اشیاء کا علم بھی اور ہدایت وضلالت کا علم بھی اس کا دیا ہوا ہے۔حواس اور عقل وتجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ سر چشمہ علم ہے۔نیز یہ کہ علم کا تعلق محض لوازماتِ حیات ہی سے نہیں، مقاصد حیات سے بھی ہے اور یہی زیادہ اہم ہے۔اس سے اسلامی تعلیم کا جو مزاج تشکیل پاتا ہے۔وہ یہ ہے کہ اس میں غلبۂ دین کی تعلیم، رب کی معرفت اور الہامی اصول ہدایت کی روشنی میں فرد اور تمدن کی صورت گری کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔(خورشید احمد، پروفیسر 1991ء،ص 15)
- اسلام نے تعلیم کو بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت نہیں، بلکہ تمام انسانوں کی اولین اور بنیادی ضرورت قرار دیا ہے ۔اسلام کے علاوہ دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن ایسا نہیں ہے جس میں تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔حتیٰ کہ یونان اور چین بھی جو اپنی علمی ترقی کی وجہ سے غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں، اس کے قائل نہ تھے۔فرمان نبوی ﷺ ہے:طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم ۔ترجمہ:علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے(ابن ماجہ،السنن، کتاب السنۃ،باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم ،ص 34، ح224)۔گویا یہ اسلام ہی ہے جس نے عام تعلیم اور ہر شخص کے لئے علم کا تصور پیش کیا۔
- ایک طرف اسلام نے تعلیم کو بنیادی ضرورت قرار دیا تو دوسری طرف اس کو حاصل کرنے کی ذمہ داری فرد اور معاشرے دونوں پر عائد کی۔اسلام کا یہ اصول ہے کہ جو چیز سب پر فرض ہو اس کی فراہمی کی اولین ذمہ داری فرد پر جبکہ آخری ذمہ داری معاشرے اور ریاست پر عائد کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نماز، حج اور زکوٰۃ کا قیام اسلام کے وظائف میں شامل ہے۔تعلیم کے سلسلے میں خود حضور اکرم ﷺ نے جو روایت قائم کی وہ اصحاب صُفہ کی درس گاہ میں نظر آتی ہے۔اصحاب صُفہ میں سے کچھ اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے خود ہی تگ و دو کرتے تھے پھر مسلمانوں کے اہل ثروت ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے دل کھول کر عطیات و وظائف دیتے تھے اور محمد ﷺ خود ان کی ضروریات پوری فرماتے بلکہ جب تک ان کے کھانے کا بندوبست نہ ہوجاتا آپ ﷺ کھانا تناول نہ فرماتے۔یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں تعلیم ہمیشہ مفت رہی ہے۔(محمد اقبال، قاری پروفیسر 2005ء،ص 140)

- اسلامی نظام تعلیم میں علم اور تربیت ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے اور یہ بھی حضور اکرم ﷺ کے اتباع ہی میں تھا کہ بحیثیت معلّم جہاں آپ ﷺ تعلیم کتاب و حکمت کی ذمہ داریاں ادا فرماتے وہیں تزکیہ نفوس کا کام بھی انجام دیتے (ملاحظہ ہو آیات' الجمعہ:2، آل عمران:164) اسلامی تعلیمی نظام کا مخصوص مزاج ان دونوں عناصر کے حسین امتزاج سے تشکیل پایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب میں عرف عام میں اس مزاج کا اظہار ''علم و فضل'' کی اصطلاح سے ہوا ہے، جو علم اور نیکی دونوں میں بڑھے ہوئے ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔
- ایک اور اہم چیز تعلیم اور مسجد کا باہمی تعلق ہے۔ تعلیم کا دینی مزاج اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دینی زندگی کے محور مسجد سے اس کو مربوط کیا جائے۔ مسجد نبوی میں پہلی تعلیم گاہ کے قیام نے اس روایت کو قائم کر دیا اور بعد میں مسلمانوں کی پوری تاریخ میں اس روایت کو فروغ دیا گیا اور اس کے ذریعے طلبہ کی زندگیاں ہمارے مخصوص ثقافتی نظام کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ (خورشید احمد، پروفیسر (س ن)' ص 67)

قرآن مکمل اور آخری کتاب ہدایت ہے۔ اسلئے اس میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو تعلیم و تربیت، ترقی، پائیداری اور استقلال کے لئے ضروری ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ آج تک وہ لفظ بلفظ پوری کتاب پڑھنے کے لب و لہجہ کے ساتھ اسی طرح عبارت میں اور زبانوں پر جاری ہے۔ اگر قرآن پاک ایک دفعہ میں اتار دیا جاتا تو پوری کتاب سمجھ میں نہیں آسکتی تھی اور نہ اس پر عمل ہوسکتا تھا۔ ایک نسل کی تعلیم و تربیت اور اس کی پختگی کی عمر اکیس بائیس سال ہوتی ہے۔ قرآن مجید 23 سال تک اترتا رہا اس طرح ایک نسل رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تربیت سے پختہ کار اور اس پر عمل کر کے دنیا کے لئے نمونہ بن گئی۔ قرآن نے منافقین اور انکار کرنے والوں کے خلاف تلوار اٹھانے اور جنگ کرنے کا اعلان نہیں کیا جب تک وہ خود اقدام نہ کریں اور اگر امن پر رہیں تو جنگ ختم کر دی جائے۔ پھر یہ کہ ہر مذہب و ملت کو آزادی حاصل رہی اور ایک فرد پر بھی پابندی نہیں لگائی گئی۔ دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی نظام بھی قانوناً انسان کو اس حد تک آزادی نہیں دیتا جتنی آزادی قرآن نے دی ہے۔ قرآن پر عمل کرنے اور رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے کی وجہ سے ایک متوازن اور انتہائی کامیاب معاشرہ قائم ہوسکا جس کی مثال نہیں ملتی۔ (عبید اللہ قدسی 1981ء ص 4)

4.3 اسلامی نظام حیات کے بنیادی اصول

اسلام ایک جامع نظام حیات ہے۔ اسی جامعیت کی وجہ سے نظام تعلیم بھی اس کا لازمی حصہ ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی نظام تعلیم کے صحیح شعور کے لئے اسلامی نظام حیات کے جامع تصور کا واضح شعور ضروری ہے۔ اسلامی نظام حیات کا ماخذ قرآن ہے۔ جس نے دنیا کے پست و بلند، ناہمواریوں اور خرابیوں کا علاج پیش کیا اور بالکل فطری راہ عمل متعین کر دی۔ روزِ اول یعنی رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے پہلے دن سے اسلامی ثقافت کی وہ انقلابی تحریک شروع کر دی جس کی مکمل بنیاد

آفاقی والٰہی علم اوراس کی ہدایت پرمبنی ہے۔آج تک دنیا کی کسی کتاب، کسی تحریک، کسی ہدایت میں ایسی جامعیت اورانسانی ترقی کی بلند پایہ رہنمائی نہیں ملے گی۔(عبیداللہ قدسی 1981ء ص 1-2)

اوّلین اور پہلے دن نازل ہونے والی تعلیم یہ ہے: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ہ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ہ – ترجمہ:پڑھیے!اپنے رب کا نام لے کر،جس نے انسان کوخون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔پڑھیے!اورآپ ﷺ کارب کرم کرنے والا ہے۔جس نے قلم سے سکھایا،انسان کووہ علم دیا جواس کوحاصل نہیں تھا۔(العلق:1-5)

اس ہدایت میں نہ کسی قبیلے کاذکر ہے،نہ کسی قوم اورملک کا،یہ ہدایت تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔اب ایک ایک فقرہ پرغور کیجئے۔ان فقروں میں انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد اورعقل انسانی کیلئے منظم طریقہ سے اس علم کی روشنی میں ہمیشہ ترقی کرتے رہنے کیلئے رہنمائی موجود ہے۔اسلام اورصرف اسلام وہ مکمل نظام زندگی ہے جس نے ایک اعلیٰ درجہ کی تہذیب اورامتیازی ثقافت کی نشوونمااورکمال میں پوری کامیابی حاصل کی ہے کیونکہ اسلام صرف انسان اورانسان کے خالق خدائے عالم الغیب والشہادۃ کے ربط وتعلق ہی کونہیں بتاتا بلکہ اس نے نہایت جرأت وبیباکی سے انسان کوعملی زندگی کے میدان میں قدم بڑھانا سکھایا۔

انسانوں کے باہمی تعلقات کے تمام شعبوں اورروزمرہ زندگی کی ضروریات کے تمام تر مسائل کاحل واضح طورپر پیش کردیا۔خواہ وہ پیٹ کی روٹی سے تعلق رکھتے ہوں یا جنسی وازدواجی تعلقات سے یا معاشرت وسیاست سے یا معیشت واقتصادیات سے یاتجارت اورمالیات سے۔اس طرح سے اسلام نے اس حدفاصل کودورکردیا جوقیصر کی حکومت اورخدا کی حکومت کے درمیان قائم کردی گئی تھی۔یہاں بڑائی چھوٹائی کاامتیاز ہے نہ ذات پات کانظام ہےاورنہ چھوت چھات کی لعنت،نہ یہاں برہمن کاکوئی عہدہ ہےنہ پروہتائی کیلئے کوئی جگہ۔یہاں دینی علوم سےواقفیت یا روحانی تقدس کی بناپرکسی کوبندےاوراس کے خالق وپروردگار کےدرمیان ایک واسطہ بننے کی اجارہ داری حاصل نہیں۔عبادت ومراسم نکاح کیلئے کسی پادری اوربرہمن کی حاجت نہیں۔خدا کےاقتداراعلیٰ میں کسی انسان کی حاکمیت اورکسی انسان کے وضع کیے ہوئے دستوروقانون کی بالادستی تسلیم نہیں کی جاسکتی۔یہاں غیرخدا کی بندگی جائزنہیں اورہروہ اطاعت جوخدا کے مدمقابل ہوقطعی شرک ہے۔اسلام تمام انسانوں کے ساتھ خواہ وہ گورے ہوں یا کالے،عربی ہوں یا عجمی،رومی ہوں یاحبشی بالکل مساویانہ سلوک ان کےانسان ہونے کی حیثیت سےلازمی قراردیتا ہے۔اسلام میں رنگ،نسل قومیت،پیشہ،زبان کی بناپرکسی قسم کی تفریق کی قطعی گنجائش نہیں یہاں کسی کوکسی پرکوئی فوقیت وبرتری وبزرگی نہیں اِلّا تقویٰ،خداترسی،ایمان اوراعمال صالح،یہ ہیں اسلامی نظام حیات کی اصل روح۔(محمدالیاس فارانی 1968ء ص 13-14)

یہ اسلامی تہذیب ہی ہےجس نے حق وصداقت،اخوت ومحبت کابول بالا کیا۔اس نے انسان کےصحیح مقام کاتعین کیا،اس نے انسان کونائب خداقراردیا۔جب انسان کوخداتعالیٰ کاخلیفہ اورنائب قراردیا گیاتواس کے معنی یہ ہوئے کہ

انسان خدا کی نیابت وخلافت کا پورا حق اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب خدا تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کی روش بھی ویسی ہو جیسی خود خدا تعالیٰ کی روش ہے ۔یعنی جس شان ربوبیت کے ساتھ خدا تعالیٰ اپنی مخلوق کی پرورش اور خبر گیری کرتا ہے، ویسی ہی شان کے ساتھ انسان بھی اپنے محدود دائرہ کار میں ان چیزوں کی خبر گیری اور پرورش کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے قبضہ قدرت میں دی ہیں ۔اس طرح جس شانِ رحمانی ورحیمی کے ساتھ خدا اپنی ملکیت میں تصرف کرتا ہے، جس شانِ عدل کے ساتھ خدا اپنی مخلوقات میں نظم قائم کرتا ہے، جس شان رحم کے ساتھ خدا اپنی صفت قہر وجبر کا اظہار کرتا ہے۔ چھوٹے پیانے پر اسی شان کے ساتھ انسان خدا کی مخلوق کے ساتھ معاملہ کرے جس پر اللہ نے اس کو حکومت بخشی ہے اور جسے اس کیلئے مسخر کیا ہے ۔یہی مفہوم ہے جو تَخَلَّقُوا بِاَخلَاقِ اللہ کے حکیمانہ جملے میں ادا کیا گیا (ابوالاعلیٰ، مودودی، سیّد 1987ء ص 29)۔یہ ہیں وہ زریں اصول جن پر اسلامی نظام حیات کی عظیم الشان عمارت قائم ہوتی ہے۔

اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے ۔اسلام فرد کی اپنی ذاتی شخصیت میں یقین رکھتا ہے اور ذاتی طور پر ہی ہر ایک فرد کو اللہ تعالیٰ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہراتا ہے ۔اسلام فرد کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا ۔اس کی تعلیمی پالیسی میں فرد کی شخصیت کا مناسب ارتقاء اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے ۔یہ اس خیال کا حامی نہیں کہ فرد کو اجتماع یا ریاست میں اپنی انفرادیت کھو دینی چاہئے ۔(خورشید احمد (س ن) ص 24)

اپنی جامعیت اور ہمہ گیریت کے باوجود اسلام عملی تدبیر وتنفید کے سلسلے میں تدریج کا قائل ہے ۔اسلام میں بٹن دبا کر یکایک انقلاب برپا کرنے کا کوئی تصور نہیں ۔حضور نبی کریم ﷺ کے اسوۂ مبارکہ سے تدریج عمل کی شہادت ملتی ہے ۔ آپ ﷺ نے پورا اسلامی قانون اس کے سارے شعبوں کے ساتھ یک وقت نافذ نہیں کر دیا تھا بلکہ معاشرے کو بتدریج اس کے لئے تیار کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آہستہ آہستہ دورِ جاہلیت کے طریقوں اور قاعدوں کو بدل کر نئے اسلامی طریقے اور قاعدے جاری کئے تھے ۔آپ ﷺ نے سب سے پہلے اسلام کے بنیادی تصورات اور اخلاقی اصول لوگوں کے سامنے پیش کئے ۔پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے گئے انہیں آپ ﷺ تربیت دے کر ایک ایسا مصلح گروہ تیار کرتے چلے گئے جس کا ذہن، زاویہ نظر اور طرز عمل خالص اسلامی تھا ۔جب یہ کام ایک خاص حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ ﷺ نے جو دوسرا اقدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ مدینے میں ایک ایسی حکومت قائم کر دی جو خالص اسلامی نظریہ پر مبنی تھی اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک کی زندگی کو اسلام کے نقشے پر ڈھال دے ۔اس طرح سیاسی طاقت اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی ﷺ نے وسیع پیانے پر اصلاح وتعمیر کا وہ کام شروع کیا جس کے لئے آپ ﷺ صرف پہلے دعوت وتبلیغ کے ذریعہ کوشش فرمارہے تھے ۔(ابوالاعلیٰ مودودی 1981ء الف ص 367)

آپ ﷺ نے ایک مرتب اور منظم طریقے سے لوگوں کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت کو بدلنے کی جدوجہد کی ۔تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقے پر تھا۔

جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرز فکر کی اشاعت کی ۔پرانی رسموں اور طور طریقوں کی جگہ نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب واطوار جاری کئے ۔اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعہ سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب رونما ہوتا گیا آپ ﷺ اسی کے مطابق پورے توازن اور تناسب کے ساتھ اسلامی قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے ۔یہاں تک کہ 9 سال کے اندر ایک طرف اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہو گیا۔

اسلام کی جامعیت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کی دعوت رنگ، نسل، قبیلہ، زبان اور کسی فرق و امتیاز کے بغیر ساری نوع انسانی کیلئے ہے۔اسلام سب بنی آدم کو ایک خدائے حیّ القیوم کی اطاعت کرنے کی دعوت دیتا ہے جو ہر شے کا خالق اور سارے جہانوں کا پروردگار ہے جس کے سامنے ہر بشر مرد ہو یا عورت اپنے اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہے ۔توحید اور انسانی اخوت خدا کے پیغمبروں کی تعلیمات کا لب لباب ہیں تا کہ سب لوگ صداقت اور عدل و انصاف کی فضا میں اپنی زندگی بسر کریں ۔پیدائش سے کسی کو خاص مقام و مرتبہ یا حقوق و مراعات حاصل نہیں ہو جاتے ۔روئے زمین پر عادلانہ معاشرتی نظام قائم کرنے کیلئے پوری جدوجہد کرنا اور ضرورت پڑے تو جان و مال بھی قربان کر دینا مسلمانوں پر فرض ہے ۔اسلام میں راسخ العقیدہ اور صالح العمل ہونے پر مسلسل زور دیا گیا ہے ۔اگر لوگ جہالت اور گناہ میں زندگی بسر کرتے ہیں تو وہ ماضی میں کسی مفروضے کو قصوروار نہیں قرار دے سکتے ۔بلکہ انہیں اس دنیا میں بھی اور اگلے جہان میں بھی اس کی ذمہ داری خود قبول کرنی ہوگی ۔(محمد علی چوھدری 1981ء ص 11)

برصغیر کا معاشرہ ذات پات اور اونچ نیچ کے بندھنوں میں جکڑا ہوا تھا۔اس صورت حال میں مسلمانوں نے انسانی حقوق کو برہمنوں اور اچھوتوں دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا۔ان پر جوش مبلغوں نے ہر جگہ یہ پیغام سنایا کہ ہر شخص کو خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں جھک جانا چاہئے ۔خدائے واحد کے سامنے تمام انسان برابر ہیں ۔(ہنٹر، ڈبلیو ۔ڈبلیو 1968ء ص 130)۔مغربی تہذیب احترام آدم اور آزادی فکر سے شروع ہوئی مگر مادیت پرستی، عریانی، وطن پرستی، جمہوریت اس کے مظاہر بن گئے ۔احترام آدم اور آزادی فکر کا توازن و جامع تصور پہلے اسلام نے دیا تھا۔تجرباتی انداز علم بھی اسلام ہی کا دیا ہوا ہے ورنہ یورپی تہذیب کی پیش رو یونانی تہذیب تو کائنات کو سایہ کہتی تھی جیسے ہندو اسے مایا یا فریب کہتے تھے ۔اپنا حاکم خود مقرر کرنے کا حق ملوکیت کا خاتمہ اور معاشی وسائل کو اسلام نے ہی عام کیا تھا۔اب یہ امر مسلمہ ہے کہ یورپ کی تحریک احیائے علوم جس نے موجودہ یورپی تہذیب کو جنم دیا دراصل ان اسلامی افکار سے وجود میں آئی تھی جو صقلیہ (سسلی) اور ہسپانیہ (سپین) کی اسلامی حکومتوں کی راہ سے یورپ میں پہنچے ۔(عبدالرشید میاں 1982ء ص 94)

4.4 اسلامی مقاصدِ تعلیم

نظامِ تعلیم یا تعلیمی عمل میں مقاصدِ تعلیم کے تعین کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ان مقاصد کے حصول کیلئے موزوں نصاب تعلیم کی تشکیل کی جاتی ہے اوراس نصاب کو طلبہ کی طرف منتقل کرنے کیلئے مناسب حکمت تدریس اختیار کی جاتی ہے۔بعدازاں یہ جائزہ لیا جاتا ہے کہ متعلقہ نصاب کس قدر کامیابی سے طلبہ میں مطلوبہ تعلّم پیدا کرنے میں موثر ثابت ہوا۔پھران سب میں ہم آہنگی پیدا کرنے اوران کیلئے موزوں فضا کی نشوونما کیلئے افرادی ومادی وسائل کا اہتمام وانصرام کیا جاتا ہے۔یوں نظام تعلیم کے پانچ بنیادی عناصر سامنے آتے ہیں:مقاصد،نصابیات،حکمت تدریس،امتحانیات، انتظامیات(علی احمد چوہدری 2001ء الف،ص 127)

علم مسلمان کی دولت ہے۔دنیا کے کسی مذہب یا نظام فکر نے حصول علم پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے۔لہذا زمانہ ماقبل اسلام کو زمانہ کفر نہیں بلکہ زمانہ جاہلیت کے نام سے پکارا گیا۔اسی طرح اسلام کے سب سے بڑے دشمن کو ابوالکفر کی بجائے ابوجہل کہا گیا۔خدا نے جب آدمؑ کو پیدا کیا تو سب سے پہلے اسے اسمائے اشیاء کا علم دیا گیا۔حضورﷺ پر جب وحی اتری تو اس کا پہلا لفظ تھا"اِقۡرَاء"۔قرآن میں ایک قول کے مطابق لفظ"علم"یا اس کے مشتقات چار سو سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں۔اس کے علاوہ عقل،شعور اور تفکر بتکرار استعمال ہوئے ہیں (ابوسلمان شاہجہان پوری 1973ء،ص 12)۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ:هَلۡ يَسۡتَوِي الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَايَعۡلَمُوۡن ہ– ترجمہ:جولوگ نہیں جانتے کیا وہ ان لوگوں کے برابر ہوسکتے ہیں جو جانتے ہیں۔(الزمر:9)

رسول اللہﷺ کی بعثت کا ایک بڑا مقصد نہ صرف عربوں کو بلکہ ساری دنیا کو تمدن کی دولت سے مالا مال کرنا تھا۔چنانچہ اسی لئے سیّدالمرسلینﷺ کو اپنے معلّمِ"کتاب وحکمت"ہونے پر بڑا فخر تھا۔عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ نے ایک دلچسپ واقعہ بیان فرمایا ہے کہ:عن عبدالله بن عمرو قال خرج رسول الله ذات یوم من بعض حجره فدخل المسجد فاذا هو بحلقتین احدهما یقرءُون القرآن ویدعون الله ، والاخری یتعلّمون ویعلّمون فقال النبی کلٌ علیٰ خیرٍ هؤلاء یقرؤن القرآن ویدعون الله فان شاء اعطاهم وان شآء منعهم وهؤلاِ یتعلّمون ویعلّمون وانما بعثت معلّما فجلس معهم – ترجمہ:آنحضورﷺ ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لائے اور صحابہ کرامؓ کے دو حلقے دیکھے۔ایک تلاوت ودعا میں مصروف تھا،دوسرا درس وتدریس میں مصروف تھا۔ آنحضرتﷺ نے پہلے ارشاد فرمایا:دونوں گروہ اچھے کام میں مشغول ہیں۔پھر اِنَّمَا بُعِثۡتُ مُعَلِّماً کہہ کر علمی حلقے میں بیٹھ گئے۔(ابن ماجہ،السنن،کتاب السنہ،باب فضل العلماء،ص 35،ح 229)

پس تعلیم کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ وہ طلبہ میں اسلامی نظریۂ حیات سے آگہی پیدا کرے۔یعنی زندگی کا مفہوم اور مقصد،دنیا میں انسان کی حیثیت،توحید،رسالت،آخرت،انفرادی اوراجتماعی زندگی پر ان کے اثرات،اخلاقیات کے

اسلامی اصول، اسلامی ثقافت کی نوعیت، ایک مسلمان کے فرائض اور اس کا مشن انہیں سمجھایا جائے۔ انہیں بتایا جانا چاہیے کہ وہ کس طرح اعلیٰ مقاصد کے لئے دنیا کی تمام قوتوں کو استعمال کریں۔ تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات پر بھرپور یقین کے حامل ہوں اور اس طرح ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطۂ نظر پیدا ہو کہ وہ زندگی کے ہر میدان کیلئے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا سکیں (سعید اختر، پروفیسر 1976ء ص 9)۔ کیونکہ قرآن کا فرمان ہے کہ: گواہی دی اللہ نے اس کی کہ اس کی ذات کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے اور اہل علم نے بھی (آل عمران: 18)۔ گویا اہل علم حق اور سچائی کے گواہ ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک انٹرویو (شائع شدہ شہاب لاہور 8۔ اپریل 1962ء) میں اسلامی دور کے مقاصد تعلیم کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا: مقصد یہ تھا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن کر اٹھیں اور دنیا میں تہذیب وتمدن کے نظام کو اس طرز پر چلانے کے قابل ہوں جو اسلام چاہتا ہے (بحوالہ ابو طارق (س ن) ص 126)۔ اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں: دوسری چیز جو کسی نظام تعلیم میں بنیادی حیثیت کی حامل ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ دین ودنیا کی تفریق مٹا دی جائے۔ ایسے نظام تعلیم کے مطابق لازم ہے کہ انسان دنیا کو سمجھے اور دنیا کے کام چلانے کے قابل ہو اور اپنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال سکے کہ کسی مرحلہ پر بھی دین اور دنیا میں ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہو سکے اور جب کبھی ایسا مسئلہ درپیش ہو تو دنیا کو دین کے نقطۂ نظر سے سمجھا جائے۔ اس سلسلہ میں اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ایک اور چیز تشکیل سیرت ہے۔ وہ نظام تعلیم جس کا مقصد محض کتابیں پڑھانے اور علوم وفنون سکھا دینے سے حل ہو سکتا ہے۔ کبھی مثالی نظام تعلیم نہیں کہلا سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تشکیل سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے جس کے نتیجہ میں بنیادی انسانی اخلاقیات پیدا ہوں گی اور معاشرہ کی تعمیر صالح بنیادوں پر رکھی جا سکے گی۔ (ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 2006ء ص 110)

ابو عمار زاہد الراشدی کے نزدیک اسلامی نظام تعلیم کا بنیادی محور یہ ہے کہ:

- نئی نسل کو اللہ تعالیٰ کے ارشادات واحکامات ان کے اصل الفاظ میں یعنی قرآن کریم کی صورت میں پہنچائے جائیں۔
- قرآن کا وہ مفہوم، معانی اور مقاصد جو نبی کریمؐ نے وحی الٰہی کے سائے میں متعین فرمائے ہیں وہ نئی نسل کے ذہن نشین کرائے جائیں۔
- نئی پود کے افراد کو ''حکمت وسنت'' یعنی زندگی گزارنے کے نبوی ﷺ اسلوب سے آگاہ کیا جائے جس میں بول چال سے لے کر تجارت، زراعت، دیگر ذرائع معیشت اور مختلف علوم وفنون میں مہارت سمیت زندگی کے تمام مسائل شامل ہیں۔
- اسلام صرف تعلیم پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ضروری قرار دیتا ہے کہ قرآن وسنت اور حکمت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی اخلاقی اصلاح، اس کی زندگی کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے اور ان کے دلوں کو ردی ورذیل

افکار وخیالات سے پاک کرنے کیلئے ان کی عملی وروحانی تربیت بھی کی جائے اور انہیں جو کچھ سکھایا جائے اللہ والوں کی نگرانی میں ان سے اس پر عمل بھی کرایا جائے تاکہ وہ ان کی تعلیم صرف "تھیوری" تک محدود نہ رہے بلکہ پریکٹیکل کے دائرہ میں آ کر ان کی زندگی میں مثبت اور مفید تبدیلیوں کا ذریعہ بنے۔(ابو عمار زاہد الراشدی 1979ء،ص 596)

محمد مصلح الدین کے نزدیک اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد دین کو سمجھنا اور اس میں بصیرت حاصل کر کے اس کے مزاج اور روح سے آشنا ہونا ہے۔اسلام کے تعلیمی نظام میں مقصود نہ دولتِ دنیا ہے، نہ علمی تفاخر، نہ شہرت و مباہات۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جن مقاصد محمودہ کی ترغیب دلائی وہ یہ تھے: خدا کی ناراضی کا ڈر (خشیت الٰہی) فرائض دینی کا علم اور ان کی ادائیگی کا اہتمام، تزکیہ نفس یا تعمیر کردار، دنیا سے بے نیازی اور اللہ تعالیٰ کے دین کا احیاء و غلبہ۔دنیا کے تعلیمی نظاموں میں یہ امر ہمیشہ مشکوک رہا کہ تعلیم کا بنیادی مقصد کیا ہے؟ بہت سے مقاصد کی فہرست میں کس کو عنوان بنایا جائے۔تعلیم کی غایت کیا ہے؟حضور نبی کریم ﷺ نے روز اول سے ہی طے فرما دیا کہ خشیت الٰہی اور رضائے الٰہی بنیادی مقاصد تعلیم ہیں۔ دوسرے مقاصد توضمنی اور ثانوی اہمیت رکھتے ہیں۔(محمد مصلح الدین 1988ء،ص 16)

یوسف القرضاوی کے نزدیک اسلامی نظام تعلیم کا مقصد "صالح انسان" پیدا کرنا ہے۔اس صالح انسان کے اوصاف سورۃ العصر کی روشنی میں حسبِ ذیل ہوں گے:

- ایک صالح انسان ایک صاحب عقیدہ مومن ہوتا ہے۔وہ شخص صالح کہلانے کا مستحق نہیں جس کا دل اپنے پروردگار کی یاد سے غافل ہو۔جو اپنی خواہشات کا پجاری ہو اور جس کا عمل بے اعتدالی کا شکار ہو۔
- انسان صالح کا ایمان مجرد ایک نظری عقیدہ اور محض زبانی دعویٰ نہیں ہوتا بلکہ اس کا ایمان اس کے اعمال بلکہ اعمال صالحہ کے پیکر میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔لفظ "صالحات" ایک قرآنی تعبیر ہے۔اس کا اطلاق ان تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو "فرد و جماعت" اور "دین و دنیا" کی اصلاح کی موجب ہوتی ہیں۔
- یہ صالح مردِ مومن صرف اپنی ذات کی اصلاح پر اکتفا نہیں کرتا۔وہ جس دین حق پر ایمان لاتا ہے۔اس کو اپنی ذات کے خول میں مقید نہیں کر دیتا بلکہ تلقین اور دعوت کے ذریعہ اس نورِ حق کی شعاعوں کو سارے معاشرے تک پھیلانے کی جدوجہد کرتا ہے۔دوسرے اہل دعوت جب اس کو اسلام کی تلقین اور دعوت دیتے ہیں تو ان کی دعوت قبول کرتا ہے۔اس طرح یہ سب اس کی نشر و اشاعت اور حمایت و نصرت میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔یہی مفہوم ہے وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کا۔
- اس کے بعد وہ دوسرے اہل حق کے دوش بدوش دعوتِ حق کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات و شدائد برداشت کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔حتیٰ کہ وہ اپنی جان تک کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔وہ مصائب کی تلخیوں، راہ حق کی طوالت اور رکاوٹوں کی کثرت پر صبر و ثبات کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس صبر و استقلال کی دوسروں کو

بھی تلقین کرتا ہے اور خود بھی دوسروں کی تلقین کو قبول کرتا ہے۔اس طرح وہ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں۔وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کا یہی مطلب ہے۔(یوسف القرضاوی علامہ ڈاکٹر 1998ء ص 22)

اسلامی نظریۂ تعلیم کے مطابق سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار کی تشکیل کو حاصل ہے۔تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے،اپنا حقیقی مقصد حاصل نہ کرپائے گی۔اسلام میں نیک اعمال اولین اہمیت کے حامل ہیں۔قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی بیک وقت تلقین کی گئی ہے۔نبی اکرم ﷺ کے بنیادی مشن میں تزکیہ نفس یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر شامل ہے اور اسے اولیت حاصل ہے۔اسلام زندگی اور اس کی مسرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کی زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کیلئے تیار کرنا چاہیے۔انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہیے اور معاشرے کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنانا چاہیے۔اسلام رہبانیت اور ترک دنیا کا مخالف ہے۔اسلام چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشائش کے درمیان حق وانصاف کے ساتھ زندگی گزارے۔(خورشید احمد،پروفیسر 1968ء ص 27)

سعید اختر نے اسلامی نقطۂ سے تعلیم کے درج ذیل اعلیٰ مقاصد قرار دیے ہیں:(سعید اختر 1991ء ص 59)

خشیت الٰہی اور رضائے الٰہی

آنحضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔علم حاصل کرو کیوں کہ علم کا سکھانا خشیت الٰہی ہے اور اس کا سیکھنا عبادت ہے۔نیز فرمایا:من سلك طريقاً يلتمس فيه علماً سهل الله له به طريقا الىٰ الجنّة ترجمہ:جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے کسی راستے پر چلا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کردے گا۔(الترمذی،الجامع،ابواب العلم، باب فضل طلب العلم،ص 601،ح 2646)

دنیا سے بے نیازی اور اخلاقی بلندی

ارشاد نبوی ہے:اللہ تعالیٰ کو جس بندے کی بھلائی منظور ہوتی ہے اس میں تین وصف پیدا کردیتا ہے۔دین کا علم وفہم،دنیا سے بے نیازی اور اپنے عیوب کی پرکھ۔حدیث قدسی ہے:من يرد اللّٰه به خيرا يفقهه في الدين - ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو جس بندے کی بھلائی منظور ہوتی ہے اس میں دین کا علم وفہم پیدا کردیتا ہے(البخاری،الجامع الصحیح،کتاب العلم،باب من یر د اللّٰه به خیرًا یفقه فی الدین ص 17،ح 71)۔دوسرا فرمانِ رسولؐ ہے:قال رسول اللّٰه اذا رأيتم الرّجل قد أعطي زهدًا في الدنيا ، وقلة منطق ، فاقتربوا منه ، فانه يلقي الحكمة — ترجمہ: جب تم بندے کو دیکھو کہ اس کو دنیا سے بے رغبتی ہے اور کم گوئی کی عادت پڑ گئی تو اس کے قریب ہوجاؤ کیونکہ اس کو حکمت دی جاتی ہے۔(ابن ماجہ،السنن،ابواب الزہد،باب الزهد فی الدنیا،ص 598،ح 4101)

احیائے دین کیلئے تحصیلِ علم

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:عن عبدالرحمن بن عبدالله بن مسعود عن ابيه قال: سمعت رسول

اللّٰہ یقول : نضّر اللّٰہ امرءَ اسمع منّا شیئًا فبلّغه کما سمعه فربّ مبلّغ أوعی من سامع — ترجمہ:اللہ تعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میرے قول کو نقل کیا جیسا کہ اس نے سنا تھا (الترمذی،الجامع،ابواب العلم،باب ماجاء فی الحث علی تبلیغ السماع ،ص603،ح2656)۔آپ ﷺ کا دوسرا ارشاد ہے: عن الحسنؓ قال رسول اللّٰہ من جاء ہُ الموت وھو یطلب العلم لیحیی به الاسلام فبینه وبین النّبیّین درجة واحدة فی الجنة — ترجمہ:جس کو اس حالت میں موت آ گئی کہ اسلام کے زندہ کرنے کیلئے علم حاصل کر رہا تھا اس کے اور نبیوں کے درمیان ایک درجے کا فرق ہوگا۔(الدارمی،السنن،باب فی فضل العلم والعالم ،ص85،ح360)

پروفیسر محمد سلیم اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

- اسلامی نظریاتی حکمت پر ایمانِ راسخ پیدا کرنا۔
    - تا کہ انسان اللہ کی بندگی کے تقاضے پورے کر سکے۔
    - تا کہ انسان خلافت کا نظام دنیا میں قائم کر سکے۔
- اطاعتِ ربّ،اتباعِ سنت،تقویٰ اور آخرت کی جوابدہی کا ہر دم تازہ شعور پیدا کرنا۔
- علوم ہدایت (علوم دینی) کی تعلیم دینا۔
- علوم وصفی (عمرانی وسائنسی علوم) کی تعلیم دینا۔
- انسان کی فنی اور حرفتی صلاحیتوں کو نشو و نما دینا تا کہ وہ رزق حلال کما سکے۔
- انسان کی تہذیب نفس،تطہیر اخلاق اور تعمیر سیرت کرنا۔
- انسان کو داعی حق اور اعمال خیر کا محرک بنانا۔
- انسان کو محنت و مشقت کا عادی بنانا۔
- انسان کے اندر صبر،مستقل مزاج اور اولوالعزمی کی صفات پیدا کرنا۔
- انسان کے اندر پابندیٔ اوقات،نظم وضبط اور پیش بینی کی عادت ڈالنا۔

(محمد سلیم،پروفیسر سیّد 1979ء،ص 49)

اوپر کی بحث سے اسلامی نظامِ تعلیم کے مقاصد حسب ذیل قرار دیے جا سکتے ہیں۔

- خشیت الٰہی
- رضائے الٰہی کا حصول
- عقل و شعور کی نشو و نما
- اسلامی تہذیب و تمدن کی تنفیذ
- تشکیل سیرت یا اعمال صالحہ میں رسوخ

- زندگی گزارنے کے نبوی ﷺ اسلوب سے آگاہی
- عقائد اسلامی اور فرائض دینی کا شعور
- دنیا سے بے رغبتی
- ایمان کی پختگی
- حق کی تلقین
- صبر کی تلقین

4.5 اسلامی نصاب تعلیم

نصاب عربی زبان کے لفظ "منہاج" کے مترادف ہے۔ کسی منزل تک پہنچنے کا راستہ ذریعہ اور طریقہ۔ گویا مقاصد تعلیم کے حصول کے لئے جو راستہ اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، نصاب ہے۔ انگریزی میں اس کیلئے کریکولم (Curriculum) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ نصاب کسی بھی تعلیمی نظام کا عکس ہوتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اس نظام کو تشکیل دینے والے اور اس کا نفاذ کرنے والے اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نصاب، حقیقت میں ان تمام سرگرمیوں کا نام ہے جو تعلیمی اداروں کی کوشش سے وجود میں آتا ہے۔ چاہے یہ سرگرمیاں کمرۂ جماعت کے اندر ہوں یا کمرۂ جماعت کے باہر (علی احمد، چوہدری 2001ء ب، ص 274)۔ یہ دراصل ایک جامع تعلیمی منصوبہ یا پروگرام ہوتا ہے جس کی روشنی میں اساتذہ طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں۔ اس پروگرام سے مراد محض نصابی خاکہ اور درسی کتب ہی نہیں بلکہ وہ سارا ماحول ہے جو تعلیم کو متاثر کرتا ہے۔ طلبہ کو اسی ماحول سے گزرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ ضروری تجربات کے حصول کیلئے با قاعدہ تدریسی لوازمہ کی تیاری، تشکیل نصاب میں ایک اہم قدم ہوتا ہے۔ اور بقول پروفیسر سعید احمد رفیق: نصاب تعلیم کا صحیح ہونا کسی قوم کو تعلیمی ترقی کی اعلیٰ منازل تک لے جا سکتا ہے لیکن ایک غلط نصاب تعلیم اس کے اعلیٰ دماغوں کو منتشر اور پریشان کر دیتا ہے۔ (سعید احمد رفیق، پروفیسر 1962ء، ص 255)

اسلامی حوالے سے طلبہ کے فکر و عمل کو واضح رخ دینے میں نصاب تعلیم کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلامی فلسفۂ حیات کے حوالے سے تشکیل و تدوین میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کو کس طرح کے انسان اور ان میں کون سے لازمی اوصاف مطلوب ہیں؟ اس تناظر میں نصاب کی اسلامی تشکیل میں اسلامی تہذیب کے احیاء کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی سارے تعلیمی عمل کا رشتہ اس رب سے جوڑا جائے جو پوری کائنات کا خالق ہے۔ چنانچہ نصاب تعلیم چاہے سائنسی علوم سے متعلق ہو یا عمرانی علوم سے اور چاہے وہ کسی بھی درجے میں پڑھایا جا رہا ہو یا کسی بھی زمانے یا علاقے میں ہو، وہ اس نظریے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے (مشتاق الرحمٰن، صدیقی ڈاکٹر 1998ء، ص 60)

اس سرچشمہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تربیت اور خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کیلئے آسمانی کتابوں کی صورت میں نصاب تعلیم عطا کیا۔انسانیت کی فلاح کیلئے آخری کتاب قرآن حکیم ہے جو نبی کریم ﷺ پر اتاری گئی۔ لہٰذا نصاب کی اہم علمیاتی بنیاد قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے اور یہی نصاب کا مرکز و محور ہے۔(مشتاق الرحمٰن، صدیقی ڈاکٹر 2001ء ص 9)

اسلام کے نزدیک عقل وحواس کے ذریعے سے علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے لیکن اسے یقین کا درجہ حاصل نہیں۔ لہٰذا یہ ذرائع لازماً بالاتر اور یقینی ذریعہ علم یعنی وحی الٰہی کے تابع ہوں گے۔حقیقت میں انسان مطلوب کے لازمی اوصاف کے حوالے سے تمام تعلیمی اور تربیتی سرگرمیوں کا اساسی رہنما اصول وہ مشن ہے جس کیلئے انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے گئے۔ یہ ایک ایسا مشن ہے جو اصحاب علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے۔قرآن حکیم کے مطابق یہ مشن اسلام کے پیغام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عادلانہ وصحت مند اجتماعی نظام کا قیام ہے۔پس اسلامی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن میں مقصد کی تعلیم دینا،ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور ایک مکمل وصحت مند زندگی کیلئے تیار کرنا ہے۔(خورشید احمد، پروفیسر (س ن)،ص 23-24)

مختصر یہ کہ اسلام کا نصاب تعلیم اللہ کی خوشنودی کے روحانی نصب العین کا آئینہ دار ہے۔چنانچہ ذیل میں درج شدہ نکات سے "اسلامی نصاب تعلیم" کی ماہیت واضح ہوگی۔

- علم کی دو بڑی صورتیں ہیں ایک ہدایتی یا دینی تعلیم (Revealed Knowledge) جن کا تعلق قرآن وسنت سے ہے اور دوسری وضعی یا عقلی تعلیم (Acquired Knowledge) جن کا تعلق انسانی فکر سے ہے۔ان دونوں کا حصول ضروری ہے لیکن دینی علم کو سب پر فوقیت ہے یعنی فرض عین اور علم محمود کا جاننا ہر طالب علم کیلئے ضروری ہے۔(مشتاق الرحمٰن،صدیقی ڈاکٹر 1998ء،ص 62)
- مطالعہ قرآن اور مطالعہ حدیث کو تعلیم میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔اس طرح وحی الٰہی تمام نصاب کا مرکز ومحور ہے اور تمام جزوی یا انسانی علوم، علم کلی یعنی "العلم" کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔حقیقت میں تمام علوم وفنون کی تشکیل وتدوین اس نقطہ نظر سے کی جاتی ہے کہ دنیا وآخرت میں سعادت وبھلائی کا حصول ہو۔(نعیم صدیقی 1999ء ص 16)
- نصاب تعلیم میں ثنویت (Dualism) کا نہیں بلکہ دین ودنیا کی وحدت کا تصور ہوتا ہے۔تعلیم بیک وقت دینی بھی ہوتی ہے اور دنیوی بھی اور یہ اس لئے تا کہ انسان دنیا کو دین کے حوالے سے ہی سمجھے۔اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت کے مطابق دنیا کے سارے کام چلائے۔اس طرح یہ نظام تعلیم ،سیکولر اور ملحدانہ نظریات کی نفی کرتا ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی،سیّد 2006ء ص 147)
- ہر تعلیمی سطح اور ہر قسم کی درسگاہ میں تشکیل اور تنفیذ نصاب میں "تلاوت آیات،تزکیہ اور کتاب وحکمت" کی تعلیم کو

اساسی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔اس طرح ہر مضمون کے تدریسی لوازمہ میں درج ذیل پانچ عمومی امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔نیز تمام نصابی سرگرمیاں چاہے تعلیمی ادارے کے اندر ہوں یا باہر،ان ہی نکات کے گرد مرتب ہوتی ہیں۔

- اللہ،کائنات،انسان،رسالت اور آخرت کا اسلامی تصور۔
- زندگی کا اسلامی تصور۔
- اسلامی عقائد۔
- عبادات یعنی تربیت افراد کا نظام۔
- نظام اجتماعی یعنی اسلامی معاشرے کی ہمہ جہت فلاح وسعادت ۔(محمد زمان،نازی 2001ء،ص 169)

ہر مضمون کو پڑھاتے وقت بھی درج بالا پانچ عمومی امور کے ساتھ اس مضمون کی مخصوص اسلامی حکمت تدریس کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

- نصاب تعلیم میں ترجیحات کے نقطۂ نظر سے دینی علوم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔عمرانی اور طبعی علوم ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر عمرانی اور طبعی علوم میں بھی عمرانی علوم کو فوقیت دی جاتی ہے کیونکہ ان علوم کے ذریعے سے انسانی زندگی کے مسائل سے متعلق بحث کی جاتی ہے۔اسلامی نصاب تعلیم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے لیکن تمام علوم میں اسلامی فکر کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔اختصاصی مضمون کے انتخاب اور اس میں مہارت کیلئے طالب علم کے علمی ذوق اور سابقہ علمی استعداد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔(شاہد ایس ایم 2003ء،ص 220)

اسلامی دور کے نصاب تعلیم کے بارے میں ہمارے پاس تاریخی مواد بہت کم ہے۔البتہ یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ دینی علوم کے پہلو بہ پہلو رسول اکرم ﷺ نے بہت سے دوسرے علوم وفنون مثلاً علم ریاضی،مبادی طب،علم ہیت یا علم فلکیات،علم انساب،علم تجوید اور فن خطاطی جیسے علوم مفیدہ کو سیکھنے کی یا تو اجازت دی یا ان کی تحصیل کی حوصلہ افزائی فرمائی۔علاوہ ازیں جسمانی صحت کو بحال رکھنے کیلئے نشانہ بازی،شہسواری،تیراکی،اور کشتی کا فن سیکھنے کی اجازت دی۔اگرچہ ان جملہ مضامین کی بیک وقت تعلیم کا کسی درسگاہ میں بھی انتظام نہ تھا جبکہ آپ ﷺ نوجوانوں اور بچوں کو مثبت اور صحت مند جسمانی مشاغل سے وابستہ فرماتے تھے(محمد طاہر القادری،پروفیسر ڈاکٹر 1997ء،ص 267)۔ اسلامی نصاب تعلیم میں بڑی وسعت تھی اور کوئی قابل ذکر علم ایسا نہیں تھا جسے نصاب میں شامل کرنے کی گنجائش نہ تھی البتہ علم نجوم اور علم طلسمات کو اسلام مذموم علوم قرار دیتا ہے۔(محمد بن عبدالوہاب 1987ء،ص 16)

اسلامی نظام تعلیم میں سب سے بڑی تعلیم قرآن ہے اور قرآن علم کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔حتیٰ کہ پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ پیغمبر حضرت محمد ﷺ سے مخاطب ہوتا ہے:اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ہ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ

عَلَقٍ – ترجمہ: پڑھ! اپنے رب کے نام پر جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔(العلق: 1-2)

اسلامی نصاب قرآن مجید اور احادیث سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اسے بنی نوع انسان کیلئے الہامی نصاب کہا جاسکتا ہے۔ اسلامی نصاب کا محور قرآن وحدیث کے گرد گھومتا ہے اور مسلمان قرآن کو یاد کرنے اور سمجھنے کیلئے زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ ایسی مثال کسی دوسری الہامی یا غیر الہامی کتاب کے ساتھ نہیں ملتی۔ ابتدائی دور میں مسلمانوں کیلئے نصاب کا مرکز قرآن مجید تھا۔ یہ صرف پڑھنے کیلئے نہیں تھا بلکہ اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں قرآن کی تشریح پر کوئی اختلاف نہیں تھا کیونکہ آپ ﷺ خود موجود تھے۔ لیکن آپ ﷺ کے وصال کے بعد رائے میں اختلاف ہونا شروع ہوا جو کہ کوئی بری بات نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی بات کی حمایت میں اس سے متعلقہ آنحضرت ﷺ کے اقوال نقل کرنے شروع کئے۔ اس سے علم کی نئی شاخ "حدیث" کا آغاز ہوا اور مسلم تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ تدریسی حدیث نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے۔ (عبدالرؤف ظفر، پروفیسر ڈاکٹر 2007ء ص 736)

مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ حدیث کے علم کو بھی ضروری سمجھا۔ اساتذہ اور طالب علم زیادہ احادیث یاد رکھنے پر فخر کیا کرتے تھے۔ اس نظری تعلیم کے علاوہ عملی تعلیم بھی تھی۔ روزانہ کی نماز، جمعہ کی نماز کا اجتماع، عیدین اور حج پر بین الاقوامی اجتماع۔ ابتدائی دور میں ان سب کو اسلامی نصاب سمجھا جاسکتا ہے۔ ان سب کے ذریعے افراد روح اسلام سے آگاہ ہوتے تھے۔ رمضان کا ایک مہینہ بھی اسلام کے نظری اصولوں کو عملی شکل دینے میں اہم ثابت ہوتا تھا۔ تاریخ کے اس دور میں ہر مسلمان سے جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل ہو، ملک کے دفاع کیلئے جہاد کی توقع رکھی جاتی تھی۔ اس لئے جنگی علوم بھی تربیت میں حصہ لیتے تھے۔ اس طرح کے نصاب کے کیا اثرات رہے اور کس حد تک کامیاب رہا۔ اس کا اندازہ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرامؓ کی زندگی سے لگایا جاسکتا ہے۔ مسلم معاشرے میں جب بچہ حروف تہجی سیکھ جاتا تو سب سے پہلے مکتب میں قرآن پڑھتا۔ پھر قرآن حفظ کرنے کے بعد اسے اسلام کے بنیادی اصول، عربی زبان اور جسمانی سائنس کے علوم سکھائے جاتے۔ (شاہد، ایس ایم 2003ء ص 223)

محمد خلیل اللہ کے مطابق اسلامی تعلیم کے حصول کیلئے ایک ایسا نصاب وضع کیا گیا جس میں مروجہ دینوی علوم بھی شامل تھے۔ تعلیم کی ابتدا قرآن حکیم سے ہوتی تھی۔ اس کے بعد حدیث وفقہ میں طالب علم کو اتنی واقفیت بہم پہنچا دی جاتی تھی کہ وہ زندگی کے عام معاملات میں شریعت کے تقاضوں کو بخوبی سمجھ لیتا تھا۔ علم وعمل کا میدان جوں جوں وسیع ہوتا گیا نصاب تعلیم میں وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس کے ساتھ اختصاص کا دور شروع ہوا۔ مگر یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کسی شعبۂ علم میں اختصاص حاصل کرنے کے یہ معنی نہ ہوتے تھے کہ دیگر علوم کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ کسی علم میں اختصاص حاصل کرنے والے علماء وہ ہوتے تھے جو سارے مروجہ علوم کی بنیادی باتوں سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ خاص طور پر دین اور شریعت کے تقاضوں کا انہیں خاصا علم رہتا تھا۔ اس بنیاد کا نتیجہ یہ تھا کہ جب مسلم علماء نے غیر مسلم قوموں کی طرف توجہ دی تو اس بات کا خاص اہتمام رکھا کہ ان علوم کو ایسے اثرات اور تصورات سے پاک کردیں جو دین کی بنیادی

شرائط سے مطابقت نہ رکھتے ہوں۔(محمد خلیل اللہ 1983ء،ص 13)

اختصاص کا سلسلہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے علم فرائض میں زید بن ثابتؓ کو قرآن و تجوید میں ابی بن کعبؓ کو اور حرام اور حلال کے علم میں معاذ بن جبلؓ کو مرتبۂ اوّل پر شمار کیا۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: عن عبداللّٰہ ابن مسعود قال رسول اللّٰہ خذوا القرآن من اربعةٍ من عبداللّٰہ ابن مسعود و سالم و معاذٍ و ابی بن کعب — ترجمہ: چار آدمیوں سے قرآن سیکھو: عبداللہ بن مسعود، سالم مولیٰ حذیفہؓ، ابی بن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ۔(البخاری، الجامع الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب الرسول، ص 896، ح 4999)

یہ دینی تعلیم کی صورت حال تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیوی علوم و فنون میں بھی مسلمانوں میں نہایت تیزی سے ترقی ہوئی اور ہیت، نجوم، جغرافیہ، طب، جراحت، فلسفہ، سائنس، ریاضی، الجبرا، کتابت، نقاشی، تزئین، تعمیر، جنگی فنون، جہاز رانی، آہن گری، سپہ گری وغیرہ میں صدی در صدی کے اندر مسلمانوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے کہ ان کی علمی قوت نے یورپ کو مرعوب کر کے اپنے دائرہ اثر میں لے لیا (عبدالحئی الکتانی 2001ء، ص 536، 556، 572، 580)۔ حضور ﷺ کی شروع کی ہوئی تعلیمی مہم نے مسلمانوں میں ایسا فکری و تہذیبی استحکام پیدا کر دیا کہ انہوں نے یونان، ایران اور ہندوستان کے باطل و فاسد علوم سیکھے مگر وہ ان سے مرعوب نہیں ہوئے۔ بلکہ انہوں نے تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر ہر چیز کو اپنے علم کی کسوٹی پر پرکھا پھر جو کچھ اس کے مطابق پایا اسے قبول کیا اور جو کچھ اس کے خلاف پایا اسے یا تو تشکیل نو کے عمل سے گزار لیا مسترد کر دیا۔(نعیم صدیقی 1999ء، ص 33)

ابوداؤدؒ نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: العلم ثلاثة و ما سوی ذلك فهو فضلٌ: آية محكمةٌ او سنةٌ قائمةٌ او فريضةٌ عادلةٌ — ترجمہ: اصل علم تین چیزوں کا علم ہے۔ آیت محکمہ، سنت قائمہ اور فریضہ عادلہ اس کے علاوہ جو کچھ ہو وہ زائد ہے۔(ابوداؤد، السنن، کتاب الفرائض، باب ما جاء فی تعليم الفرائض، ص 420، ح 2885)۔ اس حدیث پاک میں آیت محکمہ سے مراد آیات قرآنی ہیں۔ سنت قائمہ کے مفہوم میں آنحضرت ﷺ کی احادیث آتی ہیں اور فریضہ عادلہ سے مراد فقہ یا فرائض دینیہ ہیں۔ ان کی حیثیت نصاب کی لازمی اجزاء کی ہے۔ اس کے علاوہ فضل سے ضروری علوم دنیویہ مراد ہیں۔ چنانچہ خود حضور ﷺ نے ریاضی، مبادی طب، علم ہیت یا علم فلکیات، علم انساب، علم تجوید اور فن خطاطی جیسے علوم مفیدہ کو سیکھنے کی یا تو اجازت دی یا ان کی تحصیل کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ علاوہ ازیں جسمانی صحت کو بحال رکھنے کیلئے نشانہ بازی، شہسواری، پیراکی اور کشتی کا فن سیکھنے کی اجازت دی اگرچہ ان جملہ مضامین کی بیک وقت تقسیم کا کسی درس گاہ میں بھی انتظام نہ تھا۔(محمد غزالی 2001ء الف، ص 23)

آنحضور ﷺ کے منصب رسالت کے اہم پہلو بروئے قرآن (الجمعہ: 2) چار تھے: تلاوت آیات، تزکیہ، تعلیم کتاب تعلیم حکمت۔ اس حوالے سے حفظ قرآن (بطور کفایہ)، تجوید قرآن، تعلیم قرآن و حدیث بشمول تفسیر قرآن و شرح حدیث

اور عملی تربیت کردار کو نصاب کے بنیادی عناصر کی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے (محمد ادریس کاندھلوی 1979ء ص 215)۔ مناظر احسن گیلانی کی صراحت کے مطابق نصابی اصطلاح کی رو سے اعلیٰ اسلامی تعلیم میں قرآن (تفسیر)، حدیث، فقہ، عقائد اور صحبت و بیعت کی حیثیت لازمی مضامین کی رہی ہے۔ (مناظر احسن گیلانی، مولانا سیّد (س ن) ص 111)

المختصر قبل اس کے کہ ہم نصاب تعلیم پر غور کریں، ہمیں یہ سوچنا اور غور کرنا ہے کہ سرور عالم ﷺ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی غرض و غایت کیا ہے۔ تاکہ اس غرض کو پیش نظر رکھ کر نصاب تعلیم بنایا جائے۔ ارشادات ربانی ہیں: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۔ ترجمہ: وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور دانش مندی سکھلاتا ہے اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے (الجمعہ: 2)۔ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۔ ترجمہ: اے رسول ﷺ جو کچھ آپ کی طرف رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجئے (المائدۃ: 67)۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۔ ترجمہ: اے رسول ﷺ بلایئے لوگوں کو اللہ کی طرف حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ۔ (النحل: 125)

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ بعثتِ نبوی کے مقاصد یہ ہیں:

- تلاوتِ قرآن جس میں حفظ قرآن اور تجوید قرآن دونوں آ گئے۔
- تعلیم الکتاب والحکمۃ سے تعلیم قرآن و حدیث مراد ہے۔ تعلیم کے معنی تفہیم و تلقین یعنی مطلب اور معنی سمجھانے کے ہیں۔ اس میں فن تفسیر و حدیث آ گیا۔
- تیسرے تبلیغ دین اس میں شعبہ تبلیغ اور اہل باطل سے تقریری، تحریری، وعظ، تلقین، مناظرہ اور مجادلہ بھی آ گیا۔ (محمد ادریس کاندھلوی 1979ء ص 215)
- اسلامی نصاب تعلیم کی اساسیات کے تعین کے بعد تعلیمی عمل کا سرسری جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں عربی زبان اور قرآن مجید نصاب کا حصّہ تھے۔ خلفائے راشدین کے دور میں تفسیر و حدیث، علم الانساب، اسماء الرجال، قواعد زبان، عربی محاورات اور جغرافیہ شامل نصاب تھے۔ عباسی دور تک پہنچتے پہنچتے نصاب تعلیم میں قرآن، قرآت و تفسیر، حدیث، فقہ، خطاطی، ریاضی، جغرافیہ، تاریخ، علوم نجوم، نظم، گرامر، کیمیاء، فن تعمیر، سنگ تراشی، عسکری فنون، صنعتی فنون اور فن خطابت شامل ہو گئے۔ برصغیر پاک و ہند کے اسلامی مدارس میں تفسیر، حدیث، تصوف، کلام، منطق، فلسفہ، علم نحو، ادب، اصول فقہ، ہیئت، ریاضی، طب، اخلاقیات، زراعت اور دوسرے فنی علوم نصاب کا حصّہ تھے۔ مضامین کی اس فہرست سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مدارس میں دینی اور دنیاوی، عقلی اور اخلاقی سبھی قسم کے مضامین باقاعدہ پڑھائے جاتے رہے اور یہ بات اسلامی تصورِ

نصاب کے عین مطابق تھی۔(سعید اختر، پروفیسر 1988ء ص 92)

- آغاز اسلام میں نصاب تعلیم میں زیادہ وسعت نہ تھی۔قرآن وحدیث،فقہ،ہیئت،علم الانساب،خوشنویسی وغیرہ شامل نصاب تھے۔اسلامی فتوحات کے ساتھ ہی جب علماء مرکز سے نکل کر مختلف شہروں میں منتقل ہوئے اورانہوں نے اپنے الگ تعلیمی مراکز قائم کیے تو نصاب،عالم کی شخصیت اوراختصاص سے منسلک ہوگیا۔تشنگان علم جس عالم کے پاس کسب فیض کے لئے جاتے وہ اپنا مخصوص مضمون یا فن انہیں پڑھا دیتا۔اس طرح طالبان علم تعلیمی سفر کے وسیلے سے مختلف علماء سے مختلف مضامین کی تحصیل کرتے اورنصاب تعلیم کو مکمل کرتے رہتے تھے۔(سعید احمد رفیق، پروفیسر 1982ء ص 31)
- یہ حالت زیادہ عرصہ قائم نہ رہی۔حدود سلطنت وسیع ہوئیں۔مسجدوں کی جگہ مکاتب نے لے لی۔سرکاری اور نجی تعلیمی ادارے کھل گئے۔علوم کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔بڑے بڑے کتب خانے قائم ہوئے۔اب مدارس کو تدوین نصاب کا مسئلہ درپیش تھا۔مختلف ادارے اپنی فضیلت اور تشخص کو برقرار رکھنے کیلئے اعلیٰ تر اور کامل واکمل نصاب بنانے اوراسے پڑھانے کا اہتمام کرنے لگے۔اس طرح اسلامی نصاب تعلیم کے مختلف ماڈلز وجود میں آئے۔ہر ماڈل اپنے دور کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا دعویٰ رکھتا تھا۔تاہم نصاب تعلیم میں اجتہادی کوششوں کے نتیجے میں تعلیم پرکھل کے تنقید بھی کرتے رہے اورموزوں تبدیلی اورتجدید کیلئے تجاویز بھی پیش کرتے رہے۔(احمد شلبی،ڈاکٹر 2004ء ص 42-46)

اسلام میں پہلا نصاب تعلیم

اسلامی تعلیمات نے چند دن میں ہی لوگوں کی کایا پلٹ دی اورلوگوں میں علم وفن کا اتنا خیال پیدا کردیا کہ خود آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی بہت سے مضامین کی تعلیم شروع ہوگئی تھی۔مثلاً

- پڑھنا لکھنا — قرآن مجید کی تعلیم — حفظ قرآن — حدیث
- اصول وقوانین جو قرآن مجید میں دیے ہوئے ہیں۔
- علم الفرائض،یعنی میراث کی تقسیم کے اصول اوران سے متعلق ریاضی۔

ان کے علاوہ رسول کریم ﷺ لوگوں کو ہدایت فرماتے کہ علم ہیئت،مبادیات،طب اورانساب (شجرہ نسب کی جمع) سیکھیں۔آپ ﷺ بچوں کو تیرنا اور تیراندازی سیکھنے کی بھی تاکید فرماتے تھے۔آپ ﷺ دوسری زبانیں بھی سیکھنے پر زور دیتے تھے۔حضرت زید بن حارث کاتب وحی،عربی،فارسی،حبشی،عبرانی،یونانی جانتے تھے۔ان میں سے کچھ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی ہدایت پر سیکھی تھیں(محمد صادق ودیگر 2001ء ص 106)۔اسلامی نصاب تعلیم میں عورتوں کی تعلیم کا باقاعدہ اہتمام تھا۔آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کی تعلیمات جہاں مردوں کے لئے ضروری تھیں وہیں عورتوں کے لئے بھی لازمی تھیں۔قرآن پاک نے مردوزن دونوں کو یکساں طور پر مخاطب کیا اوردونوں کے لئے علم کا حصول

ضروری قرار دیا۔ آنحضورﷺ نے قرآن پاک کی عمومی تعلیم کے علاوہ ان سورتوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جس میں خواتین کے احکامات ہیں مثلاً سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کے بارے میں فرمایا: فتعلموھن و علموھن نسائکم یعنی خود بھی سیکھو اور اپنی عورتوں کو بھی سکھاؤ۔ (الدارمی، السنن، فضائل القرآن، باب فضل اول سورۃ البقرۃ و آیت الکرسی، ص 323-324، ح 3393)

حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے: قالت النّساء للنّبیﷺ غلبنا علیک الرجال فاجعل لنا یومًا من نفسک فوعدھنّ یومًا لقیھنّ فیہ فوعظھنّ و امرھنّ — ترجمہ: ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ عورتوں نے آنحضورﷺ سے کہا کہ مردوں نے آپﷺ سے ہماری نسبت زیادہ حصہ لیا ہے، آپﷺ ہمارے لئے ایک مخصوص دن رکھیں۔ آپﷺ نے ایک دن کا وعدہ فرمایا اس میں آپﷺ ان سے ملے، انہیں نصیحت کی اور حکم دیا (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء یوم علی حدۃ فی العلم، ص 23، ح 101/ البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب تعلیم النبیﷺ امّتہ من الرّجال والنساء ممّا علمہ اللّٰہ لیس برأی ولا تمثیل، ص 1258، ح 7319)۔

علاوہ ازیں آپﷺ کی ازواج مطہرات عورتوں کی تعلیم کا اہم ذریعہ بن گئیں۔ خاص طور پر حضرت عائشہؓ نے عورتوں کی تعلیم کا اہتمام فرمایا۔ آپﷺ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: خذو نصف دینکم عن الحمیرا، وفی روایۃ "ثلثی دینکم" — ترجمہ: نصف دین تم حمیرا (حضرت عائشہؓ) سے سیکھو (عبدالحیٔ بن العماد 1988ء ص 62)۔ لہٰذا نہ صرف عورتیں آپ سے تعلیم پاتی تھیں بلکہ صحابہ کرامؓ بھی آپؓ سے علمی فیض پاتے تھے چنانچہ مسروق کہتے ہیں: و اللّٰہ لقد رأیت اصحاب محمدﷺ الاکابر یسألونھا عن الفرائض — ترجمہ: خدا کی قسم میں نے بہت پڑھے لکھے صحابہ کرامؓ کو (حضرت عائشہؓ سے) علم الفرائض کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے دیکھا (شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان 1993ء ص 181-182)۔ عورتوں کو نماز جمعہ میں شریک کیا جاتا تھا تا کہ وہ مسائل سیکھ سکیں۔ آنحضورﷺ کے ان ہی احکامات و ترغیبات کی بناء پر علماء اسلام نے عورت کی تعلیم کو باقاعدہ قانونی حیثیت دے دی۔

— عہد نبویؐ میں عام تعلیم کے نصاب کا خاکہ کچھ یوں تھا:

دینی علوم:	قرآن، حدیث، فقہ، تجوید
عقلی و دنیوی علوم:	ہیئت، انساب، ریاضی، طب
لغت و ادب:	عربی زبان و ادب، غیر ملکی زبانیں بالخصوص عبرانی
فنون:	خطاطی، اسلحہ سازی
ہم نصابی مشاغل:	گھڑ سواری، گھڑ دوڑ، تیر اکی، نشانہ بازی

شعائر اسلام کی پابندی ان کے علاوہ تھی جس کی لازمی حیثیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ (منور ابن صادق 1978ء ص 10-11)

- خلفائے راشدین کے دور حکومت میں مندرجہ بالا مضامین کے ساتھ، عربی ادب، بالخصوص عربی شاعری پر بھی لیکچر شروع ہو گئے تھے۔ دینی تعلیم اور امور شریعہ کی اشاعت و تبلیغ خلفائے راشدین کا فرض منصبی تھا جس سے وہ قطعی غافل نہ تھے۔(محمد مصلح الدین، ڈاکٹر 1988ء ص 23)
- بنی امیہ کے دور میں عربی قواعد مرتب ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مذہبی امور پر (بالخصوص ان جنگوں پر جن میں رسول کریم ﷺ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی تھی جنھیں مغازی کہتے ہیں) کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ طب کی تعلیم کے لئے باقاعدہ سکول کھل چکے تھے۔ اس لئے اب مغازی اور طب بھی باقاعدہ طور پر نصاب میں شامل کر لئے گئے تھے۔ اس دور میں اسلامی نظامِ تعلیم کا منہاج (نصاب) کچھ اس قسم کا تھا:
  - عربی قواعد
  - عربی لکھنا، پڑھنا، بیان، ادب، قرآن وحدیث، علم الفرائض، ریاضی، مغازی اور طب۔
    (محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ج ص 10)
- دورِ بنو عباس میں مصر کے فاطمی، اسپین کے بنو امیہ، افریقہ کے بنو اغلب جن کی حکومت میں سسلی اور جنوبی اٹلی شامل تھے، وسطی ایشیاء کے غزنوی اور غوری خاندانوں نے علم و ادب کی سرپرستی دل کھول کر کی۔ اس دور میں بہت سے نئے مضامین مرتب ہوئے۔ علم ہیئت کی ترقی کیلئے رصدگاہیں تعمیر کی گئیں۔ ستاروں کے مشاہدے کیلئے دوربین ایجاد ہوئی۔ وقت کے اندازے کیلئے گھڑی ایجاد کی گئی۔ تاریخ وجغرافیہ پر کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ریاضی کی مختلف شاخیں الجبراء، علم مثلث وغیرہ وجود میں آئیں۔ مصریوں کے ایجاد کئے ہوئے علم ہندسہ کا ترجمہ عربی میں ہوا۔(محمد افضل طیار 2001ء ص 128)
- میسوپوٹامیہ والوں کا فلسفہ اور منطق (جسے غلطی سے یونانی فلسفہ اور منطق کہتے ہیں) عربی میں ترجمے ہوئے۔ اس زمانے میں تمام ممالک اسلامیہ میں بڑے بڑے تعلیمی ادارے جن میں موجودہ یونیورسٹیوں کی طرز پر (جو کہ انہی اسلامی اداروں کے طرز پر قائم کی گئی ہیں) بہت سے مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ جہاں منتخب روزگار اساتذہ درس دیتے تھے۔ اس زمانے میں ان اداروں کے نصاب تعلیم میں بے پناہ توسیع ہوئی۔ جس کا اندازہ مندرجہ ذیل منہاج سے لگایا جا سکتا ہے۔

1-	عربی صرف ونحو	2-	علم لغت	3-	بیان
4-	ادب	5-	حدیث	6-	تفسیر
7-	فقہ	8-	ریاضی	9-	الجبر والمقابلہ
10-	ہندسہ (اقلیدس)	11-	مساحت	12-	علم الفرائض
13-	طبیعیات	14-	کیمیاء	15-	علم ہیئت

16-	نجوم	17-	فلسفہ	18-	منطق
19-	تاریخ	20-	جغرافیہ	21-	علم طب وجراحت وغیرہ

مندرجہ بالا تمام مضامین بے حد مقبول تھے اور اکثر اداروں میں پڑھائے جاتے تھے۔لیکن ان میں سے ہر مضمون ہر طالب علم کے لئے لازمی نہیں تھا۔مسلمان طلبا اوّل الذکر چار مضامین کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے پسندیدہ مضامین کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔جن میں حدیث،تفسیر،فقہ،ریاضی اور ہیئت وغیرہ شامل ہوتے تھے۔عیسائی اور یہودی طلبہ پہلے چار مضامین کی تعلیم کے بعد طب یا دوسرے سائنسی مضامین کی تحصیل میں لگ جاتے تھے۔حدیث تفسیر اور فقہ سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔فلسفہ اور منطق کی تعلیم کسی درس گاہ میں نہیں دی جاتی تھی کیونکہ مسلمان انہیں مذہب کے منافی سمجھتے تھے لیکن لوگ انہیں نجی طور پر سیکھتے تھے،ان کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔(نذیر احمد،خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی،ڈاکٹر 1987ء ص 28)

4.6 مسلمان اساتذہ کا انتخاب و تربیت

تدریس نظامِ تعلیم کا وہ اہم عنصر ہے جس کے ذریعے نصاب طلبہ کو منتقل کیا جاتا ہے۔اس میں معلّم کی شخصیت اس کی علمی فضیلت اور اس کی فنی مہارت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ:معلّم مجسم تعلیم ہوتا ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ جن کی بدولت ہمیں یہ دین ملا ہے اور جن کی نسبت سے ہم مسلمان کہلاتے ہیں۔ان کی اولین خصوصیت ہی یہ تھی کہ وہ معلّم بنا کر بھیجے گئے تھے۔وہ معلّم کیسے تھے؟ وہ صرف زبان ہی سے تعلیم نہیں دیتے تھے۔ان کی رفتار وگفتار،نشست وبرخاست،حرکات وسکنات،غرض انکی زندگی کا ہر فعل تعلیم تھا۔اسطرح ایک مسلمان معلّم حقیقت میں مجسم تعلیم ہوتا ہے۔(ابو الاعلیٰ مودودی،سیّد 1999ء،ص 9)

سعید اختر کے مطابق اسلامی نقطۂ نظر سے معلّم کے انتخاب کا پیمانہ درج ذیل ہے۔

محبت وشفقت

معلّم اپنے شاگردوں کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آئے۔رحمتہ اللعالمین ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو تاکید فرمائی تھی۔عن ابی سعید الخدری قال رسول اللہ ﷺ ان النّاس لکم تبع وان رجالا یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستو صوا بھم خیرًا ۔ترجمہ:لوگ تمہارے پاس زمین کے دور دراز کونوں سے دین کا علم حاصل کرنے کیلئے آئیں گے۔پس جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان سے اچھا سلوک کرنا۔(الترمذی،الجامع،ابواب العلم،باب ماجاء فی الاستیصاء بمن طلب العلم،ص 601،ح 2650)

تعلیم کا حکیمانہ انداز

اپنے شاگردوں سے محبت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ معلّمین اپنے شاگردوں کو حکمت آمیز پیرائے میں تعلیم دیں تا کہ طلبہ میں تعلیم کا شوق باقی رہے۔جیسا کہ حدیث قدسی سے واضح ہے: عن ابی وائل قال: کان عبداللّٰہ یذکرالنّاس فی کل خمیسٍ ، فقال له رجلٌ : یا ابا عبدالرحمن ، لوددت انّك ذکرتنا کل یوم، قال: أما انّه یمنعني من ذٰلك اني اکره ان املّکم، واني اتخوّلکم بالموعظة کما کان النبيّ یتخوّلنابها مخافة السّآمة علینا — ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے۔کسی نے عرض کیا کہ حضرت روزانہ وعظ کیا کریں۔فرمایا میں تم کو تھکانا نہیں چاہتا اور میں تمہارا ایسا ہی خیال رکھتا ہوں جیسا رسول اللہ ﷺ ہمارا خیال فرماتے تھے۔(البخاری،الجامع الصحیح،کتاب العلم،باب من جعل لاھل العلم ایّاما معلومة ،ص 17،ح 70)

طلبہ کی ذہنی استعداد کا لحاظ

معلّم شاگردوں کی ذہنی استعداد کا پورا پورا لحاظ رکھے۔سیّد الکونین ﷺ کا ارشاد عالی ہے:انزلوا الناس منازلھم – ترجمہ:لوگوں سے ان کی حیثیت و مرتبے کے مطابق سلوک کرو(ابوداؤد،السنن،کتاب الادب،باب فی تنزیل الناس منازلھم ،ص 684، ح 4842)۔اس ضمن میں امام غزالی کا یہ نکتہ یادرکھنے کے قابل ہے کہ جب شاگرد کا حال معلوم ہو جائے کہ کوتاہ بین اور کم عقل ہے تو اسے استاد یہ کبھی نہ کہے کہ اس کے علاوہ کوئی دقیق و گہری بات بھی ہے جو ہم نے تمہیں نہیں بتائی۔کیونکہ ہر شخص کو اپنی عقل و فراست پر غیر معمولی اعتماد ہوتا ہے نیز معلّم کبھی اپنے شاگردوں کو زیادہ سخت سست نہ کہے کہ جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہو جائے۔(حبیب حسین،مولانا(س ن)ص 111)

تقرب خداوندی کی طلب

مناسب ہے کہ ہر استاد طالب علم کو آخرت کے علوم سکھانے والا ہو یا دنیا کے علوم آخرت کی فلاح کے نقطۂ نظر سے پڑھانے والا ہو۔اسے لازم ہے کہ طالب علم کے دل میں دنیا سے بے رغبتی پیدا کردے اور اسے آخرت کی کامیابی کے لئے فکر مند بنادے گویا تعلیم کا ہدف یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایسا انسان تیار کرے جو اسلام کے مطابق عبادت گزار ہو،اس کے رکوع و سجود ہی نہیں بلکہ موت و حیات کا مقصد بھی محض اللہ کی رضا جوئی قرار پائے (محمد قطب 1999ء ص 20)۔پھر علوم سکھاتے وقت معلّم کو اپنے مشاہرے یا معاوضے پر نظر نہ رکھنی چاہیے بلکہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہنا چاہیے۔

اخلاقی تربیت

معلّم طالب علم کے اخلاق و کردار کو سنوارنے اور اس مقصد کیلئے شاگرد کو نصیحت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ہر استاد اپنے شاگرد کی بری عادتوں اور اخلاقی کمزوریوں پر کڑی نظر رکھے اور مہر و محبت سے ان کو رفع کرنے کی کوشش کرے۔جیسے ہر معالج اپنے مریض کو بیماریوں سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔استاد اس سلسلہ میں محمد مصطفیٰ ﷺ کے

اسوۂ حسنہ اور طریق اصلاح تربیت پر نظر رکھے جنہیں تاریخ عالم میں نفوس انسانی کی اصلاح کے سلسلے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

رواداری اور اعلیٰ ظرفی

استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ طالب علم کے دل میں اپنے مضمون کا صحیح ذوق پیدا کرے۔نیز اس کے سامنے دیگر علوم وفنون کی بے وقعتی ظاہر نہ کرے مثلاً زبان وادب کا معلم کبھی علم فقہ کی برائی نہ کرے یا انگریزی وحساب کا استاد دینیات کے مضمون کو ہیچ نہ ٹھہرائے۔کوئی استاد کسی شاگرد کی زبانی دوسرے استاد کی برائی نہ سنے بلکہ اپنے شاگرد کو ٹوک دے اور خود بھی اپنے شاگردوں کے سامنے دوسرے استادوں کی تحقیر وتذلیل نہ کرے یعنی مسلم تعلیمی تاریخ میں استاد کے انتخاب میں ہمیشہ یہ بات شامل رہی ہے کہ وہ محض علم وفضل میں ہی نہیں بلکہ تقویٰ وکردار میں بھی اعلیٰ مقام کا حامل ہو۔مسلم معاشرہ نے عالم بے عمل کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔کردار کی اہمیت بنیادی رہی۔اس کے انتخاب میں اعلیٰ کردار،تقویٰ وخدا ترسی اور قول وفعل کی ہم آہنگی کو نمایاں مقام حاصل ہے(مسلم سجاد1992ءص 107)۔درحقیقت ایسے افراد بیک وقت مسلم،مربی اور داعی ہوتے ہیں۔حدیث نبوی ﷺ میں ہے:ان اللّٰہ وملائکتہ واھل السموت والارضین حتی النملۃ فی جحرھا وحتی الحوت لیصلون علیٰ معلّم الناس الخیر – ترجمہ:اللہ،اس کے فرشتے،آسمانوں اور زمین میں بسنے والی مخلوق حتیٰ کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں سمندروں میں لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینے والوں پر سلام بھیجتی ہیں۔(الترمذی،الجامع،کتاب العلم،باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ،ص609،ح2685)

گویا اسلامی نظامِ تعلیم میں استاد کا کردار پیشہ ورانہ نہیں بے غرضانہ تھا۔وہی اس نظام کا محور تھا۔مطلق آزادی نے اسے مکمل طور پر ذمہ دار بھی بنا دیا تھا۔خارجی دباؤ کی عدم موجودگی میں اپنے تئیں ضمیر،تاریخ اور خدا کے روبرو جوابدہ تصور کرتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے فرائض دل وجان سے ادا کرتا تھا۔اس کا تعلق شاگرد کی مکمل شخصیت کی نشوونما سے تھا۔لہٰذا وہ نہ صرف شاگرد کی ذہنی وعقلی صلاحیتوں کی نشوونما سے دلچسپی لیتا تھا بلکہ اس کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں،اخلاقیات،عقائد اور معاشی مفادات بھی استاد کے لئے بہت اہم تھے۔استاد محض پیشہ ور استاد نہیں تھا۔بلکہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کا مثالی نمونہ بھی تھا(علم الدین،سالک مولانا2001ء،ص 87-91)۔شاگرد اس کے طرز عمل سے زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ استاد عام طور پر متانت ووقار کا پیکر،اخلاقی شخصیت کی مثال،ایمانداری،راست بازی کا نمونہ اور پاکیزہ عقائد مجسم کی تصویر ہوا کرتا تھا۔ان حالات میں استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کی نوعیت محض مادی اور عارضی نہیں رہی تھی۔بلکہ یہ ایک قسم کا روحانی ناطہ بن گیا تھا۔شاگرد اطاعت کا پیکر بن جاتا تھا اور استاد ایثار کی اعلیٰ مثال،اسطرح وہ دونوں ایک ایسے رشتے میں جکڑ جاتے جو لازوال انسانی رشتہ تھا۔اس رشتے سے دونوں کو فائدہ بھی پہنچتا تھا۔شاگرد بہتر انداز میں زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سیکھتا تھا اور استاد پڑھانے کے عمل کے ذریعے اپنی ذات کی تکمیل کے مراحل طے کرتا تھا۔(جاوید قاضی1983ء،ص100)

مناظر احسن گیلانی تمثیلی انداز میں استاد کی تعلیمی آزادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہرن کو اپنی چال سے اور اونٹ کو اپنی چال سے چلنے کی آزادی تھی۔ جہاں تک تربیت کا تعلق ہے تو بعض لوگ اسلامی تربیت کا محض یہ مفہوم لیتے ہیں کہ عبادات کی حد تک دینداری اختیار کی جائے اور نماز روزہ کی پابندی کر لی جائے۔ حالانکہ اسلام کا تصورِ تربیت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ یہ ایک جامع ترین تصور کا نام ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور گوشوں پر محیط ہے۔ نیز انسانی زندگی میں جو کچھ پیش آ سکتا ہے۔ اس کے بارے میں ایک معین و مخصوص رویہ رکھتا ہے۔ خدا کا تصور، کائنات، خدا اور کائنات سے انسان کا تعلق اور ایسے ہی موضوعات کے بارے میں اسلام اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ (مناظر احسن گیلانی (س ن)، ص 13)

لہٰذا جب ہم اسلامی تربیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد وعظ و تقریر نہیں بلکہ اسلامی تربیت کا پہلا وسیلہ معلّم کا کردار ہے۔ نصیحت کا عمل کردار کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یعنی طلبہ کو جن امور کی تربیت دینا مطلوب ہے، معلّم ان کا عملی نمونہ پیش کرے۔ بالفاظِ دیگر اگر ہم اپنی نسلوں کو صحیح مسلمان بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں سب سے پہلے مسلمان معلّم بنانا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پرائمری اسکول سے یونیورسٹی کی سطح تک تمام تعلیمی اداروں میں اسلامی سپرٹ جاری و ساری ہو اور سارے ماحول پر اسی کا غلبہ و تسلّط ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اساتذہ کرام اسلام کو اپنی زندگیوں پر نافذ کریں۔ پھر طالب علموں اور نوجوانوں کے دل خود بخود ان تعلیمات و اعمال کی طرف کھنچنے لگیں گے۔ (محمد قطب 1999ء؛ ص 20)

ہر مسلمان معلّم داعی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اسلام کی دعوت کمرۂ جماعت کے اندر پیش کرتا رہے، نصیحت سے نہیں عملی کردار سے۔ معلّم کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمل و کردار سے دائرے کا مرکز بن جائے اور طالب علم اسکے گرد گھومتے اور متاثر ہوتے رہیں۔ وہ اپنے عمل سے جس چیز کو پیش کرے، طلبہ اس کو اختیار کر لیں۔ سچی بات یہ ہے کہ جب طالب علم معلّم کو شعائرِ اسلام کی پابندی کرتے دیکھیں گے، اسے اسلامی اخلاق کا نمونہ پائیں گے تو خود بخود جان لیں گے کہ اسلام کیا ہے اور اس کی خوبیاں کیا ہیں؟ جبکہ اگر استاد اس بات کا خیال نہ کرے کہ طلبہ کی حالت کیا ہے تو علم سیکھ کر بھی ایسے طلبہ و طالبات، استاد اور معاشرے کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ (عبدالرؤف ظفر، ڈاکٹر 2007ء، ص 144)

مختصراً یہ کہ تعلیم کی اسلامی روایت میں استاد کو نہایت موثر اور مثبت مقام حاصل ہے۔ اس پیشہ کی تقدیس کا احساس اس سے ہوتا ہے کہ دراصل یہ خود انبیاءؑ کا کام ہے۔ اس لئے استاد کے انتخاب و تربیت میں رہنمائی حاصل کرنے کیلئے اسوۂ حسنہ کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ یہ مطالعہ نہایت تفصیل سے ہر بات بیان کرتا ہے۔ (افضل حسین (س ن)، ص 1)

4.7 اسلامی حکمتِ تدریس

قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مرتبہ حضور ﷺ کو مُعلّم کتاب وحکمت اور مُزکّی قرار دیا گیا ہے ملاحظہ ہوں (آیات الجمعہ:2 ، ھود:2 ، آل عمران:164) حضور ﷺ خود اپنے آپ کو معلّم قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: انـمـا بـعثـت مـعلّماً (ابن ماجہ، السنن، کتاب السنۃ، باب فـضـل العلما ص 35 ح 229)۔ آیئے ذرا ایک نظر اُس تعلیمی حکمت پر بھی ڈالتے چلیں۔ جس سے حضور ﷺ نے بہ حیثیت مُعلّم کام لیا اور بعد کے مُعلّمین کے لئے واضح نشاناتِ راہ چھوڑ گئے۔ حضور ﷺ کی حکمتِ تعلیم کو یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

واضح اندازِ بیان

قرآن مجید میں حضور ﷺ کی مُعلّمانہ ذمہ داری کو بلاغ مبین تک مُحدود کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو آیت: اِنْ عَـلَـيْكَ اِلَّا الْبَلَاغ (الشوریٰ: 48)۔ یعنی وضاحت سے بات پہنچا دینا اور تفہیم کا حق ادا کر دینا ہر سچے مُعلّم کی مُعلّمانہ ذمہ داری ہے۔

جبر وتشدد سے پرہیز

حضور ﷺ پر واضح کیا گیا کہ آپ ﷺ مخاطب لوگوں کیلئے چوہدار یا جبار نہیں بنائے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں آیات: وَمَـا اَنْـتَ عَـلَيْهِـمْ بِجَبَّارٍ ۔ ترجمہ: اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں (ق:45)، لَسْـتَ عَـلَيْهِـمْ بِـمُـصَيْـطِـرٍ ۔ ترجمہ: آپ ﷺ ان پر داروغہ نہیں ہیں (الغاشیہ:22)۔ یعنی معلّمانہ کام کی رُوح محبت وخیر خواہی ہے۔ اِس فریضہ کو انجام دینے میں جبر وتشدد روا نہیں۔

معلّم کی شخصیت اور اندازِ تعلیم

حضور ﷺ کو جو حکمتِ تعلیم سکھائی گئی۔ اِس کا تقاضا یہ ہے کہ مُعلّم نرم خو ہو۔ تُند خو نہ ہو۔ ملاحظہ ہو آیات: فَبِـمَـا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔ ترجمہ: اللہ کی رحمت کے باعث آپ اُن پر نرم دل ہیں۔ اگر آپ بدزبان اور سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ ﷺ کے پاس سے چھٹ جاتے (آل عمران:159) نیز ملاحظہ ہو آیت: وَاخْـفِـضْ جَـنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (الحجر:88)۔ بصورت دیگر یا تو زیرِ تعلیم جماعت تتر بتر ہو جائے گی یا آج کل کے نظام میں اگر اسے کمرۂ جماعت میں بیٹھنے کا پابند کیا گیا تو کم از کم طلبہ کے دل ودماغ ضرور کمرۂ جماعت سے فرار ہو جائیں گے۔ حضور ﷺ نے خود اپنے رُفقائے کار کو ہدایات دیں کہ: یسّـروا ولا تـعـسّـروا، بشّـرو لا تـنـفـروا ۔ ترجمہ: لوگوں کیلئے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات نہ پیدا کرو، ان کو بشارت دینے والے بنو نفرت دلانے والے نہ بنو۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ماكان النّبى يتخوّلهم بالموعظة والعلم كي لا ينفروا، ص 17، ح 68)

تعلیمی نصب العین

حضورﷺ کے سامنے اپنا تعلیمی نصب العین پوری طرح واضح تھا یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند ایک ایسی مرکزی جماعت کا تیار کرنا جو ساری انسانیت کے سامنے خدا پرستانہ نظام حیات کی صداقت کی گواہی دے سکے۔دُوسرا مقصد یہ تھا کہ اس نظام حیات کو چلانے کیلئے ایمان و کردار سے آراستہ رہنما، افسر، کارکن اور شہری تیار کئے جائیں۔

بلا معاوضہ تعلیم حق

حضورﷺ کی حکمتِ تعلیم ہمیں مُعلّمانہ کام کا تبلیغی تصور دیتی ہے۔ہر نبی نے اپنی مخاطب قوم کو تعلیم حق دیتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ میں تم سے اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا میرا اجر تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔یہی اُصول حضورﷺ کا بھی تھا اور آپﷺ نے اپنے تیار کردہ مُعلّمین کو اس سے منع فرمایا کہ وہ شاگردوں اور طلبہ سے کوئی حق الخدمت وصول کریں۔ملاحظہ ہو آیت: اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُکُمْ اَجْرًا وَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ہ — ترجمہ: ایسے لوگوں کی راہ پر چلو جو تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتے اور وہ راہِ راست پر ہیں۔(یٰسین: 21)

اِس اصول سے یہ بات لازمی نتیجے کے طور پر اخذ ہوتی ہے کہ معلّم کا کام کسی بڑھئی یا ترکھان یا آہنگر کی طرح کا پیشہ وارانہ کام نہیں ہے کہ جس نے پیسے دیے اس کے حسبِ منشا کام کر دیا۔بلکہ یہ تبلیغی جذبے سے کرنے کا کام ہے اور اسے وہی انجام دے سکتا ہے جو اس چیز کا خود قائل ہو اور اس پر ایمان رکھتا ہو جس کی تعلیم دینے وہ چلا ہے۔اسلامی نظام تعلیم میں مخالفینِ اسلام یا منافقین کیلئے کام کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔چنانچہ حضورﷺ کا ایک ارشاد ہے کہ: خصلتان لاتجتمعان فی منافق حسن سمتٍ و لا فقه فی الدین — ترجمہ: منافق میں دو خصلتیں جمع نہیں ہوتیں، حسن خلق اور دین میں سمجھ۔(الترمذی، الجامع، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة، ص609، ح2684)

معلّمین کی کفالت ریاست کی ذمہ داری

تعلیم کے اس مشنری تصور کے ساتھ جب بڑے پیمانے پر تعلیمی ادارے قائم کر کے کثیرالتعداد مُعلّمین سے ان کا پورا وقت لیا جاتا ہو تو اِس صورت میں یہ ذمہ داری ریاست کی ہے کہ وہ ان کی کفالت کا انتظام کرے۔(نعیم صدیقی 1999ء ص20)

خوش آئند و خوشگوار طرزِ تکلّم

تعلیم کے تبلیغی کام کو سرانجام دینے کیلئے اُوپر کے اشارات کے مطابق معلّم میں جہاں اپنے مخاطبین کیلئے محبت و خیر خواہی اور نرم خوئی کے جذبات ہونے چاہئیں۔وہاں حضورﷺ کے مسلک کا تقاضا یہ ہے کہ خوش آئند طرزِ تکلّم اختیار کیا جائے۔ملاحظہ ہو آیت قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ: 83) اور بحث و اختلاف کا موقع پیش آئے تو خوشگوار

انداز میں تبادلہ خیالات کیا جائے۔ ملاحظہ ہو آیت: وَلَاتُجَادِلُوْآ اَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ ترجمہ: اہل کتاب کے ساتھ بحث مباحثہ نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو۔(العنکبوت: 46)

تعلیم بمطابق ذہنی استعداد

حضو ﷺ کی حکمتِ تعلیم کا ایک تقاضا یہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقلی و ذہنی استعداد کے مطابق خطاب کیا جائے۔ اس میں عُمر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ شہری اور دیہاتی کے فرق پر بھی نگاہ رکھنی ہوگی، مبتدی اور منتہی کے مراتب کا خیال بھی کرنا ہوگا۔(ولی اللہ، الصادق الخالدی 2000ء ص 65)

تدریجی اصول

حضو ﷺ نے تعلیم و تربیت میں تدریج کے اصول کو اختیار کیا۔ ایک حدیث میں قبائل میں جا کر تعلیم و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ چھوٹتے ہی دین کے سارے تقاضے لوگوں کے سامنے رکھ کر انہیں دہلا نہ دیا جائے بلکہ پہلے انہیں اساسی کلمہ کا قائل بنایا جائے، پھر اگر وہ توحید و رسالت کو مان لیں تو ان کو نماز کی دعوت دی جائے پھر اس کے بعد روزہ، زکوٰۃ اور حج کی دعوت دی جائے۔ جیسا کہ ابن عباس سے روایت ہے کہ:

عن ابن عباس ان رسول اللّٰه بعث معاذ الی الیمن فقال انك تاتی قوما اهل کتاب فادعهم الیٰ شهادة ان لااله الااللّٰه وان محمد الرسول اللّٰه فان هم اطاعو لذالك فاعلمهم وان اللّٰه قدفرض علیهم خمس صلواتٍ فی الیوم واللیلة فان هم اُطاعو لذلك فاعلمهم ان اللّٰه قد فرض علیهم صدقة تؤخذ من اغنیاء هم فتردعلی فقرائهم فان هم اطاعوا لذالك فایاك وکرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانه لیس بینها وبین اللّٰه حجاب ہ

ترجمہ: ابن عباسؓ سے روایت ہے بے شک رسول اللہ نے معاذؓ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ تو اہل کتاب کے پاس جا۔ ان کو اس بات کی گواہی کی طرف بلا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اگر انہوں نے اس کو مان لیا تو ان کو خبر دے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس کو مان لیں تو ان کو خبر دے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے اگر وہ اس کو مان لیں تو ان کے اچھے سے بچ اور مظلوم کی بدعا سے ڈرتا رہ۔ اس لئے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان پردہ نہیں ہوتا۔(الترمذی، الجامع، ابواب الزکوٰۃ، باب ماجاء فی کراهیة اخذ خیار المال فی الصدقة، ص 161، ح 665)

جامع مگر مختصر انداز تدریس

حضو ﷺ کی حکمت تعلیم میں ایک اُصولی بات یہ ملتی ہے کہ آپ ﷺ مخاطب جماعت کی اکتاہٹ کا پورا خیال رکھتے تھے۔ آپ ﷺ کے مطابق تعلیم و خطاب کا سلسلہ اتنا بوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اُکتانے لگیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ

نے حضور ﷺ کی اس خوبی کو بیان کیا ہے کہ آپ مناسب وقفوں پر خطاب فرماتے تھے (البخاری الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ما کان النبیؐ یتخوّلھم بالموعظة والعلم کي لا ینفروا، ص17، ح68)۔ حضور ﷺ کے اس اصول کی ایک شہادت حضرت ابن عباس کی طرف سے حضرت عکرمہ نے ہم تک پہنچائی ہے کہ عن عکرمة ان ابن عباس قال حدّث الناس کل جمعةٍ مرةً فان ابیت فمرتین فان اکثرت فثلاث مراتٍ — ترجمہ: لوگوں کو ہفتے میں ایک بار جمعہ کے دن تعلیم دو۔ اگر زیادہ کی ضرورت ہو تو دوبار یا حد سے حد تین بار۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الدعوات، باب مایکرہ من السّجع فی الدعاء، ص1102، ح6337)

اس اُصول کی بناپر حضور ﷺ ہمیشہ مختصر تعلیمی خطاب فرماتے تھے جو تیر بہدف ہوتے تھے۔ حضور ﷺ کا سب سے طویل خطبہ حجۃ الوداع کا خطبہ ہے۔ مگر وہ بھی اپنی جگہ بے حد مختصر ہے۔ پھر ایک خاص بات یہ سامنے آتی ہے کہ احادیث میں مختلف افراد اور مجالس سے حضور ﷺ کی جن تعلیمی گفتگوؤں کا ریکارڈ ملتا ہے، ان میں سے بعض میں ایک بات، بعض میں دو باتیں اور بعض میں چار یا پانچ باتیں ملتی ہیں۔ کوئی مثال ایسی نہیں ہے کہ بیسیوں نصیحتیں ایک ہی سانس میں کر ڈالی گئی ہوں۔

ذہنی آمادگی کی فضا پیدا کرنا

تعلیم وتدریس کیلئے طلب علم کی ذہنی فضا موجود ہونا ضروری ہے، چنانچہ حضور ﷺ کی معلّمانہ حکمت یہ تھی کہ مجالس صحابہ میں جب تشریف لاتے تو جن موضوعات پر گفتگو ہو رہی ہوتی، ان کا تسلسل جاری رہنے دیتے، اور خود بھی ان میں حصّہ لیتے۔ تعلیمی گفتگو کیلئے آپ ﷺ یا تو طالب علم کی فضا کے متلاشی رہتے جو کسی سوال یا بحث یا اجتماعی قضیے سے از خود پیدا ہو جاتی، یا پھر خوبصورت طریقے سے ایسی فضا پیدا فرماتے۔ اِسی بناپر حضرت ابنِ عباس نے یہ کہا کہ: قال ابن عباس فلاالفینك تاتی القوم وھم فی حدیثٍ من حدیثھم فتقص علیھم فتقطع علیھم حدیثھم فتملّھم ولکن انصت فاذا امروك فحدّثھم — ترجمہ: جب کسی مجلس کے لوگ اپنی باتوں میں مشغول ہوں تو ان کی باتوں کو منقطع کر کے تعلیم وتبلیغ شروع نہ کر دو بلکہ خاموش رہو، تا آنکہ لوگ خود ہی حصول علم کی خواہش کریں، یعنی کوئی سوال اُٹھائیں۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب الدعوات، باب مایکرہ من السّجع فی الدعاء، ص1102، ح6337)

طلبہ کی توجہ حاصل کرنا

مُعلّمی کا فریضہ اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ مُعلّم اپنے مخاطب گروہ کی توجہات کو مرتکز نہ کرے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے توجہات کو اپنی بات کی طرف مرتکز کرنے کے لئے مختلف موثر صورتیں اختیار فرمائیں۔ مثلاً: کبھی چونکا دینے والی کسی بات سے آغاز کلام کیا گیا۔ جیسے اَتٰٓی اَمۡرُ اللّٰہِ — ترجمہ: آن پہنچا اس کا فیصلہ (النحل:1)۔ کبھی سوال سے گفتگو شروع فرماتے مثلاً کیا تم فلاں بات جاننا چاہتے ہو یا کیا میں تم کو بھلائی کے راستے نہ بتاؤں ھَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا — ترجمہ: کیا میں تمہیں بتادوں کہ بہ اعتبار اعمال سب سے زیادہ خسارے میں کون ہے

(الکھف:103)۔اسی طرح خطبہ حجۃ الوداع کے آغاز میں مجمع سے دریافت کیا ای بلد ہذا ؟ ای شہر ہذا ؟ ای یوم ہذا؟ ۔ ترجمہ: یہ کونسا شہر ہے؟ یہ کونسا مہینہ ہے؟ یہ کونسا دن ہے؟(البخاری،الجامع الصحیح،کتاب الحج،باب الخطبۃ ایام منیٰ،ص280،ح1739)۔کبھی کوئی حیرت زا منظر ذہنوں کے سامنے آراستہ فرما دیتے مثلاً اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ وَاِذَ الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ہ وَاِذَاالْبِحَارُ فُجِّرَتْ ہ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ہ ۔ ترجمہ: جب آسمان پھٹ جائے گا،جب تارے جھڑ جائیں گے اور جب دریا اپنی گزرگاہوں سے باہر نکل کے آپس میں مل جائیں گے اور جب قبریں کھودی جائیں گی۔(الانفطار:1-4)

اصولِ تکرار

اُصولِ تکرار سے بھی حضورﷺ نے بارہا کام لیا۔کسی اہم بات کو ذہن نشین کرانے کیلئے تین تین بار دہراتے۔ اسی طرح کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو تین مرتبہ اجازت طلب فرماتے۔حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ:عن انس قال کان النبی ﷺ اذا تکلّم بکلمۃ اعادھا ثلاثاً حتیٰ تفھم عنہ اذا اتیٰ قوم فسلم علیھم ثلثًا ہ (البخاری،الجامع الصحیح،کتاب العلم،باب من أعاد الحدیث ثلاثاً لیفھم عنہ ،ص22،ح95)

تخصیص کار

حضورﷺ نے کارِ تعلیم کیلئے مختلف دائرے اور مختلف سطحیں مقرر فرمائیں۔

- ایک دائرہ عمومی تعلیم کا تھا۔
- دوسرا دائرہ خصوصی مجالس کا تھا جن کا مقصد معیاری علماء اور قائدین کو تیار کرنا تھا۔
- تیسرا دائرہ خواتین کی تعلیم کا تھا جس کیلئے آپ نے ہفتے میں ایک دن مخصوص کر دیا تھا اور جس کیلئے حضرت عائشہ کو مامور فرما کر لوگوں کو تلقین فرمائی کہ دین کا آدھا علم،یعنی نظام معاشرت اور خواتین کے متعلق معلومات،ان سے حاصل کرو۔
- چوتھا دائرہ خاص خاص موقعوں پر خاص خاص افراد کو انفرادی توجہ سے تعلیم و تربیت دینے کا تھا۔
- پانچواں دائرہ باہر سے حصول تعلیم کیلئے آنے والے وفود کو تیار کر کے قبائل میں فروغ تعلیم کیلئے واپس بھیجنے کا تھا۔(مشتاق الرحمٰن،صدیقی،ڈاکٹر1998ء،ص160)

ترغیب علوم وفنون

"العلم" کے علاوہ حضورﷺ نے ہر قسم کے مفید علوم وفنون کے سیکھنے کی طرف توجہ دلائی ۔نوشت وخواند کو پھیلانے کی سعی فرمائی(الترمذی،الجامع،ابواب الاستئذان والآداب ،باب ماجاء فی تتریب الکتاب،ص615، ح2713)۔صحتِ زبان کے اہتمام کی تلقین کی،فن کتابت کیلئے ہدایت دیں۔صحابہ کو عبرانی زبان سیکھنے اور تورات کا علم

حاصل کرنے پر متوجہ کیا۔عن زید بن ثابت قال امرنی رسول اللہ ﷺ ان تعلم السّریانیّۃ۔ ترجمہ: حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا (الترمذی، الجامع، کتاب الاستئذان ،باب فی تعلیم السریانیۃ ،ص615،ح2715)۔میدانِ بدر میں مجاہدین کی صف بندی کرا کے، آغازِ جنگ کیلئے انہیں پابند فرمان بنا کے اور مخصوص الفاظ (Code words) کی تعلیم دے کر دفاعی نظام کا بالکل نیا تجربہ شروع کیا۔(البخاری،الجامع الصحیح،کتاب الجھاد ، باب حفر الخندق ، التحریض علی الرّمی ص470: 479، ح2835: 2900)۔نوجوانوں کو تعلیم جہاد دینے کیلئے دوڑ اور تیر اندازی کے مقابلے کرائے، عین میدانِ جنگ سے قلعہ شکن آلات بنانے کی تربیت حاصل کرنے کیلئے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو مقامِ جرش کی طرف بھیجا۔ملاحظہ ہو آیت: وَاَعِدُّ والَھُمْ مَا اسْتَطَعْتَمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّاللّٰہِ وَعَدُوَّکُمْ وَاٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِھِمْ ۃ — ترجمہ:تم ان کے مقابلے کے لئے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑوں کے تیار رکھنے کی کہ اس سے تم اللہ کے دشمنوں کو خوف زدہ رکھ سکو اور ان کے سوا اوروں کو بھی۔(الانفال:60)

خواتین کو اس دور کی ضروریات کے مطابق چرخہ کاتنے کی نصیحت کی۔قریش کی عورتوں میں بچوں کی تربیت کا جو سلیقہ پایا جاتا تھا اس کی تحسین کر کے اس صلاحیت کو بڑھانے کا راستہ نکالا۔زیرِ تربیت رفقاء کو استیذان کے آداب سکھائے، پراگندہ بالوں کو ترشوانے اور کنگھی کر کے سنوارنے کی تلقین کی، عیدین کے تہوار مسرت سے منانے کیلئے جائز حدود میں تفریح کا موقع پیدا کیا، شادی بیاہ اور اعلانِ نکاح کے موقعوں پر مسرت آمیز انداز سکھائے اور لوگوں کو صحنوں کی صفائی کی نصیحت کی اور راستوں سے کانٹے اور کوڑا کرکٹ ہٹانے کی تربیت دی۔نیز خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں میں میل جول کے آداب سکھائے(البخاری،الجامع الصحیح،کتاب العیدین ونکاح ، باب الحرب والدّرق یوم العید ، ذھاب النساء والصّبیان الیٰ العرس ص153: 925،ح949: 5180)۔حضور ﷺ کا یہ وسیع تصور تعلیم قرآن کے جس کلمہ حکمت پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو آخرت کی بھلائی کے ساتھ دنیا میں بھی بھلائی حاصل کرنی ہے۔ملاحظہ ہو آیت:رَبَّنَا اٰتِنَا فِیْ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِیْ اْلاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار — ترجمہ:اے ہمارے رب دے ہمیں بھلائی دنیا میں اور آخرت میں اور بچا ہمیں آگ کے عذاب سے(البقرۃ:201)۔

طبی تعلیم پر توجہ

حضور ﷺ نے اپنی تعلیمی حکمت میں جسم کے حقوق کو پوری اہمیت دی۔قرآن پاک نے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت پر مامور کرتے ہوئے یہ معیارِ انتخاب پیش کیا ہے کہ ان کو علم اور جسم دونوں سے برتری حاصل ہے۔ملاحظہ ہو آیت:وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِیْ الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ — ترجمہ:اور اسے علمی اور جسمانی برتری بھی عطا فرمائی(البقرۃ: 247)۔ اسی معیار کے مطابق حضور نے جسم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر فرمایا کہ فَانَّ لجسدك علیك حقاً ۔(البخاری،الجامع الصحیح، کتاب الصوم ،باب حق الجسم فی الصوم ،ص317، ح1975)۔اِس موقع پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد قابلِ توجہ

ہے کہ قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔جسم کی ضروریات مدِّ نظر رکھنے کا ثبوت وہ طبی تعلیم بھی ہے جو حضو ﷺ نے اس دور کے فنِ طب کے مطابق اپنے پیروؤں کو دی۔(ابن قیم الجوزیۃ 2006ء احادیث درباب طب،ص 712-899)

سوالات کرنا

حضو ﷺ نے تعلیم کے فروغ کیلئے سوال کو یہ فرما کر بڑی اہمیت دی کہ علم ایک صندوق ہے جس کی کنجی سوال ہے۔یعنی سوالات اُٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصب مُعلّمی کا لازمہ ہے۔(ولی اللہ،الصادق الخالدی 2000ء ص 75)۔

باعمل استاد کی ضرورت

حضور کی حکمت تعلیم کا ایک سبق یہ ہے: عن ابن سیرین قال ان ھذا العلم دینٌ فانظروا عمن تاخذون دینکم علم یہ دیکھ کر سیکھو کہ کس سے سیکھ رہے ہو یعنی آیا تمہارا معلّم واُستاد بلحاظِ قابلیت اور بلحاظِ کردار قابل اعتماد ہے؟(مشکوٰۃ المصابیح،کتاب العلم،ص 37)۔اس ارشاد کی روشنی میں ایک اسلامی ریاست کیلئے یہ لازم آتا ہے کہ وہ مُعلّموں کے انتخاب میں بڑی چھان بین سے کام لے اور نہ صرف ان کی سندات اور علمی قابلیت کا جائزہ لے، بلکہ بلحاظ کردار ان کے خاندانی پس منظر اور تعلیمی دور کی جانچ پڑتال کو بھی زیر غور لائے،جن لوگوں کو نئی نسل کے خیالات اور کردار کی تعمیر وتشکیل کا نازک ترین فریضہ سونپا جا رہا ہو۔ان کے متعلق دوسری ملازمتوں کے اُمیدواروں سے زیادہ سخت چھان بین ہونی چاہیے۔یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا مُعلّمی کا کوئی امیدوار محض پیشہ وارانہ ذہنیت کے ساتھ آ رہا ہے یا اس کے اندر صحیح تبلیغی جذبہ موجود ہے۔بلکہ ملازمت میں آنے کے بعد بھی اساتذہ کے کردار کی جانچ پڑتال پر نظر رکھنی چاہیے اور جہاں کہیں کوئی آدمی اس کام کیلئے غیر موزوں نظر آئے اسے فوراً اس مقدس ذمہ داری سے الگ کر دیا جائے۔(شہباز خان، ڈاکٹر 1997ء،ص 114)

غیر نافع علم کی ممانعت

حضو ﷺ نے ایسے علم سے بچنے کیلئے خدا کی پناہ طلب فرمائی جس سے لوگوں کو نفع نہ ہو۔حدیث قدسی ہے: عن ابی ھریرۃؓ قال کان رسول اللہ ﷺ یقول اللّٰھم انی اعوذبك من الاربع من علمٍ لاینفع ومن قلبٍ لا یخشع ومن نفسٍ لا تشبع ومن دعآءٍ لا یسمع — ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں رب سے چار چیزوں کی پناہ مانگتا ہوں،وہ علم جس سے لوگوں کو نفع نہ ہو،وہ دل جس میں خوفِ خدا نہ ہو،وہ نفس جو سیر نہ ہو،وہ دعا جو قبول نہ ہو(ابن ماجہ،السنن،انتفاع بالعلم،ص 38،ح 250)۔اس کے دو معنی ہیں۔ایک یہ کہ کسی شخص کا علم حاصل کر کے اسے روک کے بیٹھ رہنا علم کی منفعت کو ضائع کرنا ہے،دوسرے یہ کہ بعض علوم وفنون ایسے ہوسکتے ہیں جو کوئی ٹھوس افادیت انسانوں کیلئے نہ رکھتے ہوں۔

علم اور دماغی قوتوں کے غلط استعمال سے پرہیز

حضور ﷺ نے علم اور دماغی قوتوں کے غلط استعمال سے پرہیز کی تاکید کی ہے۔ مثلاً آپ ﷺ نے جبر وقدر کے مسئلے پر ایک ایسی بحث کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا جس میں ایک فریق حقیقت کے ایک نصف حصے کو لیے ہوئے تھا اور دوسرا فریق دوسرے نصف حصے کو اور سچائی کے دونوں حصوں کو آپس میں ٹکرایا جا رہا تھا۔ اِسی سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کے ایک حصے کو اس کے دوسرے حصے سے نہ ٹکراؤ، واضح رہے کہ بحث ومناظرہ کی بیشتر صورتوں میں جو باعث تفرق وانتشار ہوتی ہیں، یہی خرابی پائی جاتی ہے۔ (الترمذی، الجامع، ابواب القدر، باب ماجاء من التشدید فی الخوض فی القدر، ص 490، ح 2133)

پھر آپ ﷺ نے ایسے سوالات پر بحث کرنے سے منع فرمایا جن کا نتیجہ سوائے گمراہی کے کچھ نہیں۔ مثلاً یہ سوال کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟ عن ابی ھریرۃ عن قال رسول اللہ ﷺ قال لایزال النّاس یتساء لون حتیٰ یقال ھذا : خلق اللّٰہ الخلق فمن خلق اللّٰہ — ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو ایسے سوالات کرنے سے منع فرمایا جس میں سے پوچھا گیا ہو کہ مخلوق کو پیدا کرنے والا تو اللہ ہے، اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ (ابوداؤد، السنن، کتاب السنۃ، باب فی الجھمیۃ، ص 667، ح 4721)۔ اس طرح کے سوالات سے منع کیا گیا ہے کہ جس دائرہ حقائق کے لئے ہمیں ذرائع علم دیے ہی نہیں گئے۔ اس میں قدم رکھنے سے سوائے گمراہی کے کچھ حاصل نہیں۔

مددگار ذرائع کا استعمال

رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق یہ بھی حکمتِ تدریس ہے کہ جو بھی دیکھنے اور سننے سے متعلق مطلوبہ حقائق کو واضح کرنے والے ذرائع مل سکیں ان سے مدد لی جائے آپ ﷺ خود امّی تھے پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے تھے۔ نہ آپ ﷺ کے دور میں اس طرح کے وسائل کی کثرت ہی تھی تاہم اصولاً آپ ﷺ نے اس طریقہ کی تائید فرمائی اور ممکن حد تک اس سے کام لیا۔ بخاری ومسلم نے ابوموسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: المؤمن للمؤمن کالبنیان یشدّ بعضہ بعضاً وشبّك بین أصابعہ — ترجمہ: ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایک دیوار کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے اور (اس بات کی وضاحت کے طور پر) آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈالیں۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب المظالم، باب نصر المظلوم، ص 394، ح 2446)

مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ: عن جابر ابن عبداللہ ان رسول اللہ مرّ بالسّوق، داخلاً من بعض العالیۃ، والنّاس کنفتہ، فمرّ بجدیٍ أسكّ میّتٍ، فتناولہ فأخذ بأُذنہ، ثمّ قال: ایّکم یحبّ انّ ھٰذالہ بدرھمٍ ؟ فقالوا: ما نحب انہ لنا بشيءٍ، وما نصنع بہ ؟ قال: تحبّون انّہ لکم ؟ قالوا: واللّٰہ ! لو کان حیّا، کان عیباً فیہ، لانہ اسكّ، فکیف وھو میّتٌ ؟ فقال: فواللّٰہ ! للدنیا اھون علیٰ اللّٰہ، من ھذا علیکم — ترجمہ: رسول اللہ ﷺ ایک بازار سے گزرے آپ کے دائیں بائیں

لوگ ساتھ چل رہے تھے ایک چھوٹے کانوں والے بکری کے مردہ بچے کے پاس سے گزر ہوا تو آپ ﷺ نے اس کا کان پکڑا اور فرمایا: تم میں سے کون اسے ایک درہم میں لینا پسند کرے گا۔ لوگوں نے عرض کیا ہم کسی بھی دام پر اسے لینا پسند نہیں کریں گے اور ہم اس کا کریں گے بھی کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم پسند کرو گے کہ یہ تمہارا ہو جائے؟ لوگوں نے عرض کیا :خدا کی قسم اگر یہ بچہ زندہ بھی ہوتا تو کان چھوٹے ہونے کی وجہ سے عیب دار تھا اور اب تو وہ مردار بھی ہے۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ حقیر ہے جتنا یہ تمہارے نزدیک ہے۔ (مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الزہد، باب الدنیا سجن للمؤمن وجنة لکافر، ص1281، ح7418)

مددگار ذرائع میں سے اس عجیب و غریب ذریعے کو اختیار کر کے رسول اللہ ﷺ نے کس طرح اپنے صحابہؓ کے دلوں میں اپنی بات ٹھیک ٹھیک اتار دی۔ اس ذریعے کے لئے نہ کوئی پیسہ خرچ کرنا پڑا، نہ اس میں کوئی محنت لگی نہ اسے استعمال کرنے میں آپ ﷺ نے تکلف سے کام لیا۔ لوگ اس طرح کی چیزوں سے ادنیٰ توجہ کے بغیر گزر جاتے ہیں لیکن آپ ﷺ نے اس کا کان پکڑ کر اور اس کے بارے میں سوالات کر کر کے لوگوں کے دل و دماغ کو پوری طرح متوجہ و بیدار کرنے کے بعد ہی اپنے مفہوم و مراد کی وضاحت کی کہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بے قیمت ہے۔ دینی واخلاقی اور عقلی اہمیت کی چیزوں کو ذہنوں میں بٹھانے کیلئے آپ ﷺ نے اس طرح کے بہت سے ذریعے اختیار فرمائے۔ (یوسف القرضاوی 1988ء ص 163)

علم کو مغالطہ کا ذریعہ نہ بنایا جائے

ایک ہدایت حضور ﷺ نے یہ دی ہے کہ علم کے ذریعے مغالطہ نہ دیا جائے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ عن معاویہ قال ان النّبی صلی اللّٰہ علیه وسلم نهی عن الغَلوطات – ترجمہ: حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے (علم میں) مغالطہ دینے سے منع فرمایا (ابو داؤد، السنن، کتاب العلم، باب التوقی فی الفتیا، ص525، ح3656)۔ یہ حقیقت ہے کہ دُنیا کے بیشتر اہل علم اور دانش ور اپنی ذہنی برتری کے ذریعے کم علم اور سادہ دل لوگوں کو مغالطے دیتے ہیں۔ آج بے شمار ایسے حکیمانہ اقوال اور دانشورانہ نکات کو علم واستدلال اور پروپیگنڈے کے زور سے ناقابلِ تردید کلیات کا مقام دے دیا گیا ہے۔ جن کا تجزیہ کریں تو وہ ایک دلفریب مغالطہ ثابت ہوتے ہیں۔ پوری نوعِ انسانی کو آج کے علم نے چند بڑے بڑے مغالطوں کا شکار بنا دیا ہے۔ ایسے دائرہائے اُمورِ غیب میں قدم رکھنے سے بھی روکا جن تک آدمی کے علم کی سرے سے دسترس ہی نہیں اور نہ ایسے دوائر کے لئے اسے وسائل علم دیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو آیت: وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ – ترجمہ: جس بات کی تجھے خبر نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ (بنی اسرائیل: 36)۔ حضور ﷺ نے خدا کی آیات کی مخالفت کرنے کو شدید قسم کے نقصانِ علم کا موجب بتایا جس کے اثر سے سمع، بصر اور فواد کی قوتیں بھی صحیح طور پر کام نہیں کر سکتیں۔ ملاحظہ ہوں آیات: وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ – ترجمہ: ہماری آیتوں کا منکر بجز ظالموں کے اور

کوئی نہیں (العنکبوت: 49)۔ وَمَا يَجۡحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوۡرٍ ترجمہ: ہماری آیتوں کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو بدعہد اور ناشکرے ہیں (لقمان: 32)۔

تدریس بچگان کے اصول

بچوں کے متعلق حضور ﷺ کی حکمت تعلیم ہمیں ایک خاص نقطۂ نظر دیتی ہے جس کے چند نمایاں ارشادات یہ ہیں:

- حضور نے بچوں کی معصومیت کی تعبیر یہ کہہ کر فرمائی کہ یہ تو جنت کے باغوں کے پھول ہیں، یعنی ان سے محبت و ملاطفت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ج1، باب الایمان بالقدر، ص34)
- پھر بچوں کے متعلق یہ فرمایا کہ عن ابی هريرة قال رسول الله ﷺ مامن مولود الايولد على الفطرة فابواه يهوّدانهٖ اوينصّرانهٖ اويمجسّانه ۔ ترجمہ: ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کوئی بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے اس کے ماں باپ اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی کر دیتے ہیں (مسلم، الجامع الصحیح، کتاب القدر، باب معنیٰ كل مولود يولد على الفطرة ص1157، ح2658)۔
- فطرت اسلام سے مراد وہی بات ہے جو قرآن میں تمام انسانوں کیلئے کہی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو آیت: فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ۔ ترجمہ: اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا (الروم: 30) اس کی تشریح ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: عن ابن مسعودؓ قال رسول اللّٰہ ﷺ انّ لِلشّيطان لمةً بابن آدم وللملك لمةً ۔ ترجمہ: ہر فرزند آدم کے اندر ایک آواز فرشتے کی ہوتی ہے اور ایک آواز شیطان کی یعنی اس کے اندر خیر و شر کے دو گونہ رُجحان پائے جاتے ہیں۔ (الترمذی، الجامع ابواب تفسیر القرآن، باب و من سورة البقرة، ص672، ح2988)۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسے تمیز خیر و شر کا میلان بھی دیا گیا ہے۔ اس ارشاد کی رُو سے یہ گھر، مدرسے اور معاشرے کی تعلیمی سرگرمیوں پر منحصر ہے کہ وہ بچے کے اندر نیکی کی ملکوتی آواز کو زوردار بنا دیں یا بدی کی شیطانی پکار کو غالب کر دیں۔
- پھر بچوں کی تربیت کے سلسلے میں حضور ﷺ نے والدین کو یہ تاکید بھی کی کہ وہ اپنی ساری اولاد سے مساوات کا معاملہ کریں، بصورتِ دیگر بچوں میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔ یہی اُصول اجتماعی نظام تعلیم پر بھی لاگو ہوگا۔ درسگاہوں میں تمام طلبہ کے ساتھ مساویانہ معاملہ ہونا چاہیے اور سب کے لئے حقوق و فرائض کی ادائیگی کے ساتھ اساتذہ کا رویّہ ایک ہی جیسا ہونا چاہیے۔

نظریۂ سزا

حضور ﷺ کی حکمتِ تعلیم نے نظریۂ سزا بھی دیا جس کے دو نکات ہیں۔ ایک یہ کہ شدید ضرورت کے تحت سات سال کی عمر سے زائد کو سزا دی جاسکتی ہے۔ عن عمرو بن شعيب ، عن ابيه ، عن جدّهٖ قال : قال

رسول اللہ ﷺ : مروا او لادکم بالصلاۃ و ھم ابناء سبع سنین ، واضربوھم علیھا و ھم ابناء عشر سنین، و فرقوا بینھم فی المضاجع — ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہوں اور نماز نہ پڑھنے پر انہیں مارو جب وہ دس برس کے ہوں (ابو داؤد، السنن، کتاب الصلوۃ، باب حتی یومر الغلام بالصلوۃ، ص 82، ح 495)۔ دوسرے یہ کہ ایسی جسمانی سزا نہیں دی جانی چاہیے جو نشان چھوڑنے والی ہو۔ سخت قسم کے تھپڑ یا گھونسے یا بید نہیں لگانے چاہئیں۔ ملاحظہ ہو آیت وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا — ترجمہ: اور جن عورتوں کی نافرمانی اور بد دماغی کا تمہیں خوف ہو انہیں نصیحت کرو اور انہیں الگ بستروں پر چھوڑ دو اور انہیں مار کی سزا دو پھر اگر وہ تابعداری کریں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو (النساء: 34)۔

نظریہ سزا کے سلسلے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں:

الف: تعلیم کا بنیادی تقاضا محبت و شفقت ہے، سزا کی گنجائش محض غیر معمولی مواقع کے لئے استثنائی درجے میں رکھی گئی ہے۔

ب: اس نظریہ سزا کے سامنے یہ حکیمانہ شعور بھی ہونا چاہیے کہ بگڑے ہوئے ماحول کے مقابلے میں اُس دورِ سعادت کا معاملہ الگ تھا جس کو پیش نظر رکھ کر حضور ﷺ نے نظریہ سزا بیان فرمایا۔ سنورے ہوئے معاشرے میں نظم و ضبط توڑنے اور سرکشی کرنے کی مثالیں شاذ ہی ہوتی ہیں اور ان پر معمولی سی سزا دینا بھی اسی لئے موثر ہوتا ہے کہ پورا ماحول سزا دینے والے ہاتھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ بگڑے ہوئے معاشرے میں جہاں بُرائی کی قوتیں حسین و دلکش اسالیب سے غلط روش کو مزین بنا کر سامنے لاتی ہوں اور ان کی وجہ سے فکری و اخلاقی محاذ پر ایک مستقل جنگ برپا ہوتی ہو، دو ہی طرزِ عمل ہو سکتے ہیں یا تو سزا اصول عام بن جائے، مشفقانہ رویہ صرف نادر صورتوں میں سامنے آئے۔ یا پھر نیکی اور سچائی کے معلّم اپنی شفقت کو اور زیادہ وسیع و عمیق بنا دیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت سزا کو غیر موثر بنا دے گی لہٰذا دوسری صورت ہی مفید نتائج دے سکتی ہے۔

ج: سزا دہی کا معاملہ طبیب کی سی حکمتِ عملی کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر قسم کے حالات میں موقع اور محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔

د: بعض اصحاب کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوتی ہے جس کی بنا پر حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ عن معاذؓ قال او صانی رسول ﷺ لاترفع عنھم عصاك ادبا و اخفھم فی اللہ ترجمہ: اولاد کے سروں سے تادیب کے عصا کو نہ ہٹاؤ اور انہیں اللہ سے ڈراتے رہو۔ (مشکوۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الکبائر و علامات النفاق، ج 1، ص 18) یہاں تادیب کے عصا سے مراد سچ مچ کا عصا نہیں ہے بلکہ یہ ویسا ہی استعاراتی انداز بیان ہے جیسے کہا جائے کہ اپنے مخالفین کو بھی احسان کی زنجیروں میں باندھ کر رکھو یا دُشمن کو مار تو

بھلائی کی تلوار سے مارو۔اگر کوئی شخص ان مواقع پر زنجیروں اور تلوار کے لفظ کے لغوی معنی لے لے تو وہ صریحاً غلطی کرے گا۔یہاں استعاراتی مفہوم لیا جاتا ہے۔یعنی احسان کی زنجیروں اور بھلائی کی تلوار سے مراد احسان کی بھلائی کے سوا کچھ نہیں۔ٹھیک اسی طرح تادیب کے عصا سے مراد محض تادیب ہی ہے۔تادیب یا ادب سکھانا یا تربیت دینا ایک فنِ لطیف ہے۔

مختلف احادیث کے حوالے سے مسلمانوں کے نظام تعلیم و تربیت کی محققین نے اس طرح تصویر کشی کی ہے:

The general course of training for young males are setforth in the Hadith has as follows;

on the seventh day after the child's birth the Aqiqa is performed and he recieves his name and is made secure against all harms; when he is six years old his education begings: at the stage of nine he is given a separte corporal punishment when he omits his prayers; at sixteen his father gives his in marriage, then grasp him by the hand and says my son I have trained you and had you taught and I have given you in marriage; now I beseach God for the help against your templations in this world and against you being punised in the last judgemnet. (Encyclopaedia of Religion and Ethics, vol:2nd, p:100)

قرآن مرکزی نصاب

حضور ﷺ کی تعلیم کا مرکزی نصاب قرآن تھا۔(متعدد احادیث البخاری، الجامع الصحیح، کتاب فضائل القرآن) جو پوری انسانی زندگی کیلئے ایک جامع رہنما کتاب ہے۔تعلیم کے بقیہ شعبے اسی مرکزی نصاب کے اردگرد مرتب ہوتے ہیں۔

معلّم اور متعلّم کے تعلقات

سرکارِ رسالت مآب ﷺ کی حکمت تعلیم کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ جس طرح معلّم کو متعلّمین کے ساتھ محبت و شفقت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔اس طرح متعلّمین کے لئے لازم ہے کہ وہ معلّم کا ادب و احترام رکھیں۔تواضعو لمن

تعلمون منه — ترجمہ: جس سے علم حاصل کرو اس سے عاجزی سے پیش آؤ۔ اس ہدایت میں یہ تقاضا از خود مُضمر ہے کہ مُعلم بلحاظِ قابلیت، کردار اور معلّمانہ روش کے ایسا اوصاف سے متصف ہو کہ طلبہ میں اس کے لئے احترام نشو ونما پائے۔
آخر میں حضور اکرم ﷺ کے اسلوب تدریس اور حکمت تعلیم کے چند پہلو اجمالاً پیش کئے جارہے ہیں۔

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہی رہتے تھے۔ البتہ مصلّی سے اُٹھ کر اس مقام پر آ کر بیٹھ جاتے تھے جہاں استوانہ (ستون) توبہ واقع ہے۔ یہ جگہ منبر شریف اور حجرہ مبارکہ کے درمیان میں چوتھا ستون ہے۔ آپ ﷺ ستون سے کمر لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور صحابہ کرام کو تعلیم دیتے تھے۔ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے (محمد بن سلیمان بن طاہر 2002ء ص 132)۔ اگر تعداد زیادہ ہوتی تھی تو متوازی حلقے بنائے جاتے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں: نماز فجر کے بعد ہم رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ ہم میں سے کوئی شخص قرآن سے متعلق سوال کرتا تھا، کوئی فرائض (وراثت) کے مسائل دریافت کرتا تھا۔ کوئی خواب کی تعبیر دریافت کرتا تھا۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب التعبیر، باب تعبیر الرؤیا بعد صلوۃ الصبح، ص 1215، ح 7047)

یہ ایک آزاد طریقہ تعلیم تھا۔ دین سے متعلق ہر قسم کی بات وہاں دریافت کی جاتی تھی اور آپ ﷺ سائل کو سمجھاتے تھے۔ اس کی تشفی فرماتے تھے۔ اس درس میں شرکت کی نیت سے صحابہ کرام کی اکثریت فجر کی نماز مسجد نبوی میں ادا کرتی تھی اور اس درس میں شریک ہوتی تھی۔ مجبوری کی وجہ سے جو صحابہ کرامؓ مجلس میں شریک نہیں ہو پاتے تھے۔ وہ حاضر باش صحابہؓ سے آپ ﷺ کی گفتگو سن لیتے تھے اور باخبر ہو جاتے تھے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے باہمی اتفاق کر لیا تھا ایک روز ایک صحابیؓ جاتے اور وہ اپنے دوست کو باخبر کرتے اور دوسرے روز دوسرے صحابیؓ جاتے اور وہ آکر اپنے دوست کو باخبر کرتے۔ اس طرح تعلیم سے ان کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب التناوب فی العلم، ص 20-21، ح 89)

- حضور اکرم ﷺ فصیح زبان میں ایک ایک لفظ مخاطب اور سامع کے دل و ذہن میں اتارتے تھے۔ آپ فرماتے ہیں: انا افصح العرب ترجمہ: میں اہل عرب میں فصیح تر ہوں (محمد غزالی 2001ء ب، ص 264)۔ أدبنی ربی فأحسن تادیبی یعنی میری تربیت خالق کائنات نے خود کی ہے اور مجھے بولنے کا انداز اس نے خود سکھلایا ہے۔ آپ ﷺ کے دل نشین انداز گفتگو کا اعجاز تھا کہ سامعین بول اُٹھتے تھے: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ جس انداز میں وعظ فرماتے ہیں ہمیں گمان گزرتا ہے کہ شاید یہ آپ ﷺ کا آخری وعظ ہے۔ لہٰذا ہمیں اور سنایئے۔ (اسماعیل بن محمد بن الہادی العجلونی 2001ء ص 62، ح 164)
- آپ ﷺ کی تدریس کی بنیاد محبت اور خیر خواہی پر تھی۔ جبر و تشدد کا کہیں گمان تک نہ تھا۔
- حضور اکرم ﷺ اپنے ساتھیوں کو ہدایت دیتے ہیں کہ لوگوں کیلئے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات نہ پیدا کرو۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ماکان النبی ﷺ یتخولهم بالموعظة، ص 17، ح 69)
- آپ ﷺ نے علمی خدمات کا اجر کبھی نہیں لیا۔

- حکمت کا عجیب انداز تھا۔ شخص متعلقہ کی تعریف بھی فرماتے پھر اس کے نقص کا ذکر فرماتے تھے۔ مثلاً خزیم اسعدیؓ بہت اچھے آدمی ہیں کاش ان کے بالوں کی لٹ لمبی نہ ہوتی اوران کا تہبند نیچے نہ لٹکا ہوتا۔ یہ سن کر خزیمؓ نے اپنی اصلاح کرلی (احمد بن حنبل ؒ 1378ھ ج4،ص 321، ح 19106)۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے عبداللہؓ ابن عمرؓ سے کہا: عبداللہؓ بہت اچھے آدمی ہیں کاش وہ رات کی نماز بھی پڑھا کرتے۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب التعبیر، باب الاخذ علی الیمین فی النوم ،ص 1212، ح 7031)۔ غرضیکہ آپ ﷺ کا تربیت کا انداز بڑا حکیمانہ تھا۔ وعظ ناگوار نہیں گزرتا تھا۔
- آپ ﷺ وعظ و نصیحت میں ناگواری پیدا ہونے سے بچتے تھے۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ماکان النبی ﷺ یتخولھم بالموعظة والعلم کی لاینفروا ،ص 17، ح 68)
- باوجود اس کے کہ آپ ﷺ اُمّی تھے کتابت نہیں جانتے تھے۔ آپ ﷺ نے کاتبوں کے لئے مختلف ہدایات دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔
  - کاغذ کو موڑنے سے قبل سیاہی کو خشک کرلو۔ اس پر ریت ڈالو۔
  - ہم اس طرح لکھو جس طرح گائے کا سرا ہے۔
  - س ' کے تین شوشے واضح طور پر بناؤ۔
  - لکھتے وقت درمیان میں رکنا پڑے تو قلم کو کان پر رکھ لیا کرو۔ (عبدالحئ الکتانی 2001ء ص 123-137)
  - خط پر مہر لگانے کا رواج بھی آپ ﷺ نے شروع کیا۔ اس کیلئے ایک مہر بنوائی گئی تھی۔ (البخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب مایذکر فی المناولة و کتاب اھل العلم بالعلم الی البلدان ، ص 15، ح 65)
  - آپ ﷺ نے لوگوں سے ان کی ذہنی استعداد کے مطابق بات کی۔
  - آپ ﷺ نے تعلیم و تربیت میں اصول تدریج کو ہمیشہ سامنے رکھا۔
  - آپ ﷺ سامعین کی اکتاہٹ کا پورا خیال رکھتے تھے اور مناسب وقفوں پر خطاب فرماتے تھے۔
  - آپ ﷺ مختلف وسائل کو کام میں لاکر طالب علم کیلئے مناسب، خوشگوار اور دلچسپ فضاء پیدا کردیا کرتے تھے تاکہ سامعین کی توجہ برقرار رہے۔
  - آپ ﷺ اصول تکرار سے کام لیتے تھے تاکہ ہر طبقے اور ذہنی استعداد کے لوگوں تک بات پہنچ جائے۔
  - آپ ﷺ گفتگو میں سوال اُٹھاتے اور سامعین کے سوالات کے جوابات خندہ پیشانی سے دیتے تھے (ابوداؤد، السنن، اول کتاب العلم، باب کتابة العلم ،ص 523-524، ح 3640:3650)۔

اسلامی حکمت تدریس کے یہ اسالیب مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

4.8 فراہمی وسائل اور منصوبہ بندی

اسلامی نظام مالیات ایک مکمل نظام ہے جس میں معاشرے کی تمام ضروریات پوری کرنے اور اس کے مسائل حل کرنے کے لئے مطلوبہ وسائل کی فراہمی کے ساتھ ساتھ ان کے مصارف کی مدوں کی بھی بخوبی نشاندہی کی گئی ہے اسی لئے دور نبوت ﷺ اور خلافت راشدہ میں ہی نہیں بلکہ دور ملوکیت میں بھی کامیابی سے زیر عمل رہا (محمد افسر، خان راجہ 1989ء ص 139)۔ حضور ﷺ کے تعلیمی و تربیتی انتظامیات میں دار ارقم (مکہ مکرمہ) کا نظام اسلامی تعلیمی نظامیات کے اولین نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں امت کے مستقل پر غور ہوتا تھا، تبلیغ اسلام کے انتظامات ہوتے اور تحفظات کے ساتھ ساتھ اشاعت و غلبہ دین کے لئے عملی تربیت بھی میسر آتی تھی (ظہور احمد اظہر 1999ء ص 34)۔ یوں دار ارقم مسلمانوں کا دار الترتیب بھی تھا اور دار الندوہ بھی (محمد رفیق ڈوگر 1999ء ص 272)۔ جبکہ باقاعدہ تعلیمی نظام کی تشکیل مدنی دور میں ہوئی۔ (رشید احمد ارشد 1983ء ص 131)

نبی اکرم ﷺ ملتِ اسلامیہ کے سب سے پہلے معلّم تھے۔ آپ ﷺ نے ہی مدینہ میں پہلی منظم تعلیم گاہ قائم فرمائی۔ صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اس کے متعلّم تھے۔ اس مدرسے میں 70 اور 80 تک طالب علم تھے۔ حضور ﷺ کے علاوہ دوسرے صحابہ کبارؓ بھی یہاں معلّم کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے تھے (رب نواز، پروفیسر 2001ء ص 23)۔ جامعہ صفہ کے اکثر طلبہ نادار تھے۔ اتنے نادار کہ دو دو دن مسلسل فاقے ہوتے تھے۔ فضالہ بن عبید کہتے ہیں کہ جب جناب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھاتے تو کئی لوگ افلاس، تنگی اور بھوک کی وجہ سے قیام نہ کرسکتے تھے اور گر پڑتے (الترمذی، الجامع، کتاب الزہد عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی معیشۃ اصحاب النبی ﷺ، ص 539، ح 2368)۔ گویا یہ طلبہ تعلیمی ضروریات تو کجا جسمانی ضروریات بلکہ صرف پیٹ بھرنے کا سامان بھی نہ رکھتے تھے۔ افلاس اور ناداری ہونے کی آخری حد فاقہ سے نماز میں گر پڑنا انتہا تو ہے۔ آیئے اب دیکھیں جناب معلّم اعظم ﷺ نے کیا ہدایت فرمائی اور اس یونیورسٹی کی معاشی کفالت کس طرح ہوتی تھی۔

ایک دفعہ جناب رسول اللہ ﷺ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس سے گزرے تو فرمایا اہل صفہ کو جا کر بلا لاؤ اس کی حضرت ابو ہریرہؓ اس طرح وضاحت فرماتے ہیں کہ اہل صفہ اسلام کے مہمان تھے۔ حضور ﷺ کے پاس صدقہ کی کوئی چیز آتی تو اہل صفہ اور خود ﷺ اس سے ذرہ برابر نہ لیتے اور جب ہدیہ یا تحفہ کی شے آتی تو خود ﷺ بھی لیتے اور اہل صفہ کی طرف بھیجتے اور اس چیز میں ان کو شریک کرتے۔ مہمان ہونے کے ناطے سارا تناظر بدل دیا گیا ہے (سعد اللہ 1984ء ص 452)۔ مہمان جس کی خدمت کا یہ طریقہ رہا کہ خود بھوکے رہا جاتا اور مہمان کو کھانا کھلایا جاتا اپنی ضروریات کو کاٹ کر مہمان کی خدمت کی جاتی۔ مہمان کی ضروریات اپنے سے مقدم ٹھہریں۔ یہ وجہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ متعلّم کی صحیح تربیت اپنے نظام کے بقا کا تقاضا ہے اور تعلیم کا مقصد بھی تو ایسا ہی ہے اور جب متعلّم کی تربیت اپنے نظام کی بنیادوں پر ہوگی

تو یہی آنے والے کل میں بدلتے تقاضوں میں قیادت فراہم کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔(محمد جاوید اقبال 2001ء ص205)۔

اصحاب صفہؓ کی معاشی کفالت جہاں افراد کی ذمہ داری قرار پائی وہاں مملکت کی بھی۔ جناب معلّم اعظم ﷺ نے ایک موقع پر اپنی لاڈلی اور چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کی درخواست مسترد فرمائی اور فرمایا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ تمہیں دے دوں اور اصحاب صفہ کا خیال نہ کروں اگر ان سے کچھ بچ گیا تو تمہیں بھی مل جائے گا۔ مگر کبھی بچتا ہی نہ تھا (عبدالحمید دہلوی ڈاکٹر (س ن)، ص 457)۔ گویا مملکت اور افراد کی مشترکہ ذمہ داری تھی کہ طلبہ کی ہر لحاظ سے کفالت کریں جبکہ جناب رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو مسلسل اس طرف متوجہ فرمایا کرتے تھے اور ہر قیمت کا ہدیہ اور تحفہ قبول کیا جاتا۔ صفہ کے دو ستونوں کے درمیان ایک رسی لٹکی رہتی تھی جس پر صحابہ کرامؓ رضوان علیہم انگوروں اور کھجوروں کے خوشے لٹکا دیا کرتے تھے لیکن اس کے باوجود جب جامعہ صفہ کے طلبہ کو تعلیم سے فرصت ملتی تو جنگل میں چلے جاتے۔ لکڑیاں اکٹھی کرتے بازار میں فروخت کرتے اور جو قیمت وصول ہوتی اس رقم کا نصف تو اسی وقت خیرات کردیتے اور باقی نصف سے نہایت تنگی سے اپنا خرچ چلاتے (منورابن صادق 1978ء ص6)

اصحاب صفہ میں سے حضرت معاذ بن جبلؓ مالی اُمور کے نگران تھے جو عطیات کے ذریعے اس کے مصارف پورے کرتے تھے جبکہ عطیات کی تقسیم کا کام بھی ان ہی کے سپرد تھا۔ اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اہل صفہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے تھے جبکہ دوسرے اہل ثروت مسلمان بھی ان طلبہ اور ان کے متعلقین کی مقدور بھر مدد کرتے اور خود حضور اکرم ﷺ بھی براہ راست ان کی مدد فرماتے (محمد صلاح الدین 1989ء ص 24)۔ اس مدرسے نے اسلامی قلم رو میں تعلیم کی نہج قائم کی اور جو روایت اس سے پڑی وہ ہی ہماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ روایت یہ تھی:

- اوّلین چیز دینی تعلیم ہے۔ قرآن اور سُنّتِ نبوی ﷺ کو نصاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہیے۔
- تعلیم کا مقصد۔
  - اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا۔
  - اور مسلم معاشرے کی ہر ضرورت کو پورا کرنا ہے۔
- رسول کریم ﷺ نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور، سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ بنی اور اس کے ذریعے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کا امین بنے۔(محمد صلاح الدین 1989ء ص 22)
- متعلمین کیلئے اپنی ضروریات پوری کرنے کیلئے خود محنت مزدوری کرنا، اور مختلف حرفتوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا اور پسندیدہ قرار پایا۔
- تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کیلئے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اوّلین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے

والے جملہ معارف کا ہے۔(خورشید احمد، پروفیسر 1991ء ص 26)

ادوارِ مابعد

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں یہ بنیاد پڑی اور ان ہی خطوط پر بعد میں ارتقاء ہوا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئیں۔ ہر جگہ حلقہ ہائے درس قرآن وحدیث قائم ہوئے۔ ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقے بنے اور ایک ایک حلقے میں ہزاروں طلبہ شریک ہونے لگے۔ جو اساتذہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے لیکن جو ضرورت مند تھے ان کی کفالت بیت المال کرتا۔ خلفائے راشدین نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر فرمائے اور ہر مسجد ایک مکتب اور ہر میدان ایک تعلیم گاہ بن گیا۔ پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا یہی نظام رائج تھا۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام ایسا مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے 5لاکھ علماء کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر سپرنگر (Springer) نے "الاصابہ فی تمییز الصحابہ" کے 1886ء کے ایڈیشن کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> **The glory of the literature of Muhammadans is its literary biography. There is no nation nor has been any which like them has during the 12 centries recorded the life of every man of letters. If the biographical records of the musalmans are collected, we should probably have acounts of the lives of half a million of distinguished persons.**

یعنی کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری اور نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت پانچ لاکھ مسلمانوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ (سپرنگر 1856ء ص 189)

اس زمانے کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حیثیت مساجد ہی کو حاصل تھی۔ اور مساجد کے فنِ تعمیر پر ان کے اس تعلیمی رول کا خاصا اثر پڑتا ہے۔ تینوں سمتوں میں دالانوں کا ہونا اور بڑی تعداد میں حجروں کی موجودگی اس کا ثبوت ہیں۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو قابل ذکر اور آج بھی موجود ہیں وہ تیونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامع ازہر ہیں۔ مساجد کے علاوہ خانقاہیں، علماء کے مکانات اور کھلے میدان بھی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہر علاقے میں لاکھوں طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ (خورشید احمد، پروفیسر 1991ء ص 27)

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ باقاعدہ مدارس بھی قائم ہوئے اور بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور مرتبہ نصاب تعلیم وغیرہ تھے۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنا

پایہ تخت غزنی میں 410ھ (بمطابق 1019ء) میں قائم کیا۔ بقول محمد قاسم فرشتہ مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، اس کے کتب خانے کو نادرالوجود کتب سے آراستہ کیا اور مسجد و مدرسے کے اخراجات کیلئے بہت سے دیہات وقف کئے۔ محمود غزنوی نے اپنی پوری مملکت میں بے شمار مدرسے قائم کئے اور اس کے زیر اثر دوسرے اُمراء اور ارکان دولت نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفریں اقدام اُس نے کیا اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ (محمد قاسم فرشتہ (س ن) ص 123)

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی 485ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمین اور امام غزالی جیسے صدر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔ (سعید اختر، پروفیسر 1991ء ص 45)۔ اس کے بعد مدارس کی ایک رو چل پڑی اور ساری اسلامی قلمرو میں ان کا جال بچھ گیا۔ ان میں ایسے ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے۔ اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی سی تھی۔ ان تمام مدارس میں وہی اصول کارفرما تھے جن کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں۔ مفت عوامی تعلیم کا یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی نظیر کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔ (احمد شلبی، ڈاکٹر 2004ء ص 58-60)

المختصر مسلمانوں کی تاریخ میں تعلیم معاشرہ کی ایک ایسی آزادانہ سرگرمی رہی ہے جو کاملاً اہل علم کے ہاتھوں میں رہی۔ معاشرہ نے اپنے وسائل سے خصوصاً اوقاف کے منظم ادارہ کے ذریعے ایسے ہمہ گیر تعلیمی نظام قائم رکھے جن کی مثال دوسری تہذیبوں میں نہیں ملتی۔ وسائل کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ طالب علم کی نہ صرف تعلیمی بلکہ تمام ضروریات کا کفیل یہ نظام ہوتا تھا۔ (مسلم سجاد 1992ء ص 159)

4.9 امتحانات و جائزہ

امتحان ایک ایسا عمل ہے جس سے معلوم کیا جاتا ہے کہ طالب علم نے مقررہ عرصہ میں تعلیمی مقاصد کس حد تک حاصل کئے۔ وہ علم، رویے، کردار سازی اور مہارتوں کے میدان میں کس حد تک آگے بڑھا ہے (محمد اقبال، چوہدری ڈاکٹر 1997ء ص 581)۔ تعلیمی عمل کے نتائج کا جائزہ لینے کیلئے جو نظام وضع کیا جاتا ہے اسے نظام امتحان یا جائزہ کہا جاتا ہے۔ یہ تعلیمی درجے کا تکمیلی مرحلہ ہوتا ہے۔ انسان کوئی سا بھی کام کرے اس کی تکمیل کے بعد وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کام سے جو نتائج وہ حاصل کرنا چاہتا تھا وہ حاصل ہوئے کہ نہیں؟ پورے حاصل ہوئے یا ادھورے؟ اس سلسلے میں اس نے

جواقدامات کئے وہ موزوں تھے یا ناموزوں اورآیا ان سے زیادہ موزوں اقدامات ہوسکتے تھے یا نہیں؟اس سے کہاں کہاں اور کیا کیا غلطیاں سرزد ہوئیں؟ان غلطیوں سے نتائج پر کیا اثر پڑا؟ان غلطیوں سے کس طرح بچا جاسکتا تھا؟جب وہ یہ سب کچھ جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ حقیقتاً اپنے عمل،اس کے محرکات اور اقدامات کا جائزہ لیتا ہے۔اس جائزے کے نتیجے میں اس کی ذہنی و عقلی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے۔وہ تجربہ کار بنتا ہے اور اپنے آئندہ کاموں کی انجام دہی کی صلاحیت کو بہتر بنالیتا ہے۔(عبدالرشید ڈاکٹر 1995ء ص 50)

اسلامی تعلیم میں "جائزہ و معیارات" کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی لکھتے ہیں کہ:

- اسلامی حکمت تعلیم میں جہاں تعلیم کا تصور وسیع ہے اسی طرح تعلیمی معیار کا تصور بھی وسیع ہے۔یعنی معیار کی جانچ کرتے ہوئے طالب علم کی تعلیمی استعداد ہی نہیں بلکہ اس کی شخصیت و کردار کو بھی دیکھا جاتا ہے۔
- اسلامی نظام تعلیم میں دوران تعلیم طلبہ کے اخلاق و کردار کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔تعلیمی معیار کو جانچنے کیلئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے آیا ضروری معلومات کے ساتھ ساتھ طلبہ میں اسلامی طرز فکر،اسلامی زاویہ نگاہ،اور اسلامی کردار بھی پیدا ہوا ہے یا نہیں۔چنانچہ طالب علم کے علمی معیار کے برتر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مضمون میں کامل استعداد رکھتا ہو،بلکہ اخلاق و کردار میں بھی مثالی ہو۔
- مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کے حوالے سے ہر چند کہ داخلی طرز امتحان کو اہمیت دی گئی ہے لیکن امتحانات کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے مقاصد کی تکمیل کس حد تک ہوئی۔چنانچہ اسلامی تعلیم کے مقاصد کی روشنی میں چاہے نظام امتحان داخلی (Internal) ہو یا خارجی (External) یا دونوں کا امتزاج ہو،اس کیلئے جہاں طریق امتحان کا موثر ہونا ضروری ہے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس نظام کو چلانے والے اساتذہ اور منتظمین بھی قابل،دیانتدار اور امین ہوں نیز اس نہج پر ان کی تربیت بھی ہوئی ہو۔
- نظام امتحان کے سلسلے میں تحقیقات سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے تا کہ جانچ پرکھ کے موثر معیارات تشکیل پاسکیں۔(مشتاق الرحمٰن،صدیقی ڈاکٹر 1998ء ص 153)

جائزے کی اسلامی ماہیت

کسی بھی نظام تعلیم میں جائزہ کو کلیدی اہمیت ہوتی ہے۔اسلام میں تدارک اور توازن (Check & Balance) پر کافی زور دیا ہے۔اسلامی تناظر میں جائزہ "احتساب" کے ہم معنی ہیں۔جائزے کا مطلب ہے کہ کسی طے شدہ پروگرام کے تحت فیصلہ دینا۔جائزے کا قرآنی تصور توازن،انصاف،فرض اور اعتماد پر مبنی ہے۔جائزے کا مقصد اشیاء کی حقیقی نوعیت جاننا ہے جائزے کے دوران ہم اشیاء کی صحیح قدر کا اندازہ لگاتے ہیں۔ان کے اچھے یا برے ہونے کا پتہ لگاتے ہیں۔تاہم جائزے کیلئے یہ ضروری ہے کہ متعلقہ مواد فراہم ہو(شاہد،ایس ایم 2004ء ص 508)۔جائزے کی ماہیت کو مندرجہ ذیل طریقے سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔

- کسی فرد کا جائزہ و تخمین اس کی چند سرگرمیوں یا عمل تک محدود نہیں ہے بلکہ فرد کی تمام سرگرمیوں پر محیط ہے۔اسلامی جائزہ اس نظریے کو قبول نہیں کرتا کہ انعام یا سزا کیلئے فیصلے میں فرد کی مخصوص سرگرمیوں کو مدِ نظر رکھا جائے۔
- اسلام میں عزم، یقین و عمل کے جائزے کی اہمیت ہے۔یہ محض علم ہی کو اہم نہیں سمجھتا جب تک کہ اس کے مطابق عمل نہ ہو۔ارشاد ربانی ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۔ترجمہ: اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، جان و مال کے نقصانات اور پھلوں کی کمی سے اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیجئے (البقرۃ:155)۔ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ۔ترجمہ: کیا تم سمجھتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل کردیے جاؤ گے حالانکہ تم پر اس قسم کے حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلوں پر گزرے تھے (البقرۃ:214)۔
- جائزے کو ٹھوس شہادتوں کی بنیاد پر مکمل کیا جاتا ہے۔درست فیصلہ کرنے کیلئے حقائق جاننے کے کئی طریقے ہیں۔ اعمال کا پورا پورا ریکارڈ رکھا جاتا اور پھر فرد کے حوالے کردیا جاتا ہے تا کہ وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکے۔اس سلسلے میں قرآن پاک کہتا ہے: حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ترجمہ: بالکل جہنم کے پاس آجائیں گے ان پر ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے اعمال کی گواہی دیں گی (حٰم السجدۃ:20)۔پھر سورۃ الکہف میں فرمان باری تعالیٰ ہے: وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۔ترجمہ: اور نامہ اعمال سامنے رکھ دیے جائیں گے پس تو دیکھے گا کہ گنہگار اس کی تحریر سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے ہائے ہماری خرابی یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹی یا بڑی بات بغیر گھیرے کے نہیں چھوڑی اور جو کچھ انہوں نے کیا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرے گا (الکہف: 49)۔اس کے بعد سورۃ قٓ میں فرمایا: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۔ إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۔ترجمہ: البتہ ہم نے بنایا انسان کو اور ہم جانتے ہیں جو باتیں آتی رہتی ہیں اس کے جی میں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں۔جب دو (فرشتے) حساب لیتے جاتے ہیں دائیں اور بائیں بیٹھے ہوئے۔(قٓ:16-17)
- اسلام نے نیکیوں کے لئے زیادہ انعام مقرر کیا ہے۔قرآن پاک میں ہے کہ: مَن جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۔ترجمہ: جو کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو اسے دس گنا زیادہ اجر ملے گا لیکن جو ایک برائی کرتا ہے تو اس کے حساب میں ایک ہی شمار کی جائے گی۔اور

ان سے زیادتی نہیں کی جائیگی ۔(الانعام:160)

- اسلام اس وقت تک کسی کی کاروائی کا جائزہ نہیں لیتا جب تک پہلے رہنمائی نہ فراہم کردے اور امتحان کا موقع نہ دے۔ملاحظہ ہو آیات سبحانی:یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَاۗءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا – ترجمہ:اے جن وانس کے گروہ! کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے جنھوں نے تمہیں میری (خدا) نشانیاں دکھائیں اور جنھوں نے تمہیں اس دن کے بارے میں خبر دار کیا (الانعام:131)۔ایک اور جگہ فرمان باری تعالٰی ہے:وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ہ – ترجمہ:بے شک ہم نے بہت سے جن وانس کو تخلیق کیا جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ان کے دل ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں،ان کی آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر بے شک وہ بے عقل ہیں۔(الاعراف:179)۔
- امتحان ہمیشہ فرد کی صلاحیت،طاقت کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ خالق کائنات کا ارشاد ہے:وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ہ –ترجمہ:وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے اور ہم کسی شخص پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے ۔یہی لوگ جنت میں رہنے والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(الاعراف:42)
- اسلام کامیاب اور ناکام لوگوں کی مزید درجہ بندی کرتا ہے۔اسی طرح جنت اور جہنم کے کئی درجات ہیں۔
- اسلام فرد کو اصلاح کیلئے مناسب وقت اور موقع فراہم کرتا ہے تاکہ کوئی بھی شکایت نہ کرسکے کہ اسے مناسب موقع نہیں دیا گیا۔

جائزے کا اسلامی نقطہ نظر

اس زمانے میں موجودہ زمانے کی طرح امتحانات رائج نہیں ہوئے تھے۔ابتدائی تعلیم میں آموختہ کا طریقہ رائج تھا۔اعلیٰ تعلیم میں بھی سالانہ امتحانات کا طریقہ رائج نہیں تھا بلکہ دوران درس کے سوالات و جوابات اور مذاکرے و مناظرے امتحان کا مقصد پورا کرتے تھے۔مختصراً یہ کہ اس زمانے میں امتحان کا وہ ڈراؤنا اور تعلیمی لحاظ سے تباہ کن تصور نہیں تھا جو موجودہ زمانہ میں طلبہ کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو قوت حافظہ پر سے قربان کردیتا ہے اور جس کے نزدیک آنے پر طلبہ کسی نہ کسی طرح بغیر سوچے سمجھے کچھ ضروری چیزیں یاد کرلیتے ہیں پھر بوقت امتحان انہیں زینت قرطاس بنا کر خود اتنے ہی کورے رہ جاتے ہیں جتنے امتحان سے چند ماہ پیشتر تھے۔(سعید احمد رفیق،پروفیسر 1982ء،ص 55)

آپ ﷺ اپنے بعض اصحاب کا امتحان بھی لیتے تھے۔آپ ﷺ ان کی علمی ذہانت کا اندازہ لگانے کے لئے کوئی

سوال کر لیتے ،اگر کوئی جواب دینے میں کامیاب ہو جاتا تو آپ ﷺ اسکی تعریف کرتے اور حوصلہ بڑھاتے بلکہ جواب دینے میں کامیاب ہو جانے پر بے پایاں محبت وشفقت کی وجہ سے اس کے سینے پر ہاتھ مارتے ۔ملاحظہ ہو حدیث قدسی: امام مسلم اپنی کتاب میں ابی کعبؓ (کنیت ابوالمنذر) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یا ابا المنذر ! اتی آیۃ من کتاب اللہ معک اعظم ؟ — ترجمہ: کتاب اللہ کی کون سی آیت تمہارے نزدیک بڑی ہے؟ ۔ابومنذر نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں ۔آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا ۔کون سی آیت؟ راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا میرے نزدیک اللّٰہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم سب سے بڑی ہے ۔اس پر آپ ﷺ نے راوی کے سینے پر تھپکی دی اور فرمایا: لیھنِك العلم -ترجمہ: تجھیں علم مبارک ہو ۔(مسلم ،الجامع الصحیح ،کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا، باب فضل سورۃ الکھف وآیۃ الکرسی ،ص 327،ح 1885)

حضور نبی اکرم ﷺ کے تعلیمی اسوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ تکمیل نصاب کی "سند تکمیل" بھی عطا فرماتے تھے ۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن حکیم کے چار بڑے معلّمین کو علم کی سند عطا کی ان میں عبداللہ بن مسعودؓ، ابی کعبؓ، سالم مولیٰ حذیفہؓ اور معاذ بن جبلؓ شامل تھے ۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو آنحضور ﷺ نے قرآن پاک کے علاوہ حدیث سکھانے اور احکامات استنباط کرنے کی اجازت بھی عطا فرمائی اس امر نے مابعد دور میں باقاعدہ روایت کی حیثیت اختیار کر لی ۔(غلام عابد خان 1978ء ص 78)

اسلامی نظام تعلیم میں "جائزہ" تدریس وتعلم کا ایک حصہ تھا ۔طلبہ محض امتحانات پاس کرنے کی خاطر تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اساتذہ امتحان کی نوعیت کے پیش نظر درس وتدریس کا کام کرتے تھے ۔تعلیم مقصود بالذات شے تھی جس کا مقصد فرد کی انفرادیت کی تکمیل تھا، کسی درجے کے پاس کرنے کیلئے عرصے اور عمر کی کوئی پابندی نہیں تھی ۔ایس ایم جعفر اس سادہ طریق کے بارے میں لکھتے ہیں: جو استاد پڑھاتا تھا، وہی جماعت کا امتحان بھی لیتا تھا اور کامیاب طلبہ کو اگلی منزل میں ترقی بھی دیتا تھا اور سرٹیفکیٹ کے علاوہ اچھے طلبہ کو ان کی قابلیت کے اعتبار سے وظائف ،انعامات اور تمغہ وغیرہ بھی دیے جاتے تھے ۔غرض یہ کہ امتحان کا جو طریقہ بھی اس وقت رائج تھا، وہ بہت سیدھا سادہ، نمائش کم اور کارآمد زیادہ تھا ۔(شاہد ،ایس ایم 2003ء ص 512)

- اسلام کے ابتدائی دور میں سند دینے کا رواج نہ تھا ۔طالب علم کو خود ہی یہ فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ آیا وہ کسی خاص فن میں کاملیت کے درجے پر پہنچ گیا ہے یا نہیں ۔نیز وہ اس خاص علم میں دوسروں کو پڑھانے کے قابل ہوا ہے یا نہیں ۔علم حدیث کے حوالے سے کچھ عرصہ بعد اسناد دینے کا رواج ہوا ۔احمد شلبی سند دینے کے آغاز پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں: کچھ عرصہ بعد احادیث نبوی ﷺ کی اہمیت کا لحاظ رکھتے ہوئے ،محدث شاگردوں کو سند دینے لگے تا کہ ان کے حوالے سے وہ حدیث بیان کر سکیں ۔بعد ازاں یہی عمل دیگر مضامین کے ساتھ کیا جانے لگا اور اس طرح ہر مدرس اپنے شاگردوں کو سند دینے لگا ۔(احمد شلبی ،ڈاکٹر 2004ء ص 145)

- حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ مبارکہ میں ہمیں امتحان اور پھر اجرائے سند (اجازہ) کی شہادت ملتی ہے۔اس امر نے مابعد دور میں باقاعدہ روایت کی حیثیت اختیار کرلی۔تحریری امتحانات کا رواج بعد کے لئے امتحانی سوالات میں معماتی انداز میں بڑا مقبول ہوا۔مختلف اساتذہ اپنے اپنے اختصاصی شعبہ میں ایسے معماتی سوالات کے سیٹ بڑی توجہ سے تیار کرتے تھے۔اعلیٰ مناصب کے لئے مخصوص قسم کی آزمائشوں کا رواج تھا۔شعر وادب میں آزمائش کا ایک انداز یہ تھا کہ ذولسانی طلبہ سے عربی عبارات اشعار، مادری زبان کی عبارات واشعار میں ترجمہ کرایا جاتا تھا۔ گرامر کے امتحانات عموماً مباحثہ کی شکل اختیار کرجاتے تھے اور یہ مباحثہ جلسہ عام میں ہوا کرتے تھے۔ (عبدالغفور، چودری 1992ء،ص 147-151)
- سند دینے کے دو انداز تھے۔ایک سماع یعنی شاگرد براہ راست ایک خاص کتاب استاد سے سنتا یا پڑھتا، امتحان دیتا اور کامیابی کی صورت میں سند حاصل کرتا۔دوسرا اجازہ یعنی کسی کتاب کو مصنف یا سند یافتہ سے براہ راست سنے اور پڑھے بغیر سند حاصل کرلی جاتی۔دور مابعد میں سند میں سماع اور اجازۃ دونوں کو شامل کرلیا گیا۔طالب علم جب ایک کتاب استاد سے سن لیتا تھا تو اسے اس کتاب کے پڑھانے کی بھی اجازت مل جاتی تھی۔اس کے بعد اس استاد کی دیگر کتابیں اور اس فن سے متعلق وممائل دوسروں کی کتابیں پڑھانے کی بھی اجازت دے دی جاتی تھی (عظیم آبادی، شمس الحق 1414ھ،ص 71)۔سماع کے ذریعے سے حاصل کردہ سند کا ایک نمونہ احمد شلبی کے حوالے سے دیا جارہا ہے۔یہ سند علی ابن محفوظ العلوی نے اپنے بیٹے اور شاگرد کو عطا کی:

میرا بیٹا صدیق ابن علی جو عالم ہے۔نیک نہاد ہے اور جوشیلا طالب علم ہے۔خدا اسے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان لوگوں کی صحبت سے بچائے جو موردِ عذاب الٰہی ہیں۔اس نے مجھ سے "دیوان عمرابن الفرید" بہ استثنائے اس نظم کے جو صق الازعن سے شروع ہوتی ہے، تمام وکمال پڑھا۔لہٰذا میں نے سند دی ہے کہ وہ اس کے پڑھنے پڑھانے کا مجاز ہے جیسے میں شیخ فخر الدین العراقی کی اجازت سے پڑھاتا ہوں۔اسی طرح احمد شلبی اجازۃ کا ایک نمونہ دیتے ہیں جو السخاوی نے اپنے شاگرد عبدالعزیز ابن عمر ابن محمد ابن فہد کو دیا: میں نے اسے سند عطا کی ہے اور اس کتاب کو پڑھانے کی اجازت دی ہے اور علاوہ ازیں میری دیگر تمام تصانیف کو اور ان کے اخراجات کو بھی پڑھا سکتا ہے (احمد شلبی، ڈاکٹر 2004ء،ص 147)۔کتابوں کی سند واجازۃ میں یہ ضروری تھا کہ شیخ اپنے شیوخ کے واسطوں سے اپنی قرأت وسماع کا سلسلہ اس کتاب کے مصنف تک پہنچائے، ورنہ وہ سند لائق اعتبار نہ سمجھی جاتی تھی۔ایسی سندیں آج بھی عربی مدرسوں میں رائج ہیں۔(ریاست علی، ندوی سید 2003ء،ص 159)

- چھوٹے بچوں کے مکاتب میں استاد عمر اور درجے کی مناسبت سے پڑھائی ہوئی چیزوں کا آموختہ شاگردوں سے روزانہ ہفتے میں ایک بار سنتا تھا۔جس سے اسے یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ بچے نے سبق کتنا اور کس حد تک یاد کرلیا

ہے؟اس درجے میں زیادہ تر طالب علم کی قوت حافظہ کا جائزہ لیا جاتا تھا۔اعلیٰ درجوں میں تعلیم کے دو درجے بنائے ہوئے تھے۔درجہ ضروری،جس سے فارغ ہونے پر اسے دانش مند کی سند ملتی تھی۔درجہ فضل جو طالب علم کو کسی علم کے مختصرات،متوسطات اور مطولات کی تکمیل کے بعد ملتا تھا۔اس میں تین قسم کی اسناد دی جاتی تھیں۔منطق اور حکمت کے ماہر کو فاضل کی،دینیات کے ماہر کو عالم کی اور علم وادب کے ماہر کو قابل کی سند ملتی تھی۔(سعید احمد رفیق،پروفیسر 1982ء،ص 57)

- اعلیٰ تعلیم میں باقاعدہ امتحانات نہیں ہوتے تھے بلکہ درس کے دوران سوال وجواب،بحث ومباحثہ،مذاکرہ ومناظرہ کی فضا قائم ہو جاتی تھی اور استاد کو یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کون سا شاگرد کتنی اہلیت اور مہارت حاصل کر چکا ہے؟ اسلامی دنیا کے عام طریق امتحان میں:استاد چند ایک علماء کے ساتھ طالب علم پر سوال کرتا تھا اور جو موضوعات نصابی کتب میں ہوتے تھے،ان کو ایک ایک کر کے زیر بحث لاتا تھا۔طالب علم کا فرض اولین تھا کہ وہ بحث کے دوران میں اپنے نقطۂ نظر سے حاضرین کو آگاہ کرے اور اعتراضات کا تسلی بخش جواب دے۔امتحان کے خاتمے پر استاد نصابی کتب کی پشت پر اپنا ایک اجازت نامہ تحریر کرتا تھا جس میں اس بات کی سند ہوتی تھی کہ طالب علم نے اس کتاب کو مکمل اور تفصیلاً پڑھا ہے۔آخر میں استاد اور اس کے علماء ساتھی اپنی اپنی مہریں ثبت کرتے تھے۔
- اجازۃ کی ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ وہ شخص جسے اجازت دی جائے،قابل اعتماد عالم ہو اور جس کتاب کی اجازت دی جائے،وہ ایسی ہو جو آسانی سے پڑھی جا سکے اور صحیح لکھی ہوئی ہو۔سند دینے کے بارے میں احمد شلبی لکھتے ہیں:یہ سند اسی نصاب کے متعلق ہوتی تھی،جو استاد کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچتا تھا۔شاگرد جس کتاب کی تکمیل کر لیتا تھا،اس کے ابتدائی سادہ ورق پر سند لکھ دی جاتی تھی۔(احمد شلبی،ڈاکٹر 2004ء،ص 147)
- مشکوٰۃ المصابیح کا مترجم رابسن مسلمانوں میں اسناد کی روایت کے بارے میں لکھتا ہے:

In the gospels as they stand we don't have the various elements of the sources seprated out for us as we go through the "Isnads" of muslim traditions where at least apparently, the transmission is traced back to the source. (Robson's James 1956, P:449-465)

اسلام کے تصور جائزہ کی نمایاں خصوصیات

اسلام کے تصور جائزہ کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

- ہر فرد کا جائزہ اس کے اعمال کی محدود نمونہ بندی پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس میں انسان سے سرزد ہونے والے تمام اعمال کو شامل کیا جاتا ہے۔اسلام کا تصور جائزہ اس نظریے کو قبول نہیں کرتا کہ سزا اور جزا کا فیصلہ چند منتخب واقعات

کی بنیاد پر کردیا جائے۔قرآن مجید کا ارشاد ہے: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ط وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ط وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ہ ۔ترجمہ: قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک ترازو رکھ دیں گے۔پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔جس کا رائی کے دانے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہوگا،وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کیلئے ہم کافی ہیں (الانبیاء:47)۔نیز فرمایا: فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ہ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ نِ الْحَقُّ ج فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ہ ۔ترجمہ: پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگزشت ان کے آگے پیش کر دیں گے،آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے اور وزن اس روز عین حق ہوگا۔جن کے پلڑے بھاری ہوں گے،وہی فلاح پائیں گے۔(الاعراف:7-8)

- نیکی اور بدی کا حساب عددی ہوگا لہٰذا یہ دیکھنے کیلئے کہ نیکی کا پلہ بھاری رہا یا بدی کا صنفی جائزے (Qualitative Evaluation) کی بجائے عددی جائزے (Quantitative Evaluation) کو بنیاد بنایا جاتا ہے یعنی نیکیوں اور گناہوں کا باقاعدہ وزن مقرر کر کے شمار کیا جاتا ہے۔قرآن مجید میں صاف صاف بیان کردیا گیا ہے: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ہ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۔ترجمہ: ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کیلئے نکالیں گے،جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائے گا۔پڑھ اپنا نامہ اعمال،آج اپنا حساب لگانے کیلئے تو خود ہی کافی ہے۔(بنی اسرآءیل :13-14)
- اسلام کا تصور جائزہ محض تحریری امتحان پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ ادارے،ایمان اور عمل سبھی کے جائزے کو ضروری قرار دیتا ہے۔وہ نظری علم کی موجودگی کو ہی کامیابی کیلئے کافی نہیں سمجھتا۔چنانچہ ارشاد ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ہ ۔ترجمہ: ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور یہ دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں (محمد: 31)۔سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوتا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ہ ۔ ترجمہ: اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے دشمن کے ڈر سے،بھوک پیاس سے،مال و جان کے نقصان سے اور پھلوں کی کمی سے۔(البقرۃ:155)

مزید ارشاد ہوتا ہے: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۔ترجمہ: پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے (البقرۃ:214)۔ایک اور جگہ ارشاد ہے: لَتُبْلَوُنَّ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۔ترجمہ: مسلمانوں،تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی۔(آل عمران:186)

- جائزہ/احتساب ٹھوس شہادتوں کی بنیاد پر مکمل کیا جاتا ہے۔اتمام حجت کیلئے شہادتوں کے تہ در تہ نظام رکھے جاتے ہیں۔تمام اعمال کا تحریری ریکارڈ محفوظ کیا جاتا ہےاورنامہ اعمال انسان کے ذاتی مشاہدے اوراعتراض کیلئےان کے ہاتھ میں تھمایا جاتا ہے۔قرآن مجید میں یہ بات صاف صاف کہی گئی ہے:وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَآءُ اللّٰهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ ہ حَتّٰى إِذَا مَاجَآءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُونَ ۔ترجمہ:اور جس دن اللہ کے دشمن دوزخ کی طرف لائے جائیں گےاوران سب کو جمع کر دیا جائے گا۔یہاں تک کہ جب بالکل جہنم کے پاس آ جائیں گےتو ان پر ان کے کان اوران کی آنکھیں اوران کی کھالیں ان کے اعمال کی گواہی دیں گی(حم السجدہ:19-20)۔پھر ان کو جواب بھی بتادیا گیا ہے: قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰى أَنْفُسِنَا ۔ترجمہ:وہ کہیں گے ہاں!ہم اپنے خلاف گواہی خود دیتے ہیں۔(الانعام:130)
- اسلام نے نیکیوں کے لئے اضافی امر کا تصور پیش کیا ہے،جوانسانی فطرت کے زیادہ قریب ہے۔قرآن مجید کا ارشاد ہے::مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ہ ۔ترجمہ:جوکوئی ایک نیکی کرتا ہےتو اسے دس گنا زیادہ اجر ملے گا لیکن جو ایک برائی کرتا ہےتو اس کے حساب میں ایک ہی شمار کی جائے گی۔اوران سے زیادتی نہیں کی جائیگی(الانعام:160)۔مسلم ماہرین کے لئے یہ ایک چیلنج ہے کہ وہ تعلیمی جائزوں میں بھی اضافی اجر کی گنجائش پیدا کریں۔ہوسکتا اسکے ذریعے سے نیکی کی قوتوں کی بہتر حوصلہ افزائی ہو۔
- اسلام سخت اورنرم حساب کا بھی تصور پیش کرتا ہےیعنی جائزے میں بھی احسان کی گنجائش موجود ہے۔ہوسکتا ہے نیکی کے اضافی اجر سے یہ صورت حال خودبخود پیدا ہوجاتی ہو۔جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:أُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۔ترجمہ:یہ وہ لوگ ہیں جن سے بری طرح حساب لیا جائے گا۔(الرعد:18)،(حاشیہ فہم القرآن صفحہ 454)اسلام واضح ہدایات اورعمل کی آزادی دیے بغیر آزمائش کا قائل نہیں ہے۔آزمائش انسان کی بالقوہ صلاحیتوں سے زیادہ نہیں دی جاتی۔جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۔ترجمہ:اور ہم ہر ایک کو اس کی استطاعت ہی کے مطابق ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔(الاعراف:42)
- اسلام کامیاب اورناکام ہونے والے افراد کی مزید درجہ بندی کا قائل ہے۔چنانچہ جنت اورجہنم میں مزید درجے رکھے گئے ہیں۔
- اصلاح احوال کیلئے کافی وقت دیا جاتا ہے تاکہ وقت کی تنگی کا جواز نہ پیدا کیا جاسکے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:وَلٰكِنْ يُؤَخِّرُهُمْ إِلٰى أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ہ ۔ترجمہ:مگر وہ انہیں ایک مقررہ وقت تک کیلئے مہلت دے رہا ہے۔پھر جب ان کا وقت آن پورا ہوگا اللہ اپنے بندوں کو دیکھ لے گا۔(فاطر:45)

باب پنجم

تحریک دیوبند

دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر اثر وجود میں آنے والے دینی مدارس کا نظام موجودہ حالات کی روشنی میں دو زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔اول یہ نظام مجاہدین کی "نرسری" ہے، دوم یہ "دہشت گردوں" کی تربیت گاہ ہے۔اس نئی صورتِ حال کا مآخذ سیاسی ہے۔سو یا ڈیڑھ سو سال قبل ان اداروں کے علماء کو "بسم اللہ کے گنبد میں بند" ایسے "کٹھ ملا" قرار دیا جاتا رہا جو دورِ جدید کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے نااہل تھے۔ذیل میں اس نظام کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے تا کہ یہ نظام اور اس سے پیدا ہونے والی تحریک کو درست سمت میں دیکھا جا سکے۔

5.1 تاریخی پس منظر

1912ء میں عالم اسلام کے ممتاز عالم سیّد رشید رضا مصری نے اپنے دورۂ ہندوستان کے تاثرات کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے علماء کو "غیرت و اخلاص" اور "جدید علمی رجحان" کا علمبردار قرار دیا۔ 1867ء میں بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہونے والا یہ چھوٹا سا مدرسہ "ازہر ہند" بن چکا تھا۔اس کی بنیاد ایسے حالات میں رکھی گئی جبکہ اسلامی سلطنت کا چراغ گُل ہو چکا تھا اور ہزاروں میل دور سمندر پار سے آئے ہوئے انگریز غاصبوں نے پورے ملک پر تسلط قائم کر کے جابرانہ انداز میں کام شروع کر دیا تھا۔(عبدالرشید ارشد 1980ء،ص 9)

انگریزی تسلط نے برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ نا صرف ان کی معاشرت و معیشت کو تہ و بالا کیا بلکہ ان کا تعلیمی نظام بھی تلپٹ کر دیا (محمد شفیع،مولانا مفتی 1976ء،ص 143)۔جو متبادل نظام انگریزوں نے نافذ کیا،مسلمان اسے قبول کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔خود انگریز ماہرین نے مسلمانوں کو ان کے اس رویے میں حق بجانب قرار دیا۔حکومت ہند کے سیکرٹری امور داخلہ مسٹر بیلی اعتراف کرتے ہیں: اس میں قطعاً کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسلمان اس طریقہ تعلیم سے احتراز کرتے ہیں جو اگر چہ فی نفسہٖ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر اُن کے ملّی رجحانات کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا۔درحقیقت اس سے اُن کے ضروری سے ضروری تقاضے بھی پُورے نہیں ہوتے یہ طرزِ تعلیم لازماً اُن کے مفاد کے خلاف اور اُن کی ملّی روایات کے منافی ہے۔(بحوالہ عبدالحمید صدیقی 1965ء،ص 31)

مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے تھے۔انہوں نے تھانہ بھون اور شاملی کے علاقوں میں

جنگ آزادی میں بھر پور شرکت کی تھی (مقبول جہانگیر (س ن) ص 32) ۔دراصل علماء نے انگریزی تسلط کا خطرہ بہت جلد بھانپ لیا تھا۔چنانچہ 1803ء میں جب انگریزوں نے ملک کے اکثر حصوں پر قبضہ کرلیا تو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے برصغیر کو دارالحرب قرار دیا۔شاہ عبدالعزیز انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط کو روکنے کیلئے ابھی ابتدائی مرحلے کی تکمیل ہی کر پائے تھے کہ انتقال ہو گیا۔پھر اس تحریک آزادی کو سیّد احمد شہید اور شاہ اسماعیل نے آگے بڑھایا اور آزادیٔ وطن کیلئے خاندان ولی اللہ کے یہ چشم و چراغ 1831ء میں بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے۔(شمس القمر قاسمی 1973ء، ص 121)

سیاست کے میدان میں شکست کے بعد مسلمان اہل فکر نے تعلیم کے میدان میں دفاعی جدوجہد شروع کی۔ دارالعلوم دیوبند اس جدوجہد کی پہلی کوشش تھی ۔لارڈ میکالے نے تعلیم کی اسکیم پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے لحاظ سے انگلستانی (شبیر، بخاری سیّد 1986ء، ص 74)۔یہ آواز ایک فاتح اور برسر اقتدار قوم کی تھی۔اس نے اس آواز کی حقیقت جتانے کیلئے تعلیم کو ہی ذریعہ بنایا تھا۔جو ایک انقلاب آفرین اور کامیاب حربہ تھا۔یہ خطرناک انقلاب دیکھ کر مولانا نانوتوی نے دارالعلوم قائم کیا اور نعرہ لگایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور دل و دماغ سے مسلمان ہوں۔جن میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جذبات پیدا ہوں اور دین و سیاست کے اعتبار سے ان میں اسلامی شعور زندہ ہو۔(محمد طیب 1972ء، ص 18)

1857ء کے بعد جب انگریزی حکومت کی طرف سے ہندوستانی مسلمانوں، ان کی تہذیب و ثقافت اور اسلامی علوم و فنون پر حملے شروع ہوئے تو مولانا محمد قاسم نانوتوی کی سربراہی میں مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن اور حاجی محمد عابد نے انگریز اور عیسائیت کی یلغار روکنے اور اسلامی شعور بیدار کرنے کے لئے ایک ایسے دینی مدرسہ کے قیام کیلئے تحریک چلائی جس کا دارومدار مسلمانوں کے چندے اور تعاون پر تھا۔چنانچہ حاجی محمد عابد نے 2 ذی القعدہ 1282ھ بمطابق 1866ء کو ایک سفید رومال کی جھولی بنائی اور اپنے پاس سے اس میں تین روپے ڈال کر چندہ اکٹھا کرنا شروع کیا اور 15 محرم الحرام 1283ھ بمطابق 30 مئی 1866ء کو دیوبند میں ہندوستان کے اس سب سے بڑے علمی و دینی ادارے کی بنیاد مولانا قاسم نانوتوی کے ہاتھوں رکھی گئی (عقیدت اللہ' قاسمی 1999ء، ص 2)۔یوں دیوبند کا مدرسہ 30 مئی 1867ء کو قائم ہوا۔مولانا نانوتوی، مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔مولانا مملوک ایک طرف شاہ ولی اللہ کے مکتب فکر کے پروردہ تھے اور دوسری طرف سیّد احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے باقی ماندہ لوگوں میں سے تھے۔مولانا محمد یعقوب اس مدرسے کے پہلے سربراہ تھے۔شیخ الہند مولانا محمود حسن اس کے پہلے طالب علم تھے۔(خورشید احمد (س ن) ص 99)

1857ء کے ہنگامے اور اس کے بعد انگریزوں کی معاندانہ پالیسی کے باعث مسلمانوں کے تعلیمی ادارے تباہ

ہو گئے تھے۔اس صورتحال میں علمائے کرام کے ایک طبقے میں علوم اسلامی کے احیاء کی تحریک پیدا ہوئی۔چنانچہ کچھ تو پرانے مدرسے زندہ اور کچھ نئے قائم کئے گئے۔نئے مدرسوں میں دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور خاص طور پر مشہور ہیں۔ سوئے اتفاق دارالعلوم دیو بند حکومت کے زیرِ عتاب رہا کیونکہ حکومت کا خیال تھا کہ اس دارالعلوم کے منتظمین اور متوسلین 1857ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے مخالف تھے اور اب بھی احیائے اسلام کیلئے کوشاں ہیں۔(طفیل احمد منگلوری 1945ء ص 175)

دارالعلوم دیوبند کا قیام حضرت شاہ ولی اللہ کی انقلابی فکر کے سلسلے ہی کا ایک اقدام تھا جو حالات و مصالح وقت کے پیش نظر اُٹھایا گیا تھا۔1857ء تک اس تحریک کے قائدین کا خیال تھا کہ وہ طاقت کے بل پر مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔لیکن 1857ء کی ناکامی کے بعد انہوں نے سمجھ لیا کہ کسی انقلابی تحریک کیلئے حالات سازگار نہیں بلکہ وقت کی سب سے اہم ضرورت فکر کے تحفظ کی ہے (محمد نسیم عثمانی 1976ء ص 483)۔گویا ایک صدی کی جدوجہد کے بعد تحریک پھر اسی مقام پر آ گئی تھی جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا اور اب پھر اس کے سامنے فکر کے تحفظ و تدوین، اشاعت، جماعت کی تیاری اور عملی میدان میں مصروف سعی وجہد ہونے کے مراحل تھے۔پہلے مرحلے کا آغاز دارالعلوم دیو بند کے قیام سے ہوتا ہے۔اس مرحلے کے رہنما وہی حضرات تھے جو گزشتہ دور میں آخری مرحلے کے قافلہ سالار تھے۔یہ اصحاب مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے دیگر رفقائے کرام تھے۔(محمد نسیم عثمانی 1973ء ص 69)

دارالعلوم دیوبند کے محرکین اور مؤسلین ولی اللّٰہی خاندان کی اس تربیت یافتہ جماعت میں شامل تھے جو شاہ عبدالغنی مجددی یا حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بیعت تھی۔شاہ عبدالغنی نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیئے جانے پر ہجرت کی اور حاجی صاحب نے جنگ آزادی 1857ء میں عملی حصہ لیا اور پھر مکہ ہجرت کر گئے۔ان علماء میں اجمیر کالج میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی، آگرہ کالج میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اور بریلی کالج میں مولانا محمد احسن اور مولانا محمد منیر علوم شرقی کے اساتذہ تھے۔اس طرح مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمان سب انسپکٹر مدارس تھے۔مولانا ذوالفقار علی عربی کے زبردست ادیب اور مولانا محمود حسن کے والد تھے۔اسی طرح مولانا فضل الرحمان مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد تھے۔مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی علوم اسلامیہ کی مختلف مقامات پر خدمت انجام دے رہے تھے۔ظاہر ہے کہ درس و تدریس اور تعلم و تعلیم سے اس جماعت کا پورا تعلق تھا۔(محمد ایوب، قادری 1976ء ص 490)

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے دارالعلوم کے سلسلے میں اس دور کے مخلص علماء سے تبادلہ خیالات کو بجا طور سے تبادلۂ الہامات کا نام دیا ہے کیونکہ اس میں اپنے وقت کے بزرگوں اور ولیوں کی قلبی واردات اور کشف والہام کی واضح شہادت ملتی ہے۔بہر حال اس تحریک کے پیچھے ایک عالمگیر اصلاح کا جذبہ بھی موجزن تھا۔یہ محض کوئی ہنگامی جذبہ نہیں تھا۔ انگریز جو لادینی نظام پورے ملک پر مسلط کرنے کی فکر میں تھا یہ تحریک اسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کیلئے 15 محرم 1283ھ کو جمعرات کے روز دارالعلوم دیوبند کے قیام کی شکل میں شروع ہوئی۔(محمد طیب 1972ء ص 20-21)

دارالعلوم دیوبند کے محرکین اساسی طور سے تحریک مجاہدین کے وہ سپاہی تھے جنہوں نے بالاکوٹ میں ہزیمت کے بعد 1857ء کے موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے شاملی کے محاذ پر فرنگی کافروں کے خلاف جہاد کیا۔اگر چہ اس وقت انگریزوں کے خلاف محاذ آراء لشکر کا مرکزِ اطاعت بہادر شاہ ظفر تھے لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی اوران کی جماعت کو یقین تھا کہ مغل شہنشاہ میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا۔چنانچہ انہوں نے اپنا نظم ونسق بالکل الگ رکھا جس کے تحت حاجی امداداللہ مہاجر مکی امام یعنی بیعت جہاد کے مرکز قرار پائے ۔حافظ محمد ضامن کو علمدار لشکر مقرر کیا گیا،مولانا رشید احمد گنگوہی کو خطابت کے ذریعے مجاہدین میں جوش واستقلال پیدا کرنے کی خدمت سپرد ہوئی اور مولانا نانوتوی امیر لشکر قرار پائے ۔(حبیب الرحمٰن، مولانا 1981ء،ص 7)

مولانا محمود مدرسہ دیوبند کا تعلیمی منصوبہ جاری کرنے کیلئے بحیثیت مدرس میرٹھ سے دیوبند تشریف لائے ۔اپنے سامنے ایک شاگرد کو(کہ اُن کا نام بھی محمود ہی تھا اور آخر کار شیخ الہند مولانا محمود حسن کے لقب سے مشہور ہوئے)بٹھا کر کسی عمارت میں نہیں جو مدرسہ کے نام سے بنائی گئی ہو بلکہ چھتہ کی مسجد کے کھلے صحن میں ایک انار کے درخت کے سایہ میں بیٹھ کر اس مشہورِ عالم درسگاہ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح کر دیا۔نہ کوئی مظاہرہ تھا نہ شہرت پسندی کا جذبہ۔نہ نام ونمود کی تڑپ تھی اور نہ پوسٹر واشتہارات کی بھرمار۔بس ایک شاگرد اور ایک استاد۔شاگرد بھی محمود اور استاد بھی محمود، دو نفر سے یہ لاکھوں کے ایمانوں کی حفاظت کی اسکیم معرض وجود میں آ گئی۔یوں جامعیت واعتدال اور دین ودانش کے ملے جُلے اندازوں کے ساتھ اس درسگاہ میں تعلیم وتربیت کا خط مستقیم کھینچا گیا۔(محمد طیب، قاری 1991ء،ص 175)

انگریزوں نے برصغیر پر تسلط کے بعد مسلمانوں کو تعذیب کا نشانہ بنایا۔جنگ آزادی 1857ء میں تقریباً سات ہزار علماء کو تہہ تیغ کر دیا گیا تھا(کمال الدین حیدر 1907ء،ص 30)۔حکومتی رویے کے ردِ عمل کے طور پر اہل علم کے بڑے طبقے کا خیال یہ تھا کہ حکومتِ وقت کی معاندانہ کاروائیوں کے پیش نظر اس سے لاتعلقی کا رویہ اختیار کیا جائے اور نوخیز نسلوں کی اسلامی تربیت کے کام کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے ۔اس کے لئے قدیم طرز کے مدارس قائم کئے جائیں اور اسلامی روایت کا تسلسل باقی رکھا جائے ۔علمی ورثہ اسلاف کو ہر قیمت پر محفوظ کر لیا جائے۔علماء کا تسلسل باقی رہے اس لیے کہ وہ مسلمان معاشرہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں ۔اس نقطۂ نظر کے حامل علماء کے سرخیل مولانا عنایت احمد کاکوروی تھے ۔انہوں نے انڈمان کی قید سے رہائی کے فوراً بعد 1277ھ بمطابق 1860ء میں نوآباد شہر کانپور میں سب سے پہلے ایک مدرسہ فیضِ عام کی بنیاد ڈالی ۔مولانا کی کوششوں سے اس مدرسہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔بڑے بڑے نامی گرامی علماء یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے لیکن اس مکتبِ فکر کے مشہور عوام نمائندے مولانا محمد قاسم نانوتوی ہیں جنہوں نے ایک غیر معروف قصبہ دیوبند میں اس مدرسہ کا افتتاح کیا۔حکومتِ وقت سے لاتعلقی اس مدرسہ کا بنیادی اصول قرار پایا۔تمام تر انحصار عوام کے تعاون اور چندے پر رکھا گیا۔راہ میں پیدا ہونے والی مشکلات کو مدرسہ کے حق میں فال نیک سمجھا گیا۔
(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ب،ص 253)

1857ء کے بعد مسلمانوں کے اقتدار شان وشکوہ اور جاہ وجلال کے آفتاب کو گہن لگ چکا تھا۔ایک دین باقی رہ گیا تھا اس پر بھی یہ خطرناک یلغار مسلسل جاری تھی۔ایسے نازک وقت میں ہوش وحواس کا بجار ہنا ہی بذات خود بڑا کمال تھا۔ حاجی امداداللہ مہاجر مکی، مولانا قاسم نانوتوی اور آپ کے احباب وانصاران حالات کی وجہ سے سب سے زیادہ دلگیر تھے اور باہم مشورے کر رہے تھے۔ان اللہ والوں کی التجاء اور دعائے نیم شبی نے کام کیا اور رب کائنات نے ان کے دلوں میں ڈال دیا کہ موجودہ حالات میں مدارس دینیہ کے قیام سے ہی یورپ سے آئے ہوئے طوفانی الحاد، دہریت اور عیسائیت کے طوفان پر بند باندھا جاسکتا ہے(محمد شفیع، مولانا مفتی 2001ء ص 33)مگر اسکے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تمام مدارس آزاد ہوں اور مسجدوں کی طرح ان کا تعلق بھی عام مسلمانوں سے براہ راست ہو، ان کا انتظام مُسلمان اپنی جیب سے کریں اوران میں بلاتفریق امیر وغریب ہر ایک مسلمان بچہ تعلیم پاسکے۔اس کے ساتھ علماء ایثار سے کام لیں اور معمولی معاوضہ پر درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کی خدمات انجام دیں۔طلبہ کے قیام وطعام اور دوسری ضروریات کا نظم حتی الوسع مدارس کی طرف سے ہو۔حاجی امداداللہ نے اس کی ذمہ داری اپنے مرید مولانا محمد قاسم نانوتوی پر ڈالی چنانچہ امن قائم ہونے کے بعد مولانا نانوتوی، حاجی سیّد محمد عابد حسین، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی اور دیوبند کے بہت سے مخلص ونمایاں حضرات کے تعاون سے 15 محرم 1283ھ بمطابق 30 مئی 1866ء یوم پنجشنبہ کو اس سلسلے کا سب سے پہلا مدرسہ (مدرسہ اسلامی عربی دیوبند) کے نام سے مسجد چھتہ دیوبند میں قائم ہوا۔(دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء؛ ص 10)

مدرسہ دیوبند کے قیام کی تاریخ اور سن کے تعین میں مورخین کا اختلاف ہے۔اکثر وبیشتر مورخین مولانا محمد قاسم نانوتوی کو اس مدرسہ کا بانی تسلیم کرتے ہیں، مگر مولانا مفتی عزیز الرحمان مصنف "تذکرہ شیخ الہند" اس امر میں دیگر مورخین سے متفق نہیں ہیں۔آپ کے خیال میں حاجی محمد عابد حسین اس مدرسہ کے موسس وبانی ہیں۔البتہ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ سیّد عابد حسین نے سب سے پہلے اس مدرسہ کے لئے چندہ جمع کیا(محبوب، رضوی سیّد 1972ء ص 231)۔دوسرے دن مولوی محمد قاسم نانوتوی کو مدرس کی خدمات کیلئے تحریر کیا۔مولوی محمد قاسم نے مدرسہ کیلئے مولوی محمود کی خدمات حاصل کیں۔بعد ازاں مدرسہ کی تعمیر وتوسیع کیلئے مولانا نانوتوی نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور دیوبند سے باہر ایک قطعہ زمین اس کی عمارت کیلئے حاصل کر کے موجودہ درسگاہ کی بنیادیں قائم کیں۔(ایچ بی خان 1985ء ص 32)

دیوبند کا مدرسہ مولانا محمد قاسم کے نام پر مدرسہ قاسم العلوم کہلاتا ہے۔اس کی ابتداء ہنگامۂ غدر سے دس سال بعد 30 مئی 1867ء کو ہوئی۔ یوں اس کے محرک مولوی ذوالفقار علی اور پہلے مدرس مُلّا محمد محمود تھے جو پندرہ روپے کے مشاہرے پر ملازمِ درس مقرر ہوئے اور دیوبند کی مسجد چھتہ میں تعلیم شروع ہوئی۔(Barbra Daly Metcalf 1989؛ P:92)

ایک روایت کے مطابق اس مدرسہ کا نام "مدرسہ عربی وفارسی وریاضی" تجویز ہوا تھا(محبوب' رضوی

سیّد 1972ء ص 320)۔ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان کے مطابق مدرسہ دیوبند کے قیام کا خیال سب سے پہلے ایک صوفی بزرگ حاجی محمد عابد دیوبند کے دل میں پیدا ہوا۔وہی اس کے اعزازی مہتمم وسرپرست بنے اور جب کافی رقم فراہم ہوگئی تو ممتاز ماہر تعلیم مولانا یعقوب کو اس کا صدر مدرس بنایا گیا۔مدرسے نے 14اپریل 1866ء کو کام شروع کیا(سٹوری آف پاکستان 2002ء ص 1)۔دیوبند ضلع سہارن پور کا ایک چھوٹا سے قصبہ ہے جو دہلی سے شمال کی جانب 144 میل کے فاصلے پر ہے۔اس قصبے کی چھوٹی سی ''چھتے والی مسجد'' کے اندر انار کے درخت کے سائے میں ایک استاد مولانا محمود دیوبندی اور ایک شاگرد محمود حسن سے اس دارالعلوم کا آغاز ہوا(ارشادالحق تھانوی 2002ء ص 6)۔افضل المطابع کے مطابق دارالعلوم کا آغاز 15محرم 1283ھ بمطابق 30 مئی 1866ء مدارس دینیہ کے سابق طریق کے بجائے بالکل ایک نئے انداز سے ہوا۔(افضل المطابع 1910ء ص 22)

منتظمین نے موجودہ عمارت کا سنگ بنیاد اس عہد کے ایک نامور عالم دین مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے ہاتھوں رکھوایا۔مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسیّد احمد خان کے اُستاد مولانا مملوک علی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس اور مولانا رفیع الدین مہتمم مقرر ہوئے۔یہ وہ زمانہ تھا جب مہتمم اور صدر مدرس سے لے کر گھنٹہ بجانے والا چپڑاسی بھی صاحبِ نسبت ہوتا تھا۔مولانا محمد قاسم بھی اپنے احباب کے اصرار پر مدرسین میں شامل ہوگئے۔(محمد شفیع،مولانا مفتی 2001ء ص 35)

قیام دارالعلوم کے وقت اکابرِ دارالعلوم کچھ زیادہ معمر نہ تھے،بلکہ ان کا تعلق عمر کے اس دور سے تھا جسے ''دورشباب'' کہا جاتا ہے۔نوجوانوں کے لئے یہ ایک مثال تھی،ایک درس تھا کہ مردان کار کسی بڑے کام کا آغاز کرنے کے لئے اپنے معمر ہونے کا انتظار نہیں کیا کرتے۔دارالعلوم کی اس جماعت مقدسہ میں سب سے زیادہ معمر مولانا ذوالفقار علی(عمر 45سال) تھے۔اُن کے علاوہ کسی کی عمر 35 سال سے زیادہ نہ تھی۔تفصیل کے لئے ذیل میں دی گئی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

نمبر شمار	نام	سن ولادت	عمر بوقت تحریک دارالعلوم
1	مولانا ذوالفقار علی	1237ھ	45سال
2	مولانا فضل الرحمٰن	1247ھ	35سال
3	مولانا قاسم نانوتوی	1248ھ	34سال
4	مولانا یعقوب نانوتوی	1249ھ	33سال
5	مولانا حاجی محمد عابد	1250ھ	32سال
6	مولانا رفیع الدین	1252ھ	30سال

(محبوب،رضوی سیّد 2005ءالف ص 135)

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ تاسیس کے بارے میں اختلاف نظر آتا ہے۔ 15 محرم 1283ھ تو متفق علیہ ہے۔ عیسوی تاریخ 30 مئی میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔البتہ عیسوی سن کہیں 1866ء مذکور ہے اور کہیں 1867ء۔ان دنوں تقویموں کی مطابقت کا شاید کوئی قطعی فارمولا موجود نہیں لہٰذا ہجری تاریخ ہی کو اصل اور صحیح حوالہ بنایا جائے کیونکہ دارالعلوم کا سارا نظام ہجری تقویم کے مطابق ہی چلتا رہا۔

5.2 مقاصد تحریک

دارالعلوم کا مقصد واضح طور پر یہ تھا کہ مسلمانوں میں علوم اسلامی کی اشاعت کی جائے اور یہ کام ہر زمانہ میں اہم رہا ہے لیکن اس وقت اس کی اہمیت کئی وجوہ سے بڑھ گئی تھی۔اوّل یہ کہ انگریزوں نے مسلمانوں کا سابقہ نظام تعلیم درہم برہم کر دیا تھا اور مالی وسائل برباد ہو جانے کی وجہ سے دو چار کے علاوہ تمام مدرسے بند ہو گئے تھے جن میں دینی تعلیم ہوتی تھی۔ دوم یہ کہ حکومت کی اعانت سے ملک میں مسیحیت کی تبلیغ ہو رہی تھی اس کا انسداد ضروری تھا۔تیسرے حکومت کا جاری کردہ نظام تعلیم جس کا مقصد ہندوستان میں ایک ایسی جماعت پیدا کرنا تھا جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی مگر خیالات، تصورات اور طرز فکر کے اعتبار سے انگریز ہو اور ہندوستانیوں میں حکومت کی ترجمانی کرے،کا موثر بندوبست کرنا تھا۔ چوتھے یہ کہ اسلامی حکومت کے سقوط کے بعد ملک میں مسلمانوں کی سیاسی،معاشرتی اور فکری تنظیم کا کوئی مرکز باقی نہیں رہا تھا۔لہٰذا ایسے مراکز کا احیاء بھی دارالعلوم کے مقاصد میں تھا۔(محمد ایوب،قادری 1983ء،ص 155)

دارالعلوم دیوبند کے قیام کی غرض وغایت محض یہ تھی کہ مسلمانوں میں ایمان اور توکل پیدا ہو جائے۔بدعات اور مکروہات سے محفوظ ہو کر دین کے صحیح فہم کی دولت بے کراں سے مالا مال ہوں۔دارالعلوم کی حیثیت محض ایک مدرسۂ دینی کی نہیں بلکہ ایک تعلیمی تحریک تھی جس کا مقصد انگریزی اقتدار اور انگریزی تہذیب وتمدن سے مکمل نجات تھا(عارف چوہدری 1980ء،ص 9)۔اصل مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کو کفر کی یلغار سے محفوظ کیا جائے۔اس کی عملی صورت یہ محسوس کی گئی کہ ایک دینی درسگاہ قائم کی جائے جس میں علوم دینیہ کی تعلیم دے کر مسلمانوں کی دینی،معاشرتی اور تمدنی زندگی اسلامی سانچے میں ڈھالی جائے۔(محمد طیب 1972ء،ص 12)

دارالعلوم دیوبند ولی اللّٰہی تحریک کا تسلسل اور مدرسہ رحیمیہ کا جانشین تھا۔شاہ عبدالرحیم دہلوی کا قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ جس میں شاہ عبدالرحیم،شاہ ولی اللہ،شاہ عبدالعزیز،شاہ رفیع الدین،شاہ عبدالقادر،شاہ مخصوص اللہ اور شاہ محمد اسحٰق جیسے نابغۂ روزگار پڑھاتے رہے تھے۔1840ء میں بند ہو گیا تھا اور 1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے وہ عمارت ایک ہندو کے ہاتھ فروخت کر دی تھی۔اس لئے ایک ایسے معیاری مدرسے کی ضرورت محسوس کی گئی جو مدرسہ رحیمیہ کے خطوط پر کام کر سکے(محمد اسلم،پروفیسر(س ن)ص 142)۔شاہ ولی اللہ نے برصغیر کے مسلمانوں کے زوال

کے اسباب کی تشخیص کی اور ان کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔اصل میں دارالعلوم دیوبند کا مطمح نظر بھی یہی تھا۔(عبداللہ، ڈاکٹر سیّد 2002ء ص 6)

دارالعلوم کے قیام کا مقصد علوم اسلامیہ کے لئے ایسے ماہرین تیار کرنا تھا جو اپنے اخلاق و کردار، بے نفسی بللّٰہیت اور ایثار کا نمونہ بن کر امّت کے سامنے آئیں۔دینی علوم کی تحصیل کا مقصد رضائے الٰہی تفقّہ فی الدین، دعوت و تبلیغ اور نیابتِ انبیاء کے فرائض انجام دینا تھا۔اس ادارے کا اصل مقصد دینی تعلیم کے ایک مرکز کا قیام تھا۔پیش نظر یہ تھا کہ اس وقت جبکہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا تعلیمی نظام تباہ و برباد کیا جارہا ہے۔قدیم بنیادوں پر ایک متبادل نظام قائم کردیا جائے۔دارالعلوم دیوبند کی حیثیت ایک مدرسے کی نہیں ایک تحریک کی تھی۔(خورشید احمد (س ن) ص 100)

غرض دارالعلوم دیوبند برصغیر کی معاصرانہ صورت حال کا ایک منطقی ردعمل تھا۔1857ء کی جنگ آزادی میں اہل ہند کو شکست دے کر سیاسی غلبہ حاصل کرنے سے بہت قبل تعلیم کے میدان میں انگریزوں نے اپنی استعماریت کا آغاز کردیا تھا۔میکالے کا اعلان (1835ء) صریح تھا کہ انگریزی نظام تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں میں ایسے لوگ پیدا کیے جائیں جو ذہنی اعتبار سے انگریزوں کے غلام ہوں۔دارالعلوم دیوبند نے اس استعماری تعلیمی نظام کے سامنے بند باندھنے کو اپنا مطمح نظر بنایا تاکہ مسلمانوں کی جہالت کو دور کیا جائے۔ان کے عقائد، رسم و رواج اور رہن سہن کی اصلاح کی جائے (محمد شفیع، مفتی 1976ء ص 143)۔مدرسے کے مقاصد کا درج ذیل نکات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو دارالعلوم دیوبند میں رہنما اصولوں کی حیثیت رکھتے تھے:

- ادارے کو پبلک چندوں سے چلایا جائے گا۔
- طلبہ کیلئے اقامت کا انتظام ہوگا تاکہ انہیں تعلیم کے ساتھ ساتھ جہاد کی تربیت بھی دی جاسکے۔
- جمہوری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مہتمم مشوروں سے کام لے گا۔
- اساتذہ کی عزت برقرار رکھی جائے گی۔
- خدا پر مکمل بھروسہ کیا جائے گا اور اسی کی تعلیم دی جائے گی۔
- گورنمنٹ سے کوئی امداد نہیں لی جائے گی تاکہ اس کا اثر مدرسہ پر نہ پڑسکے۔(محمد الیاس قارانی 1968ء ص 120)

گویا دارالعلوم کا اساسی کام تعلیم کتاب اللہ، تدریس سنت حدیث رسول ﷺ اور تفقہ فی الدین کی روشنی میں ایسے علماء، مجاہدین، محدثین، فقہاء اور رجال کار پیدا کرنا تھا جو دل و دماغ کے اعتبار سے صحیح مسلمان اور قلب و فکر کی گہرائیوں سے نمونے کے مسلمان ہوں۔(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ج ص 53)

5.3 نصابِ تعلیم

دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں برصغیر کے اس دور کے مسلم تعلیمی مراکز کے اثرات اور وقت کے ساتھ ساتھ حرفتی تعلیم کی طرف رجحان نظر آتا ہے۔اس دور میں اسلامی تہذیب کے دو خاص مرکز فرنگی محل لکھنؤ اور دہلی تھے۔نصاب تعلیم دونوں مقامات کا درس نظامی تھا مگر اس میں اپنے مذاق کے مطابق بعض چیزیں کم وبیش تھیں۔فرنگی محل میں فقہ اور اصول فقہ کے علاوہ علوم معقول پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔دہلی میں حدیث وتفسیر کو سب علوم پر فوقیت تھی اور کتاب وسنت کی تفہیم اور تعلیم کو حاصل تعلیم سمجھا جاتا تھا۔علمائے دیوبند نے مدرسہ ولی اللہ (دہلی) کی پیروی کی اور قدرے تاخیر سے لکھنؤ اور خیر آباد کی خصوصیات کو بھی دیوبند کے نصاب میں اپنایا گیا۔جس سے معقول اور منقول میں توازن پیدا ہو گیا۔(محبوب، رضوی سیّد 1950ء،ص 94)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کو وقت کے تقاضوں اور ملک کے حالات کا اچھی طرح اندازہ تھا۔انہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ دارالعلوم دیوبند میں انگریزی، سائنس اور دوسرے ان ضروری علوم کی بھی تعلیم دی جائے جو سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں پڑھائے جا رہے تھے مگر افسوس کہ مولانا کی اس خواہش کی تکمیل نہ ہو سکی (شمس تبریز 1981ء،ص 28)۔ پورا نصاب تعلیم جس میں فارسی کی کلاسیں بھی شامل ہیں 9 سال پر تقسیم کیا گیا تھا۔گویا طالب علم کی عمر کے نو سال اس پر خرچ ہوتے۔اس معمولی نصاب تعلیم کے علاوہ معاشی مقاصد کے لئے طلبہ کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا اور خطاطی جلد سازی، گھڑی سازی، پارچہ بافی، ہوزری، جفت سازی کے کام بھی شروع کئے گئے۔(محمد خلیل اللہ 1983ء،ص 156-157)

اگرچہ انہیں معاشی خود کفالت فراہم کرنے کیلئے نصاب میں طب، خطاطی جلد سازی اور کپڑا بننے جیسی دستکاریاں شامل کی گئیں مگر ان پیشہ وارانہ مضامین کی تعلیم کا بندوبست نہ کیا جا سکا اور نصاب صرف درس تک محدود رہا (عبدالرشید ارشد، ڈاکٹر 1995ء،ص 31)۔البتہ ایک مستقل شعبہ دارالصنائع کے نام سے کھولا گیا جس میں مختلف صنعتیں طلبہ کو سکھائی جاتی تھیں۔دارالعلوم کا نصاب بھی منجمد نہیں رہا بلکہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد نظر ثانی ہوتی رہی۔نصاب میں قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر تو شامل تھے لیکن ذمہ داروں نے محسوس کیا کہ جس طرح حدیث کی تعلیم کا اختتام دورہ حدیث پر ہوتا رہا ایسے ہی تفسیر قرآن کا دورہ بھی نصاب میں شامل کیا جائے اور اسے دورۂ حدیث کے بعد رکھا جائے چنانچہ دورۂ تفسیر کا اجراء عمل میں آیا (محبوب، رضوی سیّد 2005ء الف،ص 281)۔اس کے ساتھ ہی تکمیل کے بھی کئی درجات کر دیئے گئے جیسے: تکمیل ادب، تکمیل دینیات، تکمیل معقولات وغیرہ۔مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو جن فنون سے بھی مناسبت ہو اسی درجہ میں داخل ہو کر منتخب فن میں مہارت اور رسوخ حاصل کر لیں بعد میں صنفِ عربی کا درجہ بھی کھولا گیا تاکہ موجودہ جدید عربی بھی طلبہ پڑھ سکیں اور اس زمانہ میں عرب ممالک میں جا کر دین کی لسانی خدمت کر سکیں۔(دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء ص 38)

دارالعلوم میں ابتداء سے ہی سارے فنون پڑھائے جاتے رہے لیکن علم حدیث میں اس درسگاہ کی خاص شہرت رہی کیونکہ یہاں کا دورۂ حدیث محققانہ اور مجتہدانہ انداز کا ہوتا اور اساتذہ بڑی تیاری اور محنت سے درس دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد غیر ممالک سے یہاں طلبہ آنے لگے۔ وہ طلبہ جو دوسرے مدارس میں حدیث پڑھ چکے تھے بلکہ کئی سال درس بھی دے چکے تھے، اس کی شہرت سُن کر وہ بھی یہاں آ کر درس حدیث میں شریک ہوئے، پورا سال طالب علم کی حیثیت سے یہاں گزارا اور سند حدیث لیکر واپس ہوئے۔ ان علماء میں مولانا عبداللہ، مولانا سلامت اللہ، مولانا معشوق علی، مولانا برکت اللہ دہلوی اور مولانا عبدالرحیم علی گنج بہار شامل تھے جنھوں نے یہاں آ کر دورۂ حدیث پڑھا اور یہاں کے درس وفیوض وبرکات سے فیض یاب ہوئے۔ (محمد ایوب، قادری 1966ء ص 200-202)

گویا تمام اسلامی دنیا سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے کیلئے یہاں آتے۔ یہ اسلامی دنیا کی چوتھی یونیورسٹی شمار کی جاتی تھی۔ پہلی جامعہ اظہر، دوسری جامعہ زیتون، تیسری جامعہ تیونس اور یہ رہائشی یونیورسٹی تھی جہاں عربی، فارسی، قرآن، طب یونانی اور تبلیغ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ڈرل اور جسمانی تربیت کا بھی انتظام تھا۔ جو طلبہ یہاں سے تعلیم حاصل کر کے نکلتے وہ اپنے نام کے آگے دیوبندی لگاتے۔ انہیں فاضل کی سند ملتی تھی۔ (خالد یار خان 1963ء ص 273)

اس وقت برصغیر میں خوش نویسی کی کمی محسوس کی گئی۔ لہٰذا دارالعلوم میں اس طرف خصوصی ضروری توجہ دی گئی اور شعبہء خوش خطی جاری کیا گیا تاکہ اس فن کے خواہشمند طلبہ فراغت کے بعد خط نسخ اور خط نستعلیق کی مشق کر کے عمدہ کاتب بن سکیں اور بوقت ضرورت اس فن کو ذریعہ معاش بھی بنا سکیں۔ اس شعبہ سے بہت سے علماء نے حسن تحریر کی دولت حاصل کی اور انہی کی وجہ سے خط نسخ و نستعلیق میں کتابوں کی اشاعت جاری رہی جو ٹائپ سے بہت ارزاں ہوتی تھی (دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء ص 37)۔ دارالعلوم کا قیام اگرچہ اسلامی علوم وفنون کے تحفظ اور بقا کیلئے عمل میں آیا تھا مگر چونکہ اس وقت تک قدیم روایتی اور تہذیبی قدریں باقی تھیں اس لئے دارالعلوم کے ابتدائی دور میں اس کے فارسی وریاضی کے درجات میں مسلمان بچوں کے ساتھ ہندو بچے بھی پڑھتے تھے۔ (محبوب، رضوی سیّد 1972ء ص 329)

المختصر مدرسہ دیوبند اصل میں مدرسہ رحیمیہ کا ہی پیروکار تھا اور اسکی بنیاد علم حدیث پر تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس میں طلبہ کی باقاعدہ جماعت بندی، حاضری رجسٹر پر ان کا اندارج اور تحریری امتحان جیسی جدید مدرسوں کی خصوصیات بھی شامل تھیں (ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان 2002ء ص 1)۔ دینی مدارس کا نصابِ تعلیم اجتماعی ارتقاء کے نتیجہ میں تشکیل پذیر ہوا۔ ملاّ نظام الدین سہالوی بانی درس نظامی نے ایک خاص انداز سے نصاب مرتب کیا تھا۔ اجتماعی ارتقاء کا عمل اس کے بعد بھی جاری رہا بعض مضامین کو قبولیتِ عامہ حاصل ہوگئی۔ یہ علم حدیث، علم ادب اور علم تاریخ ہیں۔ یہ اضافہ شدہ نصاب دیوبند کے مدرسے کا نظام تعلیم تھا۔ (محمد اکرام شیخ 1975ء ص 605-606)

''دارالعلوم دیو بند کے نصاب تعلیم کی درجہ وار تقسیم''

سال اوّل

صرف: (1) میزان از سراج الدین اودھی 774ھ/1372ء
(2) منشعب از شیخ حمزہ بدایونی
(3) پنج گنج (تا خاصیت ابواب) از شیخ حمید الدین حاکم کیچ مکران 737ھ/1336ء
(4) صرف میر از میر سیّد شریف جرجانی 816ھ/1413ء
(5) علم الصیغہ از مفتی عنایت احمد 1277ھ/1860ء
(6) فصول اکبری از علی اکبر الہ آبادی 1090ھ/1679ء

نحو: (1) نحو میر از میر سیّد شریف جرجانی 816ھ/1413ء
(2) شرح مائۃ عامل از ملاّ محمد صادق 1190ھ/1776ء
(3) ہدایۃ النحو از ابو حیان نحوی 745ھ/1344ء

ادب: (1) مفید الطالبین از مولانا محمد احسن نانوتوی پروفیسر بریلی کالج 1312ھ/1895ء

منطق: (1) صغریٰ۔ کبریٰ از میر سیّد شریف جرجانی 816ھ/1413ء
(2) ایساغوجی از مولانا اثیر الدین مفضل بن عمر الابہری قبل 660ھ/1261ء
(3) مرقات از فضل امام خیر آبادی 1240ھ/1824ء

سال ثانی

صرف: (1) فصول اکبری از علی اکبر الہ آبادی 1090ھ/1679ء
(2) مراح الارواح از احمد بن علی بن مسعود

نحو: (1) کافیہ از جمال الدین ابن صاحب 620ھ/1223ء
(2) شرح جامی از ملاّ نور الدین عبدالرحمان جامی 850ھ/1446ء
(3) ابن عقیل از عبداللہ بن احمد معروف بہ ابن عقیل 799ھ/1396ء

ادب: (1) نفحۃ الیمن از شیخ احمد شروانی یمنی 1228ھ/1813ء
(2) نفحۃ العرب از مولانا اعزاز علی دیو بندی 1375ھ/1955ء

فقہ: (1) نور الایضاح از حسن بن علی الشرنبلانی 1169ھ/1755ء
(2) قدوری ابوالحسن احمد معروف بہ قدوری 428ھ/1036ء

منطق: (1) شرح تہذیب تا ضابطہ از علاّمہ عبداللہ یزدی 981ھ/1573ء

(2) قطبی یعنی شرح شمسیہ از محمد بن محمد قطب الدین رازی 766ھ/1364ء

(3) رسالہ میر زاہد از میر محمد زاہد بن قاضی اسلم ہروی 1101ھ/1689ء

تاریخ: (1) رسالہ سیرت از مولانا عماد الدین

(پنجاب یونیورسٹی 1971ء جلد سوم،ص 312)

سال ثالث

نحو: (1) شرح جامی از ملا نور الدین عبد الرحمان جامی 850ھ/1446ء

معانی وبیان: (1) تلخیص المفتاح از جلال الدین محمد قزوینی خطیب دمشق 739ھ/1338ء

عروض: (1) عروض المفتاح از یعقوب یوسف سکاکی 626ھ/1228ء

ادب: (1) مقامات حریری از علامہ ابو محمد قاسم بن علی الحریری 516ھ/1122ء

تاریخ: (1) دروس التاریخ الاسلامی (اوّل وثانی) از شیخ محی الدین الخیاط

فقہ: (1) اصول الشاشی از نظام الدین شاشی 754ھ/1353ء

(2) کنز الدقائق از ابوالبرکات حافظ الدین نسفی 710ھ/1310ء

منطق: (1) سُلّم العلوم از مولوی محب اللہ بہاری صدر الصدور 1119ھ/1707ء

(2) شرح ملا حسن از ملا محمد حسن بن قاضی غلام مصطفےٰ لکھنوی 1209ھ/1794ء

سال رابع

معانی وبیان: (1) مختصر المعانی از سعد الدین مسعود تفتازانی 791ھ/1389ء

تاریخ: (1) دروس التاریخ الاسلامی (ثالث ورابع) از شیخ محی الدین الخیاط۔

کلام: (1) شرح عقائد نسفی از سعد الدین مسعود تفتازانی 791ھ/1389ء

فقہ: (1) نور الانوار از ملا جیون جون پوری 1105ھ/1693ء

(2) شرح وقایہ از عبداللہ بن مسعود صدر الشریعہ 543ھ/1148ء

مناظرہ: (1) رشیدیہ از شیخ عبد الرشید جون پوری 1083ھ/1672ء

منطق: (1) رسالہ میر زاہد از قاضی میر محمد زاہد ہروی 1101ھ/1689ء

(2) شرح ملا جلال

حکمت: (1) میبذی از قاضی کمال الدین میبذی قبل 600ھ/1200ء

سال خامس

تاریخ: (1) تاریخ ابوالفدا از ابوالفدا اسمٰعیل حموی 746ھ/1345ء

کلام: (1) شرح عقائد نسفی از سعد الدین مسعود تفتازانی 791ھ/1389ء

(2) شرح خیالی از شمس الدین احمد معروف بہ خیالی 870ھ/1465ء

(3) مسامرہ از کمال الدین ابن الشریف 905ھ/1499ء

فقہ: (1) حسامی از حسام الدین محمد 644ھ/1246ء

(2) ہدایہ اولین از برہان الدین مرغینانی 593ھ/1197ء

حدیث: (1) مشکوٰۃ المصابیح از شیخ ولی الدین عراقی 742ھ/1341ء

(2) نخبۃ الفکر از علامہ ابن حجر عسقلانی 852ھ/1448ء

تفسیر: (1) الفوز الکبیر از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی 1176ھ/1762ء

(2) جلالین از جلال الدین سیوطی 911ھ/1505ء

سال سادس

(1) دیوان متنبی (تا ردیف میم) از احمد بن حسین متنبی 400ھ/1009ء

(2) دیوان حماسہ (تین باب) از ابو تمام حبیب بن اوس طائی 232ھ/846ء

(3) سبعہ معلقہ از حماد راویہ 156ھ/772ء

تاریخ: (1) تاریخ ابو الفدا از ابو الفدا اسمٰعیل حموی 746ھ/1345ء

فقہ: (1) توضیح از صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود 735ھ/1334ء

(2) تلویح از علامہ سعد الدین مسعود تفتازانی 791ھ/1389ء

(3) مسلم الثبوت از مولوی محب اللہ بہاری 1200ھ/1785ء

(4) ہدایہ از برہان الدین مرغینانی 593ھ/1197ء

فرائض: (1) سراجیہ از سراج الدین سجاوندی غزنوی چھٹی صدی ہجری

حکمت: (1) تصریح از امام الدین بن لطف اللہ لاہوری 1145ھ/1733ء

(2) شرح چغمینی از موسیٰ بن محمود عرف قاضی زادہ 814ھ/1411ء

ہندسہ: (1) رسالہ اصطرلاب از ابو الحسن ثابت بن قرہ 332ھ/943ء

(2) تحریر اقلیدس از نصیر الدین محقق طوسی 673ھ/1274ء

سال سابع

معانی وبیان: (1) مطول از سعد الدین مسعود تفتازانی 791ھ/1389ء

کلام: (1) میر زاہد (امور عامہ) از میر محمد زاہد ہروی 1101ھ/1689ء

(2) شرح عقائد جلالی از جلال الدین دوّانی 908ھ/1502ء

تاریخ: (1) تاریخ ابوالفدا از ابوالفدا اسمٰعیل حموی 746ھ/1345ء

منطق: (1) تصدیقات شرح سُلّم از حمداللہ سندیلوی 1200ھ/1785ء

(2) تصورات شرح سُلّم از قاضی مبارک بن محمد دائم گوپاموئی 1143ھ/1730ء

فلسفہ: (1) صدرا (دو فصل) از صدرالدین شیرازی 903ھ/1498ء

(2) شمس بازغہ (حرکت) از ملا محمود بن محمد فاروقی جونپوری 1062ھ/1651ء

تفسیر: (1) بیضاوی (بقرہ) از عبداللہ بن عمر بیضاوی 716ھ/1316ء

طب: (1) موجز قانونچہ از ابن النفیس قرشی 687ھ/1288ء

(2) شرح اسباب از برہان الدین نفیس کرمانی 827ھ/1423ء

(3) نفیسی اسباب از برہان الدین نفیس کرمانی 827ھ/1423ء

(4) حمیات قانون از شیخ الرئیس حکیم بو علی سینا 428ھ/1037ء

نوٹ: یہ کتب بلحاظ استعداد کئی سالوں پر پھیلائی جا سکتی ہیں۔ سال سابع تک قدیم تعلیمی نصاب ختم ہو جاتا ہے۔ اس کو "موقوف علیہ" کہتے ہیں۔

سال ثامن

دورۂ حدیث: (1) صحیح بخاری از ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری 256ھ/870ء

(2) صحیح مسلم از مسلم بن حجاج نیشاپوری 261ھ/875ء

(3) جامع ترمذی از محمد بن عیسیٰ ترمذی 279ھ/893ء

(4) سنن ابی داؤد از امام ابو داؤد سجستانی 275ھ/888ء

(5) سنن نسائی از عبدالرحمٰن بن شعیب نسائی 306ھ/918ء

(6) شمائل ترمذی از ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی 279ھ/893ء

(7) طحاوی از ابو جعفر احمد طحاوی 321ھ/932ء

(8) سنن ابن ماجہ از محمد بن ماجہ قزوینی 273ھ/886ء

(9) مؤطا امام محمد از محمد بن حسن شیبانی 189ھ/805ء

(10) مؤطا امام مالک از امام مالک 179ھ/795ء

سال تاسع

دورۂ تفسیر: (1) تفسیر کامل از امام ابن کثیر 774ھ/1372ء

(2) تفسیر کامل از امام عبداللہ بن عمر بیضاوی 716ھ/1316ء

تجوید القرآن: 12 کتب

(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ب ص 256-262)

دارالعلوم کا نصاب چار طبقات پر مشتمل تھا۔ابتدائی، متوسط، اعلیٰ، تکمیل، درجہ تکمیل لازمی نہیں۔اگر کوئی طالب علم کسی خاص موضوع یا فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا تو وہ درجہ تکمیل میں داخلہ لے کر مزید اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم تفصیلاً جن علوم و فنون اور کتب پر مشتمل تھا۔وہ ضمیمہ نمبر 1 (الف) میں درج ہیں۔دیوبند کا نصاب تمام مدارس سے زیادہ بھاری ہوگیا۔اس لئے مدت تعلیم میں اضافہ کرنا پڑا۔پہلے مدت تعلیم سات سال ہوتی تھی۔ مولانا محمد یعقوب نے بڑھا کر آٹھ سال کر دی۔(عبید اللہ، سندھی مولانا 1952ء ص 123)

5.4 حکمتِ تدریس

دیوبند کے نظام تعلیم میں اصولی طور پر صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت اور اصلاح باطن کا بھی انتظام پیش نظر تھا۔ یہاں کا نظام علم اور تقویٰ کے امتزاج کی یہ روایت زندہ رکھنا چاہتا تھا جو مسلمانوں نے اپنی تیرہ سو (1300) سالہ تاریخ میں قائم کی۔استاد اور شاگرد کا گہرا باہمی ربط بھی اسکی بنیادی خصوصیات میں سے ایک رہا۔دیوبند کے نظام تعلیم میں طلبہ کے تقریری اور تحریری مقابلے، امتیازی کارناموں پر انعامات اور طلبہ کی علیحدہ تنظیم بھی شامل تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کی تربیت اور اجتماعی زندگی کیلئے تیاری ملحوظ تھی۔(خورشید احمد، پروفیسر (س ن) ص 106)

دارالعلوم میں درس کے اوقات دو حصّوں پر تقسیم تھے۔پہلا حصہ چار گھنٹے کا تھا اور دوسرا دو گھنٹے کا موسم گرما میں صبح 6 بجے سے 10 بجے تک اور بعد ظہر 3:30 بجے سے 5:30 بجے تک۔موسم سرما میں صبح 8 بجے سے 12 بجے تک اور بعد ظہر 2 بجے سے 4 بجے تک۔دارالعلوم میں تعلیمی گھنٹہ پورے 60 منٹ کا ہوتا۔موسم کے تغیر کے ساتھ تدریجاً اوقات بدلتے رہتے یعنی چھ سے سوا چھ اور دوسرے دو سے سوا دو، اس طرح آٹھ سے پونے آٹھ اور ساڑھے تین سے سوا تین۔عام طور سے شوال میں داخلے کے بعد اوائل ذی قعدہ سے درس شروع ہو جاتے اور آخر رجب تک جاری رہتے۔شعبان میں سالانہ امتحان ہوتا جو تقریباً تین ہفتے جاری رہتا۔شعبان کے آخری ہفتے سے عام تعطیل ہو جاتی جو شوال کے پہلے ہفتے تک رہتی۔ دوسرے ہفتے سے داخلہ شروع ہو جاتا۔جمعہ، ہفتہ وار تعطیل کا دن تھا۔(محمد یوسف، مولانا لدھیانوی 1980ء ص 53)

چونکہ بانیانِ دارالعلوم اس پہلو سے سوچتے تھے کہ علوم کی تعلیم کے لئے ملک میں بے شمار سرکاری مدارس ہیں البتہ علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے اور یہ علوم ہندوستان میں کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔اسلئے انہوں نے ایسا نصاب تیار کیا جو معقولات و منقولات اور بعض علوم پر مشتمل تھا۔یہ نصاب بہت حد تک درس نظامی سے ملتا جلتا تھا بلکہ دارالعلوم کے

نصاب کو درس نظامی ہی کہا جاتا تھا۔دارالعلوم کے طریق درس کو چار مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا۔(1)ابتدائی (2)متوسط (3)اعلیٰ (4)تکمیل تفسیر،دینیات،ادب۔(سہ روزہ "دعوت" دہلی 16اکتوبر 1999ء،ص 9)

ابتدائی درجات میں اساتذہ کے پیش نظر یہ بات رہتی کہ طلبہ میں کتاب کے مضامین سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے ،اسلئے کتاب فہمی پر زیادہ زور دیا جاتا۔متوسط درجات میں کتاب فہمی کے ساتھ زیر درس کتاب کےعلاوہ اس فن کے ایسے مباحث بھی زیر بحث لائے جاتے جوطلبہ کےذہن میں وسعت پیدا کرنے اوراُن کاذہنی معیاربلند کرنے کیلئےضروری ہوتے۔اعلیٰ درجات میں زیر درس فن کی تعلیم وتفہیم پر مکمل زور دیا جاتا۔مگر اسی کے ساتھ کتاب فہمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔دارالعلوم کاطریق تعلیم یہ تھا کہ پہلے طالب علم کتاب کی عبارت پڑھتا۔اُستاد کافرض تھا کہ پڑھی ہوئی عبارت پر فنی حیثیت سے اس جامعیت کے ساتھ تقریر کرے جس میں متعلقہ عبارت کے ہر پہلو اور مسئلہ پر روشنی پڑ جائے۔(محبوب، رضوی سیّد 2005ء ب،ص 279)

اُستاد کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کی بحث میں موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آجائیں اور وہ اپنی تقریر عبارت پر منطبق کرکے طالب علم کومطمئن کردے،طلبہ درس میں بالکل آزاد ہوتے۔انہیں اس بات کا مستحق سمجھا جاتا کہ جب تک سبق پوری طرح نہ سمجھ لیں، جتنے اعتراض زیرغور درس کے متعلق اُن کے ذہن میں آئیں اوراُن کااطمینان بخش جواب اُستاد سے نہ سن لیں اُستاد کوآگے بڑھنے نہ دیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک طرف تو طالب علم پوری محنت کے ساتھ درس میں شریک ہوتا اور دوسری طرف اُستاد بھی پوری محنت اورتوجہ کے ساتھ پڑھانے پرمجبور ہوتا۔عموماً زیر مطالعہ درسی کتب میں اساتذہ کی توجہ اس امر پر مرکوز رہتی کہ طلبہ میں کتاب فہمی کی استعداد پیدا ہوجائے اور اُنہیں مصنف کا منشاء سمجھنے کاطریقہ معلوم ہوجائے۔(محبوب،رضوی سیّد 1976ء،ص 190)

علم الحدیث میں مشکوٰۃ المصابح کےعلاوہ حسب ذیل کتب نصاب میں داخل تھیں۔صحیح بخاری،صحیح مسلم، جامع ترمذی،سنن ابی داوٗد،سنن نسائی،سنن ابن ماجہ،موطاامام مالک،موطاامام محمد،شرح معانی الآ ثارطحاوی،شمائل ترمذی(محمد رفیع ،مولانامفتی 1389ھ،ص 110)۔ان کتب میں اوّل الذکر چار کتابوں کو بالا ستیعاب ختم کرایا جاتا اوران کے مضامین پر پوری بحثیں ہوتیں۔بقیہ کتابوں کااستیعاب ضروری نہیں تھا۔اساتذہ ان کتابوں کے چند اسباق میں اس قسم کی تقریر کرتے جس سے اس کتاب کا منشاء معلوم ہوجاتا۔اوّل الذکر اور موخرالذکر کتابوں میں چونکہ احادیث کابیشتر حصہ مشترک ہوتا اس لئے اُن کے سبق میں ہر ہر حدیث پر جُداگانہ بحث کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔حدیث کے درس میں رُوات حدیث پر جرح وتعدیل سے متعلق بقدر ضرورت مختصر بحث ہوتی۔اس کے بجائےفن حدیث پرتوجہ زیادہ دی جاتی تا کہ استنباط مسائل اورطریق استخراج کی قوت زیادہ سے زیادہ طلبہ میں پیدا ہوجائے اور وہ ائمہ فقہ کےطریق استنباط پوری طرح سمجھ سکیں۔البتہ اگر کسی سند یا راوی کی نسبت ائمہ مذاہب کوخصوصی توجہ کرنے کی ضرورت پیش آتی تو اسے زیر بحث لایا جاتا جو دوران درس ناگزیر ہوتا تھا۔(انظر،شاہ سیّد مولانا 1976ء،ص 312-313)

مگر ائمہ اربعہ کے دلائل اُن کے اصول استخراج ،مسائل اور احناف کی جانب سے ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات اس سنجیدہ اور علمی طریق سے طلبہ کے ذہن نشین کرائے جاتے کہ ائمہ اربعہ میں سے کسی امام کی وقعت وعظمت کم نہیں ہونے پاتی بلکہ نہایت وسعت نظر کے ساتھ ائمہ ثلاثہ کے دلائل و براہین طلبہ کے سامنے پیش کئے جاتے ۔چونکہ اکثر کتب حدیث وتفسیر جو دارالعلوم کے نصاب میں شامل تھیں ،شوافع اور مالکیہ کی مدون کی ہوئی تھیں اسلئے اُن ائمہ کے دلائل تو لازمی طور پر طلبہ کے سامنے آجاتے ۔اس وجہ سے اساتذہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ احناف کے مسلک دلائل وشواہد کی روشنی میں اس طرح رائج قرار دیں کہ ائمہ ثلاثہ کی مجتہدانہ عظمت اپنی جگہ پر برقرار رہے اور اس میں کوئی فرق رونما نہ ہونے پائے ۔(محبوب،رضوی سیّد 1980ء ص 263)

بڑی جماعت کے باذوق طلبہ حقدمین کی روش کے مطابق استاد کی تقریر کو قلم بند کرنا ضروری خیال کرتے ۔چنانچہ حضرت گنگوہی اور حضرت شیخ الہند کے درس ترمذی کی تقریر ،مولانا سیّد محمد انور شاہ کے درس صحیح بخاری کی تقریر العرف الشذی اور فیض الباری جو چار ضخیم جلدوں میں ہے ۔اسی ذوق املا کا نتیجہ تھیں ۔اسطرح کی املائی تقریروں میں سے یہ چند مثالیں ہیں جو چھپ چکی تھیں ۔جو نہ چھپ سکی تھیں اُن کا شمار بھی مشکل ہے ۔متاع علمی کے یہ جواہر ریزے بکثرت فضلائے دارالعلوم کے پاس موجود تھے ۔اُستاد کی تقریر اُردو میں ہوتی جو پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی البتہ جو طلبہ اُردو نہیں سمجھتے انہیں دوسری زبانوں میں سمجھانے کی کوشش کی جاتی تا آنکہ وہ اُردو بولنے کے قابل ہو جاتے ۔(Barbra Daly Metcalf 1989,P:102)

علوم وفنون کی تعلیم میں مادری زبان کو جو اہمیت حاصل ہے اسے عصری نظام تعلیم میں بڑی مدت کے بعد سمجھا جاسکا ۔یہ حقیقت ہے کہ علمی مسائل جس آسانی سے مادری زبان میں سمجھ میں آتے ہیں اور حافظے میں محفوظ رہتے ہیں وہ دوسری زبان میں ممکن نہیں ۔مگر انگریزی اقتدار کے غلبے نے قوم کا دماغ اس قدر متاثر اور مغلوب کر دیا تھا کہ وہ ایک عرصے تک اس حقیقت کا سُراغ نہ پا سکی ۔ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت کو سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن اور جامعہ ملّیہ دہلی نے محسوس کیا اور اس پر عمل درآمد شروع کر دیا جس میں دونوں جگہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور انھوں نے دوسری یونیورسٹیوں کیلئے ایک قابل تقلید مثال پیش کی پھر تو ہندوستان کی یونیورسٹیوں کی جانب سے یہ مطالبہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا کہ ذریعہ تعلیم مادری زبان قرار دی جائے ۔(عبدالصمد صارم 1976ء ص 303-304)

بہر حال اس سلسلے میں اولیت کا سہرا دارالعلوم کے سر ہے ،دارالعلوم میں جس چیز کو سو سال پہلے سمجھ لیا گیا تھا ۔بیسویں صدی کے ماہرین تعلیم بھی بالآخر اُسی نتیجے پر پہنچنے کیلئے مجبور ہو گئے ۔(''حکمت تدریس'' کے تحت جو واقعات درج کئے گئے ہیں اگر چہ ان کا تذکرہ مختلف تصانیف میں ملتا ہے مگر سب کا مفصل ماخذ ماہنامہ ''الرشید'' ساہیوال ہے ۔لہٰذا متن کو بہت سے حواشی سے زیر بار نہیں کیا گیا)

5.5 ہیئتِ تعلیم

مولانا محمد قاسم نانوتوی دوررس اور روشن خیال عالم تھے۔مولانا نے طلبہ کیلئے تفسیر،حدیث،فقہ اور اصول فقہ کو اسلامی علوم کے حصول کیلئے ضروری خیال کیا۔نیز قرآن وسنت کی تعلیم پر زور دیا۔ان علوم کی تکمیل کیلئے چھ سال کی مدت کو مناسب خیال کیا (ایچ۔بی خان 1985ء،ص 33)۔دارالعلوم دیوبند کا دروازہ ہر اُس طالب علم کیلئے کھلا ہوتا جو دینی علوم حاصل کرنا چاہتا۔مگر شرط یہ تھی کہ وہ دارالعلوم کے مقاصد اور اس کے تعلیمی نصب العین سے اتفاق کرتا ہو اور دارالعلوم کے اصول وقوانین کی پابندی کا مکمل عزم لے کر داخلے کا خواستگار ہو۔اس کی زندگی اسلامی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ان شرائط کے ساتھ اُس کا داخلہ اُس درجے میں ہوتا جس کی وہ استعداد اور صلاحیت رکھتا تھا۔بالعموم داخلہ شوال کے دوسرے ہفتے سے شروع ہو کر تیسرے ہفتے کے آخر تک ہوتا لیکن جدید طلبہ کا داخلہ اس سے کسی قدر پیشتر ہو جاتا۔

داخلے کے وقت جدید اُمیدوار استعداد کے مطابق جس جماعت کے قابل سمجھا جاتا اس میں داخل کیا جاتا۔کسی دوسری درسگاہ کی سند کی بنا پر داخلہ نہیں ہو سکتا تھا۔البتہ جو طلبہ درجات فارسی سے ترقی پا کر درجہ عربی میں داخل ہوتے وہ داخلے کے امتحان سے مستثنیٰ تھے۔درجہ قرآن مجید اور درجہ فارسی میں داخلہ درخواست کے ذریعے اور درجہ عربی میں مطبوعہ فارم کے ذریعے ہوتا۔فارم داخلہ کی دو قسمیں تھیں:فارم برائے قدیم طلبہ،فارم برائے جدید طلبہ۔قدیم سے وہ طلبہ مراد تھے جنہوں نے سال گذشتہ میں دارالعلوم ہی میں پڑھا ہو اور نووارد طلبہ کو جدید سے تعبیر کیا جاتا تھا۔فارم داخلہ کے ذریعے طالب علم اس امر کا وعدہ کرتا کہ وہ مستعدی اور یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول رہے گا اور دارالعلوم کے مروجہ قوانین کی پوری پوری پابندی کرے گا۔ایک طالب علم کو اپنی وضع قطع،نشست وبرخواست اور نوشت وخواند جیسے امور میں وضع ومعاشرت کا پابند رہنا ہوتا تھا۔(محمد ایوب،قادری پروفیسر 1966ء،ص 200)

داخلے کیلئے عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔البتہ اُن بیرونی کم سن بچوں کو جو دارالاقامہ میں تنہا نہ رہ سکیں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔کسی پیشے کی بنا پر کوئی ایسی پابندی بھی نہیں تھی جس کے سبب قوم کے کچھ افراد پر تعلیم وتعلم کے دروازے بند ہو جائیں بلکہ ہر وہ شخص جسے اکتساب علم کا کچھ بھی ذوق ہوتا وہ بغیر کسی رُکاوٹ کے علم حاصل کر سکتا تھا۔عمر اور پیشے کی قید سے مدارس عربیہ ہمیشہ آزاد رہے۔ان میں رنگ ونسل،امیر وغریب اور اونچ ونیچ کا کوئی امتیازی فرق روا نہیں رہا۔اس بناء پر ہر شخص کیلئے خواہ وہ کسی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور کتنا ہی کم مقدور کیوں نہ تھا بلا تکلف اعلیٰ سے اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہیں ہمیشہ کھلی رہیں۔مسلمانوں کی علمی تاریخ میں بے شمار ایسے علماء وفضلاء ملیں گے جو آبائی طور پر مختلف ادنیٰ واعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ایسے لوگ جنہیں اُن کے پیشوں کی وجہ سے دنیا میں نظر انداز کیا جاتا رہا۔مدارس عربیہ کی بدولت انہوں نے علم حاصل کر کے علمی اور سیاسی میدانوں میں جو عظیم الشان کارنامے انجام دیئے اُن سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔آج جس چیز کو یورپ کی دین سمجھا جاتا ہے اس کی اوّلیت کا شرف درحقیقت ہمارے مدارس عربیہ کو حاصل ہے۔(محبوب،رضوی

سیّد 1980ء ص 267)

دارالعلوم دیوبند کی ہیت تعلیم میں درج ذیل شعبہ جات نے بھی موثر کردار ادا کیا۔

(1) جمعیت الطلبہ

طلبہ میں تحریر و تقریر کا ملکہ پیدا کرنے کیلئے جلسوں کی تنظیم اور اداروں کی صلاحیت کو ترقی دینے کیلئے یہ شعبہ قائم کیا گیا۔ طلبہ اس کی بہت مشق کرتے کہ دعوت وارشاد کے فریضے کس طرح خوش اسلوبی سے انجام دیئے جاتے ہیں۔ جمعیت الطلبہ کے چار شعبے تھے۔ شعبہ تقریر عربی، شعبہ تحریر عربی، شعبہ مذاکرہ اور شعبہ مطالعہ۔ (محمد طیب، مولانا 1972ء ص 32)

(2) دارالافتاء

دارالعلوم کے قیام کے ساتھ ہی لوگوں نے دینی معاملات میں استفسار شروع کردیئے۔ ابتداءً یہ کام اساتذہ کے سپرد کیا گیا کہ فتاویٰ لکھا کریں مگر یہ کام بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک مستقل شعبہ قائم کرنا پڑا جو مفتی عزیز الرحمان عثمانی کے سپرد کردیا گیا (محمد طیب 1965ء ص 100)۔ بقول مولانا محمد یوسف بنوری: مفتی عزیز الرحمٰن نے مختلف سوالات کے جوابات میں پچاس ہزار فتاویٰ صادر کئے (حافظ اکبر، شاہ بخاری 2001ء ص 195)۔ اسوقت سے اب تک وہ لوگ اس خدمت پر مامور ہوتے جنہیں فقہ میں زیادہ سے زیادہ بصیرت حاصل تھی۔ روزمرہ کے معمولی مسائل کے علاوہ اہم پیچیدہ و غور طلب مسائل، پنچائتوں کے فیصلے عدالتوں کی اپیلیں اور مختلف الاحکام فتاویٰ کثرت سے آتے۔ یہ دارالافتاء کا فرض رہا ہے کہ وہ دریافت کرنے والوں کو پوری تحقیق اور صحت کے ساتھ مسائل شرعیہ بتائے۔ عوام کے علاوہ علماء بھی اکثر مسائل میں اس طرف رجوع کرتے۔ دارالافتاء کا کام عام اور خاص مسلمانوں میں ہمیشہ اطمینان اور وقعت کی نظروں سے دیکھا گیا (محمد عبداللہ سلیم 1976ء ص 203-204)۔ 1911ء سے 1951ء کے عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار فتوے دیوبند کے دارالافتاء سے صادر ہوئے۔ (مناظر احسن، گیلانی سیّد 1953ء ص 386)

(3) شعبہ تبلیغ

ملک میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ جنگ آزادی سے قبل قاضی بدرالدولہ مدراسی، عباس علی جاجموی، آل حسن موہانی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایوانی جیسے علماء نے ان کا کھل کر مقابلہ کیا۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے یہاں تک کہ دہلی کی مشہور شاہجہانی مسجد کو گرجا میں تبدیل کرنے کے ارادے کئے گئے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ انگریزی حکومت نے ایک خطرناک سازش یہ کی کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا تفوق اور غلبہ رہا تھا۔ انگریزوں نے اپنی پالیسیوں کے ذریعہ ہندوؤں کو بڑھایا اور مسلمانوں کو گھٹایا۔ (محمد ایوب، قادری پروفیسر 1983ء ص 157)

(4) شعبہ تجوید کا قیام

دارالعلوم میں ابتداءً فن تجوید کا کوئی مستقل شعبہ نہیں تھا لیکن اس کی ضرورت کا احساس برابر کیا جاتا رہا اکی شدید ضرورت کے پیش نظر مستقل شعبہ تجوید کا اجراء عمل میں لایا گیا اور سب سے پہلے اس شعبہ میں قاری عبدالوحید خاں الہ آبادی کو بلایا گیا جو قاری عبدالرحمٰن مکی کے تلامذہ میں سے تھے (انظہار احمد تھانوی 1976ء ص 650)۔ ہر طالب علم کیلئے ایک سال تجوید کی کتاب پڑھنا ضروری قرار دیا گیا۔ طالب علم جب تک فوائد مکیہ باضابطہ طور پر نہیں پڑھ لیتا اسے فاضل کی سند نہیں دی جاتی تھی۔ (دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء ص 24)

(5) شعبہ طب

اس احساس کے ساتھ ہی کہ فن طب انسانی خدمت کا ایک بہتر ذریعہ ہے اور ایک باعزت ذریعہ معاش بھی، دارالعلوم میں طبّ کا نصاب شروع کیا گیا اور مہتمم مولانا محمد طیّب نے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت سے جامعہ طبّیہ کے قیام کی مجلس شوریٰ سے سفارش کی۔ چنانچہ اس کا الگ اجراء اور قیام عمل میں آیا۔ اوّلاً یہ بات ملحوظ رکھی گئی کہ دارالعلوم میں فن طبّ کا ایسا استاد رکھا جائے جو حدیث وغیرہ کے ساتھ ہی فن طبّ کی کتابوں پر بھی بصیرت رکھتا ہو لیکن مستقل شعبہ کی حیثیت سے عمل میں آ جانے کے بعد یہ بات تسلسل کے ساتھ جاری نہیں رکھی جا سکی مگر پھر بھی ایسے ہی اساتذہ کو ترجیح دی جاتی تھی۔ جو اسلاف کے طریقہ اور علم حدیث سے مناسبت رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے جامعہ طبّیہ سے ہر سال کافی طلبہ فراغت حاصل کرتے رہے۔ اور مختلف مقامات پر کامیابی کے ساتھ مطب چلاتے رہے۔ اس کے ساتھ درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ (مناظر احسن، گیلانی سیّد (س ن) ب ص 328)

(6) دارالعلوم کا کتب خانہ

اس زمانہ میں ہندوستان کا مشہور عربی کتب خانہ منشی نول کشور کا تھا۔ مختلف سنین کی روئدادوں میں ان کی طرف سے کتابیں بھیجنے کا تذکرہ موجود ہے اور خاص طور پر ان کے تعاون کا شکریہ ادا کیا گیا۔ موصوف نے جب اپنا اخبار "اودھ" کے نام سے نکالا تو وہ اسے بھی دارالعلوم کے لئے پابندی کے ساتھ بلا قیمت بھیجتے رہے۔ اس طرح راؤ امر سنگھ نے اپنا اخبار "سفیر بڑھانہ" بھی دارالعلوم کیلئے بلا قیمت بھیجنا شروع کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ قسطنطنیہ سے "الجواب" نامی عربی اخبار بلا قیمت یہاں آنے لگا۔ یہی کتب خانہ رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک وسیع رقبہ میں پھیل گیا۔ اس میں کم و بیش ڈیڑھ لاکھ کتابیں تھیں (احسان دانش 1976ء ص 497)۔ اسلامی کتب کا جتنا بڑا ذخیرہ دارالعلوم کے کتب خانہ میں تھا برصغیر میں اس کی کوئی مثال نہیں۔ ہندوستان کے بہت سے عالموں کے کتب خانے ان کی وفات کے بعد یہاں منتقل ہوتے رہے۔ پہلے پہل یہ کتابیں احاطہ نودرہ کے بعض کمروں میں تھیں لیکن بعد میں اس کی عمارت کا دارالمشورہ سے متصل دوسری منزل پر سنگ بنیاد رکھا گیا۔ جو اس وقت اُردو ہال کے نام سے موسوم تھا۔ (محمد طیب، مولانا (س ن) ص 30)

اس کتب خانہ کی پہلی تنظیم مولانا عبدالحفیظ صاحب دربھنگوی نے کی جو شیخ الہند کے ممتاز شاگرد تھے۔ بعد میں

دوسرے علماء نے یہ ترتیب جاری رکھی ۔بعد ازاں دارالعلوم کی جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پر اس کی جدید ترتیب ضروری سمجھی گئی ۔چنانچہ مدیر کتب خانہ کے سپرد یہ ذمہ داری کی گئی ۔اب ترتیب زبان وار اور فن وار ہے۔جدید تقاضوں کے مطابق اس کتب خانہ میں کارڈ سسٹم جاری کیا گیا۔اس کے بعد مہتمم نے اکابر دارالعلوم کی تصانیف کیلئے الگ ایک کمرہ مخصوص کیا اور اس میں ہر مصنف کی کتابیں مہیا کی گئیں ۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے لیکر اس وقت تک کے اکابر علماء کی تصانیف کا ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ قلمی کتابوں کا دو ضخیم جلدوں میں تعارف لکھا گیا اور چھپوایا گیا۔دنیائے علم میں یہ سعی اور خدمت بہت سراہی گئی۔(محبوب،رضوی سیّد 2005ء الف،ص 372)

5.6 وسائل

اس مدرسہ کی تعلیمی اُٹھان بہت بلند اور نتیجہ خیز تھی اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔چند ہی سال میں چھتہ کی مسجد جس سے مدرسے کا آغاز ہوا تھا ناکافی ثابت ہوئی ۔اس لئے اوّلاً جامع مسجد میں جو اس زمانہ میں تعمیر ہو رہی تھی قدیم طرز کے مطابق دالان اور حجرے بنائے گئے جس میں مدرسہ منتقل کیا گیا۔مگر جلد ہی یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو 1874ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم کیلئے آبادی سے باہر ایک کشادہ اور وسیع عمارت کی تجویز پیش کی ۔یہ تجویز حاجی عابد حسین کے اختلاف کے باوجود عام طور پر پسند کی گئی اور اس کے لئے چندہ جمع ہونا شروع ہو گیا (سیّد ہاشمی فرید آبادی 1990ء،ص 476)۔چندے کیلئے جس نے سب سے پہلے رومال پھیلایا اور جس نے سب سے پہلے چندہ دیا وہ حاجی عابد حسین تھے۔تھوڑی ہی دیر میں چار سو روپے جمع ہو گئے تو ایک اشتہار کے ذریعہ قیام مدرسہ کا اعلان کیا گیا کہ اس وقت تک چار سو ایک روپے آٹھ آنے کا چندہ جمع ہو چکا ہے اور سولہ طالب علموں کی خوراک وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔(محمد ایوب قادری پروفیسر 1983ء،ص 154-155)

پہلے سال کے اختتام تک طلبہ کی تعداد 78 ہو گئی جس میں دیوبند اور اس کے قرب وجوار کے علاوہ متعدد دور دراز مقامات بنارس، پنجاب، افغانستان، خراسان، بنگال وآسام، کشمیر، مدراس اور مالابار تک کے لوگ آتے ، فضیلت کی دستار باندھ کر واپس جاتے اور دیوبند کا نام پھیلاتے تھے۔پچاس برس میں تعلیم پانے والوں کا شمار ایک ہزار کے قریب آ گیا (سیّد ہاشمی فرید آبادی 1990ء،ص 478)۔دارالعلوم کی کوئی مستقل آمدنی نہیں تھی اور نہ کبھی اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ دارالعلوم کیلئے مستقل آمدنی پیدا کرنے کی سعی کی جائے۔مولانا فضل الرحمٰن جو ادارے کی تاسیس کے زمانے سے اس کے شریک کار تھے، کے مطابق بانی کی وصیت ہے کہ: جب اس کیلئے کوئی سرمایہ بھروسے کا ذرا ہو جائیگا۔پھر یہ قندیل معلق اور توکل کا چراغ یہ سمجھ لینا کہ بے نور وضیا ہو جائے گا۔(فضل الرحمٰن،مولانا عثمانی 1981ء،ص 36)

اس لئے منتظمین دارالعلوم کی نظر وسائل وذرائع کی بجائے ہمیشہ خالق کائنات کے فضل وکرم پر رہی ۔دراصل یہ

ہی وہ سرمایہ توکل تھا جس کے اعتماد اور بھروسے سے بڑے بڑے کام دارالعلوم میں شروع کر دیئے گئے اور وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پورے ہوگئے ۔دارالعلوم کے خزانے میں کسی وقت بھی اتنی رقم جمع نہیں رہی جو دو تین ماہ کے مصارف کیلئے کافی ہو سکے۔ دارالعلوم کے آمد و صرف کی بنیاد ہمیشہ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ پر رہی (محبوب، رضوی سیّد 1972ء ص 337)۔روز بروز دارالعلوم مرحلہ وار ترقی کرتا رہا۔سر پرست مدرسہ مولانا نانوتوی کے مطابق عالمِ مثال میں اس مدرسہ کی شکل ایک معلق ہانڈی کی ہے۔جب تک اس کا مدار توکل اور اعتماد اللہ پر رہے گا یہ مدرسہ ترقی کرتا رہے گا۔ساتھ ہی آپ نے دارالعلوم کیلئے زریں اصول بھی خود تحریر کئے۔یہ اصول بظاہر سادہ مگر درحقیقت الہامی اور بڑے دوررس تھے۔یہاں ہم یہ اصول جن کی تعداد آٹھ ہے پیش کرتے ہیں۔(محمد طیب ٗ قاری 1991ء ص 172-173)

اصول ہشتگانہ دارالعلوم دیوبند

- ناامقدور کارکنان مدرسہ کی نظر ہمیشہ تکثیر چندہ پر رہے وہ کوشش کریں اور اوروں سے بھی کروائیں۔خیر اندیشان مدرسہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں۔
- انتظام طعام طلبہ، بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔
- مُشیران مدرسہ ہمیشہ یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ اگر اس طرح کی نوبت آئے کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو اس سے مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آ جائے گا۔القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبیٔ مدرسہ ملحوظ رہے۔سخن پروری نہ ہو۔سامعین بنیت نیک اسے سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آ جائے گی تو وہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بدل وجان قبول کریں گے۔نیز اسی وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں۔یا کوئی وارد و صادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو اور نیز اس وجہ سے ضروری ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی تعداد معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا۔ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہو سکتے ہیں۔
- یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں، اور مثل علمائے روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔
- خواندگی مقررہ اس انداز سے ہو جو پہلے تجویز ہو چکی ہے۔یا بعد میں کوئی اور انداز مشورے سے تجویز ہو تو وہ پورا ہو جایا کرے، ورنہ مدرسہ اوّل خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔
- جب تک کی آمدنی کی آمدن کی کوئی سبیل یقینی نہیں، تب تک یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا۔

اگر آمدنی کی کوئی ایسی یقینی صورت حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر، کارخانہ، تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائیگا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

— سرکاری اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔(محمد اکرام، شیخ 2004ء ص 141)

— ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جنہیں اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو، اہل حسن نیت کا چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔(محمد یوسف قریشی 1404ھ ص 81)

ان اصولوں پر بار بار غور کیا جائے کہ یہ کیسے جامع اور کتنی عمدہ ہدایات پر مشتمل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں تنظیم مدارس کا پورا منصوبہ اور جذبہ کارفرما ہے۔ اراکین شوریٰ، مہتمم مدرسہ، مدرسین اور کارکنان مدرسہ سبھی کیلئے ان میں روشنی موجود ہے۔ تکثیر چندہ اور اس کیلئے سعی، طلبہ کی امداد اور اس میں اضافہ، اراکین شوریٰ کا مخلص، صاف گو اور ہمدرد مدرسہ ہونا اور مہتمم مدرسہ کا مشورہ طلب امور میں مشورہ کرنا کسی دور اندیش سے مخفی نہیں مگر بانی کی وصیت کے مطابق جب کوئی متعین آمدنی نہ ہوگی تو اللہ پر اعتماد ہوگا اور یوں دعاؤں کے ساتھ سعی مسلسل بھی ہوگی۔ پھر اس کے نتیجہ میں غیبی امداد کے دروازے بھی کھلے رہیں گے۔ اسی وجہ سے ارباب مدرسہ کو سرکار و امراء کی امداد سے حتی الوسع اجتناب کا مشورہ دیا گیا۔(خورشید احمد، پروفیسر 1977ء ص 82)

دارالعلوم کا آغاز جس بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا اسے دیکھتے ہوئے دارالعلوم کے نظم و نسق کا مشاورت کے اصول پر مبنی ہونا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت جمہوری نظام سے لوگ عام طور پر آشنا یا مانوس نہ تھے۔ دارالعلوم نے اسلامی طرز پر مجلس شوریٰ کی بنیاد رکھی اور یہ نظام کامیابی کے ساتھ چلا کر قوم کے سامنے ایک عمدہ مثال قائم کردی۔ اس طرز فکر کا یہ نتیجہ نکلا کہ انتظامات میں بڑی وسعت کے ساتھ جمہوری انداز بھی قائم ہوگیا۔ ارباب مشورہ میں جو صفات ضروری ہیں۔ اس کی نسبت مولانا نانوتوی نے اپنے تحریر کردہ دستور العمل کی تیسری دفعہ میں جو ہدایت فرمائی تھی اس سے تعمیری نکتہ چینی کی راہ کھل گئی جو کسی ادارے کی ترقی کیلئے بڑی ضروری ہے۔(محمد ایوب، قادری پروفیسر 1983ء ص 156)

مجلس شوریٰ ایک طرف تو چندہ دینے والوں کی نمائندگی کرتی تھی یعنی اسے چندہ دینے والوں کے شرعی وکیل کی حیثیت حاصل تھی تو دوسری طرف دارالعلوم کے آمد و صرف اور اہم انتظامی امور پر کثرت رائے سے اپنے فیصلے بھی صادر کرتی رہی۔ مجلس شوریٰ انتظامی کلیات و ضوابط بھی وضع کرتی تھی۔ دارالعلوم کے اوقاف اور اس کی جائیدادیں اس کی تولیت و نگرانی میں تھیں۔ یہی مجلس دارالعلوم کے مسلک کی حفاظت اور ملازمین کے عزل و نصب کی ذمہ دار بھی تھی۔ اس کا اجلاس سال بھر میں کم از کم دو مرتبہ لازمی ہوتا تھا۔ مجلس شوریٰ کے ارکان کا انتخاب ملک کے ممتاز اور بااثر علماء میں سے کیا جاتا تھا۔ دستور کی رو سے مجلس شوریٰ میں کم از کم گیارہ اراکین کا عالم ہونا ضروری تھا۔ بقیہ دس رکن ایسے غیر عالم حضرات ہو سکتے تھے جو انتظامی اور تعلیمی امور میں بصیرت و مہارت رکھتے تھے۔ انعقاد اجلاس کے لئے اراکین کی ایک تہائی تعداد کا

شریک اجلاس ہونا ضروری تھا۔(محمد طیب' قاسمی 1968ء ص 17-19)

مجلس شوریٰ کے ماتحت "مجلس عامہ" تھی (محمد ایوب، قادری پروفیسر 1976ء ص 491)۔جس کے اراکین کی تعداد 9 تھی۔ہر تیسرے مہینے اس کا اجلاس ہوتا تھا۔اس کا کام مجلس شوریٰ کے کاموں میں اعانت تھا۔ان دونوں مجالس کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ اگر چہ فیصلے کیلئے کثرت رائے کا ضابطہ رکھا گیا تھا۔مگر ان کے فیصلے کثرت رائے کی بجائے بالعموم اتفاق رائے سے طے ہوتے تھے۔(محمد اسلم، پروفیسر (س ن)ص 144)

دارالعلوم میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک مفت انتظام تھا۔ہر سال تقریباً ڈیڑھ ہزار طلبہ تعلیم سے فارغ ہوتے تھے۔جن کے لئے خوردونوش، گرمی اور سردی کے کپڑے، دارالاقامہ میں جگہ، روشنی، پانی، علاج اور زیر درس کتب کا بھی مفت انتظام کیا جاتا تھا۔یہ سارے مصارف چندے سے پورے ہوتے تھے۔دارالعلوم دنیا میں ایک آزاد تعلیم گاہ تھی جہاں ہر شخص بقدر واستعداد علم حاصل کرسکتا تھا۔دارالعلوم کے ابتدائی درجات میں مسلمان بچوں کے دوش بدوش ہندو بچے بھی تعلیم پاتے تھے۔دارالعلوم میں جن قواعد پر عمل ہورہا تھا ان میں پہلی دفعہ یہ تھی کہ چندے کی کوئی مقدار نہیں اور نہ خصوصیت مذہب وملّت ہے۔(محبوب، رضوی سیّد 2005ء الف ص 158-159)

اسی بنا پر دارالعلوم میں غیر مسلموں کا چندہ بھی ہمیشہ بے تکلفی سے قبول کیا جاتا رہا۔چنانچہ روداد ہائے دارالعلوم چندہ دہندگان کی فہرست میں جا بجا ہندوؤں کے چندے بھی درج ہیں۔ابتدائی سالوں کی رودادوں میں تو اکثر ہندو چندہ دینے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔مگر درمیانی اور آخری سالوں میں بھی کہیں کہیں ہندوؤں کے نام مل جاتے ہیں (مناظر احسن، گیلانی سیّد (س ن) ب، ص 317)۔دارالعلوم کا چندہ مذہب وملّت کی تخصیص سے بالاتر رکھا گیا تھا۔حکومت کی امداد کبھی قبول نہیں کی گئی تھی۔اس بارے میں مولانا نانوتوی کی اس بنیادی ہدایت پر عمل کیا گیا تھا کہ سرکار اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔(محبوب، رضوی سیّد 1972ء ص 337-339)

برطانوی دور حکومت میں بارہا ایسے مواقع پیش آئے مگر دارالعلوم کے اکابر اپنی روایت پر سختی کے ساتھ قائم رہے۔1957ء میں صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد جب دارالعلوم آئے تو انہوں نے دارالعلوم کی عظیم علمی خدمات کے پیش نظر فیصلہ کیا کہ وہ حکومت کی جانب سے دارالعلوم کو ایک گراں قدر امداد دینا چاہتے ہیں تو دارالعلوم کی جانب سے سابقہ روایات کے مطابق شکریے کے ساتھ معذرت کردی گئی۔مگر جب صدر جمہوریہ نے اپنی طرف سے ایک ہزار روپے دینے چاہے تو اسے خوشی سے قبول کرلیا گیا۔1870ء میں جب کتب کی ضرورت کیلئے دارالعلوم کی جانب سے اہل مطابع کے نام اپیل کی گئی تو اس باب میں پیش قدمی کرنے کی سعادت ہندوستان کے مشہور ناشر منشی نول کشور کو حاصل ہوئی۔(مناظر احسن، گیلانی سیّد (س ن) ب ص 314)

دارالعلوم کی جانب سے طلبہ کے قیام وطعام، لباس، علاج اور دوسری لازمی ضروریات کا بندوبست کیا جاتا تھا۔لیکن اجرائے وظائف میں یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ طلبہ میں تعلیمی امور سے بے رغبتی اور مفت خوری کی عادت پیدا نہ ہونے

پائے ۔بلکہ وہ ہمہ تن تعلیمی مشاغل میں منہمک رہیں ۔اس لئے تمام وظائف ایک سال کیلئے جاری کئے جاتے تھے۔ایک سال بعد ان کی تجدید ہوتی تھی ۔طالب علم اگر کسی وقت بھی امتحان میں ناکامیاب ہوتا تو وظیفہ بند کردیا جاتا تھا تا آنکہ وہ اجرائے امداد کے قانون کے مطابق اوسط درجے کی کامیابی حاصل نہ کرلیتا ۔البتہ دارالاقامہ میں قیام کے لئے جگہ اور کتب خانہ سے سال متعلقہ کی زیردرس کتب بلاتخصیص مستحق وغیر مستحق ہر طالب علم کو چند روز کے لئے مُفت دی جاتی تھیں۔وظیفے کی دو قسمیں تھیں۔کھانا اور نقد۔(محبوب،رضوی سیّد 2005ءالف،ص 225)

کھانے کیلئے مطبخ تھا جہاں سے ہر طالب علم کو ایک وقت میں دو تنوری روٹیاں دی جاتیں جو 250 گرام آٹے کی ہوتی تھیں ۔دوپہر کو دال اور شام کو کھانے میں گوشت دیا جاتا تھا۔کھانے کے علاوہ مختلف مقدار میں نقد وظائف بھی دیئے جاتے جو پچاس روپے ماہانہ تک ہوتے تھے ۔یہ دونوں قسم کے وظائف دارالعلوم کی اصطلاح میں "امداد" کہلاتے تھے۔جن طلبہ کی امداد جاری ہوجاتی انہیں سال بھر میں چار جوڑے کپڑے،دو جوڑی جوتے اور سردی کے موسم میں لحاف بھی دیا جاتا تھا۔(محمد طیب،مولانا 1972ء،ص 89)

حجروں میں روشنی اور کپڑوں کے دھلائی کیلئے ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔بیمار طلبہ کے علاج کیلئے معالج مقرر تھے۔طلبہ کو دوا مفت مہیا کی جاتی اور کھانا پرہیزی ملتا تھا۔ان امور کے علاوہ احاطہ دارالعلوم کی تمام گزرگاہوں میں روشنی،اقامت گاہوں میں پانی کے نل اور موسم سرما میں مسجد دارالعلوم میں گرم پانی کا انتظام خصوصیت کے ساتھ کیا جاتا۔دارالعلوم میں داخل تمام طلبہ کو کتب خانے سے زیر درس کتابیں کسی معاوضے کے بغیر ایک سال کیلئے مستعار دی جاتیں ۔طالب علم کو مالی امداد ملتی ہو یا نہ۔دونوں صورتوں میں اس سے دارالاقامہ کے کمرے کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔(دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء،ص 19-20)

دارالعلوم کے قیام کے پہلے سال ہی یہ اعلان کیا گیا تھا کہ دارالعلوم طلبہ کو قیام کے ساتھ طعام کی سہولت بھی مہیا کرے گا۔عرصہ تک اس کی صورت یہ رہی کہ شہر دیوبند کے خوشحال گھرانوں کے ذمہ ایک یا دو طالب علموں کو حسب توفیق کھانا دینا طے کیا گیا۔اور وہ کھانا دیتے رہے۔جن کا انتظام گھروں میں نہیں ہوا تو انہیں نقد وظائف دیئے جاتے تھے۔جس سے وہ خود اپنے کھانے کا انتظام کرتے تھے۔مگر جب طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی اور شہر والوں کو ان سب کو کھانا دینا مشکل ہوگیا اور ادھر نقد وظائف پانے والے طلبہ کا قیمتی وقت کھانا پکانے میں ضائع ہونے لگا تو ارباب مدرسہ نے مطبخ جاری کر دیا۔اسکے لئے معقول تعداد میں ملازمین رکھے گئے۔پھر غیر مستطیع طلبہ کو بلا قیمت اور مستطیع طلبہ کو قیمتاً مطبخ سے پکا ہوا کھانا دینے کا انتظام کیا گیا۔اس شعبہ سے ڈیڑھ سے دو ہزار طلبہ تک کا کھانا دونوں وقت روزانہ تیار کیا جاتا اور تقسیم کیا جاتا۔ (محمد طیب،قاری (س ن) ص 30)

وسائل کی تعمیراتی کھپت/ترقی

طلبہ کے قیام کی سہولت کیلئے مختلف اوقات میں دارالاقامہ کی عمارت میں اضافہ ہوا۔اس سلسلے میں سب سے پہلی عمارت نودرہ کی تھی۔جس کا پورا حلقہ اس وقت درس گاہوں اور کشادہ ہال پر مشتمل تھا۔لیکن جیسے جیسے طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی عمارت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔سب سے پہلے ایک احاطہ دارالعلوم میں دارالطلبہ کے نام سے تیار ہوا،جس کی بطور خاص خوشی منائی گئی،اس کے ساتھ صدر دروازہ پر دارالمشورہ کی عمارت تیار ہوئی۔قدیم مہمان خانہ بنا۔طلبہ کی تعداد جب دوگنی ہوگئی تو دار جدید کی بنیاد ڈالی گئی اور اس کی تعمیر کا کام عرصہ تک جاری رہا۔اس دارالاقامہ کی تکمیل 1360ھ میں ہوئی،یہ دارالعلوم کا سب سے وسیع دارالاقامہ تھا۔جس میں 109 کمرے صرف نچلی منزل میں تھے بعد میں اتنے ہی کمرے اوپر کی منزل پر بنا دیئے گئے۔بلکہ یہ تعدا کچھ زائد ہی ہے۔(محبوب' رضوی سیّد 2005ءالف،ص 185)

درمیانی مدّت میں حسب ضرورت اور بھی دارالاقامہ بنائے گئے جن میں افریقی منزل قدیم وجدید قابل ذکر ہیں۔اس دارالاقامہ میں کافی کشادگی تھی۔چھتے کی مسجد کے سوا کوئی دوسری مسجد نہیں تھی۔یوں قیام پذیر طلبہ کے نماز پڑھنے میں دشواری پیش آتی تھی لہٰذا دارالعلوم کی مسجد کی بنیاد ڈالی گئی۔بعد میں اس مسجد کی بالائی منزل بنی۔اس کے بعد دیوبند کے ریلوے اسٹیشن کے متصل بھی ایک مسجد بنائی گئی تاکہ مسلمان مسافروں کو نماز پڑھنے میں سہولت رہے بعدازاں اس مسجد میں چار صفوں کی جگہ کا اضافہ کیا گیا اور اس کی مرمت وتزئین کے بعد اس کی رونق دوبالا ہوگئی۔جمعہ کی نماز میں دشواری کا بڑی حد تک اس سے ازالہ بھی ہوگیا۔(محبوب' رضوی سیّد 1980ء،ص 38-40)

دارالحدیث کی بالائی منزل پر دارالتفسیر کے نام سے ایک عمارت بھی بنائی گئی۔دارالعلوم کی یہ سب سے بلند عمارت تھی،اس پر عمدہ گنبد بنا تھا جو اپنی بلندی اور عظمت میں ممتاز اور بہت دور سے نظر آتا تھا۔اس سے بعد کے سال اس کی صفائی اور تزئین میں مزید اضافہ ہوا۔جب مولانا قاری محمد طیّب مہتمم دارالعلوم دیوبند افغانستان تشریف لے گئے تو شاہ محمد ظاہر سابق والئی افغانستان نے ایک رقم پیش کی۔واپس آکر مہتمم صاحب نے مزید روپیہ چندہ کرکے باب الظاہر کے نام سے غربی دروازہ تیار کرایا،ان کے علاوہ بھی مختلف زمانوں میں مختلف عمارات بنیں،جیسے دارالقرآن،یادگار سعدی،کتب خانہ کا جدید ہال،دفتر محاسبی،دفتر تنظیم وترقی،جدید مہمان خانہ،جامعہ طبیہ،دارالمدرسین وملازمین اور دیگر درس گاہیں وغیرہ۔(خورشید احمد' پروفیسر 1977ء،ص 81)

گویا دارالعلوم کا سب سے بڑا سرمایہ توکل علی اللہ صبر واستقامت کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہنا اور اپنی ہر قسم کی ضرورتوں کیلئے اسباب ظاہر سے بے نیاز ہو کر اللہ کی ذات پر بھروسہ تھا۔

5.7 مسائل

دارالعلوم دیوبند ہماری گذشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں روشنی کا ایک مینار رہا ہے اس نے خطے کی علمی، ثقافتی اور سیاسی زندگی میں بڑا فعال کردار ادا کیا ہے اور یہ ثابت کردیا کہ قوموں کی تاریخ بنانے والے اداروں کا انحصار بلندو بالا عمارات اور سازو سامان کی فراوانی پر نہیں بلکہ اخلاص، سعی پیہم توکل علی اللہ اور اعانت مسلمین پر ہے۔ یہ تو ہے دیوبند کا تاریخی کردار لیکن اگر ہم تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیں تو دیوبند ہمیں مسائل کا شکار بھی نظر آتا ہے مثلاً

- مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کی تعلیم کو دیوبند کے نصاب میں کوئی اہم مقام حاصل نہ تھا۔ اس مسئلہ پر مولانا ابوالکلام آزاد نے زوردار آواز میں شکایت یوں کی: آج صدیوں سے مسلمانوں کی ذہنی ترقی کو جس چیز نے روک رکھا ہے۔ اس کا ذمہ دار صرف نصاب تعلیم ہے۔ ایک قوم کے بنانے اور بگاڑنے میں تعلیمی نصاب کا جو دخل ہوسکتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ کوئی نصاب تعلیم دوامی نہیں ہوتا۔ مختلف مقاصد کیلئے مختلف نصاب ہوں گے۔ ایک انجینئر کو اور طرح کی ضرورت ہے۔ ایک مذہبی عالم کی ضروریات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے قدیم مدارس کی قومی نظام میں ایک باعزت جگہ ہے اور ہمارا مذہبی نظام اور ہماری قدیم تہذیب برقرار رکھنے میں انہوں نے مفید کام کیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ قدیم نصاب سے چمٹے رہنے کی وجہ سے وہ ہماری مذہبی ضروریات بھی کماحقہ، پوری نہیں کر سکے۔ کئی علوم مثلاً اسلامی تاریخ کا دروازہ انہوں نے اپنے لئے خود بند کیا۔ (محمد اکرام شیخ 1975ء؛ ص 609)
- دارالعلوم کا نظم ونسق مجلس شوریٰ چلاتی تھی۔ وہی بجٹ پاس کرتی۔ عزل ونصب کے اختیارات شوریٰ کے ہاتھ میں تھے۔ جبکہ تعلیمی امور صدر مدرس کے پاس۔ دارالعلوم کے بانیوں نے چند اصول مقرر کئے تھے۔ جن پر کافی عرصہ تک عمل ہوتا رہا۔ بلکہ 1928ء تک دارالعلوم کا نظم ونسق بڑے احسن طریقے سے چلتا رہا۔ اسی سال چند نامور اساتذہ اور مہتمم دارالعلوم مولانا حبیب الرحمٰن عثمان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہوگئے۔ جس کے نتیجے میں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے۔ بنیادی ارکین کا ادارہ سے دور چلے جانا از خود نہ صرف اختلافی بلکہ انتظامی مسئلہ تھا۔ (محمد منظور نعمانی مولانا (س ن) ص 6-7)
- 1286ھ میں دارالعلوم کو کونا کوں مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سال تپ ولرزہ نے وبائی شکل اختیار کر لی۔ اساتذہ اور طلبہ سب ہی اس وبائی مرض کا شکار ہوگئے۔ مرض نے اس قدر طول کھینچا کہ مسلسل پانچ ماہ تک تعلیم نہ ہوسکی۔ مرض کے رفع ہوتے ہی طلبہ جمع ہوگئے اور مدرسین کی انتھک کوشش سے سال کے آخری حصے میں خواندگی مکمل کی جا سکی۔ اسی کے ساتھ ہمدردانِ دارالعلوم ملک گیر قحط اور گرانی کی وجہ سے بھی پریشان رہے۔ (محبوب

رضوی سیّد 2005ء ب ص 165)

مندرجہ بالا مسائل کے باوجود دیوبند کی تعلیمی تحریک نے اسلامی علوم وروایات کو طوفانوں کے تھپیڑوں میں قائم اور جاری رکھا۔

5.8 نظام امتحانات

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی ترقی شروع ہی سے بلند، صحیح اور نتیجہ خیز رہی۔ اس نے اپنی عمر کی ابھی دوسری منزل ہی طے کی تھی کہ یہاں ایسے طلبہ تیار ہوگئے جو تدریسی خدمات انجام دے سکتے تھے۔ پہلے سال کا سالانہ امتحان (جس میں 78 طلبہ شریک تھے) مولانا محمد قاسم، مولانا مہتاب علی اور مولانا ذوالفقار علی نے لیا۔ ان حضرات نے نتیجہ کے ساتھ روداد میں حسب ذیل تاثرات کا اظہار فرمایا: ہم نے کئی روز تک امتحان مفصل ہر دفعہ لیا اور حتی الوسع سوالات مشکل پوچھے اور نمبر ہر طالب علم کے ہر ایک کتاب کی بابت لگائے۔ حال مدرسہ بالعموم قابل تعریف پایا۔ مدرّسان کی سعی اور طلبہ کی محنت اس امتحان سے بخوبی ثابت ہے۔ (محبوب رضوی سیّد 2005ء الف ص 161)

دارالعلوم دیوبند اور امتحانات

یہ کہنا تو آسان نہیں کہ اُس وقت مدارس عربیہ میں امتحانات کا عام طریقہ مروج تھا۔ تاہم بعض مدارس کے حالات سے چلتا ہے کہ ان میں طلبہ کا سالانہ امتحان لیا جاتا تھا چنانچہ بیجاپور کی تاریخ بستان السلاطین میں وہاں کے مدارس کے حالات میں لکھا ہے کہ: ہر سال امتحان می شد (محمد میاں سیّد مولانا 2004ء ص 131)۔ مگر قیام دارالعلوم کے قریبی زمانہ میں یہ رواج ترک کیا جا چکا تھا اور مدارس عربیہ میں سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان کا طریقہ جو طالب علم کی استعداد کا اندازہ کرنے کا ایک مناسب ذریعہ ہے، مروج نہیں تھا۔ طالب علم جب استاد سے ایک کتاب پڑھ لیتا تو دوسری کتاب بغیر امتحان لئے شروع کرادی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں طالب علم کی استعداد جانچنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ بسا اوقات نالائق طالب علم بھی ترقی کی منزلیں طے کرتا چلا جاتا تھا۔ دارالعلوم نے یہ نقص محسوس کرتے ہوئے یہ طریقہ ختم کیا اور سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان لازمی قرار دیئے۔ (مناظر احسن گیلانی سیّد (س ن) الف ص 34)

دارالعلوم میں مروج امتحانی قواعد کافی سخت تھے۔ یہاں پرائیویٹ امتحان کا قاعدہ نہیں تھا۔ ہندوستان کے مدارس میں غالباً بیجاپور ہی کی یہ خصوصیت تھی کہ وہاں سالانہ امتحان ہوتا تھا۔ ورنہ دوسرے مدارس کی تاریخ میں سالانہ امتحان کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور یہ تو بالکل یقینی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے متصل زمانے میں ہندوستان میں سالانہ امتحان کا قطعاً رواج نہ تھا۔

قوانین امتحانات

امتحان جو طلبہ کی تعلیمی استعداد اور اساتذہ کی محنت کی جانچ ہے اور جس پر ترقی درجات کا انحصار ہے، بہت ضروری ہے۔لیکن جس طرح دارالعلوم کو حکومت کے اثر سے بالکل علیحدہ رکھا گیا اسی طرح امتحان میں کسی بیرونی مداخلت کو بھی پسند نہیں کیا گیا۔نصاب تعلیم خود اس کا اپنا مجوزہ تھا اور امتحانات بھی وہ خود ہی اپنی نگرانی میں لیتا تھا۔

امتحانات دو قسم کے ہوتے تھے۔ایک امتحان داخلہ: یہ ان طلبہ کا ہوتا جو کسی دوسرے مدرسہ سے آ کر دارالعلوم میں داخل ہونا چاہتے۔یہ امتحان عام طور سے شوال میں ہوتا۔اس امتحان میں خاصی سختی برتی جاتی تھی۔بسا اوقات نصف سے زائد طلبہ ایسے ہوتے جنہیں امتحان میں ناکام ہونے کے باعث واپس ہو جانا پڑتا۔دوسرا امتحان خواندگی۔یہ سال میں تین مرتبہ لیا جاتا تھا۔سہ ماہی ماہ صفر میں اور ششماہی ماہ جمادی الاوّل میں۔سالانہ امتحان رجب کے آخری ہفتہ سے شروع ہو کر شعبان کے عشرۂ دوم میں ختم ہوتا تھا۔(محبوب رضوی سیّد 1980ء ص 268)

امتحانات میں سخت نگرانی کی جاتی۔پہلے اور دوسرے سال کی تمام اور تیسرے سال کی چند کتابوں تک کا امتحان زبانی سوال و جواب کے ذریعے لیا جاتا۔اوپر کی جماعتوں کا امتحان تحریری ہوتا۔سوالات کے پرچے نہایت احتیاط اور رازداری سے چھپوائے جاتے تھے۔امتحان میں جوابات کیلئے چار گھنٹے وقت دیا جاتا۔نشستیں متعین ہوتی تھیں۔اس میں خاص اہتمام رکھا جاتا کہ طالب علم ایک دوسرے سے بات نہ کرنے پائیں۔کوئی بھی طالب علم خلاف ورزی کی صورت میں امتحان سے محروم کر دیا جاتا تھا۔امتحان کے مفروضہ نمبر 50 تھے۔امتحان کے درجات کی تفصیل یہ تھی۔

30 سے 36 تک..................ادنیٰ

37 سے 43 تک..................متوسط

44 سے پچاس تک..................اعلیٰ

دارالعلوم سے پہلے ہندوستان میں جتنے بھی تعلیمی مراکز تھے ان کی حیثیت بالعموم شخصی درس گاہوں کی سی تھی اور ان سب میں یہ قدر مشترک تھی کہ ان میں نہ جماعت بندی تھی نہ حاضری کے رجسٹر ہوتے تھے۔اور نہ ہی طلبہ کو مجبور کیا جاتا تھا کہ فلاں کتاب اور فن کے ساتھ فلاں کتاب اور فن کا لینا ضروری ہے۔مطلق آزادی تھی جس کا جو جی چاہتا تھا پڑھتا تھا۔اور جب تک چاہتا پڑھتا تھا۔تعلیم کی کوئی مدت متعین نہ تھی۔نیز امتحان کا بھی کوئی خاص دستور نہ تھا۔جماعت بندی، مدت تعلیم، حاضری، لازمی امتحان اور تناسب مضامین وغیرہ جیسے امور کے اجراء کی اوّلیت دارالعلوم ہی کو حاصل تھی۔یہیں سے مدارس عربیہ میں یہ امور رواج پذیر ہوئے۔(محبوب رضوی سیّد 2005ء ب ص 297)

تقسیم انعام

طلبہ میں تعلیمی مشاغل کے لئے ترغیب اور ان میں مسابقت کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے سالانہ امتحان میں کامیابی پر طلبہ کو مستحق انعام سمجھا جاتا تھا۔جو طالب علم اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوتا اسے خصوصی انعام دیا جاتا۔انعام میں طالب علم کی

استعداد کے مطابق درسی وغیر درسی کتب دی جاتی تھیں (محبوب رضوی سید 2005ء ب، ص 187)۔ دارالعلوم میں بعض دوسرے امور کی طرح شروع ہی سے تقسیم انعامات کا بھی رواج تھا۔ تقسیم انعامات کے عنوان سے ہر سال جو جلسہ منعقد کیا جاتا اس میں مقامی لوگوں کے علاوہ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی دعوت شرکت دی جاتی ۔اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان عموماً اور چندہ دہندگان خصوصاً اس بات کا اندازہ کرسکیں کہ انہوں نے اپنی جس نوخیز نسل کو دارالعلوم کے سپرد کیا تھا اس کے تعلیمی نتائج کیا برآمد ہوئے نیز یہ کہ قوم نے جو روپیہ دارالعلوم کو دیا اس کے مصرف کا منظر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ دارالعلوم کا پہلا جلسہ دستار بندی 1290ھ، دوسرا 1292ھ اور تیسرا 1301ھ میں منعقد ہوا۔ (نفیس الدین صدیقی پروفیسر 2001ء ص 124)

تصدیق نامہ اور سند و دستار

جو طلبہ نصاب دارالعلوم کی تکمیل کر کے سالانہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر لیتے انہیں سند دی جاتی ۔سند میں ہر پڑھی ہوئی کتاب کا نام درج کیا جاتا مگر جس کتاب کے امتحان میں 30 سے کم نمبر ہوتے وہ داخل سند نہ کی جاتی ۔درجہ قاری ،درجہ تجوید اور شعبہ طب کی علیحدہ علیحدہ اسناد تھیں ۔جو طلبہ تکمیل سے قبل دارالعلوم چھوڑ دیتے ۔انہیں امتحان میں کامیاب کتب کا تصدیق نامہ دے دیا جاتا ۔درجہ چہارم پاس کر لینے پر "عالم" کی سند اور درجہ ہشتم کی تعلیم ختم کرنے کے بعد "فاضل" کی سند دی جاتی تھی (محمد طیب، قاری مولانا (س ن) ص 36)۔سند میں ان کتب کے ناموں کے علاوہ (جن کا امتحان دیا جا چکا ہوتا) طالب علم کی ذہنی استعداد کا بھی ذکر ہوتا ۔نیز اس بات کی شہادت دی جاتی کہ اس نے دارالعلوم میں تعلیم پائی ہے ۔علوم و فنون میں مہارت رکھتا ہے۔ درس و تدریس اور افتاء کا اسے حق حاصل ہے ۔اس کے علاوہ اسکے اخلاق اور چال چلن کے متعلق بھی اظہار رائے کیا جاتا تھا۔ سند مطبوعہ ہوتی تھی جو مہتمم اور اساتذہ کے دستخط اور دارالعلوم کی مہر سے مزین ہوتی تھی۔ جو طلبہ علوم و فنون میں امتیازی استعداد کے مالک ہوتے انہیں سند دینے کے علاوہ قدیم درس گاہوں کی روایت کے مطابق مجمع عام میں اساتذہ ان کی دستار بندی کرتے تھے ۔مدارس عربیہ کی اصطلاح میں یہ "دستارِ فضیلت" کہلاتی تھی۔ (محمد شفیع 1366ھ، ص 15)

5.9 تنقیدی مطالعہ

بانی دارالعلوم کا یہ خواب کہ: میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پیروں کی تمام انگلیوں سے نہریں جاری ہیں اور اطراف عالم میں پھیل رہی ہیں (وجاہت انجم 1980ء، ص 8) پورا ہوا۔ مشرق و مغرب میں علوم نبوت کے چشمے جاری ہونے کی راہ ہموار ہوگئی۔ دارالعلوم کے مہتمم ثانی شاہ رفیع الدین کا یہ خواب کہ علوم دینیہ کی چابیاں میرے ہاتھ میں دے دی گئی ہیں صرف خواب ہی نہ رہا بلکہ حقیقت بن گیا ۔اس مدرسہ کے ذریعے ان چابیوں نے اُن قلوب

کے ناطے کھول دیئے جو علم کا ظرف بننے والے تھے۔ جن سے علم کے سوتے ہر طرف پھوٹنے لگے اور چند نفوسِ قدس کا علم آن کی آن میں ہزار ہا علماء کا علم ہو گیا۔ دارالعلوم جس کا سنگ بنیاد سادہ اور معمولی طریقے سے رکھا گیا تھا چند ہی سال میں ایشیاء میں علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ برصغیر سے گزر کر افغانستان، ایران، سمرقند و بخارا، برما، انڈونیشیا، ملائیشیا، ترکی اور براعظم افریقہ کے دور دراز خطوں سے کتاب و سنت اور شریعت و طریقت کے طلاب یہاں جوق در جوق آنا شروع ہو گئے (مجاہد الحسینی 2002ء ص 5)

اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا بیج اچھا تھا اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا۔ دیوبند کا مدرسہ حقیقتاً شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ کے درس کی نمایاں خصوصیات کا حامل تھا۔ اس میں فرنگی محل مدرسے کی طرح منطق، صرف ونحو اور فقہ ہی پر سارا وقت صرف نہیں ہوتا تھا بلکہ حدیث کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا جو شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کا امتیاز تھا۔ (محمد اکرام شیخ 1982ء ص 208) یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ 1857ء کے انقلاب کے بعد دارالعلوم نے جو تعلیمی، علمی، دینی، اصلاحی، تبلیغی اور سیاسی خدمات انجام دیں وہ ہندوستان کی تاریخ کے سب سے زیادہ روشن باب ہیں۔ دارالعلوم دیوبند مسلمانوں کا نہ صرف دھڑکتا ہوا دل رہا بلکہ ذہنی نشوونما اور اخلاقی اقدار کا محافظ، ملی جرات وہمت اور تہذیب وتمدن کا مرکز ومحور، کتاب وسنت کا گہوارہ اور مسلمانوں کی علمی وعملی زندگی نیز عقائد کا مضبوط ترین قلعہ بھی رہا۔ (دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1981ء ص 55)

جنگ آزادی کے بعد جب کہ مسلمانوں کی شوکت ہندوستان میں پامال ہو چکی تھی اور حالات میں یکسر انقلاب آ چکا تھا، دارالعلوم نے ان بدلے ہوئے حالات میں سب سے بڑا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کے دین اور ان کی معاشرت تبدیل نہ ہونے دی۔ مبادا وہ حالات کی رو میں بہہ جائیں۔ پختگی اور عزیمت کے ساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ ومتوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا مگر اس حکمت کے ساتھ کہ عوام کی حد تک حدود میں رہتے ہوئے جائز توقعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن ومعاشرت میں طبعی طور پر ناگزیر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا جس کی وجہ سے عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا اور جدید تمدن ومعاشرت میں اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہو سکا۔ یوں اسلامی غیرت وحمیت باقی رہ گئی۔ جدید دور کی برتری اور احساس کمتری قلوب میں جمنے نہ پائی۔ ضمیر کی آزادی کا پورا پورا تحفظ کیا، اتباع اغیار کے بجائے سنت نبوی کو معیار زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں ابھارے جس سے عام تمدن ومعاشرت میں تقویٰ وطہارت کی خواہشات اجاگر رہیں۔ (محمد طیب' قاری 1991ء' ص 178)

دارالعلوم دیوبند نہ صرف ایک دینی درس گاہ تھی بلکہ ایک تحریک بھی تھی۔ اس نے علوم دینیہ کی وہ عظیم الشان اور گراں مایہ خدمات انجام دی ہیں جو تاریخ کے صفحات میں زریں حروف میں لکھے جانے کے لائق ہیں۔ اس نے علم دین کی راہیں ہموار کیں۔ تالیفات وتصنیفات کے ذریعے سے علوم دینیہ میں گراں قدر اضافے کئے۔ دہلی کے سقوط کے بعد یہی

ایک درس گاہ تھی جو مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بنی ۔طالبان علم وعرفان اسی عظیم درس گاہ میں جمع ہوئے اور علم کے پیاسوں نے اسی چشمہ شیریں سے اپنی پیاس بجھائی ۔(محبوب رضوی سیّد 1972ء ص 328)

دارالعلوم علوم اسلامی کی ایک قدیم طرز کی درس گاہ نہیں بلکہ احیائے اسلام وقیام ملت کی ایک عظیم الشان تحریک کا نام ہے ۔دارالعلوم انقلاب کا مرکز اور سیاسی تربیت گاہ تھی ۔اس نے اسلام کے جان نثاروں اور ملت کے غمگساروں کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جو ملت کے غم میں خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رُلایا، جو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کے وقار کی بحالی کیلئے خود بھی تڑپے اور دوسروں کو بھی تڑپایا ۔انہوں نے آبرومندانہ زندگی کے حصول کیلئے خود بھی اپنی جانیں قربان کیں اور دوسروں کو بھی ایثار پیشگی کا درس دیا ۔انہوں نے مسلمانوں کا ذہنی جمود توڑا، برٹش استعمار کا سحر توڑا، وقت کی جابر قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور افراد کے ذہنوں سے خوف وہراس دور کیا ۔(محمد نسیم عثمانی 1973ء ص 71)

عدم اتباع سلف اور مغربیت کا فتنہ دین میں داخل ہونے لگا تو اس تحریک نے دلائل سے اس کی کامیاب مدافعت کی ۔بلکہ ایک ایسی مستقل حکمت عملی تیار کی جس کے سامنے کوئی فلسفہ کسی بھی روپ میں آیا تو اس نے فلسفہ کا انداز پہچان کر اسے اپنے راستے پر روک لیا (احمد حسن ، پیرزادہ 1976ء ص 347) ۔دارالعلوم نے لاکھوں جید علماء پیدا کئے جنہوں نے دنیا کے مختلف خطوں میں دو لاکھ کے قریب دینی مدارس قائم کئے ۔ان علماء نے شریعت، طریقت، تفسیر، حدیث ، درس وتدریس، خدمت خلق، تصنیف وتالیف تحریک آزادی، اتحاد امت اور تحریک پاکستان کے میدانوں میں وہ شہرہ آفاق تعمیری کردار ادا کیا جس نے جنوبی ایشیاء کی تاریخ کا رُخ موڑ دیا ۔(ارشاد الحق تھانوی 2002ء ص 6)

دارالعلوم دیوبند نے بحیثیت تعلیم گاہ ایسے فضلاء پیدا کئے جنہوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام کیا ۔جامعہ رشیدیہ ساہیوال کی تحقیق کے مطابق دارالعلوم دیوبند کے ایک سو سال میں فضلاء کی تعداد یوں تھی ۔

ابتدائی سو سال میں مشائخ طریقت کی تعداد =536

مدرّسین	=5888
مصنفین	=1164
مفتی	=1784
مناظر	=1530
صحافی	=684
خطیب ومبلغ	=4288
طبیب	=288

فضلاء صنعت وحرفت جنہوں نے تجارت کے ساتھ دینی خدمات بھی انجام دیں =748 (محمد رضوان ، قاسمی 1981ء ص 5)

مذکورہ بالا خدمات میں جن حضرات نے اونچے درجے کا مقام حاصل کیا ان کی تعداد یہ ہے۔

اعلیٰ درجے کے معلمین مدرسین	448=
مصنفین	276=
مفتی	164=
مناظر	112=
صحافی	108=
خطیب ومبلغ	288=
طبیب	164=
صناع واہل حرفہ	748= (حبیب الرحمٰن مارچ 1981ء ص 11)

غرض کہ دارالعلوم دیوبند نے اپنے فضلاء کا ایک ایسا گلدستہ تیار کیا۔ جس میں رنگ برنگ کے پھول اپنی عطر بیزی سے آج بھی فرحت کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں۔ اس جائزے سے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، صحافت وطباعت وغیرہ کے میدانوں میں فرزندان دیوبند کی خدمات کا اعتراف کیا جاسکتا ہے۔ درس وتدریس کے میدان میں دیوبند کی عظیم الشان خدمات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سو سال کی مدت میں ابنائے دیوبند نے 8936 مدارس ومکاتب قائم کئے۔ (محمد نسیم عثمانی 1973ء ص 74)

دارالعلوم نے ایک سو تیرہ برس میں ایسے ایسے نابغہ روزگار علماء پیدا کئے کہ ان میں سے ایک ایک کو کھڑا کر کے دنیا کو چیلنج کیا جاسکتا ہے کہ تم اس کی مثال لاؤ۔ بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی، سرپرست اوّل مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا یعقوب نانوتوی، شیخ الہند محمود حسن، مفتی کفایت اللہ، مولانا سیّد حسین احمد مدنی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا مفتی محمد شفیع، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سیّد مرتضےٰ حسن چاندپوری، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سیّد بدر عالم میرٹھی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا قاری محمد طیب، مولانا محمد اعزاز علی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا سیّد محمد میاں دیوبندی، مولانا شمس الحق افغانی اور مولانا عبدالحق اکوڑہ خٹک تو ایسی نامور شخصیات ہیں کہ ان میں سے ہر ایک پر جتنا بھی فخر ہو سکے کم ہے۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ دارالعلوم اپنے گذشتہ دور میں ایسی دو تین شخصیات ہی پیدا کر دیتا تو یہ اس کیلئے مباہات کی پونجی تھی چہ جائیکہ یہاں تو سینکڑوں علماء، فضلاء قطار اندر قطار کھڑے نظر آتے ہیں کہ جو اپنی مثال آپ ہیں۔ (محمد اکبر، شاہ بخاری 2001ء ص 87)

انجمن خدام الدین لاہور کے ایک جلسہ میں سر شفیع (شفیع لیگ والے) کی صدارت میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے

تقریر فرمائی تو سر شفیع انگشت بدنداں ان کی طرف دیکھتے رہے۔اختتام تقریر کے بعد مائیک پر آئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا کہ: کاش میری ماں بھی مجھے وہاں تعلیم کیلئے بھیجتی جہاں شبیر احمد کی ماں نے شبیر احمد کو تعلیم دلوائی۔علامہ اقبالؔ نے علامہ انور شاہ کشمیری کی وفات پر لاہور میں ایک تعزیتی جلسہ سے فرمایا: پانچ سو سال ادھر کی تاریخ انور شاہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔اوران ہی انور شاہ کے متعلق میاں شیر محمد صاحب شرقپوری نے فرمایا تھا۔دیوبند میں چار نوری وجود ہیں ان میں سے ایک مولانا انور شاہ صاحب ہیں(عبدالرشید ارشد 1980ء ص 12)۔دیوبند کی ایک نہایت اہم خصوصیت اس کی آزادی تھی۔مولانا قاسم نانوتوی نے اپنے ان اصولوں میں جوانہوں نے دیوبند کیلئے مرتب کئے تھے، دینی پہلو کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ضمیر کی آزادی اور حکومت وامراء کی گرفت سے اس اسلامی تعلیمی ادارے کو آزاد رکھنے پر دی۔آپ نے کہا تھا: سرکار اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو۔الجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا موجب نظر آتا ہے۔(محبوب رضوی، سیّد 1976ء ص 188)

یہ ایک بڑا ہی انقلابی اقدام تھا جس کے درج ذیل پہلو قابل غور ہیں۔

- حکومت کے بارے میں یہ فیصلہ مسلمان اہل علم کے ذہن کا عکاس ہے۔انہوں نے انگریزی حکومت اور اسکی تعلیم کے مقاصد اچھی طرح بھانپ لئے گئے۔وہ یہ چاہتے تھے کہ ادارے پر بالواسطہ طور پر بھی حکومت کا سایہ نہ پڑے۔یہ حکومت سے عدم مصالحت کے روّیے کا ایک اہم مظہر تھا۔(محمد اقبال قریشی 1976ء ص 164)
- یہ ایک حیثیت سے خود مسلمانوں کے نظام تعلیم کی روایت سے بھی انحراف تھا۔اسلئے کہ اس میں حکومت اور امراء کی امداد کا ہمیشہ بڑا حصہ رہا ہے۔لیکن اب مسلمان جن سیاسی وتمدنی حالات سے دوچار تھے، ان میں غیر معمولی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ حکومت اور دوسرے اہل مفاد کے اثر سے خود کو محفوظ رکھا جائے، اس لئے کہ حکومت اپنی نہ تھی بلکہ دشمن کی تھی۔
- مالی نظام کو اہل اخلاص کی چھوٹی رقوم تک محدود رکھنا ایک بڑی رحمت ثابت ہوا۔اس کی وجہ سے مدرسہ صرف غیر صحت مند اثرات سے ہی محفوظ نہ رہا بلکہ بہت جلد ایک عوامی تحریک میں تبدیل ہوگیا۔اس کی وجہ سے ہزاروں مسلمان مدرسہ سے وابستہ ہوگئے اور اپنے دین وثقافت کی حفاظت کیلئے انہیں ایک راستہ نظر آیا۔
- اس سے بانیان مدرسہ کا ذاتی تقویٰ، توکل علی اللہ اور بے غرضی ظاہر ہوتی ہے۔انہوں نے بے سروسامانی سے کام کرنا پسند کیا۔لیکن غلط ہاتھوں سے بڑی رقوم لینا پسند نہ کیا۔
- اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ دیوبند کا مزاج سیدھا سادہ رہا۔رہن سہن کا معیار معمولی اور عوام کے معیار زندگی کے زیادہ قریب رہا۔دوسرے مدرسوں میں غیر ضروری کاموں پر بڑی رقوم خرچ ہوجاتی تھیں جبکہ یہ مدرسہ دولت کے اس ضیاع سے بچا رہا اور زیادہ سے زیادہ وسائل فروغ تعلیم ہی پر خرچ ہوئے۔(روزنامہ "الجمعیۃ"، 8دسمبر

1951ء)

- اس ادارے کی ایک اوراہم خصوصیت اس کا نظام مشاورت تھا۔ماضی میں ہندوستان میں جو دینی مدارس تھے ان میں بالعموم سارا انتظام ایک فرد یا ایک خاندان کا ہوتا تھا۔لیکن دیوبند اس صحت مند روایت کا بانی ہے کہ سارے انتظامی امور ایک مجلس شوریٰ کے سپرد کردیئے گئے اور انتظامی امور کی انجام دہی کیلئے ایک مہتمم مقرر کیا گیا جس کیلئے ضروری تھا کہ سارے امور شوریٰ کے فیصلے سے طے کرے اور آخری فیصلہ شوریٰ کا ہو۔اسطرح اسلام کی جمہوری وشورائی روح کو یہاں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ۔(دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند 1980ء ص 60)
- دارالعلوم 1857ء کی ناکامی کی تلافی کی ایک پُرخلوص اور پُردرد کوشش تھی ۔دیوبند کا یہ کردار بعد کی تاریخ میں بہت نمایاں ہوا۔مولانا محمود حسن ،مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر عثمانی کی تدریسی اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے دیوبند خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز بن گیا (مناظر احسن، گیلانی سیّد (س ن) الف ص 226)۔یہ ضرور ایک سانحہ تھا کہ ہندوستان کے اس عظیم ترین دینی مرکز نے انگریزوں کی مخالفت میں ایک مدت تک متحدہ قومیت کے تصور کی تائید کی اور آج تک وہ اس سے نجات نہ پا سکے۔بلاشبہ آزادی کی تحریک میں قابل ذکر سرفروشانہ جدوجہد کا سہرا اس کے اساتذہ اور طلبہ کے سر ہے۔ (منظور احمد جاوید 1979ء ص 15)
- دارالعلوم کا تعلیمی نظریہ عوامی تعلیم تھا۔اس نے غریب طبقے کیلئے تعلیم کا انتظام کیا اور جس معیار کی بھی تعلیم دی وہ عوامی زندگی سے مربوط رہی ۔دیوبند کے تعلیم یافتہ کوئی مثبت کارنامہ کر سکے ہوں یا نہ لیکن انہوں نے کم ازکم بنیادی دینی تعلیم کو زندہ رکھا۔انکی وجہ سے مسجدیں اور مکتب آباد رہے۔بے شک یہ ایک حقیقت کیوں نہ ہو کہ یہ تعلیم نئے دور کے تقاضے پورے نہ کر رہی تھی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ جو خدمت اس نے انجام دی اسے حقیر جاننا کوتاہ نظری کے سوا کچھ نہیں ۔اگر خدانخواستہ یہ انتظام نہ ہوتا تو آج افغانستان ،پاکستان ، بھارت، بنگلہ دیش ، برما اور سری لنکا کے مسلم معاشرے کی کیا حالت ہوتی؟اس کے تصور ہی سے روح کانپ اٹھتی ہے۔
- دارالعلوم کا نصاب تعلیم اور طریق تعلیم خواہ کتنا ہی پرانا کیوں نہ تھا لیکن کم از کم مقاصد تعلیم ،طریق تعلیم،نصاب تعلیم اور تنظیم مدرسہ کے بارے میں ایک ہی اصول سب جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔جدید تعلیم کی طرح اس میں تضاد نظر نہیں آتا ۔جدید تعلیم طالب علم کو بیک وقت مختلف سمتوں میں لے جاتی ہے جس کے نتیجے میں طالب علم کی شخصیت انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔دیوبند کی تعلیم "جدید اصطلاح" میں "دقیانوسی" سہی ۔لیکن اس میں یک رنگی پائی جاتی تھی ۔جو طالب علم کو اپنے مخصوص رنگ میں رنگ دیتی تھی ۔(مناظر احسن، گیلانی سیّد

(س ن) ج ٔ ص 303-304)

- دین اسلام اور مسلم ثقافت کا تحفظ مقاصد تعلیم کا حصّہ تھا۔اسی لئے دیوبند اصلاحی تحریک کا مرکز بھی رہا (محمد یوسف، بنوری 1976ء ص 149) ۔دارالعلوم دیوبند کی ابتدائی اصلاحی تحریکات یہ تھیں :عقد بیوگان ،لڑکیوں کو ترکہ دینا،تقریبات اور تہواروں میں اسلامی تعلیمات کے خلاف رسوم کا انسداد، دین میں داخل خارجی باتوں کی روک تھام،مراسم پرستی کے خلاف جنگ چونکہ ان کا مسلمانوں کی زندگی پر اثر تھا مثلاً بیاہ، ختنہ، کن چھیدن، منگنی کی تقریبات،مختلف بہانوں سے طرح طرح کی غیر ضروری تقریبات جو مہینوں جاری رہتیں ۔یوں دولت مندی کی شان دکھانے کیلئے روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا تھا۔(محمد میاں ،سیّد 1961ء ص 67)
- کفرو استعمار کے خلاف دیوبند ایک عظیم قلعہ ثابت ہوا۔اس کے اساتذہ نے عیسائی مشنریوں اور ہندو آریہ سماجیوں کے فتنہ انگیز لٹریچر کا نہ صرف جواب دیا بلکہ اس سلسلے میں بہت وقیع لٹریچر بھی تیار کیا گیا جس کا اسلوب بیان خواہ کمزور تھا لیکن لوازمے کی تلاش اور فراہمی میں پوری دیدہ ریزی سے کام لیا گیا۔قرآن پاک کا پیغام عام کرنے کے لئے مولانا محمود حسن نے اردو ترجمہ کیا،مولانا عبدالحق نے تفسیر حقانی لکھی ،مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی بلند پایہ دینی و علمی خدمات سرانجام دیں(محمد یوسف ،بنوری 1976ء ص 153)۔یوں دارالعلوم دیوبند جو میراث نبوت کا امین وداعی تھا وہ نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پورے عالم اسلام میں ہمہ جہتی ، دعوت وارشاد، جہد وجہاد،حفاظت علوم رسالت ،کتاب وسنت،تدریس واشاعتِ فقہ اورتزکیہء قلوب کا علمبردار رہا۔گویا دارالعلوم دیوبند ایک جامعہ درسگاہ اور مرکز تعلیم وتربیت ہی نہیں بلکہ ایک مستقل تحریک ودعوت اور مدرسہء فکر تھا بلکہ ہے۔(محمد مالک، کاندھلوی (س ن) ص 9-10)
- دارالعلوم دیوبند کی ایک قومی خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر اُردو زبان کی بھی خدمت کی۔ اُردو نہ صرف دارالعلوم میں تعلیم وتدریس اور فہم وتفہیم کی زبان بن کر مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے طالب علموں میں فکری وحدت مضبوط کرتی رہی بلکہ دارالعلوم کے توسل سے افغانستان اور وسط ایشیاء میں بھی پہنچ گئی (رشید احمد، جالندھری 1989ء ص 197)۔زبان کی تاریخ نے اُردو کیلئے دارالعلوم دیوبند کی خدمات کا اعتراف کیا ہے یا نہیں؟یہ ایک الگ بحث ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ارباب دیوبند نے تعلیم وتدریس کے علاوہ اپنے روحانی حلقوں میں بھی تربیت وتزکیہ کیلئے اردو زبان ہی کو ذریعہ ابلاغ بنایا جس سے نہ صرف اردو کا حلقہ وسیع ہوتا گیا بلکہ اردو زبان کے سرمایہ فکر میں بھی اضافہ ہوا۔سلوک وتصوف کے لطائف ومعارف اردو زبان میں ڈھلنے لگے جس سے اُردو کے علمی سرمایہ کو بالیدگی ملی۔(محبوب ،رضوی سیّد 1976ء ص 191-192)
- دیوبند کے نظام تعلیم میں اصولی طور پر صرف تعلیم ہی نہیں بلکہ تربیت اور اصلاح باطن کا انتظام پیش نظر تھا۔یہاں کا نظام علم اور تقویٰ کے امتزاج کی اس روایت کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔جو مسلمانوں نے اپنی 14 سو سالہ تاریخ میں

قائم کی ۔استاد اور شاگرد کا گہرا ذاتی ربط بھی اس کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک رہا۔(ندیم الواجدی 1976ء،ص 361)

- دیوبند کے نظام تعلیم میں طلبہ کے تقریری اور تحریری مقابلے،امتیازی کارناموں پر انعامات اور طلبہ کی علیحدہ تنظیم کا قیام بھی شامل تھے ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کی تربیت اور اجتماعی زندگی پیش نظر تھی ۔
- جہاں تک دیوبند کی سیاسی فکر کا تعلق ہے وہ بالکل واضح ہے۔یہ تحریک آزادی وطن کی خواہاں تھی۔حتیٰ کہ 1947ءتک اس جماعت کے افراد نے اپنے اپنے طور سے بڑی سے بڑی قربانیاں پیش کیں جو تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔یہ امر قابل ذکر ہے کہ تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر میں مغلیہ حکومت کے زوال کی ساعتوں میں مولانا حاجی امداد اللہ کی سرپرستی میں مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد کی مساعی انقلاب،جہادی اقدامات اور حریت واستقلال ملی کی فداکارانہ جدوجہد اور گرفتاریوں کے وارنٹ پر ان کی قیدوبند وہ تاریخی حقائق ہیں جو نہ جھٹلائے اور اور نہ بھلائے جاسکتے ہیں۔ان میں چیدہ چیدہ حضرات کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی،مولانا رشید احمد،مولانا محمود حسن،مولانا شبیر احمد عثمانی،مولانا عبیداللہ سندھی،مولانا حسین احمد مدنی،مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔(ایچ۔بی خان 1985ء،ص 34)
- علماء دیوبند کے سیاسی رجحانات کی عملی تفسیر ''جمعیتہ علمائے ہند'' تھی جو عملی سیاست میں کانگریس کی ممدومعاون تھی۔اگرچہ تمام علماء دیوبند انفرادی طور پر اس کی فکر سے متفق نہ تھے مگر اس کی کانگریس سے وابستگی نے مسلمانوں کو بہت سیاسی نقصان پہنچایا۔سوائے مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے چند رفقاء کے ان میں سے کسی قابل قدر ہستی نے تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیا۔شبیر احمد عثمانی نے تو اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا:افسوس!وہ دارالعلوم جس کی بنیاد اولیاء واکابرین نے اسلامی تعلیم اور اس کی روایات کے بقاء وتحفظ کے لئے رکھی تھی آج کانگریسیوں کا ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا ہے جس میں ایک ریزرو فوج کافی تعداد میں ہر وقت جمع رہتی ہے۔دارالعلوم کے فرزندوں کو جہاں کانگریسی حکومت کے شوق نے ملکی آزادی کا پروانہ دے دیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے دین سے آزادی حاصل کرنی بھی شروع کر دی ہے(مختار جاوید 1996ء،ص 34)۔شروع میں یہ حضرات فرقہ پرستی سے بالا اور کٹر وہابیوں اور انتہاپسند بریلویوں کے درمیان راہ اعتدال پر گامزن رہے۔مگر بعد میں انہوں نے اپنی مصالحت پسندانہ روش ترک کر دی اور خود ایک فرقہ بن کر دوسرے فرقوں کے مقابل آگئے۔نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی وسعت نظری بھی ترک کر دی اور روح اسلام نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر زور دینے اور لڑنے جھگڑنے لگے۔خاص طور پر ان کی افکار مغرب سے بیزاری نے انہیں بہت نقصان پہنچایا۔اپنے ذہنوں کو مسدود کر لینے کے باعث ان کی فکر کے سوتے خشک ہو گئے۔(عبدالرشید،میاں 1982ء،ص 114)
- انگریزی حکومت کے ایماء پر برصغیر پاک وہند میں بہت سی گمراہ کن سیاسی اور مذہبی تحریکیں اٹھیں جن کے ذریعے

یہاں کے باشندوں اور خصوصیت سے مسلمانوں کو راہ راست سے ہٹانے کی کوششیں کی گئیں مگر دارالعلوم دیوبند اوراس کے فضلاء نے پامردی سے ان کا مقابلہ کیا۔ ان کوششوں کی بدولت مسلمان انگریزی حکومت کی سیاہ کاریوں سے بہت حد تک محفوظ رہے۔ جب انکار حدیث کا فتنہ ابھرا تو ان ہی فضلائے دیوبند (مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا مناظر احسن گیلانی) نے کتابیں تالیف کر کے اس کا سدِّ باب کیا(غلام مصطفیٰ، مولانا 1976ء، ص 7)۔ اس طرح قادیانیت اور دوسرے طریقوں سے مسلمانوں کو مرتد بنانے کی اسکیم تیار ہوئی تو دارالعلوم دیوبند نے 50 سے زائد فضلاء اس کے مقابلہ کیلئے میدان میں اتار کران مکروہ سازشوں کا قلع قمع کیا۔ فقہیات اسلامی میں مداخلت کا فتنہ اُٹھا تو دارالعلوم ہی نے قضاء شرعی قائم کرنے کی تحریک چلائی اور مولانا حافظ محمد احمد نے پانچ سو علماء کے دستخطوں سے برطانوی حکومت کے سامنے محکمہ قضاء شرعی کا مطالبہ پیش کر دیا جس سے یہ فتنہ باطل ہو گیا۔ گویا یوں برصغیر کے مشرکانہ ماحول میں دارالعلوم دیوبند نے دین و توحید کو اس کی اصلی صورت میں قائم رکھا۔(جانباز مرزا 1980ء، ص 40)

- حملہ آور کا مقابلہ دو طرح سے ہوسکتا ہے۔ آگے بڑھ کر یا اپنے آپ کو قلعہ میں محصور کر کے۔ تحریک علی گڑھ نے آگے بڑھ کر مغربی افکار کا مقابلہ کیا۔ جبکہ تحریک دیوبند نے قلعہ بند ہو کر۔ موخرالذکر کا طرز عمل یہ تھا کہ ہر مغربی چیز بری ہے۔ نہ مغربی معیشت اپناؤ نہ انگریزی پڑھو۔ مگر اس طرز عمل نے اپنی انتہائی صورت میں یورپی علمی دور کی دو بنیادی خصوصیتوں یعنی حواس ظاہری سے حاصل شدہ تجرباتی علم اور استدلالی طرز فکر سے دوری اختیار کر لی۔ اس روش نے انہیں حقیقت پسندی اور اومنی بر معقولیت سوچ سے محروم کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے شرعی اور سیاسی دونوں میدانوں میں ٹھوکریں کھائیں اور باوجود ان کے خلوص نیت کے برصغیر کے مسلمانوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا(عبدالرشید، میاں 1989ء، ص 111)۔ نیز تعلیم بھی دو حصوں میں بٹ گئی اور برطانوی ہند میں پہلی بار دینی اور دنیاوی یا قدیم وجدید تعلیم کی اصطلاح بولی جانے لگی۔ اگر دارالعلوم دیوبند اپنا نصاب تعلیم وقت کی علمی ترقیوں سے ہم آہنگ کر لیتا اور عربی زبان، عربی ادب، علم کلام، فلسفہ وغیرہ سے متعلق قرون وسطیٰ کے تعلیمی نصاب کو تجربہ، مشاہدہ، کلاسیکی ادب اور علمی ارتقاء کی روشنی میں از سر نو مرتب کرتا تو ہماری تعلیم قدیم وجدید کی تقسیم سے بچ جاتی اور ہماری تعلیمی روایت کا تسلسل برقرار رہتا ۔(رشید احمد ، جالندھری 1989ء، ص 200-210)

دارالعلوم دیوبند کے نصاب، تعلیمی مقاصد، فقہی مزاج اور ارباب دیوبند کی مذہبی و اخلاقی سیرتوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود دیوبند کی تعلیمی تحریک نے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری کی، اسلامی علوم وروایات کے چراغوں کو طوفانوں کے تھپیڑوں میں روشن رکھا اور دیوبند نے ایسے سپوت پیدا کئے جنہوں

نے نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے عظیم الشان خدمات سرانجام دیں ۔آزادی وطن کی اکثر وبیشتر تحریکات کا مرکز دیوبند رہا، ریشمی رومال کی عالمگیر تحریک ابنائے دیوبند کے ہاتھوں پروان چڑھی (ویب سائٹ، سٹوری آف پاکستان 2002ء ص A025)۔دیوبند کا نظام تعلیم درس نظامی پر مشتمل 9 سال پر محیط تھا۔مگر اس کے ساتھ ساتھ علم طب، جلد سازی، پارچہ بافی کا بھی انتظام تھا،اس کے فارغ التحصیل دنیائے اسلام کے مرکز مکہ اور مدینہ میں مدرسۃ الشرعیہ وغیرہ جیسی اسلامی علوم کی درس گاہیں قائم کر کے اسلامی تعلیمات کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں ۔(منظور احمد جاوید 1979ء ص 64-65)

ان میں صاحب درس وافتاء، مصنف ومبلغ،امراض روحانی کے معالج،امراض جسمانی کے طبیب،واعظ،ادیب، لیڈر اور اخبار نویس، قاضی،مجالسِ مقننہ کے رکن،مفکر،فلسفی شامل ہیں ۔غرض کہ مسلمانوں کی علمی،اخلاقی،تہذیبی اور سیاسی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں دارالعلوم کے فیض یافتہ موجود نہ ہوں (محبوب ،رضوی سیّد 1972ء ص 406) جیسا کہ ضمیمہ 1(ب) سے واضح ہے۔اگر اصطلاحی الفاظ میں دارالعلوم دیوبند کو ڈھالا جائے تو اسکا خلاصہ یہ بنے گا کہ دارالعلوم دیوبند دیناً مسلم،فرقتہً اہل سنت والجماعت،مذہباً حنفی،مشرباً صوفی،کلاماً اشعری،سلوکاً چشتی بلکہ جامع سلاسل فکراً ولی اللّٰہی تھا۔(محمد طیب،قاری 1991ء ص 177)مولانا ظفر علی خاں نے ٹھیک فرمایا تھا:

شاد باش وشادزی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

باب ششم

تحریک علی گڑھ

6.1۔ پس منظر

تاریخی صورتِ حال

برصغیر پاک و ہند میں مسلمان پے در پے فاتحین کی صورت میں آئے۔اس سلسلہ کا آغاز 712ء میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملہ سے ہوا۔1206ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی میں سلطنت قائم کی لیکن اس کے بعد بھی ان حملوں کا سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں کے حلقہء اقتدار میں توسیع ہوتی رہی۔حتیٰ کہ مسلمانوں کو برصغیر کے طول وعرض میں مکمل غلبہ حاصل ہو گیا۔مسلمانوں اور ہندوؤں نے اس تاریخی عمل کو بالکل متضاد پہلوؤں سے دیکھا۔مسلمان جن بادشاہوں اور فاتحوں پر فخر کرتے تھے۔ہندو اپنے دلوں کی گہرائیوں میں ان سے خوف اور دہشت محسوس کرتے تھے۔جن ہندوؤں نے حکومت کے خلاف تلوار اُٹھائی وہ مسلمانوں کے نزدیک باغی تھے اور ہندوؤں کی نظر میں محبِ وطن۔جب انگریز یہاں نمودار ہوئے تو انہوں نے بھانپ لیا کہ ان کا مفاد اس اختلاف کو مزید ہوا دینے میں مضمر ہے۔چنانچہ تاریخ ہند کو نئے انداز میں پیش کرنے کی دیدہ دانستہ کوشش کی گئی۔تاکہ مسلمان حکمرانوں کو ستم گر اور ظالم دکھایا جائے۔مقصود یہ تھا کہ آبادی کی اکثریت جو ہندوؤں پر مشتمل ہے۔وہ اس برطانوی راج کی خوبیوں اور برکات کی زیادہ آسانی سے معترف ہو جائے۔(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1996ء ص 79)

یہ ایک فطری بات تھی کہ مسلم دورِ حکومت میں فوجی، دیوانی اور عدالتی نظم و نسق میں مسلمانوں کا تناسب غالب ہوتا۔ لیکن نظم و نسق کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں ہندوؤں کی نمائندگی نہ تھی۔مالیات کے محکمے کی باگ دوڑ خاص طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ہندو فوجی خدمات بھی سرانجام دیتے تھے۔ایسی فوجوں کے سپہ سالار بھی ہندو ہوتے تھے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہوتی تھی۔جاگیرداروامراء کے طبقے میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔کئی ایسی ہندو ریاستیں بھی تھیں جن پر حاکیت اعلیٰ مسلم سلطنت کو حاصل تھی۔شہروں میں بعض محلوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی تھی اور بعض محلوں میں ہندوؤں کی لیکن اکثر و بیشتر ہندو اور مسلمان گھرانے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔(الطاف علی، بریلوی سیّد 1995ء؛ ص 113-114)

اس کے باوجود دونوں قوموں میں کشمکش اور تصادم کے بنیادی اسباب ناپید نہ ہوئے۔مسلمانوں کے آنے کے

بعد ہندوؤں نے اپنی ذات پات اور چھوت چھات کی پابندیوں کو اور بھی سخت کر دیا تا کہ مسلمانوں سے ان کے تعلق کا دائرہ کم سے کم تر ہو جائے۔ یہ ایک غیر شعوری دفاعی حربہ تھا جس نے صدیوں تک مسلم حکمرانی کے دور میں ان کا سماجی ڈھانچہ جوں کا توں محفوظ رکھا۔ کھانے کی جس شے کو مسلمان کا ہاتھ چھو جاتا وہ بھرشٹ ہو جاتی۔ دونوں قوموں میں باہمی شادی بیاہ کا بھی دربار اکبری کے ایک بہت مختصر دور کے سوا کوئی رواج نہ ہوا۔ کھانے پینے کی عادات بھی باہمی میل ملاپ سے سد راہ تھیں۔ ایک قوم سبزی خور تھی جبکہ دوسری نہیں تھی۔ سب سے بڑی رکاوٹ ذات پات کا نظام تھا۔ جس نے دونوں قوموں کو ہمیشہ منقسم اور علیحدہ رکھا۔ (محمد علی چوہدری 1981ء ص 11-14)

ہندو اپنی سماجی تنظیم کے دائرے میں محصور رہ کر بھی مسلم ثقافت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہندومت کے اندر ہی متعدد ایسی تحریکیں ابھریں جنہوں نے توحید کا پرچار کیا اور نجات حاصل کرنے کیلئے اخلاص و اعمال حسنہ کی تلقین کی۔ مسلم امراء کی بود و باش کا جو رنگ ڈھنگ تھا اس کی وسیع پیمانے پر تقلید کی گئی۔ یوں ان کا ہندو رسم و رواج، اخلاق اور آداب پر اثر پڑا۔ ادھر ہند میں بنے ہوئے عمدہ اور نفیس پارچات مسلمان زیب تن کرنے لگے۔ مسلمان جو فنون ایران سے لے کر آئے تھے۔ ہندو مصوری اور فن نے ان پر اثر ڈالا۔ ایسے ہی باہمی اثر کا عمل موسیقی و شاعری میں بھی ہوا۔ صدیوں کے میل میلاپ نے آہستہ آہستہ اُردو کے ارتقاء کی راہ ہموار کر دی۔ جو بالائی ہند کے شہروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی۔ (جواہر لال نہرو 2001ء ص 311-312)

اورنگ زیب کی وفات کے کچھ عرصہ بعد مغل سلطنت کی عظیم الشان عمارت شکستہ ہو کر زمین بوس ہونے لگی۔ انتشار و انحطاط کے اس منظر میں ایک تیسرا فریق "انگریز" نمودار ہوا۔ ڈیڑھ صدی تک انگریزوں کی یہ حیثیت رہی تھی کہ وہ مغل شہنشاہوں اور ان کے صوبیداروں کے سامنے بڑی لجاجت سے درخواستیں پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے وسط میں حالات ان کیلئے سازگار ہو گئے اور اگلے ایک سو برس تک وہ اپنے سابق سرپرستوں کی سلطنت کے استحصال میں سرگرم رہے۔ اس جدوجہد میں انگریزوں نے موقع شناسی، طاقت اور فریب کاری کے وہ تمام حربے استعمال کیے جنہیں وہ ہند کے ساتھ اپنی تجارت میں پوری کامیابی سے آزما چکے تھے۔ تجارت کے ذریعے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کے دیرینہ تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف جدوجہد میں وہ ان کے فطری حلیف بن گئے۔ جب انگریزوں کو آخر کار فتح حاصل ہو گئی تو انہوں نے مسلمانوں کو اور زیادہ کچلنے کیلئے اپنے اختیار و اقتدار کو پوری طرح استعمال کیا۔ (صفدر محمود ڈاکٹر 1989ء ص 13)

1857ء کی جنگ آزادی جو انگریزوں کے خلاف ایک عام بغاوت تھی۔ اس کا حشر ناکامی و بربادی پر ہوا۔ سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا۔ سارے برصغیر پر برطانوی راج مسلط ہو گیا۔ ہندوؤں نے بغاوت کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے سر تھوپ دی حالانکہ انگریز کے خلاف برپا ہونے والی اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے۔ برطانوی ارباب اختیار نے اپنے سیاسی دفاع کی بنا پر ہندوؤں کو بری کرتے ہوئے سارا الزام مسلمانوں کے سر منڈھ کر

انہیں قابل گردن زنی قرار دیا۔(عتیق صدیقی (س ن) ص 43)

سیاسی صورتِ حال

نئے حکمران کے دلوں میں مسلمانوں کے بارے میں بدگمانیوں کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ کیونکہ انگریزوں نے ہندوستان کا اقتدار مسلمانوں سے ہی چھینا تھا۔ لہٰذا وہ ان ہی کو اس شورش کا بانی اور باغی قرار دیتے تھے۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کی نسبت جنگ میں بہت کم حصہ لیا۔ دوسرے یہ کہ ہندو صدیوں مسلمانوں کے محکوم رہے اس لئے ان کو اپنا دشمن سمجھ کر انتقام لینے پر تل گئے اور نئے حاکموں سے دل و جان سے وابستہ ہوگئے۔ اس کے صلے میں انگریزوں نے ہر شعبۂ زندگی میں ان کی حوصلہ افزائی کی اور ترقی کے وسائل مہیا کئے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ انگریز انہیں اپنا دشمن خیال کر کے نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے۔ پھانسی، جلاوطنی، عمر قید، جائیدادوں کی ضبطی اور ملازمتوں سے محرومی مسلمانوں کی سیاسی سزائیں تھیں۔(عبدالرؤف، ڈاکٹر 1995ء ص 232)

ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان کے مطابق:

> **The war of Independence 1857 ended in a disaster for the Muslims. The British belived that the Muslims were responsible for the Anti-Britsh uprising of 1857 and therefore, they were subjected to ruthless punishment and merciless vengeance. The British had always looked upon the Muslims as their adversaries because they had ousted them from power. With the rebellion of 1857 this feeling was intensified and every attempt was made to ruin and suppress the Muslims forever.**

(سٹوری آف پاکستان 2002ء ص 2)

معاشی صورت حال

سیاسی زوال کی وجہ سے مسلمانوں کا معاشی وقار گر گیا۔ حکومت، عہدے، جاگیر اور منصب جو ان کی معاشی برتری اور اقتصادی خوشحالی کا ذریعہ تھے سب ختم ہو گئے۔(اختر الواسع 1985ء ص 13) عدلیہ، انتظامیہ اور فوج میں تمام اعلیٰ مناصب صرف انگریزوں کیلئے مخصوص ہو گئے۔ ہنٹر نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار کی تصویر کشی کرتے ہوئے کلکتہ کے فارسی اخبار "دوربین" کا حوالہ دیا ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ: مسلمانوں کی زبوں حالی کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ سرکاری ملازمت کے اہل بھی ہوتے تو انہیں دانستہ طور پر نوٹیفکیشن جاری کر کے نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔ ان کی

بے چارگی کی کہیں شنوائی نہیں ہوتی اور اعلیٰ حکام ان کے وجود کو بھی تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔(ہنٹر، ڈبلیو۔ڈبلیو 1968ء ص 149)

مسلمانوں کے برعکس ہندو ہر میدان میں آگے بڑھ رہے تھے۔1793ء میں بنگال کے بندوبست دوامی نے انہیں بڑے زمینداروں کے مقام پر فائز کر دیا اور اب نیا طبقہ امرا ان ہی پر مشتمل تھا۔مسلم حکمرانی کے دور میں تجارت پہلے ہی ان کے ہاتھ میں تھی۔چونکہ انہوں نے بڑے ذوق وشوق سے انگریزی تعلیم میں بھی حاصل کر لی۔اس لئے وکالت، انجینئرنگ، ڈاکٹری، تعلیم وتدریس اور صحافت میں ان کیلئے نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔جو نیا متوسط طبقہ ابھرا وہ کم وبیش تمام تر ہندوؤں پر مشتمل تھا اور انگریزوں کے ہند کا جو نقشہ بن رہا تھا اس کی قیادت یہی متوسط طبقہ سنبھال رہا تھا۔1878ء میں 57 مسلمانوں کے مقابلہ میں 3155 ہندو گریجوایٹ اور اس سے اعلیٰ ڈگریوں کے مالک تھے۔یوں مسلمانوں کے دل انگریزوں کے خلاف سخت نفرت سے بھر گئے۔ان پر محرومی کے ساتھ ساتھ گہری مایوسی چھا گئی۔ان کی خود اعتمادی ختم ہونے لگی اور اس کی جگہ احساس کمتری چھانے لگا۔(عبدالرشید میاں 1982ء ص 99)

لسانی صورتِ حال

مسلم دور حکومت میں سرکاری زبان فارسی تھی۔برطانیہ نے اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی۔تا آنکہ میکالے نے اپنی مشہور تعلیمی یادداشت لکھی اس پالیسی کے زیر عمل 1835ء میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب اعلیٰ عدالتوں میں فارسی کی جگہ سرکاری زبان انگریزی ہوگی۔ہندوؤں نے بہت جلد نئے حالات کو قبول کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھال لیا۔مسلمانوں کا معاملہ البتہ اس کی برعکس تھا۔انہوں نے خیال یہ کیا کہ یہ مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور ان کے مذہب کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔لہٰذا وہ انگریزی زبان سے دور دور رہے۔1867ء میں اُردو ہندی تنازعے کا آغاز ہوا۔جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے تقسیم کرنا تھا۔الغرض 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز پوری قوت سے مسلمانوں کے تہذیب وتمدن کو مٹا دینا چاہتے تھے۔(عزیز احمد 1907ء ص 1-6)

تعلیمی صورتِ حال

انگریز حکمرانوں نے نئی تعلیمی پالیسی نافذ کی۔جس کے تحت اسکولوں میں عربی، فارسی اور مذہبی تعلیم کی ممانعت کر دی گئی اور صرف انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا بلکہ 1835ء سے انگریزی کو دفتری زبان بھی قرار دیا گیا(فلپس 1939ء ص 50)۔اس روّیے سے مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ انگریز ان کے پرانے تعلیمی نظام کو مٹانے کے درپے ہیں۔دوسری طرف عیسائی مشنری تعلیمی ادارے بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم کے پردے میں عیسائیت کا پرچار کر رہے تھے اور شکر چڑھی ہوئی گولیوں کے ذریعے مسلمانوں کی دینی بنیادوں کو مجروح کر رہے تھے۔جو نیا تعلیمی نظام قائم کیا گیا تھا اور جسے تیزی کے ساتھ فروغ دیا جا رہا تھا وہ مذہبی تعلیم ودینی روح سے یکسر عاری تھا۔نیز ہندوستان کی نئی نسلوں کو لادینیت اور مغربیت کے رنگ میں رنگ رہا تھا۔پھر یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ اس نئی تعلیم سے ہندو بڑھ چڑھ کر فائدہ اُٹھا رہا ہے۔اور من حیث القوم انگریزوں کا منظور نظر بن کر اپنی ساڑھے سات سو سالہ اقتدار سے محرومی کا حساب چکا رہا

ہے(خورشید احمد، پروفیسر 1977ء ص 84)۔اسی زمانہ میں ہندوؤں کی اصلاحی تحریکات ابھریں اور انہوں نے ہندوؤں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ بھی مسلمانوں پر ایک بالاتر قوم کی حیثیت سے غالب ہوسکتے ہیں۔"آریہ سماج تحریک" نے کھل کر اسلام اور پیغمبر اسلام پر حملے کیے اور ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوؤں نے "شدھی" کی تحریک چلائی ۔اس زمانے میں ہندو مسلم مخالفت بلکہ منافرت کا بیج بویا گیا۔(جواہر لال نہرو 2001ء ص 302‘310‘311)

سماجی صورتِ حال

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے قبضے نے صرف مسلمانوں کی سیاسی قوت کا ہی خاتمہ نہیں کیا بلکہ ان کی ہمتوں کو بھی توڑ دیا تھا۔ان کے دلوں پر مایوسی اور احساسِ ذلت کی تاریک گھٹائیں مسلط کردیں۔اسلامی تعلیم کا گلا گھونٹ دیا گیا۔روزگار کے تمام دروازے مسلمانوں کیلئے بند کردیے گئے(صفدر محمود ڈاکٹر 1987ء ص 14)۔ان کے پرانے نظام تعلیم کا ربط نئے انتظامی اور معاشرتی نظام سے منقطع کردیا گیا تھا۔روزگار کی کنجیاں نئی تعلیم کو دے دی گئی تھیں۔ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا گیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ذلت وخواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہوگئے کہ دنیا میں سلامت رہنے کا ذریعہ انگریز کی اطاعت، عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی خدمت اور ترقی کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کوئی نہیں ۔نیز ان کا اپنا سرمایۂ علم وتہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل، سبب ذلت اور موجب نکبت ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی‘سیّد 1985ء الف‘ص 26)

المختصر نہ تو مسلمانوں کی خودداری انہیں اجازت دیتی تھی کہ وہ فاتحین کے ساتھ تعاون کریں اور نہ وہ زمانے کے نئے حالات کا ساتھ دینے کو تیار تھے۔ان کے تلخ تجربات ومشاہدات بھی ایک حقیقت پسندانہ جائزہ لینے میں مانع تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان جذباتی طور پر ماضی میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ مستقبل کے بارے میں مناسب تدبیر کرنے سے قاصر تھے۔1857ء کے سانحہ کے بعد وہ حسرت ویاس کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔ان کا تمدن، تہذیب، معاشرت اور اقتصادیات سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔اس کے باوجود مسلمانوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔شکست اور ناکامی سے بے دل برداشتہ نہیں ہوئے۔بلکہ یہ ناخوشگوار اور نامساعد حالات کا بڑی بے جگری وپامردی سے مقابلہ کرتے رہے۔(ولی مظہر 1983ء ص 9)

جنگ میں ہار جانے کو شکست نہیں کہا جاتا حوصلہ ہار جانے کا نام شکست ہے۔مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے۔دوسری طرف ہندو مسلمانوں کا وجود مٹا دینے کے درپے تھے۔ان کی آرزوؤں کے مطابق فرنگی کی شکل میں بیرونی امداد بھی میسر آچکی تھی۔اس مہیب سناٹے میں مسلمانوں کو تنہائی کا زہر ڈسنے لگا۔خداوند کریم کو اس زبوں حالی پر رحم آیا۔ملت اسلامیہ ہند کی رہنمائی ومسیحائی کیلئے سرسیّد احمد خان جیسی اولوالعزم اور صاحب بصیرت شخصیت کو منتخب کیا گیا۔ہندوؤں نے جہاں راجہ رام موہن رائے جیسا رہنما پایا تھا۔وہاں مسلمانوں کو سرسیّد احمد خان جیسی روشن خیال ووسیع الدماغ ہستی کی قیادت نصیب ہوئی(اصغر عباس 1975ء ص 32)۔سرسیّد احمد خان وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے وقت کی نبض کو پہچانا اور انقلاب بذریعہ تعلیم کا نعرہ بلند کیا۔آپ کی مثال ایک ایسے ستارے کی سی ہے جو اندھیری رات میں بھولے بھٹکے

مسافروں کی رہنمائی کرتا ہے۔(مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1970ء،ص 48)

6.2 بانیٔ تحریک علی گڑھ

سن عیسوی کی رو سے سرسیّد احمد خان کا سال پیدائش 1817ء تاریخی نقطۂ نگاہ سے فرنگی سامراج کی مخفی منصوبہ بندی سے ہونے والے مسلم حکمرانی کے دور انحطاط میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا۔ان کے اسلاف (ہرات)افغانستان سے آئے تھے۔یہ مغل فرمانروا شاہ جہان کا زمانہ تھا۔سرسیّد احمد خان کے والد دہلی کے ایک درویش صفت شخص میر تقی ولد سیّد ہادی تھے اور نقشبندی بزرگ شاہ غلام علی کے مرید تھے۔شاہ غلام علی نے ہی آپ کا نام سیّد احمد رکھا اور آپ نے ہی سرسیّد کی رسم بسم اللہ انجام دی۔(اقبال احمد صدیقی 2000ء،ص 19)

سرسیّد احمد خان کا میلان طبع کم سنی سے تحصیل علم کی جانب تھا۔گردوپیش اچھے گھرانوں میں جو روایتی ماحول تھا اس کے مطابق ابتداء میں قرآن مجید پڑھا۔پھر فارسی کی درسی کتابیں،کریما،خالق باری،آمد نامہ،گلستان ،بوستان وغیرہ پڑھیں۔عربی میں شرح مُلّا ،شرح تہذیب،مختصر معانی اور مطول کا کچھ حصہ پڑھا۔ہندسہ اور ریاضی کی تعلیم ان کے ماموں زین العابدین نے دی اور طب کی تعلیم حکیم غلام حیدر سے حاصل کی ۔(الطاف حسین،مولانا حالی 1984ء،ص 42)

ابھی بائیس (22) برس کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔یہ ذہنی صدمہ اپنی جگہ ناقابل تلافی تھا۔لیکن معاشی مشغلہ ہی اس کا حل تھا۔چنانچہ ان کے خالو خلیل اللہ جو اس وقت صدر امین دہلی تھے۔انہیں اپنے پاس لے گئے۔آپ پہلے وہاں سررشتہ دار کی حیثیت میں پھر کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی رہے۔1841ء میں منصفی کا امتحان پاس کر کے مرزاپور میں منصف بن گئے۔بعد ازاں ترقی یاب ہوکر "جج اسمال کاز"(منصف عدالت خفیفہ)ہوگئے۔اس منصب پر فتح پور سیکری،دہلی،رہتک،بجنور،مرادآباد،غازی پور،علی گڑھ اور بنارس میں تھوڑا تھوڑا عرصہ رہے۔یہ بات ان کے ذاتی ریکارڈ میں شامل رہی کہ سرسیّد نے اپنی ملازمت کے 45 برس بڑی فرض شناسی اور نیک نامی سے بسر کئے ۔(فرحت عظیم ڈاکٹر 2000ء،ص 20)

مسلمانوں کا جدید تعلیم سے گریزاں رہنا سرسیّد احمد خان کو شاق گزرا کیونکہ اس طرح غیر مسلم آگے بڑھ کر اس خلا کو پُر کر رہے تھے۔جبکہ اس زمانے میں دہلی کے عظیم ترین عالم شاہ عبدالعزیز پہلے ممتاز مسلمان تھے جنہوں نے فرنگی زبان اور مغربی علوم کے حصول کے جواز کا فتویٰ دیا(عبدالعزیز، دہلوی شاہ 1904ء،ص 186)۔لیکن اس فتویٰ کے باوجود مسلمانوں نے ایک قوم کی حیثیت سے مغربی تعلیم کے معاملہ میں کوئی شوق ظاہر نہ کیا۔ اس ناامیدی اور تاریکی کے دور میں سیّد احمد خان نے رہنمائی کی ذمہ داری قبول کی۔اور مسلمانوں کو اس تباہی اور دلدل سے نکالنے کا تہیہ کیا۔یہ بہت مشکل اور سخت کام تھا۔اگر ان میں عزم واستقلال نہ ہوتا تو وہ اس کو قبول نہ کرتے (ممتاز معین ' پروفیسر مسز 1982ء

ص 42-43)۔بقول الطاف علی بریلوی :

In this critical period there arose a dyanamic and remarkable leader of inpeceable character and sterling qualities to reawaken and regenerate the Muslims from their slumber. (Altaf Ali,Brelvi Syed 1997,Pvii)

اس میں شک نہیں کہ "تحریک علی گڑھ" کے رہنما سر سیّد احمد خان ہی ہیں۔جنہوں نے اپنی ساری زندگی اس کیلئے وقف کردی تھی۔ان کو اگر پاکستان کا معمار اوّل کہا جائے تو حقیقت پر مبنی ہوگا۔لیکن اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ سیّد احمد خان کو مہدی علی خان (محسن الملک)،مشتاق حسین (وقارالملک)،عزیز مرزا جیسے حیدرآباد دکن کے تربیت یافتہ مخلص ساتھی اور شبلی ،حالی،ڈپٹی نذیر احمد،چراغ علی،اعظم یار جنگ وغیرہ ہمدرد و معاون مل گئے (الطاف علی ، بریلوی سیّد 1973ء ص 311)۔جن کو حیدرآباد نے ملازمتیں اور وظائف دے کر فارغ البال اور خوشحال کردیا تھا۔ (محمد حسام الدین،خان غوری 1979ء ص 28)

علامہ شبلی نعمانی نے تحریک علی گڑھ کے بانیوں کیلئے ایک طویل نظم لکھی ہے۔اس کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ سر سیّد کی معاونت ان اصحاب نے کی۔

تدبیر مرض کی جستجو تھی — ہر بزم میں اب یہ گفتگو تھی
یعنی روشن علاج کیا ہو — بیمار کو کس طرح شفا ہو
دانش طلبان نکتہ دان نے — عیسیٰ نفسان خوش بیان نے
ترتیب دیئے بکاوش وکد — بتیس رسالے لہائے مفرد
لکھے بدلائل و براہین — اس بحث پہ مختلف مضامین
وہ نکتہ درحقیقت آگاہ — یعنی مہدی علی ذی جاہ
سیّد اشرف علی ممتاز — مشتاق حسین نکتہ پرداز
ان کی قلم گہر فشاں نے — آئین گزارش بیان نے
جو بحث تھی دل نشین کی تھی — ہر بات کی چھان بین کی تھی
تدبیر کی صورتیں بتائیں — جو جو تھیں ضرورتیں بتائیں
سیکھیں وہ مطالب نو آئین — یورپ میں ہو رہے ہیں تلقین

قائم ہوا با اتفاق باہم
ایک مدرسۃ العلوم اعظم

6.3 تحریک علی گڑھ

سرسیّد احمد خان کی تحریک کو "تحریک علی گڑھ" کہا جاتا ہے۔اس سے مراد یہ نہیں کہ جو کچھ ہوا علی گڑھ کے ہی علاقے میں ہوا بلکہ تحریک علی گڑھ میں ہر ایک ایسا کام شامل تھا جو مکمل طور پر اور صحیح معنوں میں مسلمانوں کے فائدے میں ہوا خواہ کسی علاقے کے مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچا ہو۔(معین الدین عقیل ڈاکٹر (س ن) ص 55)

سرسیّد احمد خان مندرجہ بالا پس منظر کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی زندگی کے تباہ شدہ ڈھانچے کی تعمیر نو کیلئے ضروری ہے کہ مسلمان مغربی تعلیم کو مقبول کریں۔لہٰذا انہوں نے 1859ء میں مراد آباد میں ایک مدرسہ "گلشن اسکول" قائم کر کے اپنی تحریک کا آغاز کیا۔پھر 1863ء میں "وکٹوریہ اسکول" غازی پور میں قائم کیا۔1864ء میں سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جو انگریزی علوم کا ترجمہ شائع کرتی تھی۔1866ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ شائع کیا جو سائنسی، زرعی، قدرتی وطبعی سائنس اور جدید حسابیات کے متعلق جدید معلومات فراہم کرتا تھا۔(محمد حسین، خان زبیری 1975ء، ص 185،189)

1869ء میں سرسیّد کا سفر لندن بھی قوم کو عہد جدید سے ہم آہنگ کرنے کی خاطر تھا۔وہاں آپ نے اپنے بیٹے سیّد محمود کی مدد سے انگلستان کی یونیورسٹیوں کا بخوبی مطالعہ کیا اور مسلمانوں کی تعلیم کیلئے ایک اسکیم تیار کی اور اس پر عمل درآمد کرنے کیلئے "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان" اور "کمیٹی خزینۃ البضاعۃ" قائم کیں (محمد موسیٰ، حاجی (س ن) ص 73)۔24 مئی 1875ء کو ایم اے او ہائی سکول کا افتتاح کیا۔دو سال بعد اسکول کا درجہ بڑھا کر کالج بنا دیا گیا۔گورنر جنرل لارڈ لٹن نے 8 جنوری 1877ء کو کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔جو سرسیّد کی وفات کے بعد 1920ء میں یونیورسٹی بن گیا (محمد اکرام شیخ 1982ء، ص 12)۔

وہ معمولی مدرسہ جو گھاس پھونس کے معمولی مکان میں شروع ہوا وہ ایک عظیم جامعہ کا روپ دھار چکا تھا۔یونیورسٹی کی اوّلین چانسلر نواب سلطان جہاں بیگم والی بھوپال مقرر ہوئیں۔پھر نواب حمید اللہ آف بھوپال چانسلر بنے۔ان کے مستعفی ہونے کے بعد نظام دکن نے اس منصب کو رونق بخشی۔پرو چانسلر کے عہدے پر آغا خاں اور ان کے مستعفی ہونے کے بعد نواب رضا علی خان آف رام پور کا انتخاب عمل میں آیا۔اوّلین وائس چانسلر مہاراجہ محمد علی خاں (محمود آباد) مقرر ہوئے۔اس کے بعد حسب ذیل ہستیاں یکے بعد دیگرے اس عہدے پر فائز ہوئیں۔نواب مزمل اللہ خان، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سیّد راس مسعود، سر شاہ محمد سلیمان، ڈاکٹر ضیاءالدین احمد، مسٹر زاہد حسین، نواب محمد اسماعیل خان، اے بی اے حلیم، ڈاکٹر ذاکر حسین، مسٹر طیب جی، نواب علی یار جنگ، ڈاکٹر عبدالعلیم۔(نذیر چودھری 1973ء، ص 82)

سرسیّد احمد خان نے علی گڑھ کالج کے قیام سے جو تحریک شروع کی تھی وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام پر منتج ہوئی جس نے مندرجہ بالا مسلم یونیورسٹی کے قیام کو ممکن بنایا۔سرسیّد احمد خان مدرسے بھی قائم کرتے جاتے تھے اور ساتھ

ساتھ تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ان کی تصانیف کو ہم مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور: 1840ء سے لے کر 1846ء تک کا ابتدائی دور جس میں سرسیّد نے چند علمی اور مذہبی رسالے لکھے اور ترجمہ کیا۔

دوسرا دور: 1847ء سے لے کر 1858ء تک وسطی دور جس میں تاریخی کتب کی تصنیف وتدوین ہوئی۔

تیسرا دور: 1858ء سے لے کر 1897ء تک کا آخری دور جو اعلیٰ علمی اور مذہبی تصنیف کے لحاظ سے نہایت شاندار ہے۔(وقار احمد رضوی ڈاکٹر 1996ء ص 46-47)

المختصر 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد اپنی قوم کی زبوں حالی پر سرسیّد کے قلب کا حال مولانا حالی بیان فرماتے ہیں: دِلّی، مرادآباد اور بجنور کے مسلمان خاندانوں کی تباہی سے سرسیّد کا حال بعینہ اس شخص کا تھا۔جس کے گھر کا ایک حصّہ آگ سے جل گیا ہو اور باقی حصّوں کو بچانے کیلئے وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا پھرتا ہو۔(طفیل احمد منگلوری 1945ء ص 182)

گویا تحریک علی گڑھ نے ایک قدامت پسند قوم کو گمراہی کے راستہ سے ہٹا کر تعلیم کی شاہراہ پر کھڑا کر دیا۔جس میں سب سے بڑا ہاتھ سرسیّد احمد خان کا تھا۔تب ہی آپ کے انتقال کے بعد سی ایف اینڈ روز نے لکھا: جدید تاریخ میں اس سے بڑھ کر انقلاب کی مثال نہیں ملتی کہ ایک قوم اعلیٰ تعلیم اور ایک عظیم شخصیت کے زیر اثر، اس قدر قلیل مدت میں بدل گئی۔ (بحوالہ خالد یار خان 1963ء ص 259)

6.4 مقاصدِ تحریک

سرسیّد احمد خان نے اپنے عہد کے رُو بہ زوال مسلم معاشرے کا جائزہ لیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ جس حساب سے یہ تـنـزل شروع ہوا ہے۔اس حساب سے چند ہی برس میں مسلمان سائس، خانساماں، خدمت گار اور گھاس کھودنے والوں کے سوا کچھ نہیں رہیں گے۔انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمان ہندوستان کے دوسرے ترقی یافتہ فرقوں سے بہت پیچھے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ ایک تو یورپی اقوام کی وہ تدبیریں ہیں جن کا اصل نشانہ اسلام تھا دوسرے خود مسلمانوں کا جدید تعلیم، ٹیکنالوجی، سائنس اور انگریزی سے اختلاف ہے۔تیسرے حکومت برطانیہ ایک حد تک مغربی تعلیم کو عام کرنا پسند نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پرائیویٹ اداروں نے بنگال میں علوم جدید رائج کئے تو حکومت برطانیہ نے اسے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور لارڈ ایلن بورو نے کہا: اگر یہ شرفاء جو ہندوستانی باشندوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواہش مند ہیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے تو ہم اس ملک میں تین ماہ بھی نہیں رہ سکتے۔(فرحت عظیم ڈاکٹر 2000ء ص 16)

سرسیّد احمد خان اس بات سے واقف تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ید طولیٰ رکھنے والے فرنگیوں سے اختلاف

رکھنا غیر دانشمندی ہے۔ سرسیّد کی تشخیص یہ تھی کہ: خرابی کی اصل جڑ یہ ہے کہ مسلمان حکومت کے معتمد علیہ نہیں رہے۔ چونکہ حکومت کے معتمد علیہ نہیں رہے اس لئے زندگی کے تمام شعبوں سے نکال باہر کئے جا رہے ہیں لہذا فکری اور تہذیبی میدان میں مسلمانوں کو جدید مغربی تہذیب سے سمجھوتا کر لینا چاہیے۔ کچھ چیزیں اس کی لے لی جائیں کچھ اپنی باقی رکھی جائیں۔ اسطرح ایک نیا مرکب تیار کیا جائے جو نئے حالات میں چل سکے۔ ترقی کا زینہ تعلیم ہے۔ مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کر کے حکومت کے مناصب حاصل کرنے چاہیں۔ (خورشید احمد 1963ء ص 56)

سرسیّد نے اس مشکل نصب العین کے حصول کیلئے درج ذیل لائحہ عمل تشکیل دیا:

- مغرب کی ہمہ جہتی ترقی کا کھلے دل سے اعتراف اور مغرب کے علوم جدیدہ اور بالخصوص سائنس سے پورا استفادہ کرنے کی سعی۔
- مذہب کی ایک نئی تشریح و تعبیر جو نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اور جس کی بدولت بدلے ہوئے حالات میں مذہب کی حقانیت روشن ہو سکے۔
- مغربی طرز پر نئے تعلیمی اداروں کا قیام اور تعلیم و تربیت کے نئے طریق و انداز کو قبول کرنا۔
- حکومت برطانیہ اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی کو دور کرنا اور خوشگوار روابط پیدا کرنا۔ (حفیظ مینائی 1971ء ص 235)

اس لائحہ عمل کے تحت تحریک کے جو مقاصد قرار پائے انہیں ہم درج ذیل عنوانات کے تحت واضح کر سکتے ہیں۔

تعلیمی مقاصد

تعلیم انسان کی ذہنی اور دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ تعلیم قوم، معاشرہ اور فرد کی فلاح و بہبود کا کام انجام دیتی ہے۔ وہ معاشرے کی تزئین اور تہذیب میں مدد دیتی ہے۔ تعلیم قومی نصب العین کے حصول کا ایک وسیلہ ہے تا کہ اس کے ذریعے قومی ثقافت و تمدن اور تہذیبی ورثے کو محفوظ کیا جا سکے۔ تعلیم سے قومی شعور پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم انسان کو ایک باعزت زندگی بسر کرنے اور معاشرے میں ایک باعزت و قابل احترام فرد بننے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ عظیم قومیں تعلیم سے اپنے قومی تشخص کو فروغ دیتی ہیں۔ یہ وہ خیالات تھے جو تحریک علی گڑھ کی بنیاد بنے۔ اور اس کا اولین مقصد قرار پائے۔ (شاہد حسین رزاقی 1963ء ص 39)

سرسیّد بنیادی طور پر ایک ماہر تعلیم تھے اور یہ امر تو واقعی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی نہ جاننے کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں کو انگریزی تعلیم دلانے کے اہم محرک بن گئے۔ انہوں نے سابقہ نظام تعلیم کو جو زیادہ تر فارسی اور عربی پر مشتمل تھا اور دور جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے سے یکسر قاصر تھا، وقتی ضرورت کے قطعاً برعکس قرار دیا۔ انہوں نے ان تمام مخالفین کو جو کسی نہ کسی لحاظ سے مغربی تعلیم کو مسلمانوں کیلئے غیر ضروری سمجھتے تھے موثر جواب دیئے۔ جیسا کہ آپ نے اپنے مضمون "تعصب" میں جو انہوں نے تہذیب الاخلاق میں تحریر کیا تھا لکھتے ہیں: دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں و خوشیاں حاصل کی ہوں، بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا ہے مگر

متعصب دشمن ان نعمتوں سے محروم رہتا ہے ۔علم میں اس کو ترقی نہیں ہوتی ،ہنر وفن میں اس کو دستگاہ حاصل نہیں ہوتی ۔(عبدالرشید خان،پروفیسر 1986ء،ص 68)

اسی طرح ایک مضمون "تکمیل" میں لکھتے ہیں:ارسطو ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے علوم اور اس کے فلسفے کو نا قابل غلطی سمجھیں ۔بوعلی کچھ صاحب وحی نہ تھا کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں ۔پھر کیوں ہم اپنی آنکھیں نہ کھولیں اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالیٰ کے عجائب قدرت کے نمونے ہیں اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتے جاتے ہیں ۔ان کو کیوں نہ دیکھیں (محمد نسیم قریشی 1960ء،ص 59)۔نئے علوم وفنون سے ہم وطنوں کو روشناس کرانے کیلئے سرسیّد نے تین سطحوں پر کام کیا۔

- دوسری زبانوں کی مفید کتب کے ترجمے کیلئے سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی (عزیز احمد،پروفیسر 1989ء،ص 66)
- کیمرج اور آکسفورڈ کے طرز پر علی گڑھ میں ایک کالج کی بنیاد رکھی (معین الدین عقیل ،ڈاکٹر (س ن)ص 58)
- ملک کے طول وعرض میں تعلیمی بیداری کیلئے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو ذریعہ بنایا (اختر الواسع 1978ء،ص 17)

سائنٹیفک سوسائٹی کا مقصد ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم کے فوائد سے روشناس کرانا تھا ۔اسکے دیگر مقاصد میں یورپی علوم کی کتب کا عام فہم زبانوں میں ترجمہ،نادر اور نایاب مشرقی علوم کی تحقیق،مضامین لکھوانا اور مفید تعلیمی موضوعات پر تقاریر کروانا بھی شامل تھے (یوسف حسن 1967ء،ص 9)۔اس کا ثبوت سائنٹیفک سوسائٹی کے شائع کردہ تراجم کی فہرست ضمیمہ نمبر 2 میں درج ہے۔مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کیلئے رسائل ومضامین میں اس کے فوائد وثمرات سمجھانے کے ساتھ ساتھ سرسیّد نے مختلف مقامات پر مدارس اور اسکول کھولے (محمد اکرام،شیخ 1982ء،ص 9)۔اس کالج کیلئے جو مقاصد مقرر کئے گئے تھے وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھے:ایسا کالج قائم کرنا جس میں مسلمان انگریزی زبان وعلوم حاصل کریں ۔(افتخار عالم 1901ء،ص 133)

تحریک علی گڑھ کے تعلیمی مقاصد یہیں ختم نہیں ہوجاتے کیونکہ سرسیّد سمجھتے تھے کہ علی گڑھ کالج برصغیر کے تمام مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔چنانچہ جب مالی حالت کسی قدر اطمینان کے قابل ہوگئی تو 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے علی گڑھ میں ایک تعلیمی مجلس تشکیل دی گئی (آفتاب حسن،میجر 1974ء،ص 134)۔یہ کالج سے باہر ایک تعلیمی وتہذیبی پلیٹ فارم تھا جسے کالج کی فضا کی نسبت زیادہ آزادی میسّر تھی (پنجاب یونیورٹی 1982ء ص 106)۔اس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے جن سے تحریک علی گڑھ کے تعلیمی مقاصد پر مفصل روشنی پڑتی ہے۔

- مسلمانوں میں یورپین سائنس ولٹریچر کی اشاعت اور اعلیٰ تعلیم کی کوشش کرنا۔
- مسلمانوں کے قدیم علوم کے متعلق تحقیقات کرنا،اُردو اور انگریزی میں رسالے لکھوانا۔
- مشہور علماء اور مصنفین اسلام کی سوانح حیات اُردو اور انگریزی میں مرتب کرنا۔
- مسلم مصنفین کی قدیم تصانیف کی فراہمی۔

- زمانۂ قدیم کے تاریخی واقعات کی تحقیق واشاعت۔
- دنیاوی علوم کے مسائل کی تحقیق واشاعت۔
- شاہی فرامین کو جمع کر کے ایک کتاب انشاء مرتب کرنا۔
- مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کی درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا۔
- علوم مشرقی اور دینیات کے علماء سے ربط قائم کرنا اور انکی تعلیم میں ترقی کی کوشش کرنا۔اس کو بدستور قائم وجاری رکھنے کی مناسب تدبیر عمل میں لانا۔
- قدیم مکاتب کی اصلاح وترقی۔
- قرآن خوانی اور حفظ قرآن کیلئے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے۔ان کے حالات کی تفتیش کرنا،انہیں استحکام دینے کیلئے تدابیر عمل میں لانا۔(الطاف علی بریلوی سیّد 1994ء،ص 18-19)

المختصر تحریک علی گڑھ کا بنیادی مقصد علوم جدیدہ کو مسلمانوں میں مقبول بنانا تھا۔کیونکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانوں کو مغربی علوم کے ذریعے نئے سائنسی دور سے متعارف کرایا جائے تاکہ وہ زندگی کی دوڑ میں پورا حصّہ لینے کے قابل ہو سکیں اور دور جدید کے انداز فکر اور اسلوب بیاں سے واقف ہو کر نہ صرف آگے بڑھنے کے قابل ہوں بلکہ ان لوگوں کا مقابلہ،ان ہی کے ہتھیاروں سے کر سکیں جو مسلمانوں کے دین وعقائد پر نت نئے حملے کرتے رہتے تھے۔بانیٔ تحریک نے دیکھ لیا تھا کہ مغربی تہذیب اصلاً اسلام کے منافی نہیں اور اگر اس کی عریانی وفحاشی سے بچا جا سکے تو یہ کام کی چیز ہے۔اس لئے انہوں نے اسلامی ماحول میں مغربی تعلیم دینے کا انتظام کیا اور اس مقصد کیلئے مسلم کالج علی گڑھ قائم کیا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا۔(عبدالرشید میاں 1982ء،ص 100-102)

تمدنی ومعاشرتی مقاصد

انیسویں صدی کی ابتداء میں سیّد احمد بریلوی کی تحریک اصلاح معاشرت ومذہب شروع ہوئی تھی۔جس کا سلسلہ سرسیّد احمد خان کے زمانہ تک جاری رہا۔وہ تحریک شرک وبدعت،آرام طلبی وعیش پرستی کے خلاف تھی جس کے اثر سے بڑے بڑے امراء غریبوں کی مانند زندگی بسر کرتے تھے۔وہ اصلاح کا پہلا دور تھا۔اُسی صدی کے آخر میں سرسیّد احمد خان کے ہاتھوں دوسرا دور شروع ہوا۔جو اوّل الذکر تحریک سے مختلف تھا۔سرسیّد احمد خان پر اس بات کا بڑا اثر تھا کہ تمدن ومعاشرت کے اعتبار سے اہل یورپ مسلمانوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے(Civilized) یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز ومہذب کہلائیں۔اس سلسلہ میں سرسیّد نے تحریر کیا کہ:ہم نے تمام معاملات زندگی میں بلکہ بعض امور مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی بسبب اختلاط وملاپ اختیار کر لی ہیں مگر جب ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت اور تمدن کو اعلیٰ درجہ کی تہذیب پر پہنچائیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ

مہذب ہیں وہ ہم کو بہ نظرِ حقارت نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تمام رسوم وعادات کو بہ نظرِ تحقیق دیکھیں۔ جو بُری ہوں ان کو چھوڑیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان میں اصلاح کریں۔(احمد خان 'سیّد سر (س ن)' ص 6)

سر سیّد ایک انگریز مورخ کے اعتراضات سے بہت متاثر ہوئے جنھیں سر سیّد نے تہذیب الاخلاق کے سب سے پہلے پرچے میں نقل کیا تھا۔اس کے چند الفاظ یہ ہیں: ہندوستان کے مسلمان ذلیل ترین امت محمد (ﷺ) سے ہیں۔ اور قرآن کے مسئلوں اور ہندوستان کی بت پرستی سے مل ملا کران کا مذہب ایک عجیب مجموعہ ہو گیا ہے۔ایک دوسرے مورخ نے لکھا تھا کہ: عیسائیت اس بڑی سے بڑی خوشی کے جو قادر مطلق نے انسان کو دی ہے صرف موافق اور مطابق ہی نہیں بلکہ اس کو ترقی دینے والی ہے اور برخلاف اس کے اسلام اس کو خراب کرنے والا اور ذلت میں ڈالنے والا ہے۔(طفیل منگلوری 1945ء ص 190-191)

سر سیّد احمد خان کو بخوبی اندازہ تھا کہ قوم کو مہذب بنانے کیلئے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔معاشرہ کی ترقی و تہذیب میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔اور مہذب قوموں سے کس حد تک استفادہ کرنا ضروری ہے؟ (Jose Ortega, Y. Gasset Kegan Paul 1946, P: 65,66) لہٰذا انہوں نے تحریک علی گڑھ کے مقاصد میں ان باتوں کا لحاظ رکھا۔یوں تو ہندوستان کی تمام قوموں کی معاشرتی حالت اصلاح طلب تھی لیکن مسلمانوں کے معاشرہ میں سب سے زیادہ خرابیاں پائی جاتی تھیں۔اور ان ہی کی اصلاح کرنا "تحریک علی گڑھ" کا مقصد تھا۔سر سیّد احمد خان کی قائم کردہ "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" نے اپنے فرائض میں تمدنی اصلاح کا کام بھی شامل کیا۔تمدنی اصلاح کا مقصد یہ تھا کہ: تعلیم یافتہ اور روشن ضمیر مسلمان تعلیم کے ساتھ ساتھ متحدہ کوششیں ان تباہ کن رسوم اور تمدنی عادات کی اصلاح کے واسطے کریں جو مسلمانوں کو تباہ کرتی ہیں اور شریعت کے خلاف ہیں۔(رپورٹ محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس 1900ء ص 166)

تمدنی و معاشرتی اصلاح سے مراد یہ تھی کہ مسلمان مردوں اور خصوصاً عورتوں میں فضول وغلط رسومات کا سدِّ باب کیا جائے۔انہیں فضول خرچی کے تباہ کن وغلط اثرات سے بچنے نیز بچت کرکے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں خرچ کرنے کی طرف راغب کیا جائے۔اس کے علاوہ فضول رسموں کی بیخ کنی، گداگری کی لعنت کا خاتمہ اور بے کاروں کا کام کرنے کی طرف مائل کرنا بھی شامل تھا۔کیونکہ بقول سر سیّد احمد خان: میری دانست میں ہم مسلمانوں میں بہت سی رسمیں جو درحقیقت نفس الامر میں ہیں مروج ہو گئی ہیں۔جن میں سے ہزاروں ہمارے پاک مذہب کے بھی برخلاف ہیں اور انسانیت کے بھی مخالف ہیں بلکہ تہذیب و تمدن و تربیت و شائستگی کے برعکس ہیں۔(رسالہ کانفرنس متعلق تمدن و معاشرت (س ن) ص 5)

چنانچہ سر سیّد نے مسلمانوں کی معاشرتی و تمدنی اصلاح کے لئے اسے تحریک کا نہ صرف مقصد بنایا بلکہ اس کیلئے درج ذیل امور پر مسلمانوں کو توجہ دلائی۔

- آزادیِ رائے کا پیدا ہونا ---------- جب تک آزادیِ رائے پیدا نہیں ہوگی تہذیب نہیں آئیگی۔
- درستی عقائدِ اسلامی ---------- عقائد کو ہیئتِ اسلام کے مطابق کرنا اور اس پر یقین رکھنا تہذیب وشائستگی کی اصل جڑ ہے۔
- خیالات وافعال مذہبی ---------- ان خیالات وافعال سے گریز کرنا جو یا تو بدعت ہیں یا کفر وشرک۔
- تدقیق بعض مسائلِ مذہبی ---------- وہ مسائل مذہبی جو فی نفسہٖ درست ہیں مگر تحقیق کامل نہ ہونے کے سبب علوم عقلیہ کے برخلاف اور تہذیب وشائستگی کے خلاف معلوم ہوتے ہیں ان کی تشریح کرنا۔
- تصحیح بعض مسائلِ مذہبی ---------- بعض مسائلِ مذہبی ایسے ہیں جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو۔ان کو بحث میں لانا اور درست کرنا ضروری ہے۔
- تعلیمِ اطفال ---------- مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔لہٰذا ایسے طریقہ تعلیم متعین کرنا جس سے دینی ودنیوی قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ حاصل ہو۔
- سامانِ تعلیم ---------- صرف طریقہ تعلیم ہی نہیں بلکہ آپس کی مدد سے سامان تعلیم مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔
- عورتوں کی تعلیم ---------- لڑکیوں کی تعلیم اور ہنر سکھانے کیلئے عمدہ بندوبست ہو۔
- ہنر وفن وحرفہ ---------- اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر،صنعت،فن وحرفہ کو ترقی دینا قومی تہذیب کے لئے ایک بڑا جزو ہے۔
- خودغرضی ---------- خودغرضی مذموم سبب قومی ذلت وتامہذب ہونے کا ہے۔اس سے بچنا ضروری ہے۔
- عزت وغیرت ---------- عزت وغیرت جو کہ قوم میں معدوم ہوگئی ہے اسے بحال کرنا۔
- ضبطِ اوقات ---------- ہر کام کو وقت پر کرنا اصل اصول قومی تہذیب وشائستگی کا ہے۔
- اخلاق ---------- جھوٹی نیازمندی،جھوٹی تعریف،ظاہری محبت کی بجائے خندہ پیشانی ونیازمندی اچھے اخلاق کی علامات ہیں انہیں اپنانا۔
- صدقِ مقال ---------- یہ وہ صفت ہے کہ جو انسان کو قطب وابدال کے درجے سے بھی بڑھا دیتی ہے۔لہٰذا دنیاوی باتوں میں بھی سچے پن کا اظہار ہو۔
- دوستوں سے رسم وراہ ---------- آپس میں ایسے ملنا چاہیے جیسے انسان انسان سے ملتا ہے۔
- کلام ---------- ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں استعمال ہوتے ہیں کم ہیں۔اس لئے اس کی اصلاح بہت ضروری ہے۔
- لہجہ ---------- اکھڑ لہجہ یا اس قسم کی آواز جس سے شبہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا جانور لڑتے ہیں۔ناشائستہ ہونے کی نشانی ہے۔کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

- طریق زندگی ---------- طریق زندگی تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریق زندگی ہم سے عمدہ اور اچھا ہے۔لہٰذا اسکی اصلاح بھی درکار ہے۔
- صفائی ---------- حدیث نبوی ﷺ ہے کہ "صفائی نصف ایمان ہے"۔انگریزی مثل ہے کہ "خدا اور خدا کے بعد صفائی" ہے۔لہٰذا اس پر توجہ درکار ہے۔
- طرزِ لباس ---------- لباس کی قطع اور وضع تہذیب یافتہ ہونے کی نشانی ہے۔لہٰذا اس کا خیال رہے۔
- طریق اکل وشرب ---------- اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں تو ہمارے کھانے پینے کا طریقہ ایسا ہے کہ بعض کو دیکھ کر تے آنے لگتی ہے۔اسے درست کریں۔
- تدبیر منزل ---------- ہماری تدبیر منزل یعنی انتظام خانہ داری ایسا خراب ہے کہ جس میں نہایت درجے کی اصلاح وترقی کی حاجت ہے۔
- رفاہ عورتوں کی حالت میں ---------- ہمارا جو برتاؤ عورتوں کے ساتھ ہے وہ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔
- کثرتِ ازدواج ---------- نہایت نالائقی سے خدا اور خدا کے رسول ﷺ کے حکم کے برخلاف برتا جاتا ہے۔جس کی بدولت اسلام کو شرمندگی وبدنامی ہے۔لہٰذا اسے مطابق اسلام بنانا۔
- غلامی ---------- اگرچہ یہ بدرسم موقوف ہوگئی ہے مگر ہمارے دل میں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ یہ رسم مسلمانی مذہب کے خلاف تھی۔اس پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔
- رسوماتِ شادی ---------- جو رسوماتِ شادی ہم میں رائج ہیں وہ غیر اسلامی ہیں انہیں اسلامی کرنے کی ضرورت ہے۔
- رسوماتِ غمی ---------- غمی کے موقعہ پر جو رسوماتِ بد ہم میں موجود ہیں انہیں بھی اسلامی کرنے کی ضرورت ہے۔
- ترقی زراعت ---------- زراعت کی ترقی اور کاشتکاروں کی حالت میں بہتری قومی ترقی وتہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے۔اس کیلئے ہمیں بہت کچھ کرنا چاہیے۔
- تجارت ---------- یہ سب سے آخری جزو ہے۔جبکہ ہم مسلمانوں میں یہ بالکل متروک ہوگیا ہے۔اپنی قوم میں اس کو رواج دینا تہذیب وشائستگی حاصل کرنے میں بہت بڑا عامل ہے۔(شاہد حسین رزاقی 1963ء ص 32-39)

المختصر سرسیدؒ کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں پر جنگ آزادی کے واقعات اور اس کے بعد اپنی تباہی وبربادی کا اتنا اثر ہے کہ اگر وہ انگریزوں سے سماجی تعصب کو اپنے دل میں جگہ دیتے رہے تو جو نقصان انہیں پہنچ چکا ہے اس سے بھی زیادہ نقصان اٹھائیں گے۔لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کی تمدنی ومعاشرتی اصلاح کو تحریک کا مقصد بنایا۔(رشید احمد،پروفیسر صدیقی 1920ء ص 210)

تاریخی مقاصد

اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:۔

توپ کھسکی پروفیسر آ پہنچے　　　جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

یعنی پہلے توپ سے حملہ کیا گیا جس سے ہماری سیاسی قوت کو ختم کیا گیا ۔اب مستشرقین اور معلمین تشریف لے آئے ہیں تا کہ ہمارے ذہنوں ،دلوں ،خیالات ،نظریات اور اخلاق و کردار کو بدل کر رکھ دیں اور انگریزوں کے غلام تیار کریں ۔یہ وہ پس منظر ہے جسکے باعث تحریک علی گڑھ نے اسلامی تاریخ کو صحیح رنگ میں اجاگر کرنے اور اسکی تحریفات کو ختم کرنے کے لئے قدم اُٹھایا اور اس مقصدِ عظیم کو بھی اپنے مقاصد میں شامل کر لیا (خورشید احمد ،پروفیسر 1963ء ،ص 56)۔ لہٰذا اس مقصد کیلئے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کیلئے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ ایسے امور کا اہتمام کرے کہ مسلمان مصنفوں کی نایاب و قیمتی تصنیفات کو جو چند لوگوں کے پاس موجود تھیں ،ان کے ''بہم پہنچانے کی تدبیر'' کرے یا پتہ لگائے کہ وہ کس جگہ موجود ہیں ۔مسلمانوں کے تاریخی سرمایہ کو محفوظ رکھنا اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ بیشتر غیر مسلم مورخین نے حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی ۔(محمد الیاس الاعظمی ،ڈاکٹر 2002ء ،ص 120-133)

اس سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر بہت بُرا اثر پڑا تھا ۔اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی تاریخ سے نفرت کرنے لگے تھے ۔سر سیّد نے محسن الملک کے نام اپنے ایک خط میں یوں اظہار کیا ہے:انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی گئی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں اپنی کتابوں کو پڑھتے اور لکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ از راہ ناانصافی اور تعصب مسلمان کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی جانتے ہیں ۔اس لئے اس قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو ،نہایت مفید بلکہ ضروری ہے ۔(احمد خان ،سیّد سر 1959ء الف ،ص 54)

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے 1891ء کے اجلاس (علی گڑھ) میں مذکورہ خیالات کی تائید کرتے ہوئے یہ قرارداد منظور کی کہ:اس جلسہ کی رائے یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے بعض امور کی نسبت یورپ میں شدید غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں اور رفتہ رفتہ یورپ کے مصنفوں نے ان کو بطور اصول موضوعہ بلکہ مثل علوم متعارفہ کے اپنی تصنیفوں میں قرار دیا ہے ۔مسلمان ان کو پڑھ کر غلطی میں پڑ جاتے ہیں ۔ان غلطیوں کے دور کرنے کی غرض سے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں رسالے لکھے جائیں اور انگریزی رسالے یورپ میں شائع کئے جائیں ۔(رپورٹ کانفرنس 1891ء ،محرک مولوی شبیر الدین ،تائید سر سیّد احمد خان ،ص 74)

کانفرنس میں اس امر پر بھی احتجاج کیا کہ مدرسوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ بجائے قومی ولولے پیدا کرنے کے ان کو مٹا دیتی ہیں ،قومی ہیروز کی تصویریں ایسی بدنما صورت میں دکھائی جاتی ہیں کہ قومی تاریخ کی وقعت

طالب علموں کے دلوں میں سے جاتی رہتی ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ فاتحان اسلام ایک قزاقوں اور لٹیروں کا گروہ تھا۔جنہوں نے دنیا کے امن میں خلل ڈالا ۔بے رحمی اور خونریزی کی مثالیں کثرت سے پیش کی جاتی ہیں۔(اقتباس از تقریر چودھری خوشی محمد بی۔اے رپورٹ کانفرنس 1900ء ص 140)

الغرض کانفرنس نے قدیم تاریخی واقعات کو اکٹھا کرنے ،مسلمانوں کو ان سے بخوبی روشناس کرانے کیلئے قدیم تاریخی واقعات پر رسالے لکھوانے ،تقاریر کا انتظام کرانے یا کم از کم لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے پر زور دیا۔تا کہ تعصب میں رنگے ہوئے غیر مصدقہ افسانوں کی جگہ صحت مند تاریخی ادب پیدا کرنے میں مدد ملے۔جدید علوم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر یہ ضروری ہوگیا تھا کہ لوگ محض حال ہی کے جال میں نہ پھنس جائیں بلکہ ماضی سے بھی اپنا رابطہ برقرار رکھیں۔مزید یہ کہ قدیم تہذیب وتمدن کے عروج وزوال،مختلف بادشاہوں کے کارنامے اور حملہ آور قوموں کی داستانیں بھی محفوظ کرنا تاریخی مقصد تھا۔اس سلسلے میں بانی تحریک نے خود بھی کئی تواریخ مرتب ومؤلف کیں جیسے آثار الصنادید،تاریخ ضلع بجنور،تاریخ سرکشی بجنور،آئین اکبری کی تصحیح،تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح،ترجمہ کیمیائے سعادت،تزک جہانگیری وغیرہ۔(خلیق احمد،پروفیسر نظامی 1994ء ص 24-26)

ادبی مقاصد

بانی تحریک علی گڑھ کی نظر وقت کی اس اہم ضرورت پر بھی تھی ۔لہٰذا تحریک علی گڑھ کے مقاصد ادبی بھی تھے کہ ادب میں جدیدیت پیدا کی جائے۔ادبی مقاصد میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مقفّع ومسجع عبارات کی جگہ سادہ وسلیس طرز زبان کو مقبول بنایا جائے۔مضمون نگاری کا مذاق پیدا کیا جائے بلکہ انگریزی اخبارات میں جیسے مضامین چھپتے ہیں ویسے مضامین اُردو اخبارات وجرائد میں چھاپے جائیں۔سوانح نگاری کا صحیح مذاق پیدا کیا جائے۔روایتی قسم کی گل وبلبل اور ساغر پیا نہ شاعری ترک کرکے نیچرل شاعری اپنائی جائے۔تا کہ شاعری کے ذریعے ذہنی،فکری اور تہذیبی انقلاب برپا کیا جاسکے(الطاف علیؔ بریلوی سیّد 1969ء ص 226)۔اُردو انشاء پردازی میں انقلاب برپا کیا جائے۔اُردو نثر نگاری کی فرسودہ،پرتصنع عبارت آرائی کی ڈگر کو بدل کر عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔جدید طرز نگارش یا انگریزی انداز بیان کو اُردو ادب میں رائج کیا جائے ۔(خلیق احمد،پروفیسر نظامی 1994ء ص 13-19)

سرسیّد نے اُردو ادب میں جو باتیں پیدا کیں ان کو مختصراً تہذیب الاخلاق میں خود ایک مقام پر لکھتے ہیں: جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اُردو زبان کی علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعے سے کوشش کی،مضمون کے ادا کا ایک سادہ اور صاف طریقہ اختیار کیا،رنگین عبادت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا،پرہیز کیا۔اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو،مضمون کے ادا میں ہو جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔(سلیمان ندوی،سیّد 1989ء الف ص 7)

تحریک علی گڑھ کے ادبی مقاصد کے تحت سرسیّد نے اہل قلم کی ایک ٹیم جمع کر لی تھی ۔یہ عجب اتفاق ہے کہ سرسیّد نے درجن بھر قد آور شخصیتیں پیدا کیں حالانکہ کسی تناور درخت کے سائے میں کوئی پودا نہیں پھلتا پھولتا جبکہ سرسیّد کی ٹیم میں نواب محسن الملک،نواب وقار الملک،مولوی چراغ علی،الطاف حسین حالی،شمس العلما ءذکا ءاللہ،ڈپٹی نذیر احمد،شبلی نعمانی اور محمد فارقلیط اللہ جیسے قلم کار شامل تھے ۔(محمد عبداللہ شکیب 1975ء ص 220)

مذہبی مقاصد

تحریک علی گڑھ کے مقاصد اصلاً مذہبی مقاصد تھے۔جیسا کہ خود سرسیّد احمد خان نے کہا: مجھ کو یہ بات زیادہ خوش کرنے والی نہیں کہ کسی مسلمان نے بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری حاصل کر لی۔میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔یاد رکھو قوم کوئی چیز نہیں جب کہ وہ قوم "قوم" نہ بنے۔ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہوتا ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کو ایک قوم بناتی ہیں۔جب تک وہ اپنے مذہب کے پیروکار ہیں وہ ایک قوم ہیں ۔یاد رکھو کہ اسلام پر ہی تمہیں جینا ہے اور اسلام پر ہی مرنا ۔اسلام کو قائم رکھنے ہی میں ہماری قوم قوم ہے ۔اے عزیزو اگر کوئی آسمان کا تارا بھی توڑ لائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا وہ ہماری قوم ہی نہ رہا۔پس اسلام کو قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبود ہے۔(فرحت عظیم ڈاکٹر 2000ء ص 17)

مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں سرسیّد حکومت کی مداخلت پسند نہ کرتے تھے ۔تاکہ حکومتِ وقت کے ساتھ مزید اختلافات نہ پیدا ہوں ۔انہوں نے اسلام کو جدید تحقیق کی روشنی میں سمجھا اور بعض غیر موزوں تفاسیر کو بھی غلط قرار دیا۔قطع نظر اس کے ان کے بعض مذہبی خیالات معقولات کی حدود میں مقید ہو گئے تھے۔لیکن یہ سمجھنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے مذہبی تعلیم کو "دو چار مُلّاؤں" کی "پرانی کڑھائی" کتابوں تک رکھنے کی بجائے اسے وسعت کا حامل قرار دیا۔(احمد خان سیّد سر(س ن) ص 150)

تحریک علی گڑھ کے بانیان کو یہ علم تھا کہ انگریزی تعلیم کے حصول سے عام مسلمانوں کے گریز کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسکولوں میں ان کی مذہبی تعلیم کے انتظامات غیر تسلی بخش اور نہ ہونے کے برابر تھے۔لہٰذا تحریک کے مقاصد میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی تھی کہ اس تحریک کا مقصد انگریزوں کی کورانہ تقلید نہیں اور نہ ہی صرف دنیاوی تعلیم کا حصول تھا بلکہ اس تحریک کے تحت مقصدِ تعلیم کی وضاحت کرتے ہوئے قرار دیا: تمام قوتیں جو خدا نے انسان میں رکھی ہیں نُمو پائیں ......(اور) نہ صرف انہی قوتوں کی نُمو دیا جائے جو ہماری جسمانی آسائش کے کام آئیں بلکہ روحانی قوتوں کو کام میں لانا اور دماغ کو غذا پہنچانا تعلیم کا اصل مقصد ہے(اقتباس از تقریر محسن الملک 1895ء ص 22)۔اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی گئی ۔(ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان 2002ء ص 1)

المختصر تحریک علی گڑھ کے مذہبی مقاصد میں زور اس بات پر تھا کہ مسلمانوں کے قدیم طرزِ تعلیم "درسِ نظامیہ" کو حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے ۔اس میں فقط صرف ونحو پر ہی توجہ نہ دی جائے بلکہ فقہ،اصول فقہ،حدیث

اوراصول حدیث کے ساتھ ساتھ علم کیمیا،طبیعات،طبقات الارض،تاریخ واقتصادیات وسیاست کی تعلیم بھی شامل کی جائے۔(محمد اکرام شیخ2003ء،ص423)

سیاسی مقاصد

تحریک علی گڑھ کے مقاصد میں سیاست کوواضح حیثیت حاصل تھی ۔1867ء میں اُردو ہندی تنازعے کا آغاز ہوا۔اس تنازعے نے سرسیّد کوغیر معمولی طور پر مایوس کیا۔کیونکہ یہ تنازعہ ایک ایسی گروہی سوچ کا شاخسانہ تھا۔جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے تقسیم کرنا تھا۔یہ پہلا موقعہ تھا کہ سرسیّد کے دل میں ہندوؤں کے بارے میں بدگمانی نے جنم لیا۔یہی وجہ ہے کہ 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے وقت انہوں نے مسلمانوں کونصیحت کی کہ وہ اس تنظیم سے خود کوالگ رکھیں ۔انہیں اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ ہندوستان میں نمائندہ حکومت کا مطالبہ مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی مستقل بالادستی پر منتج ہوگا۔وہ یہ بھانپ گئے کہ مغربی طرز جمہوریت یہاں کے مسلمانوں کیلئے بالآخر نقصان دہ ہے۔(عبدالرشید میاں1982ء،ص96)

ان حالات میں یہ ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کیلئے انکی علیحدہ جماعت ہونی چاہیے۔اس ضمن میں بھی پہلا قدم خودسرسیّد نے اُٹھایا۔

- 1866ء میں سرسیّد نے علی گڑھ میں ایک انجمن برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے قائم کی ۔اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کرنے کیلئے برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچیں ۔چنانچہ اس کے نتیجے میں ریل اورڈاک کی آسانیاں حاصل ہوگئیں۔
- مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے اورانہیں کانگریس سے دور رکھنے کی غرض سے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی ۔یہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھی جاتی تھی ۔جوگاہے بگاہے مسلمانوں کے حقوق کی آواز بلند کرتی رہتی تھی۔
- 1893ء میں سرسیّد نے محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔جسکا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ اورایک ایسا فورم فراہم کرنا تھا جہاں مسلمان اپنے مسائل زیر بحث لاسکیں۔
- تحریک علی گڑھ کے پلیٹ فارم سے سرسیّد نے دوقومی نظریہ پیش کیا۔ (صفدرمحمود ڈاکٹر1989ء،ص13-16)

اُردو کی ترویج

بانئ تحریک علی گڑھ نے اس نکتے کو پالیا تھا کہ تہذیبی وحدت کی ایک بڑی علامت مادری یاقومی زبان ہوتی ہے۔ لہٰذا 1867ء میں سرسیّد نے اُردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی ۔جس میں تمام علوم وفنون کی تعلیم اُردوزبان میں ہو۔اسی زبان میں امتحان لئے جائیں اوراس کی اسناد کا درجہ وہی ہو جوانگریزی خواں طلبہ کی ڈگریوں کا ہے ۔اس یونیورسٹی کے ذریعہء تعلیم کیلئے سرسیّد نے تمام علوم وفنون کی کتابیں سائنٹیفک سوسائٹی کی طرف سے ترجمہ وتالیف کا خود ذمہ لیا۔سرسیّد

کی یہ خواہش اگر چہ ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی تاہم ان کی تحریک کا واضح مقصد اُردو کی ترویج رہا (وقار احمد رضوی ڈاکٹر 1996ء ص 17)۔اس سلسلے میں سرسیّد کے یہ الفاظ یقیناً سنہرے حروف میں لکھنے کے لائق ہیں: میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حروف میں آئندہ زمانے کی یادگاری کیلئے کھودی جائے کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اس کی زبان میں نہ دیئے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔(اختر الواسع 1985ء ص 21)

مندرجہ بالا حقیقت کی روشنی میں اگر سرسیّد کی اُردو یونیورسٹی کے تصور کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ تہذیبی، لسانی اور تمدنی لحاظ سے اُردو نہ صرف ذریعۂ تعلیم بننے کیلئے موزوں ہے بلکہ پاکستان کی قومی زبان بننے کی بدرجہ احسن صلاحیت رکھتی ہے۔اس طرح سرسیّد نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا نظریہ دے کر برصغیر کے مسلمانوں کو عہد جدید سے ہم آہنگ کیا۔نیز اُردو زبان کی ترویج علی گڑھ کی تحریک کا نمایاں مقصد تھا۔(خلیق احمد نظامی 1994ء ص 17-18)

تعلیم نسواں

تحریک علی گڑھ نے محض مسلمان مردوں کے بارے میں کوششوں کو ہی مقصدِ تحریک نہیں بنایا بلکہ مسلمان عورتوں کی تعلیم بھی اُسکا واضح مقصد تھا۔اگر چہ شروع میں یہ بات اغراض ومقاصد میں شامل نہیں تھی لیکن 1888ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور میں اس امر پر اتفاق رائے کیا گیا کہ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کیلئے اہل اسلام زنانہ کتب جاری کریں جو مذہب اسلام اور طریقہ شرفائے اہل اسلام کے مطابق اور مناسب ہو (مرقع کانفرنس اجلاس 1888ء تحریک شیخ خیرالدین، تائید خلیفہ عمادالدین، ص 25)۔بچوں کی عمدہ تعلیم کیلئے ضروری تھا کہ مائیں تعلیم یافتہ ہوں تاکہ وہ بچوں کی ابتدائی تعلیم کو احسن طریقے سے انجام دے سکیں۔بقول صاحبزادہ آفتاب احمد خان: اصلیت یہ ہے کہ یورپین اقوام کے بچوں کی تعلیم ابتداء سے جاری ہوتی ہے۔ہماری تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے جبکہ وقت نکل جاتا ہے۔کیونکہ ہماری تعلیم بچے کے آٹھ دس برس کا ہوجانے پر شروع ہوتی ہے (رپورٹ کانفرنس 1900ء، ص 145)۔مسلمانوں میں پردے کی پابندی کی بدولت عورتوں کی تعلیم صرف گھروں تک محدود تھی جبکہ تحریک علی گڑھ کا مقصد یہ رہا کہ عورتوں کیلئے جدید تعلیم کا مناسب بندوبست کیا جائے۔یہ کام بھی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے انجام پایا۔اور بقول جسٹس سیّد امیر علی: اب ہر شخص تعلیم نسواں کو ضروری خیال کرتا ہے۔لیکن یہ توقع کرتا ہے کہ کانفرنس اس کا کچھ انتظام کرے گی۔(اصغر عباس 1975ء ص 42)

روشن ضمیری و کردار سازی

تحریک علی گڑھ کا ایک مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیالات میں وسعت پیدا ہو اور وہ ترقی کی دوڑ میں اقوام عالم کے دوش بدوش چل سکیں۔سرسیّد نے مسلمانوں کے ذہن کی اصلاح اور کردار کی تربیت کیلئے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا (معین الدین عقیل ڈاکٹر (س ن) ص 58)۔یہ رسالہ تحریک علی گڑھ کا آرگن تھا۔جس کے مطالعہ سے مسلمانان

ہند کے خیالات میں ایک انقلابِ عظیم رونما ہوا۔اس سے مسلمانوں کو وہی فائدہ ہوا جو ایڈیسن اور اسٹیل کے رسائل ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر سے اہلِ انگلستان کو پہنچا تھا(محمد ایوب' قادری پروفیسر 1975ء'ص 127) ۔اس رسالے نے مسلمانوں میں روشن ضمیری پیدا کی ۔اور بتایا کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے جو ترقی کی اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے عقل و دماغ کے چراغ روشن کئے اور عہدِ جدید میں بھی مسلمانوں کی ترقی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ وہ عقل و خرد سے کام لیں ۔(الطاف حسین' حالی 1965ء'ص 112-113)

غلط فہمیاں دور کر کے بد اعتمادی کی فضا کو ختم کرنا

سر سیّد کی چشم دوربین نے دیکھ لیا تھا کہ توہمات کی قدیم دنیا دم توڑ رہی ہے ۔جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا عہدِ نو اس کی جگہ لے رہا ہے ۔اس خیال کے تحت سر سیّد اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر مسلمان انگریز اور انگریزی علوم سے کنارہ کش رہے تو ان کیلئے بحیثیت قوم اپنی کھوئی عظمت حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔چنانچہ انہوں نے اپنی تحریک کا مقصد بنالیا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان موجود بد اعتمادی کی فضاء کو ختم کیا جائے اور ان کے درمیان افہام و تفہیم نیز خوشگوار تعلقات کو فروغ دیا جائے ۔لہٰذا 1858ء میں آپ نے معروف رسالہ "اسبابِ بغاوتِ ہند" تحریر کیا۔جس میں 'غدر' کے اسباب کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا۔ اس تصنیف کی اشاعت کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ 'غدر' کا واقعہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ نہیں تھا اور اس میں مسلمانوں کا حصہ ہندوؤں سے کسی صورت زیادہ نہیں تھا ۔اس میں سر سیّد نے جو اسباب گنوائے ان میں اہم ترین سبب لیجسلیٹو کونسلوں میں ہندوستانیوں کی عدم نمائندگی تھی ۔اسی طرح سر سیّد نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی جزوی طور پر 'غدر' کا ذمہ دار ٹھہرایا۔پھر سر سیّد نے ان مسلمان خاندانوں کے نام گنوائے جنہوں نے غدر کے دوران انگریزوں کی جانیں بچائیں تھیں ۔ان تمام تصانیف کا مقصد مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔(صفدر محمود' ڈاکٹر 1989ء'ص 15)

انگریزی علمداری کی ابتداء سے ہی عیسائی مشنری اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے ۔اس طرح مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری تھا مگر تحریک علی گڑھ کے مقاصد میں سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کے مصداق سر سیّد نے مناظرہ کے مخاصمانہ طریقوں کو بدلنے کا عزم کیا لہٰذا انہوں نے 1857ء کے ہنگامے کے بعد توریت اور انجیل کی تفسیر "تبیین الکلام" کے نام سے لکھی ۔جس سے ان کا منشاء یہ تھا کہ اسلام اور عیسائیت میں جو امور مابہ النزاع ہیں اور وہ جو متفق علیہ ہیں ان کی تشریح کر کے دونوں قوموں کی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے ۔تحریک علی گڑھ کے تحت مسلمانوں اور انگریزوں کی باہم منافرت دور کرنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی گئیں یہ تصنیف بھی اُسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی ۔(ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان 2002ء'ص 1-2)

اس سلسلہ کی دوسری تصنیف "احکام طعام اہلِ کتاب" تھی جو 1868ء میں شائع ہوئی ۔اس کتاب میں احادیث اور آیاتِ قرآنی سے سر سیّد نے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں کے یہاں کا کھانا اور ان کا ذبیحہ جائز ہے ۔بشرطیکہ وہ حرام چیزوں سے پاک ہو۔(ممتاز معین' پروفیسر مسز 1982ء'ص 89)

لیکن باوجودان تدابیر کے اسلام پر عیسائیوں کے اعتراضات اور نکتہ چینیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ اس زمانہ میں صوبہ متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر ولیم میور نے آنحضرت ﷺ کی سوانح انگریزی میں "لائف آف محمد ﷺ" کے نام سے لکھی جس میں اسلام اور بانیٔ اسلام پر سخت حملے کئے۔ سرسیّد یہ پڑھ کر آپے سے باہر ہو گئے۔ انگلستان کے قیام میں انہوں نے اس کتاب کے جواب کی تیاری میں اپنا تن من دھن سب قربان کر دیا۔ اور "خطبات احمدیہ" کے نام سے اس کا جواب لکھا (خلیق احمد، پروفیسر نظامی 1994ء ص 21-23)۔ سرسیّد کی اس تصنیف میں یہ خوبی تھی کہ بجائے الزامی جوابات دینے کے مخالفوں کے دعووں کو خود ان کی کتابوں سے غلط ثابت کیا اور معترضین کی مدلل تردید کر کے یہ واضح کر دیا کہ اسلام بجائے دنیوی ترقی کا مخالف ہونے کے اس کا عین ممد ہے۔ خطباتِ احمدیہ کے بعد بھی سرسیّد نے حسب ضرورت اس عنوان پر رسالہ اور کتابیں وغیرہ لکھیں۔ حتیٰ کہ ان کے انتقال سے چند روز قبل کسی عیسائی نے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات پر ایک کتاب میں حملے کئے تھے۔ سرسیّد اُسے دیکھ کر بے تاب ہو گئے اور باوجود کبرسنی اور ضعیفی کے جب تک اس کا جواب نہ لکھا چین سے نہیں بیٹھے۔ (محمد علی، صدیقی 1975ء ص 140)

گویا تحریک علی گڑھ کے مقاصد کو ہم مجموعی طور پر اختصار سے یوں بیان کر سکتے ہیں۔

- تعلیم کی نوعیت کو بدلنا اور اس کو ترقی دینا
- دینی عقائد کو درست کرنا
- اخلاق وعادات کو سنوارنا
- رسوم ورواج کی برائیوں کو مٹانا
- عورتوں کے حقوق کا تحفظ کرنا
- ملی اخوت وقومی اتحاد پیدا کرنا
- قومی عزت کا احساس پیدا کرنا
- علمی ودینی نقطۂ نظر کی اصلاح کرنا
- ادب وانشاء کا ذوق صحیح پیدا کرنا
- قوم کو جدید ترقیات عملی کی طرف راغب کرنا
- تہذیب وتمدن اور طرز معاشرت کی برائیاں دور کرنا
- اُردو کو قومی حیات اور اجتماعی افکار کا ترجمان بنانا۔ (الطاف علی، بریلوی سیّد 1994ء ص 17)

یا

Sir Syed launched the Aligarh movement with the following objectives.

- **Create an atmosphere of mutal understanding between the British govenment and the Muslims.**
- **Persuade Muslims to learn English Education.**
- **Persuade Muslims to obstain from agitational Politics.**
- **To produce an intellectual class of Muslims.**

(The website storyofpakistan(2002) Aligarh Movement 1858-1898,P:1of2)

6.5 نصاب

نصاب تعلیم کو واضح کرتے ہوئے سرسیّد نے یہ کہا: جب مسلمانوں میں کچھ تعلیم کی تحریک ہوتی ہے۔وہی پرانا موروثی طریقہ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درس کتب کا اختیار کیا جاتا ہے۔مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور لغو ہیں۔ان سے کچھ بھی قومی فائدہ ہونے کی توقع نہیں۔زمانہ،زمانے کی طبیعت،علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہوگئے ہیں۔ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں،ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ ہمیں آزادی،راستی،صفائی اور اصلیت تک پہنچانے میں ذرا بھی تعلیم نہیں کرتیں۔بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا،پیچیدہ بات کہنا،جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا سکھاتی ہیں۔اسلئے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو ان سے کچھ فائدہ ہو مضرت حاصل ہونے کی توقع ہے۔یہی کس قدر بڑی مضرت ہے کہ ان کو پڑھ کر عمر بے فائدہ چیز میں ضائع کی جاتی ہے۔دنیاوی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے کچھ دنیا کا کام چلے۔بس ضرور ہوا کہ ہم وہ دنیاوی علوم اپنی تعلیم میں داخل کریں جو درحقیقت دنیا کے کام ہیں۔پس ہم کو بڑی مضبوطی سے ارادہ کرنا چاہیے کہ جس قدر علوم دنیاوی تعلیم سے متعلق ہیں مثلاً الجبراء، زوالوجی، جیالوجی،لاجک،فلاسفی،کیمسٹری اور تمام علوم جو ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں بڑے اہتمام سے اور کامل طور سے حاصل کریں۔(شاہد حسین رزاقی 1963ء ص 68-69)

سفر ولائت پر جانے سے پیشتر ہی وہ یہ کام شروع کر چکے تھے۔اس کا اندازہ اس زمانہ کے "سوسائٹی اخبار" کی تحریروں سے ہوتا ہے۔اس میں انہوں نے یورپ کی نئی تہذیب اور تعلیم کی بے حد تعریف کی۔اس کے برخلاف اپنی قوم کی جہالت پر جابجا شکوہ کیا۔اپنے قیام لندن کے دوران وہاں کے دیگر نظاموں کے علاوہ نظام تعلیم کا گہرا مطالعہ کیا اور جامعہ کیمبرج کا تفصیل سے معائنہ کیا۔کیونکہ ہندوستان آ کر وہ مسلمانوں کے لئے ایک دارالعلوم بنانے کا ارادہ کر چکے تھے۔لندن سے واپسی کے بعد بنارس میں ایک "مجلس خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند" کی تاسیس کا اعلان کیا (محمد اسماعیل؛ شیخ پانی پتی 1959ء ص 78) اس کمیٹی کے ذمے لگایا گیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس بات کی تفتیش کرے کہ

- سرکاری اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لئے کم پڑھتے ہیں؟
- علوم قدیمہ مسلمانوں میں گھٹ گئے اور علوم جدیدہ کیوں رواج نہیں پاتے؟
- جب یہ سوانح ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرکے اور ان تدبیروں پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کرے۔(محمد امین زبیری،مولوی (س ن)،ص 53-54)

26 دسمبر 1870ء کو کمیٹی کا پہلا اجلاس بنارس میں ہوا۔سرسیّد کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔اور اس تجویز پر کہ اس مسئلے پر انعامی مضامین لکھوائے جائیں،عمدہ مضامین لکھنے والوں کے کیلئے تین انعام (اوّل،دوم،سوم) مقرر کئے گئے۔اس کاروائی کو مشتہر کیا گیا اور 32 مضامین موصول ہوئے۔سرسیّد نے سیکرٹری کی حیثیت سے ان کا خلاصہ مرتب کیا اور نتائج استخراج

کئے ۔(محمد خلیل اللہ، پروفیسر 1983ء، ص 121)

سر سیّد کے مرتب کردہ نتائج کا خلاصہ یوں تھا:

- سمجھ دار مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے بارے میں وہ شکوک و شبہات نہیں ہیں جو پرانے خیال کے لوگوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔
- سرکاری مدارس کا نصاب اور طرز تعلیم ان کے مزاج کے خلاف تھے۔
- تعلیم جدید کے ساتھ اسلامی علوم و تہذیب کی حفاظت لازمی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام خود کریں۔
- ان میں اہم نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان اپنے قدیم علوم کو محفوظ رکھنے اور جدید علوم سے استفادہ کیلئے اپنی ضرورتوں کے مطابق تعلیم و تربیت کا خود انتظام کریں۔ رپورٹ کا ترجمہ انگریزی صوبائی اور مرکزی حکومت کو بھی بھیجا گیا۔

(نذیر چودھری 1973ء، ص 79)

کمیٹی خواستگار برائے ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند کے ایک اجلاس میں نصاب کے تعین کے بارے میں سر سیّد نے واشگاف فرمایا: مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ دو قسم کا ہونا چاہیے۔ ایک وہ جو خود مسلمان اس کو قائم کریں۔ جس سے ان کے تمام مقاصد دینی و دنیاوی انجام پاویں۔ دوسرے وہ جن سے مسلمان ان اصول و قواعد سے جو گورنمنٹ نے تعلیم کیلئے مقرر کئے ہیں، فائدہ اُٹھاویں (اصغر عباس 1975ء، ص 70)۔ گویا سر سیّد نے مسلمانوں کیلئے جو نصاب مرتب کیا وہ قومی و مذہبی جذبات کے شایانِ شان اور دور جدید کی ضروریات کے عین مطابق تھا۔ آپ نے مشرقی علوم کے ساتھ مغربی علوم اور مذہبی تعلیم کو بھی نصاب میں جگہ دی۔ یہ مذہبی تعلیم محض درس و تدریس تک محدود نہیں تھی بلکہ عملی بھی تھی۔ علی گڑھ کالج میں ہر مسلمان بچہ کے لئے:

- ارکان اسلام کی پابندی کرنا لازمی تھا
- ہر طالب علم کو پانچوں وقت کی نماز اور رمضان شریف کے روزے رکھنے پڑتے تھے
- اسلامی تہواروں کا مناسب احترام کیا جاتا تھا
- دینیات کی تعلیم تمام درجوں میں لازمی قرار دی گئی
- نصاب میں اسلامی تاریخ بھی شامل کی گئی (احمد خان، سیّد سر 1962ء الف، ص 13)
- ایک کلاس سے دوسری میں جانے کیلئے دینیات کا امتحان پاس کرنا ضروری تھا
- 1887ء میں قرآن مجید کا درس نصاب میں داخل کیا گیا
- نصاب میں اُردو نہ صرف ذریعہ تعلیم قرار دیا بلکہ 1867ء میں اُردو یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ جس میں تمام علوم و فنون کی تعلیم اُردو زبان میں ہو۔ اسی زبان میں امتحانات لئے جائیں اور اسکی اسناد کا درجہ وہی ہو جو

انگریزی خوان طلبہ کی ڈگریوں کا ہے ۔گویا اُردو کا دفاع اور اسکی ترویج نصاب کا مدعا تھی ۔(یوسف القرضاوی' علامہ ڈاکٹر 1988ء،ص 17)

الختصر نصاب تعلیم میں جدید اور مفید علوم کو داخل کیا گیا ۔اس کے ساتھ ہی مذہبی تعلیم کو بھی پوری اہمیت دی گئی ۔طلبہ کی تربیت میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ وہ ذہنی اور جسمانی ہر اعتبار سے پوری طرح صحت مند ہوں اور ان میں وہ خرابیاں باقی نہ رہیں جو ہندوستانی معاشرہ میں پیدا ہوگئی تھیں ۔یہ خرابیاں دور کرنے کے علاوہ اس نصاب کا مقصد طلبہ میں وہ اوصاف پیدا کرنا تھے جو معاشرہ کی بہتری اور ملک وملت کی فلاح وترقی کیلئے ضروری ہیں ۔یوں تحریک علی گڑھ کے نصاب نے برصغیر کے عوام کی توہم پرستی کو ہدفِ تنقید بنایا ۔انہیں جدید طرز معاشرت وعلوم اپنانے کی تلقین کی۔ صفائی وطہارت کا درس دیا۔شخصی عزت کی اہمیت اور اسے محفوظ رکھنے کے طریقے بتائے۔مسلمانوں کا تعلیمی ومعاشرتی معیار بلند کرنے کی کوشش کی۔

6.6 حکمتِ تدریس

زندگی کے متعلق بانیٔ تحریک علی گڑھ کا نظریہ ترقی پسندانہ تھا۔تہذیب الاخلاق کے مضامین اس پر دال نہیں کہ سرسیّد اور ان کے جانشین مسلمانوں کا معیار زندگی بلند کرنا چاہتے تھے ۔وہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے تھے کہ انگریزوں سے اچھی باتیں سیکھیں اور ان پر عمل کریں۔خود سرسیّد میز،کرسی پر بیٹھ کر کھانا تناول کرتے اور اپنے مہمانوں کو بھی میز کرسی پر بٹھا کر کھانا پیش کرتے ۔ان کے ہاں چینی کے برتن،شیشے کے گلاس اور چھری کانٹے کا استعمال ہوتا تھا۔وہ دوسروں کو بھی تلقین کرتے کہ کھانے پینے میں شائستگی اختیار کریں ۔لباس کے معاملے میں اسلام بڑا فراخ دین ہے ۔موسم کے اعتبار سے مختلف ممالک کے عوام کو مختلف لباس استعمال کرنے پڑتے ہیں ۔اس لئے تمام لوگوں کا لباس ایک سا نہیں ہوسکتا۔سرسیّد اور ان کے رفقاء انگریزی لباس استعمال کرنے کے حق میں تھے۔وہ اور ان کے ساتھی انگریزی کوٹ پہنتے تھے لیکن اس کے ساتھ وہ اسلامی تشخص کے بھی زبردست حامی تھے لہٰذا ترکی ٹوپیاں بھی استعمال کرتے تھے ۔وہ بے جا نمود ونمائش کے سخت خلاف تھے ۔(خورشید احمد،پروفیسر 1977ء،ص 85)

وہ اپنی تقریروں میں مسلمانوں کو کفایت شعاری،سادہ زندگی بسر کرنے،شادی بیاہ،عقیقے اور ختنے کے موقعوں پر فضول خرچی نہ کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے ۔مسلمان عام طور پر ایسے موقعوں پر ہندو ساہوکاروں سے سود پر رقمیں لے کر خرچ کیا کرتے تھے،سرسیّد اس کے خلاف تھے کیونکہ وہ مسلمانوں کی معاشی پستی اور زبوں حالی کا تدارک کرنا چاہتے تھے۔ مغربی علوم کو وہ حصول ملازمت اور حصول رزق کا ذریعہ سمجھتے تھے ۔اس لئے اس تحصیل کو مخلصانہ طور پر وہ قوم کیلئے مفید سمجھتے تھے ۔وہ کوئی ایسا اقدام کرنے کے روادار نہ تھے جس سے مادی آسودگی میں رخنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو(افتخار عالم

1901ء ص 133)۔لیکن اس وقت صورت حال بقول سرسیّد یوں تھی:

مسلمانوں میں اگر کسی کی اولاد عوام الناس کے لونڈوں میں کھیل کود سے بچے اور اپنے ہمجولیوں میں رہے۔اپنے ہمسر خاندانوں کی صحبت اُٹھائے اور دو زانوں بیٹھنا اور جھک کر سلام کرنا یا ''عین'' کو ٹھیک اس کے مخرج سے نکال کر سلام علیکم کہنا اور ہاتھ جوڑ کر مزاج شریف پوچھنا سیکھ جائے تو سعادتمند اور تربیت یافتہ گنا جاتا ہے۔اور جب اس کے ساتھ اس کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہو اور کسی میاں جی اور مُلاّ جی سے پڑھتا بھی ہو تو وہ تربیت کے کنگورہ پر پہنچا ہوا سمجھا جاتا ہے۔مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مفید تربیت کیلئے اور بہت کچھ ہونا چاہیے۔ایسی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل جانوروں کے محدود ہو جاتے ہیں۔اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ ان میں نہیں رہتا۔ان کی حرکاتِ موٗدبانہ صرف بندر کی سی حرکات ہوتی ہیں۔تربیت کامل کیلئے جیسا کہ علوم مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے ویسا ہی لڑکے کی زندگی کا ایسے طور پر بسر ہونا ضروری ہے جس سے روز بروز اس کے خیالات کو وسعت ہوتی جائے، اس کی اُمنگ بڑھتی جائے اور اس کے قوئی شگفتہ و شاداب رہیں۔(شاہد حسین رزاقی 1963ء ص 55)

تربیت کا صحیح طریقہ

مسلمان لڑکوں کو صحیح تربیت دینے کے بارے میں سرسیّد کا یہ خیال تھا کہ:ان کی عمر دس برس تک نہ پہنچنے پائے کہ وہ اپنے گھر سے جدا رکھے جائیں اور ان کی خاص طور پر تعلیم میں نگرانی ہو۔کسی شہر کے نزدیک جس کی آب و ہوا عمدہ ہو پُر فضا جگہ پر مکانات تعمیر کئے جائیں اور پھول باغ لگایا جائے۔عمارتوں کے ساتھ مسجد بھی بنائی جائے۔ایک کتب خانہ بھی بنایا جائے۔ایک بڑا کمرہ کھانا کھانے کیلئے ہو اور ایک ایسے کھیلوں کیلئے ہو جو مکان کے اندر کھیلے جاتے ہیں اور ہر ایک لڑکے کو ایک مناسب کمرہ بیٹھنے اور پڑھنے کو ملے۔کسی لڑکے کے ساتھ کوئی خدمت گار نہ ہو۔بلکہ ان مکانات کے متعلق نوکر ہوں اور سب کام وہی کیا کریں۔لڑکوں کیلئے ضروری ہو کہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھیں۔صبح کی نماز کے بعد تجویز کردہ طریقہ کے مطابق قرآن مجید پڑھا کریں۔سب کو ایک قسم کا یکساں لباس پہنایا جائے اور سب مل کر وقت معینہ پر کھانا کھائیں۔(شاہد حسین رزاقی 1963ء ص 56)

پڑھنے، کھیلنے اور ورزش جسمانی کے اوقات مقرر ہوں اور ہر ایک کیلئے ان کی پابندی لازی ہو۔ان مکانات پر نہایت لائق اور معتمد شخص بطور اتالیق مقرر ہو۔وہ تمام نگرانی اور ہر طرح کا بندوبست کرتا رہے۔لڑکوں کی صحت و تندرستی کا نگران رہے۔اس بات کی بھی نگرانی کرے کہ تمام لڑکے اوقات مقررہ میں وہی کام کریں جو اس وقت کیلئے معین ہو۔لڑکوں کے آرام، اپنے گھر جانے اور عزیز و اقارب سے ملنے کے قواعد مقرر ہوں۔ہمیشہ ان کی پابندی کی جائے۔لڑکوں کا علاج کرنے کیلئے ایک طبیب ملازم رکھا جائے۔یہ مکانات عالی شان بنائے جائیں اور جو ماہانہ اخراجات ہوں وہ داخل ہونے والے لڑکوں کے مربیوں سے لئے جائیں۔جب تک لڑکے گھروں سے علیحدہ ہو کر اس طرح تربیت نہ پائیں گے وہ خراب اور بری عادتوں کے عادی رہیں گے۔(ممتاز معین، پروفیسر مسز 1982ء ص 126-127)

مذہبی تعلیم کی ضرورت

یورپ میں جدید تعلیم کے حامیوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو مذہبی تعلیم کو عام تعلیم سے خارج کر دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ لوگ اس تعلیم کو باہمی اختلاف کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اس قسم کی عام تعلیم دینا چاہتے تھے جو بلا اختلاف سچ اور فائدہ مند ہو۔ ان لوگوں کے برعکس دوسرا گروہ مذہبی تعلیم کو اصل مقصد قرار دے کر عام تعلیم کو ضمنی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ سرسیّد کو پہلے گروہ سے اختلاف تھا۔ اسلئے کہ مذہبی خیالات کو ان انسانوں کے دلوں سے نکال ڈالنا جن کی تعلیم میں کوشش مقصود ہے ایک ایسا امر ہے جس کے ہونے کی سینکڑوں برس تک توقع نہیں ہے۔ اسلئے اس گروہ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن دوسرے گروہ نے نہایت کامیابی حاصل کی۔ اس کے سبب بے انتہا علوم وفنون نے ترقی پائی۔ تحریک علی گڑھ کی حکمت تدریس یہ ہی تھی کہ مسلمانوں کو جدید علوم وفنون کی مفید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے۔ (خلیق احمد، پروفیسر نظامی 1994ء ص 54-58)

ہندوستان میں لوگ مذہبی تعلیم کے بڑے حامی تھے لیکن چاہتے یہ تھے کہ ان کی مذہبی تعلیم کا بندوبست بھی حکومت کرے۔ جبکہ تحریک علی گڑھ نے اس بات کو رواج دیا کہ تعلیم کا پورا بوجھ صرف حکومت پر ڈالنا اور خود کچھ نہ کرنا بے حِسی و بے غیرتی کی بات ہے۔ سرسیّد کی یہ رائے تھی کہ اہل ہند اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام خود کریں (عبدالرشید خان پروفیسر 1986ء ص 48)۔ چنانچہ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا: گورنمنٹ ہر فرقہ کی مذہبی تعلیم کے قصے میں نہیں پڑ سکتی۔ وہ عام تعلیم کی پالیسی اختیار کرے گی۔ مسلمان مذہبی تعلیم دینا لازمی تصور کرتے ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ خود مذہبی تعلیم کا انتظام کریں۔ جب تک تمہارے جسم میں جان ہے تم مذہبی تعلیم کو ہرگز نہ چھوڑو۔ گورنمنٹ ہماری مدد کر سکتی ہے۔ لیکن ہماری یہ غرض خود متوجہ ہوئے بغیر پوری نہیں ہوسکتی۔ جب تک ہم اپنے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیں ہم ان کو دونوں طرح کی تعلیم نہیں دلا سکتے۔ (شاہد حسین رزاقی 1963ء ص 60)

پرانے علوم کی حالت

مسلمانوں کی تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ صرف پرانے علوم تک محدود تھی۔ جدید علوم وفنون کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ مروجہ علوم اس قدر پرانے تھے کہ صدیوں سے غیر مفید ہو گئے تھے۔ ان کو ایجاد کرنے والے نئے علوم جو موجودہ زمانے کیلئے نہایت ضروری اور مفید ہیں واقف تک نہ تھے۔ مسلمانوں نے پرانے علوم جس زمانے میں اختیار کئے تھے اس وقت کیلئے وہ یقیناً مفید تھے۔ ان سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ یورپ کی قوموں کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن ان علوم میں چونکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لئے یہ رفتہ رفتہ ناقص اور غیر مفید ہو گئے۔ مگر مسلمان بدستور ان ہی علوم کو حاصل کرتے رہے اور ان کو اپنے اسلاف کا بڑا کارنامہ سمجھ کر ان سے انحراف کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ (صباح الدین عبدالرحمٰن، سیّد 1963ء ص 193)

تحریک علی گڑھ کی یہ حکمت تھی کہ اس نے مسلمانوں کو بتایا کہ موجودہ زمانے کیلئے پرانے علوم کافی نہیں بلکہ جدید

علوم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانے میں ہمارے باپ دادا اپنے حاصل کئے ہوئے علوم پر فخر کرتے تھے۔وہ فخر بلاشبہ ہمیشہ رہے گا۔ان لوگوں کے نام عزت سے لئے جائیں گے۔مگر اس زمانے میں یہ چیز دیکھنے کے قابل ہے کہ کون سا علم اب ہمارے اور ملک کے لئے مفید ہے۔جس زمانے میں مشرقی علوم ہمارے باپ دادا نے حاصل کئے تھے اس کو ہزاروں برس ہوگئے۔اگر ہم اس پرانی لکیر کو پیٹتے رہے تو گویا ہم موجودہ زمانے سے سینکڑوں برس پیچھے ہٹ جائیں گے حالانکہ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔(احمد خان ٗسیّد سر 1960ء ص 102-103)

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں کئی صدیوں تک علوم وفنون کی ترقی میں بہت اہم اور نمایاں حصّہ لیا۔اور دنیا کی مختلف قوموں نے ان کے تعلیمی اداروں سے فائدہ اُٹھایا۔مسلمانوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ علم کو مسلسل ترقی دے رہے تھے۔اس بنا پر دنیا کی دوسری تمام قوموں سے ممتاز تھے۔لیکن جب ان کی علمی ترقیوں کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو وہ پرانی لکیر کے فقیر بن گئے اور علمی دنیا میں ان کی حالت بہت پست ہوگئی۔اب اس پستی سے نکلنے کی صورت صرف یہ ہی تھی کہ مسلمان جدید علوم کو حاصل کرکے دنیا کی علمی ترقی میں حصّہ لیتے۔(احمد خان ٗسیّد سر 1960ء ص 19)

مسلمانوں نے علمی ترقی کے مختلف مدارج کیوں کر طے کئے اور علوم کی نوعیت کس طرح تبدیل ہوئی اس کو واضح کرنے کیلئے سرسیّد احمد خان نے بتلایا کہ مسلمانوں میں ترقیٔ علوم کا آغاز قرآن پاک کو اوّل سے آخر تک یکجا جمع کرکے بطور ایک کتاب کے لکھنے سے ہوا۔دوسری منزل ترقی علوم کی یہ تھی کہ لوگ حدیثوں کو جمع کرنے اور حدیثوں کی کتابیں لکھنے پر متوجہ ہوئے۔اس کے بعد علم کلام میں کتابیں تصنیف ہونی شروع ہوئیں۔اور اس کی ترقی سے مسلمانوں میں علوم کی ترقی ہوئی۔خلفائے عباسیہ کے عہد میں یونانی علوم کے عربی زبان میں ترجمے ہوئے اور رائج ہوگئے۔جس سے علوم کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔یہ سب دور گزر گئے اب علوم کی ترقی کیلئے اس بات کی ضرورت تھی کہ جس طرح قدیم یونانی فلسفہ اور حکمت ہر مسلمان نے حاصل کی تھیں۔اسی طرح جدید فلسفہ وحکمت کے حاصل کرنے میں ترقی کرتے۔کیونکہ جدید علوم نہایت عمدہ اور مستحکم بنیاد پر قائم ہو چکے تھے۔(گراہم 1885ء ص 313-316)

ایک زمانے میں مسلمانوں نے علوم وفنون میں ایسی ترقی کی تھی اور ایسی فیاضی سے اپنے علوم سے یورپ کی قوموں کو نفع پہنچایا کہ بڑے بڑے مصنفوں نے اس بات کا اقرار کرلیا کہ اگر مسلمان ان علوم میں ترقی نہ کرتے اور ان سے دوسری قوموں کو ایسا فائدہ نہ پہنچتا جیسا پہنچا تو آج دنیا میں ان علوم وفنون کا نام بھی نہ ہوتا۔قرطبہ کی یونیورسٹی اور بغداد کی یونیورسٹی نے اپنے علوم وفنون کی ترقی کی وجہ سے تمام دنیا میں علم کا آفتاب روشن کیا۔مسلمانوں کی علمی ترقی کے اس زمانے میں مسلمانوں کی تعلیم بھی عمدہ تھی۔اور ان میں سب خوبیاں بھی موجود تھیں۔لیکن جب ان میں علوم کی ترقی بند ہوگئی تو ان کی تعلیم بھی ناقص ہوگئی اور ان کی تمام خوبیاں بھی جاتی رہیں۔علمی اور معاشرتی پستی کی اس حالت سے نکلنے کے لئے سرسیّد احمد خان نے تحریک علی گڑھ کے ذریعے حکمت مدرسِ اپنائی کہ مسلمان جدید اور مفید علوم وفنون کو حاصل کرکے پھر اس راستے پر چلنے لگیں جو انہوں نے صدیوں سے ترک کردیا ہے۔(خلیق انجم 1994ء ص 8)

انگریزی کی تعلیم

تحریک علی گڑھ کا دور وہ دور تھا جب نہ صرف تعلیمی بلکہ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے بھی انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کی بڑی ضرورت تھی۔ ہندوؤں نے اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان انگریزی سے متنفر تھے۔ ان کی یہ نفرت بھی ان کی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ بن گئی تھی۔ سرسیّد چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی زبان سیکھنے اور اس کی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ کریں۔ اس کی ترغیب دلانے کیلئے انہوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ جس زمانے میں جس قوم کی حکومت ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اس کی زبان اختیار کی جاتی ہے اور جس ملک میں جو زبان حکومت کی ہوتی ہے اس ملک میں اسی زبان کا عروج ہوتا ہے۔ لوگ اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ خلفائے بنو اُمیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا اور ہر شخص اس زبان کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں سنسکرت کا عروج تھا لہٰذا لوگ اسی کو اختیار کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی ہندوستان پر عملداری ہوئی تو فارسی زبان کو عروج ہوا۔ سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا شروع کر دیا۔ اب ہندوستان پر انگریزی کی حکومت ہے۔ جس کی زبان انگریزی ہے اور اسے ہی عروج حاصل ہے تو ماسوائے مسلمانوں کے سب نے انگریزی زبان اختیار کر لی ہے۔ (شبلی نعمانی، مولانا 1941ء ص 89-90)

انگریزی زبان سے مسلمانوں کی نفرت کا سبب یہ تھا کہ ان کا بڑا طبقہ انگریزی پڑھنے کو اسلام کے خلاف سمجھتا تھا۔ سرسیّد احمد خان نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ: بہت سے بزرگ انگریزی خواں لوگوں کو بدعقیدہ، ملحد یا دہریہ کہتے ہیں۔ شاید ایسا کوئی ہو جس سے میں واقف نہیں ہوں مگر ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو ایک حرف انگریزی کا نہیں جانتے مگر بدعقیدہ ہیں۔ بعض علماء مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے والوں کو آگے جانے دو۔ اگر تم دینی، تمدنی ترقی چاہتے ہو تو پیچھے ہٹو۔ اور پیچھے لوگوں میں جا ملو۔ پیچھے ہٹنا تو آسان ہے۔ مگر صحابہ کرامؓ اور رسول اللہ ﷺ تک جا ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ مجھ کو خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گڑھے میں جا پڑو۔ (شاہد حسین رزاقی 1963ء ص 63)

جدید علوم کی ضرورت

نصاب تعلیم میں تبدیلی بھی ایک مسئلہ تھا۔ اس کی ضرورت واضح کرتے ہوئے سرسیّد نے کہا کہ: اگر ہم صرف یہی مقصد رکھیں کہ وہی پرانا فلسفہ، ہیت اور منطق پڑھا دیں اور ان علوم سے کچھ سروکار نہ رکھیں جو آج ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں تو ہم درحقیقت اپنی قوم کے ساتھ کچھ بھلائی نہیں کریں گے۔ لہٰذا سرسیّد احمد خان نے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور ملی امراض کے دفعیہ کیلئے جو نسخہ شفا تجویز کیا۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت انگریزی تعلیم اور جدید علوم و فنون سے واقفیت تھی (شمائل احمد شمیم 1973ء ص 134)۔ چنانچہ تمام ناراضگیوں اور اپنے خلاف فتووں کو قوم کا انعام سمجھ کر سرسیّد نے قبول کیا۔ اور شکریہ کے طور پر اس سے زیادہ کر گزرنے کا ارادہ کیا۔ گویا سرسیّد کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ یہ بل آ جاتا تو قوم کا بل

کیسے نکلتا؟

6.7 ہیتِ تعلیم

تحریک علی گڑھ عام اور معمولی مفہوم کی حامل تحریک نہ تھی۔ سرسیّد کی خواہش تھی کہ مسلمان خیالی یا تقلیدی زندگی میں الجھے رہنے کی بجائے حقائق اور دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق تعلیم کا ایک عظیم نصب العین متعین کریں۔ نیز اس سلسلے میں جو بھی پروگرام مرتب کریں وہ ان کی قومی ضروریات کا عکاس ہو۔ لہٰذا مسلمانوں کو زندہ اور کامیاب قوموں کے زمرے میں شامل ہونے کیلئے اعلیٰ تعلیم کی سطح تک زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونا لازمی تھا۔ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کیلئے اعلیٰ قسم کی تربیت بھی ضروری تھی۔ انہوں نے تربیت کے مقاصد پر زور دیتے ہوئے فرمایا: ہم کو مسلمانوں کیلئے تعلیم سے زیادہ وہ چیز کرنی ہے جس کو ہم تربیت کہتے ہیں۔ جو قوم کو قوم بننے کیلئے ایسی ہے جیسی جان بدن کیلئے اور بغیر اس کے قوم کا قوم بننا محال ہے۔ اس مطلب کیلئے ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ اوّل ہمارا یہ کام ہونا چاہیے کہ قوم کے بچوں اور جوانوں کو جس قدر ہو سکے ایک جگہ جمع کریں۔ (احمد خان، سیّد سر 1959ء الف، ص 200)

تعلیم اور تربیت، دونوں حصّوں کے حصول کیلئے سرسیّد نے اپنی تحریک کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ اول ایسے دارالعلوم کا قیام جو اعلیٰ تعلیم و تربیت کا مرکز ہو۔ دُوم محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام۔ دارالعلوم کے قیام سے قبل سرسیّد نے اس کی تعلیم و تربیت کی اسکیم بھی مرتب کی جس کو کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانانِ ہند نے بحث و غور کے بعد منظور کرلیا۔ اس میں دو طریقے تجویز کئے گئے تھے۔

(1) اپنی قومی و مذہبی تعلیم میں عام تعلیم جس میں دینیات، ادب، ریاضی کو رکھا گیا۔

(2) خاص تعلیم میں سائنس، فنی تعلیم، انجینئرنگ، حیوانات، نباتات، کیمیا، طبقات الارض کو رکھا گیا۔

دارالعلوم میں تین مدارس انگریزی، اُردو، عربی و فارسی کے تجویز کئے گئے اور وہ اصول و طریقے بیان کئے گئے جن پر تعلیم کا دارومدار تھا۔ مختلف شہر و قصبات میں اُردو مدرسہ کے قواعد کے مطابق قیامِ مدارس کی تجویز کی گئی۔ نیز یہ کہ گاؤں اور قصبوں میں جہاں ممکن ہو مکتبوں کا اجراء ہو جن میں قرآن مجید پڑھایا جائے۔ مسائل کی چھوٹی چھوٹی کتابیں درس میں رکھی جائیں۔ نماز کی عملی تعلیم ہو۔ اس ضمن میں حفظِ قرآن کے مدرسے بھی تھے جن میں نابینا اشخاص بھی حفظ کر سکیں۔ یہ اسکیم بہت مفصل اور جامع تھی۔ اس میں ایک مختص القوم یونیورسٹی کا قیام نہایت نمایاں تھا۔ (محمد امین، زبیری مولوی (س ن)، ص 53-54)

اس اسکیم کے ساتھ جدید علوم کی اسلامی درس گاہ کا خاکہ بھی سرسیّد نے پیش کیا۔ اس درس گاہ میں انتظامات، مختلف مدارج اور طرزِ تعلیم و تربیت کی تفصیل سرسیّد کے صاحبزادہ سیّد محمود نے مرتب کی۔ "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند"

نے ان تجاویز کو پسند کیا اور کام کا اگلا مرحلہ شروع ہو گیا۔ یعنی سرمائے کی فراہمی۔ سرمائے کی فراہمی کی مہم کے دوران ہی طے پایا کہ ابتدائی مدرسہ کھول دیا جائے تاکہ مدرسے کی کارکردگی، اس کے طرز تعلیم اور اس کے نصاب سے لوگ اندازہ کر لیں کہ اس کا مقصد مسلمانوں کی تہذیب کو انگریز تہذیب میں ضم کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق شریعت کی حفاظت کر سکیں۔ (محمد حسین، خان زبیری 1975ء ص 188)

چنانچہ 24 مئی 1875ء کو ایک گھاس پھونس کے نیم پختہ بنگلے میں مدرسہ کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا۔ اس مدرسے کا آغاز ہی اسلامی اخوت و مساوات کا آئینہ دار تھا۔ مسلمانوں میں مدرسہ کی مقبولیت اور رفتار ترقی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف 18 ماہ کے مختصر عرصے میں اسکیم کے دوسرے حصے یعنی کالج کے قیام کا کام شروع ہو گیا۔ سرسیّد اس تحریک کے بانی تھے۔ مدرسہ کے منتظم تھے اور اس کی عمارتوں کے آرکیٹکٹ بھی۔ وہ مالی بن کر آم کے درخت بھی لگاتے رہے اور فلسفی بن کر قوم کی ترقی کا راز بھی تلاش کرتے رہے۔ آخر کار خلوص نے دل جیت لئے۔ عزم نے مخالفتوں کو شکست دیدی۔ عملی میدان میں ایک قدم اور بڑھا۔ 8 جنوری 1877ء کو وائسرائے ہند لارڈ لٹن سے کالج کا سنگ بنیاد نصب کرایا۔ (محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ب، ص 273)

تنصیب سنگ بنیاد کی اس تقریب میں جو خطاب پیش ہوا اس میں مقصد و مشکلات اور کامیابیوں کو بیان کرنے کے بعد آخر میں سرسیّد نے اظہار کیا: جو بیج آج ہم بوتے ہیں اس سے ایک ایسا درخت پیدا ہو گا جس کی شاخیں اس ملک کے بڑ کے درخت، کی مانند پھر زمین میں مضبوط جڑیں پکڑ لیں گی اور ان سے نئے نئے قوت دار پودے پیدا ہوں گے۔ ایک دن یہ کالج پھیل کر یونیورسٹی ہو جائے گا۔ جس کے طالب علم اس ملک کے ہر چہار طرف آزادانہ تحقیقات اور فراخ حوصلہ، بے تعصبی اور عمدہ اخلاق کی بشارت دیتے پھریں گے۔ (نذیر چوہدری 1973ء ص 81)

یہ اُمید بتدریج بر آتی رہی۔ 1878ء میں کالج کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے اور الہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس سے ہو گیا۔ 1887ء میں ایم۔ اے اور 1889ء میں قانون کی تدریس بھی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ دو الگ الگ کمیٹیوں کے ذمے سنی اور شیعہ دینیات کی تعلیم کی نگرانی تھی۔ یہ دونوں قسم کی دینیات محض تعلیمی مضمون کے طور پر نہیں پڑھائی جاتی تھی بلکہ طلبہ کو اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات پر روزمرہ زندگی میں عمل بھی کرنا ہوتا تھا۔ ان کو روزانہ فرض نمازیں پڑھنی ہوتی تھیں۔ ماہ رمضان میں روزے رکھنے ہوتے تھے۔ غیر اسلامی افعال مثلاً قماربازی، میخواری وغیرہ سے اجتناب کرنا ہوتا تھا۔ ان کو اپنے کردار اور عمل سے اپنے روشن خیال مسلمان ہونے کا ثبوت دینا ہوتا تھا۔ درسگاہ کے سلسلہ عمارت میں جامع مسجد نہایت شاندار تھی۔ جمعہ کے روز جب اس کے کمرے وسیع صحن نمازی طلبا ساتذہ سے پُر ہو جاتے تو یہ ایک شاندار نظارہ ہوتا تھا۔ (محمد امین زبیری مولوی (س ن)، ص 71)

علی گڑھ کے ارباب حل و عقد مذہبی تعلیم کے معاملہ میں اہتمام کیوں کرتے تھے؟ اس کا اشارہ اس سپاسنامہ میں ملتا ہے جو لارڈ لٹن کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا: ہماری تعلیمی ضروریات ہندوستان کی باقی آبادی سے کئی

لحاظ سے اتنی مختلف ہیں کہ حکومت اپنی حکمت عملی کے مطابق جو بہترین اقدامات بھی کرے گی وہ نا کافی ہوں گے۔ اگر مذہبی معاملات میں مداخلت کرنا حکومت کی دانشمندانہ روش کے خلاف نہ ہوتو بھی یہ اس کی طاقت سے خارج ہوگا کہ وہ ان مشکلات کو دور کر سکے جو مذہبی نظریات سے ماخوذ ہیں اور محض دینیاتی بحث ہی سے دور ہو سکتی ہیں۔ حکومت نہ مذہبی تعلیم کا کوئی نظام رائج کر سکتی ہے اور نہ اپنی مساعی کو اس نسل کے مذہبی تعصبات کے مقابلہ پر مرکوز کر سکتی ہے۔ جس کیلئے مذہب محض مجرد عقیدہ کا معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کی غیر مذہبی معمولی زندگی میں بھی حتمی راہ نما کی حیثیت رکھتا ہے۔ (ممتاز معین، پروفیسر مسز 1982ء ص 125)

چند مشکلات دور ہو جانے کے بعد ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ تعلیم میں سائنس کے شعبوں کا اضافہ ہوا۔ فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کی تجربہ گاہیں بنائی گئیں۔ تعلیم لسانیات کے جدید اصول پر عربی کی اعلیٰ تعلیم کا ایک مستقل شعبہ قائم ہوا۔ اور جرمن مستشرق کا تقرر کیا گیا۔ دینیات کے نصاب میں بھی وسعت دی گئی۔ مقررہ نصاب کے علاوہ قرأت و تجوید اور تفسیر کی تدریس کا اضافہ ہوا۔ کالج لائبریری میں جو بنیاد کالج کے وقت ہی قائم ہوئی تھی تو سیع ہوتی رہی۔ علمی سوسائٹیاں، گیمز کلب، مختلف قسم کی ورزشی ادارے، سٹوڈنٹ یونین، کرکٹ وغیرہ وقتاً فوقتاً قائم ہوتے رہے۔ ایک رائڈنگ اسکول بھی قائم ہوا۔ جس کے ممبروں کی نہایت خوشنما وردی بنائی گئی۔ بحث و مباحثہ اور تقاریر کیلئے کیمبرج یونیورسٹی کی طرز پر ایک یونین بنائی گئی جس میں طلبا اور اساتذہ حصہ لیتے تھے۔ (محمد اکرام شیخ 1982ء ص 12)

1920ء میں کالج کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا تو بی۔ ٹی۔ ایچ اور ایم۔ ٹی۔ ایچ کے درجات قائم ہوئے۔ مزید شعبوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ 1925ء میں اس ادارہ کی سلور جوبلی بنائی گئی۔ یونیورسٹی کو قیام کے بعد چند خطرات کا مقابلہ پیش آیا جن سے ترقی کی رفتار کچھ سست ہوگئی۔ مگر وہ جلد رفع ہو گئے اور بالآخر رفتار ترقی اتنی تیز ہوئی کہ 1946ء تک یونیورسٹی میں نو (9) کالج ہو گئے۔ ان کالجوں میں ایک ملٹری کالج تھا۔ جس میں عسکری تربیت و تعلیم کے مختلف شعبے تھے۔ دیگر آرٹ، سائنس، لاء، ایجوکیشن، طبیہ، ٹیکنیکل و انجینئرنگ، زنانہ، زرعی، فوجی، ہوائی تربیتی دستوں کی اسکیم بھی جاری ہوئی اور (105) ایکڑ رقبے کو طیران گاہ بنا دیا گیا (انصار زاہد خان 1982ء ص 272-278)۔ زمانہ جنگ میں ایک ہزار طلبہ نے بری، بحری اور فضائی افواج میں ایمرجنسی کمیشن حاصل کیا۔ دو سو کامیاب انجینئروں نے فوجی انجینئرنگ سروس میں شرکت کی۔ اسی سلسلہ میں وار ٹیکنیشن کی تربیت کا بھی ایک ادارہ تھا۔ جس کے پندرہ سو کاریگر فوج کے صنعتی اداروں میں بھرتی ہوئے۔ 1941ء سے قانونی ترمیم کے بعد یونیورسٹی کو علیحدہ علیحدہ کالجوں کے قیام اور ان کے الحاق کا اختیار و حق حاصل ہوگیا۔ پھر فیکلٹیز (Faculties) سسٹم کو رائج کیا گیا۔ عورتوں کی تعلیم کیلئے ہر قسم کی اور ہر شعبہ میں تعلیم کی آسانیاں پیدا کی گئیں۔ زنانہ کالج کے الحاق نے ایک خاص سہولت پیدا کر دی۔ (الطاف علی بریلوی سید 1995ء ص 223-233)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ تعلیم و تربیت کے حصول کیلئے سرسید نے اپنی تحریک کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ اوّلاً دارالعلوم کا قیام۔ دوم محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس کا قیام۔ دارالعلوم کے قیام اور اس سلسلے کی بابت تعلیم پر گفتگو ہو چکی۔ اب

تذکرہ ہے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا۔اس کے ذریعے مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ ،جدید علوم وفنون کی تحصیل اور انگریزی زبان سیکھنے کا احساس ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر مسلمانوں نے ملی ،سیاسی اور سماجی مسائل پر غور وخوض کیا جس سے مسلمانوں میں قومی اور ملی شعور بیدار ہوا۔کانفرنس نے مسلمانوں کی ہر شعبۂ زندگی میں رہنمائی کی۔زبان کو ترقی دے کر ایک ادبی زبان کے درجے تک پہنچایا۔تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا کیا۔خطابت ،شاعری اور قومی شاعری میں نیا انداز پیدا ہوا۔غرض مسلمانوں کی ادبی ،تعلیمی ،تہذیبی ،سیاسی زندگی اور ذہن وفکر میں کانفرنس کی بدولت انقلاب پیدا ہوا۔(ریحانہ اکرام 1996ء،ص 76-77)

6.8 وسائل

1870ء میں انگلستان سے واپسی کے بعد سرسیّد نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کیلئے بنارس میں ایک کمیٹی بنام "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند" سے قائم کی۔اس کمیٹی کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ایک کالج فنڈ کمیٹی قائم کی۔جس نے سرمائے کی مہم شروع کی۔سرسیّد کی کوششوں سے شہر اور قلعہ کے درمیان تقریباً 74 ایکڑ سرکاری اراضی کالج کیلئے حاصل کی گئی اور عمارت بنانے کا کام شروع ہوا۔(شمیم اختر 1996ء،ص 30)

- سرسیّد کا ارادہ تھا کہ جب مجوزہ ابتدائی تخمینہ کے مطابق پندرہ لاکھ روپیہ جمع ہو جائے تو دارالعلوم کا افتتاح کیا جائے مگر مولوی سمیع اللہ خان اور دیگر ارکان مجلس نے اصرار کیا کہ ابتدائی مدرسہ فوراً جاری کر دیا جائے تا کہ عملی نمونہ سامنے آجائے۔چنانچہ اس رائے کے مطابق چند خس پوش بنگلوں میں جو اس منظور شدہ زمین اور عطیہ شدہ رقبہ پر واقع تھے اور جن کو کمیٹی نے خرید لیا تھا 24 مئی 1875ء کو مولوی محمد کریم (ڈپٹی کلکٹر و رکن مجلس) کے ہاتھوں افتتاح ہوا۔مجلس کے فنڈ میں نواب کلب علی خان (فرمانروائے رام پور) نے 30 ہزار روپے بصورت پرامیسری نوٹ بطور وقف اور بارہ (12) ہزار روپے سالانہ کی امداد اپنی جاگیر سے مقرر کی اور نظام گورنمنٹ کی طرف سے تین سو روپے ماہانہ گرانٹ ان ایڈ (Grant in Aid) دی مہاراجہ پٹیالہ (مہندر سنگھ) نے تیرہ ہزار اور گورنر جنرل لارڈ نارتھ بروک نے دس ہزار روپیہ بطور عطیہ دیئے۔ان عطیات کے علاوہ اور بھی عطیات قوم کے روٗسا وامراء اور دیگر طبقات سے حاصل ہوئے۔چھ سات مہینے کے اندر ہی اندر ساٹھ ستر طلبہ مدرسہ میں داخل ہو گئے۔اسٹاف میں سات ارکان کا تقرر کیا گیا جن میں ایک انگریز مسٹر سڈنس بی۔اے ہیڈ ماسٹر تھے اس وقت مدرسہ کے اخراجات 917 روپے ماہانہ تھے۔(محمد امین زبیری مولوی (س ن)،ص 60-61)
- دو سال بعد اسکیم کے دوسرے حصے یعنی کالج کے قیام کا کام شروع ہوا۔8 جنوری 1877ء کو وائسرائے ہند لارڈ لٹن سے کالج کا سنگ بنیاد نصب کروایا۔اعلیٰ حکام اکثر یہاں کا دورہ کرتے رہتے تھے اور طلبہ کو

وظائف وانعامات سے نوازتے رہتے تھے۔تقریباً 50 سال بعد یہی کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بن گیا۔(محمد سلیم،پروفیسر سیّد 1993ء ب،ص 273)

- جب کالج قائم کیا جارہا تھا تو لوگوں میں یہ تاثر عام تھا کہ جہاں بانیؒ کالج کے عقائد ہی درست نہیں تو وہاں کے طالب علم کس قسم کے ہوں گے۔اس لئے چندہ جمع کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔لیکن سرسیّد کی بلند ہمتی قابلِ داد ہے کہ انہوں نے اتنی رقم اکٹھی کرلی جس سے بیس سال کے عرصہ میں کالج کی عمارات پر سات آٹھ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔کالج کیلئے فنڈ اکٹھا کرنے کیلئے انہوں نے بے شمار ترکیبیں اختیار کیں۔اپنی کتابیں فروخت کیں، چندہ جمع کیا،فیس کا طریقہ رائج کیا،حتیٰ کہ سٹیج پر کھڑے ہوکر غزلیں گا گا کر روپیہ اکٹھا کرنے میں بھی شرم محسوس نہ کی۔(الطاف حسین،مولانا حالی 1984ء،ص 198-213)

- تعلیم کیلئے فیس کا طریقہ رائج کیا گیا اور رہائشی ہونے کی وجہ سے صرف وہی لوگ اپنی بچوں کو بھیج سکتے تھے جو تعلیمی مصارف کا گراں بار اٹھا سکتے تھے۔(خورشید احمد،پروفیسر (س ن) ص 111)

- سرسیّد نے امدادی وظائف کیلئے خاص کوشش کی تاکہ قوم کے ہونہار نوجوان عدم استطاعت کے باعث اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ان ہی کوششوں کے دوران حکومت نے اعلیٰ تعلیم کو محدود کرنے کی پالیسی اختیار کی اور 1894ء میں یکا یک تعلیمی فیسوں میں اضافہ ہوگیا سرسیّد نے احتجاج کیا مگر غیر موثر رہا۔اس لئے وظائف کی کوشش اور زیادہ تیز کردی۔اپنے مخلص رفقاء کے نام خود ہی وظیفہ تجویز کردیتے اور ان کو اطلاع دینا کافی تھا۔غرض ان امدادی وظائف سے بہت سے مسلمان اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔اس مدد کا اندازہ ان اعدادوشمار سے ہوسکتا ہے: 92-1891ء تا 97-1896ء 325 طلبہ کو 36737 روپیہ کے وظائف دیئے گئے۔امدادی وظائف کے علاوہ مزید 105 اسکالرشپ (31 عربی کے،10 دینیات کے اور 12 سائنس کیلئے) مخصوص تھے۔متعدد پرائز اور میڈل الگ تھے۔ان سب کا سرمایہ دستاویزات سرکاری اور ایسی عمارات کالج میں محفوظ تھا جن کا کرایہ ملتا تھا۔(محمد امین،زبیری مولوی (س ن)،ص 69-70)

- 1890ء میں طلبہ کی ایک خاص سوسائٹی انجمن القرض قائم ہوئی تھی۔جس کا کام قابلِ امداد طلبہ کی تعلیم کیلئے حصول عطیات تھا۔دوسرے دور میں اس نے زبردست ترقی کی۔کئی لاکھ روپیہ وصول کیا اور صدہا طلبہ کی کفیل بن گئی۔اس کی امداد کو قرض حسنہ میں تبدیل کیا گیا۔چند فیلوشپ بھی قائم ہوئیں اور مغرب کی یونیورسٹیوں میں امداد تعلیم کی غرض سے آغا خان فارن اسکالرشپ فنڈ جاری ہوا۔دورِ اوّل میں ہاسٹلوں اور لیکچروں کے کمرے یا تو انفرادی عطیات سے تعمیر ہوئے یا چند احباب کے چندوں یا کالج کے تعمیر فنڈ سے۔یہ سب کمرے کالج یا ان کے بانیوں کے نام سے موسوم ہوئے۔دورِ ثانی میں رقبہ کا بھی اضافہ ہوا اور بعض فیاض اصحاب نے پورے پورے ہاسٹلوں کا زرِ تعمیر عطا کیا۔جو ان ہی کے نام سے منسوب ہوئے۔1918ء میں ایک وسیع خوبصورت سوئمنگ باتھ

تعمیر ہوا اور شناوری سکھانے کیلئے اسی زمانے میں ایک عمدہ تیراک میر ماہی کے نام سے مقرر ہوا۔ کالج کے شفاخانے کی بھی تعمیر ہوئی۔ (محمد امین زبیری مولوی 1983ء ص 122)

— 1920-21ء کے بجٹ کے مطابق

آمدنی	=	3,15962 روپے
خرچ	=	363026 روپے
نقد سرمایہ محفوظ	=	953325 روپے

سرمایہ اور جائیداد ایک پریس، ایک بک ڈپو، ایک اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ بھی تھا۔ بکڈپو میں اُردو کا بہترین لٹریچر خصوصیت سے مہیا رہتا تھا۔ اور منافع غریب طلبہ کی امداد میں صرف ہوتا۔ پریس میں لیتھو اور ٹائپ کی طباعت تھی۔ جو حسن طباعت کے لحاظ سے مشہور تھا۔ (محمد امین زبیری 1983ء ص 123)

— صوبہ گورنمنٹ ریاست ہائے حیدر آباد۔ رام پور۔ بھوپال۔ بہاول پور۔ خیر پور۔ مالیر کوٹلہ۔ پٹیالہ سالار جنگ اسٹیٹ سے سالانہ امدادیں مقرر تھیں۔ وقتاً فوقتاً عطیات بھی حاصل ہوتے رہتے تھے (ایم اے رزاق ڈاکٹر 1986ء ص 61)۔ 1906ء میں امیر افغانستان نے بھی گرانٹ مقرر کی۔ 1912ء میں کالج کی مرکزی حیثیت تسلیم کرلی گئی۔ اور امپریل گورنمنٹ کے بجٹ سے دو لاکھ روپیہ دیا گیا۔ (الطاف علی بریلوی سیّد 1995ء ص 181-191)

— کالج کا نظم و نسق 1889ء تک ایک مینیجنگ کمیٹی کے ذمہ تھا۔ پھر ٹرسٹیوں کا قانون وضع ہوا۔ آخر تک ٹرسٹیز اوران کی مجلس عامہ (سنڈیکیٹ) ذمہ دار رہی۔ مینیجنگ کمیٹی کے بعد سیکرٹری کمیٹی کے صدر نواب لطف علی خان (چھتاری) تھے۔ پھر کچھ مدت تک سیّد محمود اور عماد الملک رہے اوران کے بعد نواب فیاض علی خاں ممتاز الدولہ رئیس پہاسو ضلع بلند شہر کا آخر تک انتخاب ہوتا رہا۔ (نذیر چوہدری 1973ء ص 79)

— سر سیّد احمد خان نے یونیورسٹی کا خیال کبھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ متعدد استقبالیہ خطبات میں جو وائسرائے اور گورنروں کو دیئے گئے اس خیال کو تازہ کرتے رہے۔ ان کی رحلت کے بعد اجلاس کانفرنس لاہور 1898ء میں باقاعدہ تحریک پیش ہوئی اور نہایت عزم و جوش کی ساتھ منظور کی گئی۔ فنڈ بھی فراہم ہونا شروع ہوا۔ پھر دسمبر 1902ء کے اجلاس منعقدہ دہلی میں آغا خان نے اپنے خطبہ صدارت میں اس تجویز کو کامیاب بنانے پر نہایت زور دیا۔ آئندہ کالج کی ترقی میں جو اقدام اُٹھایا وہ اسی منزل کی جانب تھا۔ 1911ء میں عملی اقدامات کئے گئے۔ حصول سرمایہ اور دستور اساسی کی ترتیب کے لئے کمیٹیاں قائم ہوئیں۔ آغا خان کی قیادت میں خاص خاص مقامات کے دورے کئے گئے اور ایک سال بعد 26 لاکھ روپیہ فراہم ہوگیا جس میں آنوں سے لے کر لاکھوں روپے تک کا عطیہ تھا۔ مگر ایک طرف حکومت کے غیر ہمدردانہ رویہ اور دستور اساسی میں اختلاف، دوسری طرف طرابلس اور بلقان کے

واقعات، جنگ عظیم اور خلافت ترکی کے مسائل کی وجہ سے التواء ہوتا رہا۔حتیٰ کہ نومبر 1920ء میں یونیورسٹی بل امپیریل کونسل میں پیش ہو کر یکم دسمبر سے نفاذ پذیر ہوا۔(آغا خان 1954ء ص 145-147)

- وسائل کیلئے انجمن القرض کے علاوہ طلبہ کی امداد کے جدید وسائل مہیا کئے گئے۔ایک وائس چانسلر فنڈ، کشتی کتب خانہ اور ایک ارزاں ہاسٹل جاری کیا گیا۔اس کی امداد کا اوسط 70 ہزار روپے سالانہ کے مابین ہو گیا۔حکومت کے عطیہ میں زراعتی فارم، علی گڑھ کا تاریخی قلعہ مع اراضی ملحقہ بھی شامل تھے۔(محمد خلیل اللہ پروفیسر 1983ء ص 125)

المختصر علی گڑھ کے اخراجات حکومت کی گرانٹ، مسلمانوں کے متمول طبقہ کے چندے اور طلبہ کی فیسوں سے پورے ہوتے تھے۔شروع میں اس ادارے کا انتظام کالج کمیٹی کے ہاتھ میں تھا۔جس کے سیکرٹری سرسیّد احمد خان تھے۔1889ء میں سرسیّد نے ایک ٹرسٹی بل تجویز کیا جس کے مطابق کالج کا انتظام بورڈ آف ٹرسٹیز کے ہاتھ میں چلا گیا۔سرسیّد تاحیات ٹرسٹیز کے سیکرٹری بھی رہے۔ان کی وفات کے بعد تھوڑی دیر ان کے بیٹے سیّد محمود نے سیکرٹری کے طور پر کام کیا لیکن ٹرسٹیوں نے اتفاق رائے سے سیّد مہدی علی نواب محسن الملک کو سرسیّد کا جانشین مقرر کیا۔نواب محسن الملک کے بعد نواب وقار الملک سیکرٹری مقرر ہوئے۔(نذیر احمد خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی ڈاکٹر 1987ء ص 49)

6.9 مسائل

علی گڑھ تحریک اور سرسیّد احمد خان میرے نزدیک مترادف الفاظ ہیں۔بالفاظ دیگر علی گڑھ تحریک کا دوسرا نام سرسیّد احمد خان ہے۔اور سرسیّد احمد کا دوسرا نام علی گڑھ تحریک ہے۔یہ دونوں اس قدر مربوط ہیں کہ انہیں الگ کرنا ممکن نہیں۔لہٰذا جب ہم لکھتے ہیں کہ سرسیّد نے فلاں کام کیا یا فلاں طریق کار اختیار کیا تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تحریک علی گڑھ نے یہ کام کیا اور یہ طریق کار استعمال کیا۔اس وضاحت کے بعد اصل عنوان "مسائل" کی طرف آتے ہیں۔سرسیّد احمد خان کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ بڑے مشکل تھے۔مسلمان خواب غفلت میں تھے۔وہ اپنے شاندار ماضی کے خواب ہی دیکھتے رہتے تھے۔مسلمانوں کی حالت کو سرسیّد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: مسلمان بحیثیت قوم بے فکری کا شکار ہیں۔وہ اپنے اسلاف کے قصے کہانیاں سنتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ان کے مقابلہ کا نہیں ہے۔(خالد یار خان 1963ء ص 257)

- ان مسائل کے حل کیلئے سرسیّد نے ایک دارالعلوم کے قیام اور طریقہ تعلیم و تربیت کی اسکیم بھی مرتب کی۔یہ اسکیم بہت مفصل اور جامع تھی۔اس میں ایک مختص القوم یونیورسٹی کا قیام نہایت نمایاں تھا۔لیکن جب یہ اسکیم باضابطہ حکومت میں پیش ہوئی تو یونیورسٹی سے اختلاف اور اسکی امداد سے انکار کیا گیا۔کمیٹی کے سامنے سرمائے کے سوال

کےعلاوہ یہ سوال بھی نہایت اہم تھا کہ اس صورت میں ممکن ہے حکومت اس کی اسناد کو تسلیم نہ کرے۔ لیکن سرسیّد کا عزم وارادہ اپنی جگہ قائم رہا اور وقتاً فوقتاً جلیل القدر حکام کو جو سپاسنامے پیش کئے گئے ان میں وہ اس کا اعادہ کرتے رہے۔ لیکن پہلے ہی قدم پر انکار و تنقید سب سے بڑی مشکل تھی۔ ایک اور بڑا مسئلہ جو اوّلین مرحلہ پر پیش آیا یہ تھا کہ عمارت کے لئے جو زمین تجویز ہوئی تھی اس کی باضابطہ درخواست پیش ہونے پر ضلع کے کلکٹر نے مخالفت کی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ قائم مقام لیفٹیننٹ گورنر (سرجان اسٹریچی) کو معائنہ کیلئے آنا پڑا تب زمین حاصل ہوئی۔ (محمد امین زبیری، مولوی (س ن)، ص 53، 54، 60)

- سب سے بڑی مشکل و مسئلہ جو اوّلین مرحلہ پر پیش آیا وہ مذہب اور اسلام کے نام پر مجوزہ دارالعلوم کی مخالفت کا تھا۔ اس مخالفت کی وجہ تہذیب الاخلاق کے بعض مضامین جو مذہب سے متعلق تھے، قرار دی گئی۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین کی وجہ سے عام مسلمانوں میں سرسیّد کے مذہبی خیالات کے بارے میں تشویش پیدا ہوگئی تھی۔ اسلئے نہ صرف چندہ جمع کرنے میں دشواری پیش آئی بلکہ ادارہ میں طلبہ کی تعداد بھی کم رہی۔ جس میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوا۔ (محمد اکرام، شیخ 1982ء، ص 12)
- سرمائے کی فراہمی کے دوران بھی مخالفت جاری رہی۔ اس کا سدِّ باب کرنے کے لئے یہ طے پایا کہ ابتدائی مدرسہ کھول دیا جائے تا کہ اس کی کارکردگی، طرزِ تعلیم اور نصاب سے لوگ اندازہ کرلیں کہ اس کا مقصد مسلمانوں کی تہذیب کو انگریزی تہذیب میں ضم کرنا نہیں بلکہ اس کو انفرادی مقام دلانا ہے۔ نیز یہ منصوبہ شریعت اسلامی کے خلاف نہیں بلکہ اس کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق شریعت کی حفاظت کرسکیں۔ گویا ابتدا سے ایسے مسائل میں مبتلا ہو کر کام کی رفتار میں فرق پڑا۔ (اشتیاق حسین، قریشی 1987ء، ص 313)
- علماء نے سرسیّد کے مذہبی نظریات کی شدید مخالفت کی۔ اس مخالفت کے سبب مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کیلئے ان کی تحریک بھی متاثر ہوئی کیونکہ عام طور پر شبہ ہونے لگا کہ مسلمانوں کی نئی نسل میں جدید تعلیم کے ذریعہ سرسیّد اپنے مذہبی نظریات پھیلانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا مکّے کے مفتیوں سے اُن کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کرکے شائع کئے گئے۔ انہیں دہریے، نیچری اور دجال کے القاب سے پکارا گیا۔ ایک مرتبہ جان لینے کی کوشش بھی کی گئی۔ غالباً اسی بنا پر علماء نے 1890ء میں لکھنؤ میں تحریک ندوۃ العلماء اور بعد میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ (وحیدالدین خان، 1979ء، ص 4)
- سرسیّد اہم اسلامی مباحث پر علمائے سلف سے بہت دور ہٹ گئے اور گیارہ مواقع تو ایسے ہیں جن میں اس نوعیت کے اختلاف کی کوئی نظیر اس سے پیشتر پوری تاریخ میں کسی بھی گروہ کے یہاں خواہ وہ گمراہ ہی کیوں نہ ہوں نہیں ملتی۔ علماء نے تعلیم کی مخالفت نہیں کی بلکہ سرسیّد کی تعلیم کی مخالفت کی۔ جس کی بنیاد یہ تھی کہ یہ تعلیم مغرب سے

مرعوبیت کی تعلیم ہے۔اس میں صاف کہا گیا تھا کہ تم کو داڑھیاں منڈوانا پڑیں گی۔ہیٹ پہننا پڑیں گے۔تم کو نئے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔یہی راستہ ہے جس سے تم آگے بڑھ سکتے ہو۔اسی ذہنیت پر چوٹ کرتے ہوئے اقبال نے اپنے دور میں کہا تھا کہ مغرب کی ترقی کا سبب نہ شیو کرنا ہے نہ ہیٹ پہننا اس کا راز اس جذبہ اور ولولہ قربانی میں ہے جس کا اس نے مظاہرہ کیا اور جس سے آج ہم عاری ہو چکے ہیں۔(خورشید احمدؔ 1963ء ص 58)

- ایک اور مسئلہ اساتذہ کا تھا کہ سرسیّد اس مدرسہ میں یورپین اساتذہ کو لے کر آئے۔بالعموم انہوں نے انگریز پرنسپل بھی رکھے بلکہ یورپین پادری تک پرنسپل بنے۔جس وجہ سے شدید دشواری ومزاحمت کا مسئلہ درپیش ہوا۔ (ممتاز معین، پروفیسر مسز 1982ء ص 162-166)
- سرسیّد احمد نے مذہب اسلام کے جن علمی مسائل پر قلم اُٹھایا ان میں بعض تو ان کے اپنے ذاتی معتقدات ہیں جن میں وہ ابتدائے عمر سے پختہ ہو چکے تھے مثلاً عدم تقلید اور عمل بالحدیث حالانکہ وہ ان معتقدات میں بھی اہل حدیث اور غیر مقلدین سے اصولاً اختلاف رکھتے تھے۔دوسرے جن مسائل میں غیر مذہب والوں نے اسلام پر اعتراضات کئے تھے۔ان کی تردید میں سرسیّد نے جو طریقہ اختیار کیا تھا۔وہ کلامی مباحث کے رنگ میں تھا۔جس میں انہوں نے متکلمین کا طرز استدلال اختیار کیا اور جہاں عقلی اعتراضات کے جوابات دیئے وہاں وہ معتزلہ کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔تیسرے ان مسائل کی چھان بین اور تنقید میں سرسیّد کا روئے سخن زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ گروہ کی طرف تھا۔جو مغربی تعلیم پا کر اسلامی مسائل سے ناواقفیت کے سبب مغربی مصنفین کے اعتراضات سے متاثر تھے۔گو اسلام سے برگشتہ نہ ہوئے تھے۔لیکن کم از کم علمائے اسلام اور پیشوایان مذہب سے بدظنی تو ضرور ان کے دلوں میں پیدا ہو چکی تھی۔جنہوں نے ان کے خیال میں اسلام کو غلط طور پر پیش کیا ہے۔چونکہ سرسیّد کو اس طبقہ کی اصلاح مقصود تھی۔اس لئے انہوں نے بہت سے مسائل میں قدیم علمائے مذہب کی آراء سے انحراف کرکے براہ راست قرآن وحدیث سے اجتہاد کی ٹھانی جس میں انہیں بڑی مشکلات پیش آئیں۔اور اپنے عقلی استدلال میں بعض ایسی تاویلیں کرنے پر وہ مجبور ہو گئے جو مالم یُرضٰی قائلہ کے مصداق ہیں۔(وقار احمد رضوی ڈاکٹر 1996ء ص 51-53)
- بورڈ آف ٹرسٹیز کے سلسلے میں بھی تحریک علی گڑھ مسائل کا شکار ہوئی۔1889ء میں سرسیّد احمد خان بورڈ آف ٹرسٹیز میں ترمیم چاہتے تھے جبکہ ان کے بہت سے دوست اور ساتھی ان کی تجاویز سے متفق نہ تھے۔وقار الملک نے انہیں حیدرآباد سے لکھا اور مودبانہ طریقے سے ان کی توجہ اس امر پر مبذول کرائی کہ ان کا اپنے بیٹے سیّد محمود کی جانشینی پر اصرار کرنا مناسب نہیں ہے۔اپنی تجویز کے حق میں سیّد احمد خان کی بڑی دلیل یہ تھی کہ: کافی آزادی ٔ کردار کے حامل ایسے لوگ کہاں ہیں جن کے ہاتھ میں کالج کی قسمت دی جاسکے اور جن کی وجہ سے اس سلسلہ میں انتظامات

کرنا غیر ضروری ہوں؟ وقارالملک کا عاجزانہ جواب یہ تھا: جناب والا! اچھے بُرے یہی لوگ ہیں۔ جب رسول اکرم ﷺ نے رحلت فرمائی تو کوئی ان کا مثل نہ تھا۔ لیکن بہرحال لوگوں نے ان کا کام حتی المقدور جاری رکھا۔ ایسا ہی آپ کے مدرسہ کے سلسلہ میں ہوگا (ممتاز معین ' پروفیسر مسز 1982ء 'ص 158-159)۔ سرسیّد صاحب کی تجویز کثرت رائے سے منظور ہوگئی لیکن وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے کہ وقارالملک جیسا ان کے قریبی ساتھی نے ان کی مخالفت کی تھی اور بانیان تحریک کی اس کش مکش نے تحریک کو مسائل سے دوچار کیا۔

- جب سے تحریک شروع ہوئی اس کو کئی طوفانوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ آخری طوفان 1920ء میں ترک موالات کا بڑا مہیب اور سخت تھا۔ مسلم یونیورسٹی کا بل پاس ہونے میں طرابلس اور بلقان کے واقعات، جنگ عظیم اور خلافت وترکی کے مسائل حائل رہے۔ آخر کار نومبر 1920ء میں یونیورسٹی بل امپیریل کونسل میں پیش ہوا اور یکم دسمبر کو قانون کی صورت میں اس کا نفاذ ہوا۔ (نذیر چودھری 1973ء 'ص 82)

- سرسیّد احمد خان نے تحریک علی گڑھ کی ترویج کیلئے از خود علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی نوعیت کی تحریریں اخباروں، رسائل، جرائد اور کتب و پمفلٹ کی صورت میں لکھیں۔ سرسیّد کی علمی اور مذہبی تحریروں کی سخت مخالفت کر کے تحریک کے مسائل میں اضافہ کیا گیا۔ بلکہ سرسیّد کی تحریروں کے رَد میں بے شمار کتب لکھی گئیں۔ جن میں چند خواص اہل علم کے علاوہ زیادہ تر پیشہ ور مولوی اور واعظین تھے۔ سرسیّد نے بعض تحریروں کا جواب دیا اور اکثر کو نا قابلِ التفات سمجھ کر "جواب جاہلاں" پر عمل کیا اور مسائل پر قابو پالیا۔ اسی اثنا میں ایک مولوی صاحب جو بالکل بیکار اور تنگ حال نوکری کی تلاش میں تھے۔ سرسیّد کی خدمت میں حاضر ہوئے عرضِ حال کے بعد ان سے درخواست کی کہ کوئی کام ان کو دیں۔ اس کے جواب میں سیّد صاحب نے کہا کہ آپ میری کتابوں کا رَد لکھ کر چھپوایئے آپ کو کافی پیسے مل جائیں گے۔

مولانا حالؔی نے اس واقعہ کو نظم کیا جس کا عنوان ہے "سیّد احمد خان کی تصانیف کی تردید"۔ ملاحظہ ہو۔

ایک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
وہ شہر شہر نوکری کی ٹوہ میں پھرا
لیکن نہ اس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی
اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اس کی نہ تقدیر سے چلی
روزی کی خاطر اس نے کئے سینکڑوں جتن
پر کی کہیں نصیب نے اُس کے نہ یاوری

راہ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اک خضر پے خجستہ نے کی آ کے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اس کے آج کل
سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ کے اس کے چھیڑ کر
تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بُری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گردوپیش سے
لگتی ہے کیسی آ گے زروسیم کی جھڑی
دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب ہو
دنیا پر جب تلک کہ مسلط ہے ابلہی

(احمد میاں اختر ٗجوناگڑھی ٗقاضی 1996ءص 98-99)

الغرض تحریک کے نصاب،طریقہ تدریس،اساتذہ کے تقرر،علمی ادبی ومذہبی تحریروں کی مخالفت،چندہ کی مہم میں رکاوٹ اور بورڈ آف ٹرسٹیز جیسے مسائل سے تحریک علی گڑھ کو دوچار ہونا پڑا۔بانی تحریک سرسیّد احمد خان پر کفر کا فتویٰ تک لگا مگر ان تمام مسائل ومشکلات کی پرواہ کئے بغیر وہ تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔انہوں نے ایک شعر میں (جو ان کے لوحِ مزار پر کندہ ہے) ان مسائل ومخالفت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

خدادارم دِلے بریاں زعشق مصطفیٰ ﷺ دارم
ندارد ہیچ کافر سازو سامانے کہ من دارم

(ترجمہ) میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور میرا دل نبی کریم ﷺ کے عشق میں کباب بن چکا ہے۔کیا کسی کافر کے پاس ایسا سامان ہوتا ہے جو میرے پاس ہے۔(محمد اسلم ٗپروفیسر (س ن) ص 57)

6.10 نظام امتحانات وجائزہ

حکومت انگلستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر ایکٹ کی ہر 20 سال کے بعد تجدید کرتی تھی۔چنانچہ یہ کاروائی 1799ء،1813ءاور1833ءمیں انجام پاتی رہی۔ایک خاص بات یہ مشاہدہ میں آئی کہ چارٹر کی تجدید کے موقع پر ہر مرتبہ گورنمنٹ اپنی پالیسی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کرتی رہی۔لہٰذا1853ءمیں کمپنی کو مشرق سے اپنی کاروائیاں جاری رکھنے کے متعلق شاہی احکام کے حصول کا مسئلہ زیر بحث آیا تو دارالعلوم نے ایک سیلیکٹ کمیٹی مقرر کردی۔جس کے سپرد یہ کام کیا

گیا کہ وہ پوری چھان بین کرنے کے بعد ہند کے تعلیمی معاملات کے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی تعلیمات کا مسئلہ نہ تو ملتوی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کو ٹالا جا سکتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ اس مسئلہ کے حل سے گورنمنٹ کو سیاسی نقصان نہیں ہوگا لہٰذا وڈ مراسلہ پیش کیا گیا۔ (مصطفیٰ علی بریلوی سید 1971ء ص 118-120)

1871ء میں وائسرائے ہندوستان لارڈ میو نے سابقہ تعلیمی پالیسی میں ترمیم کی۔ اب مسلمانوں نے جداگانہ اسکول اور کالج علی گڑھ میں قائم کیا۔ علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بن گیا۔ بعد ازاں علی گڑھ یونیورسٹی بھی قائم ہوگئی لیکن حکومت نے اس کو الحاقی مرکز تعلیم بننے نہیں دیا نہ مکمل آزادی دی۔ یوں کسی نہ کسی طرح اس پر نگرانی بلکہ قبضہ رکھا (ممتاز معین پروفیسر مسز 1982ء ص 15)۔ 1878ء میں کالج کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے اور الٰہ آباد یونیورسٹی کے قیام کے بعد اس سے ہوگیا۔ 1881ء میں پہلی بار طلبہ بی۔اے کے امتحان میں شریک ہوئے۔ (محمد امین زبیری مولوی 1983ء ص 122)

مقاصد تعلیم اور مضامین تعلیم میں تغیرات لانے کے ساتھ انگریزوں نے نظام امتحان و آزمائش بھی یکسر بدل ڈالا۔ مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد تزکیۂ نفوس اور تعمیر سیرت تھا۔ اس تعلیم کا خطاب انسان کے قلب سے اور اس کے ضمیر سے تھا۔ خارجی اثرات سے بے نیاز ہو کر یکسوئی کے ساتھ درس گاہ میں تعلیم کا کاروبار جاری رہتا تھا۔ دوران تعلیم مدرسہ کے احاطہ کے اندر تزکیہ نفس اور تعمیر سیرت کے علاوہ اور کوئی دوسرا مقصد نہ طالب علم کے ذہن میں ہوتا تھا اور نہ استاد کے سامنے ہوتا تھا۔ دورانِ تعلیم اخلاص نیت اور اصلاح اعمال کیلئے پیہم کی کوشش کی جاتی تھی۔ تعلیم و تربیت کا مرکز استاد کی ذات تھی۔ جو بے حد محترم اور معتمد سمجھی جاتی تھی جب طالب علم تعلیم سے فراغت حاصل کر لیتا تھا۔ اس کے اساتذہ اس کا امتحان لے کر اس کو سندِ فراغ دے دیتے تھے۔ اور اس کی دستار بندی ہو جاتی تھی۔ تب اس کے ذہن میں معاش اور روزگار کا خیال آتا تھا۔ وہ کہیں نوکری اختیار کر لیتا تھا یا پھر کوئی صنعت و دستکاری سنبھال لیتا تھا۔ اس پورے عرصے میں معاشرہ سے بے تعلق رہتا تھا۔ درسگاہ سے فارغ شدہ طلبہ معاشرہ پھر استعمال کرتا تھا۔ (جعفر ایس ایم 1936ء ص 20)

چارلس وڈ کے مراسلہ نے ایک خاص قسم کا تعلیمی نظام رائج کیا۔ اس نے اس ترتیب کو اُلٹ دیا۔ وہاں پیش نظر سرکاری ملازمت تھی اور تعلیم اس کے حصول کا زینہ تھا۔ اس نظام تعلیم کا کاروبار کسی درجہ بھی خلوص اور للّٰہیت پر مبنی نہیں تھا۔ بلکہ حاکم و محکوم کے درمیان ذہناً خلیج حائل تھی۔ یہاں استاد کی ذات نہ قابل احترام تھی نہ معتمد علیہ۔ اس لئے یہاں قیام امتحان اور پروانۂ سند کا اجراء استاد کی مرضی پر کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس کیلئے ایک غیر شخصی اور غیر جانب دار طریقۂ امتحان تجویز کیا گیا۔ علی گڑھ میں بھی اس سرکاری حکم کے تحت وہ استاد جس نے طلبہ کو سالوں پڑھایا وہ امتحان نہیں لیتا تھا بلکہ چند دوسرے استاد جنہوں نے طلبہ کو نہیں پڑھایا، جو طلبہ سے ناواقف ہوتے، وہ ان طلبہ کا امتحان لیتے تھے۔ امتحان تحریری ہوتا تقریری نہیں۔ تحریری جوابات پر نمبر دیئے جاتے۔ حاصل کردہ نمبروں کی بنا پر ایک طالب علم کامیاب یا ناکام قرار پاتا۔ کامیاب طلبہ کو سندِ تکمیل دی جاتی جس کو دکھا کر وہ حکومت کے ماتحت شعبہ جات میں ملازمت کرنے کا اہل قرار پاتا۔ (محمد سلیم پروفیسر سیّد 1985ء ص 319-324)

امتحان کا سارا کاروبار عدم اعتماد اور اخفا کی کاروائی سے لبریز تھا۔طلبہ کے ناموں کی بجائے نمبر استعمال ہوتے تھے۔پرچہ سازی،کاپیوں کی جانچ پڑتال،نمبروں کی ترتیب،یہ سارے کام انتہائی رازداری کے ساتھ ہوتے تھے،ثانوی جماعتوں کے واسطے دو امتحانات ہوتے تھے۔میٹرک کا امتحان یونیورسٹی کے تحت جبکہ مڈل امتحان محکمانہ طور پر لیا جاتا تھا۔مڈل سرٹیفکیٹ امتحان کو پاس کرنے کے بعد سروے اسکول ،ٹریننگ اسکول برائے ورنا کیولر ٹیچر،ورنا کیولر مڈل اسکول میں داخلہ کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔(مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1971ء ص 170)

6.11 تنقیدی مطالعہ

نئی پالیسی اختیار کرتے وقت سول سروس کے ایک کہنہ افسر ولیم ہنٹر نے مسلمانوں کے مسائل کا جائزہ لیا تھا۔تعلیم کے باب میں اس نے حکومت کو مشورہ دیا تھا:مسلمان لڑکوں کو ہمیں اپنے طریقے پر تعلیم دینا چاہیے ان کے مذہب میں عدم مداخلت کے ساتھ بلکہ مذہبی فرائض کی پوری ادائیگی کے ساتھ،ہم ان کے مذہبی اخلاص اور دینی احکام کی پابندی میں ضعف اور کمزوری پیدا کردیں گے۔مسلمانوں کی نوخیز نسلیں بھی اسی راستہ پر چل پڑیں گی جس پر چل کر ہندو آج روادار بن چکے ہیں۔ورنہ سابق میں وہ ایک انتہائی متعصب قوم تھی۔رواداری کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی بزرگوں کی طرح اعتقادات میں متشدد نہیں رہیں گے۔غلط مذہب کے نام پر جو بے رحمی وہ کرتے ہیں،جن جرائم کا ارتکاب وہ کرتے ہیں یہ رواداری ان کو تمام باتوں سے رہائی دلادے گی۔(ہنٹر۔ڈبلیو ڈبلیو 1974ء ص 183)

مذکورہ بالا سفارشات کو قبول کر کر کے لارڈ میو (Earl of Mayo) وائسرائے ہندوستان نے 1871ء میں سابقہ تعلیمی پالیسی میں ترمیم کی۔اب مسلمانوں کو جداگانہ اسکول اور کالج کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔جس سے وہ ایک مدت سے محروم تھے۔اس رعایت سے فائدہ اُٹھا کر سر سیّد احمد خاں نے علی گڑھ میں جدید طرز کا کالج قائم کیا(1875ء)۔یہ کالج 1922ء میں مسلم یونیورسٹی بن گیا۔یہ وہ شہرہ آفاق کالج ہے۔جس نے تحریک علی گڑھ کا روپ دھار کر برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کی تشکیل ذہنیت،تعمیر قومیت اور ترقی میں بہت فعال کردار ادا کیا تحریک علی گڑھ نے ادبی، معاشرتی،معاشی اور سیاسی زندگی پر جو اثرات مرتب کئے ان کا تنقیدی مطالعہ درج ہیں۔

- اگر مسلمانوں کو ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے نہیں ،بلکہ محض ایک قوم کی حیثیت سے لیا جائے تو تحریک علی گڑھ ان کے جدید دور کی سب سے بڑی محسن ہے۔سر سیّد احمد خاں نے مسلمانوں کو اس ہاری ہوئی فوج کی مانند سمجھا،جس کیلئے سب سے صحیح حکمت عملی محض اس کو بچالینا تھا۔خواہ اس کو بچانے کیلئے عزت وغیرت کی کتنی بڑی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔اس حیثیت سے تحریک علی گڑھ نے مسلمانوں کے تعلقات انگریزوں سے استوار کرائے۔بے اعتمادی کی فضا دور کی،انگریزوں کی غلط فہمیاں دور کیں،کچھ سیاسی رشوت دی،کچھ دم خم

مسلمانوں کے ختم کیے۔ان میں تسلیم کی خو ڈالی اور اس طرح جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، کم از کم تھوڑی دور تک ہی سہی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔(اعجاز الحق قدوسی 1977ء ص 187)

- معاشی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے حصول اور روزگار کے دوسرے مواقع کے حصول میں علی گڑھ کا بڑا حصّہ ہے۔مسلمانوں کیلئے ترقی کے دروازے بالکل بند ہو گئے تھے۔وہ اس نئی تعلیم کی وجہ سے پھر ایک حد تک کھل گئے اور اس نے مسلمانوں کو دوبارہ قدم جمانے کا موقعہ دیا۔(محمد احمد خان 1978ء ص 72)
- علی گڑھ کی تحریک ایک نئی ادبی تحریک کی بانی ہے۔جس کی بڑی خصوصیت آسان اور عام فہم اسلوب بیان ہے۔اُردو ادب اور صحافت کا نیا آہنگ بڑی حد تک تحریک علی گڑھ کا مرہون منت ہے۔(پنجاب یونیورسٹی' 1982ء ص 107)
- تحریک علی گڑھ نے بیسوی صدی اور خصوصیت سے پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک نیا سیاسی کردار بھی ادا کیا۔وہ یہ تھا کہ علی گڑھ تحریک چلانے والوں کی خواہشات کے مطابق مسلمانوں کی نئی سیاسی بیداری کا مرکز بن گیا۔اس کا سب سے دلچسپ تاریخی پہلو یہ ہے کہ آخری دور میں مسلم قومیت اور دو قومی نظریہ کی تحریک کا گہوارہ علی گڑھ ہی بنا۔اس طرح جو ادارہ انگریزوں سے قرب و مفاہمت کے جذبے سے قائم ہوا تھا، وہ ہی انگریزی اقتدار پر آخری ضرب لگانے کا ذریعہ بنا۔(خورشید احمد' (س ن)' ص 113)
- مسلمانوں کی گزشتہ 70، 80 سال کی نئی قیادت بڑی حد تک علی گڑھ نے ہی فراہم کی۔
- علی گڑھ تحریک بہت جلد ایک قومی تحریک بن گئی۔اس تحریک نے یک جہتی کیلئے بڑا کام کیا۔صوبہ سرحد، صوبہ بلوچستان، پنجاب، سندھ، مدراس، بنگال، گجرات، بہار، آسام، کرناٹک، سی۔پی، راجستھان اور بمبئی وغیرہ سے طلبہ علی گڑھ پڑھنے کیلئے آتے تھے۔اور وہاں تمام صوبائی تعصبات ختم کر کے "علیگ" بن کر نکلتے تھے۔علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ پورے ملک پر چھا گئے۔ان میں خود اعتمادی اور قوم کا درد تھا۔انہوں نے سرکاری حلقوں میں مسلمانوں کے خلاف غلط فہمیاں دور کیں۔(محمد اسلم' پروفیسر (س ن)' ص 66)
- انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کی بہت سی سیاسی اور ثقافتی تحریکیں یا تو علی گڑھ سے اُٹھیں یا اس کی قیادت سے فیض یاب ہوئیں۔(ممتاز معین' پروفیسر مسز 1982ء ص 44)
- تحریک علی گڑھ کی قائم کردہ ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں سے بہ کثرت شہروں میں اسلامیہ ہائی اسکول قائم ہوئے، اسلامیہ کالج پشاور، سندھ مدرستہ الاسلام کراچی، محمڈن عربک اسکول پٹنہ، اسلامیہ انٹر کالج اٹاوہ، بدایوں، بریلی اور میرٹھ وغیرہ اسی تحریک کے نتیجے میں قائم ہوئے۔کانفرنس کے پلیٹ فارم سے حفظِ قرآن، اوقاف کی

آمدنی سے تعلیم،اصلاح رسوم،فضول خرچی اوررسوم بے جا سے احتراز،تعلیم دینیات،فارسی تعلیم جاری رکھنے کی کوشش،عربی تعلیم کی ترویج،ندوۃ العلماء کی تائید،مکاتب قرآن کا اجراء،قانون،انجینئرنگ،ڈاکٹری اورٹیکنیکل تعلیم پر زور،سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم،طب یونانی کی ترقی،قیدیوں کی تعلیم،تعلیم اطفال،تعلیم بالغاں اور تعلیم نسواں جاری کی گئیں۔(الطاف علی بریلوی سیّد 1994ء،ص 22)

- تحریک علی گڑھ کی برکات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،ڈھاکہ یونیورسٹی،عثمانیہ یونیورسٹی کی شکل میں نمودار ہوئیں۔ تحریک ندوۃ العلماء،انجمن حمایت اسلام(لاہور)،مدرسہ احمدیہ آریہ(بہار) جیسے مذہبی اداروں پر اس تحریک کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔انجمن ترقی اُردو1903ء میں کانفرنس کے ایک شعبے کی حیثیت سے قائم ہوئی اور1912ء میں اس نے بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی قیادت میں ایک مستقل ادارہ کی حیثیت اختیار کی۔اسی کانفرنس کے ایک اجلاس میں جو 1906ء میں ڈھاکہ میں نواب محسن الملک کی زیر صدارت ہوا تھا۔"آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا جس کی کوششوں سے بالآخر 1947ء میں"پاکستان" وجود میں آیا۔(شمائل احمد شمیم'1973ء،ص138)
- تحریک علی گڑھ کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت جب مسلمانوں نے جدید تعلیم کی طرف توجہ کی تو اونچی ڈگریاں رکھنے والے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو برطانوی سرکار میں اعلیٰ عہدے ملنے لگے۔اور جنھوں نے انٹر یا انٹرنس ہی پاس کیا تھا انہیں بھی چھوٹی موٹی اسامیاں ملنے لگیں۔وکالت،طب،انجینئری باوقار اور آزاد پیشے سمجھے جاتے تھے۔ان پر بھی جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے آگے بڑھ کر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔غرض کہ جدید تعلیم کے باعث نوجوانوں کو روزگار ملنے لگا۔(محمد احمد'خان1978ء،ص 72)
- سرسیّد نے جس سیاسی پالیسی کی بنیاد رکھی بالآخر قوم نے اسی کو اختیار کیا اور وہی کامیاب رہی۔مسلمانانِ ہند کی فکری اور سیاسی لیڈر شپ مغربی تعلیم یافتہ اصحاب ہی نے سنبھالی۔اقبالؔ اور قائداعظم دونوں اعلیٰ مغربی تعلیم سے مرصع تھے۔ان ہی کی مساعی جمیلہ سے پاکستان قائم ہوا۔پاکستان کا قیام سرسیّد ہی کی پالیسی کا نتیجہ اور اس کی صداقت پر مہر ہے۔(عبدالرشید'میاں1982ء،ص 110)

المختصر مسلمانوں کو مجموعی لحاظ سے اس تحریک سے نہ صرف اقتصادی اور سیاسی بلکہ دینی فوائد بھی پہنچے۔کیونکہ مغربی علوم سے واقف ہونے کے بعد دینی لحاظ سے وہ مسیحیت کے حملوں کی پوری طرح مدافعت کرنے کے قابل ہوگئے۔سیاسی لحاظ سے وہ اس کے باعث ہندوؤں اور انگریزوں کی چالوں کو سمجھنے لگے اور ان کا جواب دینے لگے۔اقتصادی لحاظ سے اعلیٰ ملازمتیں ان کے ہاتھ آ گئیں اور ان اختیارات کے باعث وہ اپنے ہم قوموں کو تجارتی و دیگر فوائد پہنچانے کے قابل ہوگئے۔یہی نہیں بلکہ سرسیّد اور ان کے ساتھیوں نے ایک نیا ادب بھی پیدا کیا جو اپنے ساتھ نئے افکار اور نیا اسلوب نگارش لایا۔سٹوری آف پاکستان کی ویب سائٹ نے کیا خوب الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

''Syed Ahmad Khan's Aligarh Movement played a significant role to bring about an intellectual revolution among the Indian Muslims. Thus Aligarh Movement succeeded in achieving it's major objectives, i.e. educational progress and social reform and earned for Sir Syed the title ''Prophet of Education''.(The websithe storyofpakistan.2002. Aligarh Movement 1858-1898)

اب ہم تصویر کے دوسرے رخ پر نگاہ ڈالتے ہیں:

تحریک علی گڑھ اور اس کے ارتقاء میں تحقیقی فکر کے مقابلے میں تقلیدی فکر نمایاں نظر آتی ہے۔اس کا اندازہ سرسیّد احمد خان کی اس تحریر سے کیا جاسکتا ہے جو ان کی معتدل تحریروں میں سے ایک ہے: ترکوں کا تمام لباس بہ جز ٹوپیوں کے بالکل یورپین ہے۔سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔میز کرسی پر بیٹھتے ہیں۔چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ان کے مکان کی آراستگی و طریقہ بالکل یورپیوں جیسا ہے۔جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرنچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہم جولی معلوم ہوتے ہیں۔امید ہے کہ روز بروز مہذب ہوتے جائیں گے۔پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصبات اور خیالات خام کو چھوڑ دیں اور تربیت و شائستگی میں قدم بڑھائیں۔(خورشید احمد،پروفیسر (س ن)،ص 110)

یہ اس تربیت و شائستگی کی طرف پیش قدمی تھی کہ عیسائیوں کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا گیا،کھڑے ہو کر پیشاب کرنے اور داڑھی منڈانے کا جواز فراہم کیا۔حتیٰ کہ بائبل کو غیر تحریف شدہ تک ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔یوں مسلمانوں کو اپنی تاریخ کے شدید ترین ذہنی اور تمدنی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔اس پر اکبر الہ آبادی کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا:

ابتداء کی جناب سیّد نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

- دینی تعلیم کے سلسلے میں سرسیّد احمد خان نے تحریک علی گڑھ کیلئے ایک نیا نقطہ نظر اور نیا طریقہ کار اختیار کیا۔اعتقادی اور دینی امور سے زیادہ ان کے یہاں مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کو اہمیت حاصل ہے۔دین کی اعلیٰ اعتقادی تعلیم اور جامع نظام حیات ہونے کے تصور کی بجائے دینیات کی معمولی تعلیم وہ طلبہ کیلئے کافی سمجھتے تھے۔مکمل دین پر عمل پیرا ہونے کی بجائے صرف صوم و صلوٰۃ کی پابندی پر قناعت کر لی گئی۔اس کیلئے انہوں نے ہر دارالاقامہ میں

ایک پیش نماز مقرر کردیا تھا اور یہ پابندی بھی صرف ایک رسم بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جامعہ کیمبرج میں یہ طریقہ دیکھ کر آئے تھے کہ وہاں پر ہاسٹل میں ایک پادری ہوتا ہے جو مذہبی امور میں طلبہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس نمونہ پر انہوں نے علی گڑھ میں عمل کیا۔ کیمبرج کا پادری تو فاضل ترشخص ہوتا تھا۔ مگر علی گڑھ کا پیش نماز دینی علوم میں بھی کوتاہ دست ہوتا تھا۔ (خالد بن سعید 1957ء ص 32-33)

– علی گڑھ تحریک نے دو متضاد عناصر کو ایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی۔ یعنی مغربی تہذیب اور اسلام۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مغربی تہذیب میں ہی مسلمانوں کو مہارت حاصل ہوئی اور نہ اسلام ہی پورے طور پر ان کو حاصل ہوا۔ گویا

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

(خورشید احمد پروفیسر 1977ء ص 86)

– تحریک علی گڑھ نے دینیات کے ایک پیریڈ کو اسلامی تعلیم کے مترادف قرار دے کر اسلامی تصور تعلیم کی جامعیت کو ختم کردیا۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک خوابیدہ حصہ دار کی تھی۔ اوّلاً یہ امتحانی مضمون نہیں تھا کیونکہ آخری خارجی امتحان کے نصاب میں شامل نہ تھا۔ دوسرے اس کے ذریعے اسلام کا صحیح تصور اجاگر نہ ہوتا تھا۔ تیسرے یہ کہ یہ ان علوم کے نرغے میں تھا جن کے نظریات اس کی بنیادوں سے متصادم تھے۔ غرض اس طرح اسلام کے محدود تصور کو ہی فروغ ملا (عبدالرشید ارشد ڈاکٹر 1995ء ص 28)۔ علی گڑھ کے اس مزاج کا اظہار اس تقریر سے بھی ہوتا ہے جو سیّد محمود نے ندوۃ العلوم میں کی تھی اور کہا تھا: ہمارے ذمے دو کام ہیں دین و دنیا۔ ہم نے دنیا کی ترقی کا کام اپنی ذمہ لیا ہے اور ندوۃ دین کا کام دے رہا ہے۔ اس لئے ہمیں اسکے مقصد سے پورا اتفاق ہے (محمد اکرام شیخ 1965ء ص 91)۔ تعجب ہے کہ انہیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ اسلام تو دین و دنیا کی ایسی نمائندگی کا قائل نہیں جس میں ایک گروہ دین کا اجارہ دار بن بیٹھے اور دوسرا دنیا کا۔ اسلام تو دونوں کے امتزاج کا قائل ہے۔

– سرسیّد احمد خان نے نصاب بنانے والی کمیٹی سے صاف صاف کہہ دیا تھا: مذہبی کورس کو ایسی معتدل مقدار پر قرار دینا ضروری ہوگا جس سے انگریزی کی تعلیم میں حرج نہ پڑے (افتخار عالم سیّد 1901ء ص 133)۔ دینی مقاصد کے ساتھ تحریک علی گڑھ کے کچھ سیاسی اور تہذیبی مقاصد بھی سرسیّد کے پیش نظر تھے۔ سیاسی مقاصد کا اظہار انہوں نے واضح الفاظ میں یوں کیا: ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطنت انگریزی کے لائق اور کارآمد بنانا۔ اسٹوڈنٹ یونین کلب کے افتتاح 26 اگست 1884ء کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے سرسیّد نے زیادہ وضاحت سے سیاسی مقاصد کا تذکرہ کیا: اگر تم حاضرین کی خواہش یہ ہے کہ ہم قوموں میں عمدہ تعلیم پھیلے تو سب سے عمدہ حکمتِ عملی یہ ہے کہ تم کریسنٹ اور کروس کو ملا دو۔ بعض انگریز اور بعض ہندوستانی دوست یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے مگر

میرا خیال ہے ایک دن ایسا ہوگا کہ دونوں اس طرح مل جائیں گے(محمد سلیم' پروفیسر سیّد 1993ء ب' ص 272)۔کریسنٹ کے معنی ہلال اور کراس کے معنی صلیب ہیں۔یہ اسلام اور مسیحیت کے مخصوص مذہبی نشان ہیں۔پہلے جملے میں تو سرسیّد مسلمانوں کو تاج برطانیہ کے لائق اور کارآمد بنانا چاہتے ہیں لیکن دوسرے جملے میں تو انہوں نے غضب کردیا۔وہ اسلام اور مسیحیت کا نیا مرکب تیار کرنا چاہتے ہیں۔اس اقدام کی سنگینی کو ہر ایک نے محسوس کیا۔

— علی گڑھ تحریک کا ایک بڑا اہم پہلو سرکاری ملازمت حاصل کرنا تھا۔یہ چیز بڑے دوررس نتائج کی حامل ثابت ہوئی۔اسی کا کرشمہ تھا کہ عام مسلمان کلرکی کے پیچھے اوران کا ذہین ترین طبقہ ڈپٹی کلکٹری کے پیچھے مارامارا پھرتا تھا۔اس سے اونچا کوئی تصور انہیں نہ تھا۔اس کا تجربہ خود سرسیّد کو بھی ہوا۔وہ چاہتے تھے کہ ان کے صاحبزادے قوم کی خدمت کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیں لیکن صاحبزادے کی نگاہیں سرکاری ملازمت پر تھیں۔گویا لارڈ میکالے کے دل کی آرزو بر آئی۔(نذیر احمد' خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی' ڈاکٹر 1987ء ص 50)

— تحریک علی گڑھ نے جو علمی معیار قائم کیا وہ بھی سطحی اور پست تھا۔چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر بنیادی فکر یہ رہی کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ڈگریاں دے دی جائیں۔لہٰذا تحریک علی گڑھ نے نہ تو کوئی حالی یا شبلی پیدا کیا اور نہ کوئی قابل ذکر علمی روایت وتحقیقات۔گویا جن لوگوں نے مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی تھی ان میں تو سرسیّد، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مدبر و منتظم پیدا ہوئے لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کی عالیشان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی تھی وہ مطمع نظر کی پستی اور کردار کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پُرزے بن جائیں۔(لعل احمد' تھیم' 1973ء ص 126)

— اکبرالہ آبادی تحریک علی گڑھ کی جدید تعلیم کے سخت ترین نقاد تھے۔انہوں نے جدید درس گاہوں کو قتل گاہیں قرار دینے میں اس وقت بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی جب یہ تحریک اپنے شباب پر تھی۔انہوں نے اپنے مخصوص ظریفانہ اسلوب میں کہا تھا:

یوں قتل سے لڑکوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

(عبدالواحد معینی،1963ء ص 81-82)

— علی گڑھ کالج اور اسی قبیل کے دوسرے اسلامیہ کالجوں میں پڑھ کر مسلمانوں کی ایسی نسل تیار ہوئی جو اپنے اسلاف سے فکروعمل میں یکسر مختلف تھی۔ان کی عمومی خصوصیات یہ تھیں:

i: اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو یہ قومی ورثہ قرار دیتے ہیں مگر عملی زندگی میں رہنمائی کیلئے مغربی افکاروخیالات کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ii: حسنِ عقیدت کے باوجود شریعت کی پابندی کے معاملہ میں یہ سخت کوتاہ عمل ہیں۔

iii: دین کی ابتدائی معلومات کو یہ کافی تصور کرتے ہیں ۔علماء سے حصول علم کے یہ لوگ قائل نہیں......اسلئے دینی معلومات بالکل سطحی ہیں۔

(اشتیاق حسین قریشی ڈاکٹر 1974ء ص 69)

- تحریک علی گڑھ عملی حیثیت سے سرسیّد کے ذریں خواب کی ایک نہایت معمولی سی تعبیر ہے۔کئی ایسی ضروری باتیں تھیں، جن کے سرسیّد بہت خواہاں تھے لیکن وہ علی گڑھ کو نصیب نہ ہوئیں ۔سرسیّد جس درسگاہ کا خواب دیکھ رہے تھے اس کے متعلق انہوں نے خود کہا تھا: فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا،نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ الله کا تاج سر پر (محمد اکرام شیخ 1982ء ص 146)۔سرسیّد مغربی علوم کے ساتھ ایمان کامل اور صحیح مذہبی تربیت کو ضروری سمجھتے تھے۔لیکن اس سلسلے میں انہیں پوری کامیابی نہ ہوئی۔

- مغربی اقوام کی ترقی تجارت وصنعت کی ترقی سے عبارت ہے۔اگر ان ہی کے طریقہ کو اختیار کرنا تھا تو تعلیمی نظام میں صنعت وحرفت، تجارت، تجرباتی سائنس اور انجینئرنگ کو خصوصی مقام دیا جاتا۔لیکن علی گڑھ کے نصاب میں بلکہ پورے نظام میں ان علوم کو کوئی مقام نہیں دیا گیا۔اہمیت اگر دی گئی تو مغربی فلسفے اور ادب کو۔(خورشید احمد 1963ء ص 59)

- علی گڑھ تحریک کی تعلیمات کے زیر اثر نئی اقدار کو فروغ ہوا۔ابن الوقتی، خوشامد، اور نفاق کو کسی نہ کسی انداز میں محمود بنا کر پیش کیا گیا۔مسلمانوں کو بتایا گیا کہ زمانہ کا ساتھ دو۔اپنے اخلاق و کردار کو وقت کے سانچے میں ڈھال لو۔

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اس سے قوم کے اندر مسٹر اور مُلّا کی تفریق نے سر نکالا۔قوم میں دو طبقے اور دو اذہان پیدا ہو گئے۔صدیوں کی ملی وحدت کا پیرہن علی گڑھ تحریک نے چاک کر دیا۔انگریزوں کی مزاحمت اب خود بخود ختم ہوگئی۔بلکہ ظالم اور قاتل اب محسن نظر آنے لگا۔بقول اکبر الہ آبادی:

دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

(محمد سلیم پروفیسر سیّد 1993ء ب ص 278-279)

- علی گڑھ تحریک کے مطالعہ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ علی گڑھ ایثار و قربانی کی کوئی اونچی مثال قائم نہ کرسکا۔بلکہ علی گڑھ پر ایک لمبا دور ذہنی بزدلی کا گزرا۔بلکہ ایسی افسوسناک مثالیں ملتی ہیں کہ جب محسن الملک نے اُردو تحریک کے سلسلے میں حکومت کے رویہ کے خلاف پرزور تقریر کی تو سارا الزام محسن الملک پر ڈال دیا گیا (محمد امین زبیری مارہروی 1994ء ص 156)۔علی گڑھ کی سرکار پرست ذہنیت کی ایک اور مثال بے نقاب نظر آتی ہے۔جب محمد علی جوہر نے اپنے آپ کو علی گڑھ میں تدریسی خدمات کیلئے پیش کیا تو انہیں عملہ میں نہ لیا گیا کیونکہ

حکومت ان کو پسند نہ کرتی تھی۔اس قسم کے واقعات سے تحریک کے ذہن کی عکاسی ہوتی ہے۔(آبادشاہ پوری 1989ء،ص 72)

- کچھ خرابیاں تو علی گڑھ کے تعلیمی مزاج کی تھیں جبکہ کچھ اور اضافہ یورپین اسٹاف کی موجودگی نے کردیا۔سرسیّد مرحوم کا اصرار تھا کہ یورپین اسٹاف ضرور رکھا جائے۔اس پر دوسرے صاحب نظر ٹرسٹیوں نے اعتراض بھی کیا لیکن ان کی ایک نہ چلی۔اس کا اثر یہ ہوا کہ علی گڑھ کی معاشرت پر مغربیت کا رنگ غالب آ تا گیا۔بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پسند و ناپسند کا معیار انگریزی بن گیا۔بقول اکبرالہ آبادی:

چیز وہ ہے جو آئے لندن سے

بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

Poineer(پانیر)اس دور کا انگریزی اخبار تھا۔(شفیق الرحمٰن ہاشمی (س ن) ص 202-218)

- بحیثیت مجموعی تحریک علی گڑھ اسلام کے بین الاقوامی رنگ سے محروم رہی۔
- تحریک علی گڑھ کے منفی نتائج کا ادراک آخری زمانے میں خود ارباب علی گڑھ کو بھی ہو چلا تھا جس کا اندازہ مندرجہ ذیل تاثرات سے ہوسکتا ہے۔

i: محمد علی جوہر اپنے ایک خط میں نواب محسن الملک کو تحریک علی گڑھ کی روش پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

جو راستہ آپ نے لیا ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک ہرگز نہ پہنچائے گا۔

عزم سفر کعبہ و رُو در مشرق

اے راہ روپشت بمنزل ہشیار

(یہ کعبہ کی راہ نہیں ہے۔یہ ترکستان کا راستہ ہے۔یہ غلطی آپکے دل کی نہیں،آپ کے دماغ کی ہے۔)محمد علی جوہر کی علی گڑھ سے مایوسی ہی تھی جس نے انہیں "جامعہ ملیّہ" قائم کرنے کی ترغیب دی اور جس کے پہلے وائس چانسلر وہ خود بنے۔

ii: نواب وقار الملک سرسیّد احمد خان کی تحریک کیلئے پالیسیوں سے سخت غیر مطمئن تھے۔اس کا اندازہ اس خط سے کیجئے جو سرسیّد مرحوم نے ان کو لکھا: جن امور کو آپ تصور کرتے ہیں کہ قومی کالج کیلئے مبارک فال نہیں،ہم ان ہی امور کو کالج کیلئے مبارک فال سمجھتے ہیں۔پس اس کا کوئی علاج نہیں ہے اور یقین کرنا چاہیے کہ جو خدا کو منظور ہے،ہوگا۔جب ان کے اپنے صاحبزادے محمد احمد،علی گڑھ کی تعلیم کے بعد لندن سے انگریز بیوی لائے اور گھر واپس آنے کی بجائے بنگلور جا کے مقیم ہوئے تو اس ذاتی تجربے کے بعد انہیں اور بھی شدید صدمہ ہوا۔انہوں نے جدید تعلیم کے تلخ نتائج بچشم سر دیکھ لیے۔یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ کے سربراہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے کو "ندوۃ العلوم" بھیجا۔

iii: علامہ شبلی نعمانی کی تحریک علی گڑھ سے بے اطمینانی اور مایوسی ایک کھلی حقیقت ہے۔ 1883ء میں ایک خط میں انہوں نے لکھا: معلوم ہوا کہ انگریزی خواں قوم نہایت مہمل فرقہ ہے۔ مذہب کو جانے دو خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ، پتلون کی نمائش گاہ ہے۔

iv: مولانا حالؔی آخری دم تک سرسیّد کے ساتھ رہے۔ لیکن مولوی عبدالحق نے جو مضمون "چند ہم عصر" میں حالؔی پر لکھا ہے اسمیں کہتے ہیں کہ: اپنی آخری عمر میں حالؔی اس تعلیم سے شدید حد تک مایوس ہو گئے تھے اور کہتے تھے کہ جو توقعات ہم نے وابستہ کر رکھی تھیں ان میں سے کوئی بھی پوری نہیں ہوئی۔

v: آخر میں ہم تحریک علی گڑھ کے بانی سرسیّد احمد خان کے ایک خط سے اقتباس پیش کرتے ہیں جو اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے: تعجب ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قوم کی بھلائی کی اُمید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔

(مندرجہ بالا واقعات کا مفصل ماخذ محمد اکرام شیخ کی تصنیف "موجِ کوثر" ہے اس لئے متعدد حوالہ جات سے حواشی کو زیر بار نہیں کیا گیا)

باب ہفتم

تحریک ندوۃ العلماء

7.1 پس منظر

1857ء کی ناکام تحریک کے بعد حالات پُرسکون ہوئے تو ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے زخموں پر مرہم رکھنے کی فکر ہوئی۔ سرسیّد احمد خان معالج بن کر آئے تو یہ نسخہ تجویز کیا گیا کہ مسلمانوں کو جدید علوم اور مغربی تمدن سے آشنا کیا جائے۔ چنانچہ 1875ء میں ایم۔اے۔او سکول کی بنیاد رکھی گئی۔ مگر 20 سال کے تجربے کے بعد معلوم ہوا کہ انگریزی داں طبقہ سرکاری عہدوں پر فائز ہو کر اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے میں کچھ حد تک کامیاب ہوا، متوسط اور اونچے گھرانوں کا ایسا طبقہ بھی ابھرا جو بیوروکریسی میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کا احساس بھی تکلیف کی حد تک ہونے لگا کہ حصول علم کے ساتھ مرعوبیت اور ذہنی غلامی بھی سرایت کرتی جا رہی ہے۔ خود سرسیّد احمد خان نے 1890ء میں اپنی مایوسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا: تعجب ہے کہ جو تعلیم پاتے جا رہے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جا رہے ہیں۔ (شہاب الدین دسنوی 1986ء ص 145)

بلکہ اس زمانے میں عوام میں یہ مشہور تھا کہ جو دیوبند چلا گیا اس کی دنیا گئی اور جو علی گڑھ چلا گیا اس کا دین گیا۔ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں عیسائی مشنریوں نے اپنا اثر دوسری صورت میں دکھایا جو ہندوستانی عیسائی بن جاتا وہ ذہنی اعتبار سے اور طرز معاشرت کے لحاظ سے اپنے آپ کو یورپین قوم کا فرد سمجھنے لگتا اور ہم وطنوں کو نیچا دیکھتا۔ اس کی وفاداری مادرِ وطن کی بجائے حکمرانِ وقت سے ہونے لگتی۔ ہمارے علمائے کرام کیلئے یہ صورت ناقابلِ برداشت تھی وہ اپنی علمی، دینی اور معاشرتی ورثے کے شیدائی تھے۔ یہ درست ہے کہ ان میں زیادہ تر قدامت پسندی اور روایت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مگر بلاشبہ ایسے علماء بھی تھے جن کی نگاہیں دوررس تھیں۔ ان کے دل و دماغ کھلے ہوئے تھے۔ جو علم کو، علم کی حیثیت سے قدر کرنے کے قائل تھے۔ خواہ وہ علم مشرقی ہو یا مغربی، چینی ہو یا جاپانی۔ حصول علم کے سلسلے میں وہ تعصب برتنا نہیں جانتے تھے۔ البتہ جہاں کوئی فتنہ اُٹھتا نظر آتا وہاں اس کے مقابلے کیلئے سینہ سپر ہو جاتے۔ (محمد اسلم، پروفیسر (س ن)، ص 161)

1892ء میں چند ایسے ہی بوریہ نشیں قوم و ملت کے حالات پر غور کر رہے تھے اور ان خرابیوں کا علاج سوچ رہے تھے جو ملت کی عزت و حشمت کو خاک میں ملا رہی تھیں۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چند قدسی نفس جو منصوبہ بنا رہے ہیں وہ اس درجہ مقبول ہوگا کہ دنیا کے کونے کونے سے کھنچ کھنچ کر لوگ ان کے کاموں کو سمجھنے، ان کے آثار کو دیکھنے اور ان کی

خدمات کااندازہ کرنے کیلئے اس ادارہ کے پنڈال میں جمع ہوں گے۔ جوان بزرگوں کی آرزوؤں کا مرکز اور امیدوں کا محور تھا۔ (عبدالسلام قدوائی ندوی 1976ء ص 145)

اس ابتدائی مشورہ میں جو حضرات شریک تھے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا محمد علی مونگیری، شاہ محمد حسین الہ آبادی، شاہ سلیمان پھلواری، مولانا احمد حسن کانپوری، مولانا محمود حسن (شیخ الہند)، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا ظہور الاسلام فتحپوری، شاہ تجمل دسنوی، مولانا عبدالغنی رشید آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا نور محمد پنجابی۔ (محمد اسلام ڈاکٹر 1973ء ص 104)

اس فہرست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات کسی ایک علاقہ یا حلقہ کے نمائندہ نہ تھے بلکہ مختلف مکاتب سے تعلق رکھتے تھے۔ ملت کے روز افزوں انحطاط نے ان سب کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ آرزومند تھے کہ یہ صورتِ حال تبدیل ہو۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ایک طرف مغربی تہذیب پرانی روایات کو ختم کر رہی تھی اور دوسری طرف برطانوی حکومت ملک کو اپنے شکنجے میں زیادہ سے زیادہ کستی جا رہی تھی۔ عیسائی مناظر بھی اسلام اور داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف اپنے خیالات کی اشاعت میں مصروف تھے۔ علوم و فنون کے مرکز برباد ہو رہے تھے۔ کتب خانوں کو کیڑے کھا رہے تھے۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ مسلمان خود دست و گریباں تھے۔ ملک میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے اور مغربی تعلیم نے دل و دماغ کو جس طرح بدل دیا تھا اس کی بنا پر پرانی تعلیم کی گرفت کمزور ہو گئی تھی۔ جدید و قدیم کی کشمکش نے بہت سے ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ نئے دور میں ان دونوں میں سے ایک، حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے نا کافی ہے، وقت کی بہت بڑی ضرورت جدید و قدیم کا امتزاج ہے۔ (شبلی نعمانی مولانا 1932ء جلد سوم، ص 176-177)

ان بزرگوں نے یہ رائے قائم کی کہ کوئی ایسا مرکزی ادارہ بنایا جائے جس میں ہر خیال کے لوگ مل بیٹھ سکیں۔ اپنی کہیں دوسروں کی سنیں، فروعی مسائل کی بجائے اصولی معاملات کی جانب توجہ کریں اور باہم نبرد آزمائی کی بجائے مشترک مسائل میں متحد ہو کر قدم اٹھائیں۔ اس اجتماع میں تبادلۂ خیال کے بعد طے ہوا کہ اگلے سال خاص اس مقصد کیلئے کانپور ہی میں جلسہ کیا جائے۔ چنانچہ 1893ء میں ہر فکر و خیال کے ممتاز افراد کانپور میں جمع ہوئے جن میں سے چند حضرات خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مولانا ابراہیم آروی، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا احمد رضا بریلوی، مولانا سیّد محمد شاہ محدث رامپوری، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا غلام حسین کنتوری اور شاہ سلیمان پھلواروی۔ (خورشید احمد پروفیسر (س ن) ص 121)

مولانا محمد علی مونگیری نے علمائے ہند کے سامنے ندوۃ العلماء کے قیام کا تصور پیش کیا۔ چنانچہ مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسہ دستار بندی کے موقعہ پر علماء کی مشاورت سے علماء کی ایک مستقل انجمن قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مدرسہ فیض عام میں ہندوستان کے نامور علماء (باستثناء اختلاف عقائد و مسلک) جمع ہوئے اور علماء کی ایک انجمن قائم ہوئی۔ چونکہ انجمن کا قیام علمائے دین کی کوششوں سے ہوا تھا۔ اس لئے اس کا نام "ندوۃ العلماء" رکھا گیا۔ (ایچ۔ بی خان 1985ء، ص 38)

اس انجمن کے ناظم مولانا محمد علی مونگیری مقرر ہوئے جو مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے شاگرد تھے۔ رد نصاریٰ میں متعدد کتابوں کے مصنف اور رد نصاریٰ میں "تحفہ محمدیہ" ایک رسالہ نکال رہے تھے۔(انتظام اللہ شہابی مفتی 1983ء ص 115)

1894ء کے جلسہ منعقدہ بریلی نے قیام دارالعلوم کی تجویز منظور کر لی۔ پہلے خیال یہ تھا کہ یہ درس گاہ دہلی میں قائم کی جائے لیکن جب وہاں اس کا انتظام نہ ہو سکا تو لکھنؤ کی رائے ہوئی۔ قصہ مختصر یہ کہ 1312ھ/ 1894ء میں دارالعلوم لکھنؤ میں قائم ہوا۔(رشید احمد جالندھری ڈاکٹر 1989ء ص 341) جیسا کہ ویب سائٹ، سٹوری آف پاکستان میں درج ہے کہ:

This institute came into existance in 1894 as a result of the efforts of some religious minded government officals, Ulema and Sufis, who wished to bring the Ulema togather and remove sectarian difference.(Web site: storyofpakistan, 2002, P.1)

گولہ گنج میں ایک وسیع عمارت کفایت سے مل گئی ۔اس عمارت کے ملنے کے بعد 2 ستمبر 1898ء کو ندوۃ کا دفتر کانپور سے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ وہیں 26 ستمبر 1898ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا آغاز ہوا۔(عبدالسلام ندوی 1975ء ص 1-3)

ندوۃ العلماء کے قیام کا مسلمانوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ مختلف اسلامی اور قومی انجمنوں نے تائیدی تجویزیں اور ریزولیوشن بھیجے۔ مختلف اضلاع نے سپاس نامے پیش کئے۔ ملک کے طول و عرض سے پر جوش تحسین کے پیغامات موصول ہوئے۔ سر سیّد احمد خان اور ان کے رفقاء نے ندوۃ کے بانیوں کو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا پلیٹ فارم استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور مسلمانوں کو اس کی ہر ممکن مدد کرنے کا مشورہ دیا۔(عبداللہ فہد فلاحی 1987ء ص 163)

ندوۃ العلماء لکھنؤ علی گڑھ کالج کی ایک بدلی ہوئی صورت تھی۔ گویا روح ایک تھی مگر قالب دو۔اس کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مولانا شبلی اور مولانا عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اس کے قواعد و ضوابط متعین کئے(اعجاز الحق قدوسی 1977ء ص 185)۔ 1904ء میں مولانا شبلی معتمد مقرر ہوئے۔ وہ سولہ سال تک علی گڑھ میں فارسی کے استاد رہے تھے۔ سر سیّد کی صحبت نے فطری ذہانت کو چمکایا، شعبۂ مشرقی کے اساتذہ میں سب سے زیادہ کالج سے ان ہی نے فیض پایا تھا۔ بڑی امیدیں لے کر لکھنؤ آئے۔ ندوۃ العلماء کی مالی حالت استوار کی، حکام سے تعلقات سازگار بنائے۔ 1908ء میں لفٹیننٹ گورنر سے دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد نصب کرایا۔ یوں تعلیم خاصے زور شور سے ہونے لگی۔(سیّد ہاشمی فرید آبادی 1990ء ص 479)

1901ء میں ندوۃ میں داخلے کیلئے یورپ سے آیا ہوا ایک طالب علم ابو نجیب سیّد سلیمان سات سال وہاں گزار کر زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوا تو اس نے اپنا سفر کیسے طے کیا؟ ندوۃ کی فلاسفی سے اس کا رشتہ کس حد تک مضبوط رہا۔ بیس سالہ یہ نوجوان لکھنؤ شہر کی اس دانشگاہ تک کیسے پہنچا؟ خود اس کی زبانی سنیے: 1900ء پورا ہو رہا تھا کہ اس مجلس (یعنی ندوۃ العلماء کی جماعت) کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے پٹنہ میں ہوا۔ یہ جلسہ کیا تھا۔ جوش و خروش کا ایک سمندر تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب عمامے اور ہیٹ یکجا ہوئے۔ علماء اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونوں نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھ کر قوم و ملت کی چارہ نوازی کی فکریں کیں۔ میں بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسے میں شریک تھا۔ میری آنکھوں نے قومی خدمت کا یہ پہلا منظر دیکھا تھا۔ میں نے اس جلسے میں یہ پُراثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے جو خود بھی رو رہے تھے اور بڑے جبہ و دستار والے علماء و مشائخ کو بھی رُلا رہے تھے۔ اسی جلسے میں سب سے پہلے اس سلسلۂ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ عبدالقادر، لاہور کو بھی دیکھا۔ ان کی تقریر ایسی دل چسپ تھی کہ جس نے پورے جلسے کے ساتھ مجھے بھی محو حیرت بنا دیا۔ اور دل ہی دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مشق بعد کو ہوئی۔ جلسے کے اختتام پر میرے شوق نے بال و پر پیدا کئے اور میں اڑ کر لکھنؤ پہنچا اور ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں داخل ہو گیا۔ (شہاب الدین دسنوی 1986ء، ص 147-148)

یہ نوجوان بعد کو سیّد سلیمان ندوی کے نام سے تاریخ میں جانا گیا۔ یہ تھا وہ پس منظر جس کے تحت دارالعلوم ندوۃ العلماء وجود میں آیا۔ اب ہم اس کے مقاصد زیرِ غور لاتے ہیں۔

7.2 مقاصد تحریک

سر سیّد احمد خان نے جو افراد تیار کئے ان میں علمی ذوق کم اور نوکری کا شوق زیادہ تھا۔ دیوبند کے تیار کردہ افراد عالم دین تھے لیکن رفتارِ زمانہ سے واقف نہ تھے اور معاشرے میں امامت، خطابت اور مناظرے کے علاوہ کوئی دوسری جگہ انہیں راس نہیں آتی تھی۔ قوم کو تنزل سے نکالنے کا خواب ان کے ہاتھوں بھی پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ جدید و قدیم کے یہ دونوں مکاتیب فکر انتہائیں تھیں۔ ان کے درمیان کی راہ کے طور پر ایک اعتدال پسند تعلیمی تحریک کی ضرورت تھی۔ جس کو اپنے مذہب اور مذہبی اقدار بھی عزیز ہوں اور جدید تقاضوں کے لحاظ سے روشن خیالی، جدت پسندی اور مغربی علوم فنون بھی عزیز ہوں۔ ندوۃ العلماء کی تعلیمی تحریک ایک نظریاتی اور مذہبی تحریک تھی جس نے مغربی اثرات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکا اور قدامت پسند علماء کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ دکھائی۔ (شبلی نعمانی، مولانا 1941ء، ص 101)

قیام ندوۃ سے پہلے علامہ شبلی اور مولانا عبدالحق دہلوی نے ندوۃ العلماء کے دستور العمل میں اسکے یہ مقاصد بیان

کئے:

- اسلامی نظام تعلیم کی اصلاح ،علوم دین کی ترقی ،تہذیب اخلاق اور شائستہ اطوار پیدا کرنا۔
- علماء کے باہمی نزاعات کا خاتمہ کرنا۔
- مسلمانوں کی فلاح و بہبود اوران کے معاملات کی اصلاح کی تدابیر کرنا۔
- ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع کی تعلیم بھی ہو۔
- دینی علوم میں فتوے دینے کیلئے ایک محکمہ افتاء کا قیام عمل میں لانا۔

(محمد الحسنی ،سیّد 1964ء،ص 244)

ندوۃ العلماء کے ناظم اور عالم اسلام کے مایہ ناز عالمِ دین مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں ندوۃ العلماء کے قیام کے دو بنیادی مقاصد تھے:

(الف) علماء کی باہمی نزاع کا خاتمہ۔

(ب) اصلاح طریقۂ تعلیم۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے مطابق اس تحریک کی اساس (علی گڑھ کی تعلیم جدید اور تہذیب مغربی کی دعوت اور ملک کی دوسری تحریکوں کے برخلاف) خالص دینی تھی ۔یعنی اس میں مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب دین سے انحراف اور صحیح دینی تعلیم سے محرومی کو قرار دیا اور اسی کو ملت کے درد کا مداوا اور اصلاح و ترقی کا واحد راستہ تسلیم کیا گیا (ابوالحسن علی ،ندوی سیّد 1976ء،ص 120)۔اس تحریک میں طبقہ علماء کو جو شریعت اسلامی کا حامل و امین ،کتاب و سنت کا شارح و ترجمان اور اسلام کا اصل نبض شناس ہے ،مرکزی مقام دیا گیا ۔اور اسی کو امت کی تعمیر و تخریب ،ترقی و تنزل اور اصلاح و فساد کا ذمہ دار قرار دے کر اپنی جدو جہد کا محور بنایا گیا ۔ندوۃ العلماء تحریک کے بانیوں کی یہ رائے کتنی دقیع ہے کہ امت میں اصلاح احوال کی کوئی کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک علماء اس کے داعی اور علم بردار نہ بنیں ،ان میں امت کی رہنمائی و قیادت کی صلاحیت پیدا نہ ہو ۔اس کیلئے ایک طرف دینی علوم پر حاوی اور کتاب و سنت کا رمز شناس ہونے کی ضرورت تھی۔ دوسری جانب حالاتِ زمانہ اور جدید ضرورتوں سے واقفیت کی ۔(محمد اسلام ،ڈاکٹر 1973ء؛ ص 104-105)

چونکہ اس زمانے میں علماء پر یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ وہ معمولی مذہبی اختلافات اور جزئیات کی بنا پر آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں ۔اس لئے ضرورت تھی کہ علماء کو باہمی مصالحت و رواداری پر آمادہ کر کے اس خانہ جنگی کا خاتمہ کیا جائے ۔چنانچہ ندوۃ العلماء کی اصلاحی و تعلیمی تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ مختلف الخیال علماء جو کبھی ایک صحبت میں نہیں بیٹھ سکتے ،ایک مشترک مقصد کیلئے ندوۃ العلماء کے پلیٹ فارم پر جمع کر کے بہت سارو پیہ اور وقت بچائے ۔(طفیل احمد ،منگوری 1945ء،ص 178)

تحریک ندوۃ العلماء کے چار اہم مقاصد تھے ۔ایک تو علوم اسلامیہ یعنی عربی مدارس کے نصاب میں اصلاح اور نئے نصاب کی تیاری۔دوسرے رفع نزاع باہمی یعنی مسلکی اختلافات کو ختم کرنا۔تیسرے ایسے افراد تیار کرنا جو کتاب وسنت کے وسیع علم کے ساتھ جدید خیالات ونظریات سے واقف ہوں۔چوتھے اسلامی علوم وفنون،تعلیمات اور تہذیب وثقافت کی اشاعت،ان ہی مقاصد کو لے کر تحریک آگے بڑھی۔اس کے اثرات جب مسلم معاشرے پر پڑنے لگے اور اس کی افادیت سامنے آئی تو چند سال بعد تحریک سے وابستہ علماء وجدید تعلیم یافتہ حضرات نے اس پہلو سے سوچنا شروع کیا کہ اگر کوئی ایسا ادارہ قائم کردیا جائے جو تحریک کا آئینہ ہو اور اس سے ایسے افراد تیار کئے جائیں جو مذکورہ مقاصد کے حامل ہوں تو اس ادارہ کے ذریعے مقاصد کے حصول میں آسانی ہوگی۔(شبلی نعمانی' مولانا 1989ء جلد سوم' ص 121-122)

چنانچہ 9 جمادی الاولیٰ 1216ھ بمطابق 26 ستمبر 1898ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا قیام لکھنؤ میں ہوا۔ابتداء میں دارالعلوم انجمن کے ماتحت تھا بعد میں انجمن کی ساری ذمہ داریاں دارالعلوم نے سنبھال لیں۔دارالعلوم نے جب تحریک ندوۃ العلماء کے مقاصد کے حامل افراد تیار کرنے کا بیڑہ اُٹھایا تو اس نے سب سے پہلے مسلکی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس سے ہر مسلک ومکتب فکر کے طلبہ علوم اسلامیہ اور حسب ضرورت علوم عصریہ حاصل کرسکیں۔چنانچہ ندوہ پر کبھی بھی کسی مسلک ومکتب کا لیبل نہیں لگا۔(دعوت' 16 اکتوبر 1999ء ص 121)

انتظام اللہ شہابی کے مطابق تحریک ندوۃ کے مقاصد درج ذیل تھے:

(الف) ایسے علماء تیار کرائے جائیں جو علوم مذہبی بقرآن وحدیث وفقہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہوں اور خصوصاً علم کلام میں۔تاکہ غیر مذہب والوں کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت وصداقت ثابت کرسکیں۔

(ب) قوم میں ایسے علماء کی بھی ایک جماعت موجود ہونی چاہیے جو علوم وفنون مثلاً صرف ونحو،ادب وانشاء،منطق وفلسفہ وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتی ہو۔دوسری قوموں کے سامنے جب اسلام کی علمی عظمت کا تذکرہ آتا ہے تو خواہ مخواہ خلیل،جرجانی،فارابی اور ابن سینا کا نام لینا پڑتا ہے حالانکہ یہ لوگ خالص مذہبی علوم میں کچھ کمال نہیں رکھتے تھے۔

(ج) ایسے علماء بھی پیدا کئے جائیں جو دنیا کے حالات اور واقعات سے باخبر ہوں اور ان کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بستے ہیں اس کے اصول سلطنت کیا ہیں؟اس وقت مسلمانوں کی دنیاوی ضرورتیں کیا ہیں؟سلطنت کے انتظام میں جو تبدیلیاں پیش آتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑے گا؟۔المختصر واقفیت،انتظام،تدبر،عزم اور مصلحت اندیشی میں انہیں ید طولےٰ حاصل ہو۔(انتظام اللہ شہابی' مفتی 1983ء ص 116)

ندوۃ 1894ء میں مولانا محمد علی مونگیری کے ہاتھوں قائم ہوا۔جس کا مقصد علی گڑھ اور دیوبند کو ملانا اور دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنا تھا۔جدید وقدیم کا سنگم اس کا آئیڈیل قرار پایا۔خود اس کے بانی مرحوم اس نقطۂ نظر کے حامی

تھے۔ چنانچہ انہوں نے صاف طور سے لکھا ہے کہ: بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات وواقعات سے بھی باخبر ہو۔اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہے اس کے اصول سلطنت کیا ہیں۔ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جا رہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جا رہا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں۔ان کو دنیا کے حال کی بالکل خبر نہیں۔اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اوران کا ارشاد بالکل نا قابلِ التفات ہے۔(سلیمان ندوی مولانا سیّد 1939ء ص 2)

ندوۃ العلماء کے پیش نظر مقاصد میں سے درج ذیل مقاصد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(الف) دینی مدارس کے نصاب میں ایسی مناسب تبدیلیاں لانا کہ وہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ہو جائیں۔جہاں تک ہو سکے دینی تعلیم کو معاشرے کی ثقافتی ترقی سے ہم آہنگ کیا جائے۔

(ب) شریعت کے اصول واحکام کا جائزہ لے کر اسلام کے نظام قانون کو متحرک رکھنا، اس طرح کہ وہ قرآن وسنت کی رہنمائی کے مطابق بھی ہو اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا بھی ساتھ دے سکے۔(شعبۂ تعمیر وترقی 1981ء ص 4)

المختصر خلاصۂ مقاصد تحریک ندوۃ العلماء درج ذیل تھے۔

- اوّل روز سے ہی ندوۃ کے پیش نظر یہ نصب العین تھا کہ طلبہ عربی ادب سمیت علوم اسلامیہ میں مہارت حاصل کریں اور اپنے جدید ماحول و تقاضوں سے بھی بہرہ ور ہوں۔(عبدالسلام ندوی 1975ء ص 2-3)
- ایسے لوگ تیار ہوں جو نہ صرف گردوپیش کے حالات سے بخوبی واقف ہوں بلکہ انہیں معاملات پر بات کہنے کا سلیقہ بھی آتا ہو۔
- جزئیات سے گہری اور علمی واقفیت ہو جو کہ ایک تجربہ کار اور کامیاب قائد اور رہنما کے لئے بے حد ضروری ہے۔
- جب ہندوستان کے اہم علاقوں کے دورے پر مولانا مشتاق علی نگینوی استاد مدرسہ اسلامیہ فیض آباد کو مامور کیا گیا تو انہیں ناظم اوّل ندوۃ العلماء نے جو تحریر دی اس میں ندوۃ کے قیام کی یہ غرض بھی بتائی گئی تھی کہ: اس وقت ہمارے علماء کی باہمی نزاعیں سخت نقصان پہنچا رہی ہیں اور بہت سے چھوٹے چھوٹے امروں میں بڑا بڑا فساد پیدا ہوتا ہے جس سے علمائے اسلام اور خود ہمارے پاک مذہب اسلام کی مخالفین کی نظروں میں اہانت ہوتی ہے۔یہ انجمن کوشش کرے کہ یہ باہمی نزاع نہ ہونے پائے اور جب کوئی اختلاف کسی گروہ میں واقع ہوا کرے تو وہ اس انجمن کے ذریعے طے ہو جایا کرے۔(روداد ندوۃ العلماء بابت سال اول اپریل 1975ء)
- سب سے مقدم مقصد یہ تھا کہ علوم کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو اور لوگوں کو تکمیل فن کی طرف رہبری ہو۔اس مقصد کیلئے نہایت باکمال علماء کا مدرس ہونا، نصاب تعلیم میں ترمیم واصلاح شدہ کتاب کا داخل ہونا، امتحانات کے قواعد کا مستحکم اور سخت ہونا قرار دیا گیا۔

- ندوہ کے فارغ التحصیل اس نوعیت کے ہوں جو دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکیں تا کہ اثر سلطنت اور شیوع آزادی سے جو بے دینی مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہے وہ رُک سکے۔
- غیر قوموں کے علاوہ خود مسلمانوں کی نظروں میں جو روز بروز طلبہ اور علماء کی وقعت کم ہوتی جاتی ہے۔وہ دور ہو تا کہ طلبا اور علماء اپنے ذاتی کمال واخلاق میں ایسے ہوں کہ عوام کے دلوں میں خود بخود ان کی وقعت ہو، جس سے عظمت اسلامی متصور ہے۔(سلیمان ندوی، مولانا سیّد 1939ء ص 10)
- طالب علموں میں دلیری وبلند ہمتی، اعلیٰ نظری وفراخ حوصلگی کا پیدا کرنا۔
- علوم دینیہ خصوصاً علم کلام میں جس کی اس وقت نہایت ضرورت تھی ،نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کرنا تا کہ اتحاد ودہریت اور دیگر مذاہب کا مقابلہ پورے زور اور قوت کے ساتھ ہو سکے اور ان کے اندرونی وبیرونی حملوں کو روک سکے۔(عبداللہ فلاحی 1987ء ص 237)
- سیّد سلمان ندوی ندوہ کو قلب دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوش مند، تینوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے تھے اور اسی ترتیب وتناسب کے ساتھ کہ پہلا مقام قلب دردمند کا ہو، دوسرا ذہن ارجمند کا اور اس کے بعد ان کی ترجمانی کے لئے زبان ہوش مند ہو۔(ابوالحسن علی، سیّد ندوی 1984ء ص 40)

المختصر تحریک ندوۃ کے مقاصد میں نصاب کی اصلاح، علوم ودین کی ترقی، تہذیب اخلاق، شائستگی اطوار، علماء کے باہمی نزاعات کا خاتمہ، مسلمانوں کی فلاح واصلاح کی تدابیر، ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم وفنون کے علاوہ علمی صنائع کی تعلیم بھی ہو اور دینی علوم میں فتوے دینے کیلئے ایک محکمہ افتاء کا قیام شامل تھا۔

7.3 نصاب

1892ء کی تحریک ندوہ کی بنیاد علماء کی ایک تنظیم "ندوۃ العلماء" سے ہوئی۔اس تنظیم کا پہلا اجلاس 15-17 شوال 1310ھ بمطابق 22-24 اپریل 1893ء بمقام کانپور منعقد ہوا۔اس اجلاس میں مولانا لطف اللہ، مولانا شبلی نعمانی، مولانا احمد رضا خاں، شاہ محمد حسین الہ آبادی، شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی غلام حسین کنتوری پر مشتمل ایک کمیٹی اصلاح نصاب پر غور کرنے کیلئے بنادی گئی۔اس کمیٹی کے اراکین نے تمام حالات پر غور کیا۔باہر کے مدارس کی رائے بھی حاصل کی اور کافی غور وخوض کے بعد اگلے سال کا مجوزہ نصاب پیش کیا۔(عبدالسلام قدوائی ندوی 1976ء؛ ص 147)

شروع شروع میں یہ کوشش کی گئی کہ ایک ایسا نصاب تیار کر کے تمام اسلامی مدارس میں رائج کیا جائے جس پر تمام مسلمان متفق ہوں لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو صرف ندوہ کیلئے ایک جدید اور متوازن نصاب ترتیب دیا گیا۔مدارس

میں رائج درسِ نظامیہ پر شبلی اوران کے ساتھیوں نے سخت تنقید کی کہ اس نصاب میں اصل مقصود ومطلوب مضامین پر توجہ کم ہے اور ایسے مضامین جو صرف علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں ان پر وقت صرف کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً صرف ونحو بذات خود مقصود نہیں لیکن اس کی تدریس پر بہت وقت صرف کیا جاتا ہے۔ منطق کے نصاب میں فلسفہ ہی فلسفہ نظر آتا ہے۔ اور تفسیر پر خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ شامل درس کتب کی زبان اتنی پیچیدہ ہے کہ اصل مطلب پلے نہیں پڑتا اور سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ جدید علوم اور جدید ترقی یافتہ زبانوں پر کوئی توجہ نہیں۔ لہٰذا نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کی گئیں کہ طالب علم علوم دین اور عربی زبان وادب میں مہارت کے ساتھ ساتھ دنیا اور اس کے مسائل سے بھی بے خبر نہ رہے۔ آگے چل کر اس تحریک نے دیوبند اور علی گڑھ کی انتہاپسندیوں کے درمیان ایک بین بین مسلکِ اعتدال کی شکل اختیار کر لی۔ (مسعود عالم ندوی، مولانا 1987ء، ص 24)

فرزندان ندوہ نے خود تالیف وتصنیف کے ذریعہ عربی زبان وادب اور اس کے قواعد کا پورا نصاب تیار کر لیا۔ صحاح ستہ، ہدایہ، شرح الوقایہ اور قدیم عربی شاعری ونثر سے انہوں نے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی کیونکہ ان کا کوئی بدل نہیں۔ البتہ منطق، فلسفہ، علم کلام اور فارسی کی جگہ سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور انگریزی کو داخل نصاب کیا (دعوت 16 اکتوبر 1999ء نئی دہلی)۔ یہ نصاب تعلیم اس طرح مرتب کیا گیا جس میں اصلی دینی علوم یعنی قرآن پاک، احادیثِ نبوی، فقہ، تاریخ اسلام، اسرار شریعت، تصوف کی صحیح اور اعلیٰ فہم پیدا ہو سکے اور ان پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہو اس کے علاوہ بقدر ضرورت انگریزی اور حکومت کی سرکاری زبان ہندی کو بھی نصاب میں رکھا گیا۔ (محمد اسلام ڈاکٹر 1973ء، ص 109)

دارالعلوم میں ترتیبی نصاب بھی مرتب ہوا۔ اس کے مطابق یہ طے کیا گیا کہ نماز عصر کے بعد طلبہ مدرسے کے احاطے میں کوئی جسمانی ورزش بھی کیا کریں گے مثلاً گھوڑے کی سواری، تیرنا اور بندوق چلانا وغیرہ۔ اسی طرح کسبِ حلال کے لئے بعض صنعتی فنون سکھانے کی تجویز ہوئی جن کا تعین طلبہ کے رجحان اور مناسبت طبع پر موقوف رکھا گیا (محمد اسحاق جلیل؛ مولانا ندوی 2003ء، ص 144)۔ مولانا شبلی کی آمد سے پہلے مدرسے میں چھ سال کی تعلیم تجویز کی گئی تھی جس میں تین سال ابتدائی درجوں کے اور تین سال ثانوی درجوں کے شامل تھے۔ آپ نے آکر اس پر دو سال کا اضافہ کیا۔ یعنی اب ابتدائی سے اعلیٰ درجے تک عربی زبان کے کورس مکمل کرنے کیلئے آٹھ سال کا عرصہ مقرر کیا گیا۔ 1909ء میں دو سال کی تکمیل کے درجے کا اضافہ کیا گیا۔ جس کو سیّد سلیمان ندوی نے شبلی کا کارنامہ کہا ہے۔ اس درجے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ دو سال تک ایک ہی مضمون میں تعلیم حاصل کر کے تحقیقی نظر پیدا کریں۔ بعد میں اس درجے کے تین شعبے جاری کئے گئے جن میں عربی ادب، علم عقائد وکلام اور تفسیر کے شعبے شامل تھے۔ (عبدالوحید 2004ء، ص 226)

تحریک ندوہ کا پہلا مقصد کیونکہ نصاب کی اصلاح تھا اس لئے اس پر خاص توجہ دی گئی۔ علامہ عبدالقیوم، سیّد عبدالحئی اور مولانا شبلی پر مشتمل کمیٹی نے 1904ء میں درج ذیل نصاب تجویز کیا۔

— عربی ادب اور فنِ بلاغت کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ مختصر المعانی کے ساتھ دلائل الاعجاز، اعجاز القرآن اور نقد الشعراء

نصاب میں شامل کی گئیں۔

— تفسیر کو نصاب میں بنیادی اہمیت دی گئی۔ بیضاوی کے پہلے پندرہ پارے شامل درس ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مصری کتاب الصراط المستقیم بھی نصاب میں شامل کی گئی۔

— علم عقائد اور علم الکلام کے بارے میں ابن رشد، غزالی اور رازی کی بعض کتب شامل کی گئی۔

— منطق اور فلسفے کے قدیم و بیکار قصے خارج کر کے اشراقی فلسفے اور سائنس کے جدید علوم پر مشتمل کتابیں ہدیہ سعدیہ، شرح حکمت العین، شرح حکمت الاشراق، دروس الادلیہ فی علوم الطبیعیۃ اور قسطنطنیہ میں چھپے ہوئے فارسی رسالے کو شامل کیا گیا۔

— اسرار شریعت میں شاہ ولی اللہ کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ شامل نصاب کی گئی۔

— قدیم عربی کے ساتھ جدید عربی کی تدریس کیلئے سیّد سلیمان ندوی کی دروس الادب عربی نصاب میں شامل کی گئی۔

— جدید علوم سے واقفیت حاصل کرنے اور جدید دور کی ترقیوں سے فائدہ اُٹھانے کیلئے انگریزی زبان کی تدریس لازمی قرار دی گئی۔

— ہندوؤں کے اعتراضات کے جواب دینے کے قابل بنانے کیلئے ہندی اور سنسکرت کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا۔(شبلی نعمانی مولانا 1932ء جلد سوم ص 157-163)

گویا مرحلہ وار تین مراحل (ابتدائیہ، عالیہ، فاضلیہ) میں مندرجہ ذیل کتب کی تدریس ہوتی تھی۔

العالیہ

السنۃ الاولیٰ

1 صرف: تمرین الصرف (الجزء الاوّل)

2 نحو: تمرین النحو (الجزء الاوّل)

3 ادب: قصص النبیین (الجزء الاوّل والثانی) المحاورۃ العربیہ و دروس الانشاء

4 تعلیم الاسلام: از مولانا حکیم سیّد عبدالحیٔ

5 حساب۔ عبارت نویسی

6 فارسی

السنتہ الثانیہ

1 صرف: تمرین الصرف (الجزء الثانی)

2 نحو: تمرین النحو (الجزء الثانی)

3 ادب: قصص النبیین (الجزء الثالث، القراءۃ الراشدہ (الجزء الاوّل والثانی)

4 تجوید قرآن:

5 دینیات: اسلام کیا ہے؟ از مولانا منظور نعمانی۔

6 فارسی، اُردو عبارت نویسی:

السنته الثالثه

1 صرف ونحو: ہدایت النحو (تا بحث حرف) منہاج الصرف

2 تجوید: جمال القرآن از مولانا اشرف علی تھانوی

3 ادب: القرائتہ الراشدہ (الجزء الثالث) کلیہ ودمنہ (منتخب ابواب)

4 تاریخ اسلامی: دروس التاریخ الاسلامی (الجزء الاوّل والثانی)

5 قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (چند سورہ)

6 حدیث: ریاض الصالحین (نصف آخر)

7 فقہ: نور الایضاح

8 انشاء: معلّم الانشاء (الجزء الاوّل)

السنته الرابعه

1 نحو: شرح شذور الذہب

2 انشاء: معلّم الانشاء (الجزء الثانی)

3 ادب: منشورات من الادب۔ از سیّد ابوالحسن علی ندوی

4 تاریخ: دروس التاریخ الاسلامی (الجزء الثالث)

5 قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (چند سورتیں)

6 حدیث: ریاض الصالحین (نصف الاوّل)

7 فقہ: قدوری

8 منطق: مبادی منطق

السنته الخامس

1 قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (چند سورتیں)

2 حدیث: مشکوٰۃ المصابیح (نصف الاوّل) معہ مقدمہ شیخ عبدالحق دہلوی

3 فقہ: شرح نقایہ (اوّلین)

4 ادب: مختارات از سیّد ابوالحسن علی ندوی، معلّم الانشاء (الجزء الثالث)

5 تاریخ: دروس التاریخ الاسلامی (الجزی الرابع)

6 جغرافیہ: مبادی

7 فلسفہ: مبادی فلسفہ

السنتہ السادسہ

1 قرآن مجید: ترجمہ وتشریح (بقیہ سورہ)

2 حدیث: مشکوٰۃ المصابیح (نصف ثانی) نخبۃ الفکر، شمائل ترمذی

3 فقہ: ہدایہ (الجزء الاوّل)، سراجیہ معہ مشق

4 کلام: العقیدۃ الحسنہ

5 ادب: مختارات (الجزء الثانی)، معلّم الانشاء (الجزء الثالث)

6 جغرافیہ عالم اسلامی: خصوصاً جزیرۃ العرب

7 انگریزی:

السنتہ السابعہ (الاخیرہ)

1 قرآن مجید: ترجمہ وتشریح، الفوز الکبیر از شاہ ولی اللہ

2 حدیث: جامع ترمذی کامل، صحیح بخاری (تا کتاب العلم)

3 فقہ: ہدایہ (الجزء الثانی) المدخل الی اصول الفقہ از شیخ معروف الدوالیبی

4 ادب: البلاغۃ الواضحہ بفصوص ادبیہ، انشاء

5 انگریزی:

التفصیل

1 صحیح مسلم کامل، سنن ابی داؤد

2 ہدایہ (الجزء الثالث)

3 تفسیر بیضاوی (آل عمران)

4 سیرت ابن ہشام۔ قطعات

5 دیوان المتنبی۔ قصائد مختارات، الحماسہ (باب الاوّل) الانشاء

6 حجۃ اللہ البالغہ (فصول مختارات من الجزء الاوّل)

7 محاضرات فی السیاستہ

(محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ب، ص 289-293)

شعبہ جات کے مطابق نصاب کو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا تھا۔

درجہ ابتدائیہ: اُردو زبان میں ابتدائی تعلیم اور دینیات کا چار سالہ نصاب عربی میں کمزور طلبہ کیلئے ایک سالہ نصاب۔

درجہ ثانیہ: عربی زبان اور علوم اسلامیہ کا چار سالہ نصاب ۔اس درجہ سے ذریعہ تعلیم عربی ہو جاتا تھا۔ادب عربی اور ترجمتین پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

درجہ عالیہ: علوم اسلامیہ کا سہ سالہ نصاب، ان مدارج میں حدیث اور تفسیر کے علاوہ علوم حاضرہ اور بقدر ضرورت انگریزی زبان کی تدریس بھی نصاب میں شامل تھی۔

درجہ تکمیلات: تفسیر و اصول تفسیر، حدیث و اصول حدیث اور دوسرے متعلقہ علوم پر مشتمل دو سالہ نصاب۔

درجہ تخصیص: عربی ادب اور ادبیات کا دو سالہ کورس۔(رشید احمد جالندھری ڈاکٹر 1989ء ص 122)

اس درس گاہ اور اس کے نصاب کے تعین سے ارباب بست وکشاد کے پیش نظر جو اصلاحات تھیں ۔ان کا خلاصہ یہ ہے:

- علوم میں کتابی مہارت کی بجائے فنی مہارت پیدا کی جائے۔
- علوم حاضرہ کو بقدر ضرورت رکھا جائے اور جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کی جائے۔
- عربی ادب خصوصاً دور جاہلیت کے شعراء اور ادباء وغیرہ کو شامل نصاب کیا جائے۔
- تاریخ اور جغرافیہ کے ابواب کا اضافہ کیا جائے۔
- انگریزی کو بحیثیت زبان داخل نصاب کیا جائے۔
- تقابل ادیان کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔
- تدریس و تعلیم جماعتی عصبیت سے یکسر پاک ہو۔

(احمد حسن جامی پیرزادہ 1976ء ص 329-349)

7.4 حکمتِ تدریس

مولانا سیّد محمد علی نے جولائی 1903ء میں ندوۃ العلماء کے اندرونی اختلافات کی بنا پر استعفیٰ دے دیا جو منظور ہو گیا اور طے یہ ہوا کہ تا انتخاب ناظم جدید، نائب ناظم مولانا محمد مسیح الزمان خاں رئیس شاہ جہان پور ناظم کے اختیارات کے ساتھ کام کرتے رہیں۔21 اپریل 1905ء کو مولانا مسیح الزمان خان کے مستعفی ہونے پر نظامت کا کام تین معتمدیوں پر تقسیم کر دیا گیا۔

i معتمدی مراسلات ودفتر سیّد عبدالحئی کے سپرد ہوا۔

ii صیغہ مال یعنی ندوہ کے مالی امور کا انصرام مداخل ومخارج کی نگرانی اور بجٹ وغیرہ کی تیاری مفتی محمد احتشام علی رئیس کے سپرد ہوئی وہ معتمد مال کہلائے۔

iii دارالعلوم کے تعلیمی مسائل کا انصرام، تعلیمی نگرانی اور طلبہ ومدرسین سے تعلق رکھنے والے امور کی انجام دہی مولانا شبلی نعمانی کے سپرد کی گئی اور انہیں معتمد تعلیمات کا لقب دیا گیا۔(محمد اسلام' ڈاکٹر 1973ء' ص 106)

اپریل 1905ء میں مولانا شبلی نعمانی معتمد تعلیم کی حیثیت سے (خاتون منزل گولہ گنج) لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ان کے آنے سے طلبہ میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ان میں مطالعہ، مضمون نگاری اور تقریر کا ذوق پیدا ہوا۔اشاعتِ اسلام کی تحریک میں بھی جان پیدا ہوئی اور دارالعلوم کی مزید ترقیوں میں بھی اضافہ ہوا۔کیوں کہ تحریک ندوہ کا مزاج سیاسی وہنگامی کی بجائے علمی وفکری تھا۔اس کا آغاز ہی اصلاح وترقی نصاب کے کام سے ہوا(محمد الیاس الاعظمی' ڈاکٹر 2002ء' ص 177)۔گویا تحریک ندوہ کی حکمت تدریس اصل میں اس کے نصاب میں پوشیدہ تھی۔تحریک کے جاری کردہ نصاب میں قدیم وجدید علوم کے امتزاج کی کوشش کی گئی۔عربی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی لازمی تھی۔انگریزی زبان کی سلسلے میں ایسا نصاب مرتب کیا گیا تھا جس کی مدد سے طالب علم کو جلد ہی انگریزی رسائل واخبارات پڑھنے کا سلیقہ آجاتا تھا نیز حسب ضرورت کتابوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی۔(نذیر احمد' خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی' ڈاکٹر 1987ء' ص 51)

انگریزی کے ساتھ جغرافیہ، حساب، جیومیٹری اور تاریخ کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی تھیں۔تاکہ اگر کوئی طالب علم میٹرک کا امتحان دینا چاہے تو بلا کسی مزید تیاری کے دے دے۔ان ابتدائی علوم کے علاوہ علوم جدیدہ معاشیات وسیاسیات سے بھی طلبہ کو روشناس کرایا جاتا۔معاشیات وسیاسیات کی تعلیم میں اصول ونظریات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے معاشی وسیاسی حالات بھی بیان کئے جاتے تھے۔معاشی مسائل کے حل میں اسلامی اصول سے بھی کام لیا جاتا اور یہ کوشش کی جاتی کہ اسلام کا معاشی نظام طلبہ کے سامنے آجائے۔

سیاسیات کی تعلیم میں نظریات کی تشریح کے بعد سے پہلے ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے بحث کی جاتی۔ واسکوڈے گاما کی آمد سے برطانوی قبضہ تک کی ساری سرگذشت سنادی جاتی پھر منٹو مارلے اصلاحات کا تذکرہ ہوتا۔اس کے بعد اگست 1917ء کے تاریخی اعلان کا ذکر آتا اور مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر گفتگو ہوتی۔اس سلسلہ میں ملک کے ترقی پسند عناصر کا ذکر بھی آتا۔ساتھ ساتھ قومی مطالبات کا تذکرہ بھی چلتا رہتا۔آخر میں اصلاحات پر گفتگو ہوتی۔گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر بحث کی جاتی۔یہ تمام باتیں اختصار کے ساتھ طلبہ کو بتائی جاتیں تاکہ طلبہ موجودہ مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے مطالعہ کے بعد بصیرت وسنجیدگی سے کوئی رائے قائم کر سکیں۔اس سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر بھی واضح کیا جاتا اور اسلامی نظام حکومت کا خاکہ پیش کیا جاتا تاکہ اس کشاکش حیات میں شمع راہ بن سکے۔سیاسی مسائل کو زیادہ ذہن

نشین کرانے کی غرض سے ایک نقلی پارلیمنٹ بھی قائم تھی تاکہ نظری بحثوں کی عملی مشق ہو جائے۔(انتظام اللہ شہابی 1983ء،ص 117)

تحریک ندوہ کی ایک حکمت تدریس یہ بھی تھی کہ عربی زبان کی تعلیم ایک زندہ تعلیم کی طرح ہوتی ہے لہٰذا طلبہ کو صرف کتاب فہمی کا عادی نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ اس کے ساتھ لکھنے اور بولنے کی مشق بھی کرائی جاتی تھی۔اس سلسلہ میں دارالعلوم ندوۃ کا طریق تعلیم عربی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں مختلف تھا۔سب سے پہلے طلبہ کو روزمرہ کے مفردات ایک خاص ترتیب سے یاد کرائے جاتے۔اس کے ساتھ ساتھ قواعد کی طرز پر آسان اور دلچسپ طریقے سے جملوں کی مشق کرائی جاتی۔کچھ دنوں بعد جب صرف ونحو کے ضروری قواعد آ جاتے تو "حکایات اطفال" کا پہلا حصّہ شروع کرادیا جاتا تھا۔بالعموم یہ منزل ایک ماہ میں ختم ہو جاتی۔جب اس طرح ایک حصّہ ختم ہو جاتا تو اسی انداز میں استاد چھوٹے چھوٹے قصّے لڑکوں کو سناتا۔پھر ان سے وہی قصّے بار بار زبانی کہلواتا۔چند مشقوں کے بعد "القراۃ الرشید" کا سلسلہ شروع کرادیا جاتا۔اس طرح تین چار ماہ میں متعلّم میں اتنی استعداد اور صلاحیت پیدا کردی جاتی کہ وہ سادہ زبان میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں لکھ سکے اور روزمرہ کی ضروری بات چیت کرسکے۔ایک عرصہ دراز کے تجربے نے یہ ثابت کردیا کہ دو سال میں متعلّم لکھنے بولنے اور سمجھنے میں کافی مشاق ہو جاتا تھا۔وہ آسانی سے ہر قسم کے خیالات عربی میں ظاہر کرسکتا تھا۔آگے چل کر مصر کے ابتدائی ثانوی مدارس کے دو منتخب مجموعے پڑھائے جاتے جو اسی غرض سے "وزارت معارف" نے مرتب کرائے تھے۔ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں ایک میوزیم بھی قائم تھا جس میں تمام چیزوں کے نمونے جمع تھے تاکہ ترجمہ کے بغیر چیزوں کا تصور قائم ہوسکے۔اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً لڑکوں کو مشاہدہ اشیاء کی غرض سے دور بھی لے جایا جاتا تھا۔(انتظام اللہ شہابی 1983ء،ص 118)

تحریک ندوہ کی حکمت تدریس میں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اس نے عربی ادب کی جانب خصوصیت سے توجہ کی۔اس لئے کہ ادب ہماری تعلیم کی حقیقی بنیاد ہے۔قرآن وحدیث کے بیشتر خزائن علوم اس کے اندر مدفون ہیں۔یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ہندوستان میں اسی فن کی جانب نسبتاً کم توجہ دی گئی۔چنانچہ تحریک ندوہ نے فن ادب پر خاص زور دیا تاکہ طلبہ فصاحت وبلاغت کے ساتھ صحیح عربی لکھ پڑھ سکیں۔یہ طریق تعلیم قدیم عربی مدارس کے ارباب حل وعقد کے لئے ایک عجوبہ روزگار بن گیا۔بلکہ اس وقت ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دارالعلوم ندوہ کے طلبہ کو عام جلسوں میں عربی زبان میں فی البدیہہ تقریر کرتے اور برجستگی سے گفتگو کرتے دیکھا۔اس سے عام لوگ بہت متاثر ہوئے اور خصوصیت سے ندوہ کی جانب متوجہ ہوئے۔دارالعلوم ندوہ میں عربی ادبیات کے ساتھ تاریخ ادب بھی پڑھائی جاتی تھی۔تاکہ ادب کے متعلّم کے سامنے عہد جاہلیت سے آج تک کے تمام ادبی تغیرات آ جائیں۔(محمد ناظم ندوی 1987ء ص 183)

تحریک ندوہ کی ایک خاص حکمت تدریس یہ تھی کہ اس نے نصاب تعلیم میں دینیات کی تعلیم پر خصوصیت سے زور

دیا۔علوم اسلامیہ کی تدریس کا اصل مقصد قرآن پاک تھا لیکن عام طور پر معقولات اور فلسفہ مطمع نظر بن کر رہ گئے۔قرآن مجید اور علوم قرآن مجید بالکل نظر انداز کردیئے گئے۔اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے دارالعلوم نے عربی ادبیات کے بعد قرآن پاک کی جانب خاص طور پر توجہ کی۔معانی و مطالب اور تفسیر و ترجمہ کے لحاظ سے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کردیا۔سب سے پہلے وہ کتابیں پڑھائی جاتیں جن میں سلیس زبان میں مسائل مذکور ہوں۔دوسرا دور ان کتب کا ہے جن میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی واضح طور پر بیان کئے گئے ہوں۔تیسرا دور ان کتب کا آتا ہے جن کی عبارت دقیق و پیچیدہ ہوتا کہ متعلّم میں دِقّتِ نظر اور مشکل عبارتوں کے سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے۔چنانچہ قرآن پاک کی تعلیم بھی اسی ترتیب سے دی جاتی تھی۔(طفیل احمد منگلوری 1945ء،ص 178)

سب سے پہلے قرآن مجید کا تشریحی ترجمہ پڑھایا جاتا۔اس کے بعد علمی انداز میں تعلیمی مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی اور پھر اس کے بعد مفسرین کی کاوشیں، تحقیقات ان ہی کے الفاظ میں بتائی جاتیں۔بالکل یہی ترتیب حدیث کی تعلیم میں بھی رکھی گئی۔اس سلسلہ میں خاص کوشش یہ کی جاتی تھی کہ متعلّم میں ذاتی جستجو کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ پر خصوصیت سے زور دیا جاتا۔طلبہ کو اسلامی عہد سے متعلق سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی مسائل سے آگاہ کیا جاتا تاکہ وہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان پر غور کرسکیں اور اس عہد نو کی تشکیل میں ماضی کے ان تجربات سے فائدہ اُٹھا سکیں۔(محمد اسلم، پروفیسر (س ن)، ص 165)

7.5 ہیتِ تعلیم

قدیم طرز کے دینی مدارس اور جدید طرز کی یونیورسٹیوں کے درمیان ندوہ تحریک کو اکثر اصلاح پسند اور دردمند علماء وعمائد، جدید سربرآوردہ تعلیم یافتہ حضرات ملت کے مختلف مکاتبِ فکر کے ذی علم اور معروف شخصیات نے قبول کیا اور اس کی مجلس انتظامی میں بحیثیت رکن یا کارکن شریک ہوئے۔تحریک ندوہ نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اسلام کے ایسے داعی و شارع تیار کئے جائیں جو دین حنیف کو جدید دنیا کے سامنے موثر انداز اور جدید اسلوب میں پیش کرسکیں۔(ضیاءالدین احمد، پروفیسر 1995ء، ص 128)

اس موثر انداز اور جدید اسلوب کو اپنانے کیلئے دستورالعمل میں درج ذیل اصول وضع کئے گئے:

دفعہ 1۔ طلبہ تین قسم کے ہوں گے۔

- جو تمام علوم عربیہ مروّجہ و مجوزہ میں تکمیل چاہیں گے۔
- جو صرف کسی خاص فن کی تحصیل کرنی چاہیں گے۔
- جو قدر مناسب کو حاصل کر کے دوسرا قصد رکھتے ہوں گے۔

دفعہ 2۔ ہر طالب علم کو اختیار ہوگا کہ جس قسم کے صیغہ تحصیل میں چاہے داخل ہو اور اس کے موافق علم حاصل کرے۔

دفعہ 3۔ علوم درسیہ کے مدرس تا امکان الگ الگ ہوں گے یعنی صرف ونحو، فقہ، اصول فقہ، منطق وحکمت، ادب، حدیث، تفسیر کے جدا جدا مدرس ہوں گے تا کہ ہر مدرس اپنے خاص فن میں زیادہ اہتمام اور توجہ کے ساتھ مصروف ہو سکے۔

دفعہ 4۔ تعلیم دو طریقے پر ہوگی۔

- طریقہ مروّجہ موافق
- طریقہ قدیمی یعنی اسلامی طور پر

جس کا یہ طریقہ ہوگا کہ استاد زبانی اس مسئلہ پر نہایت واضح دلائل کے ساتھ تقریر کرے گا جو اس روز کا سبق ہوگا۔

دفعہ 5۔ ہر فن کے مدرس وہی علماء ہوں گے جو اس فن میں کمال رکھتے ہوں۔

دفعہ 6۔ تینوں قسم کے طلبہ کیلئے نصاب درس علمائے کرام کے اتفاق ومشورہ سے مقرر کیا گیا۔ اس کے عام اصول یہ تھے:

- سب سے مقدم قاعدہ یہ ہوگا کہ قرآن مجید پر زیادہ توجہ دینی ہوگی۔ تفسیروں کے علاوہ وہ کتابیں درس میں داخل ہوں گی جن میں خاص طور پر علوم قرآن مجید سے بحث ہے اور بالخصوص وہ جن سے قرآن مجید کا اعجاز ثابت ہوتا ہے جیسے اعجاز القرآن۔
- ادنیٰ درجے میں خاص دینیات اور ادب کا لحاظ ہوگا۔
- درجہ اعلیٰ کے لئے تین قسم کی کتابیں ہر علم میں ہوں گی۔ ایک وہ جن میں نفس کے مسائل مذکور ہوں، دوسری وہ جن میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی نہایت واضح بیان ہوئے ہوں، تیسری وہ جس کی عبارت مشکل اور پیچیدہ ہو۔
- فن ادب پر بھی نہایت توجہ ہوگی۔ شعرائے جاہلیت کے متعدد دیوان درس میں داخل ہوں گے تا کہ قرآن مجید کے طرز بیان پر عمدہ طور سے واقفیت ہو۔
- اسلام کے اس حصہ تاریخ پر ضرور عبور کرایا جائے گا جس سے حضرت سرور عالم ﷺ کے اخلاق، جوش اسلامی اور مخلوق کیلئے خیر خواہی ثابت ہو یا جس سے قرآن مجید اور احادیث کے بعض مقامات کی توضیح ہوتی ہو۔ اسی طرح علمائے کرام اور شاہان اسلام کے وہ حالات جن سے ان کی اولوالعزمیاں، غیروں کے ساتھ ان کے اخلاق اور عمدہ برتاؤ کا اظہار ہوتا ہو۔
- اسلامی بلاد وممالک کا جغرافیہ بھی اس قدر معلوم کرایا جائے گا جس سے وہ قرآن مجید اور احادیث کے ان مقامات کو بخوبی سمجھ سکیں جہاں کسی مقام کا ذکر آیا ہے اور اس وقت کی اسلامی دنیا سے بھی واقف ہوں۔

— منطق اور فلسفے میں جو کتابیں نہایت کثرت سے داخل ہوگئی ہیں وہ گھٹا کر ادب اور دین کی کتابیں داخل کی جائیں گی۔

— علم کلام کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے گی۔

— تہذیب نفس کیلئے علم اخلاق وتصوف کی تعلیم داخل درس کی جائیگی۔

— اگر کسی فن کی ایسی کتاب دستیاب نہ ہوگی جس طرح کی تجویز کی گئی ہے تو تالیف کرائی جائے گی۔

دفعہ 7۔ تمام مستعد طلبہ مہینے میں ایک مرتبہ دارالمناظرہ میں جمع ہوکر کسی علمی مضمون پر مباحثہ کریں گے۔ مضمون ایک ہفتہ پہلے سے معین کردیا جائے گا اور مناظرہ کے وقت ایک مدرس موجود ہوگا تا کہ طلبہ کو قواعد مناظرہ کا پابند رکھے اور جہاں ان کی تقریر اصول مناظرہ کے خلاف ہو ان کو روکے اور بتائے کہ تمہیں اس طرح تقریر کرنی چاہیے۔ اس بات کی نہایت تاکید رہے گی کہ مناظرہ کے وقت کسی کی تقریر میں درشتی اور خشونت نہ پیدا ہونے پائے نیز کسی کے چہرے پر کسی طرح غصے کا اثر نہ ہو۔

دفعہ 8۔ تمام مستعد طلبہ کے لئے ضروری ہوگا کہ ہفتہ میں ایک دفعہ زبان عربی میں مناظرہ یا تقریر کریں یعنی مسئلہ معینہ پر جس قدر جو تقریریں کی جائیں زبان عربی میں ہوں تا کہ عربی میں گفتگو اور بات چیت کرنے کی مشق پیدا ہو۔

دفعہ 9۔ طلبہ کیلئے ایک دارالقراۃ ہوگا جس میں ہندوستان کے اُردو، انگریزی اخبارات اور رسائل کے ساتھ بلاد اسلامیہ کے اخبارات و رسائل منگوائے جائیں گے اور تمام مستعد طلبہ کو تاکید ہوگی کہ ہر روز وقت معین پر ان اخبارات کا مطالعہ کریں تا کہ حال کے محاورات پر اطلاع ہو اور ممالک اسلامی و دیگر ممالک کے حالات وواقعات سے واقفیت ہو۔

دفعہ 10۔ طلبہ کو وعظ و مناظرہ کے علاوہ کسی علمی یا سیاسی یا تاریخی مضمون پر کھڑے ہوکر گھنٹے دو گھنٹے تک تقریر کرنا بھی سکھایا جائے گا۔

دفعہ 11۔ طلبہ کو انگریزی علوم کے ساتھ حساب، جغرافیہ، تاریخ اور بعض جدید علوم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ 12۔ انگریزی زبان بھی ان کو سکھائی جائے گی۔ تا کہ موجودہ زمانے کے مطابق اسلام کی خدمت انجام دے سکیں اور اسلام پر جو غلط اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کا انگریزی میں جواب دے سکیں اور اس زبان میں اسلام، تاریخ اسلام اور علوم اسلامیہ پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان کو سمجھ سکیں۔

دفعہ 13۔ دارالعلوم میں انگریزی تعلیم کا معیار میٹرک تک ہوگا تا کہ طلبہ یہاں عربی تعلیم کی فراغت کے بعد ایک دو سال میں اسکول کا امتحان پاس کر کے انگریزی کالجوں میں داخل ہوسکیں۔

دفعہ 14۔ تمام طلبہ کو عربی انشاء پردازی کی مشق کرائی جائے گی اور عمدہ عبارت لکھنے پر انعامات مقرر کئے جائیں گے۔ (سلیمان ندوی، مولانا سیّد 1939ء، ص 6-9)

مندرجہ بالا اصولوں کو مدنظر رکھ کر تعلیم کو چار مختلف درجات میں تقسیم کیا گیا۔

— درجہ ابتدائی — درجہ عالمیت — درجہ فضیلت — درجہ تکمیل

ان تمام درجوں کے نصاب اور قواعد علیحدہ علیحدہ تھے جیسا کہ مندرجہ ذیل سے واضح ہے۔

درجہ ابتدائی

درجہ ابتدائی سے مقصود وہ درجہ ہے جس میں چھوٹے بچوں کو بقدر ضرورت اُردو، فارسی، حساب، نقشہ کشی اور دینیات کی تعلیم دی جائے گی۔

— اس درجہ میں پانچ چھ برس کے لڑکے داخل کئے جائیں گے۔

— اس درجہ کے کسی طالب علم کو مدرسہ سے کوئی وظیفہ نہیں مل سکتا۔

— اس درجہ کے ہر اس طالب علم سے جو مدرسہ کے اندر دارالاقامہ میں رہ کر پڑھنا چاہتا ہو، اس کی ہر قسم کی تعلیم وتربیت، نگرانی وخدمت کیلئے دارالاقامہ کی معمولی فیسوں کے علاوہ دو روپیہ ماہوار زائد فیس لی جائے گی۔

— اس درجہ کا پورا نصاب پانچ سال کا ہوگا جس میں طلبہ کو قراۃ وتجوید قرآن، اُردو لکھنا پڑھنا، فارسی بقدر ضرورت، حساب ابتدائی، جغرافیہ عام معلومات، عقائد عبادات، اخلاق، سیرت، تاریخ خلفاء کی تعلیم ہوگی۔ وضو ونماز کے عملی طریقے، معمولی حفظان صحت کے اصول، چھوٹے چھوٹے عملی کاموں کی تعلیم اور اسلامی اخلاق وآداب سکھائے جائیں گے۔

درجہ عالمیت

اس درجہ میں عربی، صرف ونحو، ادب وفقہ، اصول حدیث، فصاحت وبلاغت، منطق، فلسفہ قرآن، عقائد سیرت النبی ﷺ، تاریخ نبوی ﷺ، تاریخ اسلام، تاریخ ہند، حساب، جغرافیہ عالم اور انگریزی کی ابتدائی کتابیں تھیں۔

— اس درجہ کا نصاب چھ سال میں ختم ہوگا۔

— جو لوگ اپنے لڑکوں کو تھوڑی سی عربی اور دینیات پڑھا کر انگریزی سکولوں اور کالجوں میں داخل کرنا چاہتے ہوں۔ ان کیلئے مناسب ہے کہ اپنے لڑکوں کو دارالعلوم کا یہ درجہ پڑھا کر انگریزی مدارس میں داخل کریں۔

درجہ فضیلت

— درجہ عالمیت کو کامیابی سے طے کرنے کے بعد یا دوسرے مدارس کی اسی قدر استعداد کے طلبہ اس درجہ میں داخل ہوں گے۔

— اس کی مدت تعلیم تین سال ہوگی۔

— اس درجہ کو کامیابی سے ختم کرنے کے بعد طالب علم کو فضیلت کی سند دی جائے گی جو عام مدارس کی سندِ فراغ کے برابر ہے۔

- اس میں ادب، عربی نظم ونثر، اصول فقہ، اصول حدیث، حدیث تفسیر، تصوف، قرآن پاک، عقائد، علم کلام، علم اسرارومصالح شریعت، فلسفہ قدیمہ وجدیدہ، تاریخ فلسفہ، حکمت جدیدہ (سائنس)، ہیت قدیم وجدید علم، تمدن، معاشیات وسیاسیات، اخلاق اور تاریخ اسلام کی اعلیٰ درجہ کی کتابیں اور انگریزی بقدر میٹرک ہوگی۔

درجہ تکمیل

درجہ فضیلت میں کامیابی کے بعد طالب علم کسی خاص علمی شعبہ کی تکمیل کی خاطر اس درجہ میں داخل ہوسکتا ہے۔

- اس کی مدت تعلیم دو سال ہوگی۔
- اس درجہ کیلئے وہی طلبہ انتخاب کئے جائیں گے جنہوں نے درجہ فضیلت کا امتحان تمام مضمونوں میں اچھے نمبروں سے پاس کیا ہو، اپنی جماعت میں اوّل رہے ہوں، مجموعی نمبروں کے لحاظ سے وہ اوّل آئے ہوں، دوسرے مضامین میں پاس ہونے کے ساتھ کسی ایک مضمون میں سب سے اوّل آئے ہوں یا کسی ایک مضمون کو بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا ہو اور ان کے اساتذہ نے ان کی لیاقت واستعداد کی تصدیق کی ہو۔
- اس درجہ میں سبقاً سبقاً تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ زیادہ تر اساتذہ کے مشورے سے کتابوں کے مطالعہ کے ذریعے اپنی استعداد کو ترقی دینی ہوگی۔
- اس درجہ کے طالب علم کو مدرسہ کی طرف سے ماہوار وظیفہ بھی دیا جاسکتا ہے۔تاکہ وہ بے فکر ہوکر اپنی تعلیمی ترقی میں مصروف رہے۔
- اس درجہ کے امتحان کا یہ طریقہ ہوگا کہ اساتذہ کی مجلس ان میں سے ہر طالب علم کیلئے علیحدہ علیحدہ کسی اہم مضمون کا عنوان مقرر کرے گی اور طلبہ اپنے مطالعہ وکتب بینی اور تلاش وتفحص سے اس عنوان کے متعلق عربی میں کوئی بڑا رسالہ یا کتاب تالیف کرکے پیش کریں گے۔وہ رسالہ یا کتاب اس علم کے مشاہیر کی خدمت میں اظہار رائے کی خاطر بھیجی جائے گی اور طالب علم سے اس مضمون کے متعلق زبانی سوالات کئے جائیں گے۔ان میں کامیابی کے بعد طالب علم کو کامل کی سند دی جائے گی۔
- اس درجہ کے طلبہ کو مدرسہ میں عملی تجربہ کی تعلیم بھی دی جائے گی۔
- بالفعل صرف دینیات اور ادبیات دو شعبوں کا درجہ تکمیل قائم ہے۔
- اس درجہ کے طلبہ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ تکمیل کے بعد ندوۃ العلماء کے زیر ہدایت کم از کم تین سال تک مناسب تنخواہ پر علمی وتعلیمی خدمت انجام دیں گے۔
- دینیات وادبیات کا الگ الگ نصاب ہے۔

(محمد اسحاق جلیس، مولانا ندوی 2003ء، ص 229-231)

درجہ تبلیغ

تحریک ندوہ کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد ہمیشہ اشاعت تعلیم رہا ہے اور اس کے متعلق مختلف وقتوں میں عملی کام شروع کئے گئے مگر ناکامی اسلئے ہوتی رہی کہ ضرورت اور مقتضائے وقت کے مطابق واعظین و مبلغین نہیں ملے۔ اسلئے بالآخر ندوۃ العلماء نے یہ طے کیا کہ دارالعلوم میں واعظین و مبلغین کے تیار کرنے کیلئے ایک درجہ کھولا جائے چنانچہ اس تجویز کے مطابق علماء حضرات کے مشورہ سے ایک نصاب تیار کیا گیا۔ اس درجہ کے قواعد و ضوابط مندرجہ ذیل تھے۔

- یہ نصاب دو برس میں ختم ہوگا۔
- کتابی تعلیم سے زیادہ اس میں اسلامی علم کلام اور مختلف مذاہب کی کتابوں کے ذاتی مطالعہ پر وقت صرف ہوگا۔
- مختلف مذاہب کے باہمی مقابلہ و تنقید کی کتابیں مطالعہ میں دی جائیں گی۔
- تبلیغ کے مسائل پر مختلف ماہرین ان کے سامنے تقریریں کریں گے۔
- ایک استاد ان کو مطالعہ و تحقیق میں مدد دیتا رہے گا۔
- ان کو اسلامی اخلاق و پابندی اور سخت زندگی کی عادت ڈلوائی جائے گی۔
- ان طلبہ کے مطالعہ کیلئے مذہبی اور تبلیغی کتابوں کا ذخیرہ مہیا کیا جائیگا۔
- ان کو مختلف اسلامی و تبلیغی عنوانات پر تقریر کرنے کی تعلیم دی جائے گی۔
- اس درجہ میں جو طالب علم داخل ہوں گے ان کیلئے مناسب وظیفہ کا سامان کیا جائے گا۔
- ان کو وعدہ کرنا ہوگا کہ ختم تعلیم کے بعد کم از کم تین سال ندوۃ العلماء کے زیر ہدایت تبلیغی کام مناسب تنخواہ پر انجام دیں گے۔ (شبلی نعمانی، مولانا 1941ء،ص 103-104)

نظام تربیت

دستور عمل میں نظام تربیت کی درج ذیل دفعات بیان کی گئی ہیں۔

- ہر طالب علم کے لئے جدا حجرہ ہوگا۔ دو طالب علم ایک حجرے میں نہ رہیں گے۔
- طالب علموں کو تاکید ہوگی کہ وہ اپنے حجروں کو صاف اور پاکیزہ رکھیں۔
- ہر طالب علم کے حجرے میں چٹائی کا فرش اور اس پر دری ہوگی، پلنگ اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی الماری بھی ہو گی۔
- صبح سے شام تک جو اشغال ہیں سو کر اٹھنا، نماز پڑھنا، مطالعہ کرنا، مدرسہ جانا، کھانا پینا، مسنون ورزش کرنا، سب کے اوقات مقرر ہوں گے اور تمام طلبہ کو ان ہی معین اوقات میں یہ سب کام کرنا ہوں گے۔
- تمام طالب علموں کا ایک اسلامی لباس ہوگا اور وہ خاص شرفائے عرب کے طور پر ہوگا۔
- تمام طلبہ عرب کے طریقہ پر کھانا کھائیں گے۔

- نمازِ عصر کے بعد طلبہ مدرسہ کے احاطہ میں کسی قسم کی جسمانی ورزش مثلاً گھوڑے پر چڑھنا، بندوق لگانا، تیرنا وغیرہ سیکھیں گے۔
- مدرسہ کے رہنے والے طلبہ میں جب کوئی بیمار ہو گا تو مدرسہ کے شفاخانہ میں اس کا علاج کیا جائے گا۔
- کسب حلال کے لئے بعض فنون صناعیہ بھی سکھائے جائیں گے مگر اس کا تعین طلبہ کے رجحان پر موقوف ہو گا۔

(سلیمان ندوی مولانا سید 1939ء ص 9 وبعدہٗ)

تحریک ندوہ نے تعلیم کی ترویج کیلئے مندرجہ بالا درجات میں نصاب کو ختم کروانے اور طلبہ کو اسناد جاری کر کے عالم فاضل ہی نہیں بنایا بلکہ طلبہ وفضلاء میں صحیح علمی و تحقیقی ذوق پیدا کرنے اور تحریک کے پیغام کو دور دراز پہنچانے کیلئے مختلف ماہنامے اور رسائل وجرائد بھی جاری کیے مثلاً

- ندوۃ العلماء سے ایک پندرہ روزہ عربی مجلہ "الرائد" شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ عربی میں ہی "البعث الاسلامی" کے عنوان سے ایک ماہنامہ بھی جاری ہوتا تھا۔ جو نہ صرف ہندوستان کی عربی صحافت کا ایک مبارک آغاز تھا بلکہ یہ دونوں صحیح اسلامی فکر و دعوت کی نقیب و وکیل اور وقت کے فتنوں کے مقابلہ میں ایک جانباز مجاہد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان رسائل کے ذریعے نہ صرف ندوہ کی آواز بلکہ اسلامی ضمیر کی آواز عالم عربی کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی۔ اور ان کا شمار عربی کے موقر رسائل میں ہونے لگا۔ (عبداللہ فہد فلاحی 1987ء ص 165)
- ندوہ کے مقاصد کی اشاعت، علوم اسلامیہ کی تحقیق اور عقل ونقل کی تطبیق کی غرض سے رسالہ "الندوہ" کا اجراء عمل میں آیا۔ جس پر بہ حیثیت ایڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کا نام ہوتا تھا (محمد ہاشم سید ڈاکٹر 2003ء ص 172)۔
- 1932ء میں ایک عربی ماہنامہ "الضیاء" کا اجراء کیا جس کے مرتب ومدیر دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کے ایک مایہ ناز فرزند اور عربی کے مشہور اہل قلم مولانا مسعود عالم ندوی تھے۔
- مولانا مسعود علی کی توجہ سے دارالعلوم کی خوبصورت مسجد، مہمان خانہ تعمیر ہوا۔ نصاب پر نظر ثانی کی گئی۔ عربی زبان کی تعلیم وتدریس کیلئے ڈاکٹر تقی الدین ہلالی المراکشی کی خدمات حاصل کی گئیں جو عربی زبان وادب کے مسلم الثبوت اساتذہ اور ماہرین فن میں سے تھے۔
- ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر جمہوریہ ہند) نے جو اس زمانہ میں شیخ الجامعہ تھے۔ ندوہ میں کئی دن ٹھہر کر سیاسیات ومعاشیات اور انگریزی لٹریچر کی تعلیم کیلئے بڑا اچھا نصاب بنایا۔ سائنس کا بھی ایک درجہ کھولا گیا۔ جس سے بہت سے طلبہ نے فائدہ اٹھایا۔ ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ ندوہ میں انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم اس حد تک ہو جائے کہ یہاں کے طالب علم کالجوں اور یونیورسٹیوں کے محتاج نہ رہیں۔ (عبدالسلام قدوائی ندوی 1976ء ص 157)

الغرض تعلیم کے علاوہ تحریک ندوہ نے اخلاقی وجسمانی تربیت پر بھی زور دیا یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طلبہ کو صحیح اسلامی ومذہبی تربیت دی جاتی تھی ۔ان میں بلند نظری، عالی ہمتی اور ایثار کے جوہر پیدا کئے جاتے تھے ۔ساتھ ہی ان میں جانفشانی اور جدوجہد کے ساتھ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے حاصل کرنے کا تخیل پیدا کیا جاتا تھا۔اس کے ساتھ ان میں مناسب رواداری، تحمل، برداشت اور دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا کی جاتی تھی۔

7.6 وسائل

1892ء میں مدرسہ فیض عام کانپور میں علماء کا اجتماع ہوا جس میں مولانا محمد علی مونگیری نے تحریک ندوہ پیش کی۔ 1893ء میں دوبارہ کانپور میں اجلاس ہوا جس میں علماء کی ایک مستقل انجمن "ندوۃ العلماء" کا قیام عمل میں آیا(ایچ۔بی۔خان 1985ء ص 38)۔ مولانا محمد علی مونگیری کو ندوہ کا معتمد منتخب کیا گیا۔دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح کیلئے کمیٹی بنائی گئی (عبدالسلام ندوی 1975ء ص 3)۔شروع میں یہ کوشش کی گئی کہ مدارس اسلامیہ اس نصاب کو رائج کریں لیکن کچھ عرصے بعد کے تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ خیال درست نہیں کیونکہ مدارس کے منتظمین نے جب اس اصلاح شدہ نصاب کو جاری کرنے میں دلچسپی نہ لی تو خیال ہوا کہ خود اپنا دارالعلوم قائم کیا جائے۔چنانچہ 1313ھ کے جلسہ منعقدہ بریلی نے دارالعلوم کی تجویز منظور کر لی۔مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد 1894ء میں یہ دارالعلوم لکھنؤ میں قائم کیا گیا جو آگرہ اور اودھ کے مقام وسط پر واقع ہے اور جس کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ کسی زمانے میں اسلامی علوم کی تعلیم کا مرکز رہا تھا۔(انتظام اللہ شہابی ،مفتی 1983ء ص 116)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ: مکان مدرسہ شہر سے باہر ہے اور اس کا احاطہ 32 بیگھہ زمین ہے۔اس وسیع ٹکڑے میں مفصلہ ذیل عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں۔

- درسگاہ کی عظیم الشان دو منزلہ عمارت جس میں اوپر نیچے بیس 20 بڑے بڑے وسیع کمرے ہیں۔تفسیر کی تعلیم کا جدا کمرہ،حدیث کی تعلیم کا جدا کمرہ،فقہ کی تعلیم کا علیحدہ کمرہ وعلیٰ ہذا، بیچ میں بہت بڑا ہال
- پُر فضا اور شاندار مسجد
- نہایت عالیشان دارالاقامہ جس میں طلبہ کے رہنے کیلئے خوش فضا اور موزوں کمرے ہیں
- دارالاقامہ کے بیچ میں وسیع "دارالمطالعہ"

(سلیمان ندوی،مولانا سید 1939ء،ص 5)

ہمارا زیر بحث موضوع یہی ہے کہ ان عمارات کو بنانے اور تحریک کو چلانے کے لئے وسائل کون کون سے اور کہاں سے میسر آتے رہے۔اس سلسلے میں بھی سلیمان ندوی سے رہنمائی ملتی ہے وہ دارالعلوم و دارالاقامہ کے زر مصارف کے تحت

لکھتے ہیں کہ:

— دارالعلوم میں تعلیم کی کوئی اجرت نہیں لی جاتی اور نہ دارالاقامہ میں قیام کی کوئی اجرت لی جائے گی۔

— دارالعلوم میں داخلہ کی فیس دو روپیہ ہے۔

— دارالاقامہ میں کھانے کی فیس چھ روپے ماہوار ہے جس میں دو وقت صبح و شام کھانا دیا جائیگا۔

— طلبا اگر چاہیں تو مزید فیس دے کر ناشتہ کا بھی انتظام کرا سکتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کیلئے چار روپیہ ماہوار میں ناشتہ کا انتظام کر دیا جائیگا۔

— کھیل کیلئے چار آنہ ماہانہ

— دارالقراۃ کیلئے چار آنہ ماہانہ

— ایک روپیہ سالانہ، سالانہ امتحان کیلئے

— برائے روشنی چار آنہ ماہوار

(سلیمان ندوی، مولانا سیّد 1939ء ص 25)

ندوۃ العلماء میں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کی بنا پر خاتون منزل کی عمارت چھوٹی پڑ گئی تو ندوۃ العلماء کے بانیوں نے حکومت سے بات چیت کر کے لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق گومتی ندی کی کنارے ایک وسیع خطۂ اراضی حاصل کرلیا اور یہاں گورنر کے ہاتھوں نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا۔ نواب بہاولپور نے پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم نئی عمارت کی تعمیر کیلئے عطا کی۔ مولوی نظام الدین جھجھری کی خدمات بھی اس سلسلے میں ناقابل فراموش ہیں۔ 1914ء میں ندوۃ العلماء نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ مولوی مسعود علی ندوی کی کوشش سے نئے کیمپس میں بڑی شاندار مسجد تعمیر ہوئی جو ادارے کے اساتذہ اور طلبہ کی دینداری کا مظہر ہے۔ (محمد اسلم، پروفیسر (س ن) ص 164)

دارالعلوم کی زمین کے حصول اور عمارت کے سرمایہ کی فراہمی میں مولانا شبلی کی سعی و تدبیر کو بڑا دخل ہے۔ دارالعلوم کے مصارف کیلئے انہوں نے والیان ملک اور روسا قوم کو متوجہ کیا اور بڑی بڑی رقمیں حاصل کیں۔ اس کیلئے انہوں نے خطوط بھی لکھے اور دورے بھی کیے (شبلی نعمانی، مولانا 1938ء جلد ہفتم، ص 78)۔ 1908ء میں گورنمنٹ نے پانچ سو روپے ماہوار کی امداد مدرسہ کی دنیاوی تعلیم کیلئے منظور کی۔ بھوپال اور بعض ریاستوں سے ماہانہ امدادیں مقرر ہوئیں۔ نامور اساتذہ مثلاً مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا سیّد شیر علی، شیخ محمد طیب کی رام پوری اور مفتی عبداللہ ٹونکی جیسے ماہرین تعلیم قدیم اور اساتذہ فن کا تقرر ہوا۔ دارالعلوم کیلئے گورنمنٹ نے ایک وسیع اراضی عطا کی اور درس گاہ کی تعمیر کیلئے 28 نومبر 1908ء کو ایک شاندار جلسہ سنگ بنیاد منعقد ہوا۔ اس سنگ بنیاد کی رسم سر جان ہیوٹ لیفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ کے ہاتھوں ادا ہوئی۔ ہز ہائی نس آغا خان اور والئی بہاولپور نے سالانہ عطیے مقرر کیے۔ (محمد اسلام، ڈاکٹر 1973ء ص 107)

مفتی احتشام علی کاکوروی ندوۃ العلماء کے قیام میں مولانا محمد علی کے دست راست تھے۔ مفتی صاحب اوران کے ایک بزرگ عزیز مفتی اطہر علی کے اصرار اور تحریک پر ہی ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ان دونوں بزرگوں نے گولہ گنج میں نو ہزار روپے صرف کر کے ایک وسیع عمارت خرید کر مدرسے کیلئے وقف کی۔ یہ عمارت اُن دنوں "خاتون منزل" کے نام سے موسوم تھی۔ قصّہ مختصر یہ کہ "ندوہ" نے مختلف ذرائع سے مالی اعانت وصول کی اس بارے میں اس کا مسلک دیوبند سے مختلف رہا۔ لیکن بحیثیت مجموعی "ندوہ" نے اپنی آزادی کو کسی قیمت پر قربان نہ کیا اور انگریزوں سے معاملے میں اس کا روّیہ بڑی حد تک آزادانہ رہا۔ بلکہ ایک دور تو ایسا بھی گزرا جب وہ سرکار برطانیہ کے عتاب کا نشانہ بنا رہا۔ ایک زمانے میں حکومت نے 500 روپے ماہانہ کی گرانٹ بھی دی لیکن عدم تعاون تحریک کے زمانے میں "ندوہ" نے یہ گرانٹ لینے سے انکار کر دیا۔ (خورشید احمد، پروفیسر (س ن) ص 123)

7.7 مسائل

مولانا محمد علی مونگیری کو سب سے پہلے ندوہ کی ضرورت کا احساس ہوا تھا جوان کی روشن ضمیری اور زمانہ شناسی کا نتیجہ تھا۔ ان ہی کی صاحب اثر شخصیت تھی جس کی بدولت چند برس میں ندوہ کی آواز ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس کام میں برابر لگے رہیں لیکن کچھ کبرسنی (بڑھاپے) اور صحت کی مسلسل خرابی کی وجہ سے ان کو محسوس ہونے لگا کہ وہ اتنی محنت نہ کر سکیں گے جتنی اس کیلئے ضروری ہے۔ ہر چند کہ مولانا حکیم سیّد عبدالحئی ان کے معاون و مددگار تھے اور دفتری کاموں کا سارا بوجھ انہوں نے اپنے سر پر اُٹھالیا تھا۔ مفتی عبداللطیف صاحب بھی پورے طور پر ان کے ارشاد کی تعمیل میں لگے رہتے تھے لیکن اس کے باوجود مولانا محمد علی پر ذہنی اور جسمانی طور پر بہت بوجھ تھا۔ ایک طرف تحریک کی ہمہ گیری تھی، دوسری طرف دارالعلوم کے تعلیمی وتربیتی مسائل تھے۔ ان وجوہ سے انہوں نے خواہش کی کہ نظامت کے بارگراں سے سبکدوش ہو جائیں۔ لوگوں نے عرصہ تک ان کی اس درخواست کو قبول نہیں کیا۔ لیکن جب ان کی مجبوری بہت نمایاں ہو گئی تو بادلِ ناخواستہ 1903ء میں ان کا استعفیٰ منظور کر لیا۔ (عبدالسلام قدوائی ندوی 1976ء، ص 148)

اب سوال یہ تھا کہ اس بارگراں کو کون اُٹھائے۔ یوں تحریک ندوہ کو سربراہی تعطل نے کونا گوں مسائل کا شکار کر دیا۔ اگرچہ مولانا حکیم سیّد عبدالحئی کو اچھا تجربہ تھا۔ ان کی علمی اور عملی صلاحیتیں بھی مسلّم تھیں۔ خاندانی وجاہت اور روحانی اہمیت بھی حاصل تھی لیکن وہ ابھی نوجوان تھے۔ اس کیلئے کسی سنِ رسیدہ، مشہور اور صاحب اثر شخصیت کی ضرورت تھی۔ بالآخر نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کے سابق استاد اور اتالیق مولانا مسیح الزماں خاں ناظم منتخب کئے گئے۔ یہ زمانہ ندوہ کی تاریخ میں بڑی پریشانی کا تھا۔ ایک طرف مولانا محمد علی جیسا ناظم الگ ہو رہا تھا تو دوسری طرف انگریزی حکومت ندوہ سے بدظن تھی۔ سرکاری مخبروں نے یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر انیٹونی میکڈانلڈ کے کان کچھ اس طرح بھرے تھے کہ وہ تحریک

ندوہ کوایک باغیانہ تحریک سمجھنے لگے تھے۔(محمد اکرام شیخ 1982ء ص 188)

انگریز وہابی تحریک سے خائف تھے، ہنٹر کی کتاب کا زہر بھی ان کے دماغ میں بھرا تھا،اس زمانہ میں اتفاق سے لکھنوٴ میں ایک بڑی ہڑتال ہوگئی تھی جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے پس پشت علماء کا ہاتھ ہے، ملک کے بعض حلقے ندوہ کو بھی ایک وہابی نواز تحریک قرار دے رہے تھے،ندوہ نے باہمی اختلاف دور کرنے اور رواداری وخیر سگالی کی فضاء پیدا کرنے کیلئے اپنی کمیٹی میں ممتاز اہل حدیث علماء کو بھی شامل کیا تھا۔ پھر ملک کے اندر طاقتور سیاسی تحریک بھی چل رہی تھی اور انگریزی حکومت سے آزاد ہونے کیلئے دہشت پسند سرگرم کار تھے۔ان وجوہ کی بنا پر حکومت کو ندوہ کی طرف سے بڑی بدگمانی ہوگئی تھی۔اس وقت کی مطلق العنان حکومت کے دبدبے کا ہم صحیح اندازہ تو نہیں کرسکتے لیکن ندوہ کے روداد نگاروں کے جو اجمالی بیانات سامنے آتے ہیں اور جو روایت ندوہ کے کارکنوں سے ہم تک پہنچی، اس سے انگریزوں کی شدید ناگواری کا علم ہوتا ہے۔(شہاب الدین دسنوی 1986ء ص 151)

حالات ایسے سخت تھے کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان سراسیمہ ہوگئے تھے۔مفتی اطہر علی جیسا بااثر شخص بھی لکھنوٴ نہ ٹھہر سکا اور وہ مدینہ ہجرت کرگئے جہاں انتقال کے بعد بقیع میں آسودۂ خاک ہوئے۔ان حالات میں مولانا مسیح الزماں خاں کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے ندوہ کی نظامت قبول کرلی، لیکن وہ اپنی جائیداد کے انتظامات کی بنا پر شاہ جہاں پور چھوڑ نہیں سکتے تھے۔اس لئے طے پایا کہ ندوہ کا دفتر وہیں منتقل کردیا جائے۔لیکن یہ "کشتی درفرنگ وملاح درچین" والا معاملہ تھا۔دارالعلوم لکھنوٴ میں اور دفتر نظامت شاہ جہاں پور میں۔یہ صورتحال کب تک چل سکتی تھی۔اسی طرح دو برس گاڑی گھسیٹی گئی۔بالآخر اس طرح کام ممکن نہ ہوسکا اور 1905ء میں مولانا مسیح الزماں خاں نے استعفیٰ دے دیا۔(محمد اسحاق جلیس ندوی 2003ء ص 279)

اب چونکہ کوئی ایسی بھاری بھرکم شخصیت نہیں تھی جو پورے طور پر نظامات کا بارگراں اُٹھا سکے۔اسلئے ندوہ کے کاموں کو تین شعبوں میں تقسیم کردیا گیا۔

1: دفتری معاملات ومراسلت.................................حکیم سیّد عبدالحئی

2: تعلیم کی دیکھ بھال.................................مولانا شبلی نعمانی

3: مالی معاملات.................................مفتی احتشام علی

مولانا خلیل الرحمٰن، مولانا مسیح الزماں خان کے زمانہ میں نائب ناظم تھے یہ کام بدستور ان کے سپرد رہا۔مولانا خلیل الرحمٰن، حکیم عبدالحئی اور مفتی احتشام علی پہلے ہی لکھنوٴ میں مقیم تھے۔اب مولانا شبلی بھی یہیں آگئے۔مولانا شبلی کی معتمدی نے علمی حیثیت سے ندوہ کا مرتبہ بہت بلند کردیا۔وہ جدید وقدیم تعلیم کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ان کی تصانیف کی سارے ملک میں دھوم تھی۔ملک اور بیرون ملک علمی حلقے ان کی بڑی عزت کرتے تھے اس بنا پر ان کی معتمدی ندوہ کے حق میں بڑی سازگار ثابت ہوئی۔(عبدالسلام قدوائی ندوی 1976ء ص 150)

دارالعلوم ندوہ کی اصل غرض شبلی کی نظر میں یہ تھی کہ اس کی تعلیم وتربیت ایک خاص طرح کی ہو۔یعنی اس کے تعلیم یافتہ طلبہ ادب اور عربیت میں ماہر ہوں۔عقائد اسلام کو جدید فلسفے کے مقابلے میں ثابت کر سکتے ہوں،روشن خیال اور وسیع المعلومات ہوں۔قرآن مجید کے حقائق اور اسرار پر ان کی نظر ہو۔عربی زبان میں تحریر وتقریر کر سکتے ہوں۔افسوس کہ مولانا اپنے اس مشن کو تکمیل کی آخری حد تک نہ پہنچا سکے۔کیونکہ انگریزی زبان کی لازمی تدریس،حکومت کی گرانٹ حاصل کرنے اور نصاب میں جدید مضامین شامل کرنے پر آپ سخت تنقید کا نشانہ بنے اور اس تنقید کا بڑا سبب خود آپ کی ذات تھی۔آپ ہی کی وجہ سے ندوہ علی گڑھ کا حریف بن گیا اور اس شوق میں جدیدیت کی ہر جائز و ناجائز مخالفت شروع ہوگئی۔رائج الوقت اسلامی تعلیم کے نصاب پر بھی آپ نے تنقید کی تھی اس لئے جب ندوہ کا نصاب سامنے آیا تو دارالعلوم دیو بند نے اس پر دل کھول کر تنقید کی۔خود آپ کے ساتھیوں کے ساتھ آپ کے تعلقات درست نہ رہے۔(شبلی نعمانی' مولانا 1941ء'ص 11-15)

1913ء میں مولوی عبدالکریم کا جہاد پر ایک مضمون ادارے کے جریدے الندوہ میں شائع ہوا۔آپ نے سیاسی مصلحت کے تحت مولوی صاحب کو معطل کردیا۔چنانچہ آپ پر چاروں طرف سے تنقید ہوئی۔مسلم گزٹ نے تو آپ کی معطلی کیلئے با قاعدہ تحریک چلائی۔اس سلسلے میں سیّد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:ان کے بہت سے رفقاء اور شرکائے کار کو ان کے متعلق جذبہ تفوق،احساس برتری،دوسروں کی حق تلفی اور تحقیر کا شبہ ہونے لگتا تھا۔جس میں ان کی نیت اور ارادہ کو کم اور ان کے جذبہ و جوش اور طرز گفتگو اور طرز تحریر کو زیادہ دخل تھا۔(شبلی نعمانی'مولانا 1989ء'جلد ہشتم'ص 118)

مولانا شبلی کی مخالفت نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ وہ دل برداشتہ ہوگئے۔اور 19 جولائی 1913ء کو مولانا نے معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔جب اس سے علیحدہ ہوئے تو اپنے دلی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:میرا نصب العین ایک مذہبی عام انجمن ہے،ندوہ ہو سکتا تھا۔لیکن وہ مولویوں میں پھنس گیا اور یہ فرقہ کبھی وسیع الخیال اور بلند ہمت نہیں ہو سکتا ہے۔اس سلسلہ میں ان کے دو شعر بھی قابل توجہ ہیں جن میں ادبی لطافت کے ساتھ شاعرانہ طنز ہے۔

سیارگان چرخ علی گڑھ تھے پیش پیش — جن میں کوئی قمر تھا کوئی آفتاب تھا

ندوہ کہاں،کہاں وہ علی گڑھ کی انجمن — اس بزم قدس میں یہ کہاں باریاب تھا

(محمد اسلام'ڈاکٹر 1973-1974ء،ص 108)

1915ء میں مولانا سیّد عبدالحئی ناظم ندوہ مقرر ہوئے۔ان کے زمانہ میں ندوہ نے خاصی ترقی کی۔اور اس کو خاصہ استحکام حاصل ہوا۔ان کی مرنجاں مرنج طبیعت نے مختلف خیال کے اشخاص کو ندوہ کی خدمت پر متحد کردیا۔طبقہ قدیم نے بھی ان کے ساتھ پورا تعاون کیا۔اس زمانے کے حالات پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو حکیم سیّد عبدالحئی کی دور بینی،زمانہ شناسی، علمی وانتظامی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔پہلی عالمی جنگ زور وشور سے جاری تھی۔اس کی وجہ سے ان دنوں غیر معمولی گرانی اور پریشانی تھی۔پھر وبائی بخار نے سارے ملک کو لرزہ براندام کردیا تھا۔یہ حالات ختم نہ ہونے پائے تھے کہ تحریک خلافت

شروع ہوگئی اور جلیانوالہ باغ کے حوادث نے آزادی کی تحریک کو تیز کردیا۔اس وقت سارے ملک میں ہل چل مچی ہوئی تھی ۔ان حالات میں تعلیم گاہوں کو چلانا آسان کام نہ تھا۔ندوہ سے انگریزی حکومت پہلے ہی ناراض رہ چکی تھی۔جس کو بڑی مشکل سے دور کیا جاسکا تھا۔مگر اب پھر مخالفت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔گورنمنٹ نے دارالعلوم کی زمین اور عمارت کو لے کر دوسرے کالج کو دینے کا ارادہ کرلیا۔اس قیدوبند کے زمانے میں گورنمنٹ کے منشاء کونظر انداز کرنا بڑا مشکل کام تھا۔لیکن حکیم سیّدعبدالحئی کی رہنمائی میں مجلس ندوۃ العلماء نے اس سرکاری تجویز کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔بلآخر گورنمنٹ کی اعانت جو ندوہ کو ملتی تھی اس کے قبول کرنے سے معذرت کردی۔(محمد اسحاق جلیس' ندوی 2003ء ص 191، 214، 224، 259،315-317)

ندوۃ العلماء کے قیام کے ایک سال بعد ہی نکتہ چین افراد نے ندوہ پر نکتہ چینی شروع کردی۔بریلی میں ندوہ کے مخالفین کا ایک خاصا طبقہ موجود تھا۔اس سلسلے میں مولانا احمد رضا خان اور مولانا محمد علی مونگیری میں خط کتابت بھی ہوئی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا بلکہ مخالفت کی آنچ تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ندوۃ العلماء کے لئے ندوۃ الجہلاء کا لفظ وضع کیا گیا۔ندوہ کے وزن پر طرح طرح کی مہذب گالیاں ایجاد کی گئیں اور ان پر رسالوں کے نام رکھے گئے۔ان رسالوں میں بیشتر کے نام "جشوہ، جذوہ، سطوہ، خدوہ" وغیرہ تھے۔اس جنگ میں مولانا احمد رضا خان کے علاوہ مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا نذیر احمد خان رامپوری سب سے پیش پیش تھے۔مولوی وصی احمد، شاہ محمد عبدالصمد، شاہ عبدالوہاب لکھنوی فرنگی محلی وغیرہ بھی ندوہ کے مخالفین میں سے تھے۔ان علماء کے نزدیک ندوۃ العلماء کی بنیاد علی گڑھ کے نیچریوں نے رکھی اور اب اپنے نیچری خیالات اور دلی منصوبوں کو ندوۃ العلماء کے ذریعے پورا کرنا چاہتے تھے۔(محمد الحسنی 'سیّد 1964ء ص 172)

گویا تحریک ندوہ نے اگر کامیابیاں حاصل کیں تو ان کے ساتھ ساتھ تعلیمی، تربیتی، انتظامی، منصبی اور مالی مسائل کا شکار بھی رہی بلکہ تھوڑی سی مدت میں ندوۃ العلماء پر تین ادوار گزرے۔

- پہلا دور اس کے آغاز کا تھا۔جس کے غلغلہ سے دفعتہً تمام ہندوستان گونج اُٹھا۔
- دوسرا دور عہد ظلمت تھا۔جب سیکرٹری ندوہ محمد علی ندوہ کی خدمات سے مستعفی ہوگئے۔
- تیسرا دور 1905ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ ارکان کو یہ حالت دیکھ کر سخت بے چینی پیدا ہوئی۔معتمد دارالعلوم نے ترک تعلقات کرکے خود ندوہ میں سکونت اختیار کرلی، دفتر شاہجہان پور اُٹھ آیا۔مصارف جو آمدنی سے بہت زیادہ تھے، گھٹا کر مداخل کے قریب قریب کردیئے گئے۔(شبلی نعمانی 'مولانا 1989ء جلد ہشتم' ص 110)

7.8 نظام امتحانات و جائزہ

تحریک ندوۃ قدیم نظام تعلیم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ایک کوشش کا نام تھا۔اپریل

1894ء میں مدرسہ فیض عام، کانپور میں علماء کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں تعلیمی مسائل کا جائزہ لے کر یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعلیمی ضرورت پرانے نظام کی اصلاح ہے۔ شروع میں تو یہ کوشش کی گئی کہ تمام اسلامی مدارس ایک نئے نصاب پر متفق ہو جائیں لیکن جب اس میں کامیابی کا امکان زیادہ نظر نہ آیا تو کم از کم ایک ایسا مرکز قائم کرنا طے پایا جہاں نئی اصلاحات کو روبہ کار لایا جا سکے (خورشید احمد، پروفیسر (س ن)، ص 121)۔ اس مقصد کیلئے 1894ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا۔ ندوۃ تحریک کا چونکہ ایک تعلیمی واصلاحی تربیتی مرکز قائم ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس کے لئے نہ صرف نصاب بلکہ ایک مکمل دستور العمل تیار کیا گیا۔ اس دستور العمل میں اس کے مقاصد ونصاب کے بعد طلبہ کے جائزہ کی مکمل تفصیلات درج کی گئیں ۔ لہٰذا اب ہم تحریک ندوہ کے ادارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نظام امتحانات و جائزہ پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس کے لئے ہم سیّد سلیمان ندوی کے تحریر کردہ دستور العمل سے مدد لیتے ہیں جس میں انہوں نے نظام امتحانات وجائزہ کے مکمل قواعد یوں درج کئے ہیں:

- ہر تیسرے مہینہ طلبہ دارالعلوم کا باقاعدہ تحریری امتحان ہوا کرے گا جو خود اساتذہ لیا کریں گے اور اس کے نتائج سے معتمد یا ناظم کو اطلاع دیا کرینگے۔ سالانہ امتحان میں صرف درجہ عالیت کے ممتحن اساتذہ دارالعلوم ہوں گے مگر کوئی استاد اس کتاب کا ممتحن نہ ہوگا جو سال امتحان میں اس کے زیر تعلیم رہی ہو۔
- درجہ فضیلت کی جماعتوں کے امتحان کے واسطے عموماً مشاہیر علمائے ہندوستان میں سے چند اصحاب کا امتحان کیا جائے گا۔
- سہ ماہی امتحان کی تیاری کیلئے طلبہ کو کسی قسم کی مہلت نہیں دی جائے گی بلکہ اسباق برابر جاری رہیں گے۔
- کسی امتحان میں کامیابی کے واسطے ضرور ہے کہ ہر مضمون کے امتحان میں خواہ وہ تقریری ہو یا تحریری کم از کم 33فیصدی نمبر حاصل کئے جائیں لیکن درجہ تکمیل کی کامیابی کیلئے 50فیصدی نمبر حاصل کرنے لازمی ہوں گے۔ درجہ ابتدائی، درجہ عالیت اور درجہ فضیلت کے آخری سال کے سوا بقیہ جماعتوں کے ایسے طلبہ کو جنہوں نے کو 33 سے کم لیکن 25یا 25 سے زیادہ نمبر کسی مضمون میں حاصل کئے ہوں، اساتذہ کی سفارش سے مشروط ترقی دی جاسکتی ہے۔
- بلحاظ ایام تعلیم کے جن طلبہ کی سالانہ حاضری کا اوسط 75فیصد سے کم ہوگا یا جو فیل ہوں گے۔ ان کو سالانہ امتحان میں شرکت کا موقع نہ دیا جائیگا اور نہ اوپر کے درجے میں ترقی دی جائے گی۔
- امتحانات کے اوقات اور پرچوں کی تعداد معین کرنا مہتمم کے اختیار میں ہوگا۔
- سالانہ امتحان میں کامیابی کے بغیر کسی طالب علم کو ترقی نہیں دی جائے گی۔
- جو طالب علم بلا کسی عذر کے جس کو مہتمم نے قبول کرلیا ہو شریک سالانہ امتحان نہ ہوگا تو اس کا نام دارالعلوم سے خارج کردیا جائے گا۔

- دارالعلوم کے کسی طالب علم کو یہاں کے زمانہ تعلیم میں کسی دوسری جگہ پڑھنے یا کسی دوسرے امتحان کیلئے تیاری کرنے کی مطلق اجازت نہیں ہے۔
- امتحان سالانہ مقررہ اوقات میں ہوگا۔ کسی درجہ کا امتحان بغیر کسی خاص سبب کے تعطیل کے بعد نہ لیا جائیگا۔ اور نہ کسی ایک طالب علم کا سالانہ امتحان علیحدہ لیا جاسکتا ہے۔
- امتحان کے مصارف کیلئے امتحان سالانہ سے ایک ماہ قبل ہر مستطیع طالب علم سے ایک روپیہ فیس لی جائے گی۔
- غیر مستطیع طلبہ کو خرچہ دارالعلوم ادا کرے گا۔
- کوئی ناکام طالب علم اعداد دوبارہ دیکھنے اور جوڑنے کی تحقیق کی درخواست کرسکتا ہے۔ مگر کاپیوں کے دوبارہ دیکھے جانے کی درخواست نہیں کرسکتا۔
- امتحان کے طلبہ کو کاپیاں خود دارالعلوم مہتمم کے دستخط سے دے گا۔ طالب علم کو باہر سے اپنے ساتھ کسی قسم کے کاغذ لانے کی اجازت نہیں ہے۔
- جو طالب علم امتحان میں کسی بدعنوانی یا خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا مہتمم کو حق ہوگا کہ وہ اس کے جرم کے مطابق 5 نمبر کاٹ لے یا اس پرچہ سے اٹھوا دے یا کوئی اور سزا دے۔
- طلبہ کو امتحان کے نگراں کے احکام کی پوری پوری پابندی کرنی پڑے گی۔

(سلیمان ندوی، مولانا سید 1939ء، ص 21-22)

ان قوانینِ امتحانات سے تحریک ندوہ کا نظام و امتحانات وجائزہ بڑے واضح انداز میں سامنے آتا ہے کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہر تین ماہ بعد تحریری امتحان ہوتا تھا۔ جو کہ ادارے کے اساتذہ لیتے تھے۔ نیز ان امتحانات میں اوقات نامہ بھی جاری رہتا تھا۔ ماسوائے سالانہ امتحان کے۔ پھر سہ ماہی امتحان کا نتیجہ باقاعدہ ناظم تعلیمات تک پہنچا کرتا تھا۔ پھر ایسا استاد اس قسم کے کسی امتحان کا ممتحن نہیں بن سکتا تھا جو زیر امتحان میں کسی مضمون کا خود شاگرد ہو۔ سہ ماہی امتحان کی تیاری کیلئے کسی قسم کی تعطیل نہیں دی جاتی تھی۔ بلکہ امتحان ہوجانے کے بعد باقی وقت میں پڑھائی جاری رہتی تھی۔

امتحان میں کسی مضمون میں کامیابی کے نمبر 33 فیصد ہوتے تھے۔ مگر بعض خصوصی طلبہ کیلئے اگر استاد سمجھے کہ یہ آگے محنت کرنے سے چل سکتے ہیں انہیں 25 فیصد نمبروں پر ہی ترقی دے کر مشروط پاس کردیا جاتا تھا۔ درجہ تکمیل کی کامیابی کیلئے 33 فیصد کی بجائے 50 فیصد نمبر درکار ہوتے تھے۔ طلبہ کو اس وقت سالانہ امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ملتی تھی جب کہ ان کی سالانہ حاضریوں کی اوسط 75 فیصد ہوتی تھی۔ سالانہ امتحان مقررہ وقت پر ہوتے اور مقررہ وقت پر نتائج کا اعلان کرکے اگلی جماعتوں کی پڑھائی شروع کروادی جاتی تھی۔

درجہ فضیلت کا امتحان دارالعلوم کے مدرسین کی بجائے مشاہیر علمائے ہند لیا کرتے تھے۔ سالانہ امتحان پاس کئے بغیر کوئی طالب علم اگلی جماعت میں نہ جاسکتا تھا۔ گویا اصول وضوابط بہت پختہ اور سب کیلئے یکساں تھے۔ اسناد دینے میں

طالب علم کی اپنی محنت کام آتی تھی۔رشوت وسفارش پر اسناد نہیں بانٹی جاتی تھیں۔درس وتدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق کے جائزہ کیلئے بھی مشاہیر ہند وعرب سے مدد لی جاتی تھی۔نقل کے رجحان کے خاتمہ کیلئے امتحانی جوابی کاپی دارالعلوم طلبہ کو خود مہیا کرتا تھا۔کسی قسم کے کاغذ لانے کی طلبہ کو اجازت نہ تھی۔اگر کوئی طالب علم امتحانی قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کرتا تو اس کیلئے جرم کے مطابق سزائیں موجود تھیں۔یعنی لکھے گئے جواب میں سے پانچ نمبر کاٹ لینے، پرچہ سے اٹھوا دینا یا موقعہ محل کے مطابق اور کوئی سزا۔امتحانی پڑتال پر اگر طالب علم کو اعتراض ہوتا تو وہ دوبارہ پڑتال کرانے کی درخواست کر سکتا تھا۔اگر اس کے نمبروں کا میزان غلط ہوتا یا کسی سوال کے نمبر درج نہ کئے ہوتے تو اسے حق حاصل تھا کہ وہ نمبر لگواتا۔البتہ درست میزان اور تمام سوالات کی پڑتال ہوجانے کی صورت میں اس کی درخواست پر کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مولانا محمد اسحاق جلیس ندوی اپنی تصنیف "تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول" میں امتحانات اور جائزہ کے اصول وضوابط درج کرنے کے علاوہ "ندوی طلبہ کا امتحان" اور "نونہالوں کا امتحان" جیسے عنوانات کے تحت دارالعلوم کے سالانہ جلسوں میں طلبہ کے امتحان کے مناظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کس طرح پورے جلسہ عام کے سامنے طلبہ کا امتحان ہوتا تھا اور کامیابی پر نہ صرف طلبہ بلکہ دارالعلوم بھی داد وتحسین کا مستحق قرار پاتا تھا۔(محمد اسحاق جلیس ندوی 2003ء ص 149، 252، 271)

مختصراً یہ کہ نظام امتحانات ایک مضبوط،اصولی اور معیاری نظام تھا۔

7.9 تنقیدی مطالعہ

تحریک ندوہ تحریک دیوبند اور تحریک علی گڑھ کی ایک درمیانی راہ تھی۔اس تحریک کے زیر سرپرستی دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ اسلام کے ایسے داعی وشارح تیار کئے جائیں جو دین حنیف کو جدید دنیا کے سامنے موثر انداز اور جدید اسلوب سے پیش کر سکیں۔ندوہ کو بحمد اللہ اپنے مقاصد میں قابل رشک کامیابی ہوئی اور تھوڑے ہی عرصے میں ایسے علماء تیار ہوئے جو جدید دنیائے اسلام کیلئے قابل تقلید تھے۔ان فضلاء نے اسلامی ادب، علم کلام، تاریخ اور سیرت نبوی ﷺ کے موضوع پر نہایت قیمتی لٹریچر فراہم کیا۔(ضیاءالدین احمد، پروفیسر 1995ء، ص 128)

- تحریک ندوہ کا اوّلین کارنامہ یہ تھا کہ اس نے پرانے نظام تعلیم کی اصلاح کی۔پرانے نصاب میں جو علوم مقصود اصلی ہیں ان کی کتابیں بہت کم اور جو علوم بالواسطہ مقصود ہیں ان کی کتابیں کثرت سے پڑھائی جاتی تھیں۔ندوہ نے اس کی کمی کو نئے نصاب میں دور کرنے کی کوشش کی۔تعبیر،عقائد اور شریعت کے اسرار وحکم کو نصاب میں دور کرنے کی کوشش کی۔تعبیر،عقائد اور شریعت کے اسرار وحکم کو نصاب میں ایک اہم جگہ دی۔ادب اور فن بلاغت پر زیادہ توجہ دی۔نیز یہ کہ فلسفہ جدید اور انگریزی زبان کو شامل نصاب کیا۔صرف ونحو کے مقابلے

میں ادب وانشاء کو زیادہ اہمیت دی۔عربی بول چال کی طرف بھی توجہ دی۔اسطرح ایک نیا نصاب وجود میں آیا،جس میں قدیم کے عدم توازن کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔قدیم کے ساتھ ساتھ جدید کی گنجائش بھی پیدا کی گئی تھی۔(نذیر احمد خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی ڈاکٹر 1987ء،ص 51)

- ندوہ نے علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔(محمد اسلام ڈاکٹر 1973ص 110)
- اس حقیقت سے انکار کرنا مشکل ہے کہ اس ادارے نے لٹریچر کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔اس نے ایسے افراد پیدا کئے جو تحریر و تقریر کی بہترین صلاحیتوں سے مزین تھے۔اس نے اسلامی تہذیب وتمدن پر بیش بہا کتابیں اُردو زبان میں مہیا کیں۔جن سے قوم کے اندر بیداری آئی اور مغرب پر علمی تنقید سے اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی۔بالخصوص اسلامی تاریخ،سیرت اور مختلف اسلامی علوم پر اس ادارے کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔اس ادارے کے بانیوں اور سرپرستوں میں مولانا محمد علی مونگیری،علامہ شبلی نعمانی،مولانا شیروانی اور مولانا عبدالحئی وغیرہ ایسے نام ہیں جو برصغیر میں اسلامی علوم اور تقویٰ وطہارت کا نشان سمجھے جاتے ہیں۔(محمد اسلم،پروفیسر(س ن)ص 166)
- شبلی نعمانی اور سیّد سلیمان ندوی نے جس علم کلام کی بنیاد رکھی۔اس کی تازگی اور شادابی اب بھی باقی ہے۔علامہ کی لازوال تصانیف سیرت النبیﷺ،حجۃ الاسلام،الجـزیة فـی الاسـلام،کتب خانہ اسکندریہ،الفاروق وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔اسی لئے علامہ شبلی کے بارے میں سیّد سلیمان ندوی نے کہا ہے کہ جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلا نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے جنھوں نے مستشرقین کے طریقہ سے ان ہی کے اسلوب پر ان کو جواب دینا شروع کیا اور بتایا کہ اسلام کے فیض و برکت کی فرحت بخش ہواؤں نے دنیا کے علم وتمدن کی بہاروں کو کیسے دوبالا کیا؟ سیّد سلیمان ندوی نے سیرت النبیﷺ کی بقیہ جلدیں مکمل کیں جن میں اسلام کے مکمل نظام کی پوری تفصیل سے وضاحت کی۔خصوصیت سے ساتویں جلد میں اسلام کے نظام حکومت کو نکھارا اور غلبہ اسلام اور اقامت دین کیلئے مسلمانوں کو ابھارنے کی کوشش کی۔اسلئے علامہ اقبالؒ نے ان کے بارے میں یہ شہادت دی تھی کہ: آج ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد،سیّد سلیمان ندوی کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟(عبداللہ فہد فلاحی 1987ء،ص 237-238)
- مولانا شبلی نے ادب صالح کی نئی راہیں نکالیں جن پر گامزن ہو کر ان کے تلامذہ اور دیگر ارباب علم نے علم و ادب کی نہایت مفید خدمات انجام دیں اور ایک ایسا لٹریچر پیدا کیا جس نے ملت اسلامیہ کی ذہنی نشاۃ ثانیہ کی طرح ڈالی۔مرحوم نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کیلئے 1913ء میں ایک علمی ایسوسی ایشن "دارالمصنفین" کے نام سے اعظم گڑھ میں قائم کی۔(شمس الدین محمد 1982ء،ص 1)
- استاد تقی الدین الہلالی والمراکشی نے ندوہ کے طلبہ میں عربی زبان کا صحیح ذوق پیدا کیا۔ندوہ کے فارغ طلبہ نے

عربی تحریر و تقریر کا لوہا ہندوستان سے باہر عرب ممالک سے بھی منوالیا۔ہندوستان کی کسی درسگاہ کیلئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ندوہ اس وصف میں ممتاز ہے۔تصنیف و تالیف کے میدان میں انہوں نے اُردو زبان میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔بلکہ درحقیقت دارالمصنفین اعظم گڑھ کو ندوہ کا ہی تتمہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ندوی قلم کاروں نے سیرت و تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ستائش خدمات انجام دی ہیں۔اُردو داں طبقہ میں ان تصانیف کی بڑی قدر و منزلت ہے۔(سلیمان ندوی،سیّد (س ن)،ص 447)

- سیّد سلیمان ندوی کے دورِ نظامت میں ندوۃ العلماء کے اخلاق و معاشرت میں دین داری اور دینی شعائر کے مزید احترام کا رنگ نمایاں ہوا۔ان کے زمانے میں تعلیمی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاس نے ندوۃ العلماء میں قیام کیا اور وہاں کے اساتذہ و طلبہ کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔(ابوالحسن علی ندوی،مولانا سیّد 1989ء،ص 39)
- ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور طلبہ نے شُدھی تحریک کے زمانے میں مسلمانوں کو مُرتد ہونے سے بچانے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ان کی سعی و کاوش سے ہزارہا مسلمان مرتد ہونے سے بچ گئے۔(محمد اکرام،شیخ 1982ء؛ ص 166)
- تحریکِ ندوہ کا ایک کارنامہ عربی زبان و ادب کے مستقل نصاب اور درسی کتب کی تیاری تھی۔جو خود دارالعلوم کے اساتذہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔دارالعلوم ندوۃ اپنے ابتدائی عہد میں عربی زبان و ادب کی صحیح تعلیم اور ان کی ترقی و ترویج کا علمبردار رہا ہے۔عربی میں تحریری و تقریری قابلیت ندوی فضلاء کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا تھا لیکن عربی زبان و ادب کی تعلیم کیلئے ندوہ کے پاس خود اپنا کوئی نصاب نہ تھا۔زبان آموزی اور ادب کیلئے کچھ کتابیں داخل نصاب تھیں یا مصر کی وہ درسی کتابیں داخل کی گئی تھیں جو وہاں کے سررشتہ تعلیم نے مقامی حالات و ضروریات کے مطابق لکھوائی تھیں اور یہاں کے حالات و ضروریات سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ڈاکٹر سیّد عبدالعلی کے دورِ نظامت میں یہاں عربی کی پہلی کتاب سے لے کر نثر عربی کی آخری کتاب تک ایسا مکمل نصاب تیار ہوگیا جس نے عرب فضلاء اور مصر و شام کے ماہرینِ تعلیم سے بھی دادِ تحسین حاصل کی اور ان میں سے متعدد کتابیں وہاں کی جامعات و مدارس کے نصاب میں داخل کی گئیں۔جو نہ صرف ندوۃ العلماء بلکہ ہندوستان کیلئے شرف و افتخار کا باعث ہے۔(عبدالسلام قدوائی ندوی 1976ء،ص 159)
- ندوہ کی خدمات کا اعتراف برصغیر پاک و ہند کے تمام اکابر نے کیا ہے لیکن ہم صرف رام بابو سکسینہ مصنف تاریخ ادب اردو کے اعتراف کے چند جملے نقل کرتے ہیں۔سکسینہ لکھتا ہے: ندوہ نے یہ بڑا کام کیا کہ علوم عربیہ اور اسلامی تہذیب کو دنیا کے سامنے صحیح طور پر پیش کیا۔قیمتی قلمی اور ہزارہا مفید مطبوعہ کتابیں جمع کر کے ایک اعلیٰ درجے کا کتب خانہ قائم کیا۔قرآن شریف کے انگریزی ترجمے کا کام بھی ہاتھ میں لیا۔مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان کے متعلق جو تاریخی غلطیاں ناواقفیت سے لوگوں میں مشہور ہوگئیں،ان کو رفع کیا۔اسی طرح

مسلمانوں کے قانون وقف ومیراث کے متعلق جو پیچیدہ قانونی مسائل اکثر پیش آجاتے ہیں ان پر روشنی ڈالی۔ اسلامی علوم اور تمدن کا ایک مرکز قائم کیا جس کا اثر ممالکِ دور تک پڑا۔(سکینہ رام بابو (دوسری اشاعت)' ص 429-450)

- پرانی روایات کو قائم رکھتے ہوئے "ندوہ" نے تعلیم کے ساتھ تربیت کا ضروری انتظام کیا طلبہ کیلئے اقامت گاہ بنائی گئی اور استاد و طالب علم کے پرانے رشتے کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔علماء کے باہمی نزاع اور اختلافی مسائل میں ردوکد سے احتراز کی روش اختیار کی گئی۔اختلافی مسائل میں کشادہ نظری اور اعتدال کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔عام مسلمانوں کی اصلاح وفلاح اور ان کے معاملات سے دل چسپی بھی پیش نظر رہی۔ یہاں علوم وفنون کے علاوہ علمی صنائع کی تعلیم بھی تھی۔گو اس پہلو سے عملاً زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔لیکن تعلیم کا یہ وسیع تصور ضرور رہا۔"ندوہ" عملاً بھی جدید اور قدیم دونوں سرچشموں سے سیراب ہوا۔ایک طرف قدیم علماء کا اجتماع اس میں ہوا اور دوسری طرف مولانا شبلی کے ذریعے علی گڑھ اور الازہر یونیورسٹی مصر دونوں سے فیضیاب ہوا۔(خورشید احمد' پروفیسر 1977ء' ص 90)
- "ندوہ" کا ایک اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ علمی وتعلیمی حیثیت سے عالم اسلام سے جڑا رہا۔مصر کے علماء سے براہِ راست استفادہ کیا گیا۔عرب علماء کو تدریس کے لئے بلایا گیا۔"ندوہ" کے اہل قلم سارے عالم اسلام کے ادبی رسائل سے استفادہ بھی کرتے رہے اور ان میں لکھتے بھی رہے۔آج تک "ندوہ" یہ رشتہ قائم کئے ہوئے ہے۔(محمد اسلام' ڈاکٹر 1973ء' ص 107)
- "ندوہ" تعلیم کے ساتھ ساتھ علم وتحقیق کی روایت کا بھی امین رہا۔ندوہ کا ملت کو سب سے بڑا علمی عطیہ سیّد سلیمان ندوی کی ذات گرامی ہے جو اس دور کے چوٹی کے علماء میں سے تھے۔اس کے علاوہ بھی "ندوہ" نے بیسیوں اہل علم قوم کو دیئے۔سچی بات یہ ہے کہ دارالمصنفین ،اعظم گڑھ نے جو عظیم خدمت علوم اسلامیہ،خصوصاً اسلامی تمدن وتاریخ کے میدانوں میں کی ہے،وہ ندوۃ العلماء کی وجہ سے ممکن ہوئی۔اس لئے کہ "ندوہ" ہی کے تیار کردہ افراد نے اس ادارے کو سیراب کیا۔(طفیل احمد' منگلوری 1945ء' ص 178)
- ندوہ نے نصاب تعلیم میں ضروری اصلاح کی،قدیم نصاب میں بہت کچھ بدل دیا،منطق وفلسفہ کی بیکار کتابیں نکل گئیں،تفسیر اور علم وادب کا حصہ زیادہ کردیا،انگریزی زبان کی تعلیم لازمی ہوگئی۔(شبلی نعمانی' مولانا 1938ء' جلد ہفتم،ص 76)

تحریک ندوہ کی یہ خصوصیات اور اس کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے اور یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ تحریک اسلامی کو جو مردان کار ملے ان میں دارالعلوم دیوبند کے مقابلے میں "ندوہ" کے تیار کردہ افراد زیادہ ہیں۔لیکن بحیثیت مجموعی قومی زندگی کے دھارے کو موڑنے میں ندوہ کوئی موثر اور محسوس حصہ ادا نہ کرسکا۔غالباً اس کی وجہ یہ

ہیں:

- ''ندوہ'' قدیم وجدید کے امتزاج کی ایک کوشش تو ضرور ہے لیکن اس کی بہترین اور مناسب ترین کوشش نہیں۔ ''ندوہ'' کے ان ناقدین سے اتفاق نہ کیا جائے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ: ندوہ کی مثال آدھا تیتر اور آدھا بٹیر، جو نہ تیتر رہا اور نہ بٹیر کی ہے۔ تو بھی اس سے انکار مشکل ہے کہ جس نوعیت کی تخلیقی وانقلابی جدوجہد کی ضرورت تھی وہ ''ندوہ'' نہ کرسکا۔ ''ندوہ'' کی پوری تاریخ میں جدوجہد اور انقلابیت کے بجائے ایک ٹھہراؤ اور سکونی کیفیت ہے۔(منظور احمد جاوید 1979ء ص 68)
- ''ندوہ'' نے نصاب کی حد تک تو نئے اور پرانے تقاضوں میں کچھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن زندگی کے رُخ کو موڑنے کیلئے پوری فکر اور تمدن وتہذیب کے پورے نظام کا جو نیا تصور ابھرنا چاہیے تھا، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ جدید تعلیم کے پیچھے ایک پورا تہذیبی نظام موجود تھا۔ پرانی تعلیم کے پیچھے بھی زندگی کا ایک مخصوص تصور پایا جاتا تھا۔ لیکن قدیم وجدید کے امتزاج کی جو کوشش ہورہی تھی، اس کی فکری اور فلسفیانہ بنیادیں موجود نہ تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تعلیم ایک خاص فکر وتہذیب کی نمائندہ اور ایک انقلابی تحریک کا ہراول دستہ ہونے کی بجائے اس پورے ماحول میں ایک اجنبی سی چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تعلیم، معاشرہ پر اپنا کوئی غیر معمولی اور ہمہ گیر اثر نہ ڈال سکی۔ تحریک اسلامی میں ''ندوہ'' کے تیار کردہ افراد کیلئے کشش کا راز بھی یہی ہے کہ اس تحریک نے فکر ونظر اور تہذیب وتمدن کا وہ انقلابی تصور دیا، جو اس نوعیت کی تعلیم کے خلا کو پُر کررہا تھا۔(خورشید احمد، پروفیسر 1977ء ص 90)
- ''ندوہ'' کی تعلیم میں یہ بات پوری طرح ملحوظ نہ رہی کہ اس کے تیار کردہ افراد زندگی کے ایک شعبے میں نہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں نفوذ کرسکیں گے۔ اسلئے ''ندوہ'' نے کچھ علماء ومعلّم تو ضرور دیئے لیکن ایسے افراد تیار نہ کیے جو زندگی کے ہر میدان میں اپنا مقام پیدا کرسکیں۔ ندوہ نے جدید تعلیم کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن اس کا حصہ اتنا کم تھا کہ ندوہ کے طلبہ کی رسائی مغربی علوم کے اصل مآخذ تک نہ ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ ندوہ مغرب سے پورا استفادہ کرسکا اور نہ مغرب کے حقیقی چیلنج کا مقابلہ کرسکے۔(نذیر احمد، خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی ڈاکٹر 1987ء ص 52)
- ندوہ مجموعی طور پر قومی زندگی میں کوئی موثر حصہ ادا نہ کرسکا۔ دیوبند اور علی گڑھ کو جو مقبولیت اپنے اپنے حلقوں میں حاصل ہوئی وہ ندوۃ العلماء کو حاصل نہ ہوسکی۔ جامعہ عباسیہ (موجودہ جامعہ اسلامیہ) بہاولپور کے علاوہ کہیں اس طرز کو اپنایا نہیں گیا۔ ندوہ نے جدید تعلیم کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن اسکا حصہ اتنا کم تھا کہ ندوہ کے طلبہ مغربی علوم سے پوری طرح استفادہ نہ کرسکے۔ چند منفرد ہستیاں البتہ ضرور پیدا کیں جن کی اسلامی خدمات قابل تعریف ہیں۔ اربابِ ندوہ کا دعویٰ تھا کہ وہ قوم کے دونوں بڑے تعلیمی اداروں دیوبند اور علی گڑھ سے اشتراک عمل کریں گے لیکن ندوہ میں دونوں کی مخالفت ہوتی رہی۔ اس لئے بقول شیخ محمد اکرام ندوہ میں نہ جدید (علی گڑھ) کی مادیت آسکی اور نہ قدیم (دیوبند) کی روحانیت اور اس کا روحانی معیار روز بروز گرتا چلا گیا۔(محمد اکرام شیخ 1975ء

ص 193)

— دیوبند اور ندوہ کا یہ فرق رہا کہ اس نے دیوبند کی نسبت "ماڈرن مولوی" پیدا کئے لیکن علی گڑھ کے مقابلے میں یہ ایک متوازن تحریک تھی۔ اس کو جو کامیابی ابتداء میں ہوئی وہ قائم نہ رہ سکی بلکہ شبلی کے بعد وہ پھر کبھی اس سطح پر نہ آسکا۔ اس کے بعد سب سے بڑی وجہ اندرون خانہ کشمکش تھی۔ شدید پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر شبلی کے ساتھیوں کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ علی گڑھ کے واسطے سرکار کے آدمی ہیں اور ندوہ کا اسلامی کردار ختم کرنا چاہتے ہیں۔ شبلی نے اس کا موقعہ خود بھی فراہم کیا۔ اپنی وفات سے پہلے انہوں نے مولانا عبدالماجد دریابادی سے لکھوا کر جو خط چیف سیکرٹری کو بھیجا اس سے اس خیال کو کچھ تقویت ملتی ہے جس میں انگریزی حکومت کیلئے انہوں نے اپنی خدمات گنوائی ہیں۔ (سعید اختر، پروفیسر 1991ء، ص 107)

الختصر ندوہ وہ انقلابی شخصیتیں تیار نہ کر سکا جو جدید اور قدیم کی صحیح معنوں میں جامع ہوں اور علی گڑھ و دیوبند کے درمیان پل کا کام دے سکیں۔ لیکن پھر بھی ندوہ اس دور احیاء کی ایک اہم تحریک ہے اور نئے دور کے تقاضوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ ندوہ کا ذہن تحریک اسلامی کے تقاضوں کو نسبتاً زیادہ سمجھتا ہے۔ اور اس کے زیادہ قریب ہے۔ گویا ندوہ کی تحریک ایک سنگلاخ زمین پر ایک نئی کوشش کے مترادف ہے۔ قدیم و جدید کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں "ندوہ" نے روشنی کی ایک ننھی منی شمع روشن کی، جو ان مہیب تاریکیوں کا سینہ تو نہ چیر سکی لیکن اس نے ان کے خلاف کچھ لمحات کیلئے احتجاج کو وجود ضرور بخشا۔ (خورشید احمد، پروفیسر (س ن) ص 124)

باب ہشتم

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

8.1 پس منظر

ہندوستان میں جدید نظامِ تعلیم کے ارتقاء کو ایک عظیم ڈرامہ کہا جاسکتا ہے۔ڈرامے کی کشمکش قدیم اور جدید کی کشمکش میں پنہاں ہے۔اس ڈرامے کے اداکاروں کو تین ٹولیوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔(1) مشنری (2) شعبۂ تعلیم کے یوریپن افسر (3) ہندوستان کے عوام۔اس ڈرامے کے چھ ایکٹ تھے۔پہلا ایکٹ اٹھارویں صدی کے آغاز سے 1813ء کے چارٹر تک۔دوسرا ایکٹ 1813ء سے شروع ہوکر 1854ء کے ووڈ ایجوکیشن ڈسپیچ (Wood Education Dispatch) پر ختم ہوتا ہے۔یہ زمانہ عام طور پر کشمکش کی شدت اور تعلیمی تجربوں کا زمانہ تھا۔تیسرا ایکٹ 1854ء سے 1900ء تک ہے جب نظام تعلیم پر بہت تیزی کے ساتھ مغربیت چھا گئی۔(ایم۔اے۔عزیز 1965ء ص 21-23)

ڈرامے کے چوتھے ایکٹ کا آغاز ڈائریکٹرز آف پبلک انسٹرکشن کی اس کانفرنس سے ہوا جو 1901ء میں لارڈ کرزن نے شملہ میں بلائی تھی۔یہ ایکٹ 1921ء میں ختم ہوتا ہے جب تعلیم کو ہندوستانی وزیروں کے کنٹرول میں دے دیا گیا۔پانچواں ایکٹ 1921ء سے شروع ہوتا ہے اور اسکا اختتام 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر ہوتا ہے۔جس کی رو سے برطانوی ہند کی گیارہ ریاستوں کو صوبائی خودمختاری ملی۔یہ زمانہ ہندوستانی اختیارات کے تحت ہونے والے ابتدائی تجربات کا زمانہ تھا۔صوبائی خودمختاری اور گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں حکومت کی باگ دوڑ کانگریس میں آنے سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور ڈرامے کا چھٹا ایکٹ شروع ہوا۔(کونار 1968ء ص 1641)

1937ء سے 1940ء کے درمیانی تین برسوں کا مختصر زمانہ تعلیم کی تاریخ میں بڑی مصروفیتوں کا زمانہ رہا۔مدت کے اختصار کے باوجود اس عرصے میں تعلیمی کاموں کیلئے کافی سرمایہ فراہم کیا گیا۔ابتدائی تعلیم کی توسیع، تعلیم کو لازمی بنانے اور بالغوں کی ناخواندگی کو ختم کرنے کی اسکیمیں چلائی گئیں۔واردھا اسکیم کا آغاز ہوا۔دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو کانگریسی وزارتیں مستعفی ہوگئیں۔1940ء سے 1945ء کا عرصہ ایک طرح سے سکوت کا عرصہ تھا۔1946ء میں کانگریسی وزارتیں پھر برسرِ اقتدار آئیں۔تعلیمی توسیع واصلاح کا کام شروع ہوا لیکن شدید سیاسی ہیجان نے تعلیم کی تعمیر نو کے لئے بہت کم گنجائش چھوڑی۔حتیٰ کہ 15 اگست 1947ء کو انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ دیا۔(نوراللہ سیّد او رنائیک 1982ء ص 456)

اس چھ ایکٹ پر مشتمل ڈرامے کے پس منظر میں محض ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور آئینی تاریخ ہی نہیں بلکہ معاصر

انگلستان کی سماجی، سیاسی اور تعلیمی تبدیلیاں بھی شامل ہیں۔ بہت سے تعلیمی ادارے انگلستان کے اداروں کو سامنے رکھ کر قائم کئے گئے۔ ہندوستان میں بہت سے تعلیمی تنازعات انگلستان کی تعلیمی کشمکشوں سے پیدا ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انگلستان کی تعلیمی پالیسی کی بیشتر تبدیلیوں کی بازگشت جلد یا بہ دیر ہندوستان میں سنائی دیتی رہی (ایم۔ اقبال 1967ء؛ ص 55-56)۔ دراصل وکٹورین عہد کے انگریز کو اس بات پر کامل یقین تھا کہ اس کی زبان، اس کا ادب اور اس کی تعلیم کے طریقے دنیا بھر میں سب سے اچھے ہیں اور یہ کہ ہندوستان کیلئے اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ ان کو حرف بہ حرف اپنا لے (محمد میاں' سیّد 1946ء؛ جلد 1 ' ص 21)۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے کے ہندوستانی اپنے اور مغربی تمدن کے تقابل سے کچھ مبہوت سے ہوگئے تھے۔ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ملک کیلئے برطانوی نمونوں کی نقل سے اچھی کوئی دوسری بات نہیں ہوسکتی۔

پھر نئے نظام کے تحت تعلیم پانے والے لڑکے اور لڑکیوں کو سرکاری ملازمتیں ملنے کی سہولت نے اس نظام کو ایک مصنوعی مقبولیت اور اہمیت عطا کردی (خورشید احمد' پروفیسر (س ن)' ص 89)۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر تک قدیمی دیسی نظام تعلیم بالکل ختم سا ہوچکا تھا۔ اس کی جگہ پر ایک ایسا نظام تعلیم مستحکم طور پر قائم ہوا جس کا مقصد انگریزی زبان کے ذریعے مغربی علوم کی اشاعت تھا (ایف۔ ڈبلیو تھامسن 1891ء؛ ص 45)۔ مگر جلد ہی ایک رِدِّعمل شروع ہوا۔ جاپان جیسے ملک کے اچانک عروج نے خصوصاً روس اور جاپان کی جنگ کے خاتمے کے بعد، ہندوستان کی رائے عامہ پر گہرا اثر ڈالا۔ اسے ہندوستان کی تعلیم کی سست رفتار اور غیر اطمینان بخش ترقی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ اسی کے بعد ایک نئی روح بیدار ہوئی۔ 1914ء-1918ء کی جنگ عظیم نے یہ ظاہر کردیا کہ مغربی تمدن میں کوئی بنیادی خرابی ضرور ہے۔ مغربی نمونوں کی تقلید کی افادیت کے بارے میں لوگوں میں شک وشبہ پیدا ہوگیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں نے انگلستان کی حرف بہ حرف تقلید کو ترک کردیا۔ ان میں سے کچھ کوششیں تو سرکاری نظام کے اندر رہ کر ہوئیں جیسے بنارس اور علی گڑھ اور کچھ سرکاری نظام سے الگ رہ کر ہوئیں جیسے وشوا بھارتی اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔ جنوری 1920ء تک ہندوستان کے سیاسی حالات ایک انقلاب کا پیش خیمہ بن چکے تھے۔ خلافت کمیٹی نے مسلمانوں کے سامنے ترکِ موالات کا پروگرام پیش کردیا تھا اور کانگریس نے (Non Co-operation) عدم تعاون کا۔ (www.jmi.nic.in,27-4-2006)

ایک طرف علی برادران اور دوسری طرف گاندھی جی ملک کا دورہ کررہے تھے۔ علی گڑھ کالج کے بہت سے طلبہ کو خلافت تحریک سے گہری دلچسپی تھی۔ نظری طور پر وہ علی برادران کے ہمنوا تھے۔ بعض جوشیلے طالب علم مولانا محمد علی کے پاس پہنچے اور انہیں علی گڑھ آکر طلبہ کو ترک موالات کا پیام دینے کی دعوت دی (شمس الرحمٰن محسنی 1986ء؛ ص 15)۔ مولانا تو خود علی گڑھ کے نظام سے مطمئن نہ تھے۔ انہیں شدید احساس تھا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی بجائے عملاً ایک برطانوی یونیورسٹی بن چکی ہے۔ اس کا نظام انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور جو مسلمان شریک انتظام تھے وہ بالعموم جی حضور تھے (منور ابن صادق

1981ء ص 7-9)۔لہٰذا مولانا نے گاندھی جی سے کہا کہ سرکار سے وابستہ تعلیمی اداروں سے تعلقات منقطع کرنے کا کام علی گڑھ سے شروع کیا جائے۔گاندھی جی کو ساتھ لے کر وہ علی گڑھ پہنچے۔وہاں کے طلبہ کو ترک موالات کا پیام سنایا۔کالج کے کارپردازوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ جلسہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پائے۔یوں طلبہ اپنے رہنماؤں کی دعوت پر لبیک نہ کہہ سکے۔(انصار زاہد خان 1982ء ص 293-295)

بعدازاں ایک پرجوش جلسے میں ذاکر حسین نے جب اپنی لیکچراری سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا تو لوگ کھڑے ہو ہو کر خلوص و صداقت کا امتحان دینے لگے۔وظیفہ لینے والوں نے وظیفہ نہ لینے کا اعلان کیا اور جن کا تعلق علی گڑھ کالج سے کسی حد تک ملازمت کا تھا انہوں نے استعفیٰ کا۔اس کے بعد جیسے جلسے کا رنگ ہی بدل گیا اور یہ تجویز پاس ہوئی کہ کالج سرکار سے تعلق منقطع کرلے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو قوم نوجوانوں کی تعلیم کا دوسرا انتظام کرے۔دو تین دن بعد ذاکر حسین دہلی گئے اور مسلم رہنماؤں کو طلبہ کے اس فیصلے کی اطلاع کردی۔یوں اہل فکر اور سیاسی کام کرنے والوں نے ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد مان لیا کہ علی گڑھ مسلمانوں کے مطالبہ کو ٹھکراتا ہے تو قوم کو اپنے نوجوانوں کا مطالبہ ماننا ہوگا۔(محمد اکرام شیخ 1982ء ص 152-153)

29 اکتوبر 1920ء کو جمعہ کے دن علی گڑھ کالج کے طلبہ اور اساتذہ اس کی مسجد میں جمع ہوئے۔مولانا محمد علی نے دلوں کو گرمادینے والی تقریر کی۔شیخ الہند مولانا محمود حسن بیماری کے باوجود جلسے میں آئے۔ان کا خطبہ استقبالیہ ان کے شاگرد شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔اس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رسم افتتاح کے ذریعے دیوبند اور علی گڑھ کا سنگم ہوگیا۔یہ اس بات کا اعلان تھا کہ ایک طرف تو مسلمان اپنی صدیوں کی ذہنی اور روحانی میراث سے کنارہ کش نہ ہوں گے اور دوسری طرف نئی نسل میں یہ قابلیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ تہذیب و تمدن کے اس خزانے میں جو اسے بزرگوں سے ملا ہے وہ خود اپنی جدوجہد سے اضافہ کرسکے۔(خورشید احمد، پروفیسر (س ن) ص 125)

علی گڑھ کے منتظمین نے جب یہ دیکھا کہ ان کا اقتدار خطرے میں ہے۔جوشیلے طلبہ اور اساتذہ سے اپنی بات منوانا تو درکنار ان کے سامنے اظہار کرنا بھی مشکل ہے۔تو انہوں نے حکام سے مشورے کئے،علی گڑھ کالج کے کارپردازوں کے ہم نوا اپنے سرکاری اور غیر سرکاری فرائض سے چھٹیاں لے کر علی گڑھ کو بچانے کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔طلبہ سے بات نہ منوا سکے تو ان کے والدین کو سمجھایا کہ تمہارے لڑکے کی جان خطرے میں ہے اسے جاکر لے آؤ۔حکومت سے کہا لڑکے باغی ہوگئے ہیں۔پولیس اور فوج بھیجے تاکہ ان پر قابو حاصل کیا جائے۔طلبہ سے چھپ کر ملے۔انہیں ولایت کے وظیفوں کا لالچ دے کر اور نوکری کے سبز باغ دکھا کر ورغلانے کی کوشش کی۔ڈائننگ ہال سے کھانا بند کردیا گیا۔ملک کے بڑے بڑے رہنما قدیم طلبہ (Old Boys) کی عمارت میں مقیم تھے۔سب وہاں جمع ہوتے اور آئندہ کیلئے پروگرام بناتے۔مختلف تجاویز تھیں۔کوئی کہتا اس کالج کو چھوڑ کر دوسرا ادارہ بنایا جائے۔کچھ کی رائے تھی کہ قوم ہمارے ساتھ ہے طلبہ ساتھ دینے کو تیار ہیں لہٰذا علی گڑھ کو ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی شکل دے دینی چاہیے اور کالج کی چار دیواری سے اس وقت تک نہ نکلا جائے جب

تک کہ جبراً نکالے جائیں۔(ذکی احمد، حکیم دہلوی (س ن) ص 238)

کالج والوں کی تمام کوششیں جب اکارت گئیں تو انہوں نے اپنے گرتے ہوئے اقتدار کو پولیس کے ذریعے سنبھالنے کی کوشش کی۔ایک دن صبح سویرے کالج کے چاروں طرف پولیس نے گھیرا ڈال لیا۔پولیس کا ایک افسر مولانا محمد علی کے نام حکم لے کر پہنچا کہ طلبہ کو ساتھ لے کر علی گڑھ کالج کی عمارتوں سے نکل جایئے۔طلبہ کا یہ قافلہ جب کالج سے نکلا جسے وہ اپنے گھر سے زیادہ عزیز رکھتا تھا تو دیکھنے والوں کے دل دہل گئے۔ادھر اُدھر فوج کے سپاہی سنگین لیے ہوئے، بیچ میں طالب علموں کی قطار، سامنے ایک نوجوان ہرا جھنڈا لئے جس پر کلمۂ طیبہ لکھا تھا ساتھ میں مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے اکابر۔نواب محمد اسماعیل خان نے کہیں سے خیموں کا بندوبست کیا۔قافلہ جا کر ان خیموں میں اترا۔صبح سے دوپہر ہوگئی کھانے پکانے کی کس کو ہوش تھی۔ابھی اپنی چھاؤنی میں نہ پہنچے تھے کہ شہر کے لوگ دیگوں میں پکا ہوا کھانا ٹھیلوں پر لادے پولیس کے گھیرے سے بچتے بچاتے پہنچ گئے۔شام کو بھی کھانا شہر سے آیا۔رہنے سہنے کی کافی تکلیف تھی۔جن لوگوں نے یہ تکلیف جھیلی وہ کہتے تھے کہ ایسا لطف کا زمانہ پھر عمر بھر نصیب نہ ہوا۔(شمس الرحمان محسنی 1986ء ص 18)

مولانا محمد علی کے علاوہ دو استاد اور تھے۔مولانا رشید احمد جو سب جماعتوں کو عربی اور فارسی پڑھانے لگے۔ دوسرے حسن محمد حیات۔نومبر کے آخر میں مولانا خواجہ عبدالحئی اور مولوی سیّد محمد شرف الدین بھی آ گئے۔خواجہ عبدالحئی تفسیر پڑھاتے اور مولوی شرف الدین اُردو۔جنوری 1921ء کا مہینہ جامعہ کیلئے مبارک تھا لڑکوں کی تعداد بھی بڑھی اور اساتذہ کی بھی۔مولانا اسلم جیراجپوری، عبدالمجید خواجہ، ڈاکٹر محمد علی شاہ، کے ستا نم، کرپا ندھی، ڈاکٹر محمد عالم، مولانا محمد سورتی اور ڈاکٹر لطیف سعید بھی جامعہ کے سٹاف میں شامل ہوگئے۔اونچے درجے کے طلبہ میں سے سیّد نور اللہ اور ذاکر حسین بھی ابتدائی درجوں کو پڑھانے لگے۔اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی آزاد تعلیمی درسگاہ نے آزاد فضا میں کام کرنا شروع کر دیا۔(محمد مجیب، پروفیسر (س ن) ص 35)

یہ تھی جامعہ ملّیہ اسلامیہ جو 1920ء میں مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں قائم ہوئی۔مولانا ہی اس کے پہلے شیخ الجامعہ تھے (ضیاء الدین احمد، پروفیسر 1995ء ص 129) جبکہ حکیم اجمل خان جامعہ کے پہلے امیر تھے۔ جامعہ کو بہت قابل اساتذہ ملے جن کی فہرست ضمیمہ نمبر 3 (الف) میں درج ہے۔جامعہ ملّیہ اسلامیہ قائم تو علی گڑھ میں ہوئی لیکن 1925ء میں دہلی منتقل ہوگئی۔جہاں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے حسن تدبر اور انتظامی قابلیت سے اس نے دن دُونی رات چوگنی ترقی شروع کر دی (محمد اکرام، شیخ 1963ء ص 145-146)۔اپنے قیام کے پانچ سال بعد یہ درس گاہ دہلی کے اندر اوکھلے میں اپنی مستقل عمارت میں منتقل ہوگئی۔چند ہی برسوں میں اوکھلے کا ویرانہ جیتی جاگتی زندگی میں تبدیل ہو گیا اور جامعہ نے مستقل یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔(رشید احمد، جالندھری ڈاکٹر 1989ء ص 122)

جامعہ کی کارکن مجالس حسب ذیل تھیں:

(1) مجلس اُمناء Board of trusties

مجلس اُمناء انجمن تعلیم ملی کے اراکین پر مشتمل تھی جس کے اراکین کی دو اقسام تھیں۔

(ا) دائمی رکن (ب) معاون رکن

(ا) دائمی رکن، اساتذہ کی جماعت میں سے وہ اصحاب تھے جنھوں نے تحریری عہد کیا تھا کہ وہ بیس/20 سال تک یا تا حیات انجمن تعلیم ملی کی خدمت کریں گے اور کبھی مبلغ ایک سو پچاس (-/150) روپے ماہوار سے زیادہ مشاہرہ اپنی خدمت کا نہیں لیں گے اور تمام قوانین کی پابندی کرتے رہیں گے۔ پہلے دائمی رکن مندرجہ ذیل اساتذہ تھے۔

۔ڈاکٹر ذاکر حسین خان	۔خواجہ عبدالحیٔ	۔مولوی محمد اسلم
۔حافظ فیاض احمد	۔شفیق الرحمٰن قدوائی	۔سعید انصاری
۔ارشاد الحق	۔حامد علی خان	۔برکت علی
۔محمد مجیب		

(ب) سابق اُمناء جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وہ حضرات جنھوں نے چھ سو روپے سالانہ دینے یا دلوانے کا اقرار کیا تھا۔ (شمس الرحمان محسنی 1986ء، ص 56-57)

(2) مجلس انتظامی

انجمن تعلیم ملی کا تمام انتظام سات اشخاص پر مشتمل تھا۔ جو شروع میں یہ تھے۔

- صدر انجمن .... ڈاکٹر مختار احمد انصاری
- معتمد انجمن .... ڈاکٹر ذاکر حسین
- خازن انجمن .... سیٹھ جمنالال بجاج
- اراکین .... مولانا اسلم۔ خواجہ عبدالحیٔ۔ محمد مجیب۔ شفیق الرحمٰن

(3) مجلس تعلیمی

مجلس تعلیمی کے ارکان حسب ذیل تھے۔

- شیخ الجامعہ .... ڈاکٹر ذاکر حسین خان
- مسجل جامعہ (رجسٹرار) .... حافظ فیاض احمد
- صدر نگران دار الاقامہ .... ای جے کیلاٹ
- مہتمم کتب خانہ .... سیّد نذیر نیازی

- ناظم دینیات.........................خواجہ عبدالحیٔ
- صدرالمعلمین.........................ڈاکٹر ذاکر حسین
- اساتذہ و معلمین کے دو نمائندے.........محمد مجیب، کیلاٹ
- مجلس اُمناء کے چار نمائندے.........ڈاکٹر مختار احمد۔ مولانا محمد اسلم۔ مولوی ارشاد الحق۔ سعید انصاری۔
- بیرونی ماہرین تعلیم۔ زیادہ سے زیادہ چار۔ حسب ضرورت۔

(محمد علی جوہر، مولانا 1932ء ص 5-4)

ان مجالس کے علاوہ جامعہ کے پانچ عہدہ دار تھے۔

(4) عہدہ دارانِ جامعہ

- امیر جامعہ.........................پہلے مسیح الملک حافظ حکیم اجمل خاں ان کے بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاری
- شیخ الجامعہ.........................پہلے مولانا محمد علی جوہر، ان کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین خان
- معتمد جامعہ.........................ڈاکٹر ذاکر حسین خان
- خازن جامعہ.........................سیٹھ جمنا لال بجاج
- مُسجّل جامعہ (رجسٹرار).........................حافظ فیاض احمد

(www.jmi.nic.in,27-4-2006)

مندرجہ بالا ویب سائٹ سے حاصل کردہ جامعہ ملیہ کے تمام وائس چانسلرز کا تصویری ریکارڈ ضمیمہ نمبر 3 (ب) میں ملاحظہ فرمائیے۔

8.2 مقاصد تحریک

اسلامی علوم اور ملی مقاصد کو فروغ دینے کے واضح مقصد کے ساتھ یہ جامعہ قائم ہوئی تھی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مختلف افراد سے مشورہ کر کے مولانا محمد علی جوہر نے جو کتابچہ تعارف تالیف کیا تھا، اس میں اس جامعہ کا مقصد یہ مقرر کیا گیا تھا: ہمارا مطمحِ نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں سے ایسے نوجوان پیدا کریں جو نہ صرف حسبِ معیار زمانہ حال، تعلیم و تربیت یافتہ شمار کئے جانے کے مستحق ہوں بلکہ سچے معنوں میں مسلمان بھی ہوں، جن میں اسلام کی روح ہو، جو اپنے مذہب سے اس قدر بہرہ یاب ہوں کہ مبلغین اسلام کی فوج میں، دوسروں کی امداد سے بے نیاز ہو کر، خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس مقصد کیلئے قرآن مجید سے پوری واقفیت حاصل کرنے کو ہم نے اپنی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا

ہے۔(رئیس احمد جعفری 1950ء ص 357)

جامعہ ملّیہ کے بانی ارکان کا خیال تھا کہ اس کیلئے نہ تو انگریز حکومت سے منظوری ہی حاصل کی جائے اور نہ اس کی کوئی امداد قبول کی جائے کیونکہ باعزت خودمختاری کی تکالیف سرپرستی کی قباحتوں سے بہر حال بہتر ہیں۔زیردستی سے کارکنوں کی پرواز میں کوتاہی آجاتی ہے اور شریفانہ بلند ارادوں کا خون ہوجاتا ہے۔چنانچہ اس قومی ادارے کے مقاصد محمد عیسٰی خان کے مطابق مندرجہ ذیل تھے۔

مسلم ثقافت کا احیاء

جامعہ کے تمام تعلیمی عمل کی بنیاد اس مسلم ثقافت پر رکھی جائے جو ہمیں اپنے اسلاف سے ورثے میں ملی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری ثقافتوں میں جو مفید کارآمد باتیں ہیں ان اسے بھی استفادہ کیا جائے۔

تربیتِ کردار

نصابی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ادارے میں اس قسم کا ماحول پیدا کیا جائے جس میں طلبہ کی تمام ذہنی اور جذباتی ضروریات پوری ہوں اور اس طرح ان کے اخلاق کی تعمیر اور کردار کی تربیت ہو۔طلبہ کی شخصیت کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ ان میں ہمت، جرات اور ذمہ داری کی صفات پیدا ہوں۔(محمد عیسٰی خان 1999ء ص 248-249)

ڈاکٹر سیّد عابد حسین (1928ء) کے مطابق جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

- تعلیم و امتحان
- تحقیقات علمی
- اشاعت علوم
- قوم کے نوجوانوں کو کسب معاش کیلئے تیار کرنا

(عابد حسین، ڈاکٹر سیّد 1928ء ص 9)

شیخ الہند مولانا محمود حسن کے افتتاحی خطبے، مسیح الملک اجمل خان اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی چھ مندرجہ ذیل خصوصیات کا ذکر ملتا ہے۔جنہیں اس کے مرکزی مقاصد کا درجہ حاصل ہے۔

- تعلیمی آزادی
- دینی اور دنیاوی علوم کی ہم آہنگی
- اُردو زبان میں تعلیم
- وطن دوستی اور متحدہ قومیت
- صنعت و حرفت
- سادگی کفایت شعاری اور میانہ روی

(شمس الرحمان محسنی 1986ء ص 37)

تعلیمی آزادی

جامعہ کے تاریخی پس منظر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے رہنما اور رہبر برطانوی حکومت کے قائم کیے ہوئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو قوم و ملت کیلئے ناکافی بلکہ بڑی حد تک نقصان دہ اور مضر سمجھتے

تھے۔شیخ الہند کے الفاظ میں وقت کی بڑی اہم ضرورت یہ تھی کہ: مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد ۔کیا باعتبار عقائد وخیالات اور کیا باعتبار اخلاق واعمال واطوار ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں ۔ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں۔ بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہیں، بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اوران عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا تھا۔(لعل احمد تھیم 1973ء ص 127)

دینی اور دنیوی علوم سے ہم آہنگی

بانیانِ جامعہ کے نزدیک دین اور دنیا دو جدا جدا چیزیں نہیں بلکہ دنیا کو صحیح طور پر برتنے کا نام دین ہے۔اس لئے دینی تعلیم کے ساتھ دنیوی علوم پڑھانا بھی مقصد تھا۔دینی اور دنیوی علوم میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا یہ تعلیمی منصوبہ اس منطقی تضاد کو دور کرنا چاہتا تھا جو کبھی دین ودنیا کے جھگڑے کے نام سے، کبھی روح اور مادہ کی جنگ کی صورت میں، کبھی جبر واختیار کی بحث کے پردے میں انسان کی نظر کو حق کا صرف ایک پہلو دکھا کر دوسرے سے محروم کر دیتا ہے۔کبھی عقیدے اور عمل کی لڑائی کی بدولت، کبھی انفرادیت اور اجتماعیت کی پیکار کے بہانے، کبھی عقل اور فطرت کی جنگ کی آڑ میں اخلاقی زندگی کے ایک عنصر پر زور دے کر دوسرے عنصر کی طرف سے بے پرواہ بنا دیتا ہے۔(محمد علی جوہر مولانا 1928ء ص 2)

اُردو کے ذریعے تعلیم

لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے بعد ہندوستان میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم بن گئی ۔ایک غیر ملکی زبان، جس سے طالب علم اچھی طرح واقف نہ تھے تحصیل علوم کا ذریعہ بن جانے سے طلبہ کے راستے میں بڑی رکاوٹیں کھڑی ہوگئیں۔تعلیم دینے کا غیر فطری طریقہ عام تعلیم کے رواج میں سدراہ بن گیا۔ہندوستان کے اسکولوں اور کالجوں کے اکثر طلبہ تعلیم کے معیار میں دوسرے ممالک سے اس ہی لئے پیچھے رہ جاتے کہ ایک اجنبی زبان ذریعہ تعلیم تھی۔بانیانِ جامعہ یہ سمجھتے تھے کہ اُردو مادری زبان کی حیثیت سے ذریعہ تعلیم ہو تو نہ صرف اس سے تعلیمی کمزوریاں دور ہوسکتی ہیں بلکہ ہماری زبان بھی ترقی کرسکتی ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ جامعہ عثمانیہ اور جامعہ ملّیہ میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بعد اُردو کی رفتار ترقی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔(خورشید احمد پروفیسر (س ن)، ص 125)

وطن دوستی اور متحدہ ہندوستانی قومیت

وطن دوستی اور متحدہ ہندوستانی قومیت کی تعلیم جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے تعلیمی مقاصد کا ایک اہم حصّہ تھا۔1921ء میں جامعہ کے پہلے تقسیم اسناد کے موقع پر اپنے صدارتی خطبے میں حکیم اجمل نے کہا: ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا کہ تعلیم وتربیت میں ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے۔اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی پیش نظر ہے۔چنانچہ

اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ جہاں ہندو طلبہ کے لئے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے وہاں مسلمان طلبہ بھی بہت سے ہندو رسوم اور ہندو تہذیب سے نا آشنا نہ رہیں۔ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی تفہیم اور تفہم پر منحصر ہے۔ (شمس الرحمان محسنی 1986ء ص 40)

جامعہ ملّیہ اسلامیہ اپنے طلبہ کے سامنے زندگی کا ایک ایسا نمونہ پیش کرنا چاہتی تھی جو مسلمانوں کی تہذیب کو انسانیت کی عالمگیر تہذیب سے ہم آہنگ بنا سکے۔ جامعہ ملّیہ مذہب کی صحیح تعلیمات اور وطن پرستی میں کسی قسم کا تضاد نہیں مانتی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہندوستانی مسلمان اپنے ملک وقوم کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ عدل ومساوات کے ترقی پذیر نظام کو قائم کرنے میں ان کا حصّہ رہے اور وہ اس سے پوری طرح مستفید ہو سکیں۔ (محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1993ء ب، ص 284)

صنعت وحرفت

سرکاری اسکول اور کالجوں کا مقصد اس سے زیادہ نہ تھا کہ اعلیٰ ومتوسط طبقے کے چند افراد سرکاری نوکریاں پا کر چین وآرام اور فخر ومباہات کی زندگی گزار سکیں۔ ان اداروں میں تعلیم پانے پر اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ ادنیٰ اور متوسط طبقے کے لوگ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اپنی اولاد کو ان میں تعلیم دلائیں۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ وہ حکومت کیلئے ملازم تیار کرے۔ اس کے دروازے سب کیلئے کھلے تھے۔ اس مقصد کے حصول کیلئے ہر طالب علم کیلئے ضروری قرار پایا کہ وہ ایک دستکاری یا حرفہ ضرور سیکھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنی بعد کی زندگی میں وہی پیشہ اختیار کرے جو اس نے اپنی طالب علمی کی زندگی میں سیکھا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ دستکاری اس بات کی ضامن رہے کہ آڑے سے آڑے وقت آنے پر وہ کسی کا دست نگر نہ ہو۔ بوقت ضرورت خود اپنے ہاتھ کے ہنر سے روزی کمائے (محمد علی جوہر مولانا 30۔ اکتوبر 1925ء)۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان یقیناً کسی بھی کاروبار کو بڑے پیمانے پر منظم کر سکتا ہے اگر اُسے دستکاری یا حرفے کے بارے میں عملی جانکاری بھی ہو تو بہت کم سرمایہ سے ایک اچھا خاصا کاروبار چلا سکتا ہے۔ حرفہ اور دستکاری کی تعلیم نوجوان طالب علموں پر ہاتھ کے کام کی عظمت اور اہمیت واضح کرتی ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں اور ہاتھ کا کام کرنے والوں میں جو اجنبیت اور بیگانگی ہے، اس سے وہ دور کی جاسکتی ہے۔ پھر تعلیم یافتہ نوجوان کسی دستکاری یا حرفہ کو اپنا پیشہ بنالیں تو یہ خود اس پیشے کیلئے اچھا ہے۔ تعلیم یافتہ فن کار تقلید محض پر قناعت نہیں کرتا۔ وہ ہر وقت اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ جدت، ایجاد واختراع کے ذریعے اپنے پیشے کی اصلاح کرے اور اسے ترقی دے۔ یہ پیشہ وارانہ تعلیم اگر چہ ٹیکنیکل ایجوکیشن کا بدل نہیں تھا مگر گیارہ یا چودہ سال تک ابتدائی جماعتوں سے کالج تک اگر کوئی طالب علم ہفتہ میں صرف چند گھنٹے صرف کرتا تو اتنا ضرور سیکھ جاتا تھا کہ اپنی کما سکے۔ (محمد علی جوہر مولانا 1924ء، ص 30)

سادگی، کفایت شعاری اور میانہ روی

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ سادگی، کفایت شعاری اور میانہ روی کا طریق

اپنایا جائے۔تا کہ تعلیم کو کم خرچ بنا کر ہر کس وناکس کو تعلیم یافتہ بنانے کا کام سرانجام دیا جاسکے۔اس کے طلبہ اور اساتذہ دونوں میانہ روی اور کفایت شعاری سے زندگی گزارتے تھے۔ان کی کوشش رہتی کہ ان کا لباس صاف ستھرا ہو مگر سادہ اور ان کی غذا نہ صرف مفید بلکہ کم خرچ ہو۔(خورشید احمد،پروفیسر (س ن) ص126)

المختصر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مقاصد درج ذیل تھے۔

- قوم کی نوجوانوں کی جملہ علوم وفنون خصوصاً علوم مشرقی اور اسلامیات میں ایسی تعلیم دینا جوان کے جسمانی،ذہنی اور اخلاقی قوٰی کی تربیت کرے۔ان کی سیرت میں گہرائی،وسعت اور ہم آہنگی پیدا کرکے انہیں اسلامی تمدن کا مفید رکن،ہندوستانی قومیت کا جانباز ہراول دستہ اور اسلام کا سچا خادم بنائے۔
- مسلمانوں کیلئے اسلامی تمدن واسلامی روایات اور دوسرے مذاہب کے طلبہ کیلئے ان کی تمدنی اور مذہبی روایات پیش نظر رہیں۔
- تعلیم کا ایک معیار قائم رکھنے کیلئے امتحان لینا اور سند وتصدیق نامے دینا۔
- قوم کے عام افراد میں مدارس شبینہ،عام لیکچروں اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع سے ابتدائی تعلیم کو رواج دینا۔
- علمی تحقیقات کے ذریعے علم انسانی کے موجودہ ذخیرے میں حتیٰ الامکان اضافہ کرنا۔خصوصاً اسلام کے متعلق خود مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں کو صحیح معلومات بہم پہنچانا۔
- مشرق ومغرب میں ذہنی مفاہمت کی کوشش کرنا اور ان قدیم وجدید علوم میں صحیح امتزاج کرنا جن میں اس کا امکان ہو۔
- علوم کی اشاعت کرکے انہیں انسانی زندگی کیلئے کارآمد بنانا خصوصاً اسلامی تہذیب کے بہترین ثمرات کو ہندوستان کے سامنے پیش کرکے ان سے قومی زندگی کو تازگی اور قوت پہنچانا۔
- اپنے طلبہ کیلئے مفید صنعتوں،حرفتوں اور پیشوں کا انتظام کرنا تاکہ آگے چل کر خودداری اور آزادئ ضمیر کو قائم رکھتے ہوئے کسب ومعاش کرسکیں۔
- ہندوستان میں جو دوسرے مذاہب موجود ہیں۔ان کے مسلّمات اور معتقدات سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا تاکہ علم سے اعتبار پیدا ہو اور اعتبار سے اعتماد کی بنیادیں مضبوط ہوں۔
- تمام مذاہب عالم کے ساتھ رواداری برتنا۔
- ذریعہ تعلیم اُردو زبان ہو لیکن ہندی رسم الخط بھی سکھایا جائے تاکہ مسلمان برادرانِ وطن کے دوش بدوش کام کرسکیں۔ہندی تحریر پڑھ کر اُردو میں جواب لکھ سکیں۔
- تعلیم کا عام ذریعہ ہر منزل میں اُردو زبان ہو لیکن خاص صورتوں میں انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی تعلیم دی جائے۔جو طلبہ اُردو نہیں سمجھتے ان کو ابتداء میں دوسری زبانوں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اُردو سمجھنے کے قابل ہو جائیں۔(شمس الرحمان محسنی 1986ء ص69 وتعدد)

8.3 نصاب

جامعہ ملّیہ میں مدت تعلیم کو مندرجہ ذیل حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر حصّہ تعلیم کا نصاب الگ تھا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل سے واضح ہے۔

(1)۔مکتب (2)۔منزل ابتدائی (3)۔منزل ثانوی (4)۔سندی یا سندِ امتیازی یا منزل اعلیٰ

مکتب

(مدت تعلیم ایک سے دو سال اور بچے کی عمر کے ساتویں سال تک)

منزل ابتدائی کی تعلیم سے قبل بچہ کی تعلیم عموماً پانچویں برس میں خانگی طور پر کسی مکتب یا محلے کی مسجد میں شروع کرادی جاتی تھی۔ یہ تعلیم ناظرہ قرآن پڑھنے اور اُردو یا کسی دوسری ملکی زبان میں ابتدائی نوشت خواند پر مشتمل ہوتی تھی۔ ذیل میں جو نصاب درج ہے اس کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب بچہ عمر کے سات سال پورا کرنے کے بعد ابتدائی مدرسہ میں داخل ہوتا تو اس میں کس درجہ کی استعداد ہوتی تھی۔

پڑھائی: عربی اور اُردو کے قاعدے (عربی کیلئے قادیانی قاعدہ اور اُردو میں انجمن ترقی اُردو کا قاعدہ) قرآن مجید کی آخری چھوٹی چھوٹی سورتوں میں سے 5 سے 10 تک اور ان کا بین السطور ترجمہ اُردو یا کسی دوسری ملکی زبان میں۔

لکھائی: تختی یا کاپی پر لکھنے کی مشق اور چھوٹے چھوٹے جملے بطور املا۔

حساب: گنتی، زبانی جمع، تفریق اور پانچ تک پہاڑے۔

مذہب و اخلاق: استاد طلبہ کو سبق آموز مذہبی اور اخلاقی کہانیاں سناتے۔ یہ کہانیاں اسطرح بیان کی جاتیں کہ بچے الفاظ کا صحیح تلفظ سیکھنے کے ساتھ ساتھ جو اخلاقی سبق دینا مقصود ہوتا سیکھ جاتے۔ قصّے کے دہرانے میں یہ خیال رکھا جاتا کہ بچے کو یہ خیال مطلق نہ آئے کہ اس سے یہ کام جبریہ یا حکماً لیا جارہا ہے۔ جامعہ میں جرمنی کے مشہور و معروف طریقہ تعلیم کنڈر گارٹن کے مطابق پڑھانے کا انتظام کیا گیا۔ (محمد علی جوہر مولانا 1920ء ص 2)

منزل ابتدائی

(مدت تعلیم 5 سال، عمر کے آٹھویں سال سے بارہویں سال کے اختتام تک)

قرآن شریف: کل قرآن مجید ناظرہ مع ترجمہ بین السطور اُردو یا کسی دوسری ملکی زبان میں۔ چند منتخب آیات اور چھوٹی چھوٹی سورتیں حفظ کرائی جاتیں جن کی مجموعی مقدار کل کتاب اللہ کا 1/30 ہوتا۔

ابتدائی مسائل: طہارت ونماز (بشمول نماز جنازہ، نماز عیدین وغیرہ) کے متعلق عملی اور زبانی تعلیم۔

حساب: علم الحساب اربعہ متناسبہ تک، سود، رقبہ نکالنا۔ سوالات ایسے سادہ اور سہل دیئے جاتے جن کی ضرورت گاؤں یا شہر کے لڑکوں کو روزانہ عملی زندگی میں پڑتی تھی۔

- ذہنی حساب: ابتدائی عملی اقلیدس صرف اس قدر کہ طالب علم ابتدائی مساحت با آسانی سیکھ لے۔
- ابتدائی مساحت
- ابتدائی سیاق: (بہی کھاتہ)

معلومات عامہ: مذکرہ صدر مضامین کے علاوہ تمام دیگر مضامین کی تعلیم ایک خاص سلسلہ کتب کے ذریعے ہوتی جو ذیل پر مشتمل تھی۔

(الف) معلومات مذہبی جس میں عقائد، مسائل فقہ، متعلقہ عبادات، اخلاق و سیرت شامل تھے۔

(ب) ایسے مضامین جن کا انتخاب زبان کی عمدگی اور ادبی خوبی کی وجہ سے کیا گیا۔

(ج) تمام علوم حکمیہ میں ابتدائی اسباق عام فہم زبان میں ایسی صحیح حکمی معلومات قلم بند کی جاتیں جن کا علم دور حاضر میں ہر انسان کیلئے از بس ضروری ہے نیز علوم مذکورہ کی ہر شاخ میں کامل تر معلومات اور زندگی کی عملی تگ و دو میں ان کے بے شمار فوائد کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا تا کہ کمسن طالب علم کے دماغ میں ان علوم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو۔

(د) تاریخ اسلام اور تاریخ ہند نیز ان کا تعلق تحریکات عالم سے۔

(و) ہندوستان کا تفصیلی جغرافیہ اور ممالک اسلامی پر ایک عام نظر اور ان کا تعلق باقی ممالک دنیا سے۔

(ہ) حکومت ہند کے دستور اساسی کا خاکہ۔ ایک ضلع کا انتظام اور شہری کے حقوق و فرائض کے متعلق عام معلومات۔

مادری زبان میں خوشخطی کی مشق: مادری زبان میں عبارت نویسی اور ایسی سہل دستاویزات کا لکھنا جن کی آئے دن گاؤں اور شہر والوں کو ضرورت رہتی ہے۔ مثلاً عرضیاں، پٹہ، بیع نامہ اور مختار نامہ وغیرہ۔

عربی: ابتدائی عربی، عبارت نویسی اور بول چال، قواعد میں طالب علم کی استعداد کا کوئی علیحدہ امتحان نہیں ہوتا تھا سوائے وہ جو عربی عبارت لکھنے سے معلوم ہو جائے۔

اس منزل کی تعلیم حتی الواسع ''منصوبہ کے طریقہ'' (Project method) سے کام لیا جاتا تھا۔ اس طریق تعلیم میں کوشش کی جاتی تھی کہ بچہ کو زندگی کے ہر شعبہ سے دلچسپی اور مناسبت پیدا ہو اور اس کے دل میں قومی وملی روایات زندہ کی جائیں۔ اس منزل کی دستکاری میں مٹی کے آسان نمونہ بنانا، ابری سازی، لفافے بنانا، نواڑ بننا، باغبانی، تکلہ و چرخہ شامل تھے۔ (محمد علی جوہر مولانا 1981ء ص 38-40)

منزل ثانوی

(مدت تعلیم 5 سال، عمر کے تیرھویں سال سے سترھویں سال تک)

اس منزل میں ابتدائی تین سال کی تعلیم ہائی سکول کی تعلیم کے برابر تھی اور اس کے خاتمہ پر جامعہ جونیئر کے نام سے امتحان ہوتا تھا جبکہ آخری دو سال کی تعلیم ایف۔اے کے برابر تھی اور اس کے ختم ہونے پر جامعہ سینئر کا امتحان ہوتا تھا۔

مضامین جامعہ جونیئر

منزل ثانوی کے پہلے تین سال میں حسب ذیل مضامین تھے۔

(1)۔اسلامیات (دینیات مع عربی)......ہندو طلبہ کیلئے ہندو اخلاقیات و سنسکرت (2)۔اُردو مع فارسی

(3)۔ ریاضی (4)۔انگریزی (5)۔تاریخ وجغرافیہ (6)۔سائنس یا ڈرائنگ یا پشتو

دستکاری

مندرجہ بالا مضامین جامعہ جونیئر کے امتحان کیلئے لازمی قرار دیئے گئے تھے ان کے علاوہ نجاری اور چرخہ کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔نجاری میں نقاشی کا کام سکھایا جاتا تھا۔تعلیمی اوقات کے علاوہ اگر کوئی متعلم چھاپہ خانہ کا کام یعنی کتابت، کمپوزیٹری، لیتھو اور ٹائپ کی چھپائی، جلد سازی وغیرہ سیکھنا چاہتا تھا تو اس کا بھی انتظام تھا۔

مضامین جامعہ سینئر

منزل ثانوی کے آخری دو سال میں حسب ذیل مضامین تھے۔جن میں سے تین لازمی تھے اور دو اختیاری۔لازمی مضامین سے مراد یہ تھی کہ ان کا لینا ضروری تھا۔ان سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا تھا جبکہ اختیاری مضامین سے مراد یہ تھی کہ محض ان کے انتخاب کا حق دیا گیا ہے وگرنہ ان میں پاس ہونا ضروری تھا۔

لازمی (1)۔اسلامیات (دینیات مع عربی)
(ہندو طلبہ کیلئے ہندو اخلاقیات اور سنسکرت)
(2)۔اُردو (3)۔انگریزی

اختیاری (الف) (1)۔سائنس (2)۔ریاضی.................یا
(ب) (1)۔عربی یا فارسی یا سنسکرت یا جرمن یا روسی
(2)۔ تاریخ ہند یا تاریخ اسلام یا تاریخ یونان وروما یا تاریخ یورپ یا تاریخ انگلستان یا معاشیات ومعدنیات یا منطق یا ریاضی یا ڈرائنگ اعلیٰ۔ یا
(ج) (ب) کے نمبر 2 میں سے کوئی دو

منزل ثانوی کے آخری دو سال میں داخلہ کے لئے جامعہ جونیئر یا اس کے مساوی کسی امتحان میں کامیابی کی سند پیش کرنا ضروری تھا۔(محمد علی جوہر مولانا 1932ء ص 49-50)

منزل اعلیٰ

درجہ سندی (بی۔اے)

اس منزل میں تعلیم کیلئے دو نصاب تھے۔

(1)۔درجہ معمولی (2)۔درجہ امتیازی (آنرز)

بی۔اے معمولی میں مدت تعلیم دو سال اور بی۔اے امتیازی میں تین سال

نصاب بی۔اے معمولی: سند بی۔اے کیلئے مندرجہ ذیل مضامین تھے جن میں سے دو لازمی اور دو اختیاری مضامین ہوتے تھے۔

لازمی: (1)۔ دینیات (ہندوؤں کیلئے ہندو اخلاقیات) (2)۔انگریزی

اختیاری: ذیل کے مضامین میں سے کسی دو کا انتخاب کرنا تھا۔

(1)۔اُردو (2)۔ عربی (3)۔ فارسی (4)۔ سنسکرت (5)۔انگریزی

(6)۔جرمنی (7)۔فلسفہ (8)۔معاشیات (9)۔معدنیات وسیاسات

(10)۔ تاریخ

نصاب بی اے امتیازی: سند بی اے امتیازی (آنرز) کیلئے دو مضامین تھے، ایک لازمی اور دوسرا اختیاری۔اختیاری مضمون انتخابی حیثیت رکھتا تھا۔اس کا انتخاب ہو جانے کے بعد وہ اس جماعت کا اصلی مضمون شمار ہوتا اور آنرز اسی مضمون میں سمجھا جاتا تھا۔

لازمی: دینیات (ہندوؤں کیلئے ہندو اخلاقیات)

اختیاری: (1)۔اسلامیات (2)۔زبان وادب عربی (3)۔زبان وادب فارسی

(4)۔زبان وادب انگریزی (5)۔ اجتماعیات (6)۔تاریخ (7)۔فلسفہ

نصاب برائے سند

لازمی مضمون: دینیات

تفسیر: سورۃ البقرۃ، آل عمران، انفعال، توبہ، آخری پارہ۔مبادی اُصول تفسیر

حدیث: 500 منتخب احادیث (علاوہ ان احادیث کے جو نصاب تعلیم ثانوی میں شامل تھیں)

فقہ

سیرت

تاریخ: تاریخ خلافت اور تاریخ اسلام ....مختلف خاندان

اختیاری مضامین: مضامین ذیل میں سے کوئی ایک

(1) علوم اسلامی

قرآن مجید،تفسیر،اصول تفسیر

- حدیث: اصول حدیث واسماءالرجال

- عقائد: کلام

- سیرت

- تاریخ اسلام: تاریخ اسلام مع ضروری علم جغرافیہ

جامعہ کا کوئی بھی سندیافتہ مندرجہ بالا مضامین سے کسی ایسے مضمون پر جسے جامعہ نے منظور کیا ہو مزید تحقیق ومطالعہ سے کوئی تصنیف کر کے ڈاکٹریٹ کی سند کا امیدوار ہوسکتا تھا۔

(2) تاریخ

- ہر جگہ تاریخ کے ساتھ ضروری جغرافیہ کا علم بھی شامل متصور ہوتا تھا۔

- تاریخ خلافت اور تاریخ اسلام کا ایک عام خاکہ۔

- تاریخ ہند جس میں ہندوستان کی معاشی تاریخ شامل تھی۔

- تاریخ عالم کا ایک خاکہ۔

- ایشیا یا یورپ کی تاریخ کا مخصوص عہد یا کسی ایک اسلامی ملک یا خاندان کی تاریخ۔

- کسی ایک ملک کی تاریخ حصول حُریت (اس میں وہ ملک یا نسل نہیں لی جاسکتی تھی جو اس سے عین اوپر والی شق میں لی جاچکی ہے)۔

علوم اسلامیہ کی طرح تاریخ میں بھی جامعہ کا سندیافتہ کوئی مقالہ تصنیف کر کے ڈاکٹریٹ کی سند کا امیدوار ہوسکتا تھا۔

(3) اجتماعیات

معاشیات: مباحث اصول ،اصول معاشیات اور معاشی خیالات کے رجحان کی تاریخ ،سکہ ،مبادلہ ، بنک،تجارت بین الاقوام،محاصل ،مالیات نامہ،تجارت ہند کے متعلق اعداد وشمار، بنک،انجمن ہائے امدادِباہمی، اشتراکیت،مزدوروں کی انجمن ہائے اتحادی ،ہندوستانی ریلیں ،نہریں، قحط وآبیاری،طریق مال گزاری، زمین اوران کا تعلق رعایا کی معاشی زندگی سے ،ہندوستانی صنعت وحرفت پر معاشی نظر۔

سیاسیات: سیاسی نظام

مدنیات: اصول مدنیتِ قدیمہ،جدید دستورہائے اساسی اورحکومت ہند،ہندوستان کے متعلق اعداد وشمار (باستثنائے اعدادمتعلقہ تجارت) قانونِ ہند،متعلقہ تحریکات سیاسی ۔

مضامین بالا میں سے کسی ایک پر بھی جامعہ کا سند یافتہ دیگر مضامین کی طرح مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا امیدوار ہو سکتا تھا۔

(4) فلسفہ

اس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے۔

- منطق - مابعد الطبیعات - نفسیات

- اخلاقیات اور مختلف مذاہب کی اخلاقی تعلیم کا موازنہ و مقابلہ

(5) تاریخ فلسفۂ اسلامی

فلسفے کی کسی شاخ میں بھی جامعہ کا سند یافتہ مقالہ لکھ کر فاضل (ڈاکٹریٹ) کی سند حاصل کر سکتا تھا۔

(6) ادب والسنہ

- عربی مع ابتدائی عبرانی - فارسی مع ابتدائی پہلوی

- انگریزی/جدید یورپی زبان - اُردو یا کوئی دوسری ملکی زبان

مادری زبان یا عربی اور فارسی کے علاوہ دو شرقی زبانوں میں دستگاہ مندرجہ بالا السنہ میں سے کسی ایک میں بھی ڈاکٹریٹ کی سند کی وہی شرائط ہیں جو مضامین مذکورہ بالا میں درج ہو چکی ہیں۔ (محمد عبداللہ شکیب 1975ء ص 222-224)

(7) قانون

- قانونِ روما - قانون ایکوٹی (Equity) - اصول قانون - قانون بین الاقوام

قانونِ اساسی اور تاریخ آئین (قدیم، وسطی اور جدید دستورہائے اور اساسی اور ان کی تاریخ)

(ا) ہندوستان کا نافذ اور رسمی قانون

- قانون نافذ - قانونِ تعزیری و ضابطۂ فوجداری - قانونِ معاہدہ و پرچہ

- قانون شہادت - قانونِ مالگزاری - ضابطۂ دیوانی

(ب) قانونِ رسمی

- قانونِ اسلام - قانونِ ہنود - قانون حق شفعہ - پنجاب کا قانون رسمی - مخصوص رسوم

دیگر مضامین کی طرح قانونِ ہنود اور قانونِ اسلام میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی جا سکتی تھی۔

(8) حکمیات

سند کی تعلیم کا معیار ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ایم۔ ایس۔ سی کے مساوی تھا اور اس میں بھی دیگر مضامین کی طرح ڈاکٹریٹ کی سند مل سکتی تھی۔

(9) ریاضیات

سند کی تعلیم کا معیار ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ایم۔ ایس۔ سی کے مساوی تھا۔ اس میں بھی شرائط گذشتہ بالا کے

بموجب ڈاکٹریٹ کی سند مل سکتی ہے۔(محمد علی جوہر مولانا 1981ء ص 44-48)

8.4 حکمتِ تدریس

تعلیم کی چار منزلیں ہوتی ہیں۔

- بنیادی - ابتدائی - ثانوی - اعلیٰ

ان میں سے اعلیٰ تعلیم طالب علم کو اس وقت ملتی ہے جب اس کی سیرت بن چکی ہوتی ہے اور پختہ ہو چکی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ تعلیم محض علمی قدر رکھتی ہے اور طلبہ پر اخلاقی اثر کم ڈالتی ہے۔ تعلیم میں تربیت اور تہذیب نفس کی جو قوتیں ہیں ان کے ظاہر ہونے کا خاص وقت بنیادی، ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا زمانہ ہے جو طلبہ اسکول میں گذارتے ہیں (عابد حسین' ڈاکٹر سیّد 1928ء ص 13'14)۔یہی وجہ ہے کہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ نے تعلیم کیلئے جو حکمتِ تدریس اپنائی اس کے مطابق ابتدائی تعلیم کے میدان میں جماعتی زندگی یا برادری کی طرح مل جُل کر رہنے، کام کے ذریعے تعلیم دینے، شہریت وجمہوریت کی عملی تربیت دینے کیلئے بہت تجربات کئے۔نصابی مضامین کی تعلیم کو دوسری سرگرمیوں کے ساتھ مربوط کرنے کے طریقے دریافت کئے اور یہ معلوم کیا کہ کون کون سے نصابی مضامین کس کس طرح مختلف منصوبوں کے ذریعے پڑھائے جاسکتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم میں جامعہ کی حکمتِ تدریس یہ تھی کہ پڑھانے کے ہر طریقے کو ایک بامقصد کام کے ساتھ ہم آہنگ بنایا جائے۔ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھی تعلیم کے مختلف طریقوں کے ذریعے بچوں کی تعلیم کے بنیادی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔سب سے پہلے تو وہ یہ چاہتے تھے کہ بچوں کی خداداد صلاحیتوں اور قوتوں کو اس طرح ابھارا جائے کہ وہ ان پر، اپنے محرکات عمل پر اور اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھیں۔آہستہ آہستہ اپنی متمدن زندگی کے فرائض اور ذمہ داریوں سے واقفیت حاصل کریں اور ان سے عہدہ برآ ہوسکیں۔وہ چاہتے تھے کہ بچے اپنی فطری اور معاشرتی ماحول سے اجنبی نہ رہیں بلکہ ان میں اس کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا ہو۔جامعہ ملّیہ کی حکمتِ تدریس یہ تھی کہ اس کی زیرنگرانی جو بچے تعلیم وتربیت حاصل کریں وہ تندرست ہوں، ان کی چال ڈھال اچھی ہو، وہ لوگوں سے اچھی صفائی اور فصاحت کے ساتھ بات چیت کرسکیں، ان کی گفتار میں حُسن اور وقار ہو، وہ صاف ستھرے ہوں، سچ بولتے ہوں۔ (طفیل احمد منگوری سیّد (س ن) ص 211)

اُن میں اپنے ماحول میں حسن وخوبی سے لُطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہو اور ان سے حسین اور خوب تر بنانے کی آرزو رکھتے ہوں۔ہمدردی اور اخلاق کی بنیادیں ان کی ابتدائی زندگی میں ایسی استوار رکھی گئی ہوں کہ بڑے ہوکر وہ اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان یعنی کامل انسان بن سکیں۔ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے وہ ساتھی جو ابتدائی تعلیم کے میدان میں تجربات کررہے تھے، جانتے تھے کہ نصابی مضامین کو منطقی ترتیب سے پڑھادینے یا یاد کرادینے سے بچوں کی تعلیم کے بنیادی

ماخذ حاصل نہیں ہو سکتے۔لہٰذا ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے نصاب تعلیم کا ہر گھونٹ بچوں کو اس وقت دیا جائے جب انہیں اس کی ضرورت پیش آئے۔یہ اُسی وقت ممکن ہے جب کسی مقصدی کام یا کسی سرگرمی کے ذریعے تعلیم دی جائے کہ اس کے دوران بچے نصابی مضامین کے وہ اجزاء آسانی سے قبول کرلیتے ہیں جن کی انہیں ضرورت پیش آتی ہے۔(محمد ابراہیم خالد و دیگر 1996ء ص 8-9)

جامعہ کے ابتدائی مدارس میں بتدریج جو طریقے رائج ہوئے وہ تھے۔

- کہانی اور صوتی /آواز کا طریقہ
- منصوبہ بندی کا طریقہ
- بچے کی انفرادی کوشش میں مدد دینے کا طریقہ
- غیر نصابی سرگرمیوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا طریقہ

ذیل میں ان سب طریقوں کی مختصر وضاحت پیش کی جارہی ہے تا کہ جامعہ ملّیہ کی حکمتِ تدریس کا اندازہ ہو سکے جس کی بناپر اسے مقبولیت عام کی سند حاصل ہوگئی۔

کہانی اور آواز کا طریقہ

یہ طریقہ پہلی جماعت کو پڑھنا سکھانے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ایک چھوٹی سی کہانی سنا کر اسے زبانی یاد کرایا جاتا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے ذریعے پڑھنا سکھایا جاتا اور بچے اسے ملا کر لکھتے۔اس طرح کھیل کھیل میں وہ کہانی کے جملے اور لفظ سیکھ جاتے۔اس کے بعد آواز کی مدد سے انہیں حروف پہچاننے کی مشق کرائی جاتی۔(الطاف علی بریلوی سیّد 1995ء ص 57)

منصوبہ بندی کا طریقہ

اساتذہ بچوں کو یہ طے کرنے میں مدد دیتے تھے کہ کسی عنوان پر ایک مقررہ مدت میں معلومات حاصل کر کے ان پر پوسٹرز اور کتابچے تیار کریں پھر ان کی نمائش کریں۔مثلاً اگر کوئی جماعت طے کرتی کہ پرندوں پر ایک پراجیکٹ (Project) چلائے گی تو اس کے مختلف کام بچوں میں تقسیم کردیئے جاتے۔وہ الگ الگ مختلف پرندوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ان پر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتے،پوسٹرز تیار کرتے اور ان کو دیدہ زیب بنانے کیلئے تصویریں بناتے۔اس مقصدی طریقے سے بچے بڑی دل چسپی کے ساتھ پڑھنے لکھنے اور ڈرائنگ وغیرہ کے بہت سے کاموں کی مشق کرلیتے۔

ایسے پراجیکٹ وقتی ہوتے،جیسے پرندہ پراجیکٹ،ہندوستان پراجیکٹ،میلاد النبی ﷺ پراجیکٹ وغیرہ وغیرہ۔یہ ایک خاص مدت تک چلتے۔سب کام مکمل ہوجاتا تو اس کی نمائش لگادی جاتی۔بعض پراجیکٹ مستقل ہوتے جیسے بچوں کی دکان،بچوں کا بینک،بچوں کا خوانچہ اور باغبانی وغیرہ۔یہ پورے سال چلتے۔ان کے ذریعے بچے بینک،دکان اور باغبانی جیسے کاموں میں لگ کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور ان کے ذریعے لکھنے پڑھنے اور حساب وغیرہ کی مشق کرتے تھے۔ان کے علاوہ ہر جماعت میں کسی نہ کسی حرفے جیسے پیپر کٹنگ اور ابری بنانے وغیرہ کے پراجیکٹ بھی چلائے

جاتے نیز کوشش کی جاتی کہ حرفے اور نصاب کے دوسرے مضامین میں ربط قائم کیا جائے۔

بچے کی انفرادی کوشش میں مدد دینے کا طریقہ

نصاب کے جو حصے منصوبے کے طریقے سے پورے نہیں ہو سکتے، ان کو سکھانے کیلئے بچوں کو فرداً فرداً کام دینا پڑتا۔ زیر بحث اسباق پر ایسے سوالات بچوں کو حل کرنے کیلئے دیے جاتے جو انہیں تلاش اور تجسس پر ابھارتے۔ ایسے مواقع فراہم کئے جاتے کہ وہ لغت کا استعمال کریں، اشعار کا انتخاب کریں، تحریر و تقریر کیلئے مختلف کتب کی چھان بین کریں۔ اس قسم کے کاموں میں بچے بہت دل چسپی لیتے۔ یوں ان کی انفرادیت کو ابھرنے کا موقع ملتا۔

غیر نصابی سرگرمیوں کے ذریعے تعلیم دینے کا طریقہ

جامعہ کے ابتدائی مدارس نے روزمرہ کی غیر نصابی سرگرمیوں کو بھی اپنے پروگرام میں بڑی اہمیت دی کہ ان کے ذریعے بچوں پر جماعتی زندگی کے بہت سے پہلو آشکار ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے مل جل کر کام کرنا اور اپنے ماحول کو خوب سے خوب تر بنانا سیکھتے ہیں۔ فرشی اور میدانی کھیلوں، جلسوں اور میلوں کی مشغولیت سے بچوں کو زندگی کی بہت سی ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو وہ اپنی جماعتوں میں نہیں سیکھ سکتے۔ بچوں کی انجمن کے ذریعے تحریر و تقریر کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ مل جُل کر کام کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ اس سے وہ الیکشن کے طور طریقے سیکھتے ہیں۔ اور انہیں جمہوریت کی عملی تربیت کے مواقع مل جاتے ہیں۔ (شمس الرحمان محسنی 1986ء ص 80-81)

جامعہ ملّیہ کے ابتدائی مدارس میں تعلیم کے مقاصد اور منہاج کے بارے میں جو مختلف تجربات کئے گئے اس میں یہ حکمت تدریس پوشیدہ تھی کہ تعلیم کے مختلف طریقوں کو کسی با مقصد کام کے ساتھ مربوط اور ہم آہنگ بنایا جائے۔ جامعہ کی یہ حکمت تدریس اس وقت بہت کام آئی جب گاندھی جی کے "حرفہ کے ذریعے تعلیم" کے خیال کو لے کر ڈاکٹر ذاکر حسین نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم تیاری کی۔ پروفیسر محمد مجیب اپنے ایک مضمون "ذاکر صاحب" میں لکھتے ہیں کہ مجھے جامعہ کے تعلیمی کام کی نوعیت اور معیار کا اندازہ اس وقت ہوا جب نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے چند ماہروں نے جو دنیا کا دورہ کر رہے تھے مجھ سے کہا کہ ہم نے اس سے بہتر کوئی اور مدرسہ نہیں دیکھا۔ یہ لوگ انگلستان سے مختلف ملکوں کا دورہ کرتے ہوئے 1927ء میں ہندوستان پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک سالٹر ڈیویز تھے، انہوں نے اپنی تحریر میں لکھا: مجھے جامعہ ملّیہ کے اسکولوں کو دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میں نے اس سفر میں بہت سے اسکول دیکھے ہیں اور میں بلا جھجک کہتا ہوں کہ کئی لحاظ سے میں نے آپ کے اسکول کو دل چسپ پایا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی مشکلات کے باوجود آپ لوگ تعلیم کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہیں جنہیں عام طور پر تسلیم تو کیا جاتا ہے لیکن ہمارے اسکولوں میں انہیں برتنے میں بہت سست روی سے کام لیا جاتا ہے۔ آپ دراصل انہیں اصولوں پر کام کر رہے ہیں جنہیں میں اپنے وطن کینٹ (انگلستان) میں عمل میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ خدا اس عظیم الشان کام میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کامیاب کرے۔

دوسرے ماہر تعلیم لارن دلیاکس تھے۔ ان کا اعتراف ملاحظہ فرمائیں: جامعہ میں آ کر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور اُن

کے مخلص ساتھیوں سے گفتگو کر کے میں نے محسوس کیا کہ میری زندگی کا یہ بہت ہی فیض بخش اور حوصلہ افزاء تجربہ ہے۔اس ادارہ کے پیچھے جو تصور کارفرما ہے۔اور وہ جذبہ وعمل جس میں یہ تصور ڈھل گیا ہے،اس نے اس ادارے کے کام کو دنیا کی بہترین تعلیمی کوششوں کی صف میں جگہ دی ہے۔(محمد مجیب ؛پروفیسر 1970ء؛ص 50)

تعلیم کا انسانی عنصر محض مدرسہ کے معلموں تک محدود نہیں۔بچوں کو ساری عمر مدرسہ میں نہیں گذارنا بلکہ وہاں سے نکل کر زندگی کے کھلے میدان میں بھی آنا ہے۔ان کی سیرت وکردار کی تکمیل وتوسیع کے لئے محض ان کے اساتذہ کا فیض صحبت ہی کافی نہیں بلکہ انہیں موقعہ ملنا چاہیے کہ اپنے ملک وقوم اور دوسری اقوام کے ایسے برگزیدہ افراد سے ملیں جو تمدن کے مختلف شعبوں میں کمال کے درجہ تک پہنچے ہوں۔ان کے نظری افکار اور عملی زندگی سے استفادہ کریں یہ وہ حکمتِ تدریس ہے جو جامعہ ملّیہ نے اعلیٰ تعلیم کیلئے اپنائی۔منزل اعلیٰ کے طلبہ کیلئے تحقیق کو بنیاد بنایا گیا۔اعلیٰ تعلیمی منزل کے بعد جامعہ کا سندیافتہ مقالہ لکھ کر فاضل (ڈاکٹریٹ) کی سند حاصل کرسکتا تھا۔جامعہ کی حکمت تدریس یہ تھی کہ وہ اساتذہ جو تصنیف وتالیف کی صلاحیت اور اس کا ذوق رکھتے ہیں وہ چند فارغ التحصیل طلبہ اور چند بیرونی فضلاء کے ساتھ مل کر تحقیق کے ذریعے تصنیف وتالیف کا کام سرانجام دیں۔بلکہ اس کام کیلئے جامعہ میں اردو اکادمی قائم کی گئی۔(عابد حسین ؛سید 1928ء؛ص 22)

پھر تحقیق تک ہی کام ختم نہیں کیا گیا۔بلکہ علمی تحقیق کے نتائج سے عام لوگوں کو آگاہ کرنے کیلئے اشاعت علوم پر زور دیا گیا۔اشاعت علوم سے قبل اشاعت علوم کے معنی کی توضیح کی گئی کہ سیاست،مذہب اور علم کی نشر واشاعت کے طریقے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔جامعہ کی حکمت تدریس کے تحت سیاسی خیالات کا ناشر خطابت کی مدد سے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ اوران کے دماغ کو مسحور کرتا ہے۔مذہبی عقائد کا مبلغ اسرارِ معرفت کا جلوہ دکھا کر ان کے دلوں کو موہ لیتا ہے لیکن علمی مسائل کا شائع کرنے والا ان کی عقل سے خطاب کرتا ہے اور انہیں دلائل وبراہین سے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اشاعت علوم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دین اور فن سیاست کے مسائل بھی عام فہم انداز میں عام افراد کے سامنے پیش نہ کردیئے جائیں۔ظاہر ہے کہ یہاں طرز بیان خطیبانہ اور زعیمانہ نہیں بلکہ ناقدانہ ہوگا اور یہ ناگزیر ہے۔ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اشاعتِ علوم آسان کام نہیں ہے۔(خورشید احمد ؛پروفیسر 1977ء؛ ص 91)

ایسی کتابیں جن میں علمی مسائل سے بحث کی جائے لیکن علمی طرز ادا اختیار نہ کیا جائے جن کی زبان عام فہم ہو لیکن بازاری نہ ہو۔جو لوگوں کو معقول کریں لیکن مسحور نہ کریں۔جو ذہنی اور سیاسی اغراض کی محافظ ہوں لیکن پابند نہ ہوں،ہر ایک کا کام نہیں ہے۔اس کیلئے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ایک علم یا مختلف علوم پر اتنا عبور رکھتا ہو کہ اصلاحات کے پردہ کو ہٹا کر معانی کو بے نقاب دیکھ سکے اور دوسروں کو دکھا سکے۔جسے زبان اور طرز ادا پر اتنا قابو ہو کہ مشکل مطلب کو آسان پیرائے میں ادا کرسکے۔جو عوام کی ذہنی ضروریات کا احساس کرسکے اور ان سے محبت وخدمت کو کسرشان نہ سمجھے۔جو اسقدر دیانت دار ہو کہ مذہب وسیاست کے نام سے بے جا فائدہ نہ اُٹھائے۔اشاعت علوم کے سلسلے میں جامعہ ملّیہ کی حکمت تدریس نے

ہندوستان کے اُردودان طبقے میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو عام مقبولیت اور شہرت عطا کی ۔وجہ شہرت جامعہ کے دو ادارے تھے۔ اُردو اکادمی، مکتبہ جامعہ۔ان کے علاوہ اس کے دو رسائل "رسالہ جامعہ" اور "پیامِ تعلیم" (نذیر احمد خواجہ ڈاکٹر، اکبر علی ڈاکٹر 1987ء ص 53)۔ان دونوں رسائل کی تیاری کے علاوہ اُردو اکادمی مندرجہ ذیل کام کرتی تھی۔

- اس کی نگرانی میں یورپ کی معیاری کتب کے ترجمے اور دوسری علمی کتب شائع کی جاتیں تھیں۔
- مکتبہ کے پروگرام کے ماتحت شائع ہونے والی کتابوں کی علمی نگرانی کا کام بھی اُردو اکادمی کے سپرد رہا۔
- اُردو اکادمی ہر سال ایک مقالہ پڑھنے یا لیکچرز دینے کا اہتمام کرتی توسیعی خطبات یا توسیعی لیکچرز دینے کیلئے ہندوستان کے نامور اور مقتدر عالم بلائے جاتے۔کبھی کبھی لیکچرز دینے کیلئے ہندوستان سے باہر کے لوگوں کو بھی بلایا جاتا۔مثلاً ترکی کے مشہور رہنما حسین رؤف بے، جنہوں نے "قدیم اور جدید ترکی" پر چار لیکچرز دیئے۔ترکی کے مشہور عالم بہجت وہبی نے اسلام کے عروج و زوال پر چار تقریریں کیں اور مشہور ترکی عالم خاتون خالدہ ادیب خانم نے مشرق و مغرب کی کشمکش پر آٹھ لیکچرز دیئے ۔ان جلسوں کی صدارت کیلئے ہندوستان کی مشہور و مقبول ہستیوں کو دعوت دی جاتی جیسے علامہ اقبال، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، بھولا بھائی ڈیسائی، مسز سروجنی نائیڈو اور مشہور صوفی عالم بھگوان داس وغیرہ۔(ویب سائٹ جامعہ ملّیہ اسلامیہ 2006-4-27)
- اُردو اکادمی اکثر مسائل حاضرہ میں سے کسی نہ کسی عنوان پر مباحثوں کا بھی انتظام کرتی ان جلسوں میں قرول باغ اور دہلی کے دوسرے علاقوں کے تعلیم یافتہ ہندو، مسلمان مرد و عورتیں سب شریک ہوتے اور ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔
- ہر سال ایک مشاعرہ کا اہتمام بھی اُردو اکادمی کے زیر اہتمام کیا جاتا۔

اُردو اکادمی کے علاوہ اشاعت علوم کیلئے مکتبہ جامعہ قائم تھا۔مکتبہ جامعہ کے پروگرام میں درسی اور غیر درسی کتب شائع کی جاتیں۔جامعہ مکتبہ نے درسی کتب کے میدان میں بڑا کام کیا۔اس نے مختلف صوبوں کے محکمات تعلیم کے لئے درسی کتب تیار کرا کر شائع کیں۔اس کام سے جو تجربات ہوئے ان کی روشنی میں مکتبہ جامعہ نے درسی کتب کا ایک نیا سلسلہ تیار کیا جسے تعلیم کے اکثر محکموں نے اپنے نصاب میں شامل کیا۔(منظور احمد جاوید 1978ء ص 68-69)

یوں جامعہ ملّیہ نے ہر عمر اور ہر منزل کے طالب علم کیلئے الگ حکمتِ تدریس اپنائی جس کے تحت نہ صرف مکتب و منزل ابتدائی کے طلبہ کی تعلیم و تربیت کی مضبوط بنیادیں استوار ہوئیں بلکہ منزل اعلیٰ کے طلبہ کیلئے تحقیق اور اشاعتِ علوم کا بندوبست بھی ٹھوس بنیادوں پر کیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علم و تحقیق اور اشاعت علوم کے علاوہ جامعہ نے طلبہ کو ان کے مذاق اور صلاحیت کے لحاظ سے مختلف پیشوں کیلئے بھی تیار کیا۔

8.5 ہیتِ تعلیم

جامعہ ملّیہ اسلامیہ اپنے قیام کے بعد مختلف حالات سے گزری۔ان حالات میں ہیتِ تعلیم بھی متاثر ہوتا رہا۔لہٰذا مختلف ادوار کی ہیتِ تعلیم الگ الگ بیان کی جاتی ہیں۔

ابتدائی دور کی ہیتِ تعلیم

کئی سال تک جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو ایک ہنگامی دور سے گزرنا پڑا۔خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک اس زمانے میں سب کی توجہات کا مرکز تھی۔اس کے کارپردازوں کو بھی ان سرگرمیوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔نیشنل مسلم ایجوکیشن کی اسکیم تیار ہونے میں ابھی دیر تھی۔اس لئے طے پایا کہ جب تک یہ اسکیم تیار ہو اور اس کی روشنی میں نصاب تعلیم بنائے جائیں، مروجہ تعلیمی نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی رہے۔البتہ اس میں کچھ ضروری اصلاح و ترمیم کرلی جائے۔اس ہنگامی دور میں جامعہ ایک نیم سیاسی جماعت کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔رفتہ رفتہ اس پر سیاسی رنگ کی جگہ تعلیمی رنگ چڑھنے لگا۔ مولانا محمد علی نے مسلمانوں کے قومی اداروں کیلئے تعلیم کا ایک نیا خاکہ تیار کیا، نئے نصاب تعلیم بنائے گئے اور ان پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔

ہنگامی دور کی تعلیمی پالیسی اور ہیتِ تعلیم

22 نومبر 1920ء کو فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسے میں جامعہ کی تعلیمی پالیسی پر غور ہوا جس میں مندرجہ ذیل باتیں طے پائیں۔

- حکیم اجمل خان، مولانا ابوالکلام اور مولانا محمد علی کو اختیار دیا گیا کہ وہ مروجہ نصاب تعلیم میں ضروری ترمیم کرکے اس کا فوراً اعلان کردیں۔
- اہل ہنود کیلئے یونیورسٹی کے دروازے کھلے رہیں۔
- مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے ساتھ ہندوؤں کی مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے۔
- یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ نیچے درجوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہو اور اس کیلئے جامعہ ملّیہ میں ایک اسکول قائم کیا جائے۔
- جامعہ ملّیہ اسلامیہ ملک کے دوسرے اسکول اور کالجوں کا الحاق کرسکتی ہے۔اصولی طور پر یہ پالیسی منظور کی گئی اور مجلس انتظامیہ کو ہدایت دی گئی کہ وہ اس سلسلے کے ضروری قواعد بنائے۔
- ترک موالات کی تحریک میں شریک ہونے والے طلبہ کو 1920ء-1921ء کے تعلیمی سال میں جامعہ کے امتحانات میں پرائیویٹ طور پر شرکت کرنے کی اجازت دی جائے۔(عبدالغفار مدھولی (س ن) ص 32-33)

جامعہ کی رسم افتتاح کے بعد جب طلبہ کے قیام و طعام کے انتظامات مکمل ہوگئے تو علی گڑھ کالج سے ترک موالات

کرنے والے اساتذہ اور اونچے درجے کے طلبہ نے نیچے درجے کے طالب علموں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اونچے درجے کے طلبہ کیلئے ایک کم مدت کورس کا انتظام ہوا جس میں انہیں ترک موالات کے اصول اور طریقہ کار کی تعلیم دی جاتی تا کہ وہ ملک میں دورہ کر کے اس تحریک کی تبلیغ اور اشاعت کر سکیں۔ اس پروگرام کیلئے دیجہ بندی نہ تھی۔ سب طالب علم اس میں شریک نہ ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی، علامہ محمد اقبال کی ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کچھ اس وجد کے ساتھ پڑھتے اور ان کے مطالب کچھ اس انداز سے بیان کرتے کہ طلبہ کے دل میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے حقوق و فرائض کی اہمیت گھر کر جاتی اور وہ اپنے آپ کو جماعتی زندگی میں گم کرنے کیلئے بے قرار پاتے۔

اس پروگرام میں بہت سے سیاسی، مذہبی رہنماؤں کی تقریریں کرائی جاتیں۔ وہ مذہب انسانیت، اخلاق اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کچھ اس طرح روشنی ڈالتے کہ طلبہ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک پر اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کیلئے تیار ہو جاتے۔ چھ مہینے کا یہ کورس کرنے کے بعد طلبہ زندگی کے امتحان میں شامل ہو جاتے، چوغے پہن کر اور کندھوں پر تھیلا ڈال کر ملک کے دورے پر نکل کھڑے ہوتے۔ ان کی مزید تعلیم کا زندگی خود انتظام کرتی۔ جیل خانوں میں جا کر ان کے قلب ونظر میں وسعت پیدا ہوتی اور ذہن و دماغ جلا پاتے۔ جولائی 1921ء کو جامعہ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ عارضی نصاب تعلیم کے ماتحت جو گرمیوں کی چھٹیوں میں شائع ہو گیا تھا، کالج کی تعلیم کے ساتھ ثانوی منزل تک پڑھائی کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ (شمس الرحمان محسنی 1986ء، ص 43)

نیشنل مسلم ایجوکیشن کی اسکیم اور نئی ہیئتِ تعلیم

جب مولانا محمد علی گرفتار کر لئے گئے تو جیل ہی کے قیام میں انہوں نے نیشنل ایجوکیشن کی اسکیم تیار کر لی۔ اس کام کیلئے جامعہ ملّیہ کی مجلس تاسیس نے اپنے پہلے جلسے میں (17) اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ لیکن اکثر اراکین ترکِ موالات کی سرگرمیوں میں اس قدر مشغول تھے کہ کمیٹی کا ایک بھی باقاعدہ جلسہ نہ ہو سکا۔ مولانا محمد علی کو جب کبھی بھی موقعہ ملتا وہ آزاد قومی تعلیمی اداروں کے سربراہوں سے قومی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کرتے۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی مجلس انتظامیہ نے اپنے جلسہ میں نصاب تعلیم کیلئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کے اراکین تھے۔

۔ عبدالمجید خواجہ ۔ ڈاکٹر محمد عالم ۔ خواجہ عبدالحمید ۔ ذاکر حسین خان

اس کمیٹی نے جلد ہی سفارشات مرتب کیں جن کی بنیاد پر مولانا محمد علی نے ایک مفصل اسکیم تیار کر لی۔ اس اسکیم کے دو حصے تھے۔ پہلے حصے میں وہ بنیادی اصول بتائے گئے جن کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے اسلامی اور قومی تعلیم کا نقشہ تیار ہونا چاہیے جبکہ دوسرے حصے میں ابتدائی منزل سے کالج کی منزل تک ہیئتِ تعلیم کے خاکے پیش کئے گئے۔ (محمد علی جوہر مولانا 1981ء، ص 12)

مولانا محمد علی کی اس اسکیم میں نیشنل مسلم ایجوکیشن کے جو بنیادی اصول بتائے گئے ہیں وہ سب جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے ان مقاصد کی تشریح اور وضاحت کرتے ہیں جن کا اس سے پہلے 8.2 کے تحت ذکر کیا جا چکا ہے۔ اُردو کا ذریعہ تعلیم ہونا،

منزل ابتدائی سے کالج تک دستکاری سکھانے کا انتظام، دین ودنیا کی تعلیم، یہ سب اصول جامعہ کے مقاصد (8.2) میں شامل ہیں۔اس اسکیم میں ان مقاصد کی روشنی میں ابتدائی منزل سے کالج تک کی جماعتوں کیلئے نصاب تعلیم تجویز کئے گئے ہیں۔یہاں ان میں سے صرف ان باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو جامعہ ملّیہ کی ہیتِ تعلیم سے متعلق تھیں۔

دینیات کی تعلیم

اس اسکیم کے مطابق دینیات کا پڑھنا، جس میں عربی کی تعلیم بھی شامل تھی ہر طالب علم کیلئے لازمی تھا۔تا کہ تعلیم سے فراغت پاکر جامعہ کا ہر طالب علم اپنے مذہب اور اس کی ضروری تعلیمات سے آگاہ ہو۔عربی میں قرآن پڑھ کر اسے سمجھ سکے۔ان لوگوں کیلئے جو اسلامیات میں امتیاز حاصل کرنا چاہتے ہوں، منزل اعلیٰ میں تین سال کا ایک مخصوص نصاب تعلیم بنایا جائے جس میں قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کی تعلیم دی جاتی۔اس کورس کی تکمیل کرنے کے بعد انہیں اسلامیات میں بی۔اے آنرز کی سند مل جاتی اور مولوی کا رتبہ حاصل ہو جاتا۔اب وہ مذہب اسلام کی تبلیغ کا کام کر سکتے تھے۔(محمد علی جوہر مولانا 9۔جون 1921ء)

اُردو، ہندی اور فارسی کی تعلیم

اُردو اور اس کے ساتھ آسان ہندی و آسان فارسی دونوں مضامین ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں لازمی رکھے گئے۔تا کہ منزل ثانوی کی تعلیم سے فراغت پا کر ہر طالب علم اُردو ادب پر اچھی نظر رکھے۔اسے ہندی اور فارسی سے اتنی واقفیت ہو جائے جو اُردو جاننے کے لئے ضروری ہے۔ہر مضمون اُردو میں پڑھانے کی تجویز تھی اس لئے یہ توقع رکھنا بعید از قیاس نہ تھا کہ منزل اعلیٰ تک پہنچنے سے پہلے ہر طالب علم میں اتنی قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اُردو میں ہر قسم کا کام کر سکے۔جو طالب علم اُردو میں خاص امتیاز حاصل کرنا چاہتے وہ استاد کی نگرانی میں ایک خاص معیار کی کتاب اُردو میں لکھ کر جامعہ سے اُردو میں بی۔اے آنرز کی سند حاصل کر سکتے تھے۔(خورشید احمد، پروفیسر (س ن) ص 125)

ابتدائی منزل اور لازمی تعلیم

نیشنل مسلم ایجوکیشن کی اسکیم میں ابتدائی منزل کے طالب علموں کیلئے سب مضامین کی تعلیم لازمی رکھی گئی تھی جن میں ڈرائنگ اور حرفہ بھی شامل تھے۔دینیات، ریاضی اور اُردو کی تعلیم کیلئے درسی کتب فراہم کرنے کی تجویز تھی۔ دوسرے مضامین میں مثلاً نیچرل سائنس، تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ کیلئے طے کیا گیا تھا کہ انہیں معاون ریڈروں (Suplimentary Readers) کے ذریعے پڑھایا جائے۔یہ ریڈرز طالب علم خود اپنے طور پر پڑھیں۔ ہاں البتہ جماعت میں استاد زبانی طور پر اتنا کچھ بتا دیں جس سے ہر طالب علم میں مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو اور اسے ریڈرز پڑھنے میں مدد ملے۔(محمد علی جوہر مولانا 8۔جنوری 1928ء)

ہر مضمون میں Reader کی تیاری اور لازمی واختیاری مضامین

اسکیم میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ ہر مضمون میں ،ہر درجے کے معیار کے مطابق Readers تیار کی جائیں۔ثانوی منزل میں دینیات ،عربی ،اُردو اور کسی ایک حرفہ کی تعلیم لازمی تھی۔انگریزی ،اُردو، تاریخ، جغرافیہ،سیاسیات،معاشیات،نیچرل سائنس ،ریاضی ،نفسیات اور ڈرائینگ اختیاری مضامین تھے جن میں سے ہر طالب علم کو تین مضمون لینا ہوتے ۔منزل اعلیٰ میں صرف دینیات لازمی تھی ۔طلبہ اسلامیات ،تاریخ، اجتماعیات،فلسفہ،اُردو زبان وادب ،قانون ،سائنس اور ریاضی میں سے کسی ایک مضمون میں بی ۔اے آنرز کر سکتے تھے ۔خیال تھا کہ اس اسکیم کے مطابق بی ۔اے آنرز کر سکتے تھے ۔خیال تھا کہ اس اسکیم کے مطابق بی ۔اے آنرز کا معیار ہندوستان میں دوسری یونیورسٹیوں کے ایم ۔اے سے کسی طرح کم نہ ہوگا۔ایک تو اُردو کے ذریعے تعلیم ہونے کی وجہ سے یہ امید کی جاتی تھی کہ طلبہ ہر مضمون کو آسانی کے ساتھ سیکھ سکیں گے اور اس طرح تعلیم کا معیار لازمی طور پر بڑھ جائے گا۔دوسرے اس اسکیم میں منزل ثانوی کی تعلیم کا معیار انٹرمیڈیٹ کے برابر رکھا گیا تھا۔اس کی مدت تعلیم چھ برس کی ابتدائی تعلیم کے بعد پانچ سال رکھی گئی تھی ۔پھر بی ۔اے آنرز کی تعلیم کے بعد پی ۔ایچ ۔ڈی کے معیار کی تعلیم کا انتظام زیر تجویز تھا۔طالب علم تقریباً 22 برس کی عمر میں پی ۔ایچ ۔ڈی کی ڈگری حاصل کر سکتے تھے ۔(محمد علی جوہر مولانا 1981ء ص 23)

نیشنل مسلم ایجوکیشن اسکیم میں ترمیم

نیشنل مسلم ایجوکیشن کی اسکیم اخبارات میں شائع کردی گئی اور ملک کے ماہرین تعلیم سے ان کی رائے معلوم کی گئی۔ اس سلسلے میں جو آراء حاصل ہوئیں ان کی روشنی میں مجوزہ اسکیم میں ترمیم اور تبدیلی کردی گئی ۔1924ء میں تعلیم کی ہر منزل کیلئے مجلس تعلیمی نے ایک مفصّل نصاب تعلیم منظور کیا۔اس کی خاص باتیں یہ تھیں۔

- مسلمان بچوں کیلئے دینیات اور ہندو بچوں کیلئے ہندو اخلاقیات لازمی تھیں۔
- جو طالب علم زبان اوّل کے طور پر اُردو نہ پڑھنا چاہیں ان کیلئے ہندی کا نصاب منظور کیا گیا تھا۔
- ان طلبہ کیلئے آسان اُردو کا سیکھنا ضروری تھا جو زبان اوّل کی حیثیت سے ہندی پڑھتے تھے۔
- چوتھی جماعت سے انگریزی اور عربی کی تعلیم لازمی تھی ۔جو لوگ زبان اوّل کے طور پر ہندی پڑھتے ان کیلئے عربی کی بجائے سنسکرت کا انتظام تھا۔
- پانچویں جماعت سے ایک حرفہ سیکھنا ضروری تھا۔
- خوش خطی کی تعلیم سب کیلئے لازمی تھی۔

نیشنل مسلم ایجوکیشن کی اسکیم میں صرف بی ۔اے (آنرز) شروع کرنے کی تجویز تھی ۔مجلس نے طے کیا کہ عام بی ۔اے کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے تا کہ جامعہ میں وہ طالب علم بھی تعلیم پا سکیں جن میں کسی مضمون میں امتیاز

حاصل کرنے کی صلاحیت یا شوق نہ ہو۔اس کے علاوہ مجلسِ تعلیمی کی سفارش پر صحافت اور تجارت کے ڈپلومہ کورس بھی شروع کئے گئے۔جن کا اسکیم میں ذکر نہ تھا (عابد حسین' ڈاکٹر سیّد 1928ء ص 48-49)۔اسکیم میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ سب منزلوں میں حرفے کی تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا۔نئے نصاب تعلیم پر عمل شروع ہوا تو قفل سازی، الیکٹرو پلیٹنگ، پالش، کپڑا بننے، جلد سازی، لیتھو اور ٹائپ کی طباعت، تصاویر، لائن اور ہاف ٹون بلاک بنانے، کاپی رائٹنگ، شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کی تعلیم کے انتظامات کئے گئے (محمد علیؔ جوہر مولانا' 16۔جنوری 1928ء)۔اسکول اور کالج کے علاوہ جامعہ میں مندرجہ ذیل شعبہ جات بھی تھے جو ہیت تعلیم کو مزید واضح کرتے ہیں۔

مدرسہ شبینہ

جامعہ ملّیہ کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد خواندہ افراد کی تعداد میں اضافہ کرنا، مزدوری پیشہ اور کاروباری لوگوں کو نوشت وخواند سکھانا، دینیات اور حفظان صحت کی تعلیم دینا بھی تھا۔نادار اور مفلس مسلمان اپنے بچوں کی چھوٹی عمر میں کام دھندے اور مزدوری میں لگا دیتے تھے۔تاکہ ایک بڑے کنبہ کی پرورش میں ان کے چند پیسوں کی کمائی سے بھی مدد ملے۔اس طرح بہت سے ذہن اور ہونہار بچے تعلیم کی برکت سے محروم رہ جاتے تھے اور بالکل وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ان کو صحیح راستہ پر لگانے کیلئے مدرسہ شبینہ کی تجویز اختیار کی گئی۔سب سے پہلے اپریل 1926ء میں قرول باغ میں ایک مدرسہ شبینہ کی بنیاد رکھی گئی جس میں مزدور پیشہ لوگوں کو دینیات، قرآن مجید، اُردو اور حساب کی تعلیم دینی شروع کی گئی۔خدا کے فضل وکرم سے یہ تحریک بہت کامیاب رہی اور جلد ہی سینکڑوں لوگ مدرسہ میں داخل ہو گئے۔

مدرسہ شبینہ میں نہ صرف مفت تعلیم دی جاتی تھی بلکہ کتابیں، روشنائی، کاغذ، قلم، دوات، پنسل وغیرہ بھی جامعہ کی طرف سے مفت فراہم کئے جاتے تھے۔میجک لالٹین کے ذریعے حفظان صحت اور تاریخی واقعات کے متعلق باتیں سمجھائی جاتی تھیں۔تعلیم کیلئے روزانہ ڈیڑھ گھنٹہ کافی خیال کیا جاتا تھا۔ہفتہ میں ایک مرتبہ کشتیاں، کبڈی یا دوڑیں کرائی جاتیں اور جیتنے والوں کو انعامات سے نوازا جاتا۔یوں ان مدرسوں کی تعلیم سے جامعہ ملّیہ کے تعلیمی تحریکی کاموں کا دائرہ نہ صرف وسیع ہوا بلکہ جامعہ ملّیہ تحریک کے اثرات معاشرہ کے عام افراد تک منتقل ہونا شروع ہو گئے۔(محمد علی جوہر مولانا 1932ء ص 74)

تعلیم بالغاں

مدرسہ شبینہ اور تعلیم بالغاں میں کچھ زیادہ فرق نہیں لیکن ان دونوں میں تقسیم کار اور خوش اسلوبی کی غرض سے قدرے فرق کر دیا گیا۔مدرسہ شبینہ میں تو ضروری پیشہ بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی جبکہ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں بستی کے بڑی بڑی عمر کے لوگوں کو دعوت دی جاتی تھی۔ان کے سامنے وعظ کئے جاتے۔حفظانِ صحت اور متعدی

امراض پر لیکچر دیئے جاتے۔ لکھنے پڑھنے کے فوائد بتائے جاتے۔ میلاد شریف کروایا جاتا۔ انبیاء کے قصے اور بزرگان دین کے حالات بیان کئے جاتے۔ ورزشی کھیلوں کے مقابلے کرائے جاتے تھے۔ غرباء میں تنکچر آیوڈین بلیریا مکسچر، جلاب کی گولیاں اور کھانسی وغیرہ کی دوائیں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ گنجائش کے مطابق بعض غرباء کو کمبل بھی دیئے جاتے تھے۔ (ایس۔ آر محسنی (س ن) ص 141)

تعلیم المعلمین

ملک کے مختلف مدارس سے جامعہ کے طلبہ کی بہت زیادہ مانگ آتی تھی لیکن اسے پورا کرنا محال تھا کیونکہ ابھی ابھی تو اپنے طلبہ کی خود جامعہ کو بڑی ضرورت تھی۔ جامعہ سے انکار لکھ دینے کی صورت میں مختلف مدارس کے منتظمین یہ خواہش کرتے کہ ان کے مدرسہ کے اساتذہ کو جامعہ میں چند ماہ ٹھہرنے اور طریق تعلیم دیکھنے کی اجازت دی جائے تا کہ وہ اس سے واقف ہو کر اپنے ہاں جاری کر سکیں۔ چنانچہ جامعہ کی مجلس تعلیم نے "تعلیم المعلمین" کیلئے ملکی و غیر ملکی ماہرین تعلیم کے مشوروں سے ایک نصاب مرتب کیا جس کا پہلا تجربہ اگست 1932ء میں ہوا۔ 10 ماہ کے اس کورس کے اختتام پر باقاعدہ سند جاری کی جاتی تھی۔ یوں تعلیم و تدریس، تحقیق اور اشاعت علوم کے علاوہ جامعہ معلّمین کی تربیت کا کام بھی سرانجام دیتی رہی۔ (محمد علی جوہر مولانا 1932ء ص 65)

خدمت خلق

اس ادارے کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ عوام جامعہ کے تعلیمی مقاصد اور بنی نوع انسان کی خدمت کے جذبے سے آگاہ ہوں۔ چنانچہ شیخ الجامعہ اور جامعہ کے بعض اساتذہ جامعہ کے طلبہ کی معیت میں چھٹی اور فرصت کے دن بستی میں خود اپنے ہاتھوں سے جھاڑو دیتے۔ اینٹ پتھر صاف کرتے۔ کوڑا کرکٹ، انسانی پاخانہ اور گوبر وغیرہ اُٹھا کر دور پھینک کر آتے۔ اس عملی مثال سے بستی کے رہنے والوں کو صاف رہنے کی تعلیم دی جاتی۔

دارالمطالعہ

تعلیم بالغاں کے سلسلے میں ایک دارالمطالعہ بھی قائم کیا گیا جس میں اخبارات و رسائل کے علاوہ اچھی اچھی کتابیں بھی رکھی گئیں۔ جو لوگ پڑھنا جانتے وہ ان سے فائدہ اُٹھاتے۔ گھر لے جا کر پڑھتے جس کیلئے کوئی چندہ یا فیس نہ لی جاتی تھی۔ جو لوگ پڑھنا نہیں جانتے ان کو جمع کر کے کوئی اچھی خبر سنائی جاتی جس سے وہ محظوظ ہوتے۔

انجمن طلبائے سابق

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ کسی درسگاہ کا اصل سرمایہ اس کے سابق طلبہ ہوتے ہیں اور اس کی بہبود کیلئے جو خدمات وہ سرانجام دیتے ہیں وہ اس سرمایہ کا صحیح منافع ہوتا ہے۔ جامعہ ملّیہ کے پرانے طلبہ کی تعداد بھی جب بڑھ گئی تو جامعہ کے مایہ ناز فرزندوں نے جامعہ کے نظام کو درست رکھنے اور ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ اتحاد قائم رکھنے کیلئے ایک انجمن بنائی جو "انجمن طلبائے قدیم" کے نام سے موسوم تھی۔ (فضل احمد فہیم 1973ء ص 129)

اُردو اکادمی:

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کا شعبہء تصنیف وتالیف اُردو اکادمی کہلاتا تھا۔ جو 1920ء سے کام کر رہا تھا۔ اس کے کاموں کی دیکھ بھال کیلئے ایک مجلس عاملہ تھی جسکے ارکان مندرجہ ذیل تھے۔

۔مولانا ابوالکلام آزاد ۔سیّد سلیمان ندوی ۔مولوی عبدالحق

۔ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ڈاکٹر عابد حسین (ناظم اُردو اکادمی)

اُردو اکادمی ہندوستان کی ان علمی انجمنوں اور ناشروں کے ساتھ اتحادِ عمل رکھتی جو اُردو زبان کی خدمت کر رہے ہوتے تھے۔ بلکہ ان کی قابل قدر کتابوں کی اشاعت میں حسب مقدور مدد بھی کرتی تھی۔ اُردو اکادمی کے زیر اہتمام سال میں متعدد بار علمی جلسے ہوتے۔ کبھی کبھی علمی مباحثے بھی ہوتے اور سال میں ایک مرتبہ اعلیٰ پیانہ پر مشاعرہ بھی کیا جاتا تھا۔ (محمد عبداللہ شکیب 1975ء ص 225)

معمل (Labortries)

سائنس کی تعلیم کیلئے جامعہ میں معقول انتظام تھا علم طبیعات اور علم کیمیا کے معمل (لیبارٹریز) موجود تھیں۔ جہاں طلبہ اپنے تجربے اور عملی کام جاری رکھتے تھے۔ بہترین اور جدید ترین خوردبینیں، تصویریں، ارضی اور نباتاتی نمونے جرمنی سے منگوائے گئے جو طلبہ تجربہ گاہوں (معمل) میں کام کرتے انہیں پانچ روپے بطور ضمانت داخل کرنے پڑتے تاکہ وہ غفلت یا غلطی سے دورانِ استعمال کسی چیز کو خراب نہ کریں۔ (محمد علی جوہر مولانا 1920ء ص 7)

کتب خانہ (لائبریری)

جامعہ کا ایک وسیع کتب خانہ علیحدہ مہتمم کے زیر نگرانی قائم تھا جس میں شروع میں 20 ہزار کتب تھیں جن میں بعد ازاں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ کتب خانہ میں نہ صرف کتب بلکہ نادر و قیمتی قلمی نسخے بھی شامل تھے۔ اساتذہ و طلبہ کو جدید علمی ترقیات سے باخبر رکھنے کیلئے کتب خانہ کے زیر انتظام بہت سے رسائل ہندوستان و بیرونی ہند سے منگائے جاتے۔ طلبہ کو کتب خانہ سے فائدہ اُٹھانے کی ترغیب ہی نہیں دلائی جاتی بلکہ انہیں ہر ممکن بہتر سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ (الطاف علی بریلوی سیّد 1995ء ص 59)

مکتبہ جامعہ

جامعہ ملّیہ میں علم دوست اور اُردو سے شوق و دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک مکتبہ (بک ڈپو) بھی قائم تھا۔ جس میں درسی کتب کے علاوہ علمی و تعلیمی ضروریات کی اکثر کتابیں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ اُردو اکادمی جامعہ ملّیہ کی تمام تالیفات، تصانیف کی طباعت و اشاعت کا اہتمام مکتبہ کی زیر نگرانی ہوتا تھا۔ مکتبہ جامعہ ایران، مصر، جرمنی اور انگلستان سے براہِ راست کتابیں منگواتا، انہیں جامعہ ملّیہ اور جامعہ سے باہر سپلائی کرتا۔ گویا مکتبہ جامعہ کاروباری

اصول پر قائم تھا۔اس کی ملک گیر شہرت کا ایک راز یہ تھا کہ اس نے کتابوں کو سلیقے اور خوبصورتی کے ساتھ شائع کرنے کی ظاہری حیثیت کی طرف توجہ کی۔کتابت وطباعت کی پاکیزگی،جلدوں کی نفاست وخوبصورتی،سرورق اور گردپوش کی رنگینی کا معیار قائم کر کے اس نے ہندوستان کے ناشرین کتب کی رہنمائی کا جو کام انجام دیا اسے ملک کے اہل ذوق حضرات نے بہت سراہا۔مکتبہ جامعہ کے دوکام بہت اہم تھے ایک تو وہ شعبہ تصنیف وتالیف کی کتب ورسائل چھاپتا اور دوسرے اس میں طالب علموں کو پرنٹنگ کا کام سکھایا جاتا تھا۔

دوکان اتحاد باہمی

جامعہ میں Co-operative Sotre کھولا گیا۔جس کا تمام انتظام طلبہ کے ہاتھ میں تھا اور نگرانی ایک استاد کی ذمہ داری تھی۔اس دوکان پر طلبہ کی ضروریات کی نہ صرف چیزیں موجود ہوتیں بلکہ ارزاں نرخوں پر ملتی تھیں۔ گویا یہ بھی طلبہ کی تربیت کا ایک ادارہ تھا۔(خالد یار خان 1963ء ص 269-270)

کھیل اور ورزش

اسکول کے طلبہ کیلئے جسمانی ورزش کا انتظام تھا۔کھیلوں میں کبڈی،والی بال،فٹ بال اور ہاکی کا انتظام تھا۔ڈرل اور ورزش لازمی تھی۔جمناسٹک،شناوری اور کشتی بھی بعد ازاں جاری کردی گئیں۔جامعہ ان کھیلوں کیلئے سالانہ اخراجات میں مدد کرتی تھی۔

رسائل:

(الف) ملک میں علمی وادبی مضامین کا صحیح ذوق پیدا کرنے کیلئے ایک ماہانہ رسالہ "جامعہ" کے نام سے شائع کیا جاتا تھا۔جو ملک کے چوٹی کے پرچوں میں شمار ہوتا تھا۔

(ب) جامعہ کے مقاصد کی نشر واشاعت اور اس کے تعلیمی پیغام کو قوم تک پہنچانے کیلئے ایک پندرہ روزہ رسالہ "پیام تعلیم" کے نام سے نکلتا تھا۔جس میں اساتذہ کے علاوہ طلبہ بھی مضامین لکھتے تھے۔یہ رسالہ طلبہ کے علاوہ معلمین کیلئے بھی مفید تھا۔اس رسالہ میں بچوں کیلئے بہت سے انعامات کا اعلان ہوتا رہتا تھا۔

(ج) مکتبہ جامعہ کی طرف سے ایک رسالہ "کتاب نما" ہر ماہ شائع ہوتا تھا۔اس میں علمی کتب پر تفصیل سے بحث کی جاتی تھی۔تازہ مطبوعات اور تصانیف پر صحیح تنقید اس رسالہ کا خاصا تھی۔

(د) جامعہ ملّیہ میں تعلیم کی ہیت کو اس طرح منظم کیا گیا تھا کہ منزل ابتدائی سے ہی طلبہ کو مضمون نگاری اور صحافت کا سلیقہ سکھانے کیلئے توجہ دی جاتی تھی۔اور وہ تیسری چوتھی جماعت سے ہی نہایت عمدہ کتب تصنیف کرنا،مضامین کو ترتیب دینا،قصے کہانیوں کے متعلق موزوں تصاویر بنانا اشتہار دینا،سرورق کو خوبصورت بنانا اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا سیکھ جاتے تھے۔بچوں کے اس قسم کے قلمی پرچوں کو باقاعدہ رسالے میں چھاپا جاتا تھا پھر اس قسم کا ریکارڈ عجائب خانہ میں محفوظ رہتا تھا۔یہی بچے جب

منزل ثانوی میں پہنچتے تو اپنی بزم ادب کے ماتحت ایک قلمی رسالہ نکالتے جس میں علمی، ادبی اورظریفانہ مضامین کے علاوہ تصاویر، قصے، ملک کی اہم خبریں، جامعہ کے متعلق خبریں اور بعض شکایات درج ہوتیں تھیں۔(خالد یارخان 1963ء ص 271)

بیرونی لیکچر

مشہور ماہرین تعلیم، علماء، سیاسی وقومی رہنما اکثرمدعو کیئے جاتے تا کہ وہ طلبہ کے سامنے مختلف علمی اور دوسرے اہم مضامین پر لیکچر دیں۔(محمد علیؔ جوہر مولانا 1920ء ص 6-9)

بزم ادب

مدرسہ کے طلبہ کیلئے ایک انجمن "بزم ادب" کے نام سے قائم تھی جہاں ہر ہفتہ مختلف مباحث پر تقریریں ہوتی تھیں۔

انجمن اتحاد

بزم ادب مدرسہ کے طلبہ کی انجمن تھی۔چونکہ ثانوی پنجم وششم کے طلبہ کالج سے تعلق رکھتے تھے اس لئے انہوں نے بی۔اے کے طلبہ کے ساتھ مل کر علمی وادبی مباحث کیلئے علیحدہ انجمن بنا رکھی تھی جس کا نام "انجمن اتحاد" تھا۔اس انجمن کے جلسے بھی بزم ادب کی طرح ہر ہفتے ہوتے تھے جن میں نہایت عمدہ مضامین پڑھے جاتے، مباحثے ہوتے جو صرف اراکین انجمن کیلئے مخصوص ہوتے تھے۔بعض میں شرکت کیلئے دوسری درسگاہوں کے طلبہ کو بھی دعوت دی جاتی تھی۔انجمن اتحاد کے ماتحت مضمون نویسی کا ایک مقابلہ ہوتا تھا جس میں دوسرے کالجوں کے طلبہ بھی شریک ہوتے تھے۔جو شخص اوّل رہتا اس کو انجمن کی طرف سے پچاس روپے کا ایک تمغہ دیا جاتا تھا۔یہ تمغہ جامعہ کے نائب شیخ الجامعہ عبدالعزیز انصاری غازی پوری بی۔اے، ایل ایل بی، جج ریاست رامپور نے اپنے ایک دوست کی یاد میں "ببوق میڈل" کے نام سے انجمن اتحاد کو عطا فرمایا تھا۔(الطاف علیؔ بریلوی سیّد 1995ء ص 58-59)

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ ملّیہ کا پورا نظام مندرجہ ذیل ماتحت اداروں پر مشتمل تھا۔

- یونیورسٹی/کالج
- ہائی سکول
- پرائمری سکول
- کیمیائی صنعت کا ادارہ
- اشاعتی ادارے

ان اداروں میں ہیئت تعلیم کی صورت حال کیا تھی؟ اوپر تفصیلاً اس کا ذکر آ چکا نیز ہیئت تعلیم کے موثر اظہار کیلئے مختلف شعبہ جات کی معاونت بھی قابل غور تھی۔

8.6 وسائل

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو علی گڑھ سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ 17 مارچ 1925ء کو ہوا۔ مہاتما گاندھی نے کہیں سے ایک سال کے خرچ کا انتظام کردیا۔ مئی جون کی چھٹیوں میں شیخ الجامعہ عبدالمجید خواجہ کی نگرانی میں جامعہ کا سامان دہلی منتقل ہونا شروع ہوگیا۔ قرول باغ جہاں دہلی آنے کی بعد جامعہ تقریباً پندرہ بیس سال رہی، اس زمانے میں پرانے شہر کا غیر آباد سا علاقہ تھا۔ طبیہ کالج کے قریب کئی مکان اور کوٹھیاں کرائے پر لی گئیں۔ ایک بیرک نما عمارت میں ہوسٹل کھلا اور اس میں ہی بیشتر اساتذہ کیلئے رہائشی کمرے تھے۔ اس کے قریب کتب خانہ، دفاتر اور جماعتوں کیلئے تین اور عمارتیں تھیں۔ جن میں سے دو کے ساتھ چند کوٹھریاں تھیں۔ جامعہ کا چھٹا تعلیمی سال ان ہی عمارتوں میں جولائی 1925ء کو شروع ہوا۔ (عبدالغفار مدھولی (س ن) ص 31)

جامعہ دہلی منتقل ہونے پر بہت سے لوگ اسکی خدمت سے کنارہ کش ہوگئے۔ بعض کا خیال تھا کہ جامعہ کو علی گڑھ ہی میں رہنا چاہیے۔ بعض سرے سے اس کو جاری رکھنے کے مخالف تھے مگر پھر بھی بہت سے ایسے باہمت لوگ تھے جن کی وجہ سے جامعہ کا کام بھی جاری رہا۔ جامعہ کی حالت کا مالی حصّہ جس قدر اہم ہے اسی قدر قابل رحم بھی۔ بہت سے احباب دریافت کرتے تھے کہ جامعہ کی مستقل آمدنی کیا ہے؟ اور اس کے اخراجات کا مالی انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب میں سوائے اَلْفَقْرُ فَخْرِی کے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اللہ جو اپنے دشمن اور منکر کو بھی روزی دیتا ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ اپنے نام لیواؤں کو خواہ ان کا دامن گناہوں سے کتنا ہی آلودہ کیوں نہ ہو کسمپرسی کی حالت میں کیوں چھوڑے دے۔ چنانچہ اسی کلیہ کے مطابق جامعہ بفضل خدا زندہ رہی۔ (محمد علی جوہر، مولانا 1920ء ص 78)

حکیم اجمل خاں جامعہ کے تمام اخراجات کا بار اُٹھاتے تھے۔ کچھ اپنی جیب سے اور کچھ اپنے وسیع تعلقات کے بل پر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی جامعہ کے سرپرستوں، ہمدردوں، اساتذہ اور کارکنوں کی مدد سے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کردیا۔ جون 1926ء میں وہ ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور شفیق الرحمٰن قدوائی کے ہمراہ گاندھی سے ملنے گئے۔ مختلف مسائل پر دیر تک گفتگو ہوئی۔ چندہ جمع کرنے کے مختلف طریقوں پر بات چیت رہی۔ گاندھی جی نے اس بات پر زور دیا کہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو مسلمانوں کے ایک ممتاز ادارے کی حیثیت سے قائم رکھنا ہے۔ انہوں نے یہ بات بہت زور دے کر کہی کہ اگر اس کے نام سے اسلامیہ کا لفظ ہٹادیا گیا تو مسلمانوں کو اس سے کوئی دل چسپی نہ رہے گی۔ گاندھی نے کہا کہ جامعہ کو ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہیے جس کے طلبا اسلامی تہذیب کے ترجمان ہونے ساتھ ساتھ ایسے وطن دوست بھی ہوں جو سماج سیوا کا کام کرتے وقت یہ نہ دیکھیں کہ ان کی خدمت سے ہندوؤں کو فیض ہورہا ہے یا مسلمانوں کو گاندھی نے کہا:

The Jamia has to run, If you are worried about its finances, I will go about with a begging bowl.(www.jmi.nic.in,27-4-2006)

ڈاکٹر ذاکر حسین کو گاندھی کی یہ رائے آئی اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ جامعہ کو مسلمانوں کے چندے سے ہی چلائیں گے۔(عبدالغفار مدھولی (س ن) ص 32)

اس سلسلے میں وہ احمد آباد سے حیدرآباد گئے۔وہاں مولوی عبدالحق اور عبدالمجید خواجہ کے ساتھ بہت سے لوگوں کو ملے۔لگ بھگ 25ہزار روپے جمع ہوئے۔دوسرا وفد خواجہ عبدالحئی کی سرکردگی میں کاٹھیاوار اور مدھیہ پردیش گیا۔جنوری 1927ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالعلیم احراری اور حامد علی خان کے ساتھ بہار کے دورے پر گئے وہاں مولوی شفیع داؤدی کی کوشش سے چندے کی ایک معقول رقم فراہم ہوگئی۔10فروری 1927ء کی شام کو حکیم اجمل خان پٹنہ پہنچ گئے۔ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔مگر ان کا عزم جوان تھا۔وہ ہمت نہ ہارے۔پانچ دن تک انہوں نے پٹنہ بارہ، بہار اور مظفر پور دورہ کیا۔جگہ جگہ تقریریں کیں اور ایک معقول رقم جامعہ کیلئے لے کر واپس لوٹے۔(مجلس انتظامیہ 1924ء ص 29)

جامعہ ملّیہ کو مستقل اور پائیدار بنیادوں پر قائم کرنے کیلئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنے ساتھیوں کو مشورے سے ایک نیا منصوبہ تیار کرنا شروع کردیا۔یہ منصوبہ ابھی پوری طرح مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ دسمبر 1927ء میں حکیم اجمل خان دنیا سے رخصت ہوگئے۔جامعہ کے بیشتر کارکن اور استاد ایسے تھے جو 1926ء میں یہ اعلان کرچکے تھے کہ وہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں گے۔یہ عزم ہی جامعہ کا اصل سرمایہ تھا۔لہٰذا حکیم اجمل خان کی وفات کے بعد جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں نے اپنے طور پر جامعہ کی بقا کیلئے ضروری اقدامات شروع کردیئے۔ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں عابد حسین اور محمد مجیب نے رضاکارانہ طور پر اپنی تنخواہوں میں کمی کرلی۔تقرر کے وقت ان لوگوں کا ماہانہ مشاہرہ تین سو روپے تھا اب دو سو روپے ہوگیا۔پروفیسر مجیب نے گرمیوں کی تعطیلات کی پوری تنخواہ جامعہ کے کتب خانہ کو دے دی کہ کتابیں خرید لی جائیں۔(محمد علی جوہر مولانا 18۔جنوری 1928ء)

جامعہ کے نوجوان کارکنوں نے "انجمن تعلیم ملی" کے نام سے جامعہ ملّیہ کو چلانے کے لئے ایک انجمن بنائی۔اس انجمن کے اراکین نے یہ عہد کیا کہ وہ 20 سال تک جامعہ کی خدمت کریں گے اور ایک سو پچاس روپے سے زیادہ مشاہرہ طلب نہ کریں گے۔پہلی مرتبہ جن حضرات نے اس عہدنامے کی رکنیت پر دستخط کئے ان کے نام یہ تھے۔

۔ڈاکٹر ذاکر حسین	۔پروفیسر محمد مجیب	۔مولانا اسلم جیراجپوری
۔خواجہ عبدالحئی	۔حافظ فیاض احمد	۔ارشاد الحق
۔سعدالدین انصاری	۔برکت علی	۔سعید انصاری
۔شفیق الرحمٰن قدوائی	۔حامد علی خان	

(ویب سائٹ جامعہ ملّیہ اسلامیہ 27-4-2006)

مندرجہ بالا حیاتی اراکین کے علاوہ پرانی مجلس اُمناء میں سے سیٹھ جمنالال بجاج، سیٹھ جمال محمد، مولوی عبدالحق، عبدالمجید خواجہ اور مولوی مسعود علی نے انجمن کا معاون رکن بننا منظور کیا۔ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد 23 مئی 1937ء

کوعبدالمجید خواجہ جو 1926ءتک شیخ الجامعہ رہے تھے۔امیر جامعہ منتخب ہوئے۔1938ء میں گیارہ اساتذہ نے بیس سال کے معاہدہ پر دستخط کئے۔1942ء میں مندرجہ ذیل 9حضرات نے اس معاہدہ پر دستخط کئے اورانہیں جامعہ ملّیہ کا حیاتی رکن بنالیا گیا۔

۔ڈاکٹرسیّدعابدحسین	۔پروفیسرای۔جےکیلاٹ	۔محمد عاقل	۔علی احمد
۔عبدالغفارمدھولی	۔اختر حسین فاروقی	۔ماسٹرعبدالحیٔ	
۔سیّداحمدعلی آزاد	۔جرمن خاتون آپاجان Ms. Gerda Philipsborn		

(شمس الرحمٰن محسنی 1986ء ص 57-58)

حیدرآباد کی مالی امداد ماہانہ کے سلسلے میں جو تجربہ ہوا تھا(کہ اس کی ادائیگی دہلی کے چیف کمشنر کی منظوری کے بعد ہوا کرتی)۔اس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ریاستوں کے بڑے بڑے چندوں پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔اس سے اچھا تو یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے چندے جمع کیے جائیں تا کہ کسی کے کہنے سننے سے وہ بند نہ ہوسکیں۔شفیق الرحمٰن قدوائی پر جنہوں نے 1930ء کی تحریک سول نافرمانی میں شرکت کی تھی،اس واقعہ کا بہت اثر تھا۔انہوں نے ذاکر حسین کے مشورے سے ایک اسکیم تیار کی جس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ جامعہ جیسے آزاد ادارے کے لئے بینک میں جمع شدہ سرمایہ کاری امداد قابل اعتماد نہیں ہے۔اس کا مستقل سرمایہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل میں اس کیلئے جگہ ہموار ہو اور وہ اگر قطرہ قطرہ بھی اپنے فیض وکرم کا دریا بہائیں تو اس کا بہاؤ کسی سے نہ رُکے گا۔طے پایا کہ جو لوگ چار آنے،آٹھ آنے،روپے،دوروپے یا اس سے زائد ماہوار دینے کا وعدہ کریں اُن کو"ہمدردان جامعہ"کا رکن بنالیا جائے۔یہ بندوبست کیا جائے کہ وعدوں کی رقمیں مستعدی کے ساتھ وصول کی جاتی رہیں۔لہٰذا ہمدردانِ جامعہ کے نام سے ایک نیا شعبہ قائم ہوا۔شفیق الرحمٰن کو اس کا ناظم بنادیا گیا۔

اس نئے شعبے کو بنانے میں وہ چھ سال تک برابر اپنا پورا وقت اور اپنی پوری قوت لگاتے رہے۔انہوں نے اس سلسلے میں خود کئی دفعہ پورے ملک کا دورہ کیا۔ان کی شخصیت اتنی پُرکشش تھی کہ وہ جس سے بھی کہتے اس کام میں ان کا ساتھ دینے کیلئے نکل کھڑا ہوتا۔ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کو وہ اپنے ساتھ چندہ جمع کرنے نکل جاتے۔جامعہ کے طلبہ کو بھی شفیق الرحمٰن نے گرمیوں کی تعطیلات کے دوران چندہ جمع کرنے کے کام میں نہ صرف شریک کیا بلکہ ان کو انہیں چندہ جمع کرنے کے گر بھی سکھائے۔انہوں نے اپنے چندے کے پروگرام کا نشانہ یہ مقرر کیا کہ ملک کے ہر ضلع سے ایک ہزار روپے یکمشت اور 25ہزار روپے ماہوار کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔اس منصوبے کے مطابق وہ سال میں ایک دفعہ کسی نہ کسی کو ملک کے ہر کونے میں بھیجتے۔خود جاتے،اساتذہ کو بھیجتے یا پھر چندے کیلئے غیر ملازم رکھتے اور ان کو بھیجتے۔

چندے کی مہم کے دوران شعبہ ہمدردان جامعہ کے ناظم شفیق الرحمٰن قدوائی کو بہت سے اعتراضات اور بہت سی کڑی تنقیدیں سننا پڑتی تھیں۔وہ ان سب کا جواب بڑی ذکاوت،نکتہ سنجی اور ظرافت کے ساتھ دیتے۔انکسار،خلوص اور گفتگو کا دلکش انداز ان کی پُرکشش شخصیت کے زبردست ہتھیار تھے۔ان ہتھیاروں کے بل پر وہ ان لوگوں سے بھی مدد

حاصل کرلیتے جو جامعہ کے سیاسی موقف کے خلاف تھے۔ان کے بعض ساتھی بھی چندہ جمع کرنے میں ماہر ہوگئے۔واردھا اسکیم کے زمانے میں جب لوگ جامعہ ملّیہ سے بہت ناراض تھے۔اس زمانے میں شفیق الرحمٰن نے اپنے ایک ساتھی کو بہار بھیجا۔(رسالہ پیامِ تعلیم جشنِ سیمیں نمبر نومبر 1970ء)

وہ اپنے جاننے والے ایک اسٹنٹ کمشنر کو لے کر ایک زمیندار کے پاس پہنچے تعارفی کلمات کے بعد زمیندار صاحب بے ساختہ بول اُٹھے "کانگریس کی عنایت سے مالگزاری ادا کرنا مشکل ہورہا ہے اور آپ جامعہ کو چندہ دینے کا فرماتے ہیں"۔کمشنر کو یہ امید نہ تھی کہ اس کی موجودگی میں ایسا روکھا پھیکا جواب ملے گا۔غصّے سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔جامعہ کے سفیر نے کہا ذرا ٹھہریئے مجھے بولنے دیجئے۔پھر کہنے لگے کہ ایک انگریز کی عدالت میں ایک دفعہ شکایت کی گئی کہ ایک بھینس نے کھیت میں گھس کر پوری کھیتی کو تہس نہس کردیا ہے۔انگریز جج نے فوراً یہ حکم صادر کردیا کہ بھینس کے مالک کو تین مہینے کیلئے جیل کے اندر کردیا جائے۔بھینس کا مالک یہ سن کر کھڑا ہوگیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر کہنے لگا: ناجور مجھے یہ نا منظور ہے، مجھے یہ ایک گھڑی بھی منظور نہیں۔میں اکیلا آدمی ہوں۔کیا تو میری بھینس کو چارہ/پانی کھلائے پلائے گا نہیں یہ مجھے بالکل منظور نہیں۔نہ جانے انگریز کو اس کی کون سی ادا پسند آگئی کہ سزا کا حکم واپس لے لیا۔جامعہ کے سفیر نے یہ سنانے کے بعد زمیندار کا ہاتھ پکڑا اور کہا ہمیں آپکا حکم نا منظور ہے۔

یہ چندہ جامعہ کیلئے کیا جارہا ہے۔میری لڑکی یا لڑکے کی شادی نہیں ہے۔کیا آپ نے اپنا کھانا بند کررکھا ہے؟ کیا آپ نے اپنے نوکروں کی تنخواہیں بند کررکھی ہیں مہربانی فرما کر اُٹھئے اور گھر جایئے۔اندر سے جو جی چاہے لاکر دیجئے۔ اس انداز گفتگو کا زمیندار پر اچھا اثر ہوا۔وہ گھر گیا اور پلیٹ میں چاندی کے بہت سے سکے لاکر پیش خدمت کئے۔جامعہ کے سفیر نے پوچھا دروزاہ بند رہے گا یا کھلا؟۔بولے کھلا رہے گا جب جی چاہے آیئے۔یوں جامعہ کے مالی حالات قابو میں رہے۔1938ء میں جب شفیق الرحمٰن اس نظامت سے علیٰحدہ ہوئے تو شعبہ ہمدردان جامعہ اپنا خرچ نکال کر جامعہ کو ہر مہینے ایک ہزار پانچ سو روپے دینے لگا تقریباً اتنی ہی امداد جامعہ کو والیانِ ریاست سے ملتی تھی۔1939ء میں بہت سے یکمشت بڑے بڑے "عطیات" حاصل ہوئے۔سب سے بڑا عطیہ ریاست حیدرآباد سے ملا۔یہ عطیہ ایک لاکھ روپے کی یکمشت امداد تھی جو مدرسہ ثانوی کی عمارت کیلئے ملی تھی۔ہمدردانِ جامعہ اور والیانِ ریاست دونوں سے مستقل آمدنی کی رقمیں بھی بڑھتی رہیں۔1932ء میں شعبہ ہمدردانِ جامعہ نے 15ہزار روپے جمع کیے تھے۔1937ء میں اس نے 24ہزار روپے فراہم کئے۔1944ء میں 32ہزار روپے۔1944ء-1945ء میں 41ہزار اور 1945ء-1946ء میں یہ رقم بڑھ کر 48ہزار ہوگئی۔(ذاکر حسین ڈاکٹر (س ن) ص 150)

والیان ریاست سے جو مستقل امداد ملی وہ بھی اس کے برابر تھی۔1944ء میں ریاست بھوپال سے دس ہزار روپے ملے اور پانچ سو روپے کی ماہانہ امداد جاری ہوئی۔ریاست حیدرآباد نے ایک ہزار روپے کی ماہوار امداد کو بڑھا کر تین ہزار روپے ماہوار کردیا اور اس کے علاوہ 30ہزار روپے یکمشت قرضوں کی ادائیگی کیلئے دیئے۔"جامعہ کی کہانی" کے مصنف

عبدالغفار مدھولی لکھتے ہیں: ایک دن کی بات ہے جامعہ نگر کے سامنے سڑک پر ایک موٹر آ کر رکی یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ اس لئے کسی نے توجہ نہ دی۔ موٹر میں سے چار سیلانی اُترے اور ایک طرف سے جامعہ کی عمارت کو دیکھنا شروع کیا۔ اس شوق کو دیکھ کر جامعہ کے بزرگ نے اخلاقاً ان کی رہنمائی کی ذمہ داری لے لی اور مدرسے کی تمام چیزیں دکھائیں۔ آخر میں رخصت کرنے سڑک تک گئے۔ سیلانیوں میں سے ایک صاحب نے فرمایا آج ہم یوں ہی سیر کرنے کیلئے نکل آئے تھے۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیجئے۔ کل اس پتے پر کسی کو بھیج دیجئے گا۔ ارشاد کی تعمیل میں ایک صاحب ان کے ہاں گئے۔ انہوں نے ایک سو روپے حوالے کئے اور فرمایا میری طرف سے جامعہ کو دیجئے گا۔ یہ سیلانی جناب لاڈلی پرشاد رئیس چاندنی چوک دہلی تھے۔ (عبدالغفار مدھولی (س ن) ص 186)

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس قسم کے ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یکم مارچ 1944ء کو انجمن جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے جلسے میں بتایا کہ: دہلی کی امداد میں دو مخلص ہمدردوں کی طرف سے دس ہزار روپے کی ایک رقم بھی شامل ہے۔ انہوں نے اپنا ظاہر کرنے کی اجازت بھی نہیں دی اور اس خلوص و محبت سے یہ رقم پہنچائی کہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ مدد پہنچی اس وقت جامعہ کی مالی آزمائش کا دور ختم ہو گیا۔ یہ رقم ناظم انجمن کو اُس وقت دی گئی جب وہ مالی پریشانیوں کو رفع کرنے کی کوئی سبیل نہ پا کر احباب کے مشورے اور اصرار سے حیدرآباد کے سفر پر جا رہا تھا۔ روانگی سے تھوڑی دیر قبل ان مخلص ہمدردوں میں سے ایک نے آ کر ناظم انجمن کو دس ہزار روپے کے نوٹ دیے اور فرمایا کہ تم جس بے اطمینانی اور پریشانی کی وجہ سے سفر کا قصد کر رہے ہو۔ شاید یہ رقم اس میں کچھ کم کر سکے اور تم جہاں جا رہے ہو وہاں اطمینان کے ساتھ جامعہ کیلئے کوشش کر سکو۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ پروفیسر محمد مجیب نے اپنی کتاب "ذاکر حسین" میں بیان کیا ہے لکھتے ہیں کہ: 1943ء میں ذاکر صاحب چندہ جمع کرنے کی غرض سے حیدرآباد آ گئے۔ اور اپنی جگہ مجھے چھوڑ گئے۔ ان دنوں روزمرّہ کے اخراجات پورے کرنا مشکل تھا۔ ذاکر صاحب کے جانے کے دوسرے دن صبح کو میں نے اپنی میز پر ایک بڑا لفافہ پڑا پایا۔ اس کے اندر سے دس ہزار روپے کے نوٹ نکلے۔ یہ لفافہ ایک صاحب جنہوں نے اپنا نام نہیں بتایا۔ پچھلے سہ پہر میز پر چھوڑ گئے تھے۔ (محمد مجیب، پروفیسر (س ن) ص 50)

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی آمدنی کے چار بڑے ذرائع تھے۔ والیانِ ریاست سے دو قسم کی امداد ملتی تھی۔ ایک مستقل اور دوسری یکشت و ہنگامی۔ عام چندوں سے بھی مستقل اور ہنگامی دونوں طرح کی آمدنی ہوتی تھی۔ تیسرا بڑا ذریعہ طلبہ کی فیس سے تھا۔ یہ ایک مستقل آمدنی تھی۔ روزمرہ کے اخراجات کا تخمینہ تیار کرتے وقت صرف اس آمدنی کو سامنے رکھا جاتا جو مستقل حیثیت کی تھی۔ باقی دوسرے ذرائع سے جو آمدنی ہوتی اسے عمارت فنڈ میں جمع کر دیا جاتا تھا۔ یا پھر اسے دوسرے خاص ضرورتوں میں صرف کیا جاتا تھا۔ جیسے قرضوں کی ادائیگی وغیرہ۔ زمینوں کی خریداری، عمارتوں کی تعمیر اور سامانِ تعلیم کی فراہمی کو ہر صورت فوقیت اور افضلیت دی جاتی۔ (شمس الرحمان محسنی 1986ء، ص 92)

فیسوں کے ذریعے جو مستقل آمدنی موصول ہوتی وہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے دستور العمل کے مطابق کچھ یوں تھی:

فیس داخلہ: (1)مدرسہ میں داخلہ کی فیس دو روپیہ تھی۔(2)دارالاقامہ میں داخل ہونے والے طلبہ سے مزید تین روپے لئے جاتے۔(3)مدرسہ میں داخلے کے وقت ہر طالب علم کو بزمِ ادب کا رکن ہونے کیلئے چار آنے فیس دینا ہوتی۔(4)دارالاقامہ میں داخل ہونے والے طالب علم سے چار آنے پاس بک کے بھی لئے جاتے جس میں اس کا مفصل حساب ہمیشہ درج ہوتا رہتا تھا۔اور یہ کتاب طالب علم کے پاس رہتی تھی۔

فیس ماہانہ:

	مکتب و منزل ابتدائی		منزل ثانوی	
	روپیہ	آنہ	روپیہ	آنہ
۔ فیس تعلیم	1	0	2	0
۔ کرایہ کمرہ	3	0	3	0
۔ عملہ و دیگر اخراجات دارالاقامہ	1	11	1	11
۔ فیس طعام	8	0	8	0
۔ کھیل	0	2	0	2
۔ ملازمین و متفرق ضروریات مطبخ	1	0	1	0
۔ بزم ادب (کتب خانہ و دارالاقامہ)	0	2	0	2
۔ میزان	14	15	15	15

(محمد علی، جولائی تا مئی 1920ء ص 9)

فیس برائے طلبہ منزل اعلیٰ

طلبہ کو فیس داخلہ مبلغ پانچ روپیہ ادا کرنا ہوتا۔اگر درخواست بذریعہ ڈاک آتی تو اس کے ہمراہ فیس داخلہ بھیجنا ضروری ہوتا۔اگر طالب علم کا داخلہ ہو جاتا تو یہ رقم اس کی فیس داخلہ میں جمع ہو جاتی وگرنہ واپس کردی جاتی تھی۔ماہانہ اخراجات کی تفصیل حسب ذیل تھی۔

ماہانہ اخراجات	روپیہ	آنہ
۔فیس تعلیم	3	0
۔قیام	3	0
۔طعام معہ ملازمین مطبخ	9	0
۔اخراجات دارالاقامہ	1	11
۔کھیل اور انجمن اتحاد	0	4

میزان۔		16	15

(محمد علی جوالا مولانا 1920ء ص 18)

فیس امتحانات

ذیل میں امتحانات کی فیسیں درج کی جاتی ہیں۔

امتحانات	طلباء جامعہ سے	پرائیویٹ امیدواروں سے	برائے وصولیابی سند و سرٹیفیکیٹ
بی۔اے(امتیازی)	25 یا ہر حصہ کی 15	ـــــــ	5 روپے
بی۔اے(معمولی)	20 روپے	25 روپے	4 روپے
جامعہ سینئر(انٹرمیڈیٹ)	10 روپے	12 روپے	3 روپے
جامعہ جونیئر(میٹرک)	6 روپے	8 روپے	2 روپے
سرٹیفیکیٹ	5 روپے	ـــــــ	ایک روپیہ

فیس مقامی طلبہ

جو طلبہ دارالاقامہ میں نہیں رہتے صرف دن میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔انہیں مندرجہ ذیل رقوم ادا کرنا ہوتی تھیں۔ان رقوم میں فیس تعلیم،کھیل اور دارالمطالعہ بھی شامل تھیں۔

درجہ	فیس داخلہ	فیس ماہانہ
ابتدائی اول	4	1
ابتدائی دوئم	4	2
ابتدائی سوئم	8	4
ابتدائی چہارم	8	8
ابتدائی پنجم	عہ	12
ابتدائی ششم	عہ	عہ

(محمد علی جوالا مولانا 1932ء ص 28)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ماہانہ اخراجات کیلئے آمدنی کی یہی صورت جو بیان کی گئی ہے،مستقل سرمایہ کے طور پر اس کی تحویل میں رہتی۔کچھ ایسی رقوم جو معطیان نے خاص مقصد کیلئے دیں وہ یا تو اسی مقصد کی تکمیل کیلئے صرف کی جاتیں یا بدستور محفوظ رکھی جاتیں بلکہ انتہائی ضرورت اور تنگدستی کے زمانہ میں بھی ان کو ہاتھ لگانا منظور نہیں کیا جاتا تھا جیسے

(ا) ٹیکنیکل فنڈ

جمعیۃ الاسلامیہ بغداد نے مارچ 1931ء میں ایک ہزار کی رقم کسی صنعتی تعلیم کیلئے مرحمت کی تھی جو بینک میں بطور

معیاری جمع کے موجود تھی۔

(ب) تعلیم بالغاں فنڈ

مبلغ پانچ سو روپے کی رقم حافظ فیاض میڈل کی تھی ۔اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ حافظ فیاض احمد رجسٹرار جامعہ ملّیہ کے ایک محبّ صادق نے جو جامعہ ملّیہ کے دلدادہ تھے اور اس کے کام کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔نومبر 1931ء میں جامعہ کو مبلغ پانچ سو روپے کی رقم اس غرض سے دی کہ یہ رقم کسی بینک میں محفوظ رکھ دی جائے اور اس کی آمدنی سے ہر سال ایک تمغہ اس شخص کو دیا جائے جس نے تعلیم بالغاں کے سلسلے میں سب سے بہتر کام کیا ہو۔چونکہ جامعہ ملّیہ میں حافظ فیاض احمد نے مدارس شبینہ اور تعلیم بالغاں کی تحریک شروع کی تھی ،اس کو چلایا تھا اس لئے معطی صاحب کی خواہش پر اس تمغہ کا نام "حافظ فیاض میڈل" رکھا گیا۔معطی نے خاص اصرار کے ساتھ ہدایت کی کہ ان کے نام کو ظاہر نہ کیا جائے ۔اس لئے مجبوراً ظاہر نہیں کیا گیا یہ رقم 2.5 فیصدی نفع پر ڈاکخانہ کی معرفت جمع کر دی گئی۔

(ج) جہانگیر بومن جی پٹیٹ فنڈ

اکتوبر 1923ء میں سیٹھ جہانگیر بومن جی ڈنشا پٹیٹ سوداگران بمبئی نے ایک ہزار روپے کا 3.5 فیصدی والا 1942ء-1943ء کا گورنمنٹ پرامیسری نوٹ اپنے مرحوم پدر بزرگوار سیٹھ بومن جی ڈنشا پٹیٹ کی یادگار کے طور پر اس غرض سے دیا کہ اس کی آمدنی سے کسی غریب طالب علم کی مدد کی جائے ۔

(د) بلڈنگ فنڈ

- مرکزی خلافت کمیٹی نے ستمبر 1928ء میں مبلغ 20 ہزار (بیس ہزار) روپے جامعہ کی امداد کیلئے دیئے۔جس کو کارکنان جامعہ نے اپنے روزمرہ کے مصارف میں لانا مناسب نہیں سمجھا اور تعمیرات کیلئے جمع کر دیا۔
- 1930ء میں مبلغ پچاس ہزار (50ہزار) روپے نظام خلد اللہ ملکہ نے دیئے تھے۔جن میں سے چالیس ہزار (40ہزار) روپے کی رقم معیاری جمع میں محفوظ کی گئی اور دس ہزار (10ہزار) روپے کی رقم چلتے حساب میں تھی ۔چلتے حساب میں سے کچھ رقم مختلف اراضی کی خرید وغیرہ میں صرف ہوئی اور کچھ موجود رہی۔

(ہ) وظائف

نو وظیفے دس دس روپے ماہوار کے سیٹھ جمنالال بزاز نے عطا کئے ۔جن میں سے چھ منزل ثانوی اور جماعت ابتدائی کے طلبہ کیلئے مخصوص تھے۔

(مندرجہ بالا معلومات بڑی حد تک دستور العمل جامعہ ملّیہ اسلامیہ 1932ء سے ماخوذ ہیں)

الغرض جامعہ ملّیہ اسلامیہ نے حکومتی گرانٹ اور مدد کے بغیر اپنی تحریک اور تحریکی اداروں کو چلایا ۔اس کے مستقل وسائل میں طلبہ کی مختلف نوعیت کی فیسیں تھیں جبکہ غیر مستقل ذرائع میں وظائف ،چندے ،امدایں ،عطیات اور کارکنوں کا

مالی ایثار شامل تھا۔

8.7 مسائل

جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے ابتدائی سالوں بلکہ اپنے قیام کے 25 برس کے مسائل ان سے مختلف تھے جو جامعہ کو اپنے قیام کے 25 برس کے بعد پیش آئے۔ لہٰذا جامعہ کے مسائل کو آزادیٔ ہند سے قبل اور آزادیٔ ہند کے بعد کے مسائل کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔

آزادیٔ ہند سے قبل جامعہ ملّیہ کے مسائل

جامعہ کے دستوری مسائل

جامعہ ملّیہ نے ایک سیاسی تحریک کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لئے اس کی پرورش اور نگہبانی کا کام ابتداء میں سیاسی رہنماؤں کو انجام دینا پڑا۔ 29 اکتوبر 1920ء کے جلسہء افتتاح میں جامعہ ملّیہ کیلئے جو فاؤنڈیشن کمیٹی (مجلس تاسیس) بنائی گئی۔ اس میں صوبائی خلافت کمیٹیوں کے نمائندے بھی شامل تھے (عبدالغفار دھولی (س ن) ص 479)۔ 22 نومبر 1920ء کو مجلس تاسیس کے جلسہ میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ یہ انتظام جامعہ کے دہلی منتقل ہونے کے بعد بھی کئی سال تک جاری رہا۔ اس کش مکش میں کئی سال تک جامعہ کا کوئی آئین یا دستور نہ بن سکا۔ اس کے بنانے کی ذمہ داری جامعہ کی فاؤنڈیشن کمیٹی اور اس کی مقرر کردہ مجالس انتظامی اور تعلیمی پر تھی جو کہ قائم ہو چکی تھیں۔ مجلس انتظامیہ کے اراکین میں عہدیداروں کے علاوہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری، نواب محمد اسماعیل خان، مولانا حسرت موہانی، مولانا سیّد سلیمان، ڈاکٹر سیّد محمود، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے ممتاز اور مقتدر رہنما شامل تھے۔ مجلس تعلیمی، جامعہ کے عہدیداروں، اسٹاف کے نمائندوں اور مجلس انتظامیہ کے 4 نامزد ممبروں پر مشتمل تھی (مجلس انتظامیہ 1921ء ص 51)۔ گویا جامعہ ملّیہ کے ابتدائی مسائل میں آئین یا دستور کا نہ بننا ایک مسئلہ تھا۔

جامعہ کے مالی مسائل

جامعہ کے قیام کے دو سال تک سیاسی ہنگاموں اور مذہبی جوش و خروش کا زور رہا۔ اس لئے سیاست اور خلافت کمیٹی سے اس کا علیٰحدہ رہنا ممکن نہ تھا۔ خلافت کمیٹی جامعہ کے تمام اخراجات کا بار اُٹھاتی تھی (محمد علیؔ جوہر مولانا 30 اکتوبر 1925ء)۔ وہ جامعہ ملّیہ کے لئے دس ہزار روپے ماہانہ کی امداد دیتی تھی۔ جامعہ کا بجٹ منظوری کیلئے خلافت کمیٹی کے پاس گیا تھا۔ اس کے کارپردازوں اور اساتذہ کو یہ پسند نہ تھا کہ جامعہ خلافت کمیٹی کے تابع اور ماتحت ہو۔ اس لئے انہوں نے خلافت کمیٹی سے نومبر 1920ء میں یہ تجویز پاس کرالی کہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ ایک آزاد ادارہ ہے اور وہ کسی دوسری جماعت

کے سامنے جواب دہ نہیں۔جامعہ والے جانتے تھے کہ جب تک اس کا اپنا ایک فنڈ نہ ہوگا،اسے صحیح معنوں میں خالص تعلیمی ادارہ نہیں بنایا جاسکتا(مجلس انتظامیہ 1924ء ص 55)۔1922ء میں ڈاکٹر انصاری کی تحریک پر جامعہ کیلئے فنڈ جمع کرنے کی مہم شروع ہوگئی۔یہ تو پتہ نہیں کہ فنڈ میں کتنی رقم جمع ہوئی۔مگر یہ اسی کی برکت تھی کہ جامعہ ملّیہ خلافت کمیٹی کے بے جان ہونے کے بعد بھی اپنے کام کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھ سکی۔جامعہ ملّیہ اسلامیہ نے 1923ء کے شروع ہی سے خلافت کمیٹی کے اثرات سے آزادی حاصل کرنی شروع کردی تھی۔مگر آزادی حاصل کرنے کا یہ عمل علی گڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ہی تکمیل پا سکا۔(عبدالغفار مدھولی(س ن)ص 67)

دہلی آنے کے بعد جامعہ ملّیہ کے کام محدود ہوتے چلے گئے۔سب سے پہلے اسکول اور کالجوں کے الحاق کا کام بند ہوا۔ایک تو اس لئے کہ خلافت کی تحریک کے بے جان ہونے اور سیاسی جدوجہد کے ملتوی ہونے کی وجہ سے قومی اسکول اور کالجوں کا قائم رکھنا مشکل ہوگیا تھا۔دوسرے جامعہ کے پاس اتنے مالی وسائل نہ رہے تھے کہ وہ قومی نظام تعلیم کا بار اُٹھا سکتی جس کیلئے اسے مختلف صوبوں کے اسکولوں اور کالجوں کی نگرانی کا کام کرنا پڑتا تھا۔جامعہ کے مالی وسائل کم ہوگئے تھے۔اس لئے یہ کام بھی مشکل ہوگیا کہ وہ طلبہ کیلئے ایسی تعلیم کا انتظام کرے جو ان پر معاش کے دروازے کھول دے۔صنعت وحرفت کی تعلیم جو جامعہ کے تعلیمی نظام کی جان تھی باقی نہ رہ سکی۔تیسری تبدیلی یہ آئی کہ کالج میں بی۔اے آنرز اور بی ایس سی کی تعلیم کا انتظام نہ رہا۔اگست 1925ء میں جامعہ میں پچیس تیس اساتذہ،اسکولوں اور کالجوں کو ملا کر 80 طالبعلم تھے۔کالج میں صرف چودہ پندرہ طالب ہوں گے۔اساتذہ اور کارکنوں کی تعداد بھی بہت کم ہوگئی۔(محمد مجیب،پروفیسر 1970ء ص 5)

علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوتے وقت گاندھی جی نے جامعہ ملّیہ کیلئے ایک سال کے مصارف کا انتظام کردیا(محمد مجیب،پروفیسر(س ن)ص 50)۔اس کے بعد جامعہ کے مالی وسائل فراہم کرنے کی تمام ذمہ داری حکیم اجمل خان پر تھی۔وہ اپنے دم واپس تک اس ذمہ داری کو نبھاتے رہے۔29 دسمبر 1927ء کو ان کا انتقال ہونے پر جامعہ لاوارث ہوگئی۔اسکی مالی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔جامعہ کے تمام ادارے کرایہ کی عمارتوں میں تھے۔ان کا کرایہ تک ادا کرنا دشوار ہوگیا۔اساتذہ اور کارکنوں کی کئی کئی مہینوں کی تنخواہیں نہ دی جاسکیں۔حکیم اجمل خان کی وفات کے بعد دہلی میں ایک بڑے جلسے میں ان کے نام سے "اجمل جامعہ فنڈ" کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا گیا۔ایک کروڑ پتی مسلمان جس کی خوشحالی حکیم اجمل خان کی خاص عنایات کی مرہون منت تھی اس فنڈ میں صرف 250 روپے دیئے۔اس جلسے کے بعد بھی بہت کوشش کی گئی لیکن اجمل جامعہ فنڈ میں جو رقم جمع ہوئی وہ پندرہ ہزار سے آگے نہ بڑھ سکی۔(لعل احمد تھیم 1973ء ص 128)

اجمل جامعہ فنڈ کے سلسلے میں جو تجربات ہوئے ان سے ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھیوں کو پتہ چلا کہ ایسی صورت میں جبکہ ملک سیاسی انتشار کا شکار ہے،مالی وسائل کی فراہمی کیلئے سیاسی رہنماؤں پر تکیہ کرنا بیکار ہے۔لہذا ڈاکٹر ذاکر حسین نے 20 جولائی 1927ء کو ڈاکٹر مختار کی رہنمائی میں جامعہ ملّیہ کو سیاسی رہنماؤں کے اثر سے آزاد کرالیا۔

اس کے انتظام کیلئے "انجمن تعلیم ملی" قائم ہوئی جو جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں پر مشتمل تھی۔ اس وقت جامعہ کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر ذاکر نے ڈاکٹر انصاری اور ابوالکلام آزاد کے ہمراہ مدارس کا دورہ کیا اور مدارس کے سیٹھ جمال محمد سے پندرہ ہزار سے زائد روپے جمع کر لئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حیدر آباد گئے اور ریاست حیدر آباد سے پچاس ہزار روپے یکمشت نقد اور ایک ہزار روپے ماہانہ کا وعدہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک ہزار روپے ماہانہ امداد کی خبر نے مایوس دلوں میں مسرت کی لہر دوڑا دی۔ مگر انگریزوں کے وفادار سرکار حیدر کے ایک افسر کے کہنے پر ماہانہ امداد پر یہ شرط لگا دی گئی کہ اسکی ادائیگی دہلی کے چیف کمشنر کی منظوری کے بعد ہوا کرے گی۔ (محمد مجیب، پروفیسر (س ن) ص 59)

اس شرط کی وجہ سے ماہانہ امداد فوراً نہ مل سکی۔ کیونکہ تحریک سول نافرمانی میں جامعہ کے چند اساتذہ نے شرکت کی تھی جن میں شفیق الرحمٰن، دیوداس گاندھی اور حافظ فیاض احمد شامل تھے۔ چیف کمشنر کو لاکھ سمجھایا گیا کہ جامعہ کا اس تحریک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے چند اساتذہ جامعہ سے الگ ہو کر اس تحریک میں اپنی انفرادی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ لیکن چیف کمشنر نہ مانا اور ریاست حیدر آباد نے جو امداد دی تھی وہ چار سال تک وصول نہ ہو سکی۔ جامعہ والوں کیلئے یہ بہت تنگی اور عسرت کا زمانہ تھا۔ اساتذہ اور کارکنوں کی تنخواہوں کا اوسط فی کس پچاس روپے ماہوار سے زیادہ نہ تھا۔ پھر بھی کئی کئی مہینے تک کسی کو کچھ نہ ملتا۔ مطبخ سے کھانا جاری ہو جاتا۔ دیگر ضروریات کے لئے بہت کچھ سننے کہنے پر پانچ دس روپے مل جایا کرتے۔ تنخواہوں کی بقیہ رقم جامعہ کے کھاتوں میں درج ہو جاتی۔ یوں جامعہ پر اپنے اساتذہ اور کارکنوں کا قرض بڑھتا رہتا۔

آزادئ ہند کے بعد کے مسائل

آزادی کی صبح جامعہ ملّیہ اسلامیہ کیلئے امیدیں اور توقعات، تشویش اور اضطراب دونوں لے کر آئی۔ دہلی کے فرقہ وارانہ فساد میں جامعہ ملّیہ کو بہت بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس کے تین شعبے، مکتبہ جامعہ، تعلیم و ترقی اور تعلیمی مرکز قرول باغ میں تھے۔ ان کا سب کچھ اس فساد کی آگ میں جل کر راکھ ہو گیا اور انہیں اپنے کاموں کو دوبارہ نئے سرے سے شروع کرنا پڑا۔ آزادی سے پہلے وہ ایک ایسا منفرد ادارہ تھا جس پر ملک کے نظام تعلیم کا سایہ تک نہ پڑتا تھا۔ یہی انفرادیت اس کا طرۂ امتیاز تھا جس کی حفاظت کے لئے جامعہ کے کارکن طرح طرح کی مشکلات اور سخت سے سخت آزمائشوں کا سامنا کرنے سے نہ ڈرتے تھے۔ آزادی کے بعد اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ کس حد تک اپنی انفرادیت کو باقی رکھے؟ کس طرح ملک کے وسیع نظام تعلیم سے اپنا رشتہ جوڑے؟

مالی مشکلات

آزادی سے پہلے جامعہ کے کام اگرچہ پھیلے ہوئے تھے مگر ان کا پیمانہ بہت چھوٹا تھا۔ جامعہ کے یہ کام عام چندوں اور دیسی ریاستوں کے عطیات سے چلتے تھے۔ تقسیم کے بعد متمول مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ جو "ہمدردانِ جامعہ" میں شامل

تھا، پاکستان منتقل ہوگیا اور دیسی ریاستیں ختم ہوگئیں۔ جامعہ کی آمدن آہستہ آہستہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ اس کے میزانیہ میں خسارہ کی رقم ہر سال بڑھنے لگی۔ کئی سال تک یہ رقم "جوبلی فنڈ" (جو جامعہ نے اپنے جشنِ سیمیں کے موقع پر اکٹھا کیا تھا) سے ادا ہوتی تھی۔ اس فنڈ میں تقریباً 16 لاکھ روپے جمع ہوئے تھے جن میں سے صرف 7 لاکھ روپے باقی رہ گئے۔ یہ محدود رقم زیادہ دیر تک کام نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے یہ ضروری ہوگیا کہ آزاد ہندوستان کی حکومت سے مالی امداد حاصل کی جائے۔ (مجلس انتظامیہ 1948ء ص 39)

کارکنان جامعہ اور رفقاء سے مشورہ کرنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے 1948ء میں وزارت تعلیم کو اس بارے میں ایک درخواست دی۔ کافی تگ و دو کی گئی حتیٰ کہ پروفیسر مجیب جامعہ کی طرف سے ایک وفد لے کر وزیر اعظم پنڈت نہرو کے پاس گئے۔ پنڈت جی کے کہنے پر 1952ء میں ایک لاکھ روپے کی گرانٹ منظور ہوئی۔ مگر حکومت کی یہ مالی امداد اپنے ساتھ ایسی تبدیلیاں لائی جن کی وجہ سے جامعہ کی پرسکون زندگی میں بے چینی اور انتشار کے آثار پیدا ہوگئے۔

حکومتی گرانٹ اور متفرق مسائل

حکومت کی گرانٹ کے ساتھ جو شرائط عائد کیں ان پر تعلیمی آزادی کے روائتی تصور پر ایمان رکھنے والے پریشان تھے کہ کس طرح حکومت کی شرائط کو منظور کریں۔ روائتی مذہب کے ماننے والے اس کیلئے تیار نہ تھے کہ مذہبی تعلیم اختیاری کردی جائے ان کے نزدیک مذہب کی لازمی تعلیم ہی جامعہ کی امتیازی خصوصیت تھی اس کے بغیر وہ جامعہ ملّیہ کا تصور ہی نہ کرسکتے تھے۔ کچھ جو ترقی پسند تھے مگر آزاد ہندوستان کی حکومت کی قومی حکومت مانتے تھے۔ وہ حکومت سے مالی امداد لینے کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد جامعہ نے شرائط مان لیں اور حکومت سے گرانٹ بھی لینا شروع کردی تھی لیکن اس کے باوجود ایک زمانے تک جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کو تعلیمی آزادی کا روائتی تصور پریشان کرتا رہا۔

جامعہ کے کردار میں تبدیلی کے مسائل

جامعہ ملّیہ کے نظم و نسق پر جو الزامات لگائے گے۔ ان میں

- بنیادی الزام یہ تھا کہ جامعہ کے تہذیبی کردار اور اسکے بنیادی مقصد کو بدلنے کی کوشش کی جارہی ہے۔
- دوسرا الزام یہ تھا کہ انگریزی کو آہستہ آہستہ اُردو کی جگہ ذریعہ تعلیم بنایا جارہا ہے۔
- لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ساتھ پڑھایا جارہا ہے جو اسلامی روایات کے خلاف ہے۔
- ڈاکٹر ذاکر حسین کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد تہذیبی سرگرمیوں میں ڈراما، ڈانس اور موسیقی جیسے غیر اسلامی پروگرام ہونے لگے ہیں۔
- جامعہ کے اسٹاف پر دس بارہ کیمونسٹوں کو رکھ لیا گیا ہے جن کے ذریعے جامعہ کا کردار بدلتا جارہا ہے۔
- جامعہ کے اسٹاف کے ایک رکن کو کسی لڑکی کے ساتھ کار میں جاتے دیکھا گیا ہے۔ اس سے جامعہ میں پھیلی ہوئی گراوٹ کا اظہار ہوتا ہے۔

– 1957ء میں ری پبلک ڈے پر جامعہ کی طرف سے پھول والوں کی سیر کی ایک جھانکی نکالی گئی تھی جس پر ایک طوائف سے ڈانس کرایا گیا تھا۔

گویا اس قسم کے کافی الزامات تھے جن میں سے یہ چند ایک ہیں۔

مالی بے ضابطگی اور جائیداد کے انتظام میں باقاعدگی کے مسائل

اس سلسلے میں جو الزامات مسائل بنے ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

– مسجد کیلئے جو فنڈ جمع ہوا تھا وہ کسی دوسرے کام پر خرچ کرلیا گیا ہے۔

– قرول باغ میں جامعہ کی جو جائیداد تھی اُسے بے قاعدہ اور بے ضابطہ طور پر سستے داموں بیچ دیا تھا۔

– ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید نے جو قطعہ زمین جامعہ کو دیا تھا وہ بیچ دیا گیا ہے۔

– جامعہ نے شفیق الرحمٰن مرحوم کے مکان پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے اور ان کے ورثا کو کرایہ تک نہیں دیا۔

ان مسائل کو سلجھانے کیلئے شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب نے امیر جامعہ کو لکھا۔ امیر جامعہ نے وزارت تعلیم کے افسر سیّد اشفاق حسین کی سیکرٹری شپ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کردی جس کے دوسرے اراکین سیّد محمود اور سیّد مظہر امام (ایم۔پی) تھے۔ کمیٹی نے اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے بعد نومبر 1960ء تک اپنی رپورٹ امیر جامعہ کی خدمت میں پیش کردی۔ بحث کو سمیٹتے ہوئے مندرجہ بالا کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ جامعہ ملّیہ جن مسائل کا شکار رہی وہ آزادی ہند سے قبل اور مابعد بالکل مختلف تھے۔ (آزادی ہند کے بعد کے مسائل کی تفصیلات بڑی حد تک شمس الرحمان محسنی کی تصنیف ''ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تحریک'' سے ماخوذ ہیں)

8.8 امتحانات و جائزہ

امتحانات و جائزہ کے قواعد وضوابط اور اصول وقوانین جامعہ کے دستور العمل سے ماخوذ ہیں جن کے مطابق جامعہ ملّیہ میں تعلیمی سال کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

(i)۔ یکم اگست سے 28 اکتوبر تک　　　(ii)۔ 3 نومبر سے 20 دسمبر تک

(iii)۔ 5 جنوری سے ایسٹر تک (آخر مارچ یا شروع اپریل)　(iv)۔ ایسٹر اتوار کے چار روز بعد سے 31 مئی تک

تعلیمی سال کا ہر حصّہ امتحان پر ختم ہوتا تھا۔ بعض اوقات صرف ششماہی اور سالانہ امتحان پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ ترقی کیلئے سال بھر کے امتحانات کے نتائج اور اساتذہ کی ماہانہ رپورٹوں کو مدِ نظر رکھا جاتا تھا۔ سالانہ امتحان و دیگر امتحانات میں کسی طالب علم کو ہر مضمون پر جو نمبر ملتے ان کا اندراج باقاعدہ ایک رجسٹر پر ہوتا تھا جو ''رجسٹر نتائج امتحانات'' کے نام سے دفتر میں محفوظ رہتا تھا۔ یہ رجسٹر کھاتہ کی طرز پر بنا ہوتا تھا۔ اس سے بیک نظر کسی طالب علم کی پورے سال کے متعلق تعلیمی

حالت معلوم کی جاسکتی ہے۔سالانہ امتحان کے نتیجہ پر طالب علم کی ترقی کے مسئلے پر غور کرنے کیلئے اس رجسٹر سے پوری مدد ملتی تھی کیونکہ والدین کو جو ماہانہ رپورٹ بھیجی جاتی تھیں وہ اس پر مندرج ہوتی تھیں ۔امتحانات کے مکمل قواعد وضوابط مندرجہ ذیل تھے:

تاریخ: جامعہ (یونیورسٹی) کے سالانہ امتحان ہر سال ماہ اپریل میں ہوتے تھے ۔لیکن ضمنی (کمپارٹمنٹ کے) امتحانات اکتوبر میں بھی ہوتے تھے ۔سالانہ امتحانات کی تاریخوں کا اعلان دوماہ پہلے کیا جاتا تھااور ضمنی امتحان کی تاریخوں کاایک ماہ پہلے ۔جو طلبہ اکتوبر میں ضمنی امتحان نہ دینا چاہتے وہ سالانہ امتحانات کی تاریخوں میں ضمنی امتحان دے سکتے تھے۔بی۔اے آنرز کاامتحان دوحصوں میں دیا جاسکتا تھا۔

پرائیویٹ امیدوار: جامعہ کے امتحانات میں پرائیویٹ امیدوارصرف اسی صورت میں شریک ہوسکتے تھے جبکہ وہ کسی "قومی" درسگاہ میں مدرس ہوں،ان کی درخواستیں افسر مدرسہ کی وساطت سے موصول ہوں اور مجلس تعلیمی ان کو منظور کرلے ۔جامعہ کے وہ طلبہ جو کسی امتحان کاپورانصاب ختم کر چکے ہوتے لیکن خانگی معاملات کی وجہ سے امتحان میں شرکت کرنے سے پہلے ہی جامعہ سے چلے گئے ہوتے اگر بعد میں کسی دوسرے سال اسی امتحان میں ہونا چاہتے تو ان کو سابق طالب علم کی حیثیت سے بطور پرائیویٹ امیدوار کے شریک ہونے کی اجازت تھی ۔مگر جس درجہ میں وہ تعلیم پارہے تھےاس کے سوا کسی اور امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں تھی ۔

مقام امتحان: جامعہ جونیئر وسینئر اور بی۔اے کے امتحانات دہلی میں ہوتے ۔جامعہ جونیئر کا امتحان ملحقہ مدارس میں وہاں کےصدر مدرس کی نگرانی اور اہتمام میں ہوتا تھا۔

نصاب: ناکام طلبہ جب دوبارہ امتحان میں شرکت کرنا چاہتے تو انہیں اس نصاب کے مطابق امتحان دینا ہوتا جس میں اس سال اور باقی امیدواروں کا امتحان ہوتا ۔ضمنی امتحان میں شریک ہونے والے طلبہ اگر سالانہ امتحان کے چھ ماہ بعد یعنی اکتوبر میں شریک ہونا چاہتے تو اس نصاب کے مطابق امتحان دیتے جس میں وہ شریک رہ کر ناکام رہ چکے ہوتے لیکن اگر ایک سال کے بعد شریک ہوتے تو جدید نصاب کے مطابق امتحان دینا پڑتا تھا۔

ضمنی امتحانات: ضمنی امتحان نتیجہ کے دو سال کے اندر اندر پاس کرنا لازمی ہوتا تھا۔ضمنی امتحان میں ایک مرتبہ ناکام ہوجانے کی صورت میں ایک موقعہ اور دیا جاتا تھا۔دو سال گزر جانے کے بعد یا دو مرتبہ ناکام رہنے کے بعد ضمنی امتحان میں شرکت کی اجازت نہ تھی بلکہ کل مضامین میں امتحان دینا ہوتا تھا۔جامعہ جونیئر میں ضمنی امتحان میں آنے کے لئے صرف ایک مضمون میں ناکامی کی شرط تھی ۔ایک سے زیادہ مضامین میں ناکام ہوتا تو مکمل ناکام سمجھا جاتا تھا۔

- جامعہ سینئر میں اگر دو مضامین میں ناکام ہوتا تو بھی طالب علم کو ضمنی امتحان دینے کی اجازت تھی لیکن سال

آئندہ شریک ہوسکتا تھا سال کے دوران اجازت نہ تھی نیز جدید نصاب کے مطابق دینا ہوتا تھا۔

- بی اے (معمولی) میں صرف ایک مضمون میں ناکام ہونے پر ضمنی امتحان کی اجازت ہوتی تھی۔
- بی اے (امتیازی) میں ضمنی امتحان کی اجازت نہیں تھی۔

زبان: - جامعہ کے امتحانات میں تمام پرچے اُردو زبان میں ہوتے تھے۔ البتہ انگریزی، عربی، فارسی، پشتو اور سنسکرت وہندی کے پرچے حسبِ ضرورت ان ہی زبانوں میں ہوتے تھے۔

- بی اے کے طلبہ جن کی مادری زبان اُردو نہ ہو یا وہ طلبہ جن کو اجازت مل گئی ہو وہ انگریزی میں جوابات لکھ سکتے تھے۔

وقت: ہر پرچہ تین گھنٹے کا ہوتا تھا۔

نشان پرچے: جامعہ کے جملہ امتحانات میں ہر پرچہ کے پچاس نشان (Number) ہوتے تھے۔ ایک مضمون میں جتنے پرچے ہوتے اسی حساب سے اس مضمون کے مجموعی نمبر شمار کئے جاتے تھے۔

نشان سوالات: ہر پرچہ پر سوال کے آخر میں اس کے پورے نمبر درج ہوتے تھے تاکہ طالب علم کو اپنے جوابات کا اندازہ لگانے میں آسانی رہے۔

تعداد پرچے: جامعہ جونیئر و سینئر میں ہر مضمون کے دو، دو پرچے ہوتے تھے لہٰذا ہر مضمون کے 100 نمبر ہوتے تھے۔

- بی اے (معمولی) میں دینیات اور انگریزی میں دو دو پرچے ہوتے تھے جبکہ باقی کل مضامین میں تین تین۔
- بی اے (امتیازی) میں پرچوں کی تعداد حسبِ ذیل تھی۔

-	اسلامیات	= 14
-	فارسی یا انگریزی	= 10
-	عربی یا کیمیا یا اجتماعیات	= 9
-	فلسفہ	= 8

نقشہ انضباط اوقات (Date Sheet)

امتحان کی تاریخوں کا لائحہ عمل امتحان سے صرف ایک ہفتہ پہلے چسپاں کیا جاتا تھا۔

شرائط کامیابی

(الف) جامعہ جونیئر۔ جامعہ سینئر اور بی اے (معمولی) میں کامیابی کی شرائط یہ تھیں۔

- اسلامیات اور اُردو میں 33 فیصدی نمبر حاصل کرنے ہوتے تھے۔
- باقی مضامین میں 30 فیصدی۔

- کل مضامین کے مجموعی نمبروں میں 33فیصدی۔
- ہر مضمون کے مختلف پرچوں میں کم از کم دس نمبر (20فیصدی) حاصل کرنا ضروری تھے۔ مثلاً اگر ایک پرچہ میں 25 نمبر آئے دوسرے میں آٹھ تو باوجود 33فیصدی میزان ہونے کے کامیاب نہیں سمجھا جاتا تھا۔
- جس طالبعلم کے نمبر ہر مضمون میں اچھے آتے اور مجموعی طور پر بھی اس نے اچھے نمبر حاصل کئے ہوتے مگر وہ کسی ایک مضمون میں چند نمبروں سے ناکام رہ رہا ہوتا تو مجلس ممتحنین کو اختیار ہوتا تھا کہ اس طالب علم کے کم از کم اتنے نمبر بڑھا دیں جو اسکے پاس ہونے کیلئے ضروری ہوتے۔

(ب) بی اے (امتیازی) میں کامیابی کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

- آنرز کے کسی حصہ امتحان میں کامیاب ہونے کیلئے ہر پرچہ میں 40فیصدی نمبر حاصل کرنے ہوتے تھے۔
- مجموعی طور پر 45فیصدی۔
- اگر ایک ہی مرتبہ کل امتحان میں شرکت کی جاتی تو ہر پرچہ میں 35فیصدی اور مجموعہ میں 40فیصدی نمبر حاصل کرنا ضروری ہوتے تھے۔

درجہ ہائے کامیابی

(الف) جامعہ جونیئر وسینئر اور بی اے (معمولی) میں درجہ ہائے کامیابی کیلئے حسب ذیل شرائط تھیں۔

- درجہ اوّل حاصل کرنے کیلئے تمام مضامین کے مجموعی نمبروں میں سے کم از کم 60فیصدی نمبر حاصل کرنا ہوتے تھے۔
- درجہ دوم میں وہ طلبہ شمار ہوتے جن کے نمبروں کی مجموعی میزان 45فیصدی سے 59فیصدی تک ہوتی۔
- درجہ سوم میں وہ طلبہ رکھے جاتے جنہوں نے مجموعی طور سے 33فیصدی سے 44فیصدی نمبر حاصل کئے ہوتے تھے۔
- ضمنی امتحان کے طلبہ ہمیشہ درجہ سوم میں سمجھے جاتے تھے۔

(ب) بی اے امتیازی میں درجہ ہائے کامیابی کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

- اگر ایک ہی مرتبہ امتحان میں شرکت کی جاتی تو
  - 40فیصدی سے 54فیصدی تک درجہ سوم
  - 55فیصدی سے 69فیصدی تک درجہ دوم
  - 70فیصدی یا زیادہ نمبر حاصل کرنے کی صورت میں درجہ اوّل شمار ہوتا تھا۔
- اگر دو حصوں میں امتحان دیا جاتا تو
  - 45فیصدی سے 59فیصدی تک درجہ سوم
  - 60فیصدی سے 74فیصدی تک درجہ دوم

- 75فیصدی سے زائد نمبر حاصل کرنے پر درجہ اوّل میں شمار ہوتا تھا۔

کسی مضمون میں امتیاز حاصل کرنا

جس طالب علم کے کسی مضمون میں 75فیصدی یا اس سے زائد نمبر آتے تو کامیاب ہوجانے کی صورت میں اسے اس مضمون میں درجہ امتیازی(Distinction) حاصل ہوجاتا تھا۔

انعامات

طلبہ کے انعام حاصل کرنے کیلئے اساتذہ جامعہ کا بالکل جداگانہ نظریہ تھا۔ان کے مطابق ذاتی انعام حاصل کرنے سے خودغرضی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اس لئے کوشش کی جاتی تھی کہ طلبہ ایسا کام کریں جس سے ان کے مدرسہ کو دوسرے مدارس پر فوقیت حاصل ہو یا ان کے دارالاقامہ یا ان کے درجہ کو دوسرے دارالاقاموں یا درجوں کے مقابلے میں کوئی امتیازی درجہ حاصل ہو۔یعنی وہ من حیث الجماعت ترقی کرنے کی کوشش کریں جس سے انہیں ملک قوم کی فلاح و بہبود کیلئے متفقہ کوشش کرنے کی عادت ابتداء ہی سے پڑ جائے۔مثلاً طلبہ کو امتحان میں اور ہر مضمون میں اوّل آنے پر انعام کا مستحق سمجھنے کے علاوہ یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ مدرسہ میں کس طالب علم کے تمام لڑکوں کے مقابلہ میں فیصدی نمبر زیادہ آئے۔اس نتیجہ پر نہ صرف وہ طالب علم بلکہ اس کی پوری جماعت فخر کرتی تھی۔

- وہ جماعت سب سے زیادہ مبارک باد کے قابل سمجھی جاتی تھی جس میں زیادہ طالب علم پاس ہوئے ہوں۔
- ایک ہی جماعت میں طلبہ کو دو، دو تین، تین گروہوں میں تقسیم کرنے کے بعد مختلف تعلیمی کھیل کھلائے جاتے اور ہار جیت نمبروں پر ہوتی تھی۔

(مندرجہ بالا اصول و ضوابط کے تفصیلی ماخذ یہ دستور العمل ہیں: 1۔محمد علی جوہر مولانا 1920ء متعدد صفحات، 2۔محمد علی مولانا جوہر 1932ء ص 81-88)

8.9 تنقیدی مطالعہ

29اکتوبر 1920ء بروز جمعتہ المبارک علی گڑھ کالج میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ وجود میں آئی۔اس کے بانی مولانا محمد علی جوہر اس کے پہلے شیخ الجامعہ (پرنسپل) تھے(عشرت رحمانی (س ن)ص 54) جبکہ پہلے امیر جامعہ حافظ حکیم اجمل خان تھے۔اس کی باقاعدہ مجالس کارکن تھیں۔1925ء میں بعض وجوہ کی بنا پر جامعہ ملّیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوگئی۔ اوراس کا نیا تعلیمی سال اگست 1925ء سے دہلی کے ایک دورافتادہ علاقے قرول باغ میں شروع ہوا۔جہاں اس کیلئے طبیہ کالج کے نزدیک چند کوٹھیاں کرائے پر لی گئی تھیں۔1931ء میں تعلیمی مرکز کی پہلی عمارت قرول باغ میں بنائی گئی اور 1935ء میں اوکھلے میں جامعہ کے لئے زمین خرید کر مدرسے کے سب سے چھوٹے طالب علم سے عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا

گیا۔اس طرح 1936ء میں ابتدائی اسکول اپنی مستقل آبادی جامعہ نگر منتقل ہوا تھا۔(طفیل احمد' منگلوری (س ن)' ص245)

29 اکتوبر 1945ء کو جامعہ کا جشنِ سیمیں (سلور جوبلی) منایا گیا۔آزادی کے بعد مختلف حالات وواقعات کے سرد وگرم سے گزر کر 1963ء میں جامعہ کو اعلیٰ تعلیم کے ادارہ کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا اور یو۔جی۔سی کی طرف سے گرانٹ ملنے لگی تو جامعہ کی عمارات ہی میں اضافہ نہیں ہوا بلکہ کافی نئے شعبہ جات کا قیام بھی عمل میں آیا۔اس مختصر پس منظر کے ساتھ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے تنقیدی مطالعہ کو ہم یوں پیش کرسکتے ہیں ۔(لعل احمد تھیم 1973ء ص 131)

- جامعہ نے سیکولر تعلیم کو بنیادی طور پر غلط قرار دیا۔اسی طرح سیکولر تعلیم میں محض دینیات کے اضافے کو بھی ناکافی سمجھا۔اس کے بانیوں نے یہ تصور پیش کیا کہ تعلیم کو علوم جدیدہ اور دین کا جامع ہونا چاہیے اور طالب علم کو بیک وقت دونوں میں مہارت حاصل ہونی چاہیے۔اس کیلئے دین کی معقول تعلیم کا تقریباً ہر مرحلے پر انتظام کیا گیا۔قرآن پاک اور سیرت نبوی ﷺ کے مطالعے کو جزونصاب بنایا گیا۔عربی کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا اور علوم اسلامی میں اختصاصی تعلیم کی گنجائش پیدا کی گئی۔انگریزی کی بجائے جامعہ نے اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا(محمد علی جوہر مولانا 9۔جنوری 1928)۔یہ صحیح ہے کہ اس باب میں اوّلیت کا شرف جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کو حاصل ہے۔جس نے 1918ء میں اُردو کو یہ حیثیت دی تھی۔لیکن جامعہ ملّیہ کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ غیر ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا غلامانہ طریقہ ترک کیا۔خصوصیت سے اس لئے کہ جامعہ ملّیہ کی حیثیت ملک گیر تھی۔یہ ایک انقلابی قدم تھا۔اگر اس روش کو مسلمانوں کے تمام تعلیمی ادارے اختیار کرلیتے تو آج ہماری کیفیت بڑی مختلف ہوتی۔(خورشید احمد' پروفیسر (س ن) ص125)
- جامعہ کی ایک اور خصوصیت صنعت وحرفت کی تعلیم تھی۔جامعہ ملّیہ مسلمانوں کا جدید تعلیم کا وہ واحد ادارہ تھا جس نے تعلیم کا رشتہ ملازمت سے کاٹ کر معشیت کے گوناگوں تقاضوں سے جوڑا اور حرفی تعلیم کے ذریعے معاش کے آزاد ذرائع کا بندوبست کیا۔اس طرح وقت کے ایک اہم تقاضے کو ہی پورا نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں کے پرانے اور وسیع وہمہ گیر تصور تعلیم کو از سرنو زندہ بھی کیا گیا۔اس کا سیاسی اثر یہ ہوا کہ اس کے تعلیم یافتہ افراد انگریزی حکومت کے دستِ نگر نہ رہے اور ان میں حریت پسندی کا جذبہ پروان چڑھا۔(محمد عیسیٰ خان 1999ء ص 251)
- جامعہ نے تعلیمی ماحول میں بڑی سادگی قائم کی۔اساتذہ اور طلبہ سب کی زندگی قناعت کا نمونہ تھی۔علی گڑھ میں جو نوابی ماحول پیدا کیا گیا تھا اس پر اُٹھنے والے اخراجات عوام کے بچوں کے بس کی بات نہ تھی۔اس لئے علی گڑھ کالج راجوں،مہاراجوں اور جاگیرداروں کے بچوں کے لئے مخصوص ہوکر رہ گیا تھا۔جامعہ ملّیہ میں اساتذہ نے سادگی کا نمونہ پیش کرکے اپنے کردار کے ذریعے طلبہ کو سادگی کی تعلیم دی کیونکہ سادگی کے بغیر فرد سے کسی طرح کے ایثار کی توقع عبث ہے اور اسراف کی وجہ سے فرد کو ضمیر فروشی تک کرنی پڑتی ہے۔(نذیر احمد' خواجہ ڈاکٹر' اکبر علی

ڈاکٹر 1987ء ص 53)

- جامعہ ملّیہ نے اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں ہی تصنیف وتالیف پر خصوصی توجہ دی۔ یہاں اُردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا جس کی نگرانی کے فرائض ڈاکٹر عابد حسین نے انجام دیئے۔اس ادارے نے بچوں کے ادب سے لے کر بہترین افسانے، ناول، درسی وغیرہ درسی کتب اور بعض علمی وسوانحی کتب شائع کیں۔اس ادارے نے مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو اہل قلم اور قائدین کے خیالات بھی اُردو میں منتقل کئے۔ بلکہ اس کی نگرانی میں یورپ کی معیاری کتب کے ترجمے اور دوسری علمی کتب بھی شائع کی جاتی تھیں۔(شمس الرحمان محسنی 1986ء ص 84-85)

- سیّد الطاف علی بریلوی نے 1937ء میں جامعہ ملّیہ دہلی کا دورہ کیا۔اپنے تاثرات میں وہ لکھتے ہیں کہ: جامعہ کی سیر میں سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ہر ایک چھوٹے بڑے کارکن کا اخلاق، خالص علمی فضاء اور سادہ اسلامی معاشرت تھی۔(الطاف علی، بریلوی سیّد 1995ء ص 62)

- جامعہ ملّیہ محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک تعلیمی اسلامی احیاء کی تحریک تھی۔ جو صرف علی گڑھ تک محدود رکھنے کے کیلئے شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا مقصد پورے ملک میں پھیل کر ہندوستانی مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانا تھا۔ترک موالات سے پہلے مسلم رہنما علی گڑھ کالج کو ایک مسلم یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے جسے ملک کے ہر حصے کے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کا حق حاصل ہوتا۔تا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کیلئے ایک ہمہ گیر قومی نظام تعلیم کی تعمیر کر سکیں۔حکومت نے مجوزہ علی گڑھ یونیورسٹی کو یہ حق دینے سے انکار کر دیا تھا لیکن جامعہ ملّیہ اسلامیہ نے حکومت کے اثر سے آزادہ کر اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس سے ملک کے کئی اسکول اور کالجوں نے الحاق کرالیا۔1924ء تک سترہ اسکول اور کالجوں نے جامعہ ملّیہ سے اپنا الحاق منظور کرالیا تھا۔

- جامعہ ملّیہ کے فلسفی اور مفکر ڈاکٹر عابد حسین کے نزدیک جامعہ ملّیہ اسلامیہ تین تحریکوں کا سنگم تھا۔ان میں سے ایک مذہبی اور اخلاقی اصلاح کی علمبردار دیوبند کی تحریک تھی اور دوسری جدید مغربی تعلیم کی ترجمان علی گڑھ کی تحریک جبکہ تیسری گاندھی جی کی قومی یک جہتی اور قومی خدمت کی تحریک۔اسی لئے جامعہ جہاں اسلامیہ ہے، دوسری طرف ملّیہ بھی ہے۔(ایس۔آر محسنی (س ن) ص 17)

- جامعہ نے ایثار وقربانی کا اعلیٰ نمونہ بھی پیش کیا۔خصوصاً جامعہ کے اساتذہ نے ایسی سپرٹ کا مظاہرہ کیا جو مسلمان معلّمین تاریخ میں ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔اعلیٰ سے اعلیٰ صلاحیت کے اساتذہ نے نہایت معمولی تنخواہوں پر خدمات انجام دیں۔ان قابل عزت لوگوں نے کثیر رقمیں خرچ کر کے ہندوستان و یورپ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد نہایت معمولی مشاہروں پر قومی خدمت کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں۔ حالانکہ انہیں اعلیٰ ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ہندو یونیورسٹی بنارس، ڈی۔اے۔وی کالج لاہور، سرونٹس آف انڈیا

سوسائٹی پونا میں اس ایثار وقربانی کی بیسیوں مثالیں موجود تھیں۔مسلمانوں میں اس صفت کا جس کے بغیر قومی ترقی کی امید ایک خام خیال ہے اب تک فقدان رہا تھا۔لیکن جامعہ ملّیہ کے اساتذہ اور کارکنوں نے اس کے نمونے پیش کیے (محمد اکرام شیخ 1963ء ص 154)۔جامعہ میں اس وقت اساتذہ کی دل چسپی کا یہ حال تھا کہ اس ادارے کو چلانے والے بھی وہی تھے۔حکم کرنے والے بھی،یعنی حاکم ومحکوم دو الگ الگ گروہ نہ تھے۔جو لوگ مزدوروں کی طرح دن رات مختلف کاموں میں جتے رہتے تھے۔وہی حاکم اعلیٰ بھی تھے اور اس ادارے کو چلانے والے بھی،یعنی خود اس کے اپنے فرزند تھے۔اسی لئے بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو نے کہا:

They built up the Jamia Millia stone by stone and sacrifice by sacrifice.(www.jami.nic.in,26-4-2006)

- جامعہ میں اساتذہ اور طلبہ کے تعلقات گہرے تھے۔جامعہ کی اس خصوصیت اور کاموں کا اثر تھا کہ بیرونِ ممالک سے لوگ یہاں آکر پڑھانا پسند کرتے تھے۔جیسا کہ مندرجہ بالا ویب سائٹ میں درج ہے۔

Foreigners, impressed by Jamia, began working in Jamia. The German lady Ms. Gerda Philipsborn (Popularly known as Apa jan) served Jamia for many yeares and is buried in Jamia.(www.jami.nic.in,26-4-2006)

- جامعہ کی علمی روایات زیادہ صحت مند اور امید افزاء تھیں۔جامعہ کے اساتذہ نے اپنی علمی کاوشوں کو برقرار رکھا اور تحقیق وتفتیش کے میدانوں میں برابر داد دیتے رہے۔ڈاکٹر ذاکر حسین،ڈاکٹر عابد حسین،پروفیسر محمد مجیب،مولانا اسلم جیراج پوری وغیرہ کی تصانیف علمی دنیا میں ایک مقام رکھتی تھیں۔(خورشید احمد،پروفیسر 1977ء ص 91)
- جامعہ ملّیہ اسلامیہ نے ہندوستان کی آزادی سے پہلے نہ تو سرکاری گرانٹ لی اور نہ کسی دوسرے سے مشروط مالی امداد۔اس طرح وہ حکومت کے اثر اور ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے آزاد رہی۔اس پابندی کی وجہ سے جامعہ کے عہدیداروں اور کارکنوں کو بڑی کٹھن منزلوں اور دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ اپنی اس آزادی کو کسی قیمت پر کھونے کیلئے تیار نہ ہوئے۔غلطی کرنے کی آزادی،اپنی رائے اور اپنی مرضی،اپنی ہر غلطی کو درست کرنے کا حق انہیں بہت عزیز تھا۔جامعہ کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ اپنی اس آزادی کے سہارے ملک اور قوم کی ضروریات کے پیشِ نظر تعلیم کی نئی راہیں اور مفید ذرائع تلاش کرنے میں لگے رہے۔(محمد علی جوہر مولانا 1928ء ص 4)
- اپنی حکمت تدریس،ہیئتِ تعلیم،نصاب اور ماحول کی وجہ سے بلکہ سب سے بڑی ایثار وقربانی کی عمدہ مثال کی وجہ سے جامعہ کی شہرت دور دور تھی۔اس کی ویب سائٹ کے مطابق:

After the attainment of Independence, Jamia continued to grow as an academic institution with a difference. Many foreign dignitaries made it a point to visit Jamia Millia Islamia during their visit to New Dehli. Among those who visited Jamia include Marshal Tito (1954), King Zahir of Shah of Afghanistan(1955) ,Crown Prince Faisal of Saudi Arabia,King Raza Shah Pehlavi of Iran (1956) and Prince Mukarram Jah (1956). (www.jami.nic.in,27-4-2006)

- جامعہ ملیہ مختلف حیثیتوں سے ایک بڑا کامیاب تجربہ رہا لیکن یہ بھی قومی زندگی پر اپنے ہمہ گیر اثرات نہ ڈال سکی اسکی وجوہ یہ تھیں۔
  - حکومت کی طرف سے مکمل عدم تعاون اور وہ مشکلات جو ہر نئی راہ نکالنے والوں کو ایک مدت تک پیش آتی رہتی ہیں۔
  - جس حیثیت سے جامعہ کا کردار ذہنی پریشانی بنا وہ یہ کہ جامعہ نے بیک وقت اسلامی اخوت اور متحدہ قومیت کا راگ الاپا، ان میں جو بنیادی تضاد تھا اُسے آخر تک بھی محسوس نہ کیا۔(خورشید احمد،پروفیسر (س ن)،ص 126)
  - بتدریج یہاں لادین عناصر دخیل ہوگئے۔حتیٰ کہ جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل کا بھی خاتمہ ہوگیا۔دیوبند سے رشتہ تو قائم نہیں ہوا۔البتہ ہندوؤں کے یہاں بڑا تقرب حاصل ہوگیا۔جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے نام سے قائم ہونے والی درسگاہ عملاً جامعہ ملیہ ہندیہ بن کر رہ گئی۔(محمد سلیم،پروفیسر سیّد 1993ء ب،ص 286)
  - جامعہ ملیہ کانگریس کے ساتھ اس وجہ منسوب ہوگئی تھی کہ مسلمان اپنی آزاد قومیت کے احساس اور اس کو منوانے کی جدوجہد میں اس ادارے کو اپنا نہیں سکے اور نہ ان کا پیغام ان کی رگ و پے میں اتر سکا۔یہ جامعہ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔اگر اس سے بچا جاتا تو نہ راستے کی مشکلات اس کے قدم روکتیں اور نہ حکومت کی مخالفت اس کیلئے سنگِ راہ ثابت ہوتی۔فکر و نظر کا یہ تناقض اس کی پیش قدمی میں حائل ہوا اور یہ تجربہ اپنے صحیح رنگ میں نہ ہو سکا۔یہ بھی جامعہ کی بدقسمتی رہی کہ اسلامیات کا شعبہ بڑی مدت تک ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں رہا،جس کے علم و فضل کے بارے میں تو کچھ کہنا نہیں چاہیے لیکن جس کے عقائد و تصورات امت کے تصورات سے مختلف تھے۔انکارِ حدیث کی بنا پر مسلمان قوم بجا طور پر ان کے خیالات سے اِختلاف کرتی تھی۔(خورشید احمد،پروفیسر 1977ء،ص 91)

باب نہم

پنجاب، سندھ اور سرحد کی تعلیمی تحریکیں

1854ء کے تعلیمی مراسلے "وُوڈ ڈسپیچ" میں سرکاری تعلیمی اداروں کو عملی طور پر عیسائی مشنریوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد 1882ء میں ہنٹر کمیشن میں سر سیّد احمد خان کو بطور ممبر نامزد کیا گیا تو انہوں نے ہنٹر سے اختلاف کی بنا پر شروع ہی سے استعفیٰ دے دیا (آبادشاہ پوری 1989ء ص 66)۔ پھر ان کی جگہ ان کے صاحبزادے کو اس کا رکن مقرر کر دیا گیا۔ اس کمشن نے مسلمانوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی اور یہ فیصلہ ہوا کہ مسلمان بچوں کو وظائف دیئے جائیں گے۔ اسلامی مکاتب کی حوصلہ افزائی کی جائے گی اور سرکاری اسکول جہاں مسلمان بچوں کی معقول تعداد ہو وہاں پر اُردو اور فارسی زبان کی تدریس کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ ان اقدامات کے نتیجہ میں سرکاری اسکولوں پر مسلمانوں کا اعتماد کچھ حد تک بحال ہوا۔ وہ اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل کروانے لگے۔ مگر جب برصغیر کے تعلیم یافتہ افراد نے انگریزوں کے اپنے ملک میں نافذ نظام تعلیم اور ہندوستان کیلئے تجویز کردہ نظام تعلیم کا بغور مشاہدہ کیا تو دونوں نظاموں میں واضح تضاد محسوس کیا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں نافذ تعلیمی نظام کی بنیاد انگریز حاکموں کے مفادات پر مبنی ہے اور ان ہی کے مقاصد کو پورا کر رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے ایسے نظام تعلیم کی ضرورت محسوس کی جس کی بنیاد ان کے اپنے فلسفے، احساسات اور نظریات پر ہو۔ لہٰذا ایک طرف تو مذہبی مسلمان رہنماؤں نے ایسے نجی مدارس قائم کئے جن کے نصاب کا بیشتر حصہ دینی علوم پر مشتمل تھا (محمد سلیم، پروفیسر سیّد 1996ء، ص 140) تو دوسری طرف ایک نیا مکتب فکر سامنے آیا جس نے مسلمانوں کو بحیثیت قوم یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ حکومت اور معاشرے سے الگ رہ کر زندہ رہنا اور عملی زندگی سے قطع تعلق کر لینا نقصان دہ ہے۔ ان کے مطابق حالات کے پیش نظر ملکی امور میں حصہ لینا چاہیے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ نئے تعلیمی اداروں میں شریک ہو کر مروجہ مغربی علوم کی تحصیل کی جائے اور مسلمانوں کے دینی علوم کے تقاضے پورے کرنے کیلئے جدید نصاب تعلیم میں اسلامی تعلیمات کا ایک مضمون دینیات کے نام سے شامل کر لیا جائے۔ اس مکتب فکر کے سب سے بڑے داعی سر سیّد احمد خان تھے جنہوں نے تحریک علی گڑھ کی بنیاد رکھی (نذیر احمد، خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی، ڈاکٹر 1987ء ص 48)۔ تحریک علی گڑھ کے نتیجہ میں پنجاب اور دوسرے صوبوں میں بھی تحریکیں ابھریں۔ اس باب میں پنجاب، سندھ اور سرحد کی تحریکوں کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

9.1 انجمن حمایت اسلام لاہور

پس منظر

1857ء کے انقلاب کے بعد عیسائی مشنریوں کا ایک سیلاب تھا جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔عیسائی مبلغ سرکاری افسروں کی سرپرستی میں عیسائیت کی تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے ۔سرکاری اہتمام میں جلسے کئے جاتے اوران میں پادری عیسائیت کی تبلیغ کرتے اسلام کے بارے میں ناروا باتیں کہتے ،مسلمانوں کے جہل اور حکومت کی سطوت سے فائدہ اُٹھاتے ۔مشنری اسکولوں کا ایک جال تھا جو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا گیا تھا۔جہاں عیسائی مذہب کی تعلیم دی جاتی ۔ہسپتالوں میں غیر عیسائی مریضوں کو عیسائیت کی تلقین کی جاتی ،عیسائی عورتیں ہندو ،مسلمان گھرانوں میں سلائی کڑھائی کا کام سکھانے یا تعلیم کے بہانے جاتیں اور رفتہ رفتہ مسلمان خواتین وبچیوں کے عقیدوں کو بگاڑتیں ،مسلم گھرانے اسلامی تعلیمات سے عدم واقفیت ،توہمات ،معاشی بدحالی وغیرہ میں مبتلا تھے پھر حکومت کی جانبداری سے خوف زدہ بھی تھے ۔لہٰذا عیسائی مشنریوں اور آریہ سماج تنظیمیں غریب ونادار مسلمانوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں مرتد بنانے کے لئے سرگرم عمل تھیں ۔(ریحانا کرام 1996ء،ص 69)

ایک مسلمان بیوہ اپنی بچی کے علاج معالجہ کیلئے مشن ہسپتال میں داخل ہوئی اس کے پاس علاج کیلئے خاطر خواہ رقم نہ تھی ۔اس کی کم مائیگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسے مفت علاج کے عوض عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ کرلیا گیا ۔ اس واقعہ نے لاہور کے چند غیرت مند مسلمانوں کو پیچ پا کر دیا وہ ان عیسائی مشنریوں اور آریہ سماج تنظیموں کے خلاف کمربستہ ہوگئے مولانا قاضی حمید الدین کی سربراہی میں وہ اس صورت حال کے تدارک کیلئے اکٹھے ہوئے اور انجمن حمایت اسلام کا قیام عمل میں آیا جب 1884ء میں اسکا قیام عمل میں آیا تو اس کے صرف پانچ رکن اور عہدہ دار تھے ۔ (خالد شفیق 1998ء،ص 30)

صدر	قاضی خلیفہ محمد حمید الدین
رہبر اعلیٰ	مولوی غلام اللہ قصوری
نائب دبیران	منشی چراغ الدین اور منشی پیر بخش
خزانچی	منشی عبد الرحیم خان دہلوی

اس کے دفتر کے لئے ڈپی بازار لاہور میں کرنل سکندر خان کی حویلی میں اڑھائی روپے ماہوار پر مکان کرایہ پر لے کر اس کا صدر دفتر قائم کیا گیا اور ایک معروف مولوی سیّد احمد علی شاہ کی خدمات ایک قلیل سی رقم بطور وظیفہ پر حاصل کی گئیں تا کہ عیسائی مشنریوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا توڑ کیا جا سکے ۔چھ ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد 24 ستمبر 1884ء کو مسجد بکن خان اندرون موچی دروازہ میں انجمن کا پہلا اجلاس ہوا اور یہی دن انجمن کا یوم تاسیس قرار پایا ۔انجمن کو سوسائٹیز

رجسٹریشن ایکٹ مجریہ 1860ء کے تحت رجسٹر کروایا گیا۔(پیام شاہجہان پوری 1970ء ص 130)

انجمن حمایت اسلام: مقاصد

انجمن حمایت اسلام کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

1۔ اسلامی تعلیمات اور اسلام کے مخالفین کے جواب تحریری وتقریری تہذیب کے ساتھ دیئے جائیں۔اس غرض کے لئے واعظوں کا تقرر، رسالے کا اجراء اور دیگر وسائل کو عمل میں لانا۔

2۔ مسلمان لڑکیوں اور لڑکوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا تا کہ وہ غیر مذہب کی مذہبی تعلیم کے بُرے اثرات سے محفوظ رہیں۔

3۔ اہل اسلام کو اصلاحِ معاشرت وتہذیبِ اخلاق، تحصیلِ علوم دینی ودنیوی، باہمی اتحاد اور اتفاق کا شوق دلانا۔
(محمد نسیم عثمانی 1983ء ص 285)

ویب سائٹ "سٹوری آف پاکستان" کے مطابق انجمن حمایت اسلام کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

(a) To arrange for the religious and general education of Muslim boys and girls;

(b) To propgate and defend Islam against the Chirstian missionaries and Hindu revivalists;

(c) To counteract the propganda against Islam through speechs and publications. (www.storyofpakistan.com 2002, page 2 of 2)

انجمن حمایت اسلام کے منظور کردہ آئین میں انجمن کے مقاصد یوں بیان کئے گئے ہیں۔

الف: مقدس مذہب اسلام کی حمایت واشاعت۔

ب: مسلمانوں کے مذہبی، تاریخی اور دیگر علوم وادب کی حفاظت واشاعت۔

ج: مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی دینی ودنیوی تعلیم وتربیت کا انتظام۔

د: لاوارث، مفلس، یتیم ومسکین مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں ومستحق بیواؤں کی پرورش اور ان کی دینی ودنیوی تعلیم وتربیت کا انتظام۔

ہ: مفلس مسلمان بچوں کی دینی ودنیوی تعلیم میں امداد دینا۔

و: مسلمانوں کو پابندی مذہب، اصلاح طرز معاشرت، تہذیب واخلاق، تحصیل علوم دینی ودنیوی اور باہمی اتحاد واتفاق کا شوق دلانا۔تجارت کے فوائد سے آگاہ کرنا۔ان کیلئے صنعت وحرفت کی تعلیم کا مناسب انتظام کرنا اور عام طور پر ان کی ترقی وبہبودی کے وسائل پیدا کرنا اور ان کو مالی تقویت دینا۔

ز: حکومت کو مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کی طرف وقتاً فوقتاً توجہ دلانا۔

انجمن اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے مناسب ذرائع اختیار کرے گی جن میں مفصلہ ذیل بھی شامل ہوں گے۔

- واعظوں اور سفیروں کا تقرر، اخبار کا اجراء۔
- رسالوں و کتب کی تالیف و تصنیف و اشاعت اور وظائف کا عطا کرنا۔
- اسلامی کتب خانوں، مردانہ و زنانہ تعلیم گاہوں، دارالشفقت اور اسلامی انجمنوں کی تشکیل و الحاق اور عام جلسوں کا منعقد کرنا۔
- انجمن کی تعلیم گاہوں کے جملہ طلبہ اور مردانہ و زنانہ دارالشفقت میں رہائش رکھنے والے جملہ یتامیٰ و مساکین اور بیواؤں کیلئے دین اسلام کی تعلیم لازمی ہوگی۔
- انجمن کے ہر ایک ادارے میں خلاف شرع امور و خلاف شرع تفریح ممنوع ہوگی۔ ہر شکایت کا فیصلہ اس کی نوعیت کے لحاظ سے کمیٹی متعلقہ اور اسلامیہ جونیئر ماڈل سکول بورڈ کریں گے۔
- انجمن اور اس کے تمام شعبوں کی زبان اردو ہوگی۔
- انجمن کا صدر مقام لاہور ہوگا مگر اس کی شاخیں دیگر مقامات میں بھی قائم ہو سکیں گی۔
- انجمن کو اختیار ہوگا کہ کسی دیگر انجمن کو اپنی شاخ مقرر کرے اور اسلامی و تعلیمی معاملات میں دیگر اسلامی انجمنوں کا تعاون و اشتراک عمل حاصل کرے بشرطیکہ جس انجمن کو شاخ بنایا جائے یا جس سے تعلق پیدا کیا جائے اس کے مقاصد اس انجمن کے مقاصد سے متضاد نہ ہوں۔(فیاض حسین، سید قادری 1960ء ص 3-4)

انجمن حمایت اسلام: وسائل

انجمن کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ابتداء ہی سے مسلمانان پنجاب کی دریا دلی اور فیاضی رہا ہے۔ ابتداء میں بانیان کرام ماہوار چندہ کے علاوہ عموماً ہر ایک جلسہ میں کچھ نہ کچھ یکشت عطیات نقد دیا کرتے۔ اس کے علاوہ مختلف مسلمان گھرانوں میں مٹی کے برتن رکھے گئے جن میں نیک دل خواتین دونوں وقت آٹا گوندھنے سے قبل مٹھی بھر آٹا ڈال دیا کرتی تھیں۔ اس آٹے کو گھر گھر سے فراہم کرنے کیلئے کوئی ملازم نہ تھا بلکہ مجلس منتظمہ کے مقتدر اور معزز ارکان نے یہ کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ یہ بزرگوار ہر ہفتے بوریاں اٹھائے ہر گھر پہنچتے۔ آٹا لیتے، خود اٹھاتے اور فروخت کر کے موصولہ رقم انجمن کے خزانے میں جمع کرواتے۔ ان ''قومی گداگروں'' میں عمائد وا کابر شہر شامل تھے۔ اسی زمانے میں لوگوں کو اس طرح آٹا جمع کرنے کا شوق دلانے کے لیے نظمیں لکھ کر چھپوائی اور عوام میں تقسیم کی جاتی تھیں۔(عبدالقادر، سید پروفیسر 1998ء ص 23)

مولانا غلام دستگیر قصوری نے عیسائیوں کے ایک رسالہ موسومہ تحریف القرآن کے جواب میں ایک رسالہ تصنیف کر کے انجمن کے حوالے کیا تا کہ انجمن اسے اپنے خرچ سے چھپوائے اور اس کی آمدنی اپنے خزانے میں جمع کرے۔ انجمن نے اسی سال یہ رسالہ شائع کیا۔ اس طرح سلسلہ تالیفات کی ابتداء ہوئی۔ اگلے سال انجمن نے درسی کتب تیار کرانی شروع

کیں۔یوں کتب خانے کی بنیاد پڑنے پر چند صاحب تصنیف بزرگوں نے اپنی اپنی مطبوعہ تصانیف معقول تعداد میں بھیجنی شروع کیں۔ان بزرگوں میں سے خان بہادر خلیفہ سیّد محمد حسن (سی۔آئی ای وزیر اعظم پٹیالہ) کا اسم گرامی قابل ذکر ہے۔ جنہوں نے اپنی تصنیف اعجاز التنزیل کی تین سو جلدیں مالیتی -/975 روپے انجمن کو عطیہ کیں۔چنانچہ کتب خانہ بھی انجمن کی آمدنی کا ایک معقول وسیلہ بن گیا۔(محمد حیات خواجہ (س ن) ص 3)

قیام کے پہلے ہی سال انجمن حمایت اسلام کے کارکن عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر لوگوں کے گھروں میں ذبیحات کی کھالیں وصول کرنے کیلئے پہنچے۔اگرچہ اس وقت صرف سات روپیہ بارہ آنہ قیمت کی کھالیں جمع کر سکے۔لیکن آئندہ کیلئے یہ بھی آمدنی کا ایک معقول ذریعہ ثابت ہوا۔1887ء میں فیروز پور کے ایک صاحب (جن کا نام رجسٹر سے پڑھا نہیں جاتا) نے ایک مکان انجمن کے نام وقف کر کے اسے فروخت کی بھی اجازت دے کر ایک اور ذریعہ امداد کے لئے نیک مثال قائم کی۔اسی سال مسلمان دوکانداروں کی دکانوں پر مقفل صندوقچیاں رکھی گئیں۔یہ لوگ کچھ عطیات اپنے مسلمان گاہکوں سے لیتے اور کچھ شام کو اپنی گرہ سے ان صندوقچیوں میں ڈالتے۔اسی سال شیخ مہر علی رئیس اعظم ہوشیار پور نے ایک مقدمہ میں فتحیابی حاصل کرنے پر ایک ہزار ایک سو کی گراں قدر رقم جو انہوں نے بطور منت انجمن کو دینے کا وعدہ کیا تھا ارسال کی۔اس سے اگلے سال شیخ میراں بخش پرائیویٹ سیکرٹری مہاراجہ جموں وکشمیر نے مبلغ سات سو روپیہ عنایت کیے۔1886ء میں انجمن نے مدرستہ المسلمین کی بنیاد رکھ دی تھی۔اس کے طلبہ کی معمولی فیس بھی انجمن کی آمد کا ایک ذریعہ بن گئی۔1887ء میں یتیم خانہ قائم ہوا۔جسے جنوری 1891ء میں پنجاب گورنمنٹ نے تسلیم کرلیا اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں یتامیٰ کو اس یتیم خانہ میں داخلہ کی ہدایات دیں۔(خالد شفیق 1998ء ص 35)

اسی سلسلہ میں مختلف ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے انجمن کو سالانہ امداد ملنی شروع ہوئی۔سب سے پہلی رقم ہوشیار پور سے آئی۔1893ء میں اسلامی ریاستوں کی جانب سے پہلی رقم مبلغ دو ہزار روپیہ انجمن کو موصول ہوئی جو نواب شاہ جہان بیگم والئی ریاست بھوپال نے فریضہ حج سے واپسی پر ارسال کی (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد اول 1987ء ص 138)۔1893ء میں نواب بہاولپور نے یتیم خانہ کا دورہ کیا۔دوسرے سال انجمن کا وفد بہاولپور پہنچا۔یہ وفد -/600 روپے سالانہ وظیفہ کا حکم لے کر واپس آیا۔یہ وظیفہ 1908ء سے دو ہزار روپیہ سالانہ ہوگیا۔انجمن کو سالانہ وظیفہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً خاص امداد کے ذریعہ قریباً ایک لاکھ روپیہ بصورت عطیات تعمیر وصول ہوئے۔1908ء میں اسلامیہ کالج کی تعمیر کے وقت پچاس ہزار روپیہ کا یکمشت عطیہ اور 1930ء میں 50 ہزار روپیہ کا عطیہ قابل ذکر ہیں۔اسی طرح والئی افغانستان نے بھی شجرا انجمن کی آبیاری میں معتد بہ حصہ لیا۔1896ء میں جب شہزادہ نصر اللہ انگلستان تشریف لے گئے تو استقبالیہ وفد کو لاہور ریلوے سٹیشن پر پانچ ہزار روپیہ عطا کیے۔اس کے بعد امیر حبیب اللہ خان نے 1902ء میں صوفی غلام محی الدین وکیل انجمن کو دربار افغانستان میں طلب کر کے انجمن کیلئے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ کا اعلان کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی صوفی غلام محی الدین کو ایک سو پچیس روپیہ ماہوار وظیفہ دے کر انجمن کی خدمت کیلئے اپنا نمائندہ مقرر کیا۔

ان کے علاوہ شاہی خاندان کے افراد نے صوفی غلام محی الدین کے ہاتھ تین سو پونڈ بھیجے۔(محمد حیات، خواجہ (س ن)ٔ ص 5)

انجمن کی امداد میں گورنمنٹ پنجاب نے بھی حصہ لیا۔ سالانہ تعلیمی گرانٹ کے علاوہ گورنمنٹ نے انجمن کو ایک لاکھ روپے سے زائد رقم تعمیر عمارات کے سلسلہ میں عنایت کی۔ علاوہ ازیں 1914ء سے 1930ء تک اسلامیہ کالج کو قریبا ساڑھے تیرہ لاکھ روپیہ خاص گرانٹ ملی۔ مزید برآں 1925ء سے 1927ء تک تین اقساط میں تیس ہزار روپیہ کا عطیہ یتیم خانہ کو دیا گیا۔ 1938ء میں جشن جوبلی کے موقعہ پر پچیس ہزار کی گرانقدر رقم عنایت کی۔ گورنمنٹ کے علاوہ پنجاب کے بیشتر مخیّر حضرات نے انجمن کی ہر ضرورت کے وقت اس کی آواز پر لبیک کہا۔ اسلامیہ کالج کی تعمیر کے وقت کئی مخیّر حضرات نے اپنے خرچ سے کمرے بنوائے۔ کئی حضرات نے جائیدادیں وقف کر کے انجمن کی تحویل میں دے دیں۔ جن میں سے میاں محمد حسین ساکن میاں میر، میاں حسین بخش ساکن انبالہ چھاؤنی اور سیّد مبارک شاہ کے اوقاف قابل ذکر ہیں۔ بیرون از پنجاب اوقاف میں سے شہر دہلی میں آبادی بیگم کا وقف تھا جس سے پینتیس روپیہ ماہوار کرایہ وصول ہوتا تھا۔ معصوم النساء ساکن بریلی کے وقف سے دو سو روپیہ سالانہ حاصل ہوتا تھا۔ 1938ء میں جوبلی کے موقعہ پر انجمن کو دو وقف مزید حاصل ہوئے۔ ان میں سے ایک خان بہادر شیخ عبدالعزیز ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس پنجاب کا رہائشی مکان واقعہ گجرات اور دوسرا پندرہ مربعہ اراضی واقع مظفر گڑھ موقوفہ شاہنواز (سی۔آئی۔ای) تھا۔(محمد حیات خواجہ (س ن)ٔ ص 8)

بعض حضرات نے تو جائیدادیں وقف کیں لیکن بعض حضرات نے انجمن کو نقد روپیہ دیا۔ تا کہ انجمن اپنی حسب منشا جائیداد خرید کر اس کی آمدنی سے مستفیض ہوتی رہے۔ اس سلسلہ میں میاں اللہ بخش قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے جولائی 1929ء میں بائیس ہزار روپیہ نقد اور گیارہ ہزار روپیہ کے واجب الوصول قرضہ جات انجمن کو دیئے۔ ان ذرائع آمدنی کے علاوہ انجمن کے پاس کئی قسم کے فنڈز بھی جمع ہوتے تھے۔ جن میں سے طلبہ کو انعامات دیئے جاتے تھے۔ ایک نہایت ہی مفید فنڈ خان محمد زمان ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جنرل ڈاک خانہ جات (جالندھر) کا جاری کردہ تھا۔ جو غریب اور نادار یتامیٰ کو اعلیٰ تعلیم دلانے کیلئے مخصوص تھا۔ اس فنڈ کا سالانہ خرچ غیر متعین تھا۔ طلبہ کے جملہ اخراجات اس فنڈ سے ادا ہوتے تھے۔ یہ فنڈ خلیفہ فضل حسین کے ایماء پر جاری ہوا تھا۔ المختصر انجمن کے وسائل میں چندہ، مٹھی آٹا جیسی معاشرتی اسکیم کی رقم، تصانیف و تالیفات سے حاصل شدہ رقوم، فیس و کتب خانہ کی آمدنی، ذبیحات کی کھالوں کی رقوم، عطیات، اوقاف، وظائف، مخیّر حضرات کی امداد، مختلف فنڈز اور گورنمنٹ کی گرانٹ شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انجمن جس کی آمدنی پہلے سال سات سو چون -/754 روپے اور خرچ تین سو چوالیس -/344 روپیہ تھا یکم اپریل 1938ء سے 31 مارچ 1939ء تک اس کی آمدنی چھ لاکھ تیس ہزار نو سو نانوے اور اس کا خرچ پانچ لاکھ نو ہزار تر انوے روپیہ تھا۔(محمد سعید قادر، شیخ (س ن)، ص 7)

انجمن حمایت اسلام: مسائل

1919ء میں انجمن میں دھڑے بندی بہت سنگین صورت اختیار کر گئی۔ اگلے سال 29 مارچ 1920ء کو انجمن کی بدعنوانیوں پر غور کرنے کیلئے مسلمانوں کا ایک جلسہء عام ہوا۔ جس میں تجویز پیش کی گئی کہ نواب ذوالفقار علی خان کو انجمن کا صدر بنایا جائے۔ جنرل سیکرٹری کے عہدے پر علامہ اقبال اور حاجی میر شمس الدین کو مقرر کیا جائے۔ جبکہ اسلامیہ کالج کی انتظامیہ کمیٹی کی صدارت پر میاں فضل حسین کو فائز کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کر کے مسائل کو قابو میں لایا گیا۔ (حنیف شاہد 1976ء ص 55-57)

چند مہینے بعد انجمن کو ایک بڑے مسئلے سے سابقہ پڑا وہ یہ کہ آیا تحریک ترک موالات کے پیش نظر اسلامیہ کالج پنجاب یونیورسٹی سے تعلق توڑ لے اور حکومت سے گرانٹ لینا بند کر دے یا نہیں۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ کو تحریک خلافت سے جو دلچسپی تھی اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ انہوں نے جنوری 1920ء میں ایک کمیٹی بنائی جس میں دوسرے کالجوں کے مسلمان طلبہ بھی شامل تھے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کے خلاف فنڈ کیلئے چندہ جمع کیا جائے۔ چنانچہ 15 جون تک ایک ہزار چار سو تینتالیس روپے جمع ہوئے۔ جن میں سے ایک ہزار تین سو باون روپے مرکزی فنڈ کو بھیج دیئے گئے۔ اس مسئلے پر انجمن کی کونسل کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں کافی بحث کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ یونیورسٹی سے الحاق برقرار رکھا جائے اور سرکاری امداد کا سلسلہ بھی جاری رکھا جائے۔ اس فیصلے کی رو سے پرنسپل ہنری مارٹن نے کالج کھول دیا اور جن آٹھ طلبہ نے ترک موالات میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ انہیں کالج چھوڑنے کا حکم دیا۔ انہوں نے انکار کیا تو کالج کمیٹی نے انہیں معطل کر دیا۔ اس پر کالج میں ہڑتال ہوگئی۔ اسی دن لاہور میں ایک جلسہ عام ہوا جس میں طلبہ سے بدسلوکی کے خلاف احتجاج کیا گیا اور پرنسپل کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا۔

جلسے کی طرف سے ایک وفد علامہ اقبال (سیکرٹری انجمن حمایت اسلام) سے ملا۔ علامہ اقبال نے کہا میں پرنسپل کی کاروائی کو سخت ناواجب سمجھتا ہوں۔ لیکن کالج کمیٹی کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے قاصر ہوں۔ کالج میں ہڑتال کی وجہ سے حالات اتنے ابتر ہو گئے کہ پرنسپل ہنری مارٹن کو معزول کرنا پڑا۔ 31 جولائی 1922ء کو انجمن کو ایک مسئلہ اور درپیش آیا کہ علامہ اقبال نے انجمن کی آنریری سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا۔ جسے بڑی ردوکد کے بعد منظور کیا گیا۔ مگر انجمن کے حالات بگڑنے لگے تو انجمن نے مجبور کر کے علامہ اقبال کو دوبارہ یہ عہدہ تفویض کیا جو آپ نے قبول کیا۔ لیکن دس ماہ بعد اپنی خرابی صحت اور مصروفیات کی بنا پر مستعفی ہو گئے۔ مگر انجمن کی سرگرمیوں سے وابستگی جاری رکھی۔ (محمد حمزہ فاروقی 1988ء ص 154)

انجمن حمایت اسلام: خدمات

انجمن حمایت اسلام نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی اس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہیں ملتی۔ اس نے اپنے حلقہ کار کو شروع ہی سے ایک شعبہ تک محدود نہیں رکھا بلکہ مختلف شعبوں میں بیک وقت کام شروع کیا۔ لہذا شعبہ وار انجمن کی

خدمات کامختصر جائزہ پیش ہے۔جس سے اس تحریک کے نصاب، حکمت تدریس، ہیت تعلیم اور نظام امتحانات وجائزہ پر بھر پور روشنی پڑتی ہے۔

(1) انجمن کی دینی وتبلیغی خدمات

اخبار حمایت اسلام لاہور

1885ء میں تبلیغ کیلئے ایک رسالہ جاری کیا گیا۔جس میں مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جوابات اور اسلام کی خوبیوں پر نہایت مفید مضامین شائع ہوتے تھے۔یہ رسالہ ممبران میں مفت تقسیم ہوتا تھا۔اور اس کی تعداد پانچ ہزار ماہوار تک رہی ہے۔1926ء سے یہ رسالہ ہفتہ وار اخبار میں تبدیل ہو گیا۔

اشاعت اسلام کالج

شروع ہی سے انجمن نے مبلغین مقرر کئے جن میں سے ایک والئی ملتان کے خاندان کے بزرگ صوفی غلام محی الدین تھے۔ان کا اصلی نام قبل از اسلام دیوان رام سروپ تھا۔یہ وہی بزرگ ہیں جنہیں دربار کابل میں بلایا گیا اور ان ہی کی کوششوں سے انجمن کو دربار کی جانب سے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد ملی۔انجمن کے مبلغین کی کوشش سے سینکڑوں مسلمان جو بدقسمتی سے عیسائیت کے پنجہ میں گرفتار ہو چکے تھے دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ سابق امیر افغانستان سردار محمد یعقوب خان کی قرابت دار دو شہزادیاں جو بدقسمتی سے عیسائی ہو گئی تھیں۔انہیں انجمن کے سفیر ہی اسلام میں دوبارہ لانے میں کامیاب ہوئے۔انجمن کے یتیم خانوں کا اجراء بھی اسی تبلیغی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔1886ء میں انجمن نے ایک سلسلہ درسی کتب مرتب کیا۔جس میں مذہبی تعلیم کا خاص طور پر خیال رکھا گیا۔ان کے علاوہ دینیات کے رسالے علیحدہ مرتب کئے۔مدرسۃ المسلمین میں ان کتب کو پڑھایا جانے لگا۔یہ کتب اس قدر مقبول ہوئیں کہ نہ صرف ہندوستان کے تمام اسلامیہ مدرسوں میں پڑھائی جانے لگیں بلکہ اس کی درسی کتب کئی صوبوں اور ریاستوں کے سرکاری مدرسوں میں سپلیمنٹری کتب کے طور پر منظور ہوئیں۔انجمن کے مدارس میں دینیات کے رسالے چوتھی جماعت تک اور اس سے اوپر کی جماعتوں میں قرآن شریف باترجمہ پڑھایا جاتا تھا۔(محمد نسیم عثمانی 1983ء ص 285)

1886ء میں ایک مدرسہ تعلیم القرآن بھی جاری کیا گیا۔جس میں انجمن کے صدر اول قاضی خلیفہ محمد حمید الدین دو گھنٹہ یومیہ درس دیتے تھے۔اس میں تفسیر القرآن، علم الحدیث اور علم فقہ ایسے نظام کے ماتحت پڑھائے جاتے تھے کہ ایک پرائمری پاس متعلم چھ سال میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ عالم دین بھی ہو جاتا تھا۔یہ مدرسہ 1911ء میں انجمن اسلامیہ کی خواہش پر شاہی مسجد کے مدرسہ سے ملحق کر دیا گیا۔1930ء میں فتنہ ارتداد کے پیش نظر ایک اشاعت اسلام کالج کھولا گیا۔جس میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان داخل کیے جاتے تھے۔اس کا مقصد ایسے مبلغین پیدا کرنا تھا جو ہندوستان اور بیرون ہندوستان اسلامی خدمات انجام دے سکیں۔انجمن کی دینی خدمات میں سب سے اہم خدمت اغلاط سے مبرا قرآن مجید کی اشاعت تھی۔جیسا کہ سٹوری آف پاکستان ویب سائٹ میں درج ہے۔

A landmark in the history of the Anjuman publication was the production of an absolutely correct text of the Quran.

(www.story of pakistan. com 2002, page 1 of 2)

(2) انجمن کی ادبی تعلیمی خدمات

(الف) تعلیم نسواں

ابتداء میں عیسائی مشنریوں کی زیادہ توجہ فرقہ نسواں کی طرف تھی ۔اس لئے انجمن نے سب سے پہلے تعلیم نسواں کیلئے 1885ء میں پانچ مدرسے کھولے ۔ان مدرسوں کی تعداد 1886ء میں دس اور 1894ء میں پندرہ تک پہنچی ۔ان مدرسوں میں مروجہ تعلیم کےعلاوہ قرآن مجید چار سالوں میں ختم کرایا جاتا تھا۔پانچویں سال چیدہ چیدہ مقاماتِ قرآن سے ترجمہ پڑھایا جاتا اور ضروری دینی مسائل سے پوری طرح واقفیت کرائی جاتی ۔لڑکیوں کے لیے جب عوام الناس کا رجحان انگریزی تعلیم کی طرف ہوا تو ان مدارس میں سے ایک کو 1925ء میں مڈل درجہ تک پہنچا دیا گیا ۔اور انگریزی تعلیم بھی شروع کی گئی ۔1936ء میں اس مدرسہ میں ہائی کلاسز بھی کھول دی گئیں ۔

زنانہ اسلامیہ کالج

جون 1939ء سے کوپر روڈ پر ایک اعلیٰ درجہ کا ڈگری کالج کھول کر اس کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے کر دیا گیا ۔اس کالج میں ایک قرآن سٹڈی سرکل قائم کیا گیا۔جس کا مطلب یہ تھا کہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوتے وقت طالبات قرآن پاک کے معانی اور متعلقہ مسائل سے پورے طور پر واقف ہوں ۔(عبدالقادر، پروفیسر سیّد 1998ء ص 25)

(ب) مردانہ تعلیم

1886ء میں صرف 30 طلبہ کی تعداد کے ساتھ کرائے کے ایک مکان میں مدرستہ المسلمین کی بنیاد رکھی گئی ۔لیکن 1888ء میں یہ مدرسہ مڈل اسکول، 1889ء میں ہائی اور 1892ء میں کالج کے درجے تک پہنچ گیا ۔بلکہ بڑھتے بڑھتے ایک کی بجائے چار ہائی سکول ،ایک مڈل سکول ،متعدد پرائمری مدارس اور ایک اعلیٰ درجہ کا کالج بھی کافی نہ تھے ۔طلبہ کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی ۔مختصر اً یہ کہ انجمن کے زیر اہتمام متعدد تعلیمی ادارے علم کی روشنی بانٹنے لگے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے ۔

- اسلامیہ کالج سول لائنز ،لاہور (پوسٹ گریجویٹ کالج)
- اسلامیہ کالج برائے خواتین کوپر روڈ ،لاہور (پوسٹ گریجویٹ کالج)
- اسلامیہ کالج ریلوے روڈ ،لاہور (انٹرمیڈیٹ کالج)
- اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ ،لاہور
- اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی ،لاہور

- وطن اسلامیہ ہائی سکول برانڈرتھ روڈ، لاہور
- اسلامیہ ہائی سکول فیروزپور روڈ، لاہور
- اسلامیہ ہائی سکول، گوجر خاں
- اسلامیہ ہائی سکول برائے طالبات، برانڈرتھ روڈ، لاہور
- جونیئر ماڈل سکول برانڈرتھ روڈ، لاہور
- جونیئر ماڈل اسکول راجگوھ، لاہور
- جونیئر ماڈل اسکول نزد گورنمنٹ سیکرٹریٹ، لاہور
- سنیئر ورینکلولر سنٹر برائے طالبات برانڈرتھ روڈ، لاہور
- شیرانوالہ گیٹ اور ملتان روڈ پر تعلیم بالغاں کے مراکز
- اسلامیہ مڈل سکول ملتان روڈ، لاہور

(عبدالوحید بٹ (س ن) ص 14)

(3) انجمن کی صنعتی تعلیمی خدمات

1885ء میں جب مدارس نسواں کا اجراء کیا گیا تو اس میں سوزن کاری اور کشیدہ کاری کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ دھاگہ اور کپڑے جیسی ضروریات انجمن خود پوری کرتی اور تیارشدہ مال بھی خود فروخت کرتی۔ منافع انجمن کے خزانہ میں جمع کردیا جاتا تھا۔ ملک کے متمول حضرات ایسے سامان کو برائے حوصلہ افزائی خریدتے۔ چنانچہ 1888ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ تو سرسیّد احمد خاں، سردار محمد حیات خان سی۔آئی۔ای رئیس اعظم واہ ضلع اٹک نے طالبات مدارس کے تیار کردہ کپڑے خریدے۔ انجمن کی جوبلی تقریبات کے بعد معلوم ہوا کہ قومی صنعتی اداروں کیلئے گورنمنٹ کے پاس ایک فنڈ ہے جس کے تحت خرچ تو گورنمنٹ برداشت کرتی ہے لیکن انتظام قوم کے سپرد ہوتا ہے۔ جبکہ مسلمانوں نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ چنانچہ انجمن کے صدر نواب مظفر خان کی کوشش سے یہ فنڈ جاری ہوا تو یکم۔اپریل 1940ء سے اس ادارے کا خرچ گورنمنٹ کے ذمے ہوگیا۔ اور انتظام انجمن کے ہاتھوں میں رہا۔ (محمد نسیم عثمانی 1983ء، ص 286)

(4) انجمن کی طبی خدمات

1907ء میں پنجاب یونیورسٹی نے طبیہ کلاسز میڈیکل کالج لاہور سے علیحدہ کرکے انجمن ہذا کی تحویل میں دیدیں اوران کے جزوی اخراجات کیلئے 720 روپے سالانہ کی گرانٹ منظور کی۔ اس وقت صرف ایک لیکچرار تھا جو ہفتہ میں دو تین مرتبہ شام کے وقت صرف ایک دو گھنٹے لیکچر دیا کرتا تھا۔ 1926ء میں ان جماعتوں کے انتظام کیلئے انجمن کی جنرل کونسل نے ایک علیحدہ طبیہ کمیٹی بنادی اور اسلامیہ کالج سے ان کے تعلقات منقطع کردیئے۔ علم طب کی تعلیم باقاعدہ کالج کی صورت میں

ہونی شروع ہوئی۔ بجائے دو گھنٹہ یومیہ کے شام کو ساڑھے تین گھنٹے اور صبح کو عملی تعلیم کیلئے دو گھنٹے مقرر کئے گئے۔ ایک مکمل کیمیاوی لیبارٹری ایک یونانی اور ایک ڈاکٹری شفاخانہ کھولا گیا۔ پروفیسروں کی تعداد پانچ کر دی گئی۔ پنجاب کے معروف حکیم محمد حسن قرشی تقریباً بیس سال اس کالج کے پرنسپل رہے۔ یونانی شفاخانہ ریاست بھوپال کے سابق طبیب اول پروفیسر حکیم محمد زکریا کی تحویل میں دیا گیا۔ ایک میوزیم اور ایک دارالادویہ بھی قائم کئے گئے۔ 1929ء میں تشریحی تعلیم کیلئے ڈائیگرامز اور ماڈل مہیا کئے گئے۔ لائبریری میں بہت سی کتب کا اضافہ کیا گیا۔ 1931ء میں ایک بورڈنگ ہاؤس کا بھی انتظام کیا گیا۔ 1932ء میں اوقات تعلیم میں ایک گھنٹہ بڑھا دیا گیا۔ اسی سال فرسٹ ایڈ اور ڈسپنسی نیشن کی تعلیم کا بھی انتظام ہوا۔ 1934ء میں زبدۃ الحکماء کی جماعت کو پوسٹ گریجویٹ کلاس بنا دیا گیا۔ طبی خدمات میں انجمن کے مشہور ادارے طبیہ کالج، مرکزی دواخانہ، خیراتی شفاخانہ اور یونانی شفاخانہ تھے۔ (محمد حیات، خواجہ (س ن)، ص 28)

(5) انجمن کی تالیفانہ و مصنفانہ خدمات

1885ء میں انجمن کے کتب خانہ کی بنیاد پڑی۔ مولوی غلام دستگیر کے رسالہ کی اشاعت کے بعد انجمن نے 1886ء میں اردو قاعدہ اور 1887ء میں پہلی تا تیسری ریڈرز شائع کیں۔ اس سلسلے کو ہندوستان بھر میں پسند کیا گیا تو اردو کی چوتھی، پانچویں کتاب، دینیات کی عربی کتب، رسائل دینیات، فارسی کتب، انگریزی کی پرائمر اور دو ابتدائی درسی کتب، عوامل عربیہ یعنی عربی کی کتب شائع کیں۔ 1901ء میں جغرافیہ کی ابتدائی کتب بھی شائع کیں۔ 1920ء میں محکمہ تعلیم پنجاب نے اپنے تعلیمی نصاب میں ترمیم کی تو انجمن نے ایک "جدید کتب اردو" کا سلسلہ شائع کیا۔ ساتھ ہی عربی کی تین کتابیں، تاریخ ہند کی کہانیاں تین حصوں میں شائع کیں۔ یہ تمام کتب سپلیمنٹری درسی کتب منظور ہوئیں۔ 1924ء میں زنانہ مدارس کیلئے اردو ریڈرز کا مکمل سیٹ تیار ہوا۔ یہ سلسلہ بھی محکمہ تعلیم نے منظور کیا۔ دینی مسائل، ارکان اسلام اور اسلامی تاریخ کو واضح کرنے کیلئے الامین، اخلاق محمدی، طلوع اسلام جیسی مستند کتابیں شائع کی گئیں۔ 1927ء سے رائلٹی سسٹم پر کتب شائع کی جانے لگیں۔ پروفیسر شیخ غلام حسین کا سلسلہ کتب اکنامکس، تاریخ ہندوستان، تاریخ انگلستان، کتب انگریزی، علم منطق اور پروفیسر خواجہ دل محمد کی مشہور و معروف انگریزی و اردو کتب ریاضی کے علاوہ میاں عبدالحکیم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول کا سلسلہ انسانی جغرافیہ رائلٹی سسٹم پر شائع کی جانے والی کتب تھیں۔ (عبدالوحید، بٹ (س ن)، ص 31)

کتب خانہ انجمن کی عظیم الشان خدمت قرآن مجید کے صحیح ترین نسخہ کی اشاعت تھی۔ سلسلہ تالیف و اشاعت پہلے ایک کمیٹی کے زیر اہتمام تھا۔ 1933ء کے آخر میں انجمن کے نئے آئین کے ماتحت تالیف و طبع کا انتظام ایک کمیٹی کے اور فروخت کا انتظام دوسری کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا۔ مزید برآں رسالہ حمایت اسلام جو کہ ماہنامہ تھا اسے ہفتہ وار اخبار بنا دیا گیا۔ ان مقاصد کے لیے انجمن نے اپنا پریس قائم کیا جو کہ انجمن کی اپنی عمارت میں تھا۔ (ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان 2002ء، ص 1)

(6) انجمن کے یتیم خانے

1886ء میں ایک نا گوار واقعہ کی اطلاع ملنے پر ارکان انجمن سخت بیقرار ہوئے۔ واقعہ یہ تھا کہ ضلع لدھیانہ کی ایک بال بچوں والی دیہاتی عورت تنگدستی کے ہاتھوں عیسائیوں سے امداد کی طالب ہوئی۔ پادریوں نے اسے اس کی اولاد سمیت عیسائی بنالیا۔ تھوڑے عرصے بعد ایک نیک دل مسلمان عالم کے وعظ و نصیحت کی وجہ سے اس نے توبہ کی اور دوبارہ اسلام قبول کیا۔ پادریوں نے اس عورت کو تو روانگی کی اجازت دے دی مگر بچوں کو کہیں چھپالیا۔ اس پر مسلمانانِ لدھیانہ میں جوش پیدا ہوا۔ اور دادرسی کیلئے عدالت سے رجوع کیا۔ مگر پادریوں کے رسوخ کے سبب عدالت نے غریب عورت کی درخواست مسترد کر دی۔ چیف کورٹ میں اپیل دائر تو ہوگئی مگر مقدمہ کی پیروی کیلئے عورت کے پاس خرچ نہیں تھا۔ انجمن کو جب اس امر کی اطلاع ہوئی تو اس نے اپیل کے تمام اخراجات برداشت کر کے مقدمہ کی پیروی کی اور عدالت سے بچوں کی واپسی کیلئے ڈگری حاصل کی۔ کافی کوشش کے بعد 1887ء کے آخر میں تین بچوں میں سے دو بچے ایک لڑکی اور ایک لڑکا حاصل کیا۔ تعلیم و تربیت کیلئے ان بچوں کو والدہ سمیت لاہور بلالیا گیا۔ دسمبر 1887ء میں مدرستہ المسلمین کے دو ایسے بے کس یتیم بچوں کو بھی جنہیں وظیفہ دیا جاتا تھا ایک جگہ کر کے یتیم خانہ کی بنیاد رکھی۔ لدھیانہ والی عورت ان چاروں یتیموں کے لیے کھانا پکاتی اور ان کی نگرانی کرتی۔ (محمد حیات، خواجہ (س ن) ص 33)

اس خبر کے پھیلتے ہی مختلف مقامات سے درخواستیں آنی شروع ہوئیں۔ چنانچہ 1883ء میں ہوشیار پور کی ایک سیّد زادی کی درخواست آئی جو کہ بدقسمتی سے دو کم سن بچوں سمیت عیسائی مذہب قبول کر چکی تھی کہ وہ اسلام لانے کو تیار ہے۔ اس کی درخواست منظور کی گئی اور اسے لاہور بلالیا گیا۔ یہ عورت تعلیم یافتہ تھی۔ اسے زنانہ مدارس کی نگران بنا دیا گیا۔ اس کے اور بچوں کیلئے دس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا گیا۔ انجمن کو جہاں جہاں ایسے واقعات کا علم ہوتا وہیں کسی نہ کسی کارکن کو بھیج کر حالات کی اصلاح کی جاتی۔ 1896ء میں دو کم سن یتیم بچے ایسے داخل ہوئے جن کے والدین تلاشِ معاش میں انہیں ہمراہ لے کر وطن سے نکلے۔ راستہ میں بچوں کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ چند یوم بعد حرماں نصیب باپ ضلع جہلم کے ایک گاؤں کے باہر کسی درخت کے نیچے شب بسر کر رہا تھا کہ اسے بھی موت نے آدبوچا۔ ان دو ننھی جانوں (چھ سال اور چار سال) کے بلکنے کی آواز ایک نیک مرد کے کانوں میں سحری کے وقت پہنچی۔ وہ انہیں اپنے گھر لے گیا۔ بعد ازاں انہیں یتیم خانہ پہنچایا۔ اسی طرح ایسی کم سن لڑکیاں بھی لائی گئیں جنہیں بدکردار لوگوں نے حالت معصوی میں پکڑ کر بدکردار عورتوں کے پاس فروخت کر دیا تھا۔ ضلع پشاور سے ایک ایسا شیر خوار بچہ بھی آیا جس کے والدین اسے مردہ سمجھ کر دفن کر گئے مگر گوشہ قبر سے آواز کے شبہ پر ایک راہگیر نے قبر کھود کر بچہ نکالا اور یتیم خانہ پہنچایا۔ (محمد نسیم عثمانی 1983ء ص 285)

اس سلسلے میں انجمن نے اپنے کام کو صرف پنجاب تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان سے بھی مسلمان یتیم بچوں کو لانے کیلئے بروقت کوشش کی۔ 1925ء میں ساحل مالابار پر جب موپلا قوم کے 40 لڑکے یتیم ہوئے تو انجمن نے اپنے ایک ذمہ دار افسر کو مالابار روانہ کیا جو وہاں سے یتامیٰ کی ایک کافی تعداد ہمراہ لائے۔ 1935ء میں

کوئٹہ کے زلزلے کے موقعہ پر بھی انجمن نے اپنے یتیم خانہ میں کئی لڑکے داخل کئے۔اس کے بارے میں ویب سائٹ سٹوری آف پاکستان میں لکھا ہے کہ:

The Anjuman established educational institutions in arts, sciences and technology for men and women; orphanages for helpess Muslim to which widows home was added. The Moplah orphans, victims of Bihar and Quetta earthquakes and later the destitute children and widows of 1947 holocaust found shelter at these orphanages.

(www.story of pakistan.com2002, page 1 of 2)

جب لڑکیوں کی تعداد کافی ہوگئی تو 1890ء میں زنانہ یتیم خانہ علیحدہ کردیا گیا۔دونوں زنانہ و مردانہ یتیم خانوں نے آج تک ہزاروں یتامیٰ کی پرورش کی۔زنانہ یتیم خانہ میں لڑکیوں کے بالغ ہونے پر ان کیلئے موزوں بر تلاش کر کے ان کی شادی کردی جاتی تھی۔(محمد اکرم جاوید،چوہدری (س ن)،ص 6)

(7) انجمن کی پبلسٹی کمیٹی

1933ء سے انجمن نے ایک ادارہ پبلسٹی کے لیے کھول رکھا تھا۔جو انجمن کے متعلق پبلک کو اطلاعات مہیا کرتا تھا۔اخبار حمایتِ اسلام سالانہ اجلاس کا اہتمام اور انجمن کے سفیروں کا کنٹرول اس محکمہ کے سپرد تھا۔جو روپیہ سفیروں کی معرفت جمع ہوتا تھا۔وہ براہ راست محکمہ فنانس وصول کرتا تھا۔اور وہی معطی صاحبان کے نام رسیدیں جاری کرتا تھا۔

انجمن حمایت اسلام:تنقیدی مطالعہ

انجمن حمایت اسلام صرف ایک تعلیمی وسماجی ادارہ ہی نہیں بلکہ یہ ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے جس نے برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس کا سالانہ جلسہ ملتِ اسلامیہ کے لئے اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔انجمن حمایتِ اسلام کے سٹیج سے سرسیّد احمد خاں،مولانا حالی،محسن الملک،سر محمد شفیع ، شیخ عبدالقادر، جسٹس ، شاہ دین، خلیفہ شجاع الدین اور علامہ اقبال نے قوم کو ایسے زندگی افروز پیغامات دیئے جن سے قوم کی کایا پلٹ گئی (اردو انسائیکلوپیڈیا 2005ء،ص 208)۔علامہ اقبال کی شہرت کا آغاز انجمن کے پلیٹ فارم سے ہوا۔انہوں نے اپنی فکر انگیز اور معرکتہ الآرا نظمیں جیسے نالۂ یتیم،شکوہ ،جوابِ شکوہ،شمع وشاعر ،خضرِ راہ، اور طلوعِ اسلام انجمن کے پلیٹ فارم سے پڑھیں۔ (رحیم بخش شاہین1979ء،ص 122)

علامہ اقبال کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئیں (اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ 1980ء،ص 9)۔آپ نے انجمن کے جلسوں میں نہ صرف اپنی نظمیں پڑھیں بلکہ اپنے ملی نغموں کا آغاز کیا۔آپ انجمن کے ممبر،سیکرٹری اور صدر رہے۔علاوہ ازیں علامہ اقبال اسلامیہ کالج لاہور میں اعزازی پروفیسر بھی رہے۔بحیثیت استاد

آپ نے انجمن کے جلسوں میں اپنا نظریہ تعلیم بھی متعارف کروایا۔(ایم اے صوفی، ڈاکٹر 2006ء ص تعلیمی ایڈیشن)

انجمن حمایت اسلام نے اپنی دینی، تعلیمی وسماجی مقاصد کی اشاعت اور اپنا پیغام عام مسلمانوں تک پہنچانے کیلئے "حمایتِ اسلام" کے نام سے ایک رسالہ نکالا جو پہلے ماہانہ تھا مگر 1926ء سے ہفت روزہ کر دیا گیا۔ ملک کے بڑے بڑے شاعر، ادیب اور اخبارنویس اس کے شعبہ ادارت سے وابستہ رہے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری ،سعادت حسن منٹو، رشید احمد ندوی، وقارانبالوی، نشتر جالندھری، ابو صالح اصلاحی، عبداللہ بٹ، مولانا صلاح الدین احمد اور شیر محمد اختر نے مختلف اوقات میں اس کے فرائض ادارت سرانجام دیئے۔ ہفت روزہ "حمایت اسلام" نے اپنا دائرہ صرف انجمن کی ترجمانی تک محدود نہ رکھا بلکہ ادب وصحافت کے میدان میں بھی انجمن کی خدمات سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ قائداعظم اور دوسرے مسلم اکابرین کی تقریروں، پیغامات اور مسلم لیگی اجتماعات کی خبروں اور ان پر تبصروں کے ذریعے اس نے مسلمانوں کو ان کی منزل کا تعین کرنے میں بھرپور مدد دی۔ انجمن کا ایک اشاعتی ادارہ اور پریس بھی تھا۔ انجمن کا کتب خانہ نہایت شاندار تھا۔ جس میں ہزاروں کتب تھیں۔(محمد نسیم عثمانی 1983ء ص 288)

انجمن حمایت اسلام نے تقریباً ان ہی خطوط پر کام کیا۔ جو سرسیّد نے علی گڑھ سکول وکالج کے لیے وضع کیے تھے۔ انجمن نے متعدد تعلیمی ادارے قائم کیے جن میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی طرز پر تعلیم دی جاتی تھی۔ امرتسر میں انجمن اسلامیہ امرتسر قائم ہوئی جس نے امرتسر میں ایم اے او ہائی اسکول اور ایم اے او کالج قائم کیے(احمد سعید 1986ء ص 7)۔ قیام پاکستان کے بعد یہ کالج لاہور منتقل ہوگیا۔ جالندھر میں بھی ایک اسلامیہ کالج قائم ہوا۔ گجرات میں سر فضل علی نے زمیندار کالج قائم کیا۔ دہلی میں اینگلو عربک کالج نے علمی شعبے میں بڑی خدمت انجام دی۔ لکھنؤ میں شیعہ کالج قائم ہوا اور اٹاوہ میں مولوی بشیر الدین نے اسلامیہ ہائی اسکول کو ایک مثالی ادارہ بنا دیا۔ غرض انجمن نے تعلیمی خدمات کا آغاز دو پرائمری اسکولوں کے اجراء سے کیا۔ بعدازاں تعلیمی اداروں کا سلسلہ وسیع سے وسیع ہوتا چلا گیا۔(محمد اسلم پروفیسر(س ن) ص 67)

واعظین اور مناظرین کے تقرر کے ساتھ انجمن نے اسلامی مدرسوں کے قیام کا بیڑا اٹھایا تھا اور دو سال کی کوششوں سے لاہور میں مسلمان لڑکیوں کیلئے دس مدرسے قائم کر دیئے۔ لوگ اپنی بچیوں کو عیسائی مشنری اسکولوں میں بھیجنے کی بجائے انجمن کے اسکولوں میں بھیجنے لگے۔ متعدد مشنری سکول بند ہو گئے۔ ایک بڑی کامیابی یہ ہوئی کہ موچی دروازے کا مشن سکول بند ہو کر اس میں شامل ہوگیا۔ اگر اس وقت توجہ نہ دی جاتی، انجمن کے مناظر ردِنصاریٰ نہ کرتے اور مشنری سکولوں کے مقابلے میں اپنے مدرسے قائم نہ کرتے تو آج لاہور کی کوئی گلی اور کوئی گھرانا ایسا نہ ہوتا جس میں مشن کا اثر نہ ہوتا۔ سیاسی میدان میں بھی انجمن کے اداروں نے قوم کی رہنمائی کی۔ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے قیام پاکستان کے سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔(محمد حنیف شاہد 21۔اپریل 2006ء ص 2)

پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام جس کے روح رواں حمید نظامی تھے دو قومی نظریہ کو پھیلانے کا بہت بڑا ذریعہ

تھا۔مارچ 1940ء میں جب خاکسار مسلم لیگ کا جلسہ ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے اسلامیہ کالج کے طلبہ ہی تھے جنہوں نے قائداعظم کو بحفاظت اور شان وشوکت کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں منٹو پارک پہنچایا۔جہاں قرارداد پاکستان پاس کی گئی۔یہ وہی اسلامیہ کالج ہے جس کی گراونڈ میں قائداعظم نے اپنے ہاتھوں سے پاکستان کے مجوزہ پرچم کولہرا کر اپنے عزم صمیم کا اظہار کیا تھا۔1945ء میں پنجاب کے انتخابات میں مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں عوام نے جو فیصلہ سنایا اس میں طلباء اسلامیہ کالج کا حصہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔1946ء میں قائداعظم نے اسلامیہ کالج کے طلبہ کو ہدایت کی تھی کہ تعلیم محض کتابی علم حاصل کرنا نہیں ہے۔لہذا ایک ہوش مند قوم کی طرح مستقبل کی فکر کیجئے۔تاریخ گواہ ہے کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے اس ہدایت کو دل و جان سے قبول کیا۔(شمعون علی بلتوی 1973ء ص 147)

انجمن نے "دارالشفقت"، "دارالامان" اور "علی دارالاطفال" جیسے ادارے بھی قائم کئے۔جن کے قیام سے صرف یہ ہی فائدہ نہیں ہوا کہ ہزارہا مسلمان یتیم بچے جو عیسائی مشنریوں کے ہتھے چڑھ جانے سے بچ گئے اور ان کا دین وایمان محفوظ ہوگیا بلکہ وہ اس قابل بھی ہوگئے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوجائیں اور معاشرے میں باعزت زندگی گزار کر معاشرے کے مفید کارکن ثابت ہوں۔گویا انجمن حمایت اسلام ایک عمومی تحریک تھی جس نے غریب مسلمانوں کو نہایت قلیل خرچ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور بلند مدارج پر پہنچنے کے مواقع بہم پہنچائے اور وہ مسلمان جو نان شبینہ کے محتاج تھے، حکومت ومشن کے اداروں کے اخراجات برداشت نہ کرسکتے تھے وہ بھی شوق سے اپنے بچوں کو انجمن کے مدارس میں بھیجنے لگے۔یوں غریبوں کے جھونپڑے بھی ضیائے علم سے منور ہوئے۔انجمن حمایت اسلام اگرچہ ایک مذہبی اور تبلیغی انجمن کی حیثیت سے قائم ہوئی اور اس کی خدمات کا پہلا میدان تبلیغ واشاعت اسلام ہی تھا۔لیکن جلد ہی اس نے جب تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کی تو اس کی فیض بخشیوں سے پنجاب کا ریگستانِ جہالت تعلیم کے اندھیروں سے نکل آیا۔اسی لیے آج انجمن حمایتِ اسلام، اسلامی تہذیب وثقافت اور احیائے ملت کی ایک تاریخ کا نام ہے(عبدالقادر سیّد 1998ء ص 28)

9.2 سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی

پس منظر

1843ء میں انگریزوں کے قبضے سے قبل سندھ کا اپنا تعلیمی نظام ہوتا تھا۔خاص خاص مقامات پر قدیم طرز کے مکتب تھے جن میں ملاّ قرآن خوانی اور فارسی کے درس دیا کرتے تھے(حسن علی 1960ء ص 5)۔سیکنڈری سطح پر بہت سے نجی مکتب تھے جو مشرقی زبانوں اور اسلامیات کی تعلیم دیتے تھے۔یہ مکاتب سائنس اور حساب کی تعلیم سے مکمل طور پر نابلد تھے۔اعلیٰ سطح پر صرف چھ مدرسے مختلف جگہوں پر قائم تھے۔جبکہ کالج کی سطح پر "مخدوم"، "مولوی" اور "خطیب" جیسے حضرات صرف ونحو، منطق، فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھانے پر مامور تھے(محمد علی شیخ 2005ء الف ص 5-6)۔1843ء میں انگریزوں

نے سندھ فتح کرلیا۔ تعلیمی میدان میں انقلاب آیا۔ سندھ کا تعلیمی نظام تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نہ تھا۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ سندھی مسلمان نئے حالات کے مقابلہ کرنے میں ناکام رہے اور روز بہ روز مشکلات کا شکار ہوتے چلے گئے۔ تاہم سندھی ہندوؤں نے نئے حالات کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو انگریزی تعلیم سے ہم آہنگ کرلیا اور حکومتی معاملات میں شریک ہوکر معاشی و معاشرتی سطح پر سہولتیں حاصل کرلیں۔ (علی محمد خواجہ 1960ء ص 52)

اس افسوسناک صورتحال کو دیکھ کر سندھ کے باشعور اور روشن ضمیر افراد کو خوف محسوس ہونے لگا کہ اگر مسلمان انگریزی اور جدید علوم حاصل نہیں کرتے تو نہ صرف وہ سیاسی، اقتصادی اور سماجی لحاظ سے پسماندہ رہ جائیں گے بلکہ ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ مسلمانوں کی بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر جسٹس امیر علی (جو کہ کلکتہ میں اعلیٰ پائے کے بیرسٹر تھے) نے محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی جو پہلے کلکتہ والی جماعت کی شاخ تھی۔ بعد ازاں 1884ء میں انجمن اسلام کراچی کے نام سے علیحدہ ہوگئی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو عربی، فارسی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی دی جائے (محمد یعقوب اُپل 1960ء ص 13)۔ گویا سندھ میں تعلیمی تحریک کا آغاز نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی شاخ سے ہوا۔ (مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1986ء ص 129-132)

سندھ میں نیشنل ایسوسی ایشن کی چار شاخیں کراچی، شہداد پور، لاڑکانہ اور سکھر میں قائم ہوئیں۔ اس سلسلے میں سیّد امیر علی نے سندھ کا دورہ کیا تھا۔ وہ سندھ کے ارباب فکر و بصیرت اور ملت کے بہی خواہوں میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے نہ صرف ایک فکری تحریک شروع کر گئے تھے۔ بلکہ ان کے دورے سے مسلمانوں میں سیاسی شعور اور تعلیم کے فروغ کیلئے ایک عملی جدوجہد بھی شروع ہوگئی تھی۔ ایسوسی ایشن کی شاخ کراچی کے صدر حسن علی بے آفندی سندھ میں مسلمانوں کے ایک ممتاز رہنما اور بہی خواہ ملت تھے۔ 1884ء میں سیّد امیر علی ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں کراچی آئے۔ اس موقعہ پر حسن علی نے ایک جلسے کا اہتمام کیا جس میں امیر علی نے سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر ایک تقریر میں مسلمانوں کو وقت کے مطابق ملی فلاح و بہبود کے کاموں اور تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔ چونکہ یہاں کے مسلمانوں میں اخذ و قبول حق کی پوری صلاحیت اور قومی خدمات کی لگن موجود تھی۔ اس لئے امیر علی کی اس تحریک کا خاص اثر ہوا۔ حسن علی آفندی اور دوسرے سربرآوردہ مسلمان فوراً سرگرم عمل ہوگئے۔ (معین الدین سیّد 1973ء ص 98)

اس تحریک کے نتیجے میں جو مدرسہ قائم ہوا۔ اس کا نام "سندھ مدرسۃ الاسلام" ہے۔

بنیاد و قیام سندھ مدرسۃ الاسلام

ابتداً یہ مدرسہ بولٹن مارکیٹ کے سامنے ایک کرائے کی عمارت میں قائم تھا۔ یہ فی الحقیقت ایک گودام تھا اور مدرسہ کے لئے اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے حد درجہ تکلیف دہ تھا۔ بازار کے شور و غوغا میں استاد اور شاگردوں کی آوازیں دب کر رہ جاتیں لیکن اس سے بڑھ کر مصیبت "مسجد کے زیر سایہ خرابات" کے مصداق مدرسہ کے پہلو میں بھنگڑ خانہ تھا جس کا اثر طلبہ پر بھی بہت برا پڑتا تھا۔ کبھی کوئی بھنگ کے نشے میں گرتا اور جھومتا جھامتا مدرسہ میں گھس آتا اور ہنگامہ کھڑا کردیتا۔ اس

مصیبت سے نجات کا طریقہ صرف یہ تھا کہ اس جگہ کو چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ حسن علی آفندی نے بھاگ دوڑ کر کے میونسپل بورڈ سے 75 روپے ماہانہ کرائے پر سرائے لے لی جو کراچی کی میونسپلٹی نے افغانستان ،بلوچستان اور سندھ کے اس شہر کے درمیان تجارت کو آسان بنانے کیلئے قائم کی تھی ۔اس قافلہ میں سرائے کی چار دیواری کے اندر پتھر اور پکی اینٹوں سے بنی ہوئی کشادہ عمارتیں قائم تھیں جن کا رُخ جنوب کی طرف تھا۔قافلہ سرائے کا دروازہ فریئر روڈ کی طرف کھلتا تھا۔قافلہ سرائے کے مغرب میں ایک خالی پلاٹ تھا جس کے چاروں طرف خاردار تار لگے ہوئے تھے۔کچھ عمارتوں میں لکڑی کے دروازے لگوادیئے گئے۔(ریحانہ اکرام 1996ء ص 68)

اسی طرح سندھ مدرسۃ الاسلام یکم ستمبر 1885ء میں قائم ہوگیا اور تدریس کا عمل شروع کیا گیا۔افتتاحی تقریب جس میں کسی بھی سرکاری عہدیدار کو نہیں بلایا گیا۔بہت سادہ طریقے سے منعقد ہوئی۔جیسا کہ نثار حسن علی آفندی بیان کرتے ہیں:

> **It was at 8 o'clock one evening when the opening ceremony of Madressah was performed in a rented house, Perhaps it was the simplest in history.(Nisar Hassanwally Effandi 1960, P:25)**

تقریب میں شہریوں میں سے سیٹھ علی بھائی کریم جی ،سیٹھ غلام حسین چھاگلہ ،سیٹھ غلام حسین خالق ڈنہ و دیگر معززین شریک ہوئے ۔اسی دوران حسن علی آفندی نے بورڈنگ ہاؤس کیلئے مستقل جگہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی اس سلسلے میں انہوں نے قافلہ سرائے کو سندھ مدرستہ الاسلام کو مستقل طور پر دینے کیلئے کراچی میونسپلٹی کو درخواست دی۔درخواست پر غور کیلئے کراچی میونسپلٹی کا اجلاس فریئر ہال میں منعقد ہوا جس میں سندھ مدرسہ کو جگہ دینے کیلئے بحث اور بعد میں ووٹنگ ہوئی ۔اس وقت کراچی میں میونسپلٹی کے 32 ارکان میں 10 مسلمان'8 یورپین' 4 پارسی اور باقی ہندو تھے۔ ووٹنگ میں اکثریت نے یہ جگہ مدرسہ کو تعلیمی مقاصد کیلئے مفت دینے کے حق میں ووٹ دیئے لہذا میونسپلٹی نے وہ جگہ سندھ مدرسہ کو مفت دے دی۔اسی جگہ پر آج ساڑھے آٹھ ایکڑ زمین پر سندھ مدرستہ الاسلام موجود ہے۔(محمد علی' شیخ 2005ء ب' ص 4)

حسن علی آفندی نے زمین حاصل کرنے کے بعد اس جگہ پر بورڈنگ ہاؤس اور اسکول کی مرکزی عمارت کی تعمیر کیلئے ایک لاکھ روپے کے عطیات جمع کئے۔کراچی میونسپلٹی کے انجینئر و آرکیٹیک جیمس اسٹرچن (James Strachan) نے سندھ مدرسہ کی عمارت کا نقشہ تیار کیا اور کسی معاوضے کے بغیر اپنی نگرانی میں ادارے کی عمارت تعمیر کروائی۔عمارت کا سنگ بنیاد ہندوستان کے اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن نے رکھا۔تقریب کے بارے میں حسن علی آفندی کے فرزند ولی محمد کا کہنا تھا کہ اس تقریب میں پوری کراچی کے لوگ شریک ہوئے ۔ایسا مجمع اس سے قبل دیکھنے میں

نہیں آیا۔(یاسمین لاری 1996ء ص 225)

سندھ مدرسۃ الاسلام: مقصد

سندھ مدرسۃ الاسلام خاص طور پر سندھ کے مسلمانوں اور عام طور پر سندھ کے ملحقہ علاقوں بلکہ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کیلئے وجود میں آیا(میر محمد شاہ 1960ء ص 33)۔سندھ محمڈن ایسوسی ایشن کے صدر خان بہادر حسن علی آفندی نے بطور خاص اس مدرسے کو مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے قائم کیا تھا(انجم جاوید 1998ء ص 7) کیونکہ اس دور میں

> **The Muslim parents sent their childrens to the schools run by Muslim organisation becuase they wanted to give them western education in a Muslim environment.(Raiz Ahmad 1986,P:38)**

لہٰذا خان بہادر حسن علی آفندی نے مسلمانوں کے اس رجحان کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تعلیمی تحریک کا مقصد یہ بتایا کہ مسلمانانِ سندھ مغربی علوم سے مشرقی ماحول میں رہتے ہوئے مستفید ہوسکیں۔

سندھ مدرسۃ الاسلام: نصاب

سر سیّد احمد خان نے علی گڑھ میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کیلئے کالج قائم کیا اور مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دی(اردو انسائیکلوپیڈیا' 2005ء ص 855)۔سر سیّد احمد خان کے کالج اور اُس وقت کے مختلف اسلامی انجمنوں کے تحت چلنے والے اداروں میں فارسی' عربی اور مسلمانوں کی کلاسک زبانیں بطور نصاب پڑھائی جاتی تھیں۔اُردو بھی جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کی زبان کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔یہی حال سندھ مدرسۃ الاسلام کا تھا(ریاض احمد 1986ء ص 27)۔مدرسہ کے نصاب کو ترتیب دیتے وقت علی گڑھ کو بطور نمونہ پیش نظر رکھا گیا۔مدرسہ کے پہلے دو پرنسپل پرسی ہائیڈ (Percy Hyde) اور ہنری وائنز (T.H Vines) انگریز تھے۔ان کا تقرر علی گڑھ کی سفارش پر عمل میں آیا تھا۔مدرسے میں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کی دینی تربیت پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔طلبہ کو باقاعدگی سے نماز پڑھائی جاتی اور ہاسٹل میں احترام رمضان کا خاص خیال رکھا جاتا تھا(ای۔ایچ۔ایٹکن 1907ء ص 473)۔اس کے نصاب میں علاوہ معمول تعلیمی کورس کے ایک صیغہ صنعت و دستکاری کیلئے مخصوص کیا گیا تھا۔(مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1994ء ص 11)

سندھ مدرسۃ الاسلام: حکمت تدریس

سندھ مدرسۃ الاسلام نے اپنے قیام اور تعلیمی مشن شروع کرنے کے بعد نہ صرف سندھ کو ہر شعبہ زندگی میں مرکزی قیادت فراہم کی بلکہ برصغیر کی حریت پسند سیاست کو معروف سیاسی رہنما بھی دیئے۔اس کے ابتدائی پچاس برسوں کو بلاشبہ

قابل رشک کہا جا سکتا ہے۔سندھ مدرستہ الاسلام 1885ء سے لے کر 1935ء تک زیادہ تر انگریز انتظامیہ کے ماتحت رہا جن کے مضبوط نظم وضبط اور درست تعلیمی ترجیحات نے سندھ کو عروج پر پہنچا دیا تھا لیکن 1935ء کے بعد سندھ مدرسہ بورڈ کی داخلی سیاست اور سندھ کی بمبئی ریاست سے علیحدگی کے بعد جب سندھ مدرسہ کے جملہ حقوق مقامی لوگوں کے حوالے کیے گئے تو اس ادارے کا زوال شروع ہو گیا۔(انجم جاوید 1998ء ص 7)

چند مخلص افراد کی کوششوں کے باعث 1942ء میں اس ادارے کو کالج کا درجہ مل گیا۔آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے 21 جون 1943ء کو اس کالج کا افتتاح کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا: میری مادر علمی نے اب کالج قائم کر کے ایک اور مہم جوئی کی ابتدا کر دی ہے۔یہ ایک شاندار کام ہے اور اگر اس ادارے نے منظم طریقے سے کام کیا تو یہ اور بھی اچھا ہوگا(محمد علی شیخ 2005ء ب ص 6)۔بعد ازاں پاکستان بننے کے بعد کالج کو قطعی الگ کر کے سندھ مسلم سائنس کالج (ایس۔ایم۔ایس)بنا دیا گیا۔جسکی حیثیت الگ ہے۔1974ء میں حکومت پاکستان نے اس مدرسے کی قومی حیثیت واہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے قومی تحویل میں لے کر پہلے سندھ حکومت اور پھر وفاقی وزارتِ تعلیم کے حوالے کر دیا اس عمل سے سندھ مدرستہ الاسلام کی کامیابی کا سفر شروع ہو گیا۔یوں اس وقت سے اب تک یہ ادارہ وفاقی وزارتِ تعلیم کے ماتحت کام کر رہا ہے۔جس کا اپنا خود مختار "بورڈ آف گورنرس" ہے۔جس میں نامور تعلیمی وانتظامی ماہرین،سینئر افسران اور زندگی کے مختلف شعبہ جات کی شخصیات شامل ہیں۔یہ ماہرین مل کر تعلیمی حکمت عملی مرتب کرتے ہیں۔جس کے باعث اپنے قیام سے لے کر اب تک یہ ادارہ اعلیٰ تعلیمی معیار کو قائم رکھے ہوئے ہے۔(محمد علی شیخ 1998ء ص 3)

سندھ مدرستہ الاسلام: ہیئتِ تعلیم

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب سندھ کی علیحدہ حیثیت ختم کر کے اسے بمبئی میں ضم کر دیا تو ہندو اکثریت نے عملاً مسلمانوں پر تعلیم کے دروازے بند کر دیے۔سیّد امیر علی مسلمانوں کے انتہائی پر خلوص اور غمگسار رہنماؤں میں سے تھے اور مسلمانانِ ہند کے حقوق کے لئے انگلستان میں انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما تھے۔سندھ میں حسن علی آفندی جو سیّد امیر علی کی قائم کردہ تنظیم "سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن" کی کراچی برانچ کے صدر تھے علی گڑھ تحریک سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔اور ان ہی خطوط پر ایک مدرسہ کراچی میں قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔1882ء میں حسن علی آفندی جب کلکتہ اور حیدر آباد (دکن) کے دورے پر گئے تو اس دوران انہوں نے علی گڑھ جا کر سر سیّد احمد خان سے ملاقات کی اور ان سے سندھ میں تعلیمی ادارے کے قیام کی خواہش کا اظہار کیا۔سر سیّد نے حسن علی آفندی سے کہا کہ آپ نہ صرف اسکول قائم کرنے کا بلکہ پہلے کالج اور بعد میں یونیورسٹی کا مقصد اپنے سامنے رکھیں۔اس مشورے نے حسن علی آفندی کے حوصلے اور جذبے کو تقویت پہنچائی۔ بالآخر 1885ء میں یہ مدرسہ قائم ہوا۔(محمد الیاس فارانی 1968ء ص 16)

سندھ مدرستہ الاسلام اس خطے کے مسلمانوں کی ایک جدید درس گاہ کے طور پر ابھرا جس نے نظام تعلیم کے مروج اصولوں سے ہٹ کر مسلمانوں کو ان علوم کی تعلیم دینا شروع کی جو جدید دور سے کلی طور پر ہم آہنگ تھے۔تعلیم کی ترقی وترویج

کیلئےمدرسہ کی عمارت میں کشادہ کمرہ جماعت بہترین سائنس لیبارٹریز میوزیم لائبریری آڈیٹوریم اور طلبہ کی رہائش کیلئے ہاسٹل موجود تھا۔اس وقت سندھ مدرستہ الاسلام کے تنظیمی ڈھانچے میں چار تدریسی اور ایک انتظامی سیکشن شامل ہیں۔ان کے نام انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری سیکشن' لوئر سیکنڈری سیکشن' ٹیکنیکل سیکشن' ایڈمنسٹریشن اینڈ اکاؤنٹس سیکشن ہیں۔انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری سیکشن کے درس و تدریس کا کام ادارے کی مرکزی عمارت میں ہوتا ہے۔سیکنڈری سطح تک ہر ایک کلاس کے چھ سیکشن A سے F تک ہیں۔جن میں ہر جماعت کے ہر سیکشن میں طلبہ کی تعداد 35 سے 40 تک ہے۔تعلیم کا ذریعہ انگریزی' سندھی اور اُردو زبان ہے۔انٹرمیڈیٹ سطح سے دو گروپس پری انجینئرنگ اور پری میڈیکل ہیں جن میں ذریعہ تعلیم انگلش ہے۔لوئر سیکنڈری سطح پر چھٹی سے آٹھویں تک جماعتیں ہیں۔ہر جماعت چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے (A سے D تک) (A اور B) کا ذریعہ تعلیم انگریزی جبکہ سی اور ڈی کا سندھی ہے۔(محمد علی شیخ 2004ء ص 2)

بہتر افرادی قوت پیدا کرنے کی سوچ کو مد نظر رکھتے ہوئے سندھ مدرستہ الاسلام کے اندر ایک بہترین ٹیکنیکل سینٹر بھی اب تک نہ صرف قائم بلکہ ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔یہاں پر ٹیکنیکل اسکول سرٹیفکیٹ کے کورس کروائے جاتے ہیں۔جن میں الیکٹریکل ٹیکنالوجی' کارپینٹری اور مشین ٹریڈ کی تعلیم دی جاتی ہے۔سندھ مدرسہ کی لائبریری میں ایک صدی پرانی کتب بھی موجود ہیں۔سندھ مدرسہ میں داخلہ پرانے اصولوں کے مطابق ہی کیا جاتا ہے۔بلکہ داخلہ کے خواہشمند افراد میں اضافے کی بنا پر اب پہلے ایک رجسٹریشن فارم ضروری دستاویزات کے ساتھ جمع کروانا ہوتا ہے۔ضروری کاروائی کے بعد جو طلبہ داخلہ کیلئے اہل ثابت ہوتے ہیں ان کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔پھر کامیاب امیدواروں کی حتمی لسٹ لگائی جاتی ہے۔سندھ مدرستہ الاسلام میں اساتذہ کی تربیت کیلئے "ٹیچرز ڈیولپمنٹ سینٹر" بھی قائم ہے۔(محمد علی شیخ 1998ء ص 5-10)

سندھ مدرستہ الاسلام: وسائل

مالی وسائل کے سلسلے میں مختلف مسلم ریاستوں کے نوابین کے ساتھ ساتھ حکومت نے بھی تعاون کیا جبکہ عوام نے بھی اس تحریک میں درجہ بدرجہ جوش و خروش سے حصہ لیا۔مالی امداد کے لئے حسن علی اور ان کے رفقاء نے ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔دس ہزار روپے کا گراں قدر عطیہ نواب جونا گڑھ نے اور چار ہزار روپے نظام حیدرآباد دکن نے عطا کیے(منظر الحق حسن علی آفندی 1960ء ص 20)۔بارہ ہزار روپے سالانہ کی ایک امداد امیر صاحب خیر پور نے اس شرط کے ساتھ منظور فرمائی کہ کالج کا پرنسپل انگریز ہوا کرے گا۔اس کے علاوہ انہوں نے پرنسپل کے بنگلے خیر پور ہاؤس اور تالپور ہاؤس کی تعمیر کیلئے بھی بڑی بڑی رقمیں دیں۔(نثار حسن علی آفندی 1960ء ص 25)

سینٹوریم جو کہ مدرسہ کی ایک پرانی عمارت ہے یہ سندھ مدرسہ کے طلبہ نے عطیات جمع کر کے تعمیر کروائی۔یکم جنوری 1885ء کو سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن نے 34 ہزار سردار محبت خان کھوسو نے 21 جنوری 1925ء کو دو ہزار اسی تاریخ کو سردار عبدالرحیم کھوسو نے 1500' خانصاحب آدم خان نے 1500' نواب چانڈیو نے 30 اپریل 1928ء کو 1500 کا جبکہ حاجی مراد بخش ماری نے 21 اگست 1933ء کو 5 ہزار روپے کا عطیہ دیا۔کے بی ولی محمد کی ہدایت کے مطابق

سندھ مدرسہ کی عمارت جیمز اسٹریچن نے ڈیزائن کی اور بغیر معاوضے کے تعمیر کی نگرانی کی نیز مدرسہ کیلئے ساڑھے آٹھ ایکڑ کی جگہ کراچی میونسپلٹی نے مفت دی۔(انجم جاوید 1998ء ص7)

حسن علی آفندی نے جگہ حاصل کرنے کے بعد اس جگہ پر بورڈنگ ہاؤس اور اسکول کی مرکزی عمارت کی تعمیر کیلئے ایک لاکھ روپے کے عطیات جمع کئے۔ یوں بورڈنگ ہاؤس کے طور پر تالپور ہاؤس (1901ء)، حسن علی ہاؤس (1909ء) خیر پور ہاؤس (1910ء) اور سردار ہاؤس (1919ء) قائم ہوئے جبکہ کراچی میونسپلٹی کے انجینئر اور آرکیٹکٹ جیمز اسٹریچن (James Stracham) نے نہ صرف عمارت کا نقشہ تیار کیا اور بلکہ کسی معاوضے کے بغیر اپنی نگرانی میں ادارے کی تعمیر کروائی۔ یوں حکومتی امداد، نوابین کی سرپرستی، مخیر حضرات کے عطیات اور مخلص رہنماؤں کی ذاتی کاوشوں سے سندھ مدرستہ الاسلام کے خاکے میں رنگ و روپ بھرے گئے۔(نثار حسن علی آفندی 1960ء ص25)

سندھ مدرستہ الاسلام: مسائل

سندھ مدرستہ الاسلام کے قیام میں مشکلات بھی پیدا ہوئیں جو قابل ذکر ہیں۔ اس وقت برصغیر میں مسلمان معاشرتی جبر و استحصال کا شکار تھے۔ جن کے خلاف سر سیّد احمد خان نے تعلیمی جہاد کا آغاز کیا۔ ان کی اس تعلیمی کاوش کا اثر سندھ میں حسن علی آفندی اور ان کے دوستوں پر بھی ہوا۔ اس نیک کام میں انہیں کلکتہ کے جسٹس سیّد امیر علی کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تو انہوں نے ایک فلاحی انجمن "نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" قائم کی۔ آفندی انجمن کے صدر مقرر ہوئے۔ اب ان عظیم ہستیوں کے سامنے ایک منزل تھی اور وہ تھی ایک عظیم مدرسے کا قیام۔(روزنامہ'ڈان'1999ء ص2)

اس دور میں مسلمانوں کیلئے کسی درسگاہ کے قائم کرنے میں اس قدر دشواریاں درپیش تھیں جن پر قابو پانا قریب قریب محال تھا۔ اس قسم کی تحریک میں سب سے بڑے دشمن خود مسلمان ہی تھے۔ چنانچہ حسن علی کی شان میں جو قصیدے لکھے گئے وہ یہ تھے:

او حسن علی وکیل..............................تجھے خدا کرے ذلیل (ایچ۔اے۔آر 1960ء ص8)

ایک طرف تو یہ کچھ ہوتا رہا اور دوسری طرف حسن علی آفندی کی کوشش برابر جاری رہی۔ اپنے خواب کو حقیقت بنانے میں ان کی سرگرمیاں جنون کی حد تک پہنچ چکی تھیں۔ انہیں نہ تو اپنی صحت کا خیال تھا اور نہ اپنے کاروبار کا جس نے انہیں بامِ عروج تک پہنچایا تھا۔ ان کے ذہن میں تو بس مدرسہ کی ایک عالیشان عمارت کا تصور تھا جس کی تعمیر کا تخمینہ دو لاکھ سے کم نہ تھا۔ ان دنوں اتنی کثیر رقم کا فراہم کرنا ایک کارے دارد تھا پھر زمین کا حاصل کرنا بھی ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک عظیم الشان عمارت کیونکر اور کیسے کھڑی کی جائے۔(محمد علی'شیخ 2005ء الف' ص3)

ایک روز جب کہ حسن علی آفندی فریئر روڈ سے گزر رہے تھے ان کی نظر قافلہ سرائے کے ایک پتھر پر پڑی جس پر ستارہ و ہلال کندہ تھا۔ یہ وہ ہی مقام تھا جہاں پیشین ریلوے کے جاری ہونے سے قبل قندھار، چمن اور دیگر مقامات سے سوداگران اسباب تجارت اونٹوں پر لاد کر لایا کرتے تھے۔ اور یہ قافلہ سرائے ان کی قیام گاہ تھی۔ انہوں نے سخت جدوجہد

سے اس قطعہ زمین اور اس سے متصل ایک اور قطعہ اراضی کو اسکول اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کیلئے حاصل کرلیا (منظر الحق 1960ء ص 20)۔لیکن اسی اثناء میں ایک اور شگوفہ کھلا، چند مسلم حضرات نے جن کا تعلق اسی طبقے سے تھا جس کی فلاح و بہبود کیلئے حسن علی کوشاں تھے۔عدالت میں دعویٰ دائر کردیا کہ قطعہ زمین ان کی ملکیت ہے۔

اپنی قومی مصروفیات کی بنا پر حسن علی وکالت کا پیشہ ترک کر چکے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس مقدمہ کی پیروی خود کی۔حسن اتفاق تھا کہ ادھر مدرسہ کی عمارت پایہ تکمیل کو پہنچی اور اُدھر انہوں نے مقدمہ جیت لیا۔لیکن قیام مدرسہ کے بعد بھی اس مرد مجاہد کی دشواریاں قائم تھیں۔مولوی اور ملا مسلسل مخالفت کے شعلے بھڑکائے جارہے تھے۔مدرسہ کے قیام کے دوسرے ہی دن صبح سویرے ایک بہت بڑا بورڈ مدرسہ کے دروازے پر آویزاں تھا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا "مدرسۃ الشیاطین"۔المختصر حسن علی آفندی کو اس مقصد کی تکمیل کیلئے مطلوبہ رقم، طلبہ کی رہائش کا بندوبست اسکول کی عمارت کیلئے مناسب جگہ کا بندوبست، مسلم اساتذہ کی فراہمی اور سندھی مسلمان طلبہ کی موجودگی کو یقینی بنانے جیسے مسائل کا سامنا تھا۔(علی محمد خواجہ 1960ء ص 52)

سندھ مدرستہ الاسلام:تنقیدی مطالعہ

سندھ کے مسلمانوں کی تعلیمی ابتری دور کرنے کیلئے جس شخصیت نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا وہ حسن علی آفندی تھے۔آپ نے سندھ کے چند دیگر احباب سے مل کر 1885ء میں سندھ مدرستہ الاسلام کے نام سے جو اسکول جاری کیا اس کا افتتاح لارڈ ڈفرن گورنر جنرل ہندوستان کے ہاتھوں ہوا جس نے سندھ آکر مدرستہ الاسلام کراچی اور دیارام کالج کا سنگ بنیاد رکھا اور بمبئی واپس چلا گیا (اعجاز الحق قدوسی 1984ء ص 123)۔علی گڑھ کے سابق استاد پرسی ہائیڈ اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ہائیڈ کا زمانہ اس تعلیمی ادارے کی ترقی کے لحاظ سے "سنہری زمانہ" تسلیم کیا جاتا ہے۔سندھ مدرستہ الاسلام نے اپنے بانیوں کے خلوص اور محنت کی وجہ سے بڑی ترقی کی۔سندھ کے دور دراز علاقوں کے طالب علم حصول تعلیم کیلئے یہاں آتے تھے (محمد اکرام شیخ 1982ء ص 20)۔سندھ مدرسہ اپنے مجموعی کردار اور تاریخی پس منظر میں ایک علمی ادارے کے طور پر قائم ہوا تھا لیکن یہ اس خطے کے روشن خیال مسلمانوں کی ایک تحریک کے مانند بن گیا جس نے اپنے طلبہ کے توسط سے قیام پاکستان کو یقینی بنایا۔(محمد علی شیخ 2005ء ب ص 1)

اس ادارے نے بڑی شخصیتیں پیدا کیں جن میں دانش جی آلانہ، ڈاکٹر عمر بن داؤد پوتا، اے کے بروہی، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر عبداللہ ہارون، علامہ آئی آئی قاضی، سر شاہنواز بھٹو، محمد ایوب کھوڑو، سردار عطا اللہ، غوث بخش، سر شاہنواز بھٹو، شیخ عبدالمجید سندھی، قاضی فضل اللہ، مسٹر جسٹس طفیل علی عبدالرحمٰن، سابق چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ اور قائداعظم کے نام قابل ذکر ہیں (اردو انسائیکلوپیڈیا 2005ء ص 855)۔1891ء میں قائداعظم اس مدرسہ کی جماعت چہارم میں زیر تعلیم تھے لیکن 5۔جنوری کو طویل غیر حاضری کے باعث ان کا نام رجسٹر سے خارج کردیا گیا۔9۔فروری 1891ء کو دوبارہ داخلہ ہوا۔1892ء میں انہوں نے سکول چھوڑ دیا (ایم سجاد حسین 2006ء ص 13)۔کہا جاتا ہے کہ

1930-33 کے دوران لندن میں جو گول میز کانفرنسیں ہوئیں۔ ان میں ہندوستان کے مسلمان مندوبین میں سے نصف سندھ کے طلباء قدیم تھے۔اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قائداعظم کے علاوہ بھی سندھ مدرسہ کو عظیم شخصیات پیدا کرنے کا شرف حاصل ہے۔(ارشاد احمد حقانی 1998ء ص 4)

سندھ مدرستہ الاسلام برصغیر کا واحد تعلیمی ادارہ ہے جہاں قائداعظم نے تعلیمی زندگی کے تقریباً ساڑھے چار سال گزارے (جی الانہ 1969ء ص 230)۔گویا سندھ مدرسہ مسلمانوں کی قدیم درسگاہوں میں سے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے مرکزی رہنماؤں کی مادرِ علمی ہے۔علاوہ ازیں سندھ کا روایتی نظام تعلیم سے جدید نظام تعلیم ہونے کا سہرا بھی سندھ مدرسہ کو ہی جاتا ہے۔اگرچہ سندھ مدرسہ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل نہ ہوسکا۔مگر سندھ یونیورسٹی کی ابتداء سندھ مدرسہ کے بورڈ آفس کے کمرے سے ہوئی جس میں یونیورسٹی مذکور کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر اے۔بی۔اے حلیم کو پیر الٰہی بخش نے لاکر بٹھایا تھا۔پھر قیام پاکستان کے بعد سرسیّد کی "علی گڑھ تحریک" کی متاد جماعت ایجوکیشنل کانفرنس مہاجر بن کر کراچی آئی تو اس کو بھی سندھ مدرسہ ہی میں پناہ ملی۔(محمد الیاس فارانی 1968ء ص 16)

قیامِ پاکستان کے بعد سندھ مدرسہ کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا اور اس ایک سرچشمہ فیض سے ادب 'تہذیب' علم وفن کے کئی اور چشمے پیدا ہوئے جن میں سے ہر چشمہ اپنے افادہ وفیضان کا ایک خاص دائرہ رکھتا ہے۔سندھ مسلم کالج' سندھ مسلم لاء کالج، ایس۔ایم۔بی لیاری ہائی اسکول، جناح کورٹس اور ایس۔ایم۔بی فاطمہ جناح ہائی اسکول وغیرہ اسی نظام شمسی کے سیارے ہیں۔سندھ مدرسہ کے 140 سالہ دور میں سے ابتدائی پچاس برسوں کو قابل رشک کہا جاسکتا ہے کیونکہ 1885ء سے 1935ء تک مدرسہ انگریز انتظامیہ کے ماتحت رہا۔(انجم جاوید 1998ء ص 7)

کئی مصنفوں نے سندھ مدرستہ الاسلام کے قیام کو سرسیّد کی تعلیمی تحریک ایجوکیشنل کانفرنس کا نتیجہ بتایا ہے لیکن سیّد معین الدین لکھتے ہیں: اس بیان میں کوئی صداقت نہیں کیونکہ دسمبر 1885ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔سرسیّد نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک تحریک شروع کی جس کا پہلا اجلاس دسمبر 1886ء میں علی گڑھ میں ہوا اور اس کے بعد ملک کے طول وعرض میں تعلیم کے فروغ کی تحریک شروع ہوئی۔لیکن سندھ مدرسہ کا اجراء اس سے پہلے ہوچکا تھا۔صرف یہی نہیں کہ سندھ مدرسہ کا قیام سرسیّد کی تعلیمی تحریک کا نتیجہ نہ تھا بلکہ سندھ میں تعلیمی تحریک کا تعلق بھی کچھ سرسیّد کی ذات سے نہ تھا۔حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں تعلیمی تحریک کا آغاز نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی شاخ کراچی کے مساعی کا نتیجہ تھا۔یہ ایسوسی ایشن جسٹس سیّد امیر علی نے قیام کانگریس سے بھی پہلے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کیلئے 1882ء میں قائم کی تھی۔(معین الدین 'سیّد 1973ء ص 97)

الغرض اس ادارے نے اپنے قیام اور تعلیمی مشن شروع کرنے کے بعد نہ صرف مسلمانوں کی بہتر تعلیم وتربیت کی بلکہ سندھ کی ہر شعبہ زندگی میں مرکزی قیادت فراہم کرنے کے علاوہ برصغیر کی حریت پسند سیاست کو معروف سیاسی رہنما بھی دیئے۔

9.3 اسلامیہ کالج پشاور

پس منظر

صوبہ سرحد میں تعلیم کا دورِ جدید اگرچہ 19ویں صدی کے اواخر میں انگریزوں کے باعث ہوا مگر یہاں کا پس منظر قدرے مختلف ہے (محمد احمد علی 1998ء ص 18)۔ صوبہ سرحد پر انگریزوں کی نظریں اس وقت سے تھیں جب وہ 18ویں صدی عیسوی کے وسط میں جنوب مشرقی ہند اور پھر شمالی ہند میں اپنی حکومت کے قیام کے لئے نبرد آزما تھے۔ انگریز نہ صرف پورے ملک پر تسلط کا منصوبہ بنا چکے تھے بلکہ ہندوستان پر قبضے کے بعد ان کی نظریں افغانستان پر لگی ہوئی تھیں۔ ہندوستان پر قبضے میں استحکام کے نقطہ نظر سے شمال مغربی سرحدوں کی طرف سے انہیں پورا اطمینان ہونا ضروری تھا۔ سرحد پر قبضے سے ان کے پیش نظر کئی فوائد تھے:

(الف) ہندوستان پر ہمیشہ شمال مغربی سمت سے حملے ہوئے تھے۔ اب انگریزوں کو بھی اسی سمت سے خطرہ تھا کہ کہیں افغانستان' ایران وغیرہ سے کوئی صاحب ہمت اٹھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے نہ چڑھ دوڑے۔

(ب) 1831ء میں سیّد احمد شہید کی ناکامی کے باوجود تحریک جہاد کے اثرات آزاد قبائل اور صوبہ سرحد میں موجود تھے۔ انگریز اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ صوبہ سرحد کی خاکستر میں چھپی ہوئی یہ چنگاری کسی وقت شعلہ جوالہ بن کر خرمنِ آرزو کو جلا کر خاکستر بنا دے۔

(ج) افغانستان پر قبضے اور توسیع پسندانہ عزائم کی تکمیل اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ (اقبال احمد، خان 1974ء ص 111)

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صوبہ سرحد پر انگریزوں کے لئے قبضہ کرنا کس وجہ ضروری تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے ایک منصوبے کے تحت جال پھیلانا شروع کیا۔ جوں جوں سرحد پر سکھوں کی گرفت کمزور ہوتی گئی برٹش استعمار اس پر اپنا تسلط جماتا گیا۔ حتیٰ کہ 19ویں صدی کے وسط تک پورے سرحد پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن قبضہ کر لینے سے ہی خطرات کا انسداد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد کا منصوبہ انگریزوں کے پیش نظر یہ تھا کہ صوبہ سرحد کے غیور پٹھانوں میں ایک ایسا فکری انقلاب لایا جائے کہ وہ انگریزوں کے لئے خطرہ باقی نہ رہیں۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ کسی طرح صوبہ سرحد کو عیسائیت کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر بنا لیا جائے تو جو مذہبی عصبیت انہیں انگریزوں سے نفرت اور ان کی حکومت کی مخالفت پر مجبور کرتی ہے۔ اس کا رخ تبدیل ہو جائے گا۔ یوں دنیا و دین دونوں ان کے ہاتھ آ جائیں گے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو مرتد بنانے کا جو منصوبہ بنایا اس کے لئے عیسائی پادری عیسائیت کی تبلیغ کرتے اور سب سے بڑھ کر مشنری اسکولوں کے نتائج پر انگریز امید لگائے بیٹھے تھے۔ (یوسف علی، خان 1990ء ص 1)

اس منصوبے میں انگریزوں کو تو ناکامی ہوئی لیکن مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ضرور پیدا ہو گیا کہ جو عہدِ جدید کے حالات و تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مسلمانوں کے مروجہ نصاب و نظام تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی ضرورت کو

محسوس کرتا تھا۔اس گروہ کے بالغ نظر لوگوں میں سے پشاور کے رئیس فدا محمد خان نے جو یورپ میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، مسلمانوں میں جدید تعلیم کی تحریک کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ان کی اس تعلیمی تحریک میں پشاور کے مشہور ٹھیکیدار بابو غلام حیدر، میاں عبدالکریم نے نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا اور اس تحریک کو دامے قدمے سخنے کامیاب بنانے میں سعی کی۔(محمد امیر شاہ قادری گیلانی (س ن) ص 2-8)

ان حضرات نے انجمن حمایتِ اسلام کے نام سے مسلمانوں کی ایک جماعت تشکیل دی۔اس جماعت نے ایک طرف اسلامیہ اسکول کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمان بچوں کو مشنری اسکولوں کی غیر اسلامی اور عیسائیت سے مسموم فضا سے بچا کر انگریزی زبان اور سائنس کی تعلیم دی جائے۔ساتھ ہی ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کیا جائے۔ملت کے ان ہی بہی خواہوں نے اسلامیہ اسکول کی بنیاد 1890ء میں رکھی جو 1903ء میں ہائی اسکول کے درجے تک پہنچ گیا۔اس کی اپنی عمارت بھی بن گئی۔اسلامیہ کلب قائم ہوگیا۔طلبہ کے لئے ایک ہاسٹل، ایک اعلیٰ درجے کا کتب خانہ و دارالمطالعہ نیز پبلک جلسوں کے لئے ایک وسیع ہال بھی بن گیا۔انجمن حمایت اسلام کے ان اداروں نے پشاور میں مسلمانوں کے تعلیمی، تہذیبی اور علمی مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔(محمد اسلم، پروفیسر (س ن) ص 68)

مسلمانوں کی کم نصیبی یہ ہوئی کہ ان حضرات کے بعد ان کے جانشین ان صلاحیتوں کے مالک نہ تھے۔نتیجہ یہ نکلا کہ ان اداروں کو ترقی دینا تو درکنار ان کو سابقہ حالت پر بھی باقی نہ رکھ سکے۔چنانچہ 20ویں صدی کی پہلی دو دہائیاں گزرتے گزرتے یہ تمام ادارے بند ہو گئے۔ٹھیک اسی زمانے میں سرحد کے بطلِ جلیل صاحبزادہ عبدالقیوم خان مسلمانوں کی خدمت و رہنمائی کے میدان میں آئے۔انہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے صوبہ سرحد کے چیف کمشنر جارج روس کیپل (George Roos Keppel) کی امداد اور تعاون حاصل کر لیا۔اگست 1909ء میں حمایت الاسلام ہائی اسکول کے سالانہ جلسے میں ایک کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا گیا۔جس کے ذمہ درسگاہ کے لئے ابتدائی منصوبہ تیار کرنا تھا۔(اردو انسائیکلوپیڈیا 2005ء ص 133)

اس منصوبے کے مطابق پشاور سے درہ خیبر کی طرف پانچ میل کے فاصلے پر ایک دارالعلوم اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ وہی دارالعلوم اسلامیہ ہے جو بعد میں اسلامیہ کالج پشاور کے نام سے مشہور ہوا جس کے لئے Olaf لکھتا ہے:

Together they created the Islamia College, now grown into the University of Peshwar. This is their joint and visible monument, the tribute to their fore-sight and wisdom. (Olaf Caroe 1965, P:424)

یوں صاحبزادہ عبدالقیوم خان اور روس کیپل کی ان تھک کوششوں سے اسلامیہ کالج بنا (کیلنڈر یونیورسٹی آف پشاور 66-1965ء ص 408)۔1911ء میں حاجی صاحب ترنگزئی نے کالج کی جامع مسجد اور کالجیٹ اسکول کی بنیاد

رکھی ۔اس موقعہ پر ایک پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔جس میں بڑے بڑے علماء' خوانین' سرکاری افسران اور ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والوں نے شرکت کی۔کالج کی بنیاد روس کیپل نے رکھی ۔مارچ 1913ء میں اسکول کی جماعتیں شروع ہوئیں جبکہ یکم اکتوبر 1913ء کو کالج کی جماعتوں کا با قاعدہ اجراء ہوا۔(خلیجی ۔جے ڈی 1963ء ص 17)

اسلامیہ کالج پشاور: مقاصد تعلیم

انگریزوں کے عہد میں حکومت نے برصغیر پاک وہند میں تعلیمی ادارے اس لئے قائم کئے تھے کہ یہاں حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے کلرک اکاؤنٹنٹ یا اسی تعلیم کے دوسرے اہل کار حاصل ہو سکیں ۔ان اداروں کا دوسرا بڑا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کے ذہنوں میں سے آزادی اور حب الوطنی کا جذبہ یکسر نکال دیا جائے (عبدالعزیز 1988ء ص 132)۔صوبہ سرحد میں انگریزی کے چند پرائمری اسکول دیہات میں اور تین ہائی اسکول شہروں میں تھے جن میں تعلیم حاصل کرنے والے صرف خوانین اور سرداروں کے بچے تھے جو انہوں نے اپنے مخصوص مقاصد حاصل کرنے کے لئے کھولے تھے کیونکہ انگریزوں کی یہ پالیسی تھی کہ یہ خطہ کسی حالت میں بھی علم کی روشنی سے منور نہ ہو۔بقول پروفیسر عبدالمجید افغانی ایک مرتبہ صاحب زادہ عبدالقیوم نے پٹھانوں کو علم کے زیور سے آراستہ کرنے کے لئے ایک انگریز سے بات کی تو جواب ملا "بنگالیوں کو تعلیم دے کر ہم نے کونسا فائدہ اٹھایا جو پٹھانوں کو تعلیم دے کر اٹھائیں"۔(محمد جنید 1988ء ص 41)

گویا یہ نوابزادہ عبدالقیوم کی فراست اور سیاست کا بین ثبوت ہے کہ ایک طرف تو انہوں نے انگریزوں کو قائل کیا کہ پٹھانوں کو تعلیم دینے سے کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ جب تک ہندوستان پر ان کا قبضہ رہے گا وہ سرحد پر بھی قابض رہیں گے کیونکہ صوبہ سرحد ہمیشہ سے ہندوستان کا ایک صوبہ چلا آ رہا ہے۔دوسری طرف انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں سوچنا شروع کیا۔کیونکہ 1901ء میں جو کرسچن مشن کالج پشاور میں کھولا گیا ۔اس کالج میں بائبل کی تعلیم لازمی تھی ۔اس لئے مسلمان اپنے بچوں کو اس کالج میں داخل نہیں کراتے تھے۔نتیجے کے طور پر مسلمان تعلیم سے محروم رہتے تھے۔1909ء کے اوائل میں صاحبزادہ عبدالقیوم' صوبہ سرحد کے چیف کمشنر جن سے ان کے دوستانہ تعلقات بھی تھے' کے ساتھ سرکاری کام سے کلکتہ گئے۔اس دوران انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا دورہ کیا(زاہدالرحمٰن 2002ء ص 40)۔اس دورہ کے بعد صاحبزادہ عبدالقیوم نے روس کیپل کے مشورہ سے جو تعلیمی اسکیم مرتب کی' اس کے مطابق اسلامیہ کالج پشاور وجود میں آیا اور درج ذیل اس کے مقاصد قرار پائے:

The aim of the college was to educate the youngsters of N.W.F.P and bring them to the level of the rest of India to enlighten them with the true knowledge of science and technology. (Muhammad Ahmad Ali 1998, P: 145)

اسلامیہ کالج پشاور: نصاب تعلیم

بانی مدرسہ صاحبزادہ عبدالقیوم کی بڑی تمنا تھی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نمونے پر ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے روس کیپل کے ہمراہ علی گڑھ کا دورہ بھی کیا۔ 18 جنوری 1910ء کو علی گڑھ کے ناظم دینیات مولانا عبداللہ انصاری پشاور آئے۔ توان سے رہنمائی حاصل کی گئی (انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا 1998ء ص 206)۔ کالج کے سابق پرنسپل خلجی جے ڈی کے مطابق نصاب تعلیم علی گڑھ والا ہی رکھا گیا۔

The pattern was the same as seen at that other great seat of learning in Aligarh.(Khilji,J.D,1963,P:18)

ممتاز احمد خان جو کہ اس کالج کے طالب علم رہ چکے ہیں اور پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ کینٹ سے بطور اسسٹنٹ ورکس مینجر ریٹائر ہوئے ہیں وہ خیبر کے "جشنِ الماس نمبر" میں اپنی یاداشت قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: صوبہ سرحد کے مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کے لئے صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے دل میں ایک تڑپ تھی جس کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے پشاور کے نواح میں جمرود روڈ پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ڈگر پر اسلامیہ کالج پشاور کی بنیاد ڈالی (ممتاز احمد، خان 1988ء، ص 52)۔ کالج ہذا کی مختلف پراسپیکٹس کے مطالعہ سے نصاب تعلیم کے زمرے میں معلوم ہوتا ہے کہ کالج میں انٹر اور ڈگری سطح پر آرٹس، سائنس اور تھیالوجی جیسی تین بڑی جہتوں میں تعلیم دی جاتی تھی۔

اسلامیہ کالج پشاور: حکمت تدریس

اسلامیہ کالج نے برصغیر میں اور خاص طور پر صوبہ سرحد کے عوام میں حیرت انگیز ذہنی بیداری پیدا کی۔ جس وقت پاک و ہند میں انگریز سامراج کا دور دورہ تھا اور مسلمانان پاک و ہند جس طرح انگریز سامراج کے غلام بن چکے تھے نیز انگریز سامراج سے آزاد ہونے کے آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ اُس وقت اسلامیہ کالج نے جس طرح لوگوں میں آزادی کا شعور بیدار کیا وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس کالج کے طالب علموں نے جگہ جگہ، محلے محلے، شہر شہر، قصبے قصبے اسلام اور مسلمانوں کے لئے انگریز سامراج سے آزادی کی روح پھونکی۔ یہی اس تعلیمی تحریک کی حکمتِ تدریس تھی کہ طلبہ جدید علوم کے حصول کے ساتھ ساتھ اخلاقی، معاشی، معاشرتی، اسلامی اور سیاسی اقدار کے حامل ہوں۔ اس سلسلے میں اس کالج کے ایک طالب علم محمد سالم خان خلیل ایڈووکیٹ جو بعد ازاں پاکستان کی قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے لکھتے ہیں کہ:

اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اس کالج میں جو بھی طالب علم رہا ہوگا اس میں سیاسی شعور ضرور ہوگا یہ اس کالج کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس کا طالب علم سیاسی شعور میں کسی سے پیچھے نہیں ہوتا۔ اس کالج میں پڑھنے سے ہر طالب علم میں اسلامی اقدار پیدا ہوتی ہیں اور اس کا طالب علم اسلامی تعلیمات میں کسی سے کم نہیں ہوتا۔ اس کالج کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا طالب علم مہمان نواز اور دلیر ہوتا ہے جو ایک اسلامی صفت ہے۔ وہ باحیا ہوتا ہے اور زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں نام پیدا کرتا ہے۔ ایسی ہزاروں زندہ مثالیں موجود ہیں۔ میں خود بھی ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا

لیکن اس کالج کے سیاسی شعور اور ذہنی بیداری نے مجھے 27 سال کی عمر میں قومی اسمبلی کا ممبر بننے کا موقع فراہم کیا یہ سیاسی شعور اللہ نے اس کالج کی بدولت مجھے بخشا۔(محمد سالم، خان 1988ء ص 116)

بانی کالج صاحبزادہ عبدالقیوم خان ہمہ وقت طلبہ کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف رہتے۔ان کو جب سرحد سے باہر کسی قابل پروفیسر کے متعلق خبر پہنچ جاتی تو ان کی حتی الوسع یہ کوشش ہوتی کہ اس اسلامیہ کالج میں ملازم رکھا جائے۔آپ خود اس کو لانے کی کوشش کرتے یا ایلچی بھیجتے۔اگر یہ بات کارگر نہ ہوتی تو ان کو دعوت دی جاتی اور اچھی طرح خاطر تواضع کے بعد انہیں اسلامیہ کالج اپنے ساتھ لے آتے۔اور اسی طرح ان سے لیکچر دلوادیتے۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال جیسی شخصیت کو بھی آپ کھینچ لائے (محمد جنید، صاحبزادہ 1988ء ص 43)۔نظم وضبط' پابندی وقت' اساتذہ کی قابلیت اور طالب علموں پر شفقت جیسی خصوصیات حکمت تدریس کے اہم ستون تھے۔اساتذہ پڑھانے کے لئے تیاری سے آتے تھے۔اور سوائے تعلیمی باتوں کے دیگر غیر ضروری باتوں سے گریز کرتے تھے(احسان اللہ، خان 1988ء ص 65)۔ تجربہ کار اعلیٰ تربیت یافتہ اور اپنے مضامین پر مکمل دسترس رکھنے والے یہ اساتذہ طلبہ میں اپنا علم منتقل کرنے کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ان کے مطابق طلبہ کا ہر لحہ نہایت قیمتی ہوتا ہے اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔لہٰذا اس قول پر سختی سے عمل ہوتا تھا(عبدالعزیز 1988ء ص 132)۔رشتہ استاد و طالب علم کو پختگی عطا کرنے کے لئے باقاعدہ ٹیٹوریل گروپس بنائے گئے تھے جیسا کہ کالج ہذا کے پرانے طالب علم محمد ارشاد بیان کرتے ہیں کہ:

The Tutorial group was also quite good institution and responsible for good relations between students and teachers. (Muhammad Irshad 1988, P:67)

المختصر تدریس کی حکمت یہ تھی کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا خصوصی انتظام تھا جیسا کہ کالج کے ایک سابق طالب علم فرہاد جان لکھتے ہیں:

Besides, high academic standard Islamic college contributed a lot to the character building activities. For this purpose, a sermon period was made an intergral part of the college time table. (Farhad Jan 1988, P:65

اسلامیہ کالج پشاور: ہیئت تعلیم

تعلیمی نظام میں جن اساتذہ کرام نے بنیادی کام دیا ان میں اے سی ٹی برادرٹن (A.C.T.Brotherton)' ایچ ایم کلوز' قاضی عنایت اللہ' پروفیسر نفیس الدین' طاہر فاروقی' جلال الدین' شبیرالدین' مسٹر سکاٹ' شیخ محمد تیمور' شیخ منہاج الدین' مرزا انور بیگ' حافظ محمد عثمان اور حافظ محمد ادریس شامل تھے(ذاکر اعجاز، سیّد 1988ء ص 32)۔تعلیمی

نظام کی بنیادوں کو مزید مستحکم کرنے کے لئے پراکٹوریل (Proctorial) نظام قائم تھا۔اس نظام کا سربراہ پروفیسر صاحبان سے کوئی ہوتا تھا جبکہ کالج اور ہاسٹل کے مختلف طلبہ ان کی معاونت کرتے تھے۔ان پراکٹر طلبہ کو مختلف ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔مثلاً یونیفارم اور نظم وضبط کی پڑتال کرنا'صدر بازار اور پشاور شہر جاکر طلبہ سے سپرنٹنڈنٹ صاحبان کے اجازت نامے چیک کرنا وغیرہ۔قوانین وضوابط کی خلاف ورزی کرنے پر بھاری جرمانے لگتے اور والدین کو مطلع کیا جاتا تھا۔یہ پراکٹوریل نظام بڑا منظم تھا۔اس کی وجہ سے طلبہ کے کردار کا خیال رکھا جاتا تھا۔کیا مجال کہ کوئی طالب علم شیطانی کرے یا کالج اور ہاسٹل سے غیر حاضر ہو۔(احسان اللہ خان 1988ء ص 65)

خیبر یونین

اس وقت طلبہ کی غیر سیاسی انجمن تھی جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو ایسی تربیت مہیا کی جائے کہ وہ تقریر کرنا سیکھیں اور عملی زندگی میں سرخروئی حاصل کریں۔خیبر یونین کی صدارت اور جنرل سیکرٹری شپ کے لئے سخت مقابلے ہوتے تھے۔یہ مقابلے طلبہ کے ناموں پر ہوتے تھے نہ کہ آج کل کے سیاسی گروپوں کے طرز پر۔طلبہ کسی نہ کسی طالب علم گروپ کی حمایت ومعاونت کرنے میں اپنی گہما گہمی دکھاتے تھے۔کالج اور ہاسٹلوں میں تقاریر کرتے'اپنے گروپ کے امیدوار کو کامیاب کروانے کے لئے دن رات کوشاں رہتے تھے۔مباحثہ سیکھنے کے لئے خیبر یونین ایک تربیتی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔(دلاور شاہ 1988ء ص 37)

فزیکل ایجوکیشن کورس

سال اول اور سال دوم کے طلبہ کیلئے صبح پی۔ٹی کا کورس مکمل کرنا ضروری ہوتا تھا۔ورنہ امتحانات اور خاص کر یونیورسٹی کے امتحانات میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ان دنوں بورڈ کا کوئی وجود نہیں ہوتا تھا۔لہٰذا تمام امتحانات یونیورسٹی ہی براہ راست لیا کرتی تھی۔پی۔ٹی کالج کے طلبہ کے لیے ہوتی تھی اور ہاسٹل کے طلبہ کے لئے سی ایم ٹی کا کورس مکمل کرنا ضروری ہوتا تھا۔جس کے انچارج ایچ ایم کلوز ہوا کرتے تھے۔یہ کورس ستمبر سے نومبر کی یخ بستہ صبحوں تک ہوا کرتے تھے۔ہاسٹل کے علاوہ روزمرہ کالج آنے والے طلبہ صبح چھ بجے کالج کے پچھلے لان میں پہنچ جایا کرتے تھے اور تقریباً ایک گھنٹہ تک پی۔ٹی کیا کرتے تھے۔صبح کی یہ ورزش طلبہ کو سارا دن تروتازہ رکھتی تھی۔(رستم خان 1988ء ص 56)

بزم السنہ شرقیہ یا بزم ادب

بزم السنہ شرقیہ یعنی مشرقی زبانوں کی بزم ۔یہ نام چونکہ عام فہم نہیں تھا لہٰذا بعد ازاں اس کا نام بزم ادب رکھا گیا۔یہ بزم بڑے پیمانے پر مشاعرے کرواتی تھی۔جس میں قومی سطح کے شاعر اپنا کلام پیش کرکے داد وتحسین حاصل کرتے تھے۔اس وقت کے چند مشہور شعراء یہ تھے۔رضا ہمدانی'فارغ بخاری'خاطر غزنوی'احمد فراز'محسن احسان'حافظ لدھیانوی'محمود سرحدی'دو ہندوستانی شعراء...وش صدیقی اور خمار بنکوی'پشتو شعراء... حمزہ شنواری'اجمل خٹک' یونس خلیل' ہمیش گل ہمیش'سیّد رسول رسا وغیرہ۔(خورشید آفریدی 1988ء ص 67)

سرمن(Serman)اور لیکچرار

ہر اتوار کی صبح ایک گھنٹے کا سرمن (Serman)روس کیپل ہال میں ہوتا تھا۔جس میں قاضی نورالحق ندوی (ڈین تھیالوجی)نصیحت آموز خطبہ دیا کرتے تھے۔اس پیریڈ میں حاضری لازمی ہوتی تھی۔غیر حاضر طلبہ کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا(قاضی ملا 1988ء ص 39)۔اس پیریڈ میں تقریر کرنے کے لئے قاضی نورالحق ندوی کے علاوہ دنیا بھر کے جید عالم' سیاستدان' سائنس دان' شاعر' ادیب اور صحافی بھی مدعو کئے جاتے تھے۔ان شخصیات میں سیّدابوالحسن ندوی (عالم دین بھارت) مولانا مودودی' ڈاکٹر ذاکر حسین (جو بعدازاں بھارت کے صدر بنے)' علامہ اقبال' قائداعظم' مولانا ابوالکلام آزاد' نواب بہادر یار جنگ' خان عبدالقیوم خان' (صدر پروونشل اسمبلی سرحد)' سردار عبدالرب نشتر شامل ہیں۔مشہور قانون دان' حبیب اللہ خان مروت سیشن جج پشاور اور خان محمد ابراہیم خان کمشنر صوبہ سرحد کو جب لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا توانہوں نے اپنی لیاقت کا ثبوت دیتے ہوئے کئی ایک باریک قانونی نکتے سمجھائے جس سے طلبہ مستفید ہوئے۔ (فقیر محمد،خان 1988ء ص 92)

ٹیوٹوریل(Tutorial) گروپ

کالج میں ٹیوٹوریل گروپ کا نظام رائج تھا۔ہر سٹاف ممبر کے گروپ میں 25 تا 30 طالبعلم مختلف جماعتوں سے ہوا کرتے تھے۔ٹیوٹوریل گروپوں میں بھی طلبہ مباحثوں یا دیگر ہم نصابی مشاغل میں حصہ لیا کرتے تھے۔اتوار کوان گروپوں کی خصوصی نشست ہوتی تھی۔جس کا ہر طالب علم کو بے چینی سے انتظار رہتا تھا کیونکہ:

These groups would aslo arrange excursion tours, picnic parties and would thus promote social inter-action activities amongst the students. (Dilawar Shah, 1988, P:37)

اسلامیہ کالج کی ایک ہائی کنگ سوسائٹی بھی تھی۔جو ہر سال موسم گرما کی تعطیلات میں طلبہ کی ایک جماعت کے لئے کشمیر' کابل' دہلی اور آگرہ وغیرہ کی سیر وسیاحت کا انتظام کرتی تھی۔

کھیل

تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود کا بڑا اچھا انتظام تھا۔ہاکی۔فٹ بال۔ٹینس اور کرکٹ کی اچھی اور مضبوط ٹیمیں تھیں۔جو دوسرے کالجوں سے نہ صرف میچ کھیلتیں بلکہ جیت کر آتی تھیں (نیاز احمد 1988ء ص 49)۔سالانہ سپورٹس ڈے کالج کی تقریبات میں نمایاں اور اہم تقریب ہوتی تھی۔سالانہ میچ نہ صرف کالج کے طلبہ بلکہ شہر اور اردگرد کے دیہاتوں کے لئے میلے کا درجہ رکھتے تھے۔کالج کے ایک سابق طالب علم جو کہ انگلینڈ میں نامور پروفیسر آف سرجری ہیں کھیل کے میدان پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

At least three of the Islamia players later played for Pakistan

National team. In addition Islamic excelled in and dominated cricket, field hockey, lawn tennis and track. (Amjad Hussain, Dr.,1988, P:16)

لائبریری

اسلامیہ کالج پشاور کی ایک منفرد خصوصیت اس کی لائبریری تھی بلکہ ہے۔جس میں کثیر کتب کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں نادرونایاب اصل مسودات اور مخطوطات ہیں۔یہ کتب اور مخطوطات تحقیق کنندگان کے لئے سیر حاصل ذرائع ہیں۔ لہٰذا نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک طلبہ بھی اس منبع سے مستفید ہوتے رہے(نوشاد خان، ڈاکٹر 2006ء ص 5)۔ پشاور کے ایک علمی ادبی گھرانے کے چشم وچراغ مولانا غلام جیلانی کی ایک اپنی لائبریری تھی۔حج کے دوران مکہ اور مدینہ منورہ سے نادر کتب ساتھ لانا ان کا مشغلہ تھا۔ان کی لائبریری میں اعلیٰ شہرت کے حامل افراد مثلاً محمد بیگ عمران مقدسی، علامہ جراتی اور شیخ عبدالحق آف دہلی کے ہاتھوں سے لکھے نسخہ جات بھی موجود تھے۔مولانا غلام جیلانی کو اپنی لائبریری بہت عزیز تھی۔لہٰذا وہ سطحی قسم کے افراد کو کتب جاری نہیں کرتے تھے۔ان کی افسوس ناک وفات کے بعد امیر کابل نے ان کی لائبریری ڈیڑھ لاکھ روپے کے عوض خریدنے کی خواہش ظاہر کی مگر ان کے وارثوں نے اس قیمتی وراثت کو دینے سے انکار کردیا۔بانی اسلامیہ کالج صاحبزادہ عبدالقیوم کو جب معلوم ہوا تو انہوں نے کالج لائبریری کے لئے اسے وقف کرنے کی کوششیں تیز کردیں اور بالآخر ان کوششوں میں کامیاب ہوئے۔یوں یہ بیش بہا سرمایہ علم اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری میں منتقل ہوا۔(محمد احمد علی 1998ء ص 61)

کالج رسالہ

طلبہ کی تحریری وذہنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے سہ ماہی رسالہ "خیبر" نکالا جاتا تھا۔1922ء سے 1961ء تک یہ سہ ماہی مجلہ کے طور پر نکلتا رہا جب کہ 1961ء کے بعد سے یہ سالانہ رسالہ کے طور پر نکلتا ہے "خیبر" جو کہ ایک رسالہ ہی نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً ایک فخریہ پیش کش تھا۔اس کی زندگی کو ہم تین ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔پہلا دور 1922ء سے 1946ء تک ہے۔اس دورِ غلامی میں "خیبر" پریس ایکٹ آف 1935ء کے تحت کام کرتا تھا۔اس دور میں نظمیں اور غزلیں اگرچہ روانی سے لکھی جاتی تھیں بلکہ بنیادی طور پر وہ روائتی ہوتی تھیں۔یعنی عاشق ومعشوق کی باتیں جدائیاں اور ملاقاتوں پر مشتمل۔ہاں کبھی ایسی تحریر بھی کسی محب وطن کی آجاتی تھی:

اے خیبر اے آئینہ رفتگاں
کہ فسانہ عہد ماضی بیان

کہ مسلم جوان آج بیدار ہے
غلامی سے دل آج بیدار ہے

نشہ لوٹنے کو ہے مے خوار کا

نیا رنگ ہے آج گلزار کا

"خیبر" کا دوسرا دور 1940ء سے شروع ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری جنگ عظیم کے باعث دنیا آگ و خون کا دریا بنی ہوئی تھی۔ دنیا کا کوئی کونہ محفوظ نہ تھا۔ انسان کی حیثیت صرف ایک جنگلی جانور کی مانند ہو کر رہ گئی تھی۔ مغرب کی ہوس بام عروج پر تھی۔ بیروزگاری کی چھری گلوں پر چل رہی تھی۔ ان تمام حالات و واقعات سے آگاہی ہمیں "خیبر" کے صفحات سے ملتی تھی۔ اس وقت کے شاعر گہری نیند سونے والوں کو یوں بیدار کر رہے تھے۔

عہد رفتہ کو اپنے یاد کرو

نوجوانو اٹھو جہاد کرو

گردش صبح و شام کو بدلو

دہر کے اس نظام کو بدلو

ملک میں پھر بہار آ جائے

پھر وہی روزگار آ جائے

آزادی حاصل کر لینے یعنی 1947ء کے بعد "خیبر" کے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اب خیبر آزاد قوم کی آواز کے طور پر ابھرا۔ اس دور میں مجاہدین تحریک پاکستان کے لئے اس کا خصوصی شمارہ "پاکستان نمبر" نکالا گیا۔ جس میں نظریہ پاکستان' پاکستان کے ابتدائی مسائل' تحریکِ پاکستان میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے کردار کے بارے میں مضامین شائع ہوئے۔ 1962ء کے بعد سے یہ رسالہ سہ ماہی کی بجائے سالانہ رسالہ کے طور پر نکلتا ہے اور تین زبانوں (اردو' انگلش' پشتو) پر مشتمل ہوتا ہے۔ (عصمت اللہ 1990ء' ص 37)

اقامت گاہ/ہاسٹل

اسلامیہ کالج اقامتی ادارہ تھا۔ اساتذہ کرام کو مکان اور بنگلے بغیر کسی کرایہ کے دیئے جاتے تھے۔ جبکہ طلبہ کے لئے سات مختلف ہاسٹل تھے۔ ہر ہاسٹل میں اساتذہ میں سے ایک سپرنٹنڈنٹ اور ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہوتا تھا۔ یہ دونوں طلبہ کے لئے انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ کھانا دن میں دو مرتبہ دیا جاتا تھا۔ کھانے کی رقم مبلغ گیارہ روپے فی کس ماہوار تھی۔ ہاسٹل کی زندگی باضابطہ' پرسکون اور ہر لحاظ سے قابل دید تھی۔ (محمد سردار خان 1988ء' ص 61)

ہاسٹل کے تمام طلبہ علی الصبح اٹھ جاتے اور ان کی "Dress Prade" کروائی جاتی تھی۔ اس پریڈ میں ہاسٹل کا وارڈن تمام طلبہ کے لباس چیک کرتا تھا۔ طلبہ کو اپنے کمرے صاف ستھرے رکھنے کی ہدایت تھی جو اساتذہ کرام باقاعدہ چیک کرتے تھے۔ ہاسٹل کا بیرا جب تک گھنٹی نہ بجاتا تب تک کوئی طالب علم دوپہر یا رات کے کھانے کے لئے کھانے کے کمرہ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام طلبہ دن میں دو مرتبہ (سہ پہر اور شام) "کامن روم" میں جاتے تھے۔ رات آٹھ بجے

جب گھنٹی بجتی تو تمام طلبہ 8 تا 11 بجے تک لازماً مطالعہ کرتے تھے۔ہاسٹل میں طلبہ بھائیوں کی طرح رہتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔سپرنٹنڈنٹ کالج کی گھنٹی بجنے سے قبل حاضری لگاتے اور وردی چیک کرتے تھے۔کوئی طالب علم سپرنٹنڈنٹ کے تحریری اجازت نامے کے بغیر شہر یا صدر نہیں جاسکتا تھا۔غیر حاضری کی صورت میں فوراً والدین کو مطلع کیا جاتا تھا۔(فرہاد جان 1988ء ص 65)

اسلامیہ کالج پشاور: وسائل

1908ء کے اواخر یا 1909ء کے اوائل میں سر جارج روس کیپل اور صاحبزادہ عبدالقیوم خان سرکاری کام سے کلکتہ گئے اس دوران انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا دورہ کیا۔اس یونیورسٹی میں اس صوبے کے جو پٹھان طالب علم تھے۔انہوں نے دونوں شخصیات کا شاندار استقبال کیا۔ملاقات کے دوران انہوں نے یہ درخواست پیش کی کہ یا تو ان کے لئے علی گڑھ میں فرنٹیئر ہاسٹل تعمیر کیا جائے یا پھر ان کے لئے سرحد میں کوئی کالج کھولا جائے۔اس مقصد کے لئے وہاں کے طلبہ نے 60 روپے جمع کیے جو اس وقت کے لحاظ سے ایک خطیر رقم تھی اور یہ رقم روس کیپل کے حوالے کی۔روس کیپل نے یہ رقم صاحبزادہ عبدالقیوم خان کو دے دی۔(شکیل احمد 1985ء ص 284)

پشاور سے واپسی کے تھوڑے عرصے بعد پشاور میں ہی صاحبزادہ کے ایک دوست عبدالکریم خان اندرابی کے گھر میں شہر کے معززین کو مدعو کیا گیا۔شام کے کھانے پر صاحبزادہ نے موجود لوگوں کے سامنے بات شروع کی کہ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ علی گڑھ میں فرنٹیئر ہاسٹل یا پشاور میں مسلم کالج؟ سب لوگوں نے سرحد میں مسلم کالج کے خیال کو سراہا۔حاجی کریم بخش جو پشاور کی ایک بڑی کاروباری شخصیت تھی' نے کالج میں مسجد کی تعمیر کا ذمہ قبول کیا اور میاں رحیم شاہ کاکاخیل نے ہاسٹل بنانے کا وعدہ کیا۔ایک عارضی کالج کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔29 مئی 1911ء میں اس کمیٹی کو پہلے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔اس کمیٹی کے ارکان میں کرنل نواب محمد اسلم خان' عبدالکریم خان اور صاحبزادہ عبدالقیوم خان شامل تھے۔اس اجلاس میں کالج کی تعمیر کے سلسلے میں اہم فیصلے ہوئے۔(خلیجی جے ڈی 1963ء ص 14)

گویا سب سے پہلے مالی امداد کے سلسلے میں حاجی کریم بخش نے قدم اٹھایا اور 10 ہزار روپے نقد دینے کے علاوہ قرض حسنہ کا بھی وعدہ کیا۔اس کے بعد میاں رحیم شاہ کاکاخیل' نواب بادشاہ خان' نواب دیر اور نواب سر محمد زمان خان والئی امب نے اس کار خیر میں حصہ لیا اور فرداً فرداً ایک لاکھ روپے یا کچھ زیادہ چندہ عطا فرمایا۔ان اصحاب کے علاوہ نواب احمد نواب خان سدوزئی' ممند صاحب' حاجی محبت خان آف پڑانگ اور نواب محبت خان کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے دس دس ہزار روپے چندہ دیا۔(محمد جنید' صاحبزادہ 1988ء ص 40)

پشاور اور چارسدہ کے مخیّر حضرات نے کالج کے لئے دل کھول کر عطیات دیئے۔صاحبزادہ عبدالقیوم خان کالج کی تعمیر کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کے لئے بذات خود صوبہ کے کونے کونے میں گئے۔پشاور اور چارسدہ کے لوگوں نے سینکڑوں ایکڑ زمین کالج کے لئے بطور عطیہ دی جبکہ انکی بیگمات نے اس عظیم مقصد کی تکمیل کے لئے اپنے سونے کے

زیوارت ان کو دیئے۔علاوہ ازیں اگست 1908ء میں روس کیپل صوبہ سرحد کا چیف کمشنر مقرر ہوا۔صاحبزادہ عبدالقیوم نہ صرف گورنمنٹ ملازم تھے بلکہ روس کیپل سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔یوں ان دونوں کی علم دوستی نے حکومتی گرانٹ کو اسلامیہ کالج کے لئے ممکن بنایا۔حکومت نے 2لاکھ روپے ابتدائی خرچہ کے لئے جبکہ 25ہزار روپے سالانہ گرانٹ کی مد میں منظور کئے۔(عطیہ روبی 1988ء،ص 71)

گویا چندہ،عطیات،مالی امداد اور حکومتی گرانٹ اسلامیہ کالج کے وسائل بنے۔

اسلامیہ کالج پشاور:مسائل

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ جب صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے آنکھ کھولی تو اس زمانے میں پٹھانوں کے اس خطہ ارض یعنی صوبہ سرحد کو ملک بے آئین کہا جاتا تھا۔اس کے مکینوں کے متعلق ایسی بے بنیاد باتیں غیر اقوام کے ذہنوں میں بٹھا دی گئی تھیں جو آدم خوروں کے قصے کہانیوں سے بھی زیادہ وحشت ناک تھیں۔ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہندوؤں کی طاقت بہت مضبوط تھی اور صوبہ سرحد میں بھی تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔کیونکہ پٹھان تجارت کے پیشہ کو اپنے لئے ذلیل اور باعث شرم تصور کرتے تھے۔جبکہ لفظ "بنیا" پشتو زبان میں گالی سمجھی جاتی تھی۔انگریزی تعلیم کی بڑے شدومد سے مخالفت کی جاتی تھی۔(محمد جنید،صاحبزادہ 1988ء،ص 40)

ان حالات میں دارالعلوم اسلامیہ کالج پشاور کی بنیاد کا معاملہ جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔اس سلسلے کی مشکلات درج ذیل تھیں۔

- سب سے زیادہ تو خان خوانین مخالفت پر آمادہ تھے۔ایک نواب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ عبدالقیوم سے کہہ دو کہ وہ میرے پاس چندے کے لئے آدمی نہ بھیجے۔میرے بچے لاہور میں تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔اگر عام لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ لیں گے تو میرے حقے میں چلم کون بھرے گا۔
- خان خوانین کے علاوہ "مُلا گروپ" نے اسلامیہ کالج جیسے تعلیمی منصوبے کی مخالفت کر کے بانی کالج کے مسائل میں اضافہ کیا۔انہوں نے انگریزی تعلیم کی مخالفت میں عجیب و غریب باتیں مشہور کر رکھی تھیں مثلاً

سبق دَ مدرسے وائی	دَ پارہ دَ پیسے وائی
جنت کنبے بہ حائے نہ وی	دوزخ کنبے بہ غوپے وائی

یعنی لوگ صرف دولت کی خاطر انگریزی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ان کے لئے جنت میں جگہ نہ ہوگی اور وہ دوزخ میں غوطے کھائیں گے۔(محمد عبدالحئی 1938ء،ص 3)

- خوانین اور مُلا گروپ کے علاوہ صوبہ سرحد کے عوام بھی اسلامیہ کالج کی وجہ سے انگریزی علوم کے پھیل جانے سے خوفزدہ تھے۔کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی علوم کے حصول سے معاشرتی تبدیلی وقوع پذیر ہوگی اور یہ مقامی اقدار و روایات کے خلاف ہوگی۔لہٰذا انہوں نے بھی اسلامیہ کالج کے اجراء کی مخالفت کر کے مسائل میں اضافہ

کیا۔

- اسلامیہ کالج کے اجراء کے مخالفین میں سے ایک گروپ نے اسے سیاسی رنگ دیا۔ان کے مطابق اسلامیہ کالج کا اجراء دراصل صوبہ سرحد کے عوام کو علی گڑھ سے دور رکھنے کی ایک سازش ہے۔تا کہ علی گڑھ کو تنہا اور غیر موثر کردیا جائے۔(باحاصل 1978ء،ص 212)
- اسلامیہ کالج جیسی عظیم تخلیق پر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کو بجا طور پر "سر سیّد سرحد" کہا جاسکتا ہے۔لیکن سرحد کے اس سر سیّد کے مسائل علی گڑھ کے سر سیّد سے مختلف تھے۔علی گڑھ کے سر سیّد احمد خان کے ساتھ محسن الملک، وقار الملک، مولانا شبلی اور الطاف حسین حالی جیسے مخلص و مختی رفقائے کار تھے۔مگر صوبہ سرحد کو علم کے نور سے منور کرنے میں صاحبزادہ عبدالقیوم تنہا تھے جو سب سے بڑا مسئلہ تھا۔پروفیسر عبدالماجد کے مطابق:

Syed had a society of friends and helpers of which Sir A.Q had non.(Abdul Majid, Afghani 1921, P:22)

- گوہر زمان پرنسپل یونیورسٹی پبلک اسکول پشاور کے مطابق اس تحریک کے سلسلے کے مسائل درج ذیل تھے۔

We cannot realise the difficulties which confronted Nawab Sahib at the very start. The selection of suitable site, the money, construction of building with hostels, provision of suitable staff for the institution, maintenance of accounts and clerical staff figured prominently. (Gohar Zaman 1988, P:17)

اسلامیہ کالج پشاور: نظام امتحانات و جائزہ

امتحانات کے انتظام و انصرام کے لئے باقاعدہ ایک کمیٹی تھی جس کا سربراہ کوئی پروفیسر ہوتا تھا۔اس شعبے کے اصول و ضوابط درج ذیل تھے۔

- انٹر اور ڈگری دونوں سطحوں پر ماہوار امتحان کے ذریعے طلبہ کی جانچ کی جاتی تھی۔پھر سال بھر کے ماہوار امتحانات میں سے تین بہترین امتحانات انٹرمیڈیٹ بورڈ/ یونیورسٹی کو ارسال کئے جاتے تھے۔
- سالانہ امتحان سے پہلے داخلہ ٹیسٹ بھی لیا جاتا تھا۔
- طلبہ کو فراہم کردہ کوئی بھی مالی امداد صرف اسی صورت قائم رہ سکتی تھی جب تک طالب علم کا تعلیمی معیار اچھا رہتا تھا۔
- چیئرمین امتحانات کمیٹی امتحانات کی تواریخ مقرر کرنے کے علاوہ ان کے انعقاد کا انتظام و انصرام بھی کرتا تھا۔
- سالانہ امتحان سے پہلے داخلہ ٹیسٹ نہ صرف طلبہ کے لئے معاون بلکہ لازمی تھا۔امتحان سے غیر حاضری کی

صورت میں پانچ سو روپے (-/500 روپے) جرمانہ ہوتا تھا۔

— پرچہ جات بنانے کے لئے کالج میں خفیہ پرانچ قائم تھی۔

— امتحانات میں اول' دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو انعامات دیئے جاتے تھے۔

(محمد احمد علی 1998ء' ص 54)

اسلامیہ کالج پشاور، تنقیدی مطالعہ

صوبہ سرحد مختلف ادوار میں علم وفن کے مختلف مراحل طے کرتا رہا بلکہ کروٹیں بدل بدل کر مختلف حالات وواقعات اور انقلاب کا شکار بھی ہوا لیکن پھر بھی یہ علمی رجحان عملی اور مجسم صورت میں جلوہ افروز ہونے کی سعی لاحاصل میں مصروف رہا۔ صوبہ سرحد کا اسلامیہ کالج پشاور...... جو کہ صرف ایک کالج ہی نہیں بلکہ ایک عظیم تحریک تھی...... یہ علمی ومذہبی تحریک فرنگی عصبیت کے باوجود مرعوب نہ ہوسکی۔ بلکہ اس نے ایک ٹھوس شکل میں عیاں ہونے کے لئے مصمم عزم کئے تشنگانِ علم کے لئے حوض کوثر کا روپ دھار لیا (نوشاد خان' ڈاکٹر 2006' ص 1)۔ تب ہی کالج کی ڈائمنڈ جوبلی پر اپنے پیغام میں وائس چانسلر بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان نے کہا کہ: اسلامیہ کالج پشاور ہماری تحریک آزادی کا وہ روشن باب ہے جس پر ہمیں بجا طور پر ناز ہے۔ (محمد نذیر' رومانی ڈاکٹر 1988ء' ص 11)

اس کے قیام وبقا میں وہ ہستیاں کارفرما ہیں جن کے جذبہ' عقیدت ملی کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان میں بانیٔ کالج صاحبزادہ عبدالقیوم خان کا نام سرفہرست ہے جو ایک عالم' بہترین مقرر' فقید المثال رہنما' عظیم مدبر' سیاستدان' تاریخ ساز شخصیت' عظیم محب وطن' علم پرور اور راست گو انسان تھے۔ لیکن ان کی کامیابی کا راز ان کی محنت ودیانت' خوش اخلاقی' بردباری' منکسر المزاجی' شفقت' فیاضی' شیریں کلامی' عزم وہمت اور عفو ودرگزر میں مضمر تھا۔ یہ ان کی حکمت عملی اور خوش اسلوبی کا واضح ثبوت ہے۔ کہ انہوں نے ایک طرف جدید علوم سے گریزاں اور انگریزی کے مخالف عوام کو ان علوم کے حصول کی طرف مائل کیا تو دوسری طرف انگریز حکومت سے ادارے کیلئے امداد حاصل کی۔ مگر انگریزوں کے مذموم مقاصد کو بھی پورا نہ ہونے دیا۔ (محمد جنید 1988ء' ص 48)

صاحبزادہ عبدالقیوم خان کے علاوہ سردار عبدالرب نشتر' حاجی صاحب ترنگزئی اور ملک وملت کے عظیم محسن قائداعظم نے بھی اس تحریک کو ترقی دینے میں عملی حصہ لیا۔ 1946ء میں قائداعظم کی Silver Bullets کی اپیل کے جواب میں اسلامیہ کالج کے طلبہ کی طرف سے کالج کے ایک طالب علم نے آٹھ ہزار روپے کی تھیلی قائداعظم کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگلی بار جب آپ آئیں گے تو ہم پاکستان کے لئے آپ کو اتنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔ قائداعظم نے وہ پیسے نہ صرف ان الفاظ کے ساتھ واپس کئے کہ عوام میں پھیل کر پاکستان کا پیغام کونہ کونہ اور قریہ قریہ پہنچادو بلکہ کالج سے واپس آ کر فوراً مبلغ پانچ ہزار روپے کا چیک کالج کے لئے روانہ کیا۔ یہ ہی نہیں بلکہ قائداعظم نے اپنے ذاتی ترکے میں سے اسلامیہ کالج پشاور کے لئے ایک بہت بڑا حصہ چھوڑا۔ (خلجی' جے ڈی 1963ء' ص 21)

اس ادارہ کے اساتذہ جملہ اخلاق وکردار کے مالک تھے جن کے محبت وشفقت بھرے تحریکراں سے علم کے شیدائی دمتوالے قطرہ نیساں چنتے تھے۔جن کے بڑھاپے پر جوانوں کو رشک آتا تھا۔اور جن کے مثالی کرداروں کے عملی نقوش طلبہ کے اذہان پر ثبت ہو جاتے تھے۔وہ عظمت'عزت'شان وشوکت اور جلال کا ایسا نمونہ تھے کہ جن کے سامنے شاندار اور بے لوث ذاتیں بھی ہیچ نظر آتی تھیں۔ان میں سے چند ایک نام یہ ہیں۔علامہ عنایت اللہ خان مشرقی'مولوی محمد عبداللہ'مولانا سیّد قطب شاہ'ایچ ایم کلوز'سیّد ظفر الحسین'ڈاکٹر چوہدری خداداد'مولانا محمد جمیل'مولوی عبدالرحیم'فضل قادر زبیری'نوراحمد'عبدالمطلب'ارباب عبدالواحد'ایم ایم کلیم'بشیر الدین اور محمد افضل۔(ایس ایم چغتائی'ڈاکٹر 1988ء'ص 27)

اسلامیہ کالج پشاور سے صوبہ سرحد کی شاندار تاریخ وابستہ ہے۔کیونکہ اس نے جو عظیم سپوت پیدا کئے۔انہوں نے ملک وقوم کے لئے ہر ہر شعبۂ زندگی میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔پاکستان کے سابق صدر غلام اسحاق خان اور صوبہ سرحد کے پہلے مسلمان گورنر صاحبزادہ خورشید اس کالج کے اولین طلبہ میں سے تھے۔جبکہ فوج'عدلیہ'محکمہ تعلیم'سیاستدان' میدان سائنس وآرٹس اور کھیل کود کے میدان میں اس کالج کے طلبہ نے اب تک سربراہی کردار ادا کیا ہے۔اگر ان کے الگ الگ نام لکھے جائیں تو ایک طویل فہرست مرتب ہوتی ہے۔(جاوید عزیز 1975ء'ص 450)

نظم وضبط اور تعلیمی اعتبار سے اسلامیہ کالج کا شمار ملک کی مثالی درسگاہوں میں ہوتا تھا۔کھیلوں اور ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی اس کے طلبہ کی کارکردگی نمایاں رہی۔اس کالج کو یہ اعزاز بھی حاصل ہی کہ بانی پاکستان قائداعظم یہاں تین مرتبہ تشریف لائے پہلی مرتبہ 1936ء دوسری مرتبہ نومبر 1946ء اور تیسری مرتبہ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے 1948ء میں۔1946ء میں ہندوستان بھر کا دورہ کرتے ہوئے قائداعظم جب پشاور پہنچے تو ان کے تحفظ کے پیش نظر حفاظتی دستے کے طور پر مسلم نیشنل گارڈز اور سرحد مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے درمیان طے نہیں پا رہا تھا کہ کون حفاظتی دستے کی ذمہ داری سنبھالے۔لہٰذا اس کے لئے جب قائداعظم سے پوچھا گیا تو انہوں نے فیصلہ اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ کے حق میں دیتے ہوئے فرمایا:

My Students will guard my room. (Khilji, j.D. 1963, P: 20)

اسلامیہ کالج پشاور کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ 1948ء میں بطور گورنر جنرل پاکستان قائداعظم کی آمد پر طلبہ نے کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔جس کے جواب میں قائداعظم نے فرمایا تھا:

You will get your University sooner than you can imagine.(Khilji, J.D. 1963, P:21)

قائداعظم کا یہ وعدہ جلد پورا ہوا اور لیاقت علی خان نے 13 اکتوبر 1950ء کو پشاور یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔اس کالج نے تین یونیورسٹیوں کو جنم دیا۔جن میں پشاور یونیورسٹی'یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی این ڈبلیو ایف پی' پشاور اور زرعی یونیورسٹی شامل ہیں۔جبکہ خیبر میڈیکل کالج'جناح کالج فار ویمن'قائداعظم کالج آف کامرس اور پاکستان

فارسٹ انسٹی ٹیوٹ شامل ہیں (مہتاب خان یوسف زئی 1988ء ص 21)۔ بقول ڈاکٹر نوشاد خان یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اسلامیہ کالج پشاور نے پاکستان کے لئے وہ کردار ادا کیا جو آکسفورڈ ایڈنبرگ (Edinburg) اور کیمبرج نے انگلینڈ کے لئے۔ (نوشاد خان ڈاکٹر 1996ء ص 34)

جنگ عظیم دوم (1939-45) میں محوری اور اتحادی طاقتوں میں جنگ زوروں پر تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے قوم سے اپیل کی کہ انگریزوں کے ملک چھوڑنے کے بعد مسلمانوں کو ایک علیحدہ ملک اور اپنی ثقافت بچانے کے لئے انگریزوں سے مطالبہ کرنا چاہیے تاکہ برِاعظم ہند کے تعلیمی و مادی طور پر پسماندہ مسلمان اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق اپنا ملک پاکستان بنائیں۔ پھر اسلامی کنفیڈریشن کی صورت میں جمال الدین افغانی کے خواب کو پورا کریں۔ خاص طور پر طلبہ سے اپیل کی گئی کہ زندگی اور موت کے اس مسئلہ پر اولین دستہ کی حیثیت سے حصہ لیں۔ قائداعظم کی اس اپیل پر اسلامیہ کالج کے طلبہ نے لبیک کہا اور دل و جان سے سرحد کو پاکستان میں شامل کرنے کیلئے تحریک شروع کی۔ (مصطفیٰ علی بریلوی سیّد 1980ء ص 174-177)

اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ نے تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے تن من دھن سے جلسے جلوس نکالے، پولیس کے ہاتھوں لاٹھی چارج کی صعوبتیں جھیلیں، جیل کاٹی مگر جب ریفرنڈم ہوا تو ریفرنڈم کے فیصلے نے طلبہ کی قربانیوں اور کاوشوں کا نتیجہ اس صورت میں دیا کہ صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہوگیا۔ پاکستان بن گیا۔ 12 اپریل 1948ء کو قائداعظم بطور گورنر جنرل پاکستان اسلامیہ کالج پشاور تشریف لائے۔ انہوں نے نہ صرف تحریک پاکستان میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ کے کردار کو سراہا بلکہ ان کے ساتھ لائبریری میں گروپ فوٹو بھی بنوایا۔ یوں تحریک پاکستان میں کالج ہٰذا کا کردار تاریخ کا ایک حصہ ہے (امین الوہاب، میاں کاکاخیل 1988ء ص 126)۔ اس باب کی مزید وضاحت کے لئے ضمیمہ نمبر 4 (الف)، (ب) اور (ج) مرتب کئے گئے ہیں ملاحظہ فرمائیے صفحہ نمبر 473 تا 476۔

باب دہم

تحریک دارالاسلام

10.1 پس منظر

دارالاسلام پٹھانکوٹ کے قیام سے پہلے کے حالات بتاتے ہیں کہ اس وقت دنیا میں اور خصوصاً برصغیر میں اسلام کس حال میں تھا؟ تب قوانین اسلام قریب قریب معطل تھے۔ اخلاق' معاشرت' معیشت اور زندگی کے سارے معاملات میں اصول اسلامی کا نفاذ پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں تھا۔ غیر اسلامی ماحول، غیر اسلامی تربیت اور غیر اسلامی تعلیم نے دماغ کو کہیں بالکل اور کہیں کچھ کم وبیش غیر مسلم بنا دیا تھا۔ آنکھیں دیکھتی تھیں مگر ان کا زاویہ بدل گیا تھا۔ کان سنتے تھے مگر ان کے پردے متغیر ہو چکے تھے۔ زبان بولتی تھی مگر زہریلی فضا چاروں طرف محیط تھی۔ معدے کو پاک غذا نہیں ملتی تھی کہ رزق کے خزانے مسموم ہو چکے تھے۔ عبادت جو اس جسم کے جوارح اور قوائم ہیں۔ قریب قریب 60 فیصدی تو مفلوج ہو چکے تھے اور جو 40 فیصدی باقی تھے وہ بھی اپنا اثر نہیں دکھا رہے تھے۔ کیونکہ اعضائے رئیسہ سے ان کا تعلق باقی نہیں رہا تھا۔ بقول سیّد مودودی: جب دماغ، پھیپھڑوں اور معدہ جگر سب کا فعل خراب ہو گیا ہو تو قلب کیسے صحیح وسالم رہ سکتا ہے۔ یہ محض اس زبردست قلب کی غیر معمولی طاقت ہے کہ نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ بچے کھچے اعضاء کو بھی کسی نہ کسی طرح چلائے جا رہا ہے مگر کیا اس اعضاء بریدہ اسلام میں کوئی کشش ہو سکتی ہے کہ یہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچے؟ کیا اس میں یہ طاقت ہے کہ ہندوستان کی زندگی میں اپنا کوئی اثر قائم کر سکے؟ بلکہ خاکم بدہن میں تو یہ پوچھوں گا کہ اس نوبت پر کیا ان حوادث کے مقابلہ میں جن کا سیلاب روز افزوں تیزی کے ساتھ آ رہا ہے۔ اپنے بقیہ اعضاء کو مزید قطع وبرید اور خود اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی' سیّد 1937ء' ص 288)

اس کا نتیجہ تھا کہ یَدْخُلُوْنَ فِي دِيْنِ اللهِ اَفْوَاجًا کے برعکس اب خود مسلمانوں کے گروہ میں اسلام سے بغاوت اور انحراف کی وبا پھیل رہی تھی۔ سارے ہندوستان میں اور اس کے اطراف واکناف میں کہیں بھی نظام اسلامی اپنی پوری مشینری کے ساتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا تھا کہ لوگ اس کے جمال وکمال کو دیکھتے اور درخت کو اس کے پھلوں سے پہچانتے۔ (ابوالآفاق' ایم اے 1971ء' ص 154)

ان حالات میں ایک طرف حکیم الامت علامہ اقبال اپنی بے مثال اور الہامی شاعری سے امت مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلا رہے تھے، دل مسلم میں زندہ تمنا بیدار کر رہے تھے، ملی سیاست اور اسلامی ریاست کی طرف پکار رہے تھے،

متحدہ قومیت کا طلسم توڑ کر وحدت واخوت کا درس دے رہے تھے (صابر ،کلوروی دسمبر 1979ء ص 102) تو دوسری طرف علامہ سے ذرا دور حیدرآباد دکن سے ترجمان القرآن کے ذریعہ نثر کی زبان میں یہی کام سیّد مودودی بھی انجام دے رہے تھے۔علامہ اقبال کی خواہش تھی کہ ایک ایسا علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں سے اہل علم، اسلام کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں اور دنیا کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق دین الٰہی کی حقانیت ثابت کریں۔(اسعد گیلانی ،سیّد، 1977ء ص 62)

ٹھیک اس زمانے میں جب سیّد مودودی کو دعوت کا کام شروع کئے تین برس ہو چکے تھے اور وہ اپنے منصوبے کے دوسرے جزو کی طرف قدم بقدم بڑھ رہے تھے۔اللہ کی مشیت پنجاب کے ایک گاؤں میں سیّد مودودی کے اس منصوبے میں رنگ بھرنے اور اسے ایک نیا رُخ دینے میں مددگار بننے کیلئے ایک بندۂ مومن کو تیار کر رہی تھی۔یہ چوہدری نیاز علی خان تھے۔وہ اپنے گاؤں کے رئیس اور فارغ البال وخوشحال زمیندار تھے۔مگر اللہ نے انہیں دین وملت کے درد، اسلام کی سربلندی کی تڑپ اور دین کی خدمت کے جذبہ فراواں سے نوازا تھا۔بقول سیّد اسعد گیلانی: وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو پیدا ہوتے ہیں۔پرورش پا کر تعلیم برائے ذریعہ معاش حاصل کرتے ہیں۔اپنے روزگار میں ترقی پاتے ہیں اور پھر ریٹائر ہونے کے بعد چند ضروری کام جو معلق رہ گئے تھے انہیں نپٹا کر دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں ۔ (اسعد گیلانی ' سیّد 1978ء ص 271،272)

چوہدری نیاز علی خان 1935ء میں محکمہ انہار سے بطور اسسٹنٹ انجینئر ریٹائر ہوئے۔پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور سے چار میل جانب امرتسر موضع جمال پور میں ان کی زمینداری تھی۔وہ مدت سے ارادہ رکھتے تھے کہ ملازمت سے فراغت کے بعد اپنے بقایا ایام زندگی اور محدود وسائل کو خدمتِ دین میں صرف کریں گے۔چنانچہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد دورِ حاضر کی سب سے بڑی ہستی حکیم الامت کی خدمت میں پہنچے۔اپنی زندگی کا تمام حاصل ان کے قدموں میں ڈھیر کردیا کہ یہ ہے میری کل کائنات اسے لیجئے اور ٹھکانے لگا دیجئے (حبیب احمد چوہدری (س ن) ص 299)۔سیّد نذیر نیازی کا بیان ہے کہ علامہ اقبال نے چوہدری نیاز علی کے نیک عزائم کو سراہا اور فرمایا: دینی مدارس کی تو کمی نہیں ہے۔بہتر ہوگا کہ اس وقف سے کوئی اور کام لیا جائے۔میرے نزدیک مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت فقۂ اسلامی کی تشکیل جدید ہے۔بحالت موجودہ ہم روز بروز اسلام سے دور ہٹ رہے ہیں۔اس کی وجہ وہ سیاسی واجتماعی مسائل ہیں جنہوں نے موجودہ دور میں اس ایک خاص شکل اختیار کرلی ہے۔(عابد نظامی' 21 اپریل 1971ء ص 11)

لہٰذا چوہدری نیاز علی نے علامہ کے مشورہ کے مطابق مارچ 1936ء میں ساٹھ ایکڑ زمین مجوزہ ادارہ کیلئے وقف کردی اور ضروری عمارات تعمیر کیں ۔علامہ نے اس ادارہ کیلئے رفیق کار مہیا کرنے کی غرض سے 5 اگست 1937ء کو شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ مراغی کے نام خط لکھا۔بعد ازاں چوہدری نیاز علی نے اندرون ملک مولانا ابوالکلام آزاد، سیّد سلیمان ندوی، عبیداللہ سندھی، عبداللہ یوسف علی اور علامہ محمد اسد جیسے مشاہیر سے رابطہ قائم کیا۔جامعہ ازہر سے کوئی عالم نہ

آ سکا۔جبکہ اندرون ملک علمائے دین اپنے اپنے علمی مرکزوں سے کٹ کر آنا نہ چاہتے تھے۔کہیں زمانے کا شکوہ تھا اور کہیں حزم واحتیاط۔آخر علامہ کی مردم شناس نگاہ سیّد مودودی پر پڑی۔علامہ اس سے قبل سیّد مودودی کو پنجاب میں آ کر اپنے مشن اور پیغام کو پھیلانے کی دعوت دے چکے تھے اور بذریعہ ترجمان القرآن سیّد مودودی کے کلام،علم وفضل علی جذبہ،تفکر اور خدمت اسلام کے معترف تھے۔پروفیسر محمد سرور کے مطابق:ان دنوں علامہ اقبال مولانا سے کافی متاثر تھے۔لوگوں نے سیّد مودودی کے متعلق علامہ کا یہ فقرہ سنا تھا کہ یہ مولوی رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ان کے دین کو پیش کر رہا ہے۔ (محمد سرور،پروفیسر 2004ء،ص 20)

بقول سیّد مودودی: میں پنجاب سے کوئی دل چسپی نہ رکھتا تھا بلکہ یہاں کی صحافت،سیاست اور مناظر ہ بازیوں کا رنگ دیکھ کر دور ہی سے اتنا بدگمان تھا کہ پنجاب آنا پسند بھی نہ کرتا تھا۔مگر 1936ء کے اواخر میں پہلی بار ڈاکٹر صاحب نے مجھے توجہ دلائی کہ دکن کو چھوڑ کر پنجاب میں قیام کروں(ثروت صولت 1979ء،ص 15)۔پہلی نگاہ میں تو مجھے اس تجویز نے کچھ زیادہ متاثر نہ کیا مگر جب 1937ء کے اواخر میں میں نے دکن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کسی دوسرے مستقر کی تلاش میں حیدر آباد سے نکلا تو مرحوم سے مشورہ کرنے کیلئے لاہور حاضر ہوا۔یہاں ان سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ آئندہ میرے لئے پنجاب ہی میں قیام کرنا زیادہ مناسب ہے۔(خورشید احمد 1960ء،ص 73)

جب یہ سوال پیدا ہوا کہ ادارے کا سربراہ کون بنے؟اندرون ملک اور شیخ الازہر کی جانب سے کوئی مثبت جواب نہ ملا تو علامہ اقبال نے چوہدری نیاز علی سے کہا کہ:سر دست ایک نام میرے ذہن میں آتا ہے۔حیدر آباد سے ترجمان القرآن کے نام سے ایک بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں۔دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے پسند آئی ہے۔آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں؟میرا خیال ہے کہ وہ دعوت قبول کر لیں گے۔(عابد نظامی 17اپریل 1969ء ص 20)

چوہدری نیاز علی نے علامہ اقبال کو پہلا خط اگست 1935ء میں لکھا تھا اور غالباً اسی مہینے میں علامہ اقبال سے پہلی بار ملے۔مہینے کی دوسرے عشرے میں انہوں نے سیّد مودودی کو بھی پہلا خط لکھا اور ان سے اپنے ادارے کے بارے میں مشورہ چاہا۔سیّد مودودی نے اس خط کا جواب 21اگست کو دیا۔خط کتابت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔بالآخر ستمبر 1937ء میں حکیم الامت سے ملاقات کر کے سیّد مودودی حیدر آباد لوٹے اور پنجاب کی طرف ہجرت شروع کر دی گویا ادارے کا سربراہ بننے کی پیش کش قبول کر لی۔سیّد مودودی نے چوہدری نیاز علی کو جب اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو ان کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء جاری ہو گئی۔(عابد نظامی 26اپریل 1971ء،ص 14)

سیّد مودودی کے برادر ابوالخیر نے جب سیّد مودودی کی ہجرت کے بارے میں سنا تو کہا:بھیا یہ جو سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے۔اس قسم کا درد مولانا محمد علی جوہر کے دل میں بھی تھا لیکن سوچو ذرا کہ قوم نے انہیں کیا بدلہ

دیا؟ چھوڑو اس کھکھیڑ میں نہ پڑو تم حیدرآباد میں رہ کر آرام اور عزت سے علمی کام کرسکتے ہو۔ ترجمان القرآن کے ذریعے اپنا پیغام پھیلا سکتے ہو۔ (عبدالرحمٰن عبد، چوہدری 1971ء ص 135-136)

مگر سیّد مودودی ارادہ مصمم کر چکے تھے لہٰذا 18 مارچ 1938ء کو بطور سربراہ دارالاسلام پٹھانکوٹ پہنچ گئے۔ ادارے کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا۔ چوہدری نیاز علی نے سیّد مودودی سے ادارہ اور مستقر کا نام تجویز کرنے اور ادارہ کے لیٹر پیڈ کے متعلق دریافت کیا تو سیّد مودودی نے کہا کہ: دارالاسلام ادارہ اور مقام دونوں کا نام ہوگا یہ نام Muslim State کے معنی میں نہیں بلکہ Muslim Cultural Home کے معنی میں ہے۔ خدا کرے کہ پہلے معنی کا منشی بھی ہو جائے مگر سردست 'دارالاسلام' کہہ رہے ہیں اور اس لحاظ سے اس کا اطلاق ادارہ پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح مقام ادارہ پر۔ لیٹر پیڈ جو چھپوائے جائیں ان کی پیشانی پر ان الدین عنداللہ الاسلام لکھوایئے اور نیچے ذرا خفی مگر نمایاں ٹائپ میں اس نام کی انگریزی تشریح لکھوا دیجئے۔ (اسعد گیلانی 'سیّد 1978ء ص 183)

18 مارچ 1938ء کو سیّد مودودی دارالاسلام پہنچے اور تحریک دارالاسلام کا باضابطہ قیام 17 شعبان 1357ھ بمطابق اکتوبر 1938ء کو عمل میں آیا۔ چنانچہ دسمبر 1937ء میں ایکٹ نمبر 21 '1860ء کے تحت ادارہ باضابطہ طور پر رجسٹرڈ کرایا گیا۔ رجسٹریشن کی دستاویز یوں تھی:

میمورنڈم آف ایسوسی ایشن یعنی قانون انجمن برائے دارالاسلام ٹرسٹ (رجسٹری شدہ زیر ایکٹ 1860-1861ء)

انجمن کا نام: دارالاسلام ٹرسٹ ہوگا۔

انجمن کا دفتر: انجمن کی رجسٹری شدہ دفتر کا مقام دارالاسلام موضع جمال پور ضلع گورداسپور (پنجاب) میں ہوگا۔

(ابوراشد فاروقی 1977ء ص 23-24 نیز ملاحظہ فرمائیں ضمیمہ نمبر 5 (الف)، (ب)، (ج) صفحہ نمبر 477 سے 479)

10.2 مقاصد

علامہ اقبال کی رہنمائی اور مشورے سے چوہدری نیاز علی خان نے ادارہ دارالاسلام ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ چنانچہ دارالاسلام کی تعلیمی اسکیم علامہ کے نظریات کی ہی مرہون منت تھی۔ ملک میں اس وقت بے شمار تعلیم گاہیں موجود تھیں جن میں مسلمان بچے دنیوی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ایسی تعلیم گاہوں کی بھی کمی نہ تھی جو صرف مسلمان بچوں کیلئے ہی مخصوص تھیں اوران میں مسلمان بچوں کو ان کے مذہب اور روایات سے بھی حتی الوسع آگاہ کیا جاتا تھا۔ لیکن علامہ اقبال کے نزدیک یہ سب کچھ ادھورا اور ناکافی تھا۔ جو نظامِ تعلیم انگریز نے مرتب کر کے ہندوستان میں رائج کر دیا تھا وہ خوئے غلامی پیدا کرنے کا ذریعہ تھا۔ اس کے ذریعے علم حاصل نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ایک خاص نوعیت کی خو بُو پیدا کر کے اسے روٹی کمانے کا ذریعہ اور ضمیر کو غیر ملکی آقاؤں کے پاس رہن رکھنے کا نام تھا۔ اپنے ایک بیان میں انہوں نے کہا تھا: آج کل تعلیم زیادہ ہے لیکن علم

نہیں ہے۔ پہلے زمانے میں علم زیادہ تھا اور تعلیم کم تھی۔ (وحیدالدین فقیر سیّد 1966ء ص 147)

نوجوانوں کی تعلیم کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان کی تعلیمی بنیاد میں دین کے جزو کی شمولیت لازم ہے۔ انہوں نے اپنے مقاصد میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں مسلمانوں کے تعلیمی عزائم پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا: مسلمان نوجوانوں کی تعلیمی اساس اگر دینی اور اخلاقی نہ ہو تو ان میں سیر چشمی، بلند نظری اور خودداری کے وہ اوصاف حسنہ پیدا نہیں ہو سکتے جو اسلامی سیرت کیلئے مابہ الامتیاز ہیں (محمد اشرف شیخ 1963ء ص 312)۔ ایک تقریر میں انہوں نے کہا: مسلمانوں کو تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے اور ملی اعتبار سے یہ چیز علماء کے ہاتھ میں ہے۔ (غلام دستگیر رشید 1946ء ص 48)

چنانچہ مسلمانوں کیلئے قومی اور دینی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے غیروں کے نظام تعلیم کو انہوں نے ذہنی غلامی سے تعبیر کیا۔ انہوں نے 29 دسمبر 1930ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے خطبہ صدارت میں کہا: میرا دعویٰ ہے کہ دنیا کی کسی قوم نے ایسی اعلیٰ اور قابل تقلید مثالیں اپنے افراد میں پیدا نہیں کیں جیسی ہماری قوم نے۔ لیکن بایں ہمہ ہمارے نوجوان کو مغربی تاریخ کے مشاہیر سے استحساناً رجوع کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ عقلی اور اداری لحاظ سے وہ مغربی دنیا کا غلام ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کی روح اس صحیح القوام خودداری کے عنصر سے خالی ہے۔ جو اپنی قومی تاریخ اور قومی لٹریچر کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی تعلیمی جدوجہد میں اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالی کہ اغیار کے تمدن کو ہر وقت رفیق بنائے رکھنا اپنے آپ کو اس تمدن کا حلقہ بگوش بنالینا ہے۔ یہ وہ حلقہ بگوشی ہے۔ جس کے نتائج کسی دوسرے مذہب کے دائرے میں داخل ہونے سے بڑھ کر خطرناک ہیں۔ (عبدالواحد سیّد 1973ء ص 162)

غرض علامہ اقبال اس نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھے جو مسلمانوں کو اطوار غلامانہ سکھاتا تھا اور انسان کی خودداری کو تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر اسے غلامی کے سانچے میں ڈھال لیتا تھا۔ وہ مسلمانوں کیلئے کسی جدید دارالعلوم کی تلاش میں تھے۔ لہٰذا تلاش وجستجو کے ان ایام میں جب چوہدری نیاز علی علامہ اقبال کے پاس جاوید منزل آئے تو آپ نے انہیں فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کو وقت کی سب سے اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے جس دارالعلوم کا نقشہ پیش کیا وہ یہ تھا: یہ امر قطعی طور پر ضروری ہے کہ ایک نیا مثالی دارالعلوم قائم کیا جائے۔ جس میں مسند نشین اسلامی تہذیب ہو اور جس میں قدیم وجدید کی آمیزش عجیب ودلکش انداز سے ہوئی ہو۔ اس قسم کی مثالی تصویر کھینچنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کیلئے اعلیٰ تخیل، زمانہ کے رجحانات کا لطیف احساس، مسلمانوں کی تاریخ اور مذہب کے مفہوم کی صحیح تعبیر لازمی ہے۔ (محمد اقبال، علامہ، 21 مارچ 1932ء خطبہ صدارت)

علامہ اقبال کے اس تخیل سے چوہدری نیاز علی نے دارالاسلام پٹھانکوٹ میں سیّد مودودی کی آمد سے پہلے ایک تعلیمی اسکیم جاری کردی تھی جس میں انہوں نے اپنے ادارے کے مقاصد درج ذیل بیان کئے۔

- ہندوستان میں ہر ایک مسلمان گھرانے کو جہاں تک ہوسکے دارالاسلام بنادیا جائے۔ ہر مسلمان کنبے کا سربراہ اپنے

کنبے کے سب افراد کو عقائد و اعمال میں شریعت اسلامیہ کے ماتحت لائے اور ان کیلئے ارکانِ اسلام کی پابندی کو لازم کردے۔

- ادارے کا موٹو (MOTO) ہو "قرآن پڑھو اور پڑھاؤ"۔
- آئمہ مساجد کو جدید علوم کے ساتھ تیار کیا جائے جو قرآن، عربی ادب، عقائد سیرت و تاریخ تحریر و تقریر، معلوماتِ عامہ اور مسلمانوں کی دینی ضروریات پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور بنیادی طور پر اسلام کے مبلغ ہوں۔ ایسے آئمہ تیار کر کے بستی بستی تک پہنچا دیے جائیں۔
- ایک جریدہ دارالاسلام کے نام سے جاری کیا جائے جو قرآنی علوم اور تحریک دارالاسلام کا ترجمان ہو اور تبلیغ دین اور تنظیم مساجد میں مددگار ہو۔
- جسمانی تربیت اور دست کاریاں سکھانے کا اہتمام ہو۔ پارچہ بافی، بوٹ سازی، کھدر، تولئے وغیرہ تیار کئے جائیں جس سے دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ آزادانہ معیشت حاصل کر سکیں۔
- ایک ایسی اسلامی نو آبادی قائم کی جائے جس میں تمام تر زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق اور تمام تر فضا خالص اسلامی و اخلاقی ہو۔

شروع میں یہ ادارے کے مقاصد تھے لیکن علامہ اقبال نے چوہدری نیاز علی سے نہایت دردمندی کے ساتھ کالجوں کے مسلم طلبہ کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار یوں کیا تھا: چوہدری صاحب کالجوں کے طلبہ میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ ان میں اسلام کیلئے بڑا جذبہ ہوتا ہے ہمیں ان کیلئے بھی کچھ کرنا چاہیے۔ (ادارہ تحریر دارالاسلام دسمبر 1940ء ص 7)

ایک اور خط میں انہوں نے اپنے درد کا اظہار ان الفاظ میں کیا: اسلام کیلئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کیلئے ہر ممکن کوشش کریں۔ انشاءاللہ آپ کا ادارہ اس کو باحسن وجوہ پورا کرے گا۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیاء سب سے لاپرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں۔ ذاتی منفعت اور عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے لیکن ان کا بے غرض رہنما نہیں ہے۔ (محمد اشرف شیخ 1951ء ص 30)

چنانچہ علامہ اقبال کی اس آرزو کی روشنی میں ادارہ "دارالاسلام" کے ماہنامہ ترجمان رسالے میں زندہ دل مسلمان طلبہ کے نام ایک اپیل شائع ہوئی جو اس کے مقاصد پر روشنی ڈالتی ہے: عزیزو! کالج اور اسکولوں کی لادینی تعلیم سے اگر تم فارغ ہو چکے ہو اور اب بے کار دن گزار رہے ہو تو یاد رکھو ان اوقات کو کام میں لانے کا بہترین طریق علم دین کا حصول اور زندہ قرآن سے زندگی حاصل کرنا ہے۔ نہ کہ آوارہ پھرنا اور مخرب الاخلاق ناول اور رومانی رسالوں سے وقت ضائع کرنا۔ تمہاری اقامت کا بہترین مقام دارالاسلام ہے اگر ابھی تعلیم سے فراغت نہیں ملی تو بڑی چھٹیاں آ رہی ہیں۔ ان میں ادھر اُدھر پھرنے کی بجائے دارالاسلام کے مختصر کورس میں شریک ہو جاؤ اور چند دنوں میں زیادہ سے زیادہ علم دین حاصل

کر جاؤ۔انشاءاللہ ان دنوں ایک خاص کلاس کھلے گی جس میں بہترین لیکچروں کا انتظام ہوگا۔(جمیل رانا 1939ء،ص 8)

علامہ اقبال شیخ ازہر علامہ مصطفیٰ المراغی کے نام اپنے خط میں اس مقصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی ۔نیز علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں جو اپنی زندگی دین اسلام کی خدمت کیلئے وقف کردیں۔ہم ان کیلئے ایک علمی مرکز اور لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں ۔اوران کی رہنمائی کیلئے ایک ایسا معلم جو کامل اورصالح ہو اور بصیرت تامہ رکھتا ہو وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی روح سے واقف کرائے ۔(اسعد گیلانی ٗ سیّد 1978ء،ص 82)

سیّد مودودی کے دارالاسلام پہنچنے سے قبل دارالاسلام کے یہ مقاصد تھے ۔آپ کی آمد سے ان مقاصد کے خدوخال مزید نمایاں ہوئے۔آپ نے دارالاسلام پہنچ کر ادارے کیلئے ایک مکمل دستورالعمل تیار کیا۔اس دستورالعمل میں تحریک دارالاسلام کے مقاصد کے سلسلے میں سیّد مودودی لکھتے ہیں: ہم چاہتے ہیں کہ کم از کم زمین کا ایک گوشہ بہم پہنچایا جائے ۔جہاں خالص اسلامی ماحول پیدا کیا جاسکے۔جہاں ہمیں کم از کم اتنا اختیار تو ہو کہ بیرونی دنیا کے جن اثرات کو ہم روح اسلامی کے موافق پائیں صرف ان کو ہی داخل ہونے دیں اور جن کو منافی پائیں ان کو اپنی زندگی پر مسلط ہونے اور اپنے دل ودماغ میں نفوذ کرنے سے روک سکیں ۔اپنی زندگی کو مسلمان کی زندگی بنائیں اور اپنے اندر گندگیوں اور آلائشوں کو نکالیں جو غیر اسلامی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور نشوونما پانے کی وجہ سے ہمارے افکار وعمل میں گھس گئی ہیں ۔اس قسم کی اخلاقی تربیت سے جو قوت ہمارے اندر پیدا ہو ہم چاہتے ہیں کہ اسے اس نصب العین کی خدمت میں صرف کریں جو مسلمان کی زندگی کا نصب العین ہے ۔یعنی اللہ کا کلمہ بلند ہو۔اوراس کے مقابلہ میں سب کلمے دب جائیں ۔(ابوالاعلیٰ مودودی ٗ سیّد دسمبر 1937ء،ص 285)

اجتماعی بحث ومباحثہ کے بعد اس ادارے کے مقاصد مندرجہ ذیل طے کئے گئے تھے۔

ادارہ اس مقصد کیلئے قائم کیا گیا ہے کہ تمام جائز ذرائع سے دین اسلام،اس کی تہذیب اور تاریخ کی تشریح اور نشرواشاعت کی جائے ۔اس مجمل مقصد کی تشریح جو سیّد مودودی نے اپنے ایک طویل مضمون ''دارالاسلام کی اسکیم''میں کی اس کا خلاصہ یہ ہے۔

- خلافت راشدہ کا نظام درہم برہم ہونے کے بعد مسلمانوں کے سامنے فکر وعمل کے اعتبار سے مثالی ماحول ختم ہوگیا اور آج مسلمانوں کیلئے نمونہ کا دارالاسلام کہیں موجود نہیں ۔(اسعد گیلانی ٗ سیّد 1982ء،ص 135)
- اب اس مقصد کی طرف مراجعت کرنے کیلئے آغاز کار کے طور پر ایک ایسی بستی کی ضرورت ہے جہاں فکر وعمل، گفتار وکردار اور اخلاق واطوار میں اسلام ہی غالب ہو۔اوراس کی پوری فضاء اور سارے ماحول میں پوری روح اسلامی موجود ہو۔

- اس ادارے میں مبلغین اسلام کی ایک مستعد اور باکردار ٹیم تیار کی جائے جو مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی افکار و اعمال کی تبلیغ کریں اور پھر اس اسلامی دعوت قبول کرنے والوں کو منظم کیا جائے۔
- اس بستی میں اسلامی علوم کی تعلیم اور اسلامی کردار کی تربیت و استواری کا اہتمام ہو اور وہاں جدید و قدیم علوم کے ماہرین تیار کئے جائیں۔ جو نظام ہائے باطل کو فکری سطح پر چیلنج کرسکیں۔
- یہاں اسلامی ماحول میں رہنے کیلئے عارضی طور پر بھی لوگ باہر سے آ کر قیام کریں اور اسکے اثرات قبول کریں تا کہ ان کے اخلاق و عقائد کی اصلاح ہو۔اس طرح چند روزہ قیام کر کے مطالعہ اور مشاہدہ کرنے والے مسلم و غیر مسلم سکالر بھی وہاں آئیں اور یہاں آ کر اسلامی زندگی کا نمونہ دیکھیں۔بس اسی طرح خلافتِ راشدہ کی اعلیٰ تہذیب کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔(منصور خالد 1986ء ص 82)

تقی علی اپنی تصنیف "سیّد مودودی کا عہد" میں مقاصد کے سلسلے میں سیّد مودودی کے یہ فقرات قلم بند کرتے ہیں:

اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں مسلمان رہنے یا نہ رہنے کا آخری فیصلہ کرنا ہے۔اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ماحول اور پھر تمام دنیا کو دارالاسلام بنانے کا عزم لے کر اُٹھنا چاہیے اور اس کیلئے جان و تن کی پوری بازی لگا دینی چاہیے اور اگر ہم اتنی جرات نہیں کرسکتے تو پھر اسلام سے ہمیشہ کیلئے ہاتھ دھونے پر تیار ہو جانا چاہیے۔(تقی علی ،سیّد 1981ء، ص 39)

سیّد مودودی نے مزید لکھا: اب ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق مضبوط بنیادوں پر ایک تعمیری تحریک اُٹھے اور وہ پھیلنے کی اتنی حریص نہ ہو جتنی استحکام کی حریص ہو۔ہم آگ ضرور لگانا چاہتے ہیں کہ بے حرارت کی زندگی کوئی زندگی نہیں مگر ہمیں وہ آگ درکار نہیں جو گھر پھونکنے والی ہو بلکہ وہ آگ درکار ہے جس کا ٹمپریچر ضرورت کے مطابق گھٹایا بڑھایا جاسکے۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد فروری 1938ء ص 468)

گویا پرانی انسانی آبادیوں سے دور نہر کے کنارے یہ نو آبادی ایک خالص اسلامی ماحول کی حامل بستی بنانے کیلئے قائم کی گئی تھی جو خلافت راشدہ کے دارالاسلام کے نمونے پر وہی فضا اس جگہ قائم کر کے دنیا کو دکھانا چاہتی تھی جس طرح غیر مسلموں کے گورکل کانگڑی، دیال باغ اور واردھا آشرم جیسے مراکز ان کے علوم و فنون کی تحصیل و تدوین کیلئے قائم کئے گئے تھے۔

10.3 نصاب

ماہنامہ "دارالاسلام" کے مطابق مختلف سالوں کا نصاب مندرجہ ذیل تھا۔

جماعت مبلغین وائمہ مساجد

نصاب سال اوّل

قرآن شریف: (الف) ناظرہ کی تعلیم وتصحیح (ب) آخری پارہ کا ربع حفظ مع قرأت
(ج) تجوید قرآن (ضیاء القرآن) (د) ترجمہ پانچ پارہ اوّل

ادب عربی: (الف) روضۃ الادب (مولانا مشتاق احمد)
(ب) صرف ونحو (عربی گرائمر از مولانا ظفر اقبال)
(ج) عربی بول چال (حصہ اوّل) از حافظ عبدالرحمٰن امرتسری

عقائد وفقہ: تعلیم الاسلام (ہر چہار حصہ) از مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی

تاریخ اسلام: تاریخ اسلامیہ (ہر حصہ) از مولانا محمد میاں مرادآبادی

انگریزی: ہائی اسکولوں کی "جونیئر سپیشل کلاس" کے معیار کے مطابق

تحریر وتقریر: مضمون نگاری، خوشخطی، خطابت، امامت کی تعلیم ومشق

معلومات عامہ: حفظان صحت، تدبیر منزل (ڈومیسٹک سائنس) انجمن ہائے امداد باہمی (کوآپریشن) تاریخ ہند وجغرافیہ (بذریعہ لیکچرز)

صنعت وحرفت: ("انگریزی جونیئر سپیشل کلاس" کے طلبہ کیلئے اختیاری ہے) پارچہ بافی۔ بوٹ سازی۔
زراعت وباغبانی۔ طب (کوئی ایک)

نصاب سال دوم

قرآن شریف: (الف) پارہ آخر کا ربع ثالث حفظ مع قرأت (ب) تجوید (فوائد مکیہ)
(ج) ترجمہ دس پارہ (از 6 تا 15)

حدیث شریف: اخلاق محمدی (ہر سہ حصہ) از مولانا سیّد احمد فاروقی تھانوی

ادب عربی: (الف) دروس الادب (حصہ دوم) از مولانا سیّد سلیمان ندوی
(ب) عربی گرائمر از مولوی ظفر اقبال
(ج) عربی بول چال (حصہ دوم) از حافظ عبدالرحمٰن امرتسری

عقائد وفقہ: (الف) علم الفقہ (مکمل) از مولوی عبدالشکور لکھنوی
(ب) رسالہ دینیات از سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

تاریخ اسلام: تاریخ الامت (حصہ دوم وسوم) از علامہ محمد اسلم جیراجپوری

تحریر وتقریر: مضمون نگاری، خوشخطی، خطابت، امامت کی مشق اور تعلیم

انگریزی: ہائی سکولوں کی سینئر سپیشل کلاس کے معیار کے مطابق (اختیاری)

معلومات عامہ: حفظانِ صحت، تدبیر منزل (ڈومیسٹک سائنس) انجمن ہائے امداد باہمی (کوآپریشن)، تاریخ ہند و جغرافیہ (بذریعہ لیکچر)

صنعت وحرفت: (انگریزی سینئر سپیشل کلاس کے طلبہ کیلئے اختیاری ہے) پارچہ بافی۔ بوٹ سازی۔ باغ بانی۔ طب۔ (کوئی ایک)

نصاب درجہ خاص سال سوم

(اختیاری)

قرآن شریف: (الف) ترجمہ آخری پندرہ پارے (ب) اہم مباحث قرآنی پر لیکچرز

حدیث شریف: انتخاب صحاح ستہ از مولانا نیاز علی خان (انسپکٹر آف سکولز)

فلسفہ تعلیمات اسلام: بذریعہ لیکچرز

تعلیمات اقبال: علامہ اقبال کا فلسفہ اور منتخب کلام

تاریخ اسلام: تاریخ اسلام کے اہم ابواب (منتخب کتب اور تقاریر کے ذریعے)

معلومات عامہ: انیسویں صدی کی سیاسی و مذہبی تحریکات اور مشہور ہستیوں کا تعارف بذریعہ لیکچرز

عملی تبلیغ: دیہات، میلوں اور جلسوں میں

نصاب برائے تبلیغ القرآن

حل الاشتباہات۔ سائنس واسلام ۔حجتہ الاسلام ۔مآل التہذیب ۔اشرف الجواب ۔ العقل والنقل۔ المصالح العقلیہ ماسٹر قبول احمد سے رسائل انگریزی منگوائے جائیں ۔درس القرآن ۔بیان القرآن

(ناظم دارالاسلام اکتوبر 1941ء ص 17-18، 21)

زمانہ تعلیم کو تین حصوں اساسی، متوسط اور عالی میں تقسیم کرتے ہوئے سیّد مودودی نے نصاب کے سرسری خدوخال ماہنامہ ''دارالاسلام'' میں اس طرح بیان کئے: اساسی تعلیم میں ہماری کوشش یہ ہوگی کہ ہر انسان کو مسلم انسان ہونے کی حیثیت سے دنیا کا کام چلانے کیلئے لازماً جن معلومات، اخلاقی اوصاف اور جن ذہنی و عملی استعدادوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب تعلیم وتربیت کے ذریعہ سے بچہ کی شخصیت میں جمع کردی جائیں۔ ہم صرف اس کو کتاب ہی نہیں پڑھائیں گے بلکہ ہمارا استاد عملاً اس کو اپنی معلومات اور اپنی قابلیتوں سے زندگی کے مختلف شعبوں میں کام لینا سکھائے گا اور اس کو اس قابل بنائے گا کہ اساسی تعلیم کے مرحلہ سے فارغ ہو کر جب وہ نکلے تو ہر شعبہ حیات میں وہ ایک عمدہ ابتدائی کارکن بن سکے۔ اس

کی ذہنی اور جسمانی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہ ہو جس کا استعمال اسے نہ آتا ہو اور زندگی کی مختلف راہوں میں سے کوئی راہ ایسی نہ ہو جس پر چلنے کیلئے کم از کم ناگزیر معلومات اس کے پاس نہ ہوں۔ علاوہ بریں ہم اسے اتنی عربی بھی سکھائیں گے کہ وہ قرآن کا سیدھا سادہ مفہوم خود سمجھ لے۔ تعلیم و تربیت دونوں کے ذریعہ سے ہم اس کو اسلامی طرز زندگی کے ضروری آداب و اطوار اور قوانین و قواعد سے بھی نہ صرف آگاہ کردیں گے بلکہ عملاً ان کا خوگر بنادیں گے۔ یہ تعلیم تمام بچوں کیلئے یکساں ہوگی کیونکہ ہمارے پیش نظر اس مرتبہ کی تعلیم و تربیت ہر بچے کو حاصل ہونی چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ آگے چل کر اسے دنیا میں مزدور یا کسان کی حیثیت سے کام کرنا ہے یا وزیر و پروفیسر کی حیثیت سے۔ (ابو الاعلیٰ مودودی، سیّد، جون 1942ء ص 211)

متوسط تعلیم میں بچہ کے داخل ہونے کا انحصار تعلیم کے نتائج پر ہوگا۔ اساسی تعلیم کی انتہا کو پہنچتے پہنچتے ہر بچہ کے متعلق اندازہ کرلیا جائے گا کہ وہ دنیا کی زندگی میں ابتدائی کارکن کے مرتبہ سے بلند تر خدمات انجام دینے کی قوت رکھتا ہے یا نہیں۔ جن بچوں کے متعلق استادوں کا تخمینہ ہوگا اور آزمائشی امتحانات کا فیصلہ یہ ہوگا کہ وہ ایسی قوت رکھتے ہیں۔ صرف ان ہی کو دوسرے مرحلہ تعلیمی میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی اور اس مرحلہ پر ہمارے پیش نظر یہ ہوگا کہ بچوں کو ان کاموں کیلئے تیار کیا جائے جن میں جسمانی قوتوں کی نسبت ذہنی قوتوں سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ یہاں ہر بچہ کیلئے ان مضامین کا مجموعہ تجویز کیا جائے گا جن کے ساتھ اس کے ذہن کو مناسبت ہوگی۔ جس شعبہ زندگی کیلئے اسے تیار کرنا ہوگا اسی سے تعلق رکھنے والے علوم عالیہ کے مبادی اسے پڑھائے جائیں گے، مگر اس طرح کہ ہر دنیوی علم کے اندر دینی نقطۂ نظر روح کی طرح جاری و ساری ہوگا اور ہر دینی علم کا انطباق دنیوی حالات پر کرکے بتایا جائے گا۔ پھر طالب علم کو اپنے علم سے عملاً کام لینے کی پوری مشق بھی کرائی جائے گی اور تربیت کے ذریعے اس میں ایک سچے مسلمان کی سیرت بھی پیدا کی جائے گی۔

درجہ عالی کی تعلیم بالکل اختصاصی تعلیم ہوگی اور اس میں ہمارے پیش نظر ایسے علماء اور ماہرین پیدا کرنا ہوگا جو زندگی کے مختلف شعبوں میں قیادت و رہنمائی کے اہل ہوں۔ جن میں یہ قابلیت ہو کہ اسلام کے اصولوں پر ایک پورے نظام تمدن کی تعمیر کرسکیں اور جدید ترین اسٹیٹ کی تنظیم کا بار اٹھا سکیں۔ اس کیلئے جس علم، جس قوت اجتہاد اور جس متقیانہ سیرت کی ضرورت ہے وہ ان میں تعلیم و تربیت کے ذریعے سے پیدا کی جائے گی۔ اس درجہ میں صرف وہی طلبہ لیے جائیں گے۔ جن کے متعلق متوسط تعلیم کے نتائج سے یہ اطمینان ہوجائے گا کہ وہ اپنی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کے اہل ہیں۔

عملی تحقیق کا شعبہ دراصل ہماری تحریک کا دل اور دماغ ہوگا۔ اگر ہمیں واقعی نظام تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لئے ناگزیر ہے کہ صرف اُردو زبان ہی نہیں بلکہ متعدد دوسری زبانوں اور خصوصاً دو تین بین الاقوامی زبانوں میں بھی ایسا لٹریچر فراہم کریں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کرے اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظام اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے قیام کی خواہش پیدا کردے نیز ہمیں قرآن و فقہ اور تاریخ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوین جدید کرنی ہوگی۔ اسی طرح علوم جدیدہ کو بھی

اسلامی نقطۂ نظر سے از سر نو مدون کرنا ہوگا۔ یہ کام کئے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں رکھ سکتے، کہ مجرد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی، اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظام تمدن واخلاق میں رونما ہو جائے گا۔

اس غرض کے لئے ہمیں ایک طرف ایسے صاحبان فکر ونظر کی ضرورت ہے جو اس تحقیقی کام کے اہل ہوں اور ہمارے جماعتی نظم وضبط کے اندر رہ کر یہ خدمت سرانجام دے سکیں۔ دوسری طرف ایک عمدہ کتب خانہ درکار ہے اور اس کے ساتھ ایسے ذرائع درکار ہیں جن سے ہم ان خدام دین کو سامان زیست بہم پہنچا سکیں۔ سردست ہم صرف اساسی تعلیم کی درس گاہ قائم کر رہے ہیں اور اونچے درجوں کے کچھ طلبہ اگر اس مرحلہ پر آجائیں تو ہم کوشش کریں گے کہ ان کیلئے بھی تعلیم وتربیت کا خاص انتظام کردیں لیکن ہمارے نظام تعلیم کی حقیقی نشو ونما اساسی تعلیم ہی سے ہوگی۔ (ابو الاعلیٰ مودودی، سیّد، اگست۔ ستمبر 1942ء ص 3-4)

10.4 حکمت تدریس

حکمت تدریس کے سلسلے میں سیّد مودودی لکھتے ہیں کہ: ہم خالص قرآن کی بنیاد پر اسلام کی نشاۃ جدیدہ چاہتے ہیں۔ ہمارا راستہ متاخرین اور متفرنجین دونوں سے الگ ہے۔ ہمیں ایک طرف روح قرآنی کو ٹھیک ٹھیک اپنے اندر جذب کرنا اور اپنی قوت فکر ونظر کو اصول اسلامی سے پوری طرح متحد کرنا ہے۔ دوسری طرف قلم کی ان ترقیات اور احوال کے تغیرات کا جائزہ لینا ہے جو گذشتہ سات آٹھ سو برس کی مدت میں ہوئی ہیں۔ تیسری طرف صحیح اسلامی طریق پر افکار ومعلومات کو مرتب اور قوانین حیات کو مدوّن کرنا ہے تاکہ اسلام پھر سے بالفعل ایک قوّتِ محرکہ (Dynamic force) بن جائے اور دنیا میں مقتدی بننے کی بجائے مقتدیٰ اور امام بن کر رہے۔ (منصور خالد 1986ء ص 57، 58)

اس حکمتِ تدریس کے عملی جامہ پر پورا ایک مہینہ حالات کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ جس کا نچوڑ یہ تھا کہ ان حالات میں محض عیسائی مشنریوں کے ڈھنگ پر اسلام کی تبلیغ کردینا لاحاصل ہے۔ عقائد کی اصلاح کیلئے ایک رسالہ نہیں ہزاروں رسالے اگر لاکھوں کی تعداد میں بھی شائع کردیے جائیں تو یہ حالات روبراہ نہیں آسکتے۔ بلکہ اسلام میں بالقوۃ جو کچھ موجود ہے اس کو بالفعل بنایا جائے۔ یہ دنیا کشمکش اور جدوجہد کی دنیا ہے۔ اس کی رفتار محض باتوں سے نہیں بدلی جاسکتی اس کو بدلنے کیلئے انقلاب انگیز جہاد کی ضرورت ہے (ابو الاعلیٰ مودودی، سیّد 1989ء، ص 304)۔ جہاد کا یہ نقشہ اور طریق کار ہمیں کہیں اور تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی صورت میں پہلے سے موجود ہے: یہ اسوہ قیامت تک کیلئے اسوہ ہے۔ بیسویں صدی ہو یا چالیسویں صدی، ہندوستان ہو یا امریکہ یا روس، جہاں اور جس وقت چاہیں آپ اس نوعیت کا انقلاب برپا کرسکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس اسوہ حسنہ کو سامنے رکھ کر کام کریں۔ (ابو الاعلیٰ مودودی، سیّد، دسمبر 1937ء، ص 294)

اس کے بعد سیّد مودودی مختصراً اس حکمت عملی کا ذکر کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے اصولوں پر اہل ایمان کی جماعت بنانے ،اسلامی اصولوں پر اس کی تربیت کرنے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ کے آزاد اسلامی ماحول میں اسلامی نظام زندگی کو مکمل طور پر نافذ کرنے کیلئے کی اور جس نے پوری انسانی تاریخ کا دھارا بدل ڈالا ۔یہ حیرت انگیز کارنامہ حضور نبی کریم ﷺ نے جس پروگرام کو عملی جامہ پہنا کر انجام دیا سیّد مودودی اس کو چار شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں:

— ایسے لوگوں کا وہ گروہ تیار کیا جنہیں دین میں تفقہ حاصل تھا اور جن لوگوں کو دین اور اس کے احکام کو بہترین طریقے پر سمجھانے کی استعداد تھی۔

— ایسے لوگ تیار کیے جن کی زندگیاں اسلام کے نظام العمل کو قائم کرنے اور پھیلانے کی سعی و جہد کیلئے وقف تھیں۔ یہ لوگ ہر قسم کی معاشی تنگی ترشی برداشت کر کے اس میں لگے رہے جو ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔

— پوری جماعت میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ اس کا ایک ایک فرد اعلائے کلمۃ اللہ کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ۔وہ زندگی کے جس دائرے میں بھی کام کرتا اپنے اقوال وافعال ،اپنے اخلاق اور معاملات میں اسلام کے اصولوں کی پابندی کرتا اور اپنی ہر قوت وصلاحیت کو اس کام میں لگا دیتا۔

— باہر کے لوگوں کو موقع دیا کہ وہ دارالاسلام آئیں اور اس ماحول میں رہ کر کلام اللہ کا مطالعہ کریں۔جہاں کی ساری زندگی اس کلام پاک کی عملی تفسیر تھی ۔کفر کے ماحول کی نسبت اسلام کے ماحول میں وہ قرآن کو زیادہ بہتر سمجھتے اور زیادہ گہرا اثر لے کر واپس جاتے۔(ابوالآفاق ،ایم۔اے 1971ء ص155)

یہ تھا وہ پروگرام جس کو عملی جامہ پہنا کر دنیا کے سب سے بڑے ہادی اور رہبر نے صرف آٹھ نو برس کی قلیل مدت میں مدینہ منورہ کے پاور ہاؤس میں اتنی زبردست طاقت بھر دی کہ اس نے دیکھتے دیکھتے سارے عرب کو منور کر دیا اور پھر عرب سے نکل کر اس کی روشنی روئے زمین پر پھیل گئی ۔آج سینکڑوں برس گزر چکے ہیں مگر وہ پاور ہاؤس طاقت کے خزانوں سے بھرا پڑا ہے ۔دارالاسلام پٹھانکوٹ کا تخیل ہادی ورہبر ﷺ کے اسوۂ حسنہ کے غائر مطالعہ سے پیدا ہوا اور اس کی حکمت تدریس اسی نمونے سے اخذ کی گئی ۔لہٰذا ترجمان القرآن میں سیّد مودودی تحریر کرتے ہیں کہ: ہم اسی پاور ہاؤس کی نقل اتارنا چاہتے ہیں ۔وہ عظیم الشان طاقت تو ہم گناہ گار کہاں سے لائیں گے مگر جب ہم اس کی نقل اتاریں گے تو کچھ نہ کچھ طاقت ہم میں پیدا ہو گی ہی ۔محدب شیشہ جب آفتاب سے نسبت پیدا کرے گا تو کچھ نہ کچھ حرارت تو اس میں مرتکز ہو ہی جائے گی۔ساری دنیا نہ سہی اگر ایک حصہ میں بھی ہم آفتاب رسالت سے لی ہوئی روشنی اور حرارت پھیلا سکے تو ہماری زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا ۔اللہ دوسروں کو بھی توفیق دے گا کہ یہی کام ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی کریں ۔(ابوالاعلیٰ مودودی ٔسیّد دسمبر 1937ء ص298)

سیّد مودودی نے دارالاسلام کی حکمت تدریس واضح کرتے ہوئے کہا کہ ہماری کامیابی کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ ہمارا یہ نظامِ دینی اپنی روح اور جوہر کے اعتبار سے مدینہ طیبہ کے اس مثالی نظام کے ساتھ زیادہ مماثلت پیدا کرے جو

نبی کریم ﷺ نے قائم کیا تھا۔سیّد مودودی نے ذہنوں میں پیدا ہونے والی اس غلط فہمی کو بھی رفع کرنے کی کوشش کی کہ "دارالاسلام" کوئی ارتجاعی (Reactionary) تحریک ہے۔انہوں نے مفصل بحث کرتے ہوئے لکھا کہ:اسلام ہمیں رہبانیت اور قدامت پرستی نہیں سکھاتا۔اس کا مقصد دنیا میں ایک ایسی قوم پیدا کرنا نہیں ہے۔جو تغیر وارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتی رہے بلکہ اس کے برعکس وہ ایک ایسی قوم بنانا چاہتا ہے جو تغیر وارتقاء کو غلط راستوں سے پھیر کر صحیح راستہ پر چلانے کی کوشش کرے۔مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ہمارا اصل مشن یہی ہے۔ہمارا کام امامت ورہنمائی ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی،سیّد دسمبر 1937ء،ص 301)

پھر سیّد مودودی بتاتے ہیں کہ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کا وہ اسوہ کیا ہے جس کی ہمیں اس معاملے میں پیروی کرنی ہے۔انہوں نے قوانین طبیعی کو قوانین شرعی کے تحت استعمال کر کے زمین پر خداتعالیٰ کی خلافت قائم کرنے کا حق کیسے ادا کیا۔اپنے عہد کے تمدن میں اسلامی روح کیسے پھونکی اور جن طبیعی قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو چکی تھی۔ان سب کو اس تہذیب کا خادم کیسے بنایا اور آج ہم ان وسائل اور طبیعی قوتوں کو کس طرح اسلامی تہذیب کا خادم بنا کر اللہ کا کلمہ بلند کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں جو ہمارے دور میں منکشف ہوئی ہیں اور جنہیں کفر استعمال کر کے دنیا پر غلبہ وترقی حاصل کر چکا ہے۔

سیّد مودودی لکھتے ہیں کہ: یہ طاقتیں اور وسائل تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا۔خواہ وہ ناپاک مقصد کیلئے کام لے یا پاک مقصد کیلئے۔اس لحاظ سے "دارالاسلام" کیلئے کروگل کا نگری،ہتیسہ گرم آشرم اور دیال باغ میں کوئی نمونہ نہیں ہے۔اس کیلئے صحیح نمونہ ہے تو وہ صرف مدینۃ الرسول ﷺ ہے۔ایک اور اہم بات جو سیّد مودودی نے دارالاسلام کی حکمتِ تدریس کے سلسلے میں کہی وہ یہ تھی کہ قادیانیوں کے سوا اس کے دروازے تمام مسلمانوں پر کھلے ہوں گے خواہ وہ اسلام کے کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔قادیانیت کے بارے میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ اسے ہم اسلامی فرقہ میں شمار نہیں کرتے۔فرقہ بندی کی بیماری نے چونکہ مختلف فرقوں کے درمیان اختلافی مسائل پر بحث وجدال اور مناظرہ کے ہنگامے بپا کر رکھے تھے۔اسلئے دارالاسلام کو اس بیماری سے محفوظ رکھنے کیلئے طے کر دیا گیا کہ جو لوگ وہاں رہیں گے وہ اختلافی مسائل پر بحث وجدال اور مناظرہ سے پرہیز کریں گے۔اور سب بلا امتیاز مسلک ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔(ابوالاعلیٰ مودودی،سیّد دسمبر 1937ء،ص 303)

10.5 ہیئتِ تعلیم

دارالاسلام کی ہیئتِ تعلیم ان ہی خطوط پر استوار کی گئی جو ہادیٔ برحق حضرت محمد ﷺ نے اپنائی تھی یا خلافت راشدہ کے بعد جب نظام اسلامی میں برہمی پیدا ہوئی تو صوفیائے اسلام نے بھی اس طریقہ کی پیروی کی اور جگہ جگہ خانقاہیں قائم

کیں ۔صوفیاء جن لوگوں میں اچھی استعداد پاتے تھے ان کو بیرونی دنیا کے گندے ماحول سے نکال کر کچھ مدت تک خانقاہ میں رکھتے تھے اور وہاں اعلیٰ درجہ کی تربیت دے کر انہیں اسی کام کیلئے تیار کرتے تھے جس کیلئے مرشدِ اعظم اپنے صحابہ کرامؓ کو تیار کرتے تھے ۔اس طریق کار کو اپناتے ہوئے دارالاسلام کو درج ذیل چار شعبہ جات میں تقسیم کیا گیا ۔(اختر حجازی 1995ء ص255،266)

1 شعبہ علمی

اس شعبہ میں جدید اور قدیم علوم کے فارغ التحصیل یا اعلیٰ درجے کی علمی استعداد رکھنے والے حضرات کو لینا تھا۔ ان کیلئے ادارہ کا کارکن ہونا لازمی تھا۔جو خدمت اسلام کیلئے زندگی وقف کردیں اور مستقل طور پر ادارہ میں رہیں ۔ان میں سے جو لوگ علوم دینیہ میں دستگاہ رکھتے ہوں انہیں مغربی زبانوں اور علوم جدیدہ سے روشناس کرانا تھا۔جبکہ علوم جدیدہ سے مزین افراد کو عربی زبان اور اسلامی علوم کی تعلیم دینی تھی ۔گویا ایک دوسرے کے تعاون سے ان میں اتنی بلند علمی استعداد پیدا کرنا مقصود تھا کہ تحقیق واجتہاد کی راہ میں قدم رکھنے کے قابل ہو جائیں ۔دین میں مجتہدانہ بصیرت پیدا کرنے کیلئے سیرت پاک کی تعلیم اور صحابہ کرام ومجددین سلف کی سیرتوں اور ان کے کارناموں کا مطالعہ لازمی قرار دیا گیا۔(ابوالاعلیٰ مودودی سیّد 1989ء ص308)

2 شعبہ عملی

شعبہ عملی کے سلسلے میں سیّد مودودی نے جو لائحہ عمل دیا تھا وہ یہ تھا کہ اس میں ان ارکان کو لیا جائے جو اعلیٰ پائے کی صلاحیت رکھتے ہوں ۔انہیں مختلف عملی میدانوں میں اسلامی طرز پر کام کرنے کیلئے ضروری تربیت دی جائے گی۔مثلاً ایک جماعت مسجد کی امامت کیلئے تیار کی جائے گی ۔ان کا کام مسجدوں کے ذریعے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنا اور ان کی اصلاح کرنا ہوگا۔جبکہ ایک جماعت دیہات میں کام کرنے والوں کی تیار کی جائے گی ۔اس طرح ہر فن کے آدمی اور ہر قسم کی صلاحیت رکھنے والے اشخاص تیار کر کے عملی میدان میں بھیجے جائیں گے جو اپنے اپنے شعبے کے مسائل کو حل کر کے اسلامی نظام تمدن کی برتری کو عملاً ثابت کریں گے ۔اس طرح ایک دارالکفر کو دارالاسلام میں بدلنے کیلئے ملک بھر میں مسلم رائے عامہ کو انقلابی بنیادوں پر منظم کریں گے ۔دوسری طرف غیر مسلموں کے اندر یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ صرف اسلام ہی ہے جو نوع انسان کے مسائل کو حل کر سکتا ہے ۔(شبیر حسین خان 1991ء ص5)

شعبہ نمبر 3

تیسرے شعبہ میں ایسے لوگ رہیں گے جو تھوڑی دیر تک دارالاسلام میں مقیم رہ کر واپس جانا چاہتے ہوں ۔انہیں دین کا علم اور اخلاقی تربیت دے کر چھوڑ دیا جائے گا کہ جہاں چاہیں رہیں مگر مسلمان کی طرح رہیں ۔دوسروں سے متاثر ہونے کی بجائے ان پر اپنا اثر ڈالیں ۔اصولوں میں سخت ہوں ۔اپنے عقائد میں مضبوط ہوں ۔بے مقصد زندگی بسر نہ کریں۔ ایک نصب العین ہر حال میں ان کے سامنے ہو۔پاک طریقوں سے روزی کمائیں اور اس کا ایک حصہ ان لوگوں کی اعانت

میں صرف کریں جنہوں نے اپنی زندگی اسی مشترک نصب العین کی خدمت کیلئے وقف کی ہے۔نیز جتنا وقت بھی اپنی ضروریات سے بچا سکیں اس کو خدمت میں صرف کریں۔(ابوالاعلیٰ مودودی ،سید 1989ء ص 94)

شعبہ نمبر 4

چوتھا شعبہ ایسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کیلئے ہو جو محض عارضی طور پر دارالاسلام میں آ کر کچھ علمی استفادہ کرنا چاہیں یا وہاں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں۔ان لوگوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی اور اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ وہ دارالاسلام سے اچھا تاثر لے کر جائیں۔(ابوالآفاق ایم اے 1971ء ص 154)

انضباطِ اوقات برائے طلباء دارالاسلام:

ساعت اوّل = 2 گھنٹہ (نماز فجر سے نصف گھنٹہ قبل تا 1:30 گھنٹہ بعد) حوائج ضروری۔نماز۔عام درس قرآن

ساعت دوم = 5 گھنٹہ تعلیم

ساعت سوم = 2 گھنٹہ کھانا۔آرام۔نماز ظہر

ساعت چہارم = 3 گھنٹہ صنعت و حرفت (تا نماز عصر)

ساعت پنجم = 2 گھنٹہ اخبار بینی۔ورزش اور کھیلیں۔تفریح (تا نماز مغرب)

ساعت ششم = 3 گھنٹہ نماز مغرب۔مذاکرہ علمیہ۔کھانا۔مطالعہ

ساعت ہفتم = 7 گھنٹہ خواب

(ناظم دارالاسلام اکتوبر 1941ء ص 18)

یعنی صبح صادق سے ایک گھنٹہ پہلے تمام ساکنین ادارہ بیدار کر دیئے جاتے تھے تا کہ آخری شب کی پر انوار ساعتوں سے فیض یاب ہوسکیں۔صبح صادق ہوتے ہی تمام طلبہ مسجد میں جمع ہو جاتے تھے اور درس قرآن کیلئے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔نماز کا مسنون وقت ہوتے ہی سنتیں پڑھ کر نماز فجر باجماعت ادا کرتے۔نماز کے بعد قرآن پاک کا درس شروع ہو جاتا تھا۔اس درس میں خاص طور سے اس کا لحاظ رکھا جاتا کہ ہر طالب علم آیات کو تجوید اور ترتیل سے تلاوت کرے۔پھر جو طلبہ درجہ ابتدائی عربی میں تعلیم پا رہے ہوتے ان سے لفظی ترجمہ کرایا جاتا۔طلبہ کے ترجمہ کے بعد آیات کی مضامین کی تشریح سہل زبان اور دلنشیں پیرائے میں کی جاتی۔اس بات کی پوری سعی کی جاتی کہ طالب علم کے پیش نظر یہ حقیقت ہر لحہ رہے کہ قرآن کا پیغام ایمان اور عمل صالح ہے۔

درس قرآن کے بعد ڈیڑھ گھنٹہ ورزش۔ذاتی ضروریات اور کھانا کھانے کے لیے وقت ہوتا تھا۔پھر ساڑھے نو بجے سے ایک بجے تک مسلسل تعلیم ہوتی جس میں عربی،فارسی،فقہ،تاریخ الاسلام،تجوید کا درس دیا جاتا تھا۔خوش خطی،املا اور مضمون نگاری کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ایک بجے سے دو بجے تک نماز ظہر اور تلاوتِ قرآن کا وقت تھا۔تلاوت قرآن طلبہ تجوید کے ساتھ کرتے تھے۔بلکہ مترجم قرآن سامنے رکھ کر ترجمہ بھی پڑھتے تھے۔دو بجے سے چار بجے تک صنعتی کام

ہوتا۔عصر سے مغرب تک کھیل اور پریڈ کا وقت تھا۔رات کو 10 بجے تک بیدار رہنا ضروری ہوتا تھا۔جس میں زیادہ تر وقت مطالعہ کتب اور مذاکرہ میں صرف ہوتا تھا۔ہفتہ میں دو دن تقریر کرنا طلبہ کیلئے لازمی تھا۔عربی دان طلبہ کیلئے ضروری تھا کہ وہ عربی میں گفتگو کریں۔(ادارہ تحریر دارالاسلام تمبر 1939ءص 3-4)

ضابطہ قیام دارالاسلام

حدود دارالاسلام میں آنے اور رہنے کیلئے حسب ذیل ضابطہ تھا جس کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی جبکہ خلاف ورزی کرنے والے کو ان حدود سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ان قواعد سے صرف غیر مسلم اور وہ نیم مسلم مسلمان جو مولفۃ القلوب کی حیثیت رکھتے مستثنیٰ تھے مگر ایسے لوگوں کو ان حدود میں مستقل رہنے کی اجازت نہ تھی۔

- اذان کی آواز سن کر سب کام چھوڑ دیے جائیں اور نماز کی تیاری کے سوا کوئی دوسرا کام نہ کیا جائے۔
- ہر بالغ کیلئے پانچوں وقت نماز باجماعت میں شریک ہونا ناگزیر ہوگا۔
- ہر مقیم دارالاسلام کیلئے لازم ہوگا کہ اپنے سات برس سے زائد بچوں اور اپنی عورتوں اور اپنے متعلقین کو نماز کا پابند بنائے اور اس کے متعلقین میں جو ترک صلوٰۃ پر مصر ہوں اس سے قطع تعلق کرے۔
- تمام بالغ افراد جو حدود دارالاسلام میں مقیم ہوں عذر شرعی کے سوا کسی صورت میں رمضان کے روزوں سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے اور عذر شرعی میں بھی وہ اس وقت مستثنیٰ ہوں گے جب کہ قاضی دارالاسلام ان کے عذر کو قبول کرے گا۔
- ان حدود کا جو باشندہ صاحب نصاب ہو اسے محصل زکوٰۃ کے سامنے اپنی املاک کا پورا حساب دینا ہوگا اور جو زکوٰۃ اس پر عائد ہو وہ بلا تامل ادا کرنی ہوگی۔
- ہر مقیم دارالاسلام کو روزانہ قرآن کی تلاوت سمجھ کر غور کے ساتھ کرنی ہوگی،خواہ ایک ہی رکوع کیوں نہ ہو۔
- حدود دارالاسلام میں شریعت محمدی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جا سکتا خواہ کبائر میں سے ہو یا صغائر میں سے۔جو شخص کسی کو پہلی مرتبہ گناہ کرتے دیکھے تو گناہ صغیر کی صورت میں نرمی کے ساتھ نصیحت اور گناہ کبیر کی صورت میں سختی کے ساتھ ملامت کرے اور دوسری مرتبہ دیکھنے پر محتسب کو یا صدر کو اطلاع دینا اس کا فرض ہوگا۔
- محتسب،کبائر کی صورت میں پہلے جرم پر اور صغائر کی صورت میں دوسرے جرم پر قاضی دارالاسلام کے سامنے مقدمہ پیش کر دے گا اور قاضی کا فیصلہ بلا کسی رورعایت کے نافذ کیا جائے گا۔(بعض صغائر جو اس زمانے میں بلائے عام بن گئے ہیں ان کے بارے میں نو واردلوگوں کے ساتھ ابتداءً کچھ مدت تک بطور تالیف قلب رعایت کی جائی گی۔مگر دائماً نہیں۔مدت رعایت کا تعین صدر دارالاسلام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا۔)
- حدود دارالاسلام میں غیر مسلموں سے مشابہ لباس کا استعمال قطعی ممنوع ہوگا۔
- ان حدود میں فواحش یعنی فحش کلامی،فحش لٹریچر،مسکرات کے استعمال،صنفی بد اخلاقیوں اور عریانی لباس کو پھیلنے کی

اجازت کسی حال نہ دی جائے گی۔(اس دفعہ سے غیر مسلم اور مولفتہ القلوب بھی مستثنیٰ نہ ہوں گے)

- ان حدود میں اسلامی فرقوں کے اختلافی مسائل پر جدال ومناظرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی،البتہ خالص علمی وتحقیق حیثیت سے گفتگو کی جاسکتی ہے مگر ایسی گفتگوؤں پر صدر کی سخت نگرانی قائم ہوگی تا کہ وہ نزاع کی صورت اختیار نہ کریں۔
- تمام لوگ جو حدود دارالاسلام میں مقیم ہوں،بلا امتیاز فرقہ ایک جماعت میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔
- ان حدود کے اندر جو لوگ اپنا مکان یا کارخانہ بنائیں یا کوئی تجارتی وصنعتی کاروبار جاری کریں وہ ان ضوابط اور قوانین کی پاسداری اور ان محاصل کی ادائیگی پر مجبور ہوں گے جو دارالاسلام کی اعلان کردہ حدود میں رہنے اور کاروبار کرنے والوں کیلئے وقتاً فوقتاً بنائے جائیں گے۔(اختر حجازی1995ء،ص197-198)

10.6 وسائل

دارالاسلام کے قیام کے بعد جب سیّد مودودی بطور سربراہ یہاں پہنچے تو سب سے پہلے انہوں نے ادارے کیلئے دستورالعمل بنایا۔اس میں وسائل سے متعلق وہ "بیت المال" اور "معاشی معاملات" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

بیت المال

- ادارہ کو جس قدر اموال حاصل ہوں گے وہ بیت المال میں رکھے جائیں گے۔
- بیت المال کی مدات آمدنی حسب ذیل ہوں گی۔
  - عطایا(Grants)جو غیر سرکاری ذرائع سے آئیں گی۔
  - خیرات وتبرات
  - زکوۃ وصدقات واجبہ
  - اوقاف جو ادارہ کی اعانت کیلئے کئے گئے ہوں
  - ارکان ادارہ میں سے جو لوگ حدود دارالاسلام میں تجارت،زراعت یا صنعت وحرفت کا پیشہ کرتے ہوں یا اپنے مستقل ذرائع معاش رکھتے ہوں ان کیلئے مجلس شوریٰ کے مشورے سے صدر ایک معاشی پالیسی مقرر کرے گا اور ان کو اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ان میں سے کوئی رکن اپنے کسی کاروبار کو اپنا نجی معاملہ قرار دے کر ادارہ کے معاشی قواعد سے مستثنیٰ ہونے کا دعویٰ نہ کر سکے گا۔

- ارکانِ ادارہ کا فرض ہوگا کہ اپنی ذاتی املاک کا حساب کر کے شرعی ضابطہ کے مطابق اپنی زکوۃ بیت المال کو دیں۔
- کوئی رکن اپنی زکوۃ کو بطور خود صرف کرنے یا ادارہ بیت المال کے سوا کسی اور جماعت کو دینے کا مجاز نہ ہوگا۔اگر کوئی رکن اپنے رشتہ دار مستحقین کو زکوۃ یا اس کا کوئی حصہ دینا چاہتا ہو تو وہ ان کے لئے بتصریح یا بلا تصریح نام، بیت المال سے امداد حاصل کر سکتا ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد ستمبر 1938ء ص 24)

یہ دستور وضع کرنے کے بعد سیّد مودودی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وسائل کے سلسلے میں بھی ہم نے ابتدائی اسلامی دور کی تقلید کی ہے کہ جو لوگ اسلامی نصب العین کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں وہ اپنے کام کیلئے ان لوگوں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں جو اپنے سامنے وہ نصب العین نہیں رکھتے۔ان کو خود اپنی محنت سے کمایا ہوا مال اپنے مقصد کی راہ میں صرف کرنا چاہیے۔باہر کے لوگ اگر خوشی سے ہمارے کام میں مدد دیں تو ہم ان سے لے لیں گے مگر ہم خود ان کے پاس چندہ مانگنے کیلئے نہیں جائیں گے۔اس لئے ذی استطاعت ارکان ومعاونین پر لازم کیا گیا کہ اپنی آمدنی کا ایک مقرر حصہ ادارہ کے بیت المال میں داخل کریں۔دوسرا قاعدہ یہ رکھا گیا کہ اگر کوئی شخص یا گروہ اس ادارہ کی مالی اعانت کرے یا اس کے مقصد کیلئے کوئی جائیداد وقف کرے تو اس کو ادارہ کی پالیسی یا طریق کار میں دخل دینے کا حق نہ ہوگا۔جس کسی کو ادارہ کے نظام پر کامل اعتماد ہو وہ اس کی مدد کرے اور جس کو اعتماد نہ ہو وہ نہ کرے۔البتہ مالی اعانت کرنے والوں کو حساب دریافت کرنے کا حق ضرور ہوگا۔اور اگر وہ چاہیں تو اپنے مال کیلئے مصارف کی تعیین بھی کر سکتے ہیں۔(اختر حجازی 1995ء ص 170)

ترجمان القرآن میں وسائل ہی کے سلسلے میں سیّد مودودی یوں لکھتے ہیں کہ:اس تمام داستان کو پڑھتے ہوئی بار بار یہ سوال ناظرین کے دل میں کھٹکا ہوگا کہ کام تو بہت اچھا ہے اور کرنے کا ہے مگر روپے کا کیا انتظام ہوگا؟اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ دنیا نے جس چیز کو قاضی الحاجات سمجھ رکھا ہے۔ہم اسے قاضی الحاجات نہیں سمجھتے۔اصل چیز روپیہ نہیں بلکہ عزم وارادہ ہے یہ کام جو ہم کرنا چاہتے ہیں۔اسے ہم نے پیشہ کے طور پر اختیار نہیں کیا ہے بلکہ یہ ہمارا مقصد زندگی ہے اور خدا کے بھروسہ پر ہم یہ ارادہ کر چکے ہیں کہ اپنی زندگی کے اس مقصد کو پورا کر کے چھوڑیں گے۔ہمارے ارادے میں جتنی زیادہ قوت ہوگی خدا کی طرف سے اتنے ہی زیادہ اسباب ہماری مساعدت کیلئے جمع ہوتے چلے جائیں گے۔البتہ خدا کی یہ سنت ہمیشہ رہی ہے اور اس میں کسی کیلئے استثناء نہیں ہے کہ وہ ارادوں کی طاقت کا امتحان ضرور لیا کرتا ہے۔سو ہم تو یہ امتحان دینے کیلئے تیار ہیں۔اور پہلے سے کہے دیتے ہیں کہ جو لوگ ہماری رفاقت کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اس کے لئے تیار ہو کر آئیں۔ہمارے پاس نہ تنخواہیں ہیں نہ وظائف نہ یہاں چندے کا کاروبار ہے اور نہ جلوسوں اور نعروں کی بہار۔جن لوگوں کو روزگار کی تلاش ہو یا جنھیں شہرت یا ناموری مطلوب ہو ان کیلئے ہمارے پاس کچھ نہیں۔البتہ جو لوگ اپنی زندگی کا وہی مقصد رکھتے ہوں جو ہماری زندگی کا ہے اور وہی امتحان دینے کیلئے تیار ہوں جس کیلئے ہم تیار ہیں تو ان کیلئے دارالاسلام میں جگہ موجود ہے۔جس حد تک وہ اپنی روزی کا انتظام کر سکتے ہوں وہ خود کریں اور جس حد تک ہم ان کی مدد کر سکیں گے اس میں دریغ نہ کریں

گے۔یہاں نہ کوئی معاوضہ دینے والا ہے اور نہ لینے والا۔البتہ خدمت میں باہمی امداد و معاونت بلحاظ استطاعت سب پر لازم ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی،سیّد دسمبر 1937ء ص 304)

مندرجہ بالا طریق کار سے جو مالی وسائل جمع ہوئے تھے نہایت محدود تھے اور ان کی بنیاد پر کوئی توسیعی کام نہ ہو سکتا تھا۔ان وسائل میں اضافے کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں اور سیّد مودودی نے ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ جو لوگ ہمارے نصب العین سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اس راہ میں مالی قربانیاں دینے کیلئے آمادہ ہو جائیں اور ان باطل پرستوں سے سبق لیں جو آج اپنے باطل نظریات کا اقتدار قائم کرنے یا قائم رکھنے کیلئے کروڑوں پونڈ روزانہ آگ میں پھونک رہے ہیں......دوسری طرف صورت یہ ہے کہ ہماری جماعت میں جو لوگ کسی قسم کے صنعتی یا تجارتی کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ یہاں آئیں اور اپنی قابلیتوں سے کام لے کر دولت پیدا کریں اور اس کا ایک حصہ اپنی ذات پر اور دوسرا حصہ اپنی زندگی کی خدمت پر صرف کریں۔(شعبہ تنظیم 1978ء ص 69)

اس مقصد کیلئے منصوبے کا ایک جز معاشی تدابیر پر مشتمل تھا۔اس میں کہا گیا تھا کہ یہاں زمین بافراط موجود ہے اور نہایت شاداب و زرخیز ہے،بجلی موجود ہے،بڑی بڑی منڈیاں قریب ہیں،ذرائع نقل و حمل جنگی مشکلات کے باوجود یہاں میسر ہیں اور تجارتی و صنعتی کام کرنے کیلئے ہر قسم کے وسائل دستیاب ہیں۔کوئی بھی کام قلیل یا کثیر سرمائے سے شروع کیا جا سکتا ہے۔مقامی جماعتوں کے امراء سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی اپنی جماعتوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ان کے رفقاء میں سے کون لوگ کیا کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔اور کس قدر وسائل ان کی دسترس میں ہیں ان رپورٹوں کی روشنی میں انہیں مشورہ دیا جاسکے گا اور مرکزی ادارہ جس قدر سہولتیں فراہم کر سکتا ہے وہ بھی بہم پہنچائی جائیں گی۔دارالاسلام سے باہر اس کام سے دلچسپی ہمدردی رکھنے والوں سے بھی کہا گیا کہ اگر وہ اس میں حصہ لینا چاہیں تو ہمیں مطلع کریں کہ وہ کس حیثیت سے اس میں حصہ لینے کیلئے تیار ہیں۔(ابوالاعلیٰ مودودی،سیّد جون 1942ء ص 2)

المختصر مالی وسائل کے بارے میں کسی کے آگے دست طلب نہیں پھیلایا گیا۔کارکن خود اپنے رزق حلال سے اخراجات اُٹھاتے رہے۔اگر مالی اعانت قبول کی گئی تو ایسے معاونین کو ادارہ کی پالیسی اور طریق کار میں مداخلت کا حق نہیں دیا گیا۔البتہ وہ اپنے دیے ہوئے پیسے کا حساب لے سکتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب 26 جنوری 1939ء کو چند اختلافات کے باعث سیّد مودودی کو دارالاسلام چھوڑ کر منتقل ہونا پڑا تو مالی معاملات واضح اور صاف تھے۔عملی جدوجہد کے اس ایک سال میں بیت المال میں 9(پائی)۔13(آنے)۔1579 روپے کی رقوم جمع تھیں۔اس میں سے 6(پائی)۔1(آنہ)۔1095 روپے خرچ ہوئے اور 3(پائی)۔12(آنے)۔484 روپے بیت المال میں جمع تھے۔جن میں سے چوہدری نیاز علی خان کے مطالبے پر 12-252 روپے ان کو نقد واپس کئے گئے اور سٹیشنری (جنوری 1939ء) دفتر ادارہ میں موجود تھی اور وہ سامان جو ضروریات ادارہ کیلئے خریدا گیا تھا ان کے حوالے کر دیا گیا۔خان صاحب شیخ محمد تصیف بار ایٹ لاء نے ایک سو روپے بطور عطیہ بیت المال کو دیے تھے،ان کے مطالبے پر ان کا عطیہ بھی واپس کر دیا

گیا۔حساب کتاب صاف کرنے کے بعد بیت المال میں نئے سال کے آغاز پر صرف 132 روپے تھے اور سامان میں کوئی چیز موجود نہ تھی۔(آبادشاہ پوری 1989ء ص 436)

10.7 مسائل

دارالاسلام کا تعلیمی و تحریکی منصوبہ بلاشبہ بہت عظیم الشان تھا۔اس ضمن میں ابتدائی قدم بھی اٹھایا گیا تھا اور اساسی تعلیم کی درسگاہ بھی قائم کردی گئی۔دارالاسلام میں جو کارکن اپنے کنبوں کے ساتھ آبسے تھے۔ان کے بچے اس درسگاہ کے ابتدائی طالب علم تھے۔عبدالجبار غازی اس کے انچارج تھے۔تاہم اس تعلیمی اسکیم پر اپنی تفصیلات کے ساتھ عمل درآمد نہ ہوسکا۔بس ابتدائی نظام ہی قائم ہوسکا اور طلبہ کی تعداد بھی دارالاسلام کے مکینوں تک محدود رہی۔اس سست عملی میں بہت بڑا حصہ ملکی حالات کا تھا جو بڑی تیزی سے نہ صرف بدل بلکہ بگڑ رہے تھے اور جدوجہد کے ہر میدان میں رکاوٹیں ومشکلات کھڑی کررہے تھے۔پھر کچھ عملی مسائل بھی تھے۔درس گاہ کے لئے باقاعدہ پختہ،وسیع عمارت نہ سہی بہر حال کچھ نہ کچھ کمروں کی ضرورت تھی۔پھر دارالاقامہ کی عمارت اور اساتذہ کیلئے کوارٹرز درکار تھے۔جہاں وہ دلجمعی کے ساتھ بیٹھ کر اپنے فرائض انجام دینے کی تیاری کرسکیں۔جو عمارات موجود تھیں وہ پہلے سے موجود کارکنوں کیلئے کافی نہ تھیں۔تعمیر کے راستے میں رکاوٹیں الگ تھیں۔کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو تعمیر کے کام سے اچھی طرح واقف ہو۔کام کو عملاً انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کیا جاسکے۔(آبادشاہ پوری 1998ء ص 578)

ایک اور مسئلہ تعمیراتی سامان کی شدید گرانی اور نایابی کا تھا۔ایک مرحلہ پر تو پختہ عمارتوں کی بجائے گھاس پھونس کے چھپر ڈال کر کام شروع کرنے کی تجویز پیش ہوئی مگر مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اس پر عمل نہ کیا جاسکا۔سرمائے کی قلت بھی ایک اہم مسئلہ تھا۔دارالاسلام کے وسائل وذرائع نہایت محدود تھے۔زیادہ تر لوگ غریب اور متوسط طبقے سے آئے تھے۔جنھیں بڑھتی ہوئی گرانی میں اپنی ضروریات زندگی بھی پورا کرنا مشکل ہورہا تھا۔بایں ہمہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر دارالاسلام کو مالی وسائل مہیا کرتے مگر ان سے بمشکل جماعت کے روزمرہ کے دعوتی کام انجام دیے جاسکتے۔یہ سب عوامل مل کر تعلیمی اسکیم کو جامہ عمل پہنانے کی راہ میں سنگین رکاوٹ بن گئے اور کام صرف محدود پیمانے پر کیا جاسکا۔(شعبۂ تنظیم 1963ء ص 57)

12 اکتوبر 1938ء کو دارالاسلام میں ایک مختصر اجتماع منعقد ہوا۔جس میں دارالاسلام کی اسکیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات نے شرکت کی۔بریلی سے مولانا محمد منظور نعمانی،جالندھر سے عبدالعزیز شرقی،سلطان پور سے مستری محمد صدیق کے علاوہ باہر سے پانچ حضرات اور آئے۔دارالاسلام کی بستی سے چوہدری نیاز علی،سیّد محمد شاہ،مولوی صدرالدین اور سیّد مودودی نے شرکت کی۔باہر سے بہت سے حضرات نے اپنی تجاویز تحریری صورت میں بھیجیں۔یہ مشاورت تین روز

تک ہوتی رہی۔آخر کار دونوں مسودات، دستور العمل ادارہ دارالاسلام بتوضیح مقاصد اور طریق کار منظور ہو گئے۔پانچ اشخاص نے اپنے آپ کو رکنیت کیلئے پیش کیا۔جن کے نام یہ تھے۔عبدالعزیز شرقی، مستری محمد صدیق، صدرالدین اصلاحی، محمد شاہ اور سیّد مودودی۔ان سب نے حلف رکنیت اُٹھایا۔(غلام محمد چوہدری 1963ء، ص 139)

ان ہی پانچ ارکان سے مجلس شوریٰ کی ترکیب عمل میں آئی اور مجلس نے بالاتفاق طے کیا کہ جب تک چالیس ارکان فراہم نہ ہوں، اس وقت تک عارضی طور پر سیّد مودودی صدارت کے فرائض سرانجام دیں۔خیال تھا کہ مقررہ تعداد ارکان فراہم ہونے کے بعد مستقل صدر کا انتخاب کیا جائے گا۔یہ ادارہ، دارالاسلام جائیداد کے مکانات میں قائم کیا گیا۔جسے چوہدری نیاز علی خان نے وقف کیا تھا اور اس جائیداد کیلئے ایک الگ ٹرسٹ قائم ہوا تھا لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ادارہ کے قیام کے تقریباً تین ماہ بارہ دن بعد 26 جنوری 1939ء میں سیّد مودودی اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو اس چھوٹی سی نئی بستی کو چھوڑنا پڑا۔سیّد مودودی حیدرآباد دکن سے ساری کشتیاں جلا کر اور گھر پھونک کر اس جنگل میں آئے تھے کہ خدا کا پیغام بڑھانے کیلئے خواہ کیسی ہی سختیاں سہنی پڑیں سہیں گے لیکن عشق کے امتحانات تو ابھی شروع ہوئے تھے۔اس گھر کو بھی خیر باد کہنا پڑا چنانچہ "ترجمان القرآن" میں لکھتے ہیں: آج کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر ناظرین کو یہ اعلان دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ادارہ دارالاسلام کا مرکز اور ترجمان کا دفتر اس مقام سے جس کا نام ہی اس نصب العین کی رعایت سے دارالاسلام رکھا گیا تھا منتقل ہو رہا ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد جنوری 1939ء، ص 323)

دراصل دارالاسلام پٹھانکوٹ کی زمین اور جائیداد چوہدری نیاز علی نے وقف کی تھی۔وہ سیّد مودودی کے دینی خیالات سے بہت متاثر تھے اور علامہ اقبال کے حکم سے سیّد مودودی کو دارالاسلام لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔لیکن چوہدری نیاز علی سیاسی لحاظ سے مسلم لیگی تھے۔وہ مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے تھے جبکہ سیّد مودودی اُن دنوں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" کے زوردار علمی و سیاسی مضامین لکھ کر کانگریس پہ تنقید کر رہے تھے نیز مسلم لیگ، خاکسار، احرار اور جمیعت العلماء سب ہی کو اسلام کے اصل نصب العین کی طرف آنے کی دعوت دے رہے تھے۔نیاز علی نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ یہاں رہیں گے تو مسلم لیگ کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھیں گے۔بہتر ہے کہ یہاں صرف درس و تدریس اور تبلیغ ہو، سیاست کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے۔(ابوآفاق ایم اے 1971ء، ص 175)

اس اختلافی مسئلہ پر سیّد مودودی کے خیالات کا اظہار عنایت اللہ اثری کے نام مکتوب سے ہوتا ہے جو 19 اگست 1942ء کو جماعت اسلامی کے شعبۂ تنظیم لاہور کی طرف سے سیّد مودودی نے لکھا تحریر کرتے ہیں کہ: دارالاسلام ٹرسٹ جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا وہ چاہتے تھے کہ میں ان کی ہدایت کے تحت کام کروں اور اس کیلئے میں تیار نہیں تھا۔خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کا نصب العین پست اور محدود تھا اور وہ پرانے طرز کا ایک مذہبی ادارہ بنانا چاہتے تھے۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد، جنوری 1982ء، ص 174)

سیّد عبدالعزیز شرقی ادارہ کے تاسیسی رکن تھے اور اس سارے عرصے میں رونما ہونے والے واقعات کے عینی شاہد بلکہ حصّہ دار تھے وہ کہتے ہیں کہ: اجتماع میں جب دارالاسلام کے ضابطوں پر شق وار بحث ہونے لگی تو اس میں ایسی شقیں بھی تھیں کہ چونکہ اسلام محض ایک عقیدہ اور چند جسمانی عبادات اور مذہبی رسموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک ضابطہ زندگی ہے جس کا دائرہ انسانی اعمال کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ اس لئے جو لوگ دارالاسلام بنانے کیلئے اٹھیں وہ خود عملاً مسلمان ہوں اور اسلامی تعلیمات کی پیروی کریں وغیرہ۔ جب یہ شق زیر بحث آئی تو چوہدری نیاز علی نے کہا یہ تو قابل عمل نہیں۔ تو میں نے ان سے کہا کہ جن لوگوں کے نزدیک قابل عمل نہیں ہے وہ پیچھے ہٹ جائیں۔ اس پر کسی وقف کے بانی کا جوابی ردّعمل جو ہوسکتا تھا وہی ہوا۔ وہ جھنجھلا کر گویا ہوئے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں وقف کرنے والا ہوں۔ اس پر طویل بحث چھڑ گئی۔ (اقبال احمد ندوی 1987ء ص 13)

عبدالعزیز شرقی کے بیان کے مطابق سیّد مودودی نے کہا آپ ایسا کیجئے کہ اس ٹرسٹ کا نام نیاز علی ٹرسٹ رکھ لیجئے، مسلم ٹرسٹ یا اسلامی ٹرسٹ رکھ لیجئے اور دارالاسلام کا نام ہمیں واپس کر دیجئے یا بصورتِ دیگر آپ یہ جگہ ہمیں کرایہ پر دے دیجئے اور ہمیں اپنی اسکیم کے مطابق کام کرنے دیجئے لیکن چوہدری نیاز علی کہنے لگے کہ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد اجلاس تو ختم ہوا مگر سیّد مودودی نے دارالاسلام چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ چوہدری نیاز علی اس فیصلے سے سخت پریشان ہوئے انہوں نے سیّد مودودی کو منانے کی بہت کوشش کی۔ خود کامیاب نہ ہوئے تو قصبہ دینا نگر کے شیخ نصیب سے کہلوایا جو دارالاسلام ٹرسٹ کے ایک ٹرسٹی تھے مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی اور وہ دل گرفتہ واپس چلے گئے۔ (نعیم صدیقی، اپریل 1986ء ص 294)

یہ ایک افسوسناک صورتِ حال تھی جو پیدا ہوگئی تھی۔ مختلف بیانات وشواہد کی روشنی میں اس صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو معاملے کی صورت کچھ یوں نظر آتی ہے کہ چوہدری نیاز علی دین کا کام تو کرنا چاہتے تھے اور دین کا جو تصور سیّد مودودی پیش کر رہے تھے اس سے بھی ان کو اختلاف نہ تھا۔ وہ خود تو شاید اس دستوری شق کی بھی مخالفت نہ کرتے لیکن دارالاسلام کے سات ٹرسٹیوں میں، خود انہیں چھوڑ کر چار ٹرسٹی ایسے تھے جو یا تو حاضر اعلیٰ سرکاری ملازم تھے یا حکومت کے خطاب یافتہ اور اپنے علاقے کے رئیس۔ خود چوہدری نیاز علی پنشن یافتہ بھی تھے اور خطاب یافتہ بھی۔ یہ وہ دور تھا کہ اگرچہ 1935ء کا انڈیا ایکٹ نافذ ہوچکا تھا اور برعظیم آزادی کی منزل کی طرف قدم بقدم بڑھ رہا تھا۔ تاہم انگریزی اقتدار کا سورج ابھی تک نصف النہار پر تھا۔ اس کے زوال یا گہنانے کے آثار بظاہر دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ (غلام علی، ملک 1980ء ص 179)

ایسے عالم میں دارالاسلام کی زندگی کو اسلامی تعلیمات پر استوار کرنے اور شرعی قضا واحتساب کے محکمے قائم کرنے کی باتوں نے ان حضرات کو یقیناً اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا کر دیا اور انہوں نے چوہدری نیاز علی کو یہ احساس دلایا کہ وہ ہمیں ساتھ لے کر بڑی نیک نیتی کے ساتھ ایک ایسا بھاری پتھر اٹھانے چلے ہیں جس کو اُٹھائے رکھنے کی نہ ان کے اندر

طاقت ہے اور نہ چوہدری نیاز علی کے اندر۔خود چوہدری نیاز علی نے اس میں مضمر خطرات کو بھانپ لیا ہوگا۔اس نفسیاتی کیفیت میں چوہدری نیاز علی کے اظہار اختلاف پر شرقی صاحب نے جس جارحانہ ردِّعمل کا اظہار کیا اس نے گویا چوہدری نیاز علی کو اپنے موقف پر اور مضبوط کر دیا۔چوہدری نیاز علی نے درمیان کی راہ یہ نکالنی چاہی کہ سیّد مودودی کام بے شک وہی کریں جو کرنا چاہتے ہیں مگر دستورالعمل میں اس کا اعلان نہ کریں۔دوسری طرف سیّد مودودی کے لئے بھی اپنی زندگی کے نصب العین کو مصلحتوں کا شکار بنانا ممکن نہ تھا۔اس طرح ایک برس بھی نہ گزرا تھا کہ ھذا فراق بینی و بینک کا مرحلہ پیش آ گیا۔(آبادشاہپوری 1989ء،ص 435)

المختصر پہلے برسوں میں جنگ عظیم کے بڑھتے ہوئے مہیب سائے اور جنگ ختم ہونے کے بعد ملک کے غیر یقینی حالات،ملک کے طول وعرض میں برپا سیاسی کش مکش اور خونیں ہنگامے اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے۔ علاوہ ازیں مالی،عملی،تنظیمی اور اختلافی مسائل بھی درپیش رہے۔

10.8 تنقیدی مطالعہ

"دارالاسلام" کے پس منظر،مقاصد،دستورالعمل اور اثرات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ خود ایک تحریک کی صورت میں قائم ہوا۔اور اس تحریک کے تعلیمی،تربیتی،انقلابی اور سیاسی نتائج دوررس تھے۔تحریک دارالاسلام کے ذریعے مسلمانوں کی اصلاح،تعلیم،تربیت اور تنظیم کا جو فارمولا مرتب کیا گیا تھا۔اس کا ابتدائی یونٹ مسلمان گھرانے کو تجویز کیا گیا تھا۔مسلمانوں کی معاشرت میں چونکہ عائلی زندگی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور انسان سازی کا اوّلین کارخانہ گھر ہوتا ہے اسلئے تحریک دارالاسلام نے گھر کو ہی اصلاح کا ابتدائی یونٹ تجویز کیا اور گھر کو ہی کردار سازی کا ابتدائی تربیتی مرکز قرار دیا۔چنانچہ خاندان کے سربراہ کو داعی کی حیثیت سے اس کا امیر تجویز کیا گیا۔گویا دارالاسلام کی اسلامی تحریک کے نزدیک اصلاح کا یہ فارمولا تھا کہ:مسلمان کا گھر تربیتی واصلاحی پروگرام کا مرکز ہے۔مسلمان گھرانے میں آباد کنبہ ایک اسلامی جماعت ہے اور مسلمان کنبے کا سربراہ اس جماعت کا امیر ہے۔شرعاً وہی امیر اپنی اس مختصر سی جماعت کو اسلام کے اصولوں کے مطابق چلانے اور تعلیم وتربیت دینے کا ذمہ دار ہے۔اسطرح اگر ہر گھر کی اصلاح ہو جائے تو پوری قوم کی اصلاح خودبخود ہو جاتی ہے۔(اسعد گیلانی،سیّد 1992ء،ص 111)

تحریک دارالاسلام کے نزدیک اصلاح ملت کا یہ آسان ترین،مختصر مگر جامع طریقہ تھا۔تحریک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تین انسانی ستون تھے۔علامہ اقبال بہ حیثیت فکری رہنما اور سرپرست،چوہدری نیاز علی خان بحیثیت بانی اور روح رواں جبکہ سیّد مودودی بحیثیت مربی اور رہنمائے کارواں تینوں سے مل کر تحریک دارالاسلام اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوئی اور آغاز کار میں ہی تین تاریخی شخصیتوں کے مل کر ایک اسکیم پر مجتمع ہو جانے سے یہ تحریک تاریخی

کردار کی حامل بن گئی ۔(اسعد، گیلانی سیّد 1978ء ص 92)

سیّد مودودی کے نزدیک مسلمانوں کا بنیادی مرض صحیح اسلامی تربیت کی کمی تھا۔ ان کی نظر میں جدید مدارس سے تو اس کی توقع ہی نہ کی جاسکتی تھی کہ ان کا مقصد قیام انگریزی اغراض کی تکمیل تھا، قدیم عربی مدارس اور خالص اس مقصد سے قائم ہونیوالے ادارے "خانقاہیں" وغیرہ بھی ان کے خیال میں اس باب میں ناقص تھے کیونکہ خانقاہیں تزکیہ نفس کے اداروں کی بجائے نسلی گروپوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ عقابوں کے نشیمن پر بالعموم زاغ متصرف ہونے لگے۔ مشائخ مریدوں کی اندھی عقیدت واطاعت کے مرکز بن گئے تھے۔ مریدوں کی نگاہوں میں وہ انسان نہیں مافوق الفطرت ہستیاں تھیں جن سے اٹھتے بیٹھتے مافوق الفطرت افعال کا صدور ہوتا تھا۔ لہٰذا سیّد مودودی ایسی جدید خانقاہ بنانا چاہتے تھے جہاں شیخ اور مرید دونوں اپنی اصلاح وتربیت میں صحابہ کرامؓ اور اکابر اسلام کی زندگیوں کو پیش نظر رکھیں ۔ بلکہ خصوصیت سے ان طریقوں کی پیروی کریں جن سے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کی تربیت فرمائی تھی۔ زندگی میں سادگی ہو۔ اپنا کام خود کرنے کی عادت ڈالی جائے ۔ جسمانی مشقت کی مشق کیلئے ایک قطعہ زمین ایسا مقرر کیا جائے جس میں شیخ اور مرید سب اپنے ہاتھ سے باغبانی یا ترکاریوں کی کاشت کریں۔ صفائی، حفظان صحت اور تغذیہ کے بالکل جدید ترین اصولوں کی پابندی کی جائے ۔(آبادشاہپوری 1989ء ص 363)

دارالاسلام اس قسم کی جدید خانقاہ کا عملی نمونہ تھا۔ یہاں کی زندگی انتہائی سادہ تھی ۔ جو لوگ شہروں کی پر آسائش زندگی میں سے نکل کر آئے تھے ان کیلئے تو کٹھن زندگی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ سب اس کے عادی ہو گئے تھے ۔ اس کی کٹھنائیوں میں جو لذت انہوں نے محسوس کی اس پر راحت وآسائش کا تصور تک قربان کر دیا۔ میاں طفیل اس زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: سب لوگ دارالاسلام میں اپنے سارے کام خود کرتے تھے ۔ اپنے سر پر گندم کی بوریاں اٹھا کر قریبی پن چکی پر آٹا پسوانے کیلئے جاتے اور ایک ڈیڑھ میل کی دوری پر آرا مشین سے ایندھن کی لکڑیاں پیٹھ پر لاد کر لاتے ۔ مسجد کے کنویں سے سب لوگ اپنے گھر کیلئے پانی خود بھر کر لاتے اور چار میل کے فاصلے پر پٹھانکوٹ اکثر پیدل جا کر اپنا سودا سلف لاتے ۔(عبدالعزیز شرقی 'سیّد 1986ء ص 228)

ضرورت کے وقت سب ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے اور جو رفقاء کسی وجہ سے اپنا کام خود کرنے سے قاصر ہوتے ان کا کام بھی ساتھی کر دیتے ۔ علمائے دین ہوتے یا اعلیٰ جدید تعلیم یافتہ اصحاب، کسی کو خود اپنا یا ساتھیوں کا کام کرنے میں عار یا شرم محسوس نہ ہوتی۔ یہ وہ دردمند لوگ تھے جو اپنے سے زیادہ دوسروں کیلئے سوچتے ۔ اللہ کیلئے ملتے اور اللہ کیلئے بیٹھتے ۔ کوئی غرض تھی تو صرف دین کی خاطر، محبت تھی تو دین کی بنیاد پر ۔ کسی کو تکلیف ہوتی تو سب تڑپ اُٹھتے ۔ کوئی بیمار پڑ جاتا تو اس کی تیمارداری کرتے ۔ دارالاسلام آٹھ دس گھروں کی بستی تھی چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ اس لئے راتوں کو بستی کی حفاظت کیلئے باری باری پہرہ دیتے ۔ سرنا اسٹیشن آدھ پون میل کے فاصلے پر تھا۔ مہمان آتے، جماعت کے یا دارالاسلام کے مکینوں کے، تو سب مل جل کر ان کے بستر اور دیگر سامان خود اٹھا کر لاتے اور پھر واپسی کیلئے انہیں اسٹیشن پر پہنچاتے کیونکہ وہاں نہ قلی

ہوتے تھے اور نہ مزدور۔(نقی علی سیّد 1981ء ص356)

دارالاسلام ایک ایسا چمکتا دمکتا نقطہ تھا جہاں سے برصغیر پاک و ہند کی دوسری اسلامی تحریک ایک جماعتی قالب میں ڈھلنے کے بعد ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔وہ دور جو تعلیم و تعلّم کا دور تھا،فکر و نظر کی تربیت کا دور تھا۔سیرت و کردار کی تعمیر و استحکام کا دور تھا۔وہ دور جس میں اس کا مزاج،اس کا ذہن بنا،جس میں اس کی شاندار روایت وجود میں آئیں،جس میں اس کی شناخت قائم و مستحکم ہوئی۔نعیم صدیقی نے دارالاسلام کے اسی دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:اصولی اور مقصدی جماعتوں کا دورِ آغاز یا زمانہ تربیت بڑا اہم دور ہوتا ہے۔اسی زمانے میں ان کی زندگی میں وہ شگوفے پھوٹتے ہیں جو آگے چل کر ان کی مستقل روایات بن جاتے ہیں۔اسی دور میں وہ ایسے تجربوں سے گزرتی ہیں کہ جن کے زیر اثر ان کو ایک مستقل مزاج ہاتھ آتا ہے اور اس دور میں ان کی ذہنیت بنتی ہے۔اسی میں کردار کا حدود اربعہ متعین ہوتا ہے اور اسی میں اصول و مقاصد رگ و پے میں رس بس جاتے ہیں،اسی دور کی یادگاروں کے قیمتی خزانوں کو کوئی ہیت اجتماعی مرتے دم تک اپنے سینے سے الگ نہیں کرتی۔یہی وہ بنیادی سرمایہ ہے۔جس کے بل پر تحریکیں اپنا کام چلاتی ہیں۔(نعیم صدیقی 1986ء ص308)

جون 1942ء سے اگست 1947ء تک پھیلا ہوا دارالاسلام کا یہ دور بلاشبہ نہایت اہم اور تحریکی و دعوتی نقطہ نظر سے ایک انقلابی دور تھا۔جس میں زندگی بڑی سادہ تھی۔جس کو اس کے ایمان پرور شب و روز نے انتہائی خوبصورت بنادیا۔دامن دل کو پیچھے کی جانب کھینچنے والے بعض لمحات کے علی الرغم یہاں کا ایک ایک لمحہ اخذ و اکتساب کا لمحہ تھا۔اس اخذ و اکتساب اس سے جنم لینے والی روایات کے حامل کردار کو کندن بنانے والی کتاب و سنت کی کٹھالی میں تپ کر جو لوگ نکلے وہ ایک مدت تک جماعت کے وقار،قوت،اخلاص للّٰھیت،حسن و کردار،ذوق عمل اور عزیمت کی سربلندی کا نشان بنے رہے۔ایک ایسی اجتماعی ہیئت وجود میں آئی جس کے ارکان اور ہمدرد سرحد آزاد سے ہندوستان کے جنوبی کناروں تک چار پانچ صوبوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر صوبے میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے۔(آبادشاہ پوری 1998ء ص371)

دارالاسلام ایک عملی تحریک تھی۔اس تحریک نے عمل صالح کے ذریعے افراد کے دلوں میں گھر کیا اور انہیں عمل صالح پر گامزن کیا۔دارالاسلام پہنچنے پر تحریک کے مربی و رہنمائے کار سیّد مودودی نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ یہاں کی مسجد کو اس علاقے کیلئے جامعہ قرار دے کر پانچ پانچ میل تک کے دیہات میں اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے یہاں آیا کریں۔خطیب کے فرائض سیّد مودودی نے خود اپنے ذمہ لیے۔اب تک سیّد مودودی تحریر کے ذریعے تعلیم یافتہ افراد سے خطاب کرتے رہے تھے۔اب وہ ایسے لوگوں میں آگئے تھے جو فطرت کے شاگرد ہوتے ہیں۔سیّد مودودی اُردو زبان میں خطبہ دیتے۔نمازیوں کی اکثریت ان پڑھ دیہاتیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔اس لئے سیّد مودودی کا خطبہ سیدھی سادی اور سہل زبان میں ہوتا جسے ان لوگوں کو سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ پانچ میل کی حد سے باہر کے لوگ بھی خطبہ سننے کیلئے آجاتے تھے۔(ابوالآفاق ایم۔اے 1971ء ص167)

دارالاسلام میں پہلا جمعہ 23 مارچ 1938ء کو پڑھایا گیا۔سیّد مودودی نے خطبہ میں عبادات (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) کے مقاصد اور فرضیت کی نوعیت کا ذکر کرنے کے بعد نماز جمعہ کی شرعی اہمیت بیان کی اور سامعین کو تلقین کی کہ وہ نہ صرف خود سختی کے ساتھ جمعہ کی پابندی کریں بلکہ اپنے بھائیوں، دوستوں، ہمسایوں اور بالغ بچوں کو ساتھ لائیں۔جمعہ سے غافل لوگوں کو ہر طرح سمجھا کر، منا کر اور منت سماجت کر کے اور جہاں ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت ہو وہاں ڈانٹ ڈپٹ کر کے جمعہ کی نماز میں حاضر ہونے پر آمادہ کریں۔پہلے جمعہ میں تقریباً پچاس آدمی شریک ہوئے۔دوسرے میں ساٹھ آئے اور تیسرے میں 153 تک تعداد پہنچ گئی۔(نعیم صدیقی 1986ء ص 61)

یہ خطبات اب تک کی روایت کے برعکس اختلافی مسائل سے پاک تھے۔مسلمانوں کو اصول دین کی تعلیم دیتے اوران کے اندر مسلمان ہونے کا احساس زندہ کرتے تھے۔ان خطبات سے لوگوں میں اتنی دل چسپی پیدا ہوگئی کہ دور دور سے لوگ خطبہ سننے آتے۔یہی نہیں وہ خطبہ میں جو کچھ سنتے اپنے اپنے دیہات میں جا کر نمازِ فجر کے بعد بیان کرتے۔خطبہ جمعہ کے یہ اثرات بانی تحریک کیلئے بہ اطمینان بخش تھے۔ان پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا کہ جمعہ کی مرکزیت ہی میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی فلاح پوشیدہ ہے۔یہ وہ قوت ہے جس کے بل پر مسلمان اپنی زندگی کے شب و روز بدل سکتے ہیں۔لہٰذا مسلمانوں کو ہر جگہ اس مرکزیت کے قیام کا اہتمام کرنا چاہیے۔جو حضرات دعوت سے متفق تھے ان سے خاص طور پر کہا کہ: وہ اس طریقے کو اپنائیں۔جو حضرات درحقیقت کچھ کام کرنا چاہتے ہیں ان کو میں مشورہ دوں گا کہ اسی طرز پر اپنے حلقوں میں جمعہ کی مرکزیت قائم کرنے کی کوشش کریں اور اس اجتماع سے زیادہ سے زیادہ جتنا کام لینا ممکن ہو لیں۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد فروری 1938ء ص 467)

اس طرح دارالاسلام کی دعوت خواص کے دائرے سے نکل کر عوام تک پہنچنا شروع ہوئی۔تحریک مجاہدین کے بعد پہلی بار دیہات میں نماز جمعہ قائم کرنے کا اہتمام ہوا۔علماء جو دیہات میں نمازِ جمعہ کے قائل نہ تھے انہیں بھی سیّد مودودی نے دعوت دی کہ وہ بھی اسکا اہتمام کریں۔کیونکہ: یہ (قیام جمعہ) مسلمانوں کی تنظیم کا پہلا قدم ہے۔ہر مسلمان کے اندر منظم ہونے کی فطری استعداد ہر وقت قوت فعل میں آنے کیلئے تیار ہے۔جمعہ کی طاقت وہ زبردست طاقت ہے جو آٹھ کروڑ مسلمانوں کو دیکھتے دیکھتے ایک کانگریس بنا سکتی ہے۔یہ ایسا رابطۂ عوام ہے جس کا تصور بھی کسی جواہر لال نہرو اور کسی گاندھی کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔اس کے ذریعے سے آپ جمہور مسلمین کی تمدنی اصلاح، معاشی فلاح، تعلیم عوامی اور سیاسی تحریک کے مقاصد کے حصول مقاصد کیلئے سارے پروگرام بتدریج عمل میں لا سکتے ہیں۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد فروری 1938ء ص 466)

ان خطبات کو تاج کمپنی نے بلاکوں کی حسین کتابت اور عمدہ طباعت کے ساتھ پانچ حصوں میں شائع کیا۔خطبات سیّد مودودی نے عوام کیلئے لکھی تھی لیکن اس سے خواص بھی فائدہ اٹھاتے ہیں (حالانکہ خواص کیلئے "اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر" نامی کتاب لکھی تھی) اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے 56 ایڈیشن طبع ہو کر ہاتھوں

ہاتھ فروخت ہوگئے (محمد امین جاوید 2004ء،ص 21)۔تحریک کے حصول مقاصد کیلئے دو بنیادی کام تجویز کئے گئے ۔ایک کا تعلق مدافعت سے اور دوسرے کا ہجومی اقدام کی تیاری سے تھا۔سیّد مودودی نے مدافعانہ پالیسی کے بنیادی مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا: جب تک اسلامی انقلاب برپا کرنے کیلئے ایک منظم جماعت علمی اور عملی حیثیت سے تیار ہو اس وقت تک ملک میں اس نئے دارالکفر کو مستحکم بنیادوں پر قائم ہونے سے روکا جائے جو انگریزی سنگینوں کی حمایت میں ہم پر مسلط کیا جارہا ہے اور عامۃ مسلمین کی بیداری و جدوجہد سے ملک کے نظم ونسق میں کم از کم اتنا تغیر کرا دیا جائے جس پر شعبہ دارالاسلام کا اطلاق ہوتا ہو۔

ہجومی اقدام کی تیاری کے سلسلے میں سیّد مودودی نے لکھا کہ :ہمیں دارالکفر کی مزاحمت کے ساتھ ساتھ دارالاسلام کے قیام کی جدوجہد کرنی ہوگی ۔اور اس کیلئے تمدنی انقلاب لانا ہوگا۔تمدنی انقلاب کے بارے میں سیّد مودودی کی یہ پختہ رائے تھی کہ وہ فسادات، بلوؤں اور مسلح بغاوتوں سے نہیں آتا بلکہ اس کیلئے سب سے پہلے انقلاب کی فکری اساس مستحکم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ موجود الوقت نظام تمدن کے اصولوں پر سخت تنقید کر کے عامۃ الناس میں اس کے خلاف قلبی بے اطمینانی اور ذہنی بغاوت پیدا کی جائے اور اس کی جگہ جو اسلامی نظام تمدن ہم لانا چاہتے ہیں اس کے بنیادی تصورات اور عملی تفصیلات کو اس طرح واضح کیا جائے کہ لوگوں کی بھاری تعداد کے دل و دماغ مطمئن ہوجائیں۔یہی نظام اپنے اندر ان تمام مسائل و مصائب کا حل رکھتا ہے جس سے دورِ جدید کے انسان کی زندگی داغ داغ ہوچکی ہے۔اسلام کے نظام تمدن کی برتری محض علمی حیثیت ہی سے ثابت نہ کی جائے بلکہ اس نظام کو عملاً چلتا ہوا دکھایا جائے ،اگرچہ یہ عملی مظاہرہ محدود پیمانے پر ہی کیوں نہ ہو۔اس طرح علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اسلامی نظام تمدن کی حقانیت ثابت کر کے لوگوں کی بھاری اکثریت کو اس کا ہم نوا بنایا جائے اور وہ اس باطل نظام تمدن کا تختہ الٹ دے اور اس کی جگہ اسلام کا نظام تمدن قائم کردے۔(ابوالاعلیٰ مودودی،سیّد تمبر 1938ء،ص 13)

اس تمدنی انقلاب کیلئے چھوٹے پیمانے پر باقاعدہ ایک ضابطۂ اخلاق جاری کیا گیا۔اور اس کے قواعد وضوابط مرتب کئے گئے۔جن کے تحت اخلاقی و دینی فضا کے قیام،احتساب،قضائے شرعی اور معاشی معاملات پر خصوصی توجہ دی گئی۔محتسب،قاضی اور محصل زکوٰۃ کے عہدے قائم کئے گئے۔ان ہی اقدامات کا اعجاز تھا کہ 1942ء تک تحریک کے جو مثبت اثرات برآمد ہوئے ان کے مطابق:

- آئمہ مساجد تیار کرنے کیلئے کلاس تیار کی گئی۔
- خطبات جمعہ تیار کر کے شائع کرنے کا اہتمام ہوچکا تھا۔
- کالجوں کے طلبہ کو عربی پڑھانے کا اہتمام ہوچکا تھا۔
- طلبہ میں تقریر وتحریر کی مشق اور دیہات میں تبلیغ کا انتظام کیا گیا تھا۔
- چھوٹے پیمانے پر طلبہ کو صنعت وحرفت سکھانے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا تاکہ وہ باعزت روزی کما سکیں۔

- دارالاسلام کی حدود میں شریعت اسلامی کے خلاف ہر قسم کے افعال و اعمال اور فواحش و مکروہات شرعیہ کے اظہار کی بستی کی حدود میں ممانعت تھی۔
- دارالاسلام میں غیر مسلموں کے مشابہ لباس پہننے، فحش کلامی، فحش لٹریچر، مسکرات کے استعمال، مبنی بداخلاقیوں اور عریانی پر پابندی تھی۔
- بستی کی حدود میں اسلامی فرقوں کے اختلافی مسائل پر جدال و مناظرہ کی اجازت نہ تھی۔ البتہ وہ خاص علمی و تحقیقی حیثیت سے صدر کی کڑی نگرانی میں گفتگو کر سکتے تھے۔(آبادشاہ پوری 1989ء، ص 423)

تحریک دارالاسلام کا تعلیمی منصوبہ بلاشبہ بہت عظیم تھا۔اس ضمن میں ابتدائی قدم بھی اُٹھایا گیا اور اساسی تعلیم کی درسگاہ بھی قائم کردی گئی۔ بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری ابتداء میں محمد حامد پھر سیّد نقی علی کے ذمے آئی۔ دونوں اصحاب تعلیم و تدریس کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ محدود ذرائع کے ساتھ محدود دائرے کے اندر انہوں نے اس تجربے سے بھرپور کام لیا، جو چند طلبہ ان کے زیر تعلیم تھے ان کی تعلیم اور فکری و اخلاقی تربیت میں انہوں نے اپنے آپ کو جھونک دیا۔ سیّد مودودی کے مشورے سے نظم اوقات، نصاب تعلیم، زائد از نصاب مصروفیات، کھیل اور تفریح کے سلسلے شروع کئے گئے۔ بچوں میں ابتدائی ادبی تحریریں لکھنے کا ذوق پیدا کرنے کیلئے ایک دیواری اخبار "نور" شروع کیا گیا۔ ہر بچے کی اپنی تحریر کردہ ادبی تحقیق ایک بڑے کاغذ پر چسپاں کردی جاتی اور وہ بڑا کاغذ دیواری اخبار "نور" کی حیثیت سے ناظرین کو اسلام کے نور حق کی طرف متوجہ کرتا۔ تربیت گاہ میں آنے والے حضرات اور "دارالاسلام" کی زندگی کا مطالعہ کرنے کیلئے آنے والے مہمان، سب ہی متاثر ہوتے۔ قلمی دیواری اخبار سے بچوں کی جب حوصلہ افزائی ہوئی تو انہوں نے اچھی چیزیں لکھنا اور پیش کرنا شروع کردیں۔(آبادشاہ پوری 1998ء، ص 579)

بچوں کے علاوہ بڑوں میں بھی لکھنے والے تھے۔ جن کی تحریروں میں تحریک دارالاسلام کی وجہ سے نکھار پیدا ہوا۔ مولانا صدرالدین اصلاحی شروع ہی سے سیّد مودودی کے ساتھ چلے آرہے تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز "حقیقت نفاق" لکھ کر کیا۔ اس دوران ان کا علم پختہ تر، مطالعہ وسیع و گہرا اور قلم منجھتا چلا گیا۔ بلکہ ان کی تحریر کے آئینے میں مستقبل کا ایک قدآور صاحبِ علم و قلم ابھرتا نظر آرہا تھا۔ اسی زمانے میں مظہر الدین صدیقی نے اشتراکیت اور نظام اسلام کے موضوع پر پہلی کتاب لکھی۔ اسی دور میں مولانا مسعود عالم ندوی جیسا صاحب علم، عربی زبان کو خالص عرب اسلوب و لہجے میں لکھنے، عالم اسلام خصوصاً عرب پر اور اس کے اندر برپا تحریکوں اور ان کے مسائل پر گہری ناقدانہ نظر رکھنے والا فعال مردِ حق بھی سیّد مودودی کا رفیق کار رہا۔ پھر مولانا حمید الدین فراہی کے جانشین مولانا امین اصلاحی بھی دارالاسلام آگئے۔ ایک بلند پایہ مدرس و معلم اور مفسر قرآن ہونے کی حیثیت سے ان کا شہرہ تھا۔ تقریر و تحریر دونوں کے بادشاہ تھے۔ مولانا فراہی کے تفسیری منہاج پر بڑا کام کرچکے تھے۔ وہ اس دور کے ابھرتے ہوئے ان علماء میں سے تھے جن کا ورثہ تو قدیم علوم تھے ہی علوم جدید پر بھی جن کی گہری نظر تھی۔ اب وہ خالص دعوتی اور تحریکی ماحول میں پہنچ گئے تھے۔ یوں گویا دارالاسلام

کے دستورالعمل میں سیّد مودودی علمی تحقیق میں جس قسم کے افراد چاہتے تھے تحریک میں شامل ہو گئے۔ (نقی علی، سیّد (قلمی نسخہ) ص 435)

دارالاسلام میں باقاعدہ مہمان خانہ قائم تھا۔ جس میں اکثر مہمان آتے رہتے تھے۔ ان میں وہ اصحاب بھی ہوتے جو سیّد مودودی کے ہم فکر و ہمنوا ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور جرمن نومسلم محمد اسد تھے۔ دوسرے مولانا محمد علی ایم۔اے کینٹ تھے۔ دوسری قسم مہمانوں کی وہ تھی جو سیّد مودودی کی دعوت سے متاثر ہوتے تو ذہنوں میں اُٹھنے والے سوالات کا جواب پانے، فکری الجھنوں کو سلجھانے اور اطمینان قلب حاصل کرنے کیلئے سیّد مودودی کے پاس آتے۔ ان ہی میں ایک نوجوان محمد افضل چیمہ تھے جو آگے چل کر پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ کے جسٹس اور اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین بنے۔ تیسری قسم کے مہمان وہ تھے جو لٹریچر پڑھ کر دارالاسلام آتے تاکہ یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھ سکیں۔ آنے والوں میں غیر مسلم (ہندو اور سکھ) بھی ہوتے جو لٹریچر پڑھ کر متاثر ہوتے۔ اکثر کا مقصد تبادلہ خیال ہوتا۔ یوپی کا ایک نوجوان مسٹر شرما تحریک کا لٹریچر پڑھ کر اسلام کے بہت قریب آ گیا تھا۔ سیّد صاحب سے اس کی کافی طویل مراسلت رہی۔ پھر وہ دارالاسلام بھی آیا اور ہفتہ بھر مقیم رہا۔ یہاں طفیل محمد کے الفاظ میں: ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسلام قبول کر لے گا۔ لیکن اس دوران میں ملک تقسیم ہو گیا۔ (نعیم صدیقی 2000ء ص 229)

تحریک دارالاسلام ایک انقلابی تحریک تھی جس نے ملک بھر میں مسلم رائے عامہ کو انقلابی بنیادوں پر منظم کیا۔ دوسری طرف غیر مسلموں کے اندر یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش کی کہ صرف اسلام ہی بنی نوع انسان کے مسائل حل کر سکتا ہے۔ یوں شعبۂ علمی و عملی کے ذریعے اسلامی نظام تمدن کی برتری کو عملاً ثابت کیا گیا۔ کیونکہ بانیٔ تحریک کے نزدیک دارالاسلام بنانے کی جدوجہد مسلمانوں کے ایمان ہی کا تقاضا نہ تھا بلکہ ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ ہندوستان میں وطنی قومیت کی بنیاد پر لادینی جمہوری اسٹیٹ کی صورت میں جو طوفان اُمڈا آ رہا تھا۔ اس میں مسلمان کا مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس یلغار کے آگے مسلمان صرف اسی صورت کھڑے رہ سکتے تھے کہ وہ اپنے ماحول کو دارالاسلام بنانے کا عزم لے کر اُٹھتے اور اس کیلئے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے۔ جہاں تک حب الوطنی کا تعلق تھا تو سیّد مودودی نے واضح کیا کہ دارالاسلام بنانے کی خواہش نہ تو حب الوطنی اور حریت طلبی کے منافی ہے اور نہ اس کی کوشش۔ بلکہ وطن کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے وطن کو معاشرت و معیشت اور سیاست و اخلاق کا وہ عادلانہ نظام دیں جس کا نام اسلام ہے۔ (ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد ستمبر 1938ء ص 3)

یہ وہ دور تھا جب مسلم لیگ کی تحریک پاکستان بھی زوروں پر تھی اور کانگریسی مسلمان بھی بڑے سرگرم تھے۔ دینی حلقے اپنی جگہ فعال اور متحرک تھے۔ اس وقت دارالاسلام پٹھانکوٹ سے اُٹھنے والی تحریک اسلامی نے سب کو چونکا دیا۔ لہٰذا ایک مسلم لیگی وفد گورداسپور سے سیّد مودودی کے پاس آیا۔ وفد کے ارکین کافی دیر تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے کہ پاکستان بنانے کی جدوجہد کے موقع پر سیّد مودودی مسلم لیگ کے ساتھ کیوں نہیں آتے۔ سیّد مودودی نے کہا: آپ پاکستان

ضروری بنایئے، لیکن آپ نے اس کو چلانے کی بھی کوئی تیاری کی ہے۔اخلاق کے بغیر ایک اسٹیٹ وجود میں تو لائی جاسکتی ہے لیکن چلائی نہیں جاسکتی ۔میں اپنی ساری فکر اور ساری قوت اس کام میں لگا رہا ہوں کہ قوم کے اخلاق ایسے ہو جائیں جو اسٹیٹ کو سنبھالنے اور چلانے کے قابل ہوں ۔مسلم لیگ کی تحریک اخلاق کا کوئی بندوبست نہیں کر رہی ہے بلکہ جو کچھ رہے سہے اخلاق تھے ان کو بھی ختم کر رہی ہے اور پاکستان بن جانے کے بعد دو تین ماہ کے اندر ہی آپ دیکھ لیں گے کہ قوم جو اخلاق رکھتی ہے یا مسلم لیگ کے لیڈر اس کو جو اخلاق دے رہے ہیں وہ اس اسٹیٹ کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہوں گے۔(نقی علی سیّد 1980ء ص 371)

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن الٰہی علوی علی گڑھ کے زمانے سے مسلم لیگ کے سرگرم کارکن تھے اور سیّد مودودی کے افکار و دعوت سے بھی متاثر تھے۔1942ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کراچی کے بعد دارالاسلام سیّد مودودی سے یہ مشورہ لینے آئے کہ مسلم لیگ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہے جو پاکستان میں آئین کے نفاذ کے مخالف ہیں ۔اب فرمایئے، ہم لوگ لیگ میں رہیں یا چھوڑ جائیں ۔تو سیّد مودودی نے کہا: آپ جیسے لوگوں کا مسلم لیگ میں رہنا بہت ضروری ہے۔پاکستان یقیناً بن رہا ہے۔لیکن اس پر یونینسٹ قسم کے مسلمانوں کے قبضے کا خطرہ ہے جو انگریز کے مقابلے میں مسلمانوں کیلئے زیادہ ظالم ثابت ہوسکتے ہیں اور اس کا سدِّباب ضروری ہے(نعیم صدیقی 2000ء ص 454)۔گویا تحریک دارالاسلام وہ انقلابی تحریک تھی جس کے پیشِ نظر اللہ کا حکم سب حکموں پر، اس کا کلمہ سب کلموں پر اور اس کا قانون سب قوانین سے بالاتر ہو۔(ابوالاعلیٰ مودودی سیّد جنوری 1939ء)

یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہندوستان پر جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے اعتراض کیا تو بانیٔ تحریک دارالاسلام نے گویا محمود غزنوی کے الفاظ دہرائے کہ: ہم بت شکن ہیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔انسان نے اسے ہزاروں حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا۔اب بت ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہے۔مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔(ابوالاعلیٰ مودودی سیّد 1946ء ص 22)

دارالاسلام نے اپنی علمی حیثیت سے نکل کر جب عملی صورت اختیار کی تو وہ جماعت اسلامی بن گیا۔جس نے 1956ء سے ہی "اسلامی دستور" بنا کر گورنمنٹ کو پیش کر دیا۔لہٰذا اگر ہم یہ کہیں کہ دارالاسلام پٹھانکوٹ جماعت اسلامی کا نقشِ اوّل تھا تو تاریخی حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔جماعت کے قیام کے بعد اس کے ہفتہ وار اجتماعات دارالاسلام میں منعقد ہونے لگے۔جن کے باعث دارالاسلام کی ننھی منی پرسکون بستی کی تحریکی زندگی پورے بہار پر آجاتی تھی۔یہاں جمع ہونے والے نسلی، لسانی اور علاقائی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے مگر سب نصب العین کے مطابق ایک

تھے۔ان ہفتہ وار اجتماعات میں باہر سے آنے والے خطوط بھی پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔وقت جیسے جیسے پیش قدمی کر رہا تھا اکثر خطوط ان ہولناک حالات سے بدلے ہوتے تھے جن سے اس وقت کا برصغیر دوچار تھا۔فسادات کی آگ پہلے بھی بھڑکتی رہتی تھی مگر اس مرتبہ یہ آگ بنگال میں بھڑکی تو انتقام کے خونی چکر میں اس کے شعلے دور دور تک لپکنے لگے۔آگ اور خون کے اس طوفانی سمندر کے درمیان دارالاسلام کا وجود امن وسلامتی کا مرکز بن گیا۔اردگرد کے شہر سے بھی مسلمان دارالاسلام کی ننھی منی بستی میں جمع ہونے لگے۔بلکہ آس پاس کی آبادیوں کا یہ ایک کیمپ بن چکا تھا۔(تقی علی ،سیّد، (قلمی نسخہ)' ص435)

دارالاسلام کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا اور سکھوں کی طرف سے ہر وقت خطرہ لاحق تھا۔اس لئے بانیٔ تحریک نے سخت حفاظتی اقدامات کئے۔علاقے کے چاروں طرف خندق کھودی گئی۔حفاظتی اقدامات کئے اور سب کے فرائض تقسیم کردیئے۔ہر شخص کیلئے دو روٹیوں کا راشن مقرر تھا۔سیّد مودودی نے پہرے ،حفاظتی اقدامات اور گشت کا بندوبست کیا۔رات رات بھر جاگ کر دیکھتے آدمی غفلت اور نیند تو میں نہیں (محمد یوسف بھٹہ 1984ء ص256)۔کچھ عرصہ حالات اسی طرح مخدوش رہے۔قتل عام جاری تھا۔اگرچہ دارالاسلام کی بستی میں اسلحہ نہ تھا۔نہ ہی دفاع کا موثر انتظام لیکن بے مثال نظم وضبط ،حیرت ناک دلیری اور جرأت ہندو سکھوں کیلئے حوصلہ شکن تھے۔کہ انہیں آخری وقت تک ادھر کا رُخ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔کچھ دنوں بعد فوج نے دارالاسلام کو اپنے چارج میں لے لیا۔

یوں سیّد مودودی اپنے رفقاء کے ساتھ 29 اگست 1947ء کو لاہور تشریف لائے۔اور اپنی دینی وعلمی سرگرمیوں کا مرکز لاہور کو ہی بنایا۔جبکہ چوہدری نیاز علی جوہر آباد چلے گئے۔اور وہاں پہنچ کر دارالاسلام ٹرسٹ جوہر آباد قائم کرکے اپنی سابقہ تعلیمی وتربیتی منصوبے کو بروئے کار لانے لگے۔پاکستان میں بھی ادارہ دارالاسلام کے سامنے کام کا وہی نقشہ تھا جو علامہ اقبال نے اس کیلئے تجویز کیا تھا اور جس کا مکمل نقشہ چوہدری نیاز علی کے ذہن اور ادارے کے فیصلوں واعلانات میں موجود تھا۔چنانچہ ان ہی خطوط پر ادارے نے اپنا کام شروع کردیا۔المختصر تحریک دارالاسلام ایک اسلامی ،تعلیمی ،تنظیمی واخلاقی تحریک تھی۔جو وقار اور سبک روی سے اُٹھی اور بالآخر دلوں میں گھر کرگئی ،ذہنوں کو مسخر کرگئی۔نظر کو خیرہ کردیا۔کانوں کی سماعت کو بڑھایا۔زورِ قلم کو جس نے قوت عطا کی۔زبان کو فصاحت وبلاغت عطا کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قدموں کو راہِ عمل کی جانب گامزن کردیا۔(اسعد گیلانی ،سیّد 1978ء ص305)

اگرچہ اس میں تعطل بھی آیا کہ نظریاتی اختلاف کی بناپر جب سیّد مودودی اور ان کے رفقاء کو 29 جنوری 1939ء میں دارالاسلام چھوڑ کر لاہور آنا پڑا۔مگر 15 جون 1942ء کو سیّد مودودی چوہدری نیاز علی کے اصرار پر تحریک کی سربراہی کے لئے دوبارہ دارالاسلام پہنچے۔اگرچہ یہ مرحلہ اور واقعہ پریشان کن دھچکہ تھا۔لیکن تحریکوں اور جماعتوں کی زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔اہل حق ان سے نہ صرف یہ کہ دل برداشتہ نہیں ہوتے بلکہ پہلے سے زیادہ عزم راسخ کے ساتھ اللہ کے توکل پر اپنی منزل اور نصب العین کی سمت بڑھتے چلے جاتے ہیں۔چنانچہ سیّد مودودی نے اس واقعہ پر چند الفاظ میں

تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ہمیں کسی زمین کی خاک سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔محبت اس نصب العین سے ہے کہ اللہ کا حکم سب حکموں پر،اس کا کلمہ سب کلموں پراوراس کا قانون سب قوانین سے بالاتر ہو۔اس لیا ئے مقصود کے پیچھے جہاں جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جائیں گے اور جس جس سرزمین کی خاک چھاننی پڑے گی چھانیں گے۔(ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد جنوری 1939ء،ص 6)

بعض اکابرین کی طرف سے نتائج کے بارے میں شکوک وشبہات کے اظہار پر تبصرہ کرتے ہوئے سیّد مودودی نے واضح کیا کہ چونکہ یہ کام بالکل نیا اور بے حد کٹھن ہے۔اس لئے ہمیں فوری نتائج کی امید دل میں پال کر بے صبری سے نہیں بلکہ یہ بات ذہن نشین کر کے اس راہ میں جدوجہد کرنا ہوگی کہ یہ جدوجہد کئی نسلوں میں جا کر ثمرور ہو سکے گی۔سیّد مودودی لکھتے ہیں کہ: یہ ایک (Herculean Task) ہے۔اوّل تو ہم اس کو اس طرح شروع کر رہے ہیں کہ ہم سے پہلے کوئی اس کے نشاناتِ راہ چھوڑ کر نہیں گیا۔ہمیں خود ہی اپنی منزلِ مقصود کو پیش نظر رکھ کر راستہ بنانا ہے اور اس پر چلنا ہے۔دوسرے یہ اتنا بڑا کام ہے کہ میری اور آپ کی اور ہم جیسے سینکڑوں آدمیوں کی پوری پوری زندگیاں بھی اس کیلئے کافی نہیں ہیں۔اگر ہم یہ امید کریں کہ ہماری زندگی میں اس کے پورے نتائج سامنے آجائیں گے تو یہ غلط امید ہوگی۔یہ کھجور کا درخت لگانا ہے جو اس کو بوتا ہے وہ اس کا پھل نہیں توڑ سکتا۔ہم اس درخت کو لگائیں گے اور اپنے خونِ جگر سے اس کو سینچ کر چلے جائیں گے۔ہمارے بعد دوسری نسل آئے گی اور شاید وہ بھی اس کے پھلوں سے پوری طرح لذت نہ آشنا نہ ہو سکے گی۔کم از کم دو تین پشتیں اس کے پورے نتائج ظاہر ہونے کیلئے درکار ہیں۔(منصور خالد 1986ء،ص 57، 58)

بہرکیف مختصر مدت میں اس تحریک کے ابتدائی دور میں جو کام ہوا۔اس سے مندرجہ ذیل اثرات مرتب ہوئے۔

- تحریک مجاہدین کے بعد پہلی بار دیہات میں نماز جمعہ قائم کرنے کا اہتمام ہوا۔
- مالی مسائل کو حل کرنے کیلئے حکومتی گرانٹ یا چندہ کا طریقہ نہیں اپنایا گیا بلکہ کفایت،محنت اور سادگی پر انحصار کیا گیا۔
- تحریک دارالاسلام میں ادارہ دارالاسلام کا دستورالعمل حقیقت میں تحریک اسلامی کی پہلی دستاویز تھی۔جس پر چل کر ایک اسلامی جماعت کی نہ صرف بنیاد پڑی بلکہ اس وقت وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی بڑی جماعتوں میں سے وہ بڑی جماعت ہے۔جس نے 1956ء میں ہی دستور اسلامی بنا کر حکومت پاکستان کو پیش کر دیا تھا۔
- پوری ایک صدی کے بعد برصغیر پاک وہند میں ایک ایسی تحریک منظم ہوئی جس کا مقصد،نصب العین،طریقہ کار، تنظیم اور نظام تربیت خالصتاً اسلامی اصولوں پر تھا۔
- اسلام کا انقلابی پہلو نمایاں ہوا۔جمود ٹوٹا اور احساس کمتری ختم ہوا۔
- اسلام پر دوبارہ اعتماد بحال ہوا۔وقت کی ضروریات کے مطابق کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ سے زندگی کے مختلف شعبوں میں رہنمائی کیلئے لٹریچر تیار ہوا۔

- قدیم اور جدید تعلیم یافتہ کے درمیان جو کش مکش گزشتہ نصف صدی سے مسلمانوں میں شروع ہو چکی تھی وہ بڑی حد تک کم ہوئی اور دونوں باہمی اشتراک سے ملت کی خدمت پر متوجہ ہوئے۔
- اسلامی حکومت اور مسلمانوں کی قومی حکومت کا فرق واضح ہوا۔
- ناظم ادارہ دارالاسلام کے مطابق دارالاسلام ایک صنعتی مرکز کے لحاظ سے بہترین جگہ تھی۔ ماہ جولائی 1941ء کے اواخر میں نواب مظفر خان اور مولوی فتح الدین پرنسپل ایگریکلچرل کالج لائل پور بھی تشریف لائے۔ (ادارہ تحریر دارالاسلام ستمبر 1941ء ص 7)
- بستی دارالاسلام کو نمونے کی ایسی بستی بنانا مقصود تھا جس سے مدینہ منورہ کے اتباع کا نقشہ استوار کیا جا سکے۔ اس بارے میں حتی المقدور کوشش کی تھی جو کافی حد تک کامیاب ہوئی۔
- تحریک اسلامی کے تصنیفی سرمائے میں بانئ تحریک دارالاسلام سیّد مودودی کی تصانیف، افادیت، ادبیت اور کمیت کے لحاظ سے دوسرے مصنفوں پر نمایاں فوقیت رکھتی ہیں۔ ان کی تصانیف تحریکی مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اُردو ادب میں بھی گراں بہا اضافہ ہیں۔ سیّد مودودی کے علاوہ دارالاسلام تحریک کے اساسی ارکین میں نعیم صدیقی نے سب سے زیادہ لکھا۔ ان کی تصانیف میں مقالے، مضامین طنز و مزاح سے بھرپور خاکے، افسانے، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ گویا یہ تحریک ادبی خصوصیات کی حامل تحریک بھی تھی۔ (نجم الاسلام نومبر 1963ء ص 272)

باب یازدھم

معطیات کا تجزیہ

11.1 خلاصہ

انگریزوں نے جب ہندوستان پر تسلط قائم کیا تو یہاں ایک جامع نظام تعلیم رائج تھا۔ یہ نظام تعلیم خودکار اور بڑی حد تک خود کفیل تھا۔ حکومتوں کے نشیب و فراز کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ تعلیم عام اور مفت تھی۔ اساتذہ اور طلبہ دینی جذبہ سے سرشار ہو کر تعلیم اور تعلم میں مشغول رہتے تھے۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں مدرسوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ ایک چپڑاسی کا لڑکا بھی وہی تعلیم حاصل کرتا تھا جو امراء اور نوابین کے لڑکے حاصل کرتے تھے۔ یعنی عوام اور خواص میں کوئی تفریق نہیں تھی کیونکہ یہ نظام تعلیم خوف خدا، جواب دہی عقبیٰ اور زندگی ایک عبادت ہونے کے دینی تصورات پر قائم تھا۔ صدیوں کے تعامل سے اس نظام تعلیم میں استحکام اور پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ وسیع و عریض اسلامی سلطنت کو ہر قسم کے مردان کار فرما کر رہا تھا۔ علوم و فنون، تہذیب و تمدن، منبر و محراب، دفتر و میدان جنگ کی رنگ برنگ اور مختلف النوع ضروریات کو بوجہ احسن پورا کر رہا تھا۔ ذہنی آبیاری، وسعت نظر، حوصلہ اور شائستگی میں یہ نظام تعلیم کسی طرح بھی مغربی نظام تعلیم سے کمتر نہیں تھا بلکہ اس بات کا اعتراف خود جنرل سلی مین اور ہنٹر نے بھی کیا ہے۔

جنگ پلاسی (1757ء) کے بعد بنگال میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ دوسرا ٹھیکہ دیتے وقت 1813ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی (حکمران بنگال) کو پابند کیا کہ اہل ہند کی تعلیم کا انتظام کریں اور اس غرض کے لئے ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم بھی مقرر کی گئی لیکن اس چارٹر کے الفاظ میں ابہام تھا اس لئے اس کا مفہوم متعین کرتے کرتے دس سال گزر گئے۔ 1823ء میں کلکتہ، آگرہ اور دہلی میں کالج کھولے گئے۔ 66 سال گزر جانے کے بعد کمپنی کی حکومت نے اہل ہند کی تعلیم کی طرف عملی قدم اٹھایا۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ لارڈ میکالے نے 1835ء میں قدیم تعلیمی اسکیم کی جگہ تعلیم کا نیا خاکہ پیش کیا جس کو لارڈ ولیم بینٹک گورنر جنرل ہندوستان نے ملک میں نافذ کر دیا۔ جدید تعلیم کا سنگ بنیاد یہ اسکیم ہے۔ اس تعلیمی اسکیم پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظام تعلیم کے معماروں کے ذہن میں جو مقاصد کار فرما تھے وہ سب سیاسی تھے کوئی علمی یا اخلاقی مقصد ان کے پیش نظر نہیں تھا۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ تھپڑ کی بجائے تھپکی کی پالیسی اختیار کی گئی۔ اس مقصد کے لئے جہاں اور طریقے اختیار کئے گئے وہاں 1871ء کے بعد مسلمانوں کا اعتراض رفع کرنے کے لئے نصاب

تعلیم میں دینیات کے نام سے ایک گھنٹے کا اضافہ کر دیا گیا۔ جو بقول اکبرالہ آبادی:

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے
مگر یونہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

اور سیّد مودودی کے الفاظ میں یہ اضافہ "ٹاٹ میں ریشم کے پیوند" کے مترادف تھا۔ بہر کیف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا مطالبہ منظور کر کے حکومت مسلمانوں کو مغربی طرز کے تعلیمی اداروں میں لانے میں کامیاب ہوگئی۔ مسلمانوں کی اشک شوئی ہوگئی۔ اب مسلمان خود مغربی تعلیم میں پیش قدمی کرنے لگے۔

1875ء میں دارالعلوم علی گڑھ اور دوسرے اسلامی اسکول و کالج کھلتے چلے گئے۔ ان اسلامیہ اسکول اور کالجوں نے مسلمانوں میں ایک نئی ذہنیت کو جنم دیا۔ وہ یہ کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا اور کاربند ہوئے بغیر محض زبانی اور جذباتی وابستگی اسلام کے لئے کافی سمجھ لی گئی۔ مسلم معاشرہ کی خدمات ہی اسلام کی حقیقی خدمات قرار پا گئیں۔ ان حالات میں یقین ہو چلا تھا کہ سرزمین ہند سے اسلام کا چمن کسی لحہ بھی اجڑ سکتا ہے۔ یہاں بھی وہ ہی تاریخ دہرائی جانے والی ہے جس کا ایک مظاہرہ سرزمین اسپین میں ہو چکا ہے۔ اس لئے نفوس قدسیہ کے دلوں میں خلش اور کسک کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔ ان حضرات نے الہامی طور پر ضرورت محسوس کی کہ دین کے تحفظ کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کی جائے۔

چنانچہ کسی نے دیکھا کہ خواب میں، حفظ دین و مسلم کے لئے مدرسہ کے قیام کا حکم ملا ہے۔ کسی کو کشف ہوا کہ مدرسہ قائم کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ میرے قلب پر وارد ہوا ہے کہ مدرسے کا قیام ضروری ہے۔ غرض یہ کہ سب کا قیام مدرسہ پر جمع ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ قیام مدرسہ کا فیصلہ من جانب اللہ تھا۔ لہٰذا 30 مئی 1867ء کو دیوبند کی ایک چھوٹی سی مسجد جو چھتہ مسجد کہلاتی تھی، اس میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ بعدازاں مسلمانوں کے اندر انگریزی تعلیم کے اولین داعی اور موسس اول سرسیّد احمد خان نے علی گڑھ میں 1875ء کو مدرستہ العلوم قائم کیا۔ یہ ہی مدرسہ آگے چل کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنا اور مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں انگریزی تعلیم و مغربی علوم کے مرکزی جامعہ کی صورت اختیار کر گیا جبکہ 1894ء میں تحریک ندوۃ کا پہلا دارالعلوم لکھنؤ میں قائم ہوا۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ مدرستہ العلوم علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کی درمیان کڑی ثابت ہوا۔

1920ء میں تحریک ترک موالات کے دوران علی گڑھ میں چند خیموں کے اندر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد پڑی۔ کچھ عرصہ بعد دہلی میں یہ درس گاہ اپنی مستقل عمارت میں منتقل ہوگئی۔ چند ہی سالوں میں اوکھلے کا ویرانہ جیتی جاگتی زندگی کی شکل اختیار کر گیا اور جامعہ نے ایک مستقبل یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی۔ 1938ء میں علامہ اقبال کی فکر اور تعلیمی نظریات کی روشنی میں چوہدری نیاز علی خان کے وقف اور سیّد مودودی کی رہنمائی میں پنجاب کے ضلع گورداسپور میں ادارہ دارالاسلام (جمال پور، پٹھانکوٹ) ایک تحریک کی صورت میں قائم ہوا۔ یہ ادارہ آغاز ہی سے تین انسانی ستونوں پر کھڑا تھا۔ علامہ اقبال بہ حیثیت فکری رہنما اور سرپرست، چوہدری نیاز علی خاں بہ حیثیت بانی جبکہ سیّد مودودی بہ حیثیت مربی اور رہنمائے کار۔

دارالاسلام کا تخیل دنیا کے ہنگاموں سے دور ایک بستی آباد کرنے کا تھا۔جس کا پورا ماحول اسلامی اقدار کا حامل ہو اور جو مرکز تعلیمات و تبلیغات اسلامی بن سکے۔

دارالاسلام کا نقشہ ہجرت کے بعد مدینہ کی بستی سے اخذ کیا گیا تھا۔اسے ایسی بستی بنانا مقصود تھا جس میں باہر کے لوگ آئیں تو اس ماحول میں اسلام کے زندہ دل کو دھڑکتا ہوا محسوس کریں۔وہاں ایسے کارکن تیار ہوں جو قرآن کے علوم پر گہری نظر رکھتے ہوں اور جدید علوم پر تنقیدی نظر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔جن میں فرقہ بندی کا شائبہ بھی نہ ہو۔تحریک دارالاسلام کا یہ مقصد علامہ اقبال کا مقرر کردہ تھا کیونکہ وہ اس نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھے جو مسلمانوں کو اطوار غلامانہ سکھا رہا تھا اور انسان کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈال کرا سے غلامی کے سانچے میں ڈھال رہا تھا۔علامہ اقبال کے انتقال پرملال سے اس تحریک کا ایک روحانی و فکری ستون گر گیا لیکن اس کے باوجود تحریک کی گاڑی سید مودودی اور چوہدری نیاز علی جیسے دو پہیوں پر چلتی رہی۔

ان تحریکوں کے علاوہ سرحد، سندھ اور پنجاب میں تعلیمی احیاء کی جو تحریکیں برپا ہوئی ان میں سے 1884ء کی انجمن حمایت اسلام لاہور، جس کے سالانہ جلسوں کی امتیازی خصوصیت علامہ اقبال کی معرکۃ الاراء نظمیں تھیں،، 1885ء میں سندھ مدرسۃ الاسلام، جسے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی مادر علمی ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور 1911ء میں اسلامیہ کالج پشاور، جسے تین مرتبہ قائداعظم کی آمد کا شرف حاصل ہے پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

11.2 حاصلات

مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں غیر مسلموں کو جہاں اپنی تہذیب وتمدن سے متاثر کیا وہیں انہیں اپنے عظیم علمی وثقافتی کارناموں سے بھی مسحور کردیا۔وہ تقریباً ایک ہزار سال تک ایک عالمگیر علمی تحریک کے قائد وعلمبردار رہے اور انسانی علوم وفنون کی ہر شاخ میں انہوں نے اپنی عبقریت وذہانت کے نئے نئے غنچہ وگل کھلائے۔انہوں نے یونان وایشیاء کے ثقافتی سرمائے کو عربی اور اسلامی زبان میں منتقل کیا اور اس پر مفید وگرانقدر اضافوں کے بعد اسے عرب وافریقہ، سسلی اور اسپین کی جامعات کے ذریعے یورپ تک پہنچایا۔یورپی نشاۃ ثانیہ کی اہم شخصیت راجر بیکن جس نے سائنس کو تجربی طریقہ دیا وہ جامعہ قرطبہ کا طالب علم تھا مگر افسوس کہ مسلمانوں کی خانہ جنگیوں اور روح جہاد واجتہاد کے فقدان کے سبب ان کے ہاتھوں سے سیاسی قیادت کے ساتھ علمی وثقافتی امامت وسیادت بھی نکل گئی اور یورپ نے ان علوم کو مادی دنیا اور سائنس کو غیر انسانی وغیر اخلاقی رنگ دے دیا بلکہ مسلمانوں سے حاصل کئے ہوئے علوم وفنون کو خود ان کے خلاف استعمال کرنا شروع کردیا۔

صلیبی جنگوں، ترکوں کی فتوحات قومی ومذہبی اختلافات اور اپنے توسیع پسندانہ رجحانات کے سبب مغربی طاقتوں

نے مسلمانوں کو سسلی اور اسپین سے بے دخل کرنے کے بعد تقریباً سارے عالم اسلام کو اپنے ہمہ گیر استحصال کا نشانہ بنانا شروع کیا جس کی بدترین مثال 1857ء میں ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ان کا جوش انتقام تھا۔ اس سبب ہندوستانی مسلمان ایک طویل عرصے تک اپنا سیاسی و ثقافتی وجود کھو بیٹھے۔ ان کا دینی و ملی مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ اس بربریت و بہیمیت کی غم انگیز داستان غالب کے خطوط اور ہندوستان کی تاریخوں میں پڑھی جا سکتی ہے۔ اس المیے کا سب سے دردناک پہلو یہ تھا کہ فاتح برطانوی حکومت کے جذبہ انتقام کا رخ زیادہ تر مسلمانوں کی طرف تھا اور وہ انہیں مذہب و ثقافت سے الگ کر کے اپنے رنگ میں جذب کر لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک طرف سینکڑوں مدارس بند کئے گئے تو دوسری طرف ان کی جگہ مشن اسکول کھولے گئے اور ہندوستان بھر میں سرکاری سرپرستی میں جارحانہ طور پر عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔

اس شکست خوردگی کے ماحول میں جب اس ملک میں اسلام اور مسلمان اپنے زوال و انحطاط کے آخری نقطے پر پہنچ گئے اور دور دور تک ان کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا تو تعلیمی احیاء کے لئے جو تحریکیں اٹھیں انہوں نے معاشرے پر کافی اثرات مرتب کئے۔ ان میں سے پہلے ہم نے تحریک دیوبند پر روشنی ڈالی ہے جس نے بڑا کام یہ کیا کہ مسلمانوں میں بلحاظ دین و مذہب اور بلحاظ معاشرت تبدیلی نہیں ہونے دی۔ حالات کے دھارے میں بہنے سے روکا۔ پختگی اور عزم کے ساتھ انہیں اسلامی سادگی اور دینی ثقافت کے زاہدانہ و متوکلانہ اخلاق پر قائم رکھا۔

مگر اس حکمت و دانائی کے ساتھ کہ عوام کی حد تک اندرون حدود جائز توقعات سے گریز نہیں کیا جو بدلتے ہوئے تمدن و معاشرے میں طبعی طور پر ضروری تھا مگر خواص کی حد تک دائرہ وسیع نہیں ہونے دیا۔ اس طرح عام مسلمانوں میں اسلامی مدنیت کا سادہ نقشہ قائم رہا۔ جدید تمدن و معاشرت، اغیار کی نقالی کا غلبہ نہیں ہو سکا اور اسلامی حمیت و عزیمت باقی رہ گئی۔ مرعوبیت اور احساس کمتری قلوب میں نہ جم سکی۔ ضمیر کی حریت و آزادی کا پورا پورا تحفظ ہوا۔ اتباع مغرب سے بچا کر سنت کو معیار زندگی بنانے کے جذبات قلوب میں ابھرے جس سے عام تمدن اور معاشرت میں پرہیز گاری اور تقویٰ و طہارت کے تصور اجاگر رہے۔

تحریک علی گڑھ کی جدید تعلیم محدود دائرے میں بلا شبہ مفید ثابت ہوئی۔ اس کے ذریعے ہم موجودہ دور کی ترقیات سے آشنا ہوئے۔ ہمارے ہاں جو فکری و عملی جمود پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹا۔ نئے نئے افکار نے ذہنوں کو سوچنے کی راہ پر ڈالا۔ نقطہ نظر میں وسعت پیدا ہوئی۔ پھر یہ تحریک جس راہ پر چل نکلی تھی اس کا جو ردعمل ہوا، اگرچہ بہت بعد میں جا کر ہوا، اس نے مسلمانوں کی فکری اور عملی قوتوں کو متحرک کیا۔ ان کے اندر ایسی علمی و عملی تحریکیں شروع ہوئی جنھوں نے مایوسی، اپنے آپ سے بیزاری یا محدود حصار میں بند کر لینے کی ذہنیت کی بجائے رجائیت، اپنی کھوئی شناخت کو ڈھونڈنے اور اپنے آپ کو منوانے کی طرف راغب کیا، مسلمانوں کے کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کیا۔

مسلمانوں کو حکومت کے مختلف شعبوں میں جانے کا موقعہ ملا جہاں انہیں نظم و نسق سنبھالنے، کاروبار حکومت چلانے

کا تجربہ ہوا بلکہ رفتہ رفتہ اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں اور حکومتی اداروں کو سنبھالنے، تربیت پانے اور ایسی صلاحیت سے بہرہ ور ہونے لگے جن کی کسی بھی آزاد مملکت کے روزمرہ کے کام کو قائم و مستحکم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ جدید تعلیم حاصل نہ کرنے سے ہمیں جو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا اور میدان بالکل خالی پا کر ہندو نظم ونسق میں جس طرح دخیل ہو سکتے تھے اس سے ہم بچ گئے۔ دوسری طرف تحریک علی گڑھ کے جو منفی اثرات مرتب ہوئے وہ اتنے شدید تھے کہ انہوں نے ہمارے تصور دین و اخلاق، فلسفہ زندگی، تہذیبی قدروں اور سیرت و کردار کی بنیادیں جس طرح متزلزل کر دیں ان کے مقابلے میں یہ فوائد بالکل ہیچ تھے۔

اس کے بعد حالات میں جب تیزی سے تبدیلی پیدا ہوئی تو محسوس ہوا کہ جن ضروریات کے لئے دارالعلوم (دیوبند) کا قیام عمل میں لایا گیا تھا وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں کیونکہ وہاں سے جو ماہرین شریعت فارغ التحصیل ہو کر نکل رہے ہیں وہ ایک ایسی قدیم روایت کے نمائندہ ہیں جو دور جدید کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے پا رہی۔ دور جدید میں سائنس، فلسفہ مغرب، جدید نظریات و تصورات، معاشیات اور سیاسیات کے میدانوں میں جس انداز سے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں، ان چیزوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے نہ تو طلبہ کو عقلی و فکری طور پر ان کے جوابات دینے کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور نہ ان کے لئے ایسا کرنا ممکن ہے۔ ان کی تربیت ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے تو درست اور کافی تھی جو قدیم یونانی فلسفے کے انداز پر کئے جاتے تھے یا جو قدیم منطقیوں کی طرف سے کئے گئے لیکن اکثر و بیشتر میدانوں میں ان کی تربیت دور جدید کی کسی عقلی و فکری ضرورت کے اعتبار سے نہیں ہوئی تھی۔

اس ضرورت کے پیش نظر تحریک ندوۃ العلماء وجود میں آئی۔ جس نے نصاب میں ادب اور تاریخ پر زیادہ زور دیا۔ انگریزی زبان اور چند جدید علوم بھی بقدر ضرورت شامل کئے گئے۔ ندوۃ العلماء کا قیام دارالعلوم دیوبند کے تجربے کے رد عمل کے طور پر ہوا تھا اس لئے ندوۃ العلماء کے نصاب میں درس نظامی کی جو شدت پسندی، دقت پسندی اور مشکل پسندی تھی وہ بالکل ختم کر کے ان تمام مضامین کو ممکنہ حد تک آسان بنا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں سے فارغ ہونے والے حضرات جید صحافی، جید ادیب، اچھے شاعر اور اچھے مصنف تو ہوئے لیکن کوئی ایسا ٹھوس عالم اور مفکر (چند ایک کو چھوڑ کر) پیدا نہیں ہوا جو قدیم اسلامی علوم میں عمیق اور ماہرانہ نظر رکھتا قرآن وحدیث یا فقہ میں تخصیص رکھتا اور دور جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتا۔ گویا تحریک ندوۃ العلماء مجموعی طور پر قومی زندگی میں کوئی موثر کردار ادا نہ کر سکی۔ اس نے جدید تعلیم کا اضافہ تو ضرور کیا لیکن اس کا حصہ اتنا کم تھا کہ ندوہ کے طلبہ مغربی علوم سے پوری طرح استفادہ نہ کر سکے۔ چند منفرد ہستیاں البتہ ضرور پیدا ہوئیں جن کی اسلامی خدمات قابل تعریف ہیں۔ ارباب ندوہ کا دعویٰ تھا کہ وہ علی گڑھ اور دیوبند سے اشتراک عمل کریں گے لیکن عملاً ندوہ میں دونوں کی مخالفت ہوتی رہی۔

پرانی تعلیم کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش تحریک ندوہ تھی تو نئی تعلیم میں پرانی تعلیم کی کچھ خصوصیات کو زندہ کرنے کی سعی تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ تھی جس نے لادینی تعلیم کو بنیادی طور پر غلط قرار دیا اور سیکولر تعلیم میں محض

دینیات کے اضافہ کو بھی ناکافی سمجھا۔قرآن پاک اور سیرت نبویؐ کے مطالعہ کو جزو نصاب بنایا اور اسلامی علوم میں اختصاصی تعلیم کی گنجائش پیدا کی ،اردو کو انگریزی کی جگہ ذریعہ تعلیم بنا کر مصارف تعلیم بہت کم رکھے۔اس تحریک کے تحت سرکاری ملازمت کو طلبہ کا نصب العین نہیں بنایا بلکہ دستکاری کو طلبہ کے لئے حصول معاش کا ذریعہ بنا کر پارچہ بافی ،ڈیری فارمنگ اور کیمیاوی صنعتوں جیسے مفید پیشوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ مختلف حیثیتوں سے ایک کامیاب تجربہ رہا لیکن یہ مسلمانوں کی قومی زندگی پر اپنے اثرات مرتب نہ کر سکی ۔اس تحریک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کے دوران اس نے ہندو کانگریس کا ساتھ دیا اور قیام پاکستان کی مقدور بھر مخالفت کی۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم ہونے والی یہ تحریک عملاً جامعہ ملیہ قومیہ ہندیہ بن گئی۔

1884ء میں قائم ہونے والی انجمن حمایت اسلام لاہور صرف ایک سماجی و تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک ایسی تحریک تھی جس کے زیر اثر نہ صرف اسکول کالج بلکہ طبیہ کالج، کتب خانہ اور یتیم خانے بھی قائم ہوئے۔انجمن حمایت اسلام اگرچہ ایک مذہبی اور تبلیغی انجمن کی حیثیت سے قائم ہوئی اور اس کی خدمات کا پہلا میدان تبلیغ و اشاعت اسلام ہی تھا لیکن جلد ہی اس نے جب تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کی تو اس کی فیض بخشیوں سے پنجاب کا ریگستان جہالت تعلیم کے اندھیروں سے نکل آیا۔اس کے اداروں کے طلبہ نے تحریک پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا۔مارچ 1940ء میں جب خاکسار مسلم لیگ کا جلسہ ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے تب اسلامیہ کالج (انجمن حمایت اسلام کا ادارہ) کے طلبہ ہی تھے جنہوں نے قائداعظم کو بحفاظت اور شان و شوکت کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں منٹو پارک (لاہور) پہنچایا تھا۔تحریک پاکستان میں انجمن حمایت اسلام نے موثر کردار ادا کیا۔

سندھ میں تعلیمی تحریک کا آغاز نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی شاخ سے ہوا۔1884ء میں ایسوسی ایشن کے صدر جسٹس امیر علی جب کراچی آئے تو حسن علی آفندی نے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔جس میں امیر علی نے سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر ایک تقریر میں مسلمانوں کو وقت کے مطابق ملی فلاح و بہبود کے کاموں اور تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ کیا۔حسن علی آفندی اور دوسرے سربرآوردہ مسلمان فوراً سرگرم عمل ہو گئے۔ان کی کاوشوں سے سندھ مدرستہ الاسلام کی بنیاد پڑی۔اس تحریک نے اپنے قیام اور تعلیمی مشن شروع کرنے کے بعد نہ صرف مسلمانوں کی بہتر تعلیم و تربیت کی بلکہ سندھ کی ہر شعبہ زندگی میں مرکزی قیادت فراہم کرنے کے علاوہ برصغیر کی حریت پسند سیاست کو معروف سیاسی رہنما بھی دیئے۔اس تحریک کے ادارے سندھ مدرستہ الاسلام کراچی کو قائداعظم کی مادر علمی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔تحریک پاکستان کے لئے مردان کار بھی اس تحریک نے فراہم کئے۔

1911ء میں سرحد میں صاحبزادہ عبدالقیوم خان کی ان تھک کوششوں سے اسلامیہ کالج پشاور وجود میں آیا۔جو صرف ایک کالج ہی نہیں بلکہ ایک عظیم تحریک تھی ۔یہ علمی و مذہبی تحریک فرنگی عصبیت کے باوجود مرعوب نہ ہو سکی ۔اس تحریک نے مغربی علوم سے خائف مسلمانوں کو اسلامی ماحول میں عصر جدید کے علوم سے روشناس کرایا۔تحریک پاکستان میں بھرپور

کردارادا کیا۔ 1946ء میں جب قائداعظم اسلامیہ کالج پشاور آئے تو طلبہ نے آٹھ ہزار روپے کی تھیلی قائداعظم کو پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگلی بار جب آپ آئیں گے تو ہم پاکستان کے لئے آپ کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کردیں گے۔ وقت نے ثابت کیا کہ تحریک پاکستان کو زندہ رکھنے کے لئے طلبہ نے تن من دھن سے تعاون کیا۔ انہوں نے جلسے کئے، جلوس نکالے، پولیس کے ہاتھوں لاٹھی چارج کی صعوبتیں جھیلیں، جیل کاٹی، پھر جب ریفرنڈم ہوا تو طلبہ کی ان ہی قربانیوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ صوبہ سرحد پاکستان میں شامل ہوگیا۔

علامہ اقبال کی رہنمائی ومشورے، چوہدری نیاز علی خاں کے وقف اور سید مودودی کی محنت شاقہ سے 1938ء میں پنجاب کے ضلع گورداسپور موضع جمال پور میں قائم ہونے والے ادارہ دارالاسلام کا تعلیمی منصوبہ بلاشبہ بہت عظیم تھا۔ اس ضمن میں ابتدائی قدم بھی اٹھالیا گیا تھا اور اساسی تعلیم کی درسگاہ بھی قائم کردی گئی تھی لیکن تقسیم ہند کے باعث تعلیمی کی بجائے تربیتی کام زیادہ ہوا۔ جس کی تفصیل باب نمبر 10 میں دی گئی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحریک دارالاسلام میں ادارہ دارالاسلام کا دستورالعمل حقیقت میں تحریک اسلامی کی پہلی دستاویز تھی جس پر چل کر ایک اسلامی جماعت کی نہ صرف بنیاد پڑی بلکہ اس جماعت نے 1956ء میں ہی دستور اسلامی بنا کر حکومت کو پیش کردیا تھا۔ تحریک مجاہدین کے بعد پہلی بار دیہات میں نماز جمعہ قائم کرنے کا اہتمام کرنا اس تحریک کے باعث ممکن ہوا۔ پوری ایک صدی کے بعد برصغیر پاک وہند میں تحریک دارالاسلام ایک ایسی تحریک تھی جس کا مقصد، نصب العین، طریقہ کار، تنظیم اور نظام تربیت خالصتاً اسلامی اصولوں پر تھا۔

یہ وہ دور تھا جب مسلم لیگ کی تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور کانگریسی مسلمان بھی بڑے سرگرم تھے۔ دینی حلقے اپنی جگہ فعال اور متحرک تھے۔ اس وقت دارالاسلام پٹھانکوٹ سے اٹھنے والی تحریک کے نظام تربیت نے سب کو چونکا دیا۔ لہٰذا ایک مسلم لیگی وفد گورداسپور سے سید مودودی کے پاس آیا۔ وفد کے اراکین کافی دیر تک اس مسئلے پر گفتگو کرتے رہے کہ پاکستان بنانے کی جدوجہد کے موقع پر سید مودودی مسلم لیگ کے ساتھ کیوں نہیں آتے۔ سید مودودی کا موقف تھا: آپ پاکستان ضرور بنایئے لیکن کیا آپ نے اس کو چلانے کی کوئی تیاری کی ہے؟ اخلاق کے بغیر ایک اسٹیٹ وجود میں تو لائی جا سکتی ہے لیکن چلائی نہیں جاسکتی۔ لہٰذا میں اپنی ساری قوت اور ساری فکر اس کام میں لگا رہا ہوں کہ قوم کے اخلاق ایسے ہو جائیں جو اسٹیٹ کو سنبھالنے اور چلانے کے قابل ہوں (نقی علی، سیّد 1980ء، ص 371)۔ گویا اس تحریک نے اخلاقی تربیت اور عمل کو زیادہ توجہ دی۔

المختصر مسلمانوں کی تعلیمی تحریکات میں چار رجحان زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ پہلا رجحان برطانوی نظام تعلیم سے مکمل عدم تعاون اور مسلمانوں کے تعلیمی نظام کے تحفظ کی کوشش جس کا نمائندہ ہے دیوبند۔ دوسرا رجحان انگریزی تعلیم کو بحیثیت نظام کے تقریباً پورے طور پر قبول کرلینا اور جزوی ترمیمات کے ساتھ اسے مسلمانوں میں فروغ دینا، اس کا نمائندہ علی گڑھ کالج تھا۔ تیسرا رجحان دیوبند اور علی گڑھ دونوں سے عدم اطمینان ہے۔ جس کی نمائندگی ندوۃ العلماء لکھنؤ کرتا ہے۔

چوتھا رجحان پہلی جنگ عظیم کے بعد رونما ہوا۔ یہ ان تینوں تحریکوں کو قومی ضروریات کے لئے ناکافی سمجھتے ہوئے تعلیم کو قومی رنگ دینا چاہتا تھا، اس کا نمائندہ جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا۔

جہاں تک تعلق ہے تحریک پاکستان میں حصہ لینے کا تو دیوبند، یوں تو انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز رہا۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ اور اساتذہ نے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر یہ ایک تاریخی سانحہ ہے کہ ہندوستان کے اس عظیم ترین دینی مرکز نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی اور ہندو کانگریس کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت کے تصور کا پرچار کیا۔ صرف مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مفتی محمد شفیع نے قائداعظم کا ساتھ دیا اور دو قومی نظریہ کی حمایت کی۔ علی گڑھ والوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے بھی قیام پاکستان کی مقدور بھر مخالفت کی اور تحریک دارالاسلام کے بانی نے ملک کو چلانے والوں کی اخلاقی و فکری تربیت کر کے تحریک پاکستان میں اپنا حصہ ڈالا۔ انجمن حمایت اسلام (لاہور)، سندھ مدرسۃ الاسلام (کراچی) اور اسلامیہ کالج (پشاور) کے طلبہ و اساتذہ نے تحریک پاکستان میں بھرپور شرکت کی۔

11.3 حاصلات پر بحث

انیسویں صدی میں بالخصوص جنگ آزادی کے بعد ہندوستان میں اسلام کو تین خطرات درپیش تھے۔ پہلا خطرہ مشنریوں کی طرف سے تھا جو اس امید میں تھے کہ سیاسی زوال کے ساتھ مسلمانوں کا مذہبی انحطاط بھی شروع ہو جائے گا اور توحید کے پیروکار تثلیث قبول کر لیں گے۔ دوسرا خطرہ یورپ اور ہندوستان میں ان خیالات کا اظہار تھا جنہیں دیکھ کر بقول سرسید مر جانے کو جی چاہتا تھا۔ یہ لوگ اسلام کو عقل و اخلاق کا دشمن اور انسانی ترقی کا مانع ثابت کر رہے تھے۔ ان میں صرف مشنری نہ تھے بلکہ مغربی یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور وہ انگریز حاکم بھی شامل تھے جنہیں خدا نے ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت سونپ رکھی تھی۔ اسلام اور بانی اسلام کے متعلق بدترین کتاب ولیم میور کی تھی جو صوبہ جات متحدہ کا حاکم تھا۔

تیسرا بڑا خطرہ جو آئندہ اور بھی بڑھنے والا تھا، خود مسلمانوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات کا پیدا ہونا تھا۔ جن لوگوں کی نظروں سے مشنریوں اور دوسرے عیسائی مصنفوں یا آزاد خیال مغربی مفکروں کی کتابیں گزریں وہ اسلام کے بعض مسائل کو جو عام علماء بیان کرتے تھے، خلاف عقل سمجھتے اور یہ ڈر تھا کہ اگرچہ وہ اسلام چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کریں گے لیکن مذہب سے ضرور بیگانہ ہو جائیں گے۔ ان تینوں خطرات میں سے جہاں تک مشنریوں کے خطرے کا تعلق تھا ظاہر ہے کہ اس کا مقابلہ بنگلے کی چار دیواری میں بیٹھ کر کتابیں لکھنے سے نہ ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو کر لیکچر دیتے۔ پمفلٹ تقسیم کرتے۔ مناظرے کی دعوتیں دیتے اور وہیں انہیں کوئی شکار مل جاتا۔ ضروری تھا کہ جو ہتھیار یہ لوگ استعمال کرتے تھے ان ہی سے ان کا مقابلہ کیا جاتا۔

چنانچہ تحریک دیوبند کے علماء مثلاً مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رحمت اللہ، مولوی آل حسن، ڈاکٹر وزیر خان، مولوی سید ناصرالدین اور دوسرے فضلاء نے اسی طرح ان کا مقابلہ کیا۔ ان سے بالمشافہ مناظرے کئے۔ ان کے مقابلے میں کتابیں لکھیں۔ پمفلٹ تقسیم کئے۔ یہ ان ہی بزرگوں کی کوششیں تھی کہ عام مسلمانوں میں مشنری کامیاب نہ ہوئے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ زوال بغداد کے بعد جس طرح قاہرہ اسلامی علوم وفنون کا مرکز بنا ٹھیک اسی طرح دہلی کے زوال کے بعد دیوبند کو علمی مرکزیت نصیب ہوئی۔ دیوبند نے ندوہ کی طرح اصلاح نصاب کے بلند بانگ دعوے تو نہیں کئے لیکن کئی امور میں اصلاحات کیں۔ نصاب تعلیم میں مذہبی علوم کے علاوہ تاریخ، ہندسہ اور طب کا انتظام تھا۔ ابتدائی درجوں میں اردو اور فارسی کی تعلیم بھی ضروری تھی۔ یہ نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی۔ علمائے دیوبند کو حالات زمانہ، مغربی مستشرقین اور دور حاضر کے مصری علماء کی تصانیف سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی علمائے ندوۃ العلماء کو تھی لیکن دیوبند کا پیانہ بہت وسیع تھا۔

دبستان دیوبند کے بیدار مغز اور روشن دل بزرگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے صرف ایک جامع نصاب تعلیم ہی کی فکر نہیں کی بلکہ ان کے لئے نصاب عمل، اسلامی نظام حیات اور ایک باوقار زندگی کا منصوبہ بھی تیار کیا۔ انہیں ازسر نو زندگی کے میدان میں ازسر نو تعمیری خطوط پر سرگرم عمل کر دیا۔ مولانا قاسم نانوتوی نے خلافت عثمانیہ کے لئے ہزاروں روپوں کا چندہ کیا۔ ترکی خلیفہ کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ اندرون ہند عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کئے۔ موثر متکلمانہ لٹریچر تیار کیا، شرعی عدالت کے ذریعے مسلمانوں کو خودمختاری کا سبق دیا اور غیرت مند وربانی علماء کی ایک برگزیدہ جماعت تیار کر دی۔ شیخ الہند نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علمی وعملی جہاد برقرار رکھا۔ ہندوستان وہندوستانی مسلمانوں کی آزادی کے لئے ریشمی رومال کی تحریک چلائی۔ زندان مالٹا کے مصائب جھیلے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور ثمرۃ التربیت (1889ء)، جمعیۃ الانصار (1910ء) اور نظارۃ المعارف (1913ء) جیسی انجمنیں قائم کیں۔

گویا دیوبند نے اس پر آشوب دور میں ہمیں خدا اور اس کے رسولؐ کے کلمے پر قائم رکھا، ہمارا تعلق قرآن اور حدیث سے جوڑے رکھا۔ اس سے ملک میں نماز اور دوسرے شعائر اسلامی کا چرچا ہوتا رہا جو حملہ دین کو ہمارے دلوں سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے کیا گیا تھا، اس کی مدافعت کی۔ یوں اس کے علماء کی کوششیں ایک حصار بن گئیں۔ تحریک علی گڑھ نے بزرگان دیوبند کی طرح مشنریوں کا باقاعدہ مقابلہ تو نہیں کیا لیکن مشنریوں کی مخالفت میں وہ ان بزرگوں سے پیچھے بھی نہ رہی۔ کیونکہ سرسید نے تمام عمر مشن اسکولوں اور کالجوں کی مذمت کی۔ ایجوکیشن کمیشن کے سامنے کلکٹر مرادآباد کے روبرو، اسباب غدر بیان کرتے ہوئے غرض کہ ہر جگہ انہوں نے مشن اسکولوں اور مشنری اشاعت مسیحیت کے طریقوں کے متعلق عام مسلمانوں کی ترجمانی بڑی قابلیت اور بے باکی سے کی۔ اس کے علاوہ جہاں بھی انہیں مشن اسکولوں کے مسلمان طلبہ ملتے تو سرسید اسلام کی اہمیت انہیں پوری طرح سمجھاتے۔

البتہ سرسید کی مذہبی تصانیف کا مقصد اشاعت اسلام سے زیادہ مشنریوں کے اسلام وبانی اسلام پر اعتراضات کی

تردید تھا۔اس مقصد کے لئے سرسید نے اسلام کی ایسی ترجمانی کی جس پر عمل، سمجھ اور جدید فلسفے کی رو سے کوئی اعتراض نہ ہو سکے اور جس کے مطابق مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں اپنے عیسائی حاکموں کے ساتھ ربط ضبط رکھنے میں کوئی امر مانع نہ ہو کیونکہ اس دور میں مسلم امت عیسائی حکمرانوں کے ہاتھوں پامال، ان کی نظروں میں مشتبہ اور ناممکن الحصول خواہشات کا شکار تھی۔لیکن سرسید کی تحریک کے بعد اس قابل ہوگئی کہ حالات کا مقابلہ سکے۔تحریک علی گڑھ نے مسلمان قوم کی سیاسیات، ثقافت، ادب اور مذہبی تفکر پر اثرات مرتب کئے۔

اگر سرسید کے ان ارادوں اور منصوبوں سے تحریک علی گڑھ کا مقابلہ کیا جائے جو ابتدا میں سرسید کے دل میں تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ عملی حیثیت سے سرسید کے زریں خواب کی ایک نہایت معمولی سے تعبیر تھی اور کئی ایسی ضروری باتیں تھیں جن کے لئے سرسید دل سے خواہاں تھے لیکن وہ علی گڑھ کو نصیب نہ ہوئیں۔سرسید جس درسگاہ کا خواب دیکھ رہے تھے اس کے متعلق انہوں نے خود کہا تھا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا تاج سر پر۔وہ مغربی علوم کے ساتھ ایمان کامل اور صحیح تربیت کو ضروری سمجھتے تھے لیکن اس میں انہیں پوری کامیابی نہ ہوئی اور علی گڑھ کالج میں کئی ادوار ایسے آئے جب مذہبی نقطۂ نظر سے اس کی شہرت قابل رشک نہ تھی۔اسی طرح سرسید علی گڑھ کو قوم کے عام علمی احیاء کا مرکز بنانا چاہتے تھے لیکن علی گڑھ نے نہ تو کوئی حالی و شبلی پیدا کیا اور نہ کوئی قابل ذکر علمی روایات قائم کیں۔

سرسید کی خواہشوں اور علی گڑھ کی عملی صورت میں فرق اس وجہ سے پیدا ہوا کہ علی گڑھ کا سب سے اہم عملی مقصد ایسے طلبہ کی نشوونما ہو گیا جو فتح مند قوم کے علوم وفنون اور زبان حاصل کر کے ملکی حکومت میں حصہ لے سکیں۔سرسید سمجھتے تھے کہ سرکاری ملازمت کو زندگی کی معراج سمجھ لینے سے قوم کی نجات نہیں ہو سکتی مگر جب سید محمود ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے تو سرسید نے بارہا یہ بات کہی کہ میرا اصلی مقصد جو سید محمود کی تعلیم سے تھا وہ حاصل نہیں ہوا۔سید محمود ملازمت کے صیغے میں چاہے اور کتنی ہی ترقی کریں مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہے، اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں مل سکتی۔اس کے باوجود سرسید نے اپنے بیٹے کو ملازمت قبول کرنے سے نہ روکا بلکہ کالج کے طلبہ کی تربیت بھی ان اصولوں پر گوارا کی جن کی پیروی سے وہ بیشتر سرکاری ملازمت یا زیادہ سے زیادہ عام قومی راہنمائی ہی کے اہل ہو سکتے تھے۔

یوں سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک پست درجے کی شیعیت پسندی پیدا ہوگئی جو نہ صرف طلبہ کی مذہبی ترقی اور روحانی تربیت کے لئے ناسازگار تھی بلکہ جس نے ان کی اصل دنیوی ترقی پر بھی اثر ڈالا۔دنیا میں ترقی کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ہوش وخرد، جسمانی صحت اور کردار۔صحیح کامیابی کے لئے تینوں چیزیں درکار ہیں لیکن کردار کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔اگر عزائم بلند نہ ہوں یا ارادوں کی تکمیل کے لئے شوق، محنت، مستعدی، قربانی، ارادے کی پختگی، ایمان کامل اور طبیعت پر قابو نہ ہو تو قوی ہیکل جثوں اور تیز وطرار دماغوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

سیّد مودودی کے الفاظ کے آئینے میں حقیقت کا انعکاس ملاحظہ کیجئے: میری نظر میں مسلم یونیورسٹی کی دینی و دنیاوی تعلیم بہ حیثیت بالکل وہی ہے کہ آپ ایک شخص کو از سرتا پا غیر مسلم بناتے ہیں پھر اس کی بغل میں دینیات کی چند کتابوں کا ایک بستہ دے دیتے ہیں۔ اگر آپ ان حالات اور اس طرز تعلیم کو بعینہ جاری رکھیں تو اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ فرنگیت اور اسلامیات کی کشمکش زیادہ شدید ہو جائے گی اور ہر طالب علم کا دماغ ایک رزم گاہ بن جائے گا (ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد 1955ء ص 27-28)۔ علی گڑھ میں یہی ہوا۔ حقیقی یا خیالی ضروریات نے مطمح نظر کو محدود کر دیا اور روحانی کمزوری سے کردار پست ہو گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جدید اور باقاعدہ تعلیم کے باوجود نہ صرف مذہبی نقطۂ نظر سے بلکہ دنیوی اور ظاہری کامیابی کے لحاظ سے بھی طلبہ علی گڑھ اس بلندی پر نہ پہنچے، جو علی گڑھ کے قدیم الخیال لیکن روحانی طور پر سر بلند اور کردار کے لحاظ سے پختہ کار بانیوں نے حاصل کی تھی۔ لہٰذا جن لوگوں نے مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم پائی تھی ان میں سرسید، محسن الملک اور وقار الملک جیسے مدبر اور منتظم پیدا ہو گئے۔ جو لوگ انگریزی ادب سے قریب قریب ناواقف تھے اور جن کے لئے تمام مغربی ادب ایک گنج سربستہ تھا، انہوں نے نیچرل شاعری اور ایک جدید ادب کی بنیاد ڈالی اور آب حیات، سخندان فارس، شعروشاعری، مسدس حالی جیسی کتب تصنیف کر لیں لیکن جن روشن خیالوں نے کالج کی عالیشان عمارتوں میں تعلیم حاصل کی تھی بلکہ جن کی رسائی مغرب کے بہترین اساتذہ اور دنیا بھر کے علم و ادب تک تھی وہ کردار کی کمزوی سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں یا اپنے بانیوں کے خیالات اور ان کی عظمت کا کوئی اندازہ کئے بغیر جو باتیں ان کے مخالف کہہ رہے تھے ان ہی کو زیادہ آب و تاب اور رنگ و روغن دے سکیں۔

مادیت اور ظاہریت پسندی کا جو اثر طلبہ پر ہوا وہ ہی علی گڑھ کے اساتذہ پر ہوا۔ علمی زندگی کی ضامن فقط دو چیزیں ہوتی ہیں یا تو قوم کے پاس اس قدر دولت ہو کہ وہ اہل علم اور اصحاب تصنیف کی اس طرح خدمت کر سکے جس طرح مغربی ممالک میں ہوتی ہے یا اہل علم و فن سے اتنی دلچسپی ہو کہ دنیوی معاملات میں وہ قوت لایموت پر اکتفا کر کے اور مادی سر بلندی سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو علم و فن کے لئے وقف کر دیں۔ برصغیر پاک و ہند میں جن لوگوں نے علم و فن میں نام پیدا کیا ان کا عمل دوسرے طریقے پر رہا۔ جب مولانا حالی کے نام حیدر آباد سے سو روپے کی پنشن جاری ہو گئی تو انہوں نے سرکاری ملازمت کو خیر باد کہا اور سمجھ لیا کہ "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہیے۔ علامہ اقبال کی نسبت بھی مشہور ہے کہ جب ان کے پاس مہینے میں بیرسٹری سے ایک محدود رقم جمع ہو جاتی تو پھر وہ کوئی قانونی کام نہ لیتے اور اپنا باقی وقت علوم اسلامی کے مطالعہ، غور و فکر اور تصنیف و تالیف میں گزارتے۔

اس کے برعکس علی گڑھ میں مادیت و ظاہر پسندی کا دور دورہ تھا۔ اساتذہ میں علمی اہلیت اور فنی قابلیت تو ساری تھی لیکن ان کی نگاہیں بلند نہ تھیں۔ وہ قانع ہو کر علمی شوق کی تکمیل، تصنیف و تالیف اور نیک نامی کو حاصل نہ کر سکے بلکہ ان کے نزدیک علم و فن کھانے کمانے کا ذریعہ تھا۔ اس لئے بالعموم یہ ہی خواہش ہوتی کہ علمی زندگی پر مردنی چھا جائے تو کوئی حرج

نہیں لیکن مادی زندگی کی بہار ضرور لوٹی جائے۔ حالانکہ ایسے افراد بھی تھے جو اگر بلند نظری کو کام میں لاتے تو شہرت دوام اور قومی خدمات میں حالی، آزاد، شبلی اور نذیر احمد کو کہیں پیچھے چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا جب خیالات کا رخ پھر گیا اور ہمتیں پست ہو گئیں تو پروفیسروں کی علمی قابلیت، مزاج کی شگفتگی اور نیک ارادوں جیسی خصوصیات بے کار ثابت ہوئیں۔ ان کا وقت عزیز ڈرائنگ روم کی تزئین، خوش معاشی، ضیافت بازی، کلب بازی اور گپ بازی کی نذر ہو گیا۔

سر سید کا خیال تھا کہ علی گڑھ والے ان کے کام کو جاری رکھیں گے وہ اسلامی ہندوستان کی شاندار روایات کے وارث ہوں گے، اسلام اور مسلمانوں پر جو اعتراض ہوتے ہیں ان کا دندان شکن جواب دیں گے لیکن یہاں یہ عالم تھا کہ کسی طرف سے اسلام، مسلمانوں یا علی گڑھ کے خلاف کوئی آواز اٹھے۔ اس پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے علی گڑھ سے نکلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں، مسلمان بادشاہ یا اسلام کے خلاف اعتراضات کے جواب میں کوئی قابل ذکر کتاب علی گڑھ کالج کے بانیوں کی نسل ختم ہو جانے کے بعد علی گڑھ سے شائع نہ ہو سکی۔ نیز علی گڑھ کی شکست کو جس رنگ و روغن اور آب و تاب سے علی گڑھ کے ایک نوخیز طالب علم سجاد نے علی گڑھ میگزین میں بیان کیا تھا، معارف اور الہلال کے فائل اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ سر سید، محسن الملک، وقار الملک کے خیالات کے خلاف جو محکم دلائل سید طفیل احمد منگلوری علی گڑھی اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے بعض دوسرے سرگرم اراکین کی تحریروں میں ملیں گے وہ شاید ہی کہیں اور ہوں گے۔

ہندوستان میں شاندار روایات کا وارث ہونے کا وہ فخر اور تحریک علی گڑھ کے اصولوں کی درستی کا وہ یقین جو سر سید اور علی گڑھ کے دوسرے بانیوں کا طرہ امتیاز تھا، علی گڑھ کی نئی پود میں نہ آیا بلکہ روحانی، ذہنی اور مادی خرابیوں کے باعث خود علی گڑھ میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ قومی اصلاح و ترقی کے لئے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم ہونا چاہیے جس کا بنیادی مقصد اور دستور العمل علی گڑھ کالج سے مختلف ہو۔ چنانچہ سر سید کے خلیفہ ثانی اور علی گڑھ کالج کے سیکرٹری نواب وقار الملک نے 1912ء میں ان مسلمانوں کے واسطے جو سرکاری ملازمتوں کے خواستگار نہیں، ایک جداگانہ جامعہ اسلامیہ کی اسکیم پیش کی۔

وقار الملک کی خواہش تھی کہ یہ نئی یونیورسٹی گورنمنٹ کے اثرات سے آزاد ہو۔ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہو، انگریزی ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل درس رہے، مذہبی تربیت اور کفایت شعاری کو طلبہ کی تعلیم میں خاص اہمیت حاصل ہو۔ جامعہ اسلامیہ کے متعلق انہوں نے جو مفصل مضمون لکھا اسے پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اسکیم اور تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عملی صورت میں کوئی فرق نہیں۔ اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ تحریک جامعہ ملیہ اسلامیہ سر سید کی کوششوں کے خلاف ردعمل نہیں تھا بلکہ درحقیقت سر سید کی دلی خواہشات کی تکمیل تھی۔ کو کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے سیکولر تعلیم کو غلط قرار دیا۔ انگریزی کی بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا۔ صنعت و حرفت کی تعلیم کا اجراء کیا، تحقیق و تفتیش کے میدان روشن کئے یعنی مختلف حیثیتوں میں یہ تحریک ایک کامیاب تجربہ رہا۔

جس حیثیت سے جامعہ کا کردار ذہنی پریشانی کا باعث بنا وہ یہ کہ اس تحریک نے بیک وقت اسلامی اخوت اور متحدہ

قومیت کا راگ الاپا۔ان میں بنیادی تضاد کو آخر دم تک محسوس نہ کیا۔جامعہ کانگریس کے ساتھ اس درجہ منسوب ہوگئی کہ مسلمان اپنی آزاد قومیت کے احساس اور اس کو منوانے کی جدوجہد کے دوران اس تحریک کو اپنا نہیں سکے اور نہ اس کا پیغام ان کے رگ و پے میں اتر سکا۔گویا جہاں علی گڑھ جہاں "اینگلو محمڈن" سپوت پیدا کر رہا تھا وہاں جامعہ ملیہ نیشنلسٹ جنم دے رہی تھی۔ملی و اسلامی نقطہ نظر سے یہ بھی اتنا بڑا حادثہ تھا جتنا کہ علی گڑھ سے پیدا ہونے والے نتائج۔یہ تحریک جامعہ اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ تھا اگر یہ نہ ہوتا تو راستے کی مشکلات اس کے قدم نہ روک سکتیں اور حکومت کی مخالفت بھی اس کے لئے سنگ راہ ثابت نہ ہوتی۔نیز جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی رہتی۔جامعہ ملیہ ہندیہ نہ بنتی۔

اب نظر ڈالتے ہیں تحریک ندوۃ العلماء پر جو بقول مولانا شبلی نعمانی اس غرض سے قائم کی گئی کہ اس میں علوم دنیوی اور علوم دینی کی تعلیم ایک ساتھ دی جائے،اس سے ایسے روشن خیال علماء پیدا ہوں جو دونوں قسم کے علوم کے جامع ہوں،وہ جدید وقدیم گروہوں کے درمیان رابطہ اتحاد کا کام دیں،ان کے پیش نظر اسلام کا وہ مکمل نقشہ ہو جس میں دین و دنیا دونوں جمع کئے گئے ہوں اور جو مکمل عربی درسگاہ ان لوگوں کے لئے مہیا کریں جو اسلام کی قدیم مذہبی اور علمی کوششوں کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں نیز تربیت کی غرض سے جس میں دارالاقامہ کی سہولت موجود ہو جس میں طلبہ شب وروز ایک جگہ رہ کر تربیت حاصل کریں اور قوم کے سامنے اپنے اخلاق ومعاشرت کی عمدہ و پاکیزہ مثال پیش کرسکیں۔

تحریک ندوۃ العلماء قدیم وجدید کے امتزاج کی ایک کوشش ضرور تھی لیکن اس کی بہترین ومناسب ترین کوشش نہ بن سکی۔اگر ندوہ کے ان ناقدین سے اتفاق نہ بھی کیا جائے جو یہ کہتے ہیں کہ ندوہ کی مثال آدھا تیتر اور آدھا بٹیر،جو تیتر رہا نہ بٹیر،پھر بھی اس سے انکار مشکل ہے کہ جس نوعیت کی تخلیقی و انقلابی جدوجہد کی ضرورت تھی وہ ندوہ نہ کرسکا۔ندوہ کی پوری تاریخ میں انقلاب کی بجائے ایک سکونی کیفیت ہے۔ندوہ کی تعلیم میں یہ بات بھی پوری طرح ملحوظ نہ رہی کہ اس کے تیار کردہ افراد زندگی کے ایک شعبے میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں نفوذ کرسکیں گے۔ندوہ نے کچھ علماء و معلم تو ضرور دیئے لیکن ایسے افراد تیار نہ کئے جو زندگی کے ہر میدان میں اپنا مقام پیدا کرسکیں۔5 جنوری 1941ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے سید مودودی نے اس تعلیمی ادارے کی اسکیم کو یوں بیان کیا تھا:

لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہوگیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے جدید زمانہ کے بعض علوم اس میں شامل نہیں۔اس لئے اصلاح کی ساری بحث اس حد تک محدود ہوکر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے دوسری کتابوں کو داخل کردیا جائے اور بہت زیادہ روشن خیالی پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی پڑھا کر نکالو تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہوجائے۔اس سے زیادہ فائدہ اگر کچھ ہوسکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب قسم کے مولوی پیدا ہوجائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کرنے لگیں۔اس ذرا سی اصلاح کا نتیجہ یہ بھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت وقیادت کی باگیں علماء اسلام کے ہاتھ میں آجائیں۔(سید مودودی،تعلیمات،ص 66-67)

سیّد مودودی کے نزدیک اس تعلیم کا متوقع ما حاصل بس یہ تھا کہ: آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی، بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔ امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔ مختصراً یہ کہ قدیم و جدید کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ندوہ نے روشنی کی ایک ننھی منی شمع روشن کی جو ان مہیب تاریکیوں کا منہ تو نہ چیر سکی لیکن اس نے ان کے خلاف کچھ لمعات احتجاج کو ضرور وجود بخشا۔

علاوہ ازیں ان تحاریک کے پنجاب، سندھ اور سرحد کی تعلیمی تحریکوں میں سے مقالے کے باب نہم میں انجمن حمایت اسلام لاہور، سندھ مدرسۃ الاسلام سندھ اور اسلامیہ کالج پشاور پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ ان تمام تعلیمی تحریکوں نے قدرے اسلامی ماحول میں جدید علوم سے اپنے اپنے صوبے کو بہرہ ور کیا۔ ان تحاریک نے قیام پاکستان کی تحریک میں بھرپور کردار ادا کئے۔

آخر میں تحریک دارالاسلام پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ تحریک برطانوی عہد کے اخیر یعنی 1938ء میں وجود میں آئی۔ سیّد مودودی جو کہ ترجمان القرآن کے ذریعے دعوت کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ انہیں دعوت کا کام شروع کئے ہوئے تقریباً تین سال کا عرصہ گزرا تھا کہ علامہ اقبال کی نظر انتخاب ان پر پڑی۔ علامہ دراصل فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کو اس دور کی ضرورت قرار دیتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں فکرمند تھے۔ اس حالت میں قدرت چوہدری نیاز علی خان کو ان کے در پر لے آئی جو محکمہ انہار کے ایک ریٹائر افسر ہونے کے ساتھ ساتھ دردمند مسلمان بھی تھے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے بقایا ایام زندگی اور محدود وسائل کو خدمت دین میں صرف کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ علامہ سے مشورہ کے بعد چوہدری نیاز علی نے اپنی ساٹھ ایکڑ زمین اس ادارے کے لئے وقف کر دی جس کے متعلق علامہ نے 5 اگست 1937ء کو شیخ الازہر مصطفیٰ مراغی کے نام ایک خط میں لکھا تھا:

ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگی دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصارت تامہ رکھتا ہو نیز انقلاب دور حاضر سے بھی واقف ہو، مقرر کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی روح سے واقف کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تا کہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدن اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔ لہٰذا میری تمنا ہے کہ آپ ازراہ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں تا کہ یہ شخص ہمیں اس کام میں مدد دے سکے۔ (ابوراشد فاروقی، 1977ء، ص 15)

چوہدری نیاز علی نے اندرون ملک مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، عبیداللہ سندھی، عبداللہ یوسف علی، علامہ محمد اسد سے رابطے کئے لیکن قدرت نے قرعہ فال سید مودودی کے حق میں نکالا۔ چنانچہ علامہ اقبال اور چوہدری نیاز علی

کی گفتگو کے حوالے سے سید نذیر نیازی نے علامہ کی طرف سے سید مودودی کو پٹھانکوٹ کے مجوزہ ادارہ میں تشریف لانے کی دعوت دی۔مختصر یہ کہ سید مودودی حیدرآباد دکن سے تمام کشتیاں جلا کر علامہ کے فرمان کے مطابق 18 مارچ 1938ء کو پٹھان کوٹ آئے۔ادارے کی سربراہی سنبھالی۔اس کا دستورالعمل تیار کیا۔تحریک کے مرکز۔دارالاسلام کی بستی کے لئے بھی قواعد وضوابط مرتب کئے۔تحریک دارالاسلام نے گھر کو اصلاح کا ابتدائی یونٹ تجویز کیا۔جمال پور بستی کی مسجد کو جامع مسجد کا درجہ دیا گیا۔تربیتی لائحہ عمل اور دستورالعمل کے مطابق کام بھی شروع ہو گیا۔درمیان میں (سید مودودی اور چوہدری نیاز علی کے مابین) کشیدگی بھی رونما ہوئی مگر تحریک جاری رہی۔

تا آنکہ تقسیم ہند کا وقت آ پہنچا۔اس تحریک کا طریقہ کار دوسری تحریکوں سے ذرا مختلف نوعیت کا تھا۔باقی تحاریک نے ادارے قائم کئے لیکن اس تحریک نے علامہ اقبال کے فرمودات کے مطابق علوم جدیدہ کے فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے ماہرین کو مدعو کیا۔گرمیوں کی چھٹیوں میں کالج کے مسلمان طلبہ کو مذہبی اخلاقی ماحول میں آ کر تربیت حاصل کرنے کے مواقع بھی فراہم کئے گئے۔خطبات جمعہ کا اہتمام کیا گیا۔آئمہ مساجد کی تربیت گاہ بنائی گئی۔طلبہ میں تقریر وتحریر کی مشق اور دیہات میں تبلیغ کا انتظام کیا گیا۔بلکہ چھوٹے پیانے پر صنعت وحرفت سکھانے کا بندوبست بھی کیا گیا تا کہ وہ باعزت روزی کما سکیں۔یہ اسی تحریک کا ثمرہ تھا کہ سیاسی کردار نبھانے کے لئے ایک اسلامی جماعت کی بنیاد رکھی گئی۔جو تقسیم ہند کے بعد ملک پاکستان کی ایک بڑی جماعت ہے۔جس نے 1956ء سے ہی اسلامی دستور بنا کر پیش کر دیا۔

اگرچہ یہ تحریک تقسیم ہند کے قریبی عرصہ میں ابھری مگر تقسیم ہند اس پر اثر انداز نہ ہوئی۔اصلاح معاشرہ،تربیت افراد اور دین اسلام کی اشاعت وترویج کا کام تاہنوز جاری وساری ہے۔

11.4 نتائج

انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی وجہالت سے نہیں،علم اور روشنی سے کیا ہے۔تخلیق آدم کے بعد خالق نے انسان اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اشیاء ہی ہے اور علم ہی وہ قوت ہے جس کی بناء پر کائنات کی دوسری تمام مخلوقات پر انسان کو فوقیت حاصل ہے۔علم کا صحیح تصور یہ ہے کہ اس کا حقیقی سرچشمہ رب السمٰوت والارض کی ذات ہے۔حقیقت اشیاء اور ہدایت وضلالت کا علم اسی کا دیا ہوا۔حواس اور عقل وتجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ سرچشمہ علم ہے نیز یہ کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں مقاصد حیات سے بھی ہے اور یہی زیادہ اہم ہے اس سے اسلامی تعلیم کا جو مزاج تشکیل پاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں غلبہ دین کی تعلیم،رب کی معرفت اور الہامی اصول ہدایت کی روشنی میں فرد اور تمدن کی صورت گری کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔اسلام نے تعلیم کو بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت نہیں بلکہ تمام انسانوں کی اولین وبنیادی ضرورت قرار دیا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں اسلام کی دعوت، دور رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں پہنچ چکی تھی۔ پھر بنو امیہ کے عہد میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ اور اس کا ملحقہ علاقہ فتح ہوا۔ اسلامی سلطنت قائم ہوئی۔ اسلامی تعلیم کا آغاز اسی زمانے سے ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم اٹھارویں صدی کے یورپ کے تعلیمی نظام سے کہیں ترقی یافتہ تھا۔ اشاعت تعلیم، لازمی تعلیم، نفع بخش علم کا حصول، تعمیر کردار، پاکیزہ تعلیمی ماحول، طالب علم کی نفسیاتی ضرورتوں کا لحاظ، معلم اور متعلم دونوں کی عزت نفس کا لحاظ، کام کی عظمت کی تعلیم، شخصیت کی مکمل نشوونما، تعلیم کی غرض وغایت، علم کا ذوق وشوق اور مفت تعلیم جیسی خصوصیات سے مالا مال اس نظام تعلیم پر انگریزوں نے صرف یہ ہی ظلم نہیں کیا کہ اس پر ایک اجنبی نظام مسلط کر دیا بلکہ ان کا ایک نہایت گھناؤنا جرم یہ بھی تھا کہ انہوں نے اس وسیع وترقی یافتہ نظام کو ختم کر دیا۔

اس پورے دور پر نظر ڈالنے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ انفرادی زندگی میں اسلام کے تقاضوں کا شعور پیدا ہوا۔ لہٰذا جتنی بھی تعلیمی تحریکیں (دیوبند، علی گڑھ، ندوۃ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دارالاسلام) وجود میں آئیں ان کی فکری بنیادوں میں اسلامی نظام تعلیم کے تمام عناصر یعنی مقاصد تعلیم، نصاب تعلیم، حکمت تدریس، تربیت اساتذہ، ماحول، انتظامیات اور امتحانات وغیرہ موجود تھے۔ ملکی اور اجتماعی زندگی میں مذہبی تحاریک کو فروغ حاصل ہوا۔ علماء کی قیادت میں پوری قومی زندگی کی تنظیم بہتر ہوئی۔ دینی لٹریچر تیار ہوا نیز مذہبی جذبات کو عام فروغ حاصل ہوا۔ اس مذہبی احیاء اور اعتماد کی بحالی کے دور میں مولانا حالی کی مسدس نے مسلمانوں کے لہو کو گرمایا۔ شبلی نے نہ صرف مسلمانوں کا سیرت النبیؐ سے تعلق قائم کیا بلکہ جدید تعلیمی پالیسی پر نکتہ چینی کی اور مسلمانوں کو علی گڑھ کی عام پالیسی کے برعکس سیاسی تحریکات میں شرکت پر راغب کیا۔ مولانا ثناء اللہ نے عیسائیت، آریہ سماجی اور دوسری اسلام دشمن ہندو تحریکوں نیز قادیانیت کے خلاف قلمی ولسانی جہاد کیا۔ شیخ الہند نے انگریزی استعمار کے خلاف بین الاسلامی خطوط پر جدوجہد کا آغاز کیا۔ مولانا محمد علی، علی گڑھ تحریک کی نوجوان نسل کا نمائندہ ردعمل تھے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی شاعری کے ذریعے علی گڑھ کی فکر اور اس کی پیدا کردہ خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اسلامی قیادت کا پرچم بلند کیا، علماء کو جھنجھوڑا کہ ان کا اصل مقام امت کی قیادت ہے فروعات پر معرکہ آرائی نہیں۔ انہوں نے جدید تعلیم کی پیدا کردہ مرعوبیت کے خلاف بلند آہنگی سے آواز اٹھائی۔ علامہ اقبال کی شاعری اور افکار مسلمانوں کے نئے دور کے پیامبر تھے۔ انہوں نے مغربی افکار اور تہذیب وتمدن پر تنقید کی۔ اجتماعی وملی نظام کو واضح کیا اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کو سحر فرنگی سے آزاد کرنے کی جدوجہد کی۔ علامہ نے ہی سید مودودی کو فقہ اسلامی کی تشکیل نو کا کام سونپا جس کے لئے سید مودودی نے تحریک دارالاسلام کی بنیاد ڈالی۔ سید مودودی نے نظام تعلیم پر واشگاف تنقید کی۔ انہوں نے اپنی تصنیف ''تعلیمات'' میں لکھا: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت کے لئے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لئے نہیں بلکہ

غارت گری کے لئے تیار کرتا ہے۔(ابوالاعلیٰ مودودی،سید 1955ء،ص 62)

2۔ اس زمانے میں مغربی تہذیب اور اس کی نقالی پر تنبیہ کا رجحان مضبوط ہوا۔وہ مرعوبیت جواب تک ذہنوں پر مسلط تھی کچھ کم ہوئی۔مغرب کے خلاف سیاسی اور تہذیبی و تمدنی میدانوں میں جذبہ رونما ہوا۔اندھی تقلید کی روایت کو ایک دھچکا لگا۔

3۔ اس کے ساتھ ساتھ قومی نقطہ نظر پیدا ہونا شروع ہوا۔دوسروں سے موازنہ اور اپنی تاریخ،اپنے قائدین،مفکرین اور اپنے شعراء کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔

4۔ قومی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں ذہنی انتشار نظر آتا ہے۔اسلام کا معیار اقدار بالکل نکھر کر قوم کے سامنے نہیں آیا۔

5۔ ہمہ گیر حرکت تو بہت نظر آتی ہے فرضی تنظیم بندی بھی ملتی ہے لیکن مستقل بنیادوں پر مسلمانوں کو اسلامی اصول تنظیم کے مطابق جمع نہیں کیا گیا۔ان کی ایسی تنظیم بندی نہیں ہوئی جس کے ذریعے ان کی صلاحیتیں ایک مثبت دعوت پر جمع ہو جاتیں۔ان کی ترقی اور تربیت کا مناسب انتظام ہو سکتا۔

6۔ مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی باہم کشمکش اور ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش نے سب کو بدنام کیا اور آہستہ آہستہ عام بے اعتمادی کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔اندرونی کمزوریوں اور بیرونی اثرات پر یہ دور ختم ہوا۔اس کے بعد 1925ء تا 1941ء تاریک دور شروع ہوا۔

7۔ سرسید نے جو تحریک شروع کی اس کے کئی پہلو تھے،تعلیمی،مذہبی،معاشرتی،سیاسی اور ادبی۔اس تحریک کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیادی خرابی یہ تھی کہ سرسید نے اسلام کو معیار بنا کر کام نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس قدم قدم پر اسلام کی قطع و برید کی گئی۔اس وقت اگر سرسید،ان کے ساتھی اور ان کے جانشین انگریزوں،مغربی تہذیب اور مادیت سے پستی کی حد تک مرعوب نہ ہوتے بلکہ اپنے ذہن و دماغ سے آزادانہ سوچتے تو وہ ایسا نظام تعلیم و تربیت قائم کر سکتے تھے نیز ایسا نصاب تشکیل دے سکتے تھے جس سے ہمیں اپنے تصور دینی،تصور اخلاق،فلسفہ زندگی اور تہذیبی تمدنی اقدار سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑتے اور ہماری انفرادی،اجتماعی،تہذیبی و فکری بنیادیں بھی متزلزل نہ ہو پاتیں اور جو مثبت فوائد حاصل کئے گئے ان سے بھی ہم دامن بھر لیتے۔یہ سودا بلاشبہ ہم نے بہت مہنگا کیا۔اتنا مہنگا کہ تقریباً ڈیڑھ صدی گزر جانے کے بعد بھی ہم اس خسارے سے نجات حاصل نہیں کر سکے۔

8۔ سرسید نے تو اپنی کشتی مغربی تہذیب و فکر کے بہاؤ پر ڈال دی مگر علماء نے اس کے برعکس رویہ اختیار کیا۔انہوں نے معاملات دنیا سے کٹ کر مدرسوں اور خانقاہوں کو اپنی توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بنا لیا۔اس رویے نے علماء کے ہاتھوں سے سیاسی و اجتماعی قیادت چھیننے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

9۔ جب ایک عرصے بعد علماء نے ملت کے معاملات و مسائل اور ملک کی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو دوسری

انتہا کو پہنچ گئے یعنی کانگریس کی تحریک اور مقاصد کا گہرا جائزہ لئے بغیر اس کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا جس سے ان کی سرگرمیوں کا رخ بھی بدل گیا مگر اس سارے عرصے میں جو کام انہوں نے نہیں کیا وہ یہ تھا کہ ملت اسلامیہ کے حال کے وسیع تناظر میں اس کے مستقبل کے بارے میں نہ سوچا۔ حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ علماء اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ اس حیثیت کو سمجھتے کہ مسلمان امت وسط ہیں۔ وہ نوع انسان کے سامنے حق کی شہادت اور اللہ کے دین کی دعوت دینے والے ہیں۔ مسلمانوں کی اس حیثیت اور مقام کو اگر وہ بحال کر دیتے تو بھٹکی ہوئی مخلوق خدا اسلام کی آغوش رحمت میں آ جاتی۔ اس صورت میں وہ اپنا فرض بھی ادا کر سکتے تھے اور ہندو اکثریت کا جو خطرہ مستقبل میں اُمڈتا نظر آ رہا تھا اسے دور بھی کر سکتے تھے۔

حرف آخر

یہ دور تلخ، تباہ کن اور مضر رساں رہا۔ اس لئے کہ نئی تعلیم میں اصل ہدف مسلمان ہی تھا۔ ہمیں اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ انگریز اپنی چال میں کامیاب رہا۔ اس نے محض تعلیم ہی کو تباہ نہیں کیا بلکہ ہماری نئی نسل کے ذہن وفکر کو بھی بگاڑ دیا۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے کبھی بھی نئے نظام سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہمیشہ اس کے خلاف نت نئے انداز سے بغاوت کرتا رہا۔ لیکن یہ کوششیں زیادہ موثر نہ ہو سکیں اور ریاست کی ساری قوتوں کے ساتھ جو تباہ کن انقلاب برپا کیا جا رہا تھا اس کا راستہ نہ روکا جا سکا۔ کچھ تو اس نئے سیلاب میں بہ رضا و رغبت بہہ گئے اور کچھ مجبوراً۔ لیکن اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس وقت بھی ہمیں جو تعلیمی مسئلہ درپیش ہے وہ دراصل اسی تاریخی صورت حال کا پیدا کردہ ہے۔

ہم ایک ایسے نظام میں گھرے ہوئے ہیں جو ہماری تاریخ، مذہب، ملکی ضروریات، ادب، روایات غرض ہر ایک کے لئے چیلنج ہے۔ ساری زبانیں اس کے خلاف نوحہ کناں ہیں لیکن جو ذہن خود اس نظام کا پیدا کردہ ہے وہ مستقبل کی شاہراہ کے نشانات دیکھنے سے معذور ہے۔ ہمارا اصل مسئلہ تعلیمی نظام کے کسی ایک پہلو کی نہیں، پورے نظام کی اصلاح ہے۔ اس کے مقاصد، اصول تنظیم، نصاب، طریقہ تدریس، ماحول، غرض ہر چیز انقلابی تغیر و تبدیلی کا مطالبہ کرتی ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتیں جب تک اس پورے نظام کو از سر نو اسلامی بنیادوں پر استوار نہ کیا جائے۔ ہمیں اس نظام کو مٹانا ہے اور اس کی جگہ بالکل نیا نظام قائم کرنا ہے۔ جب تک تخریب و تعمیر کا یہ عمل بروئے کار نہ آ جائے ہماری ضرورت پوری نہیں ہو سکتی اور تاریخ کے تقاضے تشنہ تکمیل رہیں گے۔ بقول علامہ اقبال

حرارت ہے بلا کی تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی

11.5 سفارشات

تحقیق ہذا کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

1۔ ہم اپنی تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دیں جو نظریہ پاکستان میں راسخ ہوں، اسلامی فکر رکھتے ہوں، اسلامی نظام تعلیم کو جانتے ہوں اور اسے قائم کرنا بھی چاہتے ہوں۔

2۔ اپنے مدارس، کالجوں یا جامعات کے معلمین و معلمات کے انتخاب میں ان کی سیرت و اخلاق اور دینی حالت کو ان کی تعلیمی قابلیت کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اہمیت دیں اور آئندہ کے لئے معلمین کی تربیت میں بھی اسی مقصد کے مطابق اصلاحات کریں۔

3۔ تعلیمی اداروں کا ماحول اسلامی رنگ میں رنگا ہونا چاہیے۔ اساتذہ و تلامذہ کے لباس، وضع قطع، عادات و اطوار کے ساتھ ساتھ تعلیمی ادارے کی سرگرمیاں اسلامی اصولوں پر استوار ہوں۔ اسلامی اقدار، شرم و حیا اور روایات کی سختی سے پابندی کرائی جائے تا کہ اس ماحول سے اسلامی اخلاقیات کی حامل شخصیات تیار ہوں۔

4۔ مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کی تدوین و ترتیب اس طرح کی جائے کہ تمام افراد چاہے وہ ڈاکٹر ہوں یا انجینئر، استاد ہوں یا وکیل، تاجر ہوں یا کسی اور شعبے سے متعلق، اپنے پیشے میں مہارت کے علاوہ اول و آخر صحیح مسلمان ثابت ہوں۔ یعنی ہر تعلیمی سطح پر تشکیل اور تنفیذ نصاب میں تلاوت آیات، تزکیہ اور کتاب حکمت کی تعلیم کو اساسی حیثیت حاصل ہو۔

5۔ نظام تعلیم کو اس طرح مربوط کیا جائے کہ قدیم اور جدید نظام تعلیم کی تفریق ختم ہو جائے۔ اس باہمی ربط کی بنیاد بہر حال اسلام کے ادبی اصول ہونے چاہئیں۔

6۔ تشکیل سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

7۔ ایسا نظام تعلیم قائم کریں جس سے بیک وقت دین و دنیا کے عالم، ماہرین اور ٹیکنوکریٹ تیار ہوں جس سے نکلنے والے بریک کی جگہ نہیں بلکہ امت کی گاڑی کے ڈرائیور کی جگہ سنبھالنے کے قابل ہوں۔

8۔ مختلف مضامین کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ اسلامی تہذیب کا احیاء ہو سکے نیز اسلامی نظریات کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔

9۔ ہر سطح کے نصاب میں عربی زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے تا کہ طلبا اسلام کی اصل روح کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ مجموعی طور پر ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ سطح کے نصابات میں اسلامی تعلیمات کی ترویج کے حوالے سے مسلم مفکرین کے افکار خصوصاً سید مودودی کی کتاب ''تعلیمات'' کو پیش نظر رکھیں۔

10۔ جہاں تک انگریزی زبان کی تعلیم کا تعلق ہے تو جدید علوم کے حصول کے لئے اس کی ضرورت و اہمیت کا کوئی شخص

بھی انصاف کے ساتھ انکار نہیں کرسکتا لیکن اسے ذریعہ تعلیم نہیں ہونا چاہیے۔ ذریعہ تعلیم اپنی قومی زبان ہی ہو نیز اگر قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے میں کوئی مشکل حائل ہو تو اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ انگریزی کو ایک اہم زبان کی حیثیت سے شامل نصاب ضرور رکھنا چاہیے اور جو طلبہ سائنس و دوسرے جدید علوم حاصل کرنا چاہئیں ان کے لئے زبان کو سیکھنا لازم بھی کیا جاسکتا ہے مگر اسے ذریعہ تعلیم بنائے رکھنا ترقی علوم کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

11۔ تعلیم حاصل کرنا مرد، عورت دونوں کے لئے ضروری ہے لہٰذا جہاں تک اور جس نوعیت کی تعلیم مردوں کے لئے ہے اس کا اہتمام عورتوں کے لئے بھی ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ ہمیں اس کی عسکری تعلیم کا بھی بندوبست کرنا چاہیے۔ عورتوں کی تعلیم میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان کی اصل اور فطری ذمہ داری زراعتی فارم، کارخانے اور دفاتر چلانے کی بجائے گھر چلانے اور انسان سازی کی ہے۔ ہمارے نظام کو ان میں ایک ایسی مسلمان قوم وجود میں لانے کی قابلیت پیدا کرنی چاہیے جو دنیا کے سامنے اس فطری نظام زندگی کا عملی مظاہرہ کر سکے جو خود خالق کائنات نے بنی نوع انسان کے لئے مقرر فرمایا ہے۔

12۔ طلبہ پر نظریہ پاکستان جو درحقیقت اسلامی نظریہ حیات کا دوسرا نام ہے، واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

13۔ طلبہ کو عمر کے مطابق ضروری معاشرتی مسائل سے واقفیت بطور لازمی مضمون بہم پہنچانی چاہیے۔

14۔ اخلاق حسنہ، شائستگی، پاکیزگی، ذوق سلیم، وسعت نظر، خودداری، جرات و دلیری، جفاکش اور خود کام کرنے کی صلاحیت جیسے نکات پر مشتمل ایک لازمی مضمون کا اجراء کیا جائے۔

15۔ پرانا مذہبی نظام تعلیم اور موجودہ نظام تعلیم جو انگریز کی رہنمائی میں قائم ہوا، دونوں کو ختم کرکے ان کی جگہ ایک نیا اور ایسا نظام تعلیم بنانا چاہیے جو ان دونوں نظاموں کے نقائص سے پاک ہو، ہماری ضرورتوں کو پورا کرے جو ہمیں ایک مسلمان قوم، ایک آزاد قوم اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔

16۔ طبقاتی تفریق سے پیدا شدہ مختلف تعلیمی نظاموں کو چھوڑ کر مساوی نظام تعلیم تشکیل دیا جائے۔

17۔ نظام امتحانات کی خرابیاں و بدعنوانیاں دور کرکے اسے شفاف بنانا چاہیے۔

18۔ ایسی تعلیم جو ہماری نسلوں کو غیر مسلم بناتی جارہی ہے اس تعلیم میں اتنی ترمیم کردی جائے جس سے ارتداد و بے دینی کے سیلاب کا انسداد ممکن ہو سکے۔ اس کے لئے مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے "نظام تعلیم کی وحدت کا نظریہ" پیش کیا ہے۔ اس تعلیمی خاکے میں ہر بات کا تفصیلی جواب موجود ہے۔ اس سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

19۔ طلبہ کو یہ باور کرانا چاہیے کہ وہ علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے تعمیری پہلوؤں میں یورپ کے استاد و رہنما رہے ہیں اور یورپ نے ان ہی کے دکھائے ہوئے راستوں پر چل کر آج کے نئے علم اور ترقی کی منزل پائی ہے۔ اس لئے نئی سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنانا گویا اپنے ہی سرمائے کی بازیافت بضاعتنا ردت الینا کی مصداق اور حکم الٰہی و اعدوالھم مااستطعتم من قوۃ کی تعمیل و تکمیل ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس نکتہ کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست
اصل او جز لذت ایجاد نیست

20۔ مندرجہ بالا سفارشات کی تفصیلات و جزئیات کے لئے سید مودودی کے اصلاح تعلیم کے مقالہ جات اور مختلف کتب سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

21۔ سید مودودی کے علاوہ جن ماہرین تعلیم کے کام سے استفادہ کیا جاسکتا ہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔ڈاکٹر ضیاءالدین احمد سابق وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی، ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی (امریکہ)، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صدر شعبہ اسلامک تھاٹ اینڈ سویلائزیشن یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور، عبدالرشید ارشد جوہر آباد، ڈاکٹر انجم رحمانی لاہور۔

22۔ افراد کے علاوہ جن اداروں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے وہ ہیں۔ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد۔پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد۔ادارہ معارف اسلامی، منصورہ لاہور۔

23۔ ہمیں آئندہ نسلوں کا مستقبل تابناک بنانے کے لئے اسلامی نظام تعلیم کو اپنانے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کی غلامی کا طوق گلے سے اتارنا چاہیے۔بقول علامہ اقبال:

یاد عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے مستقبل کی تفسیر ہے

کتاب نامہ

(الف) عربی

1- القرآن،سورۃ البقرۃ۔آیت نمبر 83-155-201-247-

2- القرآن،سورۃ آل عمران۔آیت نمبر 18-155-159-164-186-214

3- القرآن،سورۃ النساء۔آیت نمبر 34-

4- القرآن،سورۃ المائدۃ۔آیت نمبر 67-

5- القرآن،سورۃ الانعام۔آیت نمبر 130-131-161-

6- القرآن،سورۃ الاعراف۔آیت نمبر 7-8-42-179-

7- القرآن،سورۃ الانفال۔آیت نمبر 60-

8- القرآن،سورۃ ھود۔آیت نمبر 2-

9- القرآن،سورۃ الرعد۔آیت نمبر 18-

10- القرآن،سورۃ الحجر۔آیت نمبر 88-

11- القرآن،سورۃ النحل۔آیت نمبر 1-125-

12- القرآن،سورۃ بنی اسرائیل۔آیت نمبر 13-14-36-

13- القرآن،سورۃ الکھف۔آیت نمبر 49-103-

14- القرآن،سورۃ الانبیاء۔آیت نمبر 47-

15- القرآن،سورۃ العنکبوت۔آیت نمبر 46-49-

16- القرآن،سورۃ الروم۔آیت نمبر 30-

17- القرآن،سورۃ لقمان۔آیت نمبر 32-

18- القرآن،سورۃ فاطر۔آیت نمبر 45-

19- القرآن،سورۃ یٰس۔آیت نمبر 21-

20- القرآن،سورۃ الزمر۔آیت نمبر 9-

21- القرآن،سورۃ حٰم السجدۃ۔آیت نمبر 19-20-

22- القرآن،سورۃ الشوریٰ۔آیت نمبر 48-

23- القرآن،سورۃ محمد۔آیت نمبر 31-

24۔ القرآن،سورۃ ق۔ آیت نمبر 16۔17۔45۔

25۔ القرآن،سورۃ الجمعۃ۔ آیت نمبر 2۔

26۔ القرآن،سورۃ الانفطار۔ آیت نمبر 1۔4۔

27۔ القرآن،سورۃ الغاشیۃ۔ آیت نمبر 22۔

28۔ القرآن،سورۃ العلق۔ آیت نمبر 1۔5۔

29۔ ابن قیم الجوزیۃ ۔(2006ء)۔زاد المعاد فی ھدی خیر العباد۔ بیروت:الکتاب العربی۔

30۔ ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی ۔(س ن)۔سنن الدارمی جز اوّل۔ ملتان:نشر السنۃ۔

31۔ ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی ۔(س ن)۔سنن الدارمی جز ثانی۔ ملتان:نشر السنۃ۔

32۔ اسماعیل بن محمد بن الھادی۔(2001ء)۔کشف الخفاء و مزیل الالباس جلد اوّل۔ بیروت: دار الکتب العلمیۃ ۔

33۔ البلاذری،ابو العباس احمد۔(1866ء)۔فتوح البلدان۔لیڈن۔

34۔ امام ابی حسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیر ی النیسابوری۔(1998ء)۔صحیح مسلم۔ الریاض: دار السلام۔

35۔ امام ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری الجعفی ۔(1999ء)۔صحیح البخاری۔الریاض:دار السلام۔

36۔ امام احمد بن حنبل۔(1378ھ)۔المسند۔ بیروت:دار الفکر۔

37۔ امام حافظ ابی عبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی ابن سنان النسائی ۔(1999ء)۔سنن النسائی۔ الریاض: دار السلام۔

38۔ امام حافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید الربعی ابن ماجہ القزوینی ۔(1999ء)۔سنن ابن ماجہ۔ الریاض: دار السلام۔

39۔ امام حافظ ابی داؤد سلیمان بن الاشعث بن اسحاق الازدی السجستانی ۔(1999ء)۔سنن ابی داؤد۔ الریاض: دار السلام۔

40۔ امام حافظ ابی عیسٰی محمد بن عیسٰی بن سورۃ ابن موسیٰ الترمذی۔(1999ء)۔جامع الترمذی۔ الریاض: دار السلام۔

41۔ امام ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب ۔(س ن)۔مشکوٰۃ شریف مترجم جلد اول۔ لاہور: مکتبہ رحمانیہ۔

42۔ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذہبی ۔(1993ء)۔سیرا علام النبلاء، جلد 2 بیروت:مؤسسة الرسالة۔

43۔ عبدالحیٔ ابن العماد ۔(1988ء)۔شذرات الذهب فی اخبار من ذهب، الجز الاوّل۔ بیروت: دارالفکر۔

44۔ عبدالحیٔ الکتانی ۔(2001ء)۔نظام الحکومة النبویه۔ بیروت:دارالکتب العلمیۃ۔

45۔ شمس الحق، عظیم آبادی۔(1414ھ)۔غایة المقصود فی شرح سنن ابی داؤد۔ جلد اول۔ فیصل آباد:حدیث اکادمی۔

46۔ محمد بن سلیمان بن طاہر ۔(2002ء)۔جمع الفوائد جلد اول۔ بیروت:دارالکتب العلمیۃ۔

47۔ محمد بن الغزالی ۔(2001ء الف)۔احیاء العلوم فی الدین، جلد اول۔ بیروت:دارالکتب العلمیہ۔

48۔ محمد بن الغزالی ۔(2001ء ب)۔احیاء العلوم فی الدین، جلد دوم۔ بیروت:دارالکتب العلمیہ۔

49۔ ولی الدین ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی۔(1350ھ)۔مشکوٰة المصابیح۔ دہلی:اصح مطابع۔

50۔ ولی اللہ، شاہ۔(1887ء)۔العقیدة الحسنه۔ آگرہ۔

(ب)۔فارسی

51۔ شاہنواز، خان ۔(1888ء)۔مآثر الامراء کلکتہ۔

52۔ عبدالعزیز، دہلوی شاہ۔(1904ء)۔فتاوٰی عزیزیه جلد اول۔ دہلی۔

53۔ غلام حسین، طباطبائی ۔(1276ھ)۔سیرالمتاخرین۔ لکھنؤ۔

54۔ ولی اللہ، شاہ۔(1897ء)۔الجزء اللطیف۔ دہلی۔

(ج)۔اردو

حوالہ جاتی کتب

55۔ پنجاب یونیورسٹی ۔(1971ء)۔تاریخ ادبیات مسلمانان ہندو پاکستان، جلد سوم۔ لاہور۔

56۔ دانش گاہ پنجاب ۔(1982ء)۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد 2/14۔ لاہور: پنجاب یونیورسٹی۔

57۔ دانش گاہ پنجاب۔(1980ء)۔اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد3۔لاہور: پنجاب یونیورسٹی۔

58۔ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ۔(1987ء)۔اردو جامع انسائیکلوپیڈیا جلد اول۔لاہور۔

59۔ فیروز سنز۔(2005ء)۔اردو انسائیکلوپیڈیا، چوتھا ایڈیشن۔لاہور۔

60۔ قاسم محمود، سید۔(1998ء)۔انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا۔کراچی: شاہکار بک فاؤنڈیشن۔

متفرق کتب

61۔ آباد شاہ پوری۔(1989ء)۔تاریخ جماعت اسلامی حصہ اول۔لاہور: ادارہ معارف اسلامی۔

62۔ ________ (1998ء)۔تاریخ جماعت اسلامی حصہ دوم۔لاہور: ادارہ معارف اسلامی۔

63۔ ابوالآفاق، ایم۔اے۔(1971ء)۔سید ابوالاعلیٰ مودودی۔سوانح، افکار، تحریک۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

64۔ ابوالاعلیٰ مودودی، سید۔(فروری1946ء)۔تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ اول۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔

65۔ ________ (1955ء)۔تعلیمات۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

66۔ ________ (1964ء)۔تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ اول۔لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

67۔ ________ (1981ء الف)۔تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم۔لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

68۔ ________ (1985ء الف)۔تنقیحات۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

69۔ ________ (1987ء)۔اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

70۔ ________ (1989ء)۔تنقیحات۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔

71۔ ________ (1993ء)۔تنقیحات۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔(دیگر اشاعت2004ء)

72۔ ________ (1999ء)۔معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز۔نظام تعلیم کی اساسی تشکیل جدید، تقاریر کل پاکستان تعلیمی کانفرنس دسمبر 1978ء۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان۔

73۔ _______ (2006ء)۔اسلامی نظام تعلیم اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر،تعلیمات۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

74۔ _______ (2008ء)۔اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصور۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

75۔ ابو طارق۔(س ن)۔مولانا مودودی کے انٹرویو۔لاہور:اسلامک پبلی کیشنز۔

76۔ ابوظفر ندوی سیّد۔(1947ء)۔تاریخ سندھ۔اعظم گڑھ۔

77۔ ابوالحسن ندوی سیّد۔(س ن)۔بصائر۔کراچی: مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد۔

78۔ _______ (1976ء)۔خطبہ استقبالیہ، روداد چمن، مرتبہ محمد الحسنی۔لکھنؤ: مکتبہ دارالسلام، ندوۃ العلماء۔

79۔ _______ (1984ء)۔پرانے چراغ حصہ اول۔کراچی: مجلس نشریات اسلام، 1۔کے۔3 ناظم آباد نمبر 1۔

80۔ ابوراشد، فاروقی۔(1977ء)۔اقبال اور مودودی۔لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت۔

81۔ احمد خان، سیّد سر۔(س ن)۔سرسید کے مضامین، تہذیب الاخلاق جلد دوم۔لاہور: کشمیری بازار۔

82۔ _______ (1949ء)۔ہنٹر پر ہنٹر۔لاہور: اقبال اکیڈمی۔

83۔ _______ (1955ء)۔رسالہ بغاوت ہند، مرتبہ محمود حسین۔کراچی/علی گڑھ: یونیورسٹی پبلشرز۔

84۔ _______ (1959ء الف)۔مقالات سرسیّد حصہ پانزدھم، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔لاہور: مجلس ترقی ادب۔

85۔ _______ (1959ء ب)۔مقالات سرسیّد حصہ شانزدھم، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔لاہور: مجلس ترقی ادب۔

86۔ _______ (1960ء)۔حالات و افکار، از عبدالحق۔دہلی: اردو مرکز۔

87۔ _______ (1961ء)۔مسافران لندن۔لاہور: مجلس ترقی ادب۔

88۔ _______ (1962ء الف)۔مقالات سرسیّد جلد چہارم، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی۔لاہور: مجلس ترقی ادب۔

89۔ _______ (1962ء ب)مقالات سرسیّد، جلد 6۔لاہور: مجلس ترقی ادب۔

90۔ احمد سعید۔(1986ء)۔انجمن اسلامیہ امرتسر۔ تعلیمی و سیاسی خدمات۔ لاہور: دانشگاہ پنجاب۔

91۔ احمد شلبی، ڈاکٹر۔(2004ء)۔مسلمانوں کا نظام تعلیم، مترجم ادریس صدیقی۔لاہور۔بک ہوم۔

92۔ احمد مرتضیٰ۔(1934ء)۔صولت شیر شاہی۔علی گڑھ۔

93۔ احمد میاں اختر، جونا گڑھی، قاضی۔(1996ء)۔سرسید کا علمی کارنامہ۔کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

94۔ اختر الواسع۔(1985ء)۔سرسیّد کی تعلیمی تحریک۔نئی دہلی: مکتبہ، جامعہ لمیٹڈ۔

95۔ اختر حجازی۔(1995ء)۔دار الاسلام، مرتب۔لاہور: ادارہ ترجمان القرآن۔

96۔ اخلاص حسین، زبیری۔(1965ء)۔عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی، مترجم۔کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

97۔ اسعد، گیلانی سیّد۔(1978ء)۔اقبال، دار الاسلام اور مودودی۔لاہور: اسلامی اکادمی۔

98۔ ________ (1992ء)۔جماعت اسلامی 1941ء تا 1947ء لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ۔

99۔ اسماعیل راجی، فاروقی ڈاکٹر۔(1989ء)۔علوم جدید کی اسلامی تشکیل عمومی اصول اور خطوط کار، مترجم پروفیسر سیّد محمد سلیم۔لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان۔

100۔ اشتیاق حسین قریشی۔(1987ء)۔برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، مترجم ہلال احمد زبیری۔کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی۔

101۔ اصغر عباس۔(1975ء)۔سرسیّد کی صحافت، مرتب۔دہلی: انجمن ترقی اردو ہند۔

102۔ اعجاز الحق قدوسی۔(1977ء)۔اقبال اور علمائے ہند۔لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔

103۔ ________ (1984ء)۔تاریخ سندھ جلد سوم۔لاہور: اردو سائنس بورڈ۔

104۔ افضل المطابع۔(1910ء)۔مدرسہ اسلامی عربی دیوبند کا زریں ماضی و مستقبل۔دہلی: افضل المطابع پریس۔

105۔ افضل حسین۔(س ن)۔فن تعلیم و تربیت۔دہلی/لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

106۔ افتخار عالم، سیّد۔(1901ء)۔تاریخ مدرسۃ العلوم علی گڑھ۔آگرہ: مطبع مفید عالم۔

107۔ الطاف حسین، حالی مولانا۔(1903ء)۔حیات جاوید جلد دوم۔آگرہ: مطبع مفید عالم۔

108۔ ________ (1965ء)۔حیات جاوید۔لاہور: نامی پریس۔

109۔ ________ (1984ء)۔حیات جاوید حصہ اول۔لاہور: ہجر پبلشرز۔

110۔ الطاف علی، بریلوی سیّد۔(1969ء)۔چند محسن، چند دوست۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

111- ______ (1973ء)۔مقالات بریلوی۔ کراچی:اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ،آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔
112- ______ (1994ء) علی گڑھ تحریک۔۔۔پس منظر و پیش منظر،حیات محسن، مرتبہ محمد امین زبیری مارہروی۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔
113- ______ (1995ء)۔تعلیمی مسائل۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔
114- ______ (1982ء)۔دیباچہ،ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔
115- ______ (1994ء) علی گڑھ تحریک۔۔۔پس منظر و پیش منظر،حیات محسن، مرتبہ محمد امین زبیری مارہروی۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔
116- امین زبیری۔(1941ء)۔سیاست ملّیہ۔آگرہ۔
117- انصار زاہد خان۔(1982ء)۔تاریخ تحریک علی گڑھ حصہ دوم۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔
118- ایچ۔بی۔خان۔(1985ء)۔برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار۔ اسلام آباد:قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت۔
119- ایڈورڈ،ولیم۔(1991ء)۔بادشاہ دہلی کے حضور میں انگریزوں کی آخری نذر،ادب،سیاست اور معاشرہ، مرتبہ احمد سلیم۔لاہور: نگارشات۔
120- ایم۔اے۔رزاق۔(1986ء)۔پاکستان کا نظام حکومت اور سیاست۔ کراچی: مکتبہ فریدی۔
121- این۔این۔لا۔(1972ء)۔پاک و ہند میں تعلیمی ترقی، سیّد احسن مارہروی مترجم۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔
122- باری۔(1969ء)۔کمپنی کی حکومت۔لاہور: نیا ادارہ۔
123- بشیر احمد۔(1940ء)۔مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل۔لاہور: ہمایوں 23۔لارنس روڈ۔
124- پیام شاہجہان پوری۔(1970ء)۔تاریخ نظریہ پاکستان۔لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام۔
125- ثروت صولت۔(1979ء)۔مولانا مودودی کی تقاریر حصہ اول۔لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔
126- ثناءالحق صدیقی۔(1986ء)۔مقدمہ،مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں مسلم

ایجوکیشنل کانفرنس کا کردار۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

127۔ جاوید عزیز۔(1975ء)۔سرحد کا آئینی ارتقاء۔ پشاور: ادارہ تحقیق و تصنیف۔

128۔ جاوید قاضی۔(1983ء)۔ہندی مسلم تہذیب۔ لاہور: وین گارڈ بکس۔

129۔ جمیل احمد، خواجہ۔(1974ء)۔انگریز اور مسلمان۔ کراچی: اردو اکیڈمی، سندھ۔

130۔ جواہر لال نہرو۔(1992ء)۔تلاش ہند۔ لاہور: تخلیقات۔

131۔ ______ (2001ء)۔تاریخ عالم پر ایک نظر جلد دوم، مترجم طاہر منصور فاروقی۔ لاہور: تخلیقات۔

132۔ جہانگیر۔(1909ء)۔تزک جہانگیری، مترجم اے۔ راجرس۔ لندن۔

133۔ حافظ اکبر، شاہ بخاری۔(2001ء)۔امام الفقہاء حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، چالیس بڑے مسلمان۔ کراچی: ادارۃ القرآن۔

134۔ حبیب احمد، چوہدری۔(س ن)۔علامہ اقبال، قائداعظم، پرویز، مودودی اور تحریک پاکستان۔ فیصل آباد: گلستان کالونی۔

135۔ حسن ریاض، سید۔(1967ء)۔پاکستان ناگزیر تھا۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی۔

136۔ ______ (1970ء)۔پاکستان ناگزیر تھا۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی۔

137۔ حنیف شاہد۔(1976ء)۔اقبال اور انجمن حمایت اسلام۔ لاہور۔

138۔ حیرت مرزا۔(1895ء)۔حیات طیبہ۔ دہلی۔

139۔ خافی خان نظام الملک۔(1985ء)۔منتخب اللباب۔ کلکتہ: ایشیاٹک سوسائٹی۔

140۔ خالد یار خان۔(1963ء)۔تاریخ التعلیم۔ لاہور: اردو مرکز۔

141۔ خرم جاہ مراد۔(1999ء)۔احیائے اسلام اور معلم۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، 3 بہاول شیر روڈ، مزنگ۔

142۔ خلیق احمد، پروفیسر نظامی۔(1950ء)۔شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ علی گڑھ: شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی۔

143۔ ______ (1958ء)۔سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات۔ دہلی۔

144۔ ______ (1994ء)۔علی گڑھ کی علمی خدمات۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)۔

145۔ خلیق انجم۔(1994ء)حرف آغاز،علی گڑھ کی علمی خدمات۔ نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)۔

146۔ خورشید احمد، پروفیسر۔(1963ء)۔تحریک اسلامی، مرتب۔کراچی: ادارہ چراغ راہ۔

147۔ ______ (1968ء)۔اسلامی نظریہ حیات۔ کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی۔

148۔ ______ (1991ء)۔اسلام کا نظریہ تعلیم۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، 3۔بہاول شیر روڈ، مزنگ۔

149۔ ______ (1999ء)۔نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، 3۔بہاول شیر روڈ، مزنگ۔

150۔ ______ (س ن)۔نظام تعلیم۔نظریہ، روایت، مسائل۔ اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔

151۔ خورشید مصطفیٰ، رضوی۔(1990ء)۔جنگ آزادی 1857ء۔ لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار۔

152۔ خوندکار فضل ربی، منشی۔(1973ء)۔حقیقت مسلمانان بنگالہ، طبع اول 1895ء، طبع ثانی 1973ء۔کراچی: اردو اکیڈمی، سندھ۔

153۔ دفتر اجلاس صد سالہ دارالعلوم دیوبند۔(1981ء)۔دارالعلوم دیوبند کے 117 سال۔ لاہور: ادارہ اسلامیات۔

154۔ ذاکر حسین، ڈاکٹر۔(س ن)۔جامعہ کے پچیس سال۔ دہلی: مکتبہ جامعہ۔

155۔ ذکی احمد، حکیم دہلوی۔(س ن)۔کیا خوب آدمی تھا، حیات اجمل، مرتب محمد عبدالغفار قاضی۔دہلی: حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر۔

156۔ رب نواز، پروفیسر۔(2001ء)۔آنحضور کی تعلیمی جدوجہد۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، 3۔بہاول شیر روڈ، مزنگ۔

157۔ رحمٰن علی طیش، منشی۔(1910ء)۔تواریخ ڈھاکہ۔ انڈیا: ستارہ ہند پریس، بنگال۔

158۔ رحیم بخش شاہین۔(1979ء)۔اوراق گم گشتہ۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔

159۔ رشید احمد، جالندھری ڈاکٹر۔(1989ء)۔ برطانوی ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم، ایک ناقدانہ جائزہ، دارالعلوم دیوبند، جلد اول۔اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن۔

160۔ رشید احمد، پروفیسر صدیقی اور آل احمد سرور، پروفیسر۔(1920ء)۔علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز، مرتب نسیم قریشی۔لکھنؤ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

161۔ رئیس احمد جعفری۔(1950ء)۔سیرت محمد علی۔لاہور: کتاب منزل۔

162۔ ریاست علی ندوی سیّد۔(2003ء)۔اسلامی نظام تعلیم۔لاہور: الفیصل، اردو بازار۔

163۔ سعید احمد رفیق، پروفیسر۔(1962ء)۔مسلمانوں کا نظام تعلیم۔کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔

164۔ ________ (1982ء)۔مسلمانوں کا نظام تعلیم (طبع ثالث)۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

165۔ سعید اختر، پروفیسر۔(1976ء)۔ہمارا نظام تعلیم (الجزء اول) عہدنبویؐ سے ترکان عثمانی کے دور تک۔لاہور: البدر پبلی کیشنز۔

166۔ ________ (1988ء)۔غیرفانی تہذیب۔لاہور: مکتبہ کارواں۔

167۔ ________ (1991ء)۔ہمارا نظام تعلیم۔لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق۔

168۔ سلیمان ندوی، مولانا سیّد۔(1939ء)۔دار العلوم ندوۃ العلماء کا تخیل، نصب العین، نظام تعلیم، دستور العمل اور نصاب۔لکھنؤ: نامی پریس۔

169۔ ________ (س ن)۔حیات شبلی۔اعظم گڑھ: دار المصنفین۔

170۔ ________ (1958ء)۔ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

171۔ سمیع اللہ۔(س ن)۔پاکستان کا تاریخی و مذہبی پس منظر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔

172۔ سمیع اللہ قریشی۔(1981ء)۔قیام پاکستان کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر۔لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

173۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔(1990ء)۔تاریخ مسلمانان پاک و ہند، مغلوں کے زوال سے قیام پاکستان تک۔لاہور: ادارہ معارف اسلامی۔

174۔ شاہد ایس، ایم۔(2003ء)۔اسلامک سسٹم آف ایجوکیشن۔لاہور: مجید بک ڈپو۔

175۔ شاہد حسین رزاقی۔(1963ء)۔سرسیّد اور اصلاح معاشرہ۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔

176۔ شبلی نعمانی، مولانا۔(1932ء جلد سوم)۔مقالات شبلی جلد سوم، با اہتمام مولوی مسعود علی ندوی۔اعظم گڑھ: مطبع معارف۔

177- ________ (1938ء جلد ہفتم)۔مقالات شبلی جلد ہفتم، باہتمام مولوی مسعود علی ندوی۔اعظم گڑھ: مطبع معارف۔

178- ________ (1941ء)۔خطبات شبلی، باہتمام مولوی مسعود علی ندوی۔اعظم گڑھ: معارف پریس۔

179- ________ (1958ء)۔اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر۔لاہور

180- ________ (1989ء جلد دوم)۔مقالات شبلی حصہ دوم۔لاہور: جنرل بائینڈنگ کارپوریشن پریس۔

181- ________ (1989ء جلد سوم)۔مقالات شبلی جلد سوم، مرتب سیّد سلیمان ندوی۔لاہور: جنرل بائنڈ نگ کارپوریشن پریس۔

182- ________ (1989ء جلد ہشتم)۔مقالات شبلی جلد ہشتم، مرتب سیّد سلیمان ندوی۔لاہور: استقلال پریس، مسلم مسجد۔

183- شبیر، بخاری سیّد۔(1986ء)۔میکالے اور برصغیر کا نظام تعلیم۔لاہور: آئینہ ادب۔

184- شفیق الرحمٰن، ہاشمی۔(س ن)۔تعلیم اور تعلیمی نظریات۔لاہور: مکتبہ عالیہ۔

185- شمس الدین محمد۔(1982ء)۔مقدمہ، ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں، از سیّد سلیمان ندوی۔کراچی: اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

186- شمس الرحمٰن محسنی۔(1986ء)۔ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک، جامعہ ملیہ اسلامیہ۔نئی دہلی: مکتبہ جامعہ۔

187- شمس القمر، قاسمی۔(1973ء)۔روداد برصغیر۔لاہور: عزیز پبلی کیشنز۔

188- شہاب الدین، دسنوی۔(1986ء)۔مولانا سیّد سلیمان ندوی اور ندوہ، سیّد سلیمان ندوی، مرتبہ خلیق انجم۔نئی دہلی: انجمن ترقی اردو ہند۔

189- شہباز خان، ڈاکٹر۔(1997ء)۔اسلامی نقطۂ نظر سے تربیت اساتذہ، تربیت اساتذہ، ترتیب وادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد: پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

190- شیر محمد گریوال۔(1989ء)۔اسلامیان ہند کا شاندار ماضی۔لاہور: اسلامک بک سروس۔

191- صباح الدین عبدالرحمٰن، سیّد۔(1963ء)۔ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے۔اعظم گڑھ: معارف پریس۔

192- صفدر محمود، ڈاکٹر۔(1986ء)۔پاکستان مسلم لیگ کا دور حکومت 1947ء 1954ء

لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔

193۔ ________ (1987ء)۔پاکستان: مسلم لیگ کا دورِحکومت۔ لاہور: غالب پبلشرز۔

194۔ ________ (1989ء)۔پاکستان، تاریخ و سیاست (1947ء۔1988ء)۔ لاہور: جنگ پبلشرز۔

195۔ صلاح الدین ناسک۔(س ن)۔تحریک آزادی۔ لاہور: عزیز بک ڈپو۔

196۔ ضیاء الدین احمد، پروفیسر۔(1995ء)۔مفکرین تعلیم۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل پریس۔

197۔ طفیل احمد منگلوری۔(1945ء)۔مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ نئی دہلی: مکتبہ رشیدیہ۔

198۔ ________ (س ن)۔مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ لاہور: حماد الکتبی، شیش محل روڈ۔

199۔ ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر۔(1999ء)۔سیرت طیبہ کا اہم گوشہ دارارقم، تاریخ کے آئینے میں۔ لاہور: جنگ پبلشرز۔

200۔ عابد حسین، ڈاکٹر سیّد۔(1928ء)۔مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ۔ دہلی: مطبع جامعہ ملیہ۔

201۔ ________ (1984ء)۔قومی تہذیب کا مسئلہ۔ نئی دہلی: ترقی اردو بیورو۔

202۔ عبدالباری، پروفیسر۔(س ن)۔ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا زوال۔ لاہور: اردو بازار۔

203۔ عبدالرحمٰن عبد، چوہدری۔(1971ء)۔سیّد ابوالاعلی مودودی۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔

204۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر۔(1977ء)سرگذشت اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔

205۔ عبدالسلام بقدوائی ندوی۔(1976ء)۔ندوۃ العلماء کے پچاسی سال، روداد چمن، مرتب محمد الحسنی۔ لکھنؤ: مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

206۔ عبدالعزیز شرقی سیّد۔(1986ء)۔تذکرہ سیّد مودودی۔ کراچی: ادارہ معارف اسلامی۔

207۔ عبدالغفار مدھولی۔(س ن)۔جامعہ کی کہانی۔ جامعہ نگر: مکتبہ جامعہ۔

208۔ عبداللہ فہد فلاحی۔(1987ء)۔تاریخ دعوت و جہاد، برصغیر کے تناظر میں۔ لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت۔

209۔ عبداللہ یوسف علی۔(س ن)۔انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ کراچی: نفیس اکیڈمی۔

210۔ ________ (1936ء)۔انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ الٰہ آباد، یوپی: ہندوستان اکیڈمی۔

211۔ عبدالحمید، دہلوی مولانا۔(س ن)۔سیرت محبوب کائنات۔ لاہور: کتب خانہ شان اسلام۔

212۔ عبدالحمید صدیقی۔(1965ء)۔مقدمہ،میکالے کا نظریہ تعلیم، اردو ترجمہ۔کراچی: رونیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی۔

213۔ عبدالرشید ارشد، ڈاکٹر۔(1995ء)۔پاکستان میں تعلیم کا ارتقاء لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق۔

214۔ ________ (1995ءالف)۔انقلاب تعلیم، ضرورت و لوازم۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق پاکستان۔

215۔ ________ (1995ءب)۔گم گشتہ منزل کا سراغ۔لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم پاکستان۔

216۔ عبدالرشید، خان پروفیسر۔(1986ء)۔مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا کردار۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

217۔ عبدالرشید، میاں۔(1982ء)۔پاکستان کاپس منظر اور پیش منظر۔ لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب۔

218۔ ________ (1989ء)۔پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر۔ لاہور: ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب۔

219۔ عبدالروف، ڈاکٹر۔(1995ء)۔تصویری تاریخ اسلام۔کراچی: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔

220۔ عبدالروف ظفر، پروفیسر ڈاکٹر۔(2007ء)۔علوم الحدیث۔ فنی، فکری اور تاریخی مطالعہ۔ لاہور: نشریات۔

221۔ عبدالفتاح ابوغدہ۔(س ن)۔حضور اکرمؐ بطور معلم، مترجم مولانا حبیب حسین۔کراچی: درخواستی کتب خانہ۔

222۔ عبدالقادر، بدایونی۔(1869ء)۔منتخب التواریخ جلد دوم۔کلکتہ، اردو ترجمہ لاہور 1966ء۔

223۔ عبدالواحد معینی۔(1963ء)۔مقالات اقبال، مرتب۔لاہور: اشرف پریس۔

224۔ عبدالوحید۔(2004ء)۔مولانا شبلی نعمانی، علمائے دیوبند، مرتب مجاہد الحسینی۔فیصل آباد: سیرت مرکز۔

225۔ عبدالوحید، بٹ۔(س ن)۔انجمن حمایت اسلام۔ایک تحریک، ایک ادارہ۔ لاہور: حمایت اسلام پریس۔

226۔ عبیداللہ، سندھی مولانا۔(1952ء)۔شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔لاہور۔

227۔ عبیداللہ قدسی۔(1981ء)۔اسلام کی انقلابی علمی تحریک۔ اسلام آباد: ادارہ تاریخ و تہذیب و تمدن اسلامی، اسلامیہ یونیورسٹی۔

228۔ عتیق صدیقی۔(س ن)۔سرسیّد احمد خان، ایک سیاسی مطالعہ۔نئی دہلی: مکتبہ جامع۔

229۔ عزیز احمد، پروفیسر۔(1989ء)۔برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔

230۔ عشرت رحمانی۔(س ن)۔حیات جوہر۔لاہور: مقبول اکیڈمی۔

231۔ ________ (س ن)۔اسلامی تہذیب و تمدن۔لاہور: مقبول اکیڈمی۔

232۔ عفیف، شمس سراج۔(1890ء)۔تاریخ فیروز شاہی۔کلکتہ۔

233۔ علم الدین، سالک مولانا۔(2001ء)۔استاد اور شاگرد کا روحانی رشتہ،استاد معمار قوم، ترتیب و ادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد: پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

234۔ علی احمد، چوہدری۔(2001ء)۔نصاب تعلیم۔اسلام آباد: پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

235۔ ________ (2001ء الف)۔عہد نبوی کے تعلیمی نظام کا نصاب،نصاب تعلیم، ترتیب و ادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد: پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

236۔ ________ (2001ء ب)۔عہد رسالت کے تعلیمی نظام کا پرائمری نصاب،اسلامی نظام تعلیم، ترتیب و ادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد: پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

237۔ علی اظہر برلاس، مرزا۔(1984ء)۔اودھ پر انگریزوں کا غاصبانہ قبضہ۔کراچی: اودھ ادبی اکیڈمی۔

238۔ غلام دستگیر رشید۔(1946ء)۔آثار اقبال۔حیدرآباد دکن: سید عبدالرزاق تاجر کتب۔

239۔ غلام رسول مہر۔(1956ء)۔سرگذشت مجاہدین۔لاہور۔

240۔ ________ (1971ء)۔1857ء پاک و ہند کی پہلی جنگ آزادی۔لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔

241۔ غلام عابد خان۔(1978ء)۔عہدنبوی کا نظام تعلیم۔لاہور: عوامی کتب خانہ۔

242۔ غلام مصطفیٰ بسمل۔(س ن)۔عظیم مغلیہ عہد بمعہ دستاویزات۔لاہور: الورنیو بک پیلس۔

243۔ فرمان فتح پوری۔(1990ء)۔تحریک پاکستان اور قائداعظم۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔

244۔ فضل حق، خیرآبادی۔(1957ء)۔الثورة الهندیه، اے۔ایس۔کے شیروانی مرتب۔بجنور۔

245۔ فیاض حسین، سیّد قادری۔(1960ء)۔انجمن حمایت اسلام کا آئین۔لاہور: حمایت اسلام پریس۔

246۔ کمال الدین حیدر۔(1907ء)۔قیصر التواریخ۔لکھنؤ: نول کشور پریس۔

247۔ قاضی جاوید۔(1986ء)۔افکار شاہ ولی اللہ۔لاہور:نگارشات۔

248۔ گل محمد جبر۔(1988ء)۔پاکستان میں پرائمری تعلیم، تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ۔ ملتان:بیکن بکس،گل گشت کالونی۔

249۔ محبوب،رضوی سیّد۔(1950ء)۔دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات۔ دیوبند۔

250۔ ______ (1972ء)۔تاریخ دیوبند۔ دیوبند،یوپی:علمی مرکز۔

251۔ ______ (طبع دوم)۔تاریخ دیوبند۔ دیوبند،یوپی: آزاد پریس۔

252۔ ______ (2005ءالف)۔تاریخ دارالعلوم دیوبند حصہ اول۔لاہور:ادارہ اسلامیات پاکستان۔

253۔ ______ (2005ءب)۔تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم۔لاہور:ادارہ اسلامیات۔

254۔ محسن فانی۔(1843ء)۔دبستان مذاہب، انگریزی ترجمہ ڈی شیا،اے ٹرائر۔پیرس۔

255۔ محمد احمد خان۔(1978ء)۔اقبال اور مسئلہ تعلیم۔ لاہور:اقبال اکادمی پاکستان۔

256۔ محمد اسحاق جلیس،مولانا ندوی۔(2003ء)۔تاریخ ندوۃ العلماء حصہ اول۔لکھنؤ:مجلس صحافت و نشریات، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

257۔ محمد اسلم،پروفیسر۔(س ن)۔تحریک پاکستان۔ لاہور:ریاض برادرز،اردو بازار۔

258۔ محمد اسماعیل ذبیح۔(1989ء)۔برصغیر میں مسلمانوں کے عروج و زوال کا آئینہ۔ کراچی:علوی پبلشرز۔شلوزان سینٹر اے۔ون،بلاک 6/5 گلشن اقبال۔

259۔ محمد اسماعیل، شیخ پانی پتی۔(1959ء)۔مکتوبات سرسیّد۔ لاہور:مجلس ترقی ادب۔

260۔ محمد اشرف،شیخ۔(1951ء)۔مکاتیب اقبال۔ لاہور۔

261۔ محمد افسر،خان رانجہ۔(1989ء)۔اسلامی نظام مالیات۔ اسلام آباد:الزکوٰۃ 287 ای۔7۔

262۔ محمد افضل طیار۔(2001ء)۔علم پروری اور اسلام،اسلامی نظام تعلیم، ترتیب و ادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

263۔ محمد اقبال،چوہدری ڈاکٹر۔(1997ء)۔قومی تعلیمی مقاصد اور نظام امتحانات،تربیت اساتذہ، ترتیب و ادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

264۔ محمد اقبال،علامہ۔(1986ء)۔تشکیل جدید الہیات اسلامیہ۔لاہور:بزم اقبال۔

265۔ ______ (1989ء)۔پیام مشرق۔ لاہور:شیخ غلام علی اینڈ سنز۔

266۔ محمد اقبال،قاری پروفیسر۔(2005ء)۔مقالات اسلامیہ۔فیصل آباد:انجمن نوجوانان اسلام (رجسٹرڈ)۔

267۔ محمد اکبر، شاہ بخاری۔(2001ء)۔حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ چالیس بڑے مسلمان۔ کراچی: ادارۃ القرآن۔

268۔ محمد اکرم جاوید، چوہدری۔(س ن)۔An Introduction of Dar-ul-shafqat، تعارف دارالشفقت مردانہ/زنانہ۔ لاہور: حمایت اسلام پریس۔

269۔ محمد اکرام، شیخ۔(1963ء)۔موج کوثر۔ کراچی: فیروز سنز لمیٹڈ۔

270۔ ________ (1982ء)۔آب کوثر۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان۔

271۔ ________ (س ن)۔رود کوثر۔ کراچی: فیروز سنز لمیٹڈ۔

272۔ ________ (1958ء)۔رود کوثر۔ لاہور: فیروز سنز لمیٹڈ۔

273۔ ________ (1975ء)۔رود کوثر۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان۔

274۔ ________ (2003ء)۔رود کوثر۔ راولپنڈی: سروسز بک کلب، آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ۔

275۔ ________ (1965ء)۔موج کوثر۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔

276۔ ________ (2004ء)۔موج کوثر۔ راولپنڈی: سروسز بک کلب۔

277۔ محمد اکرم طاہر، پروفیسر۔(1991ء)۔نظام امتحانات اور معیار تعلیم، پاکستان میں نظام امتحانات۔ بحران، اسباب، حل۔ اسلام آباد: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔

278۔ محمد الحسنی، سیّد۔(1964ء)۔سیرت مولانا محمد علی مونگیری، بانی ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ: مکتبہ دارالسلام، ندوۃ العلماء۔

279۔ محمد الیاس الاعظمی، ڈاکٹر۔(2002ء)۔دارالمصنفین کی تاریخی خدمات۔ پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری۔

280۔ محمد الیاس، برنی مولوی۔(1924ء)۔برطانوی حکومت ہند۔ حیدرآباد دکن: جامعہ عثمانیہ۔

281۔ محمد الیاس قارانی۔(1968ء)۔برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء۔ کراچی: ادارہ مطبوعات پاکستان۔

282۔ محمد امیر، شاہ قادری گیلانی۔(س ن)۔تذکرہ علماو مشائخ سرحد حصہ دوم۔ پشاور: عظیم پبلشنگ ہاؤس، خیبر بازار۔

283۔ محمد امیر، ملک پروفیسر۔(2000ء)۔نظام تعلیم کی اسلامائزیشن، ایک نعرہ یا حقیقت، پاکستان کا نظام تعلیم حصہ اول، ترتیب وتدوین پروفیسر رب نواز۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق۔ 3 بہاول

شیر روڈ۔

284۔ محمد امین جاوید ۔(2004ء)۔عرض ناشر،خطبات۔ لاہور:اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ۔

285۔ محمد امین، زبیری مارہروی۔(1994ء)۔حیات محسن۔ کراچی:اکیڈمی آف ریسرچ،آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

286۔ محمد امین، زبیری مولوی۔(س ن)۔تذکرہ سرسیّد۔ لاہور:پبلشرز یونائیٹڈ۔

287۔ محمد ایوب، قادری۔(1966ء)۔مولانا محمد احسن نانانوتوی۔کراچی۔

288۔ محمد بن عبدالوہاب۔(1987ء)۔کتاب التوحید۔ لاہور:البدر پبلی کیشنز۔

289۔ محمد جاوید اقبال ۔(2001ء)۔اسلام کی اولین درسگاہ،صفہ اور اس کا طریقہ تدریس،اسلامی نظام تعلیم، ترتیب وارادات ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

290۔ محمد حسام الدین، خان غوری۔(1979ء)۔تحریک علی گڑھ اور حیدر آباد دکن۔ کراچی:دارالادب پاکستان۔

291۔ محمد حمزہ، فاروقی۔(1988ء)۔حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، مرتب۔ لاہور:ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب۔

292۔ محمد حیات، خواجہ۔(س ن)۔مختصر تواریخ انجمن حمایت اسلام، لاہور۔لاہور:حمایت اسلام پریس۔

293۔ محمد رفیق، ڈوگر۔(1999ء)۔الامین صلی اللہ علیہ وسلم۔ لاہور:دید شنید پبلشرز۔

294۔ محمد زمان ناز ی۔(2001ء)۔اسلامی نظریہ تعلیم اور تعمیر شخصیت،اسلامی نظام تعلیم، ترتیب وادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

295۔ محمد سرور۔(1991ء)۔1857ء کا پس منظر،ادب، سیاست اور معاشرہ، مرتبا محمد سلیم۔ لاہور: نگارشات۔

296۔ محمد سرور، پروفیسر۔(2004ء)۔مولانا مودودی اور ان کی تحریک اسلامی معہ جماعت اسلامی و اسلامی دستور۔ لاہور: سندھ ساگر اکادمی۔

297۔ محمد سعید قادر، شیخ ۔(س ن)۔انجمن کے قیام کے اغراض ومقاصد،تعارف دارالشفقت مردانہ/زنانہ۔ لاہور:حمایت اسلام پریس۔

298۔ محمد سلیم، پروفیسر سیّد ۔(1979ء)۔قرآن کا تصور تعلیم۔ لاہور:احباب پبلی کیشنز۔

299- ________ (1981ء)۔مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ۔ لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق،تنظیم اساتذہ پاکستان۔

300- ________ (1985ء)۔مسلمان اور مغربی تعلیم(پاک و ہند میں)۔ لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق،تنظیم اساتذہ پاکستان۔

301- ________ (1993ءالف)۔مغربی زبانوں کے ماہر علماء، علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے۔لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق،3۔بہاول شیر روڈ،مزنگ۔

302- ________ (1993ءب)۔ہندو پاکستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق،تنظیم اساتذہ پاکستان۔

303- ________ (1993ءج)۔دینی مدارس کیلئے نصاب نو کی تجاویز۔لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق۔

304- ________ (1995ء)۔مغربی نظام تعلیم، تنقید و تبصرہ۔ لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان۔

305- ________ (1996ء)۔تاریخ نظریہ پاکستان۔ لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق۔

306- محمد شفیع۔(1366ھ)۔مقدمہ،فتاوی دارلعلوم دیوبند۔ دیوبند۔

307- محمد شفیع،مولانا مفتی۔(2001ء)۔مقدمہ،چالیس بڑے مسلمان۔ کراچی:ادارۃ القرآن۔

308- محمد صادق، ودیگر۔(2001ء)۔اسلامی نظام تعلیم کی خصوصیات،اسلامی نظام تعلیم، ترتیب وادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔اسلام آباد:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

309- محمد صلاح الدین۔(1989ء)۔حضور اکرمؐ کے قائم کردہ نظام تعلیم و تربیت کی روح،اسلام کا نظام تعلیم و تربیت۔ لاہور:ادارہ تعلیمی تحقیق،تنظیم اساتذہ پاکستان،8۔اے ذیلدار پارک،اچھرہ۔

310- محمد طاہر القادری، پروفیسر ڈاکٹر۔(1997ء)۔مقدمہ،سیرت الرسولؐ جلد اول۔لاہور:منہاج القرآن پبلی کیشنز۔

311- محمد طیب۔(1965ء)۔دارالعلوم دیوبند۔ دیوبند:اہتمام دفتر دارالعلوم۔

312- محمد طیب، قاسمی۔(1968ء)۔دارالعلوم دیوبند کی صدسالہ زندگی۔ دیوبند۔

313- محمد طیب،مولانا۔(1972ء)تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ کراچی:دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ۔

314- محمد طیب،قاری مولانا۔(س ن)۔مختصر تاریخ دارالعلوم دیوبند،بیس بڑے مسلمان۔ لاہور:مکتبہ المعارف العلمیۃ۔

315- ________ (س ن)۔تاریخ دارالعلوم دیوبند۔ کراچی: دارالاشاعت، اردو بازار۔

316- محمد علی، جوہر مولانا ۔(1920ء)۔دستور العمل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔ دہلی: مطبع جامعہ ملیہ۔

317- ________ (9جون1921ء)۔نصاب تعلیم جامعہ ملیہ علی گڑھ معہ مقدمہ مولانا محمد علی۔ اعظم گڑھ: مطبع معارف۔

318- ________ (1932ء)۔دستور العمل جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔

319- ________ (1981ء)۔قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام۔ لاہور: صادقیہ پبلی کیشنز، علامہ اقبال ٹاؤن۔

320- محمد علی، چوہدری۔(1981ء)۔ظہور پاکستان۔ لاہور: مکتبہ کارواں۔

321- محمد علی چراغ۔(1985ء)۔قرارداد پاکستان۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔

322- ________ (1986ء)۔تاریخ پاکستان۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔

323- محمد عیسٰی خان۔(1999ء)۔تعلیمی فلسفہ و تاریخ۔ لاہور: علمی کتاب خانہ، اردو بازار۔

324- محمد قاسم فرشتہ۔(س ن)۔تاریخ فرشتہ جلد اول، مترجم عبدالحئی۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ۔

325- ________ (س ن)۔تاریخ فرشتہ، مترجم عبدالحئی خواجہ۔ کراچی: شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ۔

326- محمد قطب۔(1999ء)۔موجودہ نظام تعلیم سے اسلامی نظام تعلیم کی طرف، نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان۔

327- محمد مالک، کاندھلوی مولانا ۔(س ن)۔تقریظ۔اکابر علماء دیوبند (مؤلفہ حافظ محمد اکبر شاہ)۔ لاہور: ادارہ اسلامیات۔

328- محمد مجاہد فاروق۔(س ن)۔پاکستان کی نظریاتی تاریخ: حکومت اور سیاست۔ لاہور: نیو بک پیلس، اردو بازار۔

329- محمد مجیب، پروفیسر۔(س ن)۔ڈاکٹر ذاکر حسین۔ نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ۔

330- محمد مصلح الدین، ڈاکٹر۔(1988ء)۔اسلامی تعلیم اور اس کی سرگزشت۔ لاہور: اسلامک پبلی کیشنز۔

331- محمد منظور نعمانی، مولانا۔(س ن)۔دارالعلوم دیوبند کا قضیہ عوام کی عدالت میں۔ دیوبند: دفتر دارالعلوم دیوبند۔

332- محمد موسیٰ، حاجی۔(س ن)۔مسلم یونیورسٹی کے بھولے ہوئے اصول۔ حیدرآباد دکن۔

333- محمد میاں،سیّد۔(1946ء جلد 1)۔علمائے حق کا شاندار ماضی جلد 1۔مراد آباد۔

334- ________ (1961ء)۔علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد چہارم۔دہلی۔

335- ________ (1991ء)۔تحریک شیخ الہند۔لاہور:نگارشات۔

336- ________ (2004ء)۔علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد پنجم۔کراچی: مکتبہ رشیدیہ۔

337- محمد ناظم،ندوی۔(1987ء)۔منہاج تعلیم میں اصلاح،تعلیم اسلامی تناظر میں۔ اسلام آباد:انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔

338- محمد نسیم قریشی۔(1960ء)۔علی گڑھ تحریک آغاز تا امروز۔لکھنؤ:مسلم پریس۔

339- محمد یوسف، بھٹہ۔(1984ء)۔مولانا مودودی (اپنی اور دوسروں کی نظر میں)۔ لاہور:ادارہ معارف اسلامی۔

340- محمد یوسف قریشی۔(1404ھ)۔سفرنامہ ہند۔ پشاور:موتمر المؤلفین جامعہ اشرفیہ۔

341- محمود احمد،بنگوری۔(س ن)۔تاریخ سلطنت خداداد میسور۔ لاہور۔

342- مختار جاوید۔(1996ء)۔دارالعلوم دیوبند کے سو سال۔ لاہور:عظیم پبلی کیشنز۔

343- مسرت شوکت،چیمہ۔(1995ء)۔تعلیم کے اسلامی آفاق۔لاہور:اسلامک ایجوکیشنل ٹرسٹ۔

344- مسعود عالم،ندوی مولانا۔(1987ء)۔برصغیر ہندو پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ۔ لاہور:اسلامک پبلی کیشنز۔

345- مسلم سجاد۔(1992ء)۔اسلامی ریاست میں نظام تعلیم۔اسلام آباد:انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز۔

346- مشتاق الرحمٰن،صدیقی ڈاکٹر۔(1998ء)۔تعلیم و تدریس، مباحث و مسائل۔ اسلام آباد:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

347- ________ (2001ء)۔پیش لفظ،نصاب تعلیم، ترتیب وادارت ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد۔ اسلام آباد:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

348- مصطفیٰ علی،بریلوی سیّد۔(1970ء)۔انگریزوں کی لسانی پالیسی۔کراچی:انجمن پریس۔

349- ________ (1971ء)۔مسلمانان بنگال کی تعلیم۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

350- ________ (1980ء)۔مسلمانان صوبہ سرحد کی تعلیم۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

351- ________ (1986ء)۔مسلمانان سندھ کی تعلیم۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

352- ________ (1994ء)۔دستاویزات کانفرنس سلسلہ 2۔کراچی: اکادمی آف ایجوکیشنل ریسرچ۔

353- معین الحق،ڈاکٹر سیّد۔(1965ء)۔معاشری و علمی تاریخ (اسلامی ہند پاکستان 711ء۔1707ء)۔ کراچی نمبر 5: حق نشان، 30 نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔

354- معین الدین عقیل،ڈاکٹر۔(س ن)۔مسلمانوں کی جدوجہد آزادی۔مسائل،افکار اور تحریکات۔ لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت۔

355- مقبول جہانگیر۔(س ن)۔داستان سرفروشوں کی۔ لاہور: مکتبہ اردو ڈائجسٹ۔

356- ممتاز معین، پروفیسر مسز۔(1982ء)۔مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا آغاز،تاریخ علی گڑھ تحریک۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

357- ________ (1982ء)۔علی گڑھ تحریک،تاریخ علی گڑھ تحریک۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

358- مناظر احسن،گیلانی۔(1953ء)۔سوانح قاسمی۔ دیوبند۔

359- ________ (س ن)الف۔سوانح قاسمی جلد اول۔لاہور: مکتبہ رحمانیہ،اردو بازار۔

360- ________ (س ن)ب۔سوانح قاسمی حصہ دوم۔لاہور: مکتبہ رحمانیہ،اردو بازار۔

361- ________ (س ن)ج۔مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت۔ دہلی: ندوۃ المصنفین۔

362- منصور خالد۔(1986ء)۔وثائق مودودی۔ لاہور: ادارہ معارف اسلامی۔

363- منور ابن صادق۔(1981ء)۔پیش لفظ و حواشی،قومی اور اسلامی تعلیم کا نظام، تصنیف مولانا محمد علی جوہر۔لاہور: صادقیہ پبلی کیشنز،علامہ اقبال ٹاؤن۔

364- نذیر احمد،خواجہ ڈاکٹر اور اکبر علی،ڈاکٹر۔(1987ء)۔پاکستان میں تعلیم کی تاریخ۔ لاہور: ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب نیو کیمپس۔

365- نعیم صدیقی۔(1986ء)۔المودودی۔ لاہور: المنار بک سنٹر۔

366- ________ (اپریل 1986ء)۔تذکرہ سیّد مودودی۔ لاہور: ادارہ معارف اسلامی۔

367- ________ (1999ء)۔رسول اللہ بحیثیت معلم۔ لاہور: ادارہ تعلیمی تحقیق پاکستان، تنظیم اساتذہ پاکستان۔

368۔ ________ (2000ء)۔تذکرہ سیّد مودودی جلد اول۔لاہور:ادارہ معارف اسلامی۔

369۔ نفیس الدین، پروفیسر صدیقی۔ (2001ء) سرپرست دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، چالیس بڑے مسلمان۔ کراچی:ادارۃ القرآن۔

370۔ نقی علی،سیّد۔(1980ء)۔سیّد مودودی کا عہد میری نظر میں۔لاہور:البدر پبلی کیشنز۔

371۔ ________ (1981ء)سیّد مودودی کا عہد میری نظر میں۔ رام پور،یوپی: مکتبہ ذکریٰ۔

372۔ ________ (قلمی نسخہ)۔تاریخ جماعت اسلامی۔کراچی:ادارہ معارف اسلامی۔

373۔ نوراللہ،سیّد اور جے۔پی نائیک۔(1982ء)۔تاریخ تعلیم ہند، مترجم مسعودالحق۔نئی دہلی:ترقی اردو بیورو۔

374۔ نوشہروی،ابویحییٰ امام خان۔(1938ء)۔تراجم علمائے حدیث ہند۔ دہلی۔

375۔ وحیدالدین فقیر،سیّد۔(1966ء)۔روزگار فقیر۔کراچی:لائن آرٹ پریس۔

376۔ وسیم احمد،فاروقی۔(1988ء)۔علامہ اقبال اور سیّد مودودی۔لاہور: حسنات اکیڈمی لمیٹڈ۔

377۔ وقار احمد،رضوی ڈاکٹر۔(1996ء)۔مقدمہ سرسیّد کا علمی کارنامہ، مصنفہ قاضی احمد میاں جونا گڑھی۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

378۔ ولی اللہ،الصادق الخالدی۔(2000ء)۔رسول اکرمؐ کا تعلیمی اسوہ اور پاکستان۔ لاہور: صادقیہ پبلی کیشنز۔

379۔ ولی اللہ،شاہ۔(1953ء)۔حجۃ اللہ البالغہ، اردو ترجمہ از مولوی عبدالرحیم۔لاہور:المکتبہ السّلفیہ۔

380۔ ولی مظہر۔(1983ء)۔عظیم قائد عظیم تحریک۔ ملتان: روحانی آرٹ پریس۔

381۔ ہاشم علی،خان۔(1985ء الف)۔منتخب اللباب حصہ دوم،مترجم محمود احمد فاروقی۔کراچی:نفیس اکیڈمی۔

382۔ ________ (1985ء)۔مغلیہ دور حکومت حصہ اول،مترجم محمود احمد فاروقی۔کراچی:نفیس اکیڈمی۔

383۔ یوسف القرضاوی،علامہ ڈاکٹر۔(1988ء)۔اسلامی نظام کے خدوخال،مترجم ابوالظفر انصاری۔ لاہور:ادارہ دراسات اسلامیہ۔

384۔ ________ (1998ء)۔تعلیم کی اہمیت (سنت کی روشنی میں)،مترجم ابومسعود اظہر ندوی۔ نئی دہلی:مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔

رسائل

385۔ ابوالاعلیٰ مودودی،سیّد ۔(دسمبر 1937ء)۔دارالاسلام،ماہنامہ ترجمان القرآن (11)4۔ پٹھانکوٹ(پنجاب):دفتر ترجمان القرآن دارالاسلام۔

386۔ ________ (فروری1938ء)۔اشارات،ماہنامہ ترجمان القرآن (11)6۔پٹھانکوٹ(پنجاب): دفتر ترجمان القرآن دارالاسلام۔

387۔ ________ (ستمبر 1938ء)ضمیمہ ترجمان القرآن۔۔۔دستورالعمل ادارہ دارالاسلام مع توضیح مقاصدوطریق کار،ماہنامہ ترجمان القرآن (13)1۔ پٹھانکوٹ(پنجاب):دارالاسلام۔

388۔ ________ (جنوری1939ء)۔اشارات،ماہنامہ ترجمان القرآن (13)5۔پٹھانکوٹ(پنجاب): دفتر ترجمان القرآن دارالاسلام۔

389۔ ________ (جون1942ء)۔اشارات،ماہنامہ ترجمان القرآن (20)4۔لاہور:مبارک پارک پونچھ روڈ۔

390۔ ________ (اگست ستمبر 1942ء)۔اعلان منجانب سیّد مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی،ماہنامہ دارالاسلام (4)12۔پٹھانکوٹ(پنجاب):دارالاسلام ٹرسٹ۔

391۔ ________ (2جنوری1982ء)۔مکتوب بنام عنایت اللہ اثری،ماہنامہ ذکریٰ احیائے اسلام نمبر۔رامپور۔

392۔ ابوالکلام آزاد۔ (1979ء)۔تعلیم،عزم نو،جنوری تا جون 1979ء۔لاہور:جمعیت طلباءاسلام،شاہ عالم مارکیٹ۔

393۔ احسان دانش۔(1976ء)۔اکابر دیوبند،ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

394۔ احمد حسن پیرزادہ جامی ۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند پر علمی وتحقیقی مقالہ،ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

395۔ ادارہ تحریر دارالاسلام۔(ستمبر 1939ء)۔معروضات،ماہنامہ دارالاسلام(1)4۔پٹھانکوٹ (پنجاب):دارالاسلام ٹرسٹ۔

396۔ ادارہ تحریر دارالاسلام۔(نومبر۔دسمبر 1940ء)۔معروضات،ماہنامہ دارالاسلام(3)3-4۔پٹھانکوٹ پنجاب:دارالاسلام۔

397۔ ________ (ستمبر 1941ء)۔معروضات،ماہنامہ دارالاسلام(4)1۔پٹھانکوٹ پنجاب:دارالاسلام۔

398۔ اظہار احمد تھانوی۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند اور تجوید وقرات، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

399۔ اقبال احمد ندوی۔(اپریل 1987ء)۔میں بھی وہاں تھا، ماہنامہ زندگی نو (6)4۔دہلی۔

400۔ انظر شاہ، مولانا سیّد۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

401۔ جمیل رانا۔(ستمبر 1939ء)۔حقیقت اسلام، ماہنامہ دار الاسلام (1)4۔پٹھانکوٹ (پنجاب): دارالاسلام۔

402۔ حبیب الرحمٰن، مولانا (1981ء)۔ چودھویں صدی ہجری کی ایک دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید (9)3۔ساہیوال۔

403۔ خالد شفیق۔(نومبر 1998ء)۔انجمن حمایت اسلام، ماہنامہ حمایت اسلام۔ لاہور: انجمن حمایت اسلام پریس۔

404۔ خورشید احمد۔(مارچ 1960ء)۔مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، ماہنامہ چراغ راہ۔کراچی۔

405۔ رشید احمد ارشد، سیّد۔(1984ء)۔عہد رسولؐ میں نظام تعلیم، نقوش رسول نمبر (4)130۔لاہور۔

406۔ سرفراز خان، مولانا ابوالزاہد۔(س ن)۔بانی دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید۔ساہیوال۔

407۔ سعید الرحمٰن اعظمی۔(2000ء)۔تحریک ندوۃ العلماء اور ختم نبوت، تعمیر حیات۔لکھنؤ: 10۔نومبر 2000ء۔

408۔ شبیر احمد، خان غوری۔(1984ء)۔علم وتہذیب کی ترقی میں معارف محمدی کا حصہ، نقوش، رسول نمبر (4)130۔لاہور: ادارہ فروغ اردو۔

409۔ شمس تبریز۔(1981ء)۔اسلام کا جامع نظریہ تعلیم اور دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید (9)8-9۔ساہیوال۔

410۔ صابر کلوروی۔(دسمبر 1979ء)۔سیّد مودودی اور اقبالؒ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ سیّد مودودی نمبر حصہ اول۔لاہور۔

411۔ عبدالرشید ارشد۔(1980ء)۔شادباش وشادزی اے سرزمین دیوبند، ماہنامہ الرشید، تاریخ دارالعلوم دیوبند نمبر (8)4-5۔ساہیوال۔

412۔ عبدالصمد صارم۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند کی ادبی خدمات، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

413۔ عبدالقادر، پروفیسر سیّد۔(نومبر 1998ء)۔انجمن حمایت اسلام کے کارناموں پر سرسری نظر، ماہنامہ انجمن حمایت اسلام۔ لاہور: حمایت اسلام پریس۔

414۔ غلام علی، ملک۔(جنوری 1980ء)۔ پروفیسر مودودی کے ساتھ ساتھ اسلامیہ کالج سے ذیلدار پارک تک، ماہنامہ قومی ڈائجسٹ سید مودودی نمبر (2)8۔لاہور۔

415۔ غلام محمد، چوہدری۔(نومبر 1963ء)تحریک اسلامی کالائحہ عمل تاریخ کے پس منظر میں، ماہنامہ چـــراغ راہ۔ تحریک اسلامی نمبر۔کراچی۔

416۔ غلام مصطفےٰ، مولانا۔(1976ء)۔جامعیت دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

417۔ فضل الرحمٰن، مولانا عثمانی۔(1981ء)۔دارالعلوم دیوبند کے بانی کی اہم وصیت، ماہنامہ الــرشیـد (9)4۔ ساہیوال۔

418۔ قدرت نقوی، سیّد۔(2002ء)۔مسلم لیگ، قائداعظم اور اردو، اخبار اردو (18)7۔اسلام آباد۔

418۔ ماہنامہ رسالہ جامعہ پیام تعلیم، جشن سیمیں نمبر، نومبر 1970ء۔دہلی: مکتبہ جامعہ۔

420۔ محبوب، رضوی سیّد۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی خصوصیات، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

421۔ ______ (1980ء)۔تاریخ دارالعلوم دیوبند نمبر، ماہنامہ الرشید (8)4-5۔ساہیوال۔

422۔ محمد اقبال قریشی(1976ء)۔حضرات علماء دیوبند کا مسلک اعتدال، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

423۔ محمد ایوب قادری۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند۔۔ایک ادارہ، ایک تحریک، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

424۔ محمد رضوان قاسمی۔(1981ء)۔دارالعلوم دیوبند کی صد سالہ تاریخ۔اعداد و شمار کے آئینے میں، ماہنامہ الرشید (9)1-2۔ساہیوال۔

425۔ محمد رفیع، مولانا مفتی۔(1399ھ)۔حیات مفتی اعظم، ماہنامہ البلاغ (13)6۔دیوبند۔

426۔ محمد سعد اللہ، حافظ(1984ء)۔اصحاب صفہ، مترجم، نقوش رسول نمبر (4)130۔لاہور: ادارہ فروغ اردو۔

427۔ محمد شفیع، مولانا مفتی۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند اور اس کا مزاج و مذاق، ماہنامہ الـرشید، دارالعلوم دیوبند نمبر (4)2-3۔لاہور۔

428۔ محمد عبداللہ سلیم، قاری مولانا۔(1976ء)۔دارالافتاء۔۔۔دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الــرشیـد (4)2-3۔ لاہور۔

429۔ محمد مجیب، پروفیسر۔(1970ء)۔چوتھے امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین، رسالہ جـــامـعـــہ، جشن زریں نمبر۔ دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

430۔ محمد نسیم عثمانی۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔ساہیوال۔

431۔ محمد ہاشم، ڈاکٹر سیّد۔(2003ء)۔ایک ہمہ جہت عالم ایک گراں مایہ شخصیت، ماہنامہ القــاسم۔نوشہرہ: جامعہ ابوہریرہ برانچ، پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ۔

432۔ محمد یوسف، بنوری۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند ایک جائزہ، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور۔

433۔ محمد یوسف، مولانا لدھیانوی۔(1980ء)۔تاریخ مظاہر چند اقتباسات، ماہنامہ الرشید (9)1-2۔ ساہیوال۔

434۔ محمود، مولانا مفتی۔(1976ء)۔تحفظ و احیائے اسلام کی عالمگیر تحریک، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔ ساہیوال۔

435۔ منظور احمد جاوید۔(1979ء)۔مقدمہ، ماہنامہ عزم نو، اسلامی نظام تعلیم نمبر۔لاہور: جمعیت طلباء اسلام، شاہ عالم مارکیٹ، جنوری تا جون 1979ء۔

436۔ منور ابن صادق۔(1978ء)۔پاکستان میں تعلیمی انقلاب کا لائحہ عمل، ماہنامہ تعلیمات، اپریل 1978ء۔ لاہور۔

437۔ ناظم دارالاسلام۔(اکتوبر 1941ء)۔دارالاسلام کا تعلیمی پروگرام، ماہنامہ دارالاسلام (4)2۔ پٹھانکوٹ (پنجاب): دارالاسلام ٹرسٹ۔

438۔ نجم الاسلام۔(نومبر 1963ء)۔اردو ادب پر اسلامی تحریکات کے اثرات، ماہنامہ چراغ راہ، تحریک اسلامی نمبر۔کراچی۔

439۔ ندیم الواجدی۔(1976ء)۔دارالعلوم دیوبند ماضی اور حال، ماہنامہ الرشید (4)2-3۔لاہور

مجلّے

440۔ آفتاب حسن، میجر۔(1974ء)۔سائنٹیفک سوسائٹی پاکستان، مجلہ علم و آگہی خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، جلد دوم۔کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج، بابت سن 1974-75ء۔

441۔ ابوسلمان شاہجہان پوری۔(1973ء)۔مقدمہ، مجلہ علم و آگہی، خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے۔کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج، بابت سن 1973-74ء۔

442۔ ابوعمار زاہد الراشدی۔(1979ء)۔اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی خدوخال، عزم نو، جنوری تا جون 1979ء۔لاہور: جمعیت طلباء اسلام، شاہ عالم مارکیٹ۔

443۔ احسان اللہ، خان۔(1988ء)۔اسلامیہ کالج میں میری طالب علمی کا زمانہ، خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان: کوثر پرنٹنگ پریس۔

444۔ اسعد گیلانی سیّد ۔(1977ء) ۔اقبال،دارالاسلام،تعلیمی اسکیم،مجلہ محور، تعلیم نمبر۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی۔

445۔ اقبال احمد،خان ۔(1974ء)۔اسلامیہ کالج پشاور،مجلہ علم و آگہی خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک وہند کے علمی،ادبی،تعلیمی ادارے۔کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج۔بابت سن 1974-75ء۔

446۔ اقبال احمد،صدیقی ۔(2000ء)۔سرسیّد احمد خان اورتحریک علی گڑھ،مجلہ العلم (49)4۔کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

447۔ امین الوہاب،میاں کاکاخیل ۔(1988ء)۔اسلامیہ کالج پشاور ایک تاریخی علمی درسگاہ،خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان:کوثر پرنٹنگ پریس۔

448۔ انتظام اللہ شہابی،مفتی ۔(1983ء)۔دارالعلوم ندوۃالعلماء،مجلہ تعلیم، 18۔نومبر 1983ء۔کراچی:شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ،وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

449۔ حسن علی ۔(1960ء)۔خان بہادر حسن علی آفندی،دی پلاٹینم جوبلی بک۔ کراچی:سندھ مدرسۃ الاسلام۔

450۔ حفیظ مینائی ۔(1971ء)۔شبلی اور علی گڑھ تحریک،مجلہ کریسنٹ شبلی نمبر جنوری 1971ء۔لاہور:اسلامیہ کالج۔

451۔ حمیرا اقبال ۔(1996ء)۔دینی مدارس کا نظام تعلیم،سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویے (7)2۔لاہور:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

452۔ خورشید آفریدی۔(1988ء)۔کچھ باتیں،خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان:کوثر پرنٹنگ پریس۔

453۔ خورشید احمد،پروفیسر۔(1977ء)۔ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم،مجلہ محور، تعلیم نمبر۔لاہور:پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین۔

454۔ ذاکر اعجاز،سیّد۔(1988ء)۔پروفیسر صاحبزادہ ادریس مرحوم،خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان: کوثر پرنٹنگ پریس۔

455۔ رستم خان۔(1988ء)۔کالج میں دو سالہ زندگی،خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان:کوثر پرنٹنگ پریس۔

456۔ زاہدالرحمٰن۔(2002ء)۔اسلامیہ کالج تاریخ کے آئینے میں،خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان:کوثر پرنٹنگ پریس۔

457۔ شبیر احمد، پروفیسر۔(1983ء)۔مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور ایسٹ انڈیا کمپنی ،مجلہ تعلیم 18۔نومبر 1983ء۔کراچی:شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ،وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

458۔ شبیر احمد، پروفیسر(1983ء)۔انگریزوں کی تعلیمی پالیسی ،مجلہ تعلیم۔ 18۔نومبر 1983ء۔کراچی:شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ،وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

459۔ شمائل احمد شیم۔(1973ء)۔آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس،مجلہ علم و آگہی،خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک وہند کے علمی،ادبی اور تعلیمی ادارے۔کراچی:گورنمنٹ نیشنل کالج،بابت سن 1973-74ء۔

460۔ شمعون علی بلقوی۔(1973ء)۔انجمن حمایت اسلام لاہور،مجلہ علم و آگہی۔خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی، تعلیمی ادارے۔کراچی:گورنمنٹ نیشنل کالج۔ بابت سن 1973-74ء۔

461۔ عبدالرزاق سکندر الازہری، ڈاکٹر۔(1979ء)۔اسلامی نظام تعلیم،عزم نو، جنوری تا جون 1979ء۔ لاہور:جمعیت طلباء اسلام،شاہ عالم مارکیٹ۔

462۔ عبدالعزیز۔(1988ء)۔اسلامیہ کالج پشاور۔۔۔ایک عظیم درسگاہ،خیبر جشن الماس نمبر۔ 2مردان:کوثر پرنٹنگ پریس۔

463۔ فرحت عظیم،ڈاکٹر۔(2000ء)۔سر سیّد اور قومی ترقی،مجلہ العلم (49)4۔کراچی:آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

464۔ فقیر محمد،خان۔(1988ء)۔پرانی یادیں،خیبر جشن الماس نمبر۔مردان:کوثر پرنٹنگ پریس۔

465۔ قاضی مُلاّ۔(1988ء)۔چند یادیں چند باتیں،خیبر جشن الماس نمبر۔مردان:کوثر پرنٹنگ پریس۔

466۔ قدیر الدین احمد۔(1979ء)۔تعلیم کا مسئلہ حل کیوں نہیں ہوتا؟عزم نو، جنوری تا جون 1979ء۔ لاہور:جمعیت طلباء اسلام،شاہ عالم مارکیٹ۔

467۔ لعل احمد جھبیم۔(1973ء)۔جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی،مجلہ علم و آگہی،خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک وہند کے علمی،ادبی اور تعلیمی ادارے۔کراچی:گورنمنٹ نیشنل کالج بابت سن 1973-74ء۔

468۔ محمد ابراہیم خالد و دیگر۔(1996ء)۔ملک کے معروف ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر اسمٰعیل سعد سربراہ شعبہ خصوصی تعلیم کراچی یونیورسٹی سے انٹرویو،سہ ماہی تعلیمی زاویے (7)1۔لاہور:پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن۔

469۔ محمد ادریس، کاندھلوی مولانا۔(1979ء)۔مسئلہ تعلیم،عزم نو، جنوری تا جون 1979ء۔لاہور: جمعیت طلباء اسلام، شاہ عالم مارکیٹ۔

470۔ محمد اسلام، ڈاکٹر۔(1973ء)۔دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مجلہ علم و آگہی، خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی، تعلیمی ادارے۔ کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج۔ بابت سن 1973-74ء۔

471۔ محمد امین، زبیری مولوی۔(1983ء)۔مسلم یونیورسٹی، مجلہ تعلیم، 18۔نومبر 1983ء۔کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

472۔ محمد ایوب، قادری پروفیسر۔(1983ء)۔دارالعلوم دیوبند، مجلہ تعلیم۔ 18۔نومبر 1983ء۔کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

473۔ محمد ایوب، قادری۔(1975ء)۔انجمن کراچی پر ایک نظر، مجلہ العلم، اپریل تا ستمبر 1975ء۔کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

474۔ محمد جنید، صاحبزادہ۔(1988ء)۔سرسید سرحد۔۔۔معمار سرحد نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم، خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان: کوثر پرنٹنگ پریس۔

475۔ محمد حامی الدین، پروفیسر۔(1983ء)۔مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور ایسٹ انڈیا کمپنی، مجلہ تعلیم۔ 18۔نومبر 1983ء۔کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

476۔ محمد حسین، خان زبیری۔(1975ء)۔سرسید کی تعلیمی خدمات، مجلہ العلم، اپریل۔ستمبر 1975ء۔ کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

477۔ محمد خلیل اللہ، پروفیسر۔(1983ء)۔اسلامی نظریہ اور نصاب تعلیم، مجلہ تعلیم۔ 18۔نومبر 1983ء۔ کراچی: شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

478۔ محمد سالم، خان۔(1988ء)۔اسلامیہ کالج سے میری وابستگی، خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان: کوثر پرنٹنگ پریس۔

479۔ محمد سلیم، پروفیسر سیّد۔(1998ء)۔پاکستانی نظام تعلیم ورلڈ بنک کے ہاتھوں میں، مجلہ العلم (47)4 اکتوبر تا دسمبر۔کراچی۔

480۔ محمد طیب، قاری۔(1991ء)۔دارالعلوم دیوبند، مجلہ (2)1-4۔کراچی۔

481۔ محمد عبداللہ شکیب۔(1975ء)۔جامعہ ملیہ علی گڑھ کا ایک تجربا آور، مجلہ العلم۔اپریل تا ستمبر 1975ء۔ کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

482۔ محمد علی، صدیقی ۔(1975ء)۔سرسیّد احمد خان ۔ایک ترقی پسند مفکر، مجلہ العلم، اپریل تا ستمبر 1975ء۔ کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔

483۔ محمد نذیر، رومانی ڈاکٹر۔(1988ء)۔پیغام، خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان: کوثر پرنٹنگ پریس۔

484۔ محمد نسیم عثمانی ۔(1973ء)۔دارالعلوم دیوبند، مجلہ علم و آگہی، خصوصی شمارہ۔کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج۔بابت 1973-74ء۔

485۔ محمد نسیم، عثمانی ۔(18 نومبر 1983ء)۔انجمن حمایت اسلام، مجلہ تعلیم۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، وفاقی گورنمنٹ اردو کالج۔

486۔ محمد یعقوب اُپل ۔(1960ء)۔خان بہادر حسن علی خان آفندی ۔بے مجیدی، دی پلاٹینم جوبلی بک۔ کراچی: سندھ مدرستہ الاسلام۔

487۔ معین الدین، سیّد ۔(1973ء)۔سندھ مدرستہ الاسلام، مجلہ علم و آگہی، خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی، تعلیمی ادارے۔کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج۔بابت سن 1973-74ء۔

488۔ ممتاز احمد، خان ۔(1988ء)۔اسلامیہ کالج کی کچھ یادیں، خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان: کوثر پرنٹنگ پریس۔

489۔ منظور احمد جاوید ۔(1978ء)۔مقدمہ، عزم نو، اسلامی نظام تعلیم نمبر۔لاہور: جمعیت طلباء اسلام، شاہ عالم مارکیٹ۔

490۔ منور ابن صادق ۔(1969ء)۔قدیم اسلامی روایت اور نصاب تعلیم، مجلہ تعلیم و تحقیق، اگست 1969ء۔لاہور: ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب۔

491۔ نذیر چودھری ۔(1973ء)۔مدرستہ العلوم علی گڑھ، مجلہ علم و آگہی خصوصی شمارہ بعنوان برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے۔کراچی: گورنمنٹ نیشنل کالج بابت سن 1973-74ء۔

492۔ نیاز احمد، خان ۔(1988ء)۔چند واقعات دوران اسلامیہ کالج پشاور، خیبر جشن الماس نمبر۔ مردان: کوثر پرنٹنگ پریس۔

493۔ وحید الدین، خان ۔(1979ء)۔علوم اسلامی کی تدوین، عزم نو، جنوری تا جون 1979ء۔لاہور: جمعیت طلباء اسلام، شاہ عالم مارکیٹ۔

494۔ ہمایوں دین پوری ۔(2003ء)۔سیاح نہیں دہشت گرد، سہ ماہی تعلیم و تہذیب، جنوری ۔مارچ 2003ء۔لاہور۔

اخبارات وجرائد

495۔ اداریہ۔روزنامہ مدینہ۔ 9۔جون 1943ء۔بجنور۔

496۔ اداریہ۔سہ روزہ دعوت۔ نئی دہلی۔16۔اکتوبر 1999ء۔

497۔ اداریہ۔روزنامہ الجمعیۃ۔ 8دسمبر 1951ء۔دہلی۔

498۔ اداریہ۔قافلہ سرائے سے عظیم تعلیمی درسگاہ تک کا سفر،روزنامہ دن 2 ستمبر 1999ء۔کراچی۔

499۔ ارشاد احمد حقانی۔(1988ء)۔سندھ مدرسہ مسائل اور ضروریات،روزنامہ جنگ 14۔اگست 1998ء۔ کراچی۔

500۔ ارشاد احمد حقانی۔(1998ء)۔سندھ مدرسہ کے طلبہ وطالبات سے خطاب،روزنامہ جنگ 15۔اگست 1998ء۔کراچی۔

501۔ ارشاد الحق تھانوی،مولانا۔(2002ء)۔دارالعلوم دیوبند۔۔۔ایک ادارہ،ایک تحریک،روزنامہ جنگ لاہور۔31۔مئی 2002ء۔

502۔ انجم جاوید۔(1998ء)۔سندھ مدرسۃ الاسلام۔۔۔معروف شخصیات کی مادر علمی کے مسائل پر خصوصی رپورٹ، ہفت روزہ فیملی میگزین (27دسمبر تا 2جنوری)۔کراچی۔

503۔ ایم۔اے صوفی،ڈاکٹر۔(15۔اپریل 2006ء)۔انجمن حمایت اسلام،علامہ اقبال اور تعلیم،روزنامہ نوائے وقت۔ لاہور۔

504۔ ایم سجاد حسین۔(2006ء)۔سندھ مدرسۃ الاسلام اور چرچ مشن ہائی سکول جہاں قائداعظم پڑھتے رہے، سنڈے میگزین،نوائے وقت 13۔اگست 2006ء۔لاہور۔

505۔ شبیر حسین،خان۔(4۔نومبر 1991ء)۔دعوتی وتحریکی سرگرمیاں،سہ روزہ دعوت۔ دہلی۔

506۔ عابد نظامی۔(17۔اپریل 1969ء)۔علامہ اقبال اور مولانا مودودی،ہفت روزہ ایشیا۔ لاہور۔

507۔ ________ (26اپریل 1971ء)۔کیا مولانا مودودی علامہ اقبال کی دعوت پر پنجاب آئے تھے،ہفت روزہ چٹان۔ لاہور۔

508۔ عبداللہ،ڈاکٹر سید۔(2002ء)۔دارالعلوم کا قیام۔۔۔اسباب ومحرکات،روزنامہ جنگ۔31۔مئی 2002ء۔لاہور۔

509۔ عقیدت اللہ قاسمی۔(1999ء)۔نقطۂ نظر،سہ روزہ دعوت۔ 22۔اکتوبر 1999ء۔نئی دہلی۔

510- مجاہد الحسینی، مولانا۔(2002ء)۔دارالعلوم دیوبند کی علمی و دینی خدمات۔۔۔ایک جائزہ، روزنامہ جنگ۔ 31۔مئی 2002ء۔لاہور۔

511- محمد حنیف شاہد۔(21۔اپریل 2006ء)۔علامہ اقبال کا خواب کب شرمندہ تعبیر ہوگا، روزنامہ نوائے وقت۔ خصوصی اشاعت۔لاہور۔

512- محمد علی، جوہر مولانا۔(30۔اکتوبر 1925ء)۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی۔۔۔مولانا محمد علی جوہر، روزنامہ ہمدرد۔ دہلی۔

513- ________ (8۔جنوری 1928ء)۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کیا ہے؟۔۔۔از کلید دین در دنیا کشاد، روزنامہ ہمدرد۔ دہلی۔

514- ________ (9جنوری 1928ء)۔خدا ہماری حماقت پر رحم کرے، روزنامہ ہمدرد۔دہلی۔

515- ________ (16۔جنوری 1928ء)۔جامعہ ملیہ کا استفسار مسلمانان ہند کی اقتصادی حالت پر، روزنامہ ہمدرد۔ دہلی۔

516- ________ (18۔جنوری 1928ء)۔جامعہ ملیہ کی ایک اور خصوصیت۔۔۔خدا پرستی، ملت پروری، وطن پروری، روزنامہ ہمدرد۔دہلی۔

517- محمد علی، شیخ۔(2004ء)۔سندھ مدرستہ الاسلام، ایک تاریخ ساز ادارہ، روزنامہ کائنات۔ یکم ستمبر 2004ء۔ کراچی۔

518- وجاہت انجم۔(1980ء)۔دارالعلوم دیوبند کھلی اور چھپی کہانی۔۔۔ایک صدی کی زبانی، ہفت روزہ ہادیان 47(2)۔لاہور۔

519- ہندوستانی ٹائمز۔ جولائی 1936ء۔بمبئی۔

تقاریر، رپورٹیں، کانفرنسیں، روودادیں، مقالہ جات

520- جانباز مرزا۔(1980ء)۔میں بھی وہاں حاضر تھا، روئیداد جشن دیوبند 21-23 مارچ 1980ء لاہور: مکتبہ تبصرہ، شادباغ۔

521- رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس 1891ء۔(1892ء)۔آگرہ: مفید عام پریس۔

522- رپورٹ محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس 1895ء، اقتباس تقریر محسن الملک۔(1896ء)۔آگرہ: مفید عام پریس۔

523- رپورٹ محمڈن اینگلو اورنٹیل ایجوکیشنل کانفرنس سال 1900ء۔(1901ء)۔آگرہ: مفید عام پریس۔

524- رسالہ کانفرنس متعلق تمدن و معاشرت۔(س ن)۔امرتسر: ہتیم پریس۔

525- روداد ندوۃ العلماء بابت سال اول حصہ اول (غیر مطبوعہ) بحوالہ اسلام اور عصر جدید۔ (7)2۔اپریل 1975ء۔

526- ریحانا کرام۔(1996ء)۔آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا ارتقاء اور تعلیمی خدمات کا جائزہ۔ کراچی: غیر مطبوعہ مقالہ ایم۔ایڈ، جامعہ ملیہ گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن۔

527- شعبہ تنظیم۔(1963ء)۔روداد جماعت اسلامی حصہ سوم۔لاہور: شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی پاکستان۔

528- شمیم اختر۔(1996ء)۔دیوبند اور علی گڑھ کا تقابلی جائزہ۔ فیصل آباد: غیر مطبوعہ مقالہ ایم۔ایڈ، گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن۔

529- مجلس انتظامیہ۔(1921ء)۔روداد، 4 نومبر 1921ء۔دہلی: مکتبہ جامعہ۔

530- ________ (1924)ء۔روداد، جلسہ انجمن جامعہ ملیہ 17 فروری 1924ء۔دہلی: مکتبہ جامعہ۔

531- ________ (1948ء)۔روداد انجمن جامعہ ملیہ منعقدہ 20۔اکتوبر 1948ء۔دہلی: مکتبہ جامعہ۔

532- مرقع کانفرنس اجلاس۔(1888ء)۔تحریک شیخ خیر الدین، تائید خلیفہ عماد الدین۔آگرہ: مفید عام پریس۔

533- محمد اقبال، علامہ۔(21۔مارچ 1932ء)۔خطبہ صدارت۔آل انڈیا مسلم کانفرنس۔لاہور۔

534- محمد علی، شیخ۔(2005ء ب)۔سندھ مدرسۃ الاسلام کا 121واں یوم تاسیس، تقریر بمقام سندھ مدرسۃ الاسلام بتاریخ یکم ستمبر 2005ء۔کراچی۔

(و)۔انگریزی

Reference Books

535- Elexender Hamilton Ait-Ken. (1907). *Gazetteer of the Province of Sindh*, Vol. A. Karachi.

536- Good, Carter, V. (1950). *Dictionary of Education*. New York: McGraw Hill Book Co.

537- Hastings, James, Editor. (1937). *Encyclopaedia of Religion and Ethics*, Vol. 2, London.

538- Joseph. T. Shipley. (1957). *Dictionary of Word Origins.* New York: Philosophical Library.

539- Muhammad Ahmad, Ali. (1998). *Islamic College Peshawar......... History and Achievement.* Peshawar: Unpublished Thesis of M.A. (Pakistan Studies), University of Peshawar.

540- William Bentor Publishers. (1960) *Encyclopaedia Britannica,* Vol. 6. London.

541- William Bentor Publishers. (1960) Encyclopaedia Britannica, Vol. 7. London.

Miscellaneous Books

542- Abdul Ghafur, Chaudhri. (1992). *Some Aspects of Islamic Education.* Lahore: Universal Books, 40-A, Urdu Bazar.

543- Abdul Majid, Afghani. (1921). *Hayat Qumi.* Peshawar: Steam Press.

544- Abdul Vahid, Syed. (1973). *Thoughts and Reflections of Iqbal.* Lahore: Sh. Muhammad Ashraf.

545- Abdul Salam, Nadvi. (1975). *85 Years of Nadwatul Ulama.* Lucknow: Nadwatul Ulama.

546- Agha Khan Third. (1954). *The Memories of Agha Khan, World Enough and Time.* New York: Simon & Schuster.

547- Akhtar-ul-Wasey. (1978). *Education of Indian Muslims.* Aligarh.

548- Altaf Ali, Brelvi Syed. (1997). *The Struggle of Muslims in Education.*

Karachi: All Pakistan Educational Conference.

549- Archer, J.C. (1946). The Sikhs. Princiton: Princinton University Press).

550- Aziz, M.A. (1965). *The Educational Pyramid Reinverted.* Lahore: United Publishers.

551- Aziz Ahmad. (1907). *Islamic Modernism in India and Pakistan.* Lahore: Khadim-ul-Ta'lim Press. (Other edition in 1967. London: Oxford University Press).

552- Baha Lal. (1978). N.W.F.P. *Administration Under British Rule 1901-1919*. Islamabad: National Commission on Historical and Cultural Research.

553-Barbara Daly Metcalf. (1989). *Islamic Revival in British India. Deoband, 1860-1900.* Karachi: Royal Book Company.

554- Basu, B.D. (1922). *History of Education Under the East India Company.* Calcutta: Modern Review Office.

555- Bause, B.D. Major. (1922). *The Rise of the Christian Power in India.* Calcutta. Probasi Press.

556- ________. (1931). *The Rise of Christian Power in India.* Calcutta: R. Chatterjee. (Other Editions in 1920, 1923).

557- ________. (1974). *The Indian Musalman.* Lahore.

558- Behram, B.K. (1942). *Educational Controversies in India.* Bomby: D.B. Tarapore Wala Sons and Company.

559- Browne, E.G. (1951). *Literary History of Persia.* Cambridge: Cambridge University Press.

560- Dutt, Romash. (1956). *Economic History of British India.* London: Routledge & Paul.

561- G. Allana. (1969). *Our Freedom Fighter (1562-1947).* Karachi: Nawa-i-Waqat Printers Ltd.

562- Graham, G.F.I. (1885). *The Life and Works of Syed Ahmad Khan CSI Pori. Edenburg, London,*Delhi:Idara-i-Adbiyat-i-Delhi.

563- Grant James. (1880). *Cassell's Illustrated History of India*, Vol. 2. London: Casell and Co.

564- Gunnar Myrdal. (1968). *Asian Drama* Vol. III. London: Allen Lane the Penguine Press.

565- Hunter, W.W. (1945). *The Indian Musalamans.* Calcutta.

566- --------------- . (1968). *The Indian Musalmans.* Lahore: The Primier Book House, Katchery Road.

567- Ishtiaq Hussain, Qureshi. (1958). *The Administration of the Sultanate of Delhi.* Karachi.

568- ______________________. (1974). *Education in Pakistan.* Karachi: Arafat Publications.

569- Ishwari Prasad. (1930). *Muslim Ruule in India.* Allahabad: The Indian Press Limited.

570- _____________. (1932). *History of the Qaranuah Turks in India.* Allahabad: Central Book Depot.

571- Jadunath Sarkar. (1938). *Fall of the Mual Empire.* Calcutta: M.C. Sarkar.

572- _____________. (1949). *Fall of the Mughul Empire.* Calcutta. M.C. Sarkar.

573- _____________. (1952). *Shivaji and His Times.* India: M.C. Sarkar.

574- Jaffar. S.M. (1936). *Education in Muslim India.* Pesawar: Kissa Khawani Bazar.

575- Jose Ortega, Y. Gasset Kegan Paul. (1946). *Mission of the University.* London: Routledge & Kegan Paul.

576- Khalid Bin Sayeed (1951). *Pakistan the Formation Phase.* Karachi: Oxford University Press. (Other Edition in 1968).

577- Khaliquezzaman Chaudhri. (1961). *Pathway to Pakistan*. Lahore: Longman, Green & Co.

578- Khushwant, Singh. (1953). *The Sickhs*. Princeton: Princeton University Press.

579- Lala Lajpat Rai. (1927). *Young India.* Delhi.

580- Lane-Pool, Stanley. (1893). *Aurangzeb, Rulers of India Series.* Oxford: Oxford University Press.

581- Lloyd Thrope, C. (1965). *Education and Development of Muslim Nationalism in Pre-Partition India*. Karachi: New Karaching Housing.

582- Ludlow John. (1858). *British India,* Vol. II. U.S.A. Kessinger Publishing. (Other Edition in 2008).

583- Law, N.N. (1915). *Promotion of Learning in India*. London: Longman, Green.

584- ________. (1916). *Promotion of Learning in India by Early European Setters.* London: Longman, Green.

585- Mallick, A.R. (1961). *British Policy and the Muslim Bengal.* Dacca: Asiatic Society.

586- Marshman, John Clark. (1873). *Abridgement of the History of India, Serampure.* London: William Black Wood & Sons.

587- Max, Muller. (1899). *Six Systems of Indian Philosophy*. London: Longman, Green.

588- Mohsani, S.R. (N.A.) *Adult and Community Education.* Delhi: Indian Adult Education Association.

589- Muhammad Ali, Johar Molana. (1924). *The Scheme of Studies for National Muslim Educational Institutions in India.* Delhi: Jamia.

590- Muhammad Ali, Shaikh. (2005A). *Sindh Modressah...... The Institution and the Alumni.* Karachi: Azad Communications.

591- Mahmood Hussain. (1957). *A History of Freedom Movement.* Karachi.

592- Muhammad Iqbal. (1967). *Education in Pakistan.* Karachi:Oxford University Press.

593- Muhammad Nazim, Dr. (1931). *Life and Times of Sultan Mahmood of Ghazna.* Delhi: Cambridge University Press.

594- Naurung, G.C. (1956). *Transformation of Sikhism.* Delhi: New Book Society of India.

595-. Nurullah, Syed and Naik. (1951). *A History of Education in India During the British Period.* Bombay: MacMillan.

596- _________ (1956). *Student's History of Education in India.* Bombay: Time of India Press.

597- Olaf Caroe. (1965). *The Pathans.* London: MacMillan.

598- Philip Hartong. (1939). *Some Aspects of Indian Education ...... Past and Present.* London: Oxford University Press.

599- Ram Babu Saccina. (1999 2nd Ed.). *A History of Urdu Literature*, Vol. I, Urdu Translation by Mirza Muhammad Ascary. Lucknow: Adam Publishers Delhi.

600- Rashid Ahmad, Nadvi. (1957). *History of Freedom Movement,* Vol. I. Karachi: Pakistan Historical Society.

601- Rawat, L.P. (1917). *History of Indian Education.* Agra: Ram Prasad.

602- Razi Wasti, Syed. (1968). *Memories and Other Writings of Syed Amir Ali.* Lahore: Publishers United.

603- Riaz Ahmad (1986). *Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah The Formative Years (1892-1920).* Islamabad: National Institute of Historical and Cultural Research.

604- Robson's James. (1956). Use of Isnads, *Bulletin of the John Ryland Library,* Vol. 38, 2nd March. U.K: University of Manchester.

605- Russel, William Howard. (1957). *My Indian Mutiny Diary, Edited by Michael Edward.* London.

606- R.V. Parulekar. (1939). *Literacy in India.* Bombay: MacMillan.

607- Savarkar, V.D. (1909). *The Indian War of Independence.* Holland.

608- Sharp, H. (1920). *Selection from Educational Records (1781-1839).* Calcutta: Superintendent of Government Printing.

609- Sherma, S.R. (1940). *The Religious Policy of The Mughal Emperors.* Delhi: Oxford University Press.

610- Sleeman, William, H. (1844). *Rambles and Collection.* London: J. Hatchard and Sons.

611- Smith, R. Bosworth. (1885). *Life of Lord Lawrence.* London: Smith, Elder & Thomas Nelson.

612. Smith, V.A. (1917). *Akbar the Great Mogel.* Oxford: Clarendon Press.

613- Springer. (1856). Introduction, *Al Isabah (Ibn-i-Hajar).* Calcutta: Biship's College Press.

614- Syed Mahmood. (1895). ***A History of English Education (1781-1893).*** **Aligarh: The Honorary Secretary of the M.A.O. College.**

615- Tara Chand. (1943). ***Dara Shakoh and The Islamic Culture.*** **Allahabad: The Indian Press.**

616- Temple, Sir Richard. (1882). ***Men and Events of My Time in India*****. London: John Murray.**

617- Thompson, Edward and Garratt, G.T. (1934). ***Rise and Fulfilment of British Rule in India.*** **London: MacMillan.**

618- Thornton, Edward. (1823). ***Chapters of the Modern History of British India.*** **London.**

619- Trevelyan, Charles, E. (1838). ***On the Education of the People of India.*** **London: Longman, Orme, Brown, Green and Longmans.**

620- William Adam. (1868). ***Report on Vernacular Education of Bengal and Bihar.*** **Calcutta: Home Secretariat Press.**

621- Yasmeen Lari. (1996). ***The Dual City Karachi During the Raj.*** **Karachi: Oxford University Press.**

622- Yousaf Ali, Khan. (1990). ***Academics Versus Activists - A history of the University of Peshawar.*** **Peshawar: Khyber Printers.**

623- Yousaf Hasan (1967). ***Selected Documents from the Aligarh.*** **Calcutta: Archives Asis Publishing House, Bombay, Madrass, Calcutta.**

624- Zianuddin Ahmad, Prof. (1997). Foreword, ***The Struggle of Muslims in Education by Syed Altaf Ali Brevli.*** **Karachi: All Pakistan Educational Conference.**

Journals, Brochures, Prospectus

625- Ali Muhammad Khawaja. (1960). Historyof Sind Madressah-Tul-Islam, *The Platinum Jubilee Book.* Karachi: Sind Madrssah-Tul-Islam.

626-. Amjad Hussain, Dr. (1988).گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را, *The Khyber Diamond Jubilee Number*. Mardan: Kausar Printing Press.

627- Atiya Ruby. (1988). The Grand Old Man of NWFP, *The Khyber Diamond Jubilee Number*. Mardan: Kausar Printing Press.

628- Dilwar Shah. (1988). Islamia College Life Witnessed, *The Khyber Diamond Jubilee Number.* Mardan: Kausar Printing Press.

629- Farhad Jan (1988). A Look Back, *The Khyber Diamond Jubilee Number.* Mardan: Kausar Printing Press.

630- Ghohar Zaman. (1988). The Founder of Darul-Ulum, *The Khyber Diamond Jubilee Number.* Mardan: Kausar Printing Press.

631- Hassanally A. Rehman. (1960). Hassanally Bey Effendi...... Founder of Sind Madressah, *The Platinum Jubilee Book.* Karachi: Sind Madressah-Tul-Islam.

632- Institution. (1966). The Calendar of the University of Peshawar. Peshawar: Ferozsons Ltd.

633- Ismatullah. (1990). An Introduction to the Publications of Islamia College - *The Khyber:* Peshawar: Unpublished M.A.

Thesis, Department of Journalism, Peshawar University.

634-Khiliji, J.D. (1963). Glorious Half Century of Darul Ulum-e-Islamia, *Golden Jubilee Brochure of Islamia College and Collegiate School.* Peshawar: Ferozsons Ltd.

635-________. (1988). Glorious Three Quarters of a Country of Darul Ulum-e-Islamia, *Diamond Jubilee, a brochure of Islamia College and Collegiate School.* Peshawar.

636-Mahtab Khan, Yousafzai. (1988). My Alma-Mater The Islamia College, *The Khyber Diamond Jubilee Number*. Mardan: Kausar Printing Press.

637-Manzural Haq Hassanally Effendi. (1960). Muslim Education in Sind, *The Platinum Jubilee Book.* Karachi: Sind Madressah-Tul-Islam.

638-Muhammad Abdul Hai. (1938). Islamia College Peshawar, *The Khyber.*

639-Muhammad Ali Shaikh. (1998). *Alma Mater of Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah… Sind Madrssah-tul-Islam Karachi.* Karachi: Prospectus 1998-1999.

640-Muhammad Irshad. (1988). Our Sweet Memories, *The Khyber Diamond Jubilee Number.* Mardan: Kausar Printing Press.

641-Muhammad Sardar, Khan. (1988). Reminiscences of the Days Spent in Islamia College Peshawar, *The Khyber Diamond Jubilee Number.* Mardan: Kausar Printing Press.

642-Munwar Ibne Sadiq. (1993). What is Education? *Journal of Elementary Education* (1)3. Lahore.

643-Naushad, Khan Dr. (May 1996). Islamia College Peshawar. *The Busy World*, Monthly Journal. Peshawar.

644-_________________. (2006). Islamia College Peshawar at a glance, *a brochure*. Peshawar: University of Peshawar.

645-Nisar Hassanally, Effendi. (1960). Life Sketch of K.B. Hassanally Effendi Bay Majidi, *The Platinum Jubilee Book*. Karachi: Sind Madressah-tul-Islam.

646- Shah Muhammad, Mir. (1960). Late Mr. T.H. Vines - The Most Beloved and Charished Principal of the Sind Madressah, *The Platinum Jubilee Book*. Karachi: Sind Madressah-tul-Islam.

647- Shakeel Ahmad. (1985). The Birth of Islamia College, *A Brochure on Darul Ulum Sarhad in the Memory of Sahibzada Abdul Qayum Khan*. Peshawar: Islamia Collegiate School and College, Peshawar.

648- S.M. Chaghtai, Dr. (1988). From Golden to Diamond Jubilee - A Journey of Success, *The Khyber Diamond Jubilee Number*. Mardan: Kausar Printing Press.

649- Soba-e-Tamir-o-Tarraqqi. (1981). *Darul Uloom Nadwatul Ulama Lucknow (India)*. Lucknow: A Brochure of Darul Uloom.

Websites

650- www.jmi.nic.in. (2006). Jamia Millia Islamia.

651- www.storyofpakistan.com. (2002). Aligar Movement (1858-98).

652- www.storyofpakistan.com. (2002). Anjuman Himayat-i-Islam, Lahore (1884-1947).

653- www.storyofpakistan.com. (2002). Deoband Movement (1886-1947)

654- www.storyofpakistan.com. (2002). Nadva-tul-Ulama Lucknow (1894-1947).

ضمیمہ نمبر 1 (الف)

دارالعلوم دیوبند کے درجاتِ عربیہ کا آٹھ سالہ نصابِ تعلیم

سال اوّل

فن	اسمائے کتب
صرف	عربی کا قاعدہ
	میزان الصرف و منشعب تمام پنج گنج تمام
نحو	میر نحو میر تمام حفظ شرح مائۃ عامل تمام
عربی ادب	روضۃ الادب باستثنا عباب المکاتیب
	انشاء عربی انشر عربی کا معلم اول و دوئم
منطق	تیسیر المنطق
خوشنویسی	تصحیح خط واملا نویسی
تجوید	مشق تجوید پارہ عم ربع اول وادعیہ ماثورۃ

سال دوم

فن	اسمائے کتب
فقہ	نورالایضاح تمام قدوری تا کتاب الحج
نحو	ہدایت النحو تمام، النحو الواضح ابتدائی حصہ اول
	النحو الواضح ابتدائی حصہ اول
صرف	علم الصیغہ تا خاصیات
	فصول اکبری (از خاصیات)
عربی اداب	نفحۃ الادب تمام۔ تمرین عربی
تجوید	مشق تجوید پارۂ عم ثلث آخر حفظ جمال القرآن تمام
خوشنویسی	تصحیح خط واملا

سال سوم

فن	اسمائے کتب
تفسیر	ترجمۃ القرآن سورہ بقرہ
فقہ	قدوری از کتاب البیوع تا ختم
نحو	ابن عقیل تا صفحہ 300، شرح جامی (فعل و حرف)
عربی ادب	نفحۃ العرب (نثر)
منطق	شرح تہذیب تا ضابطہ قطبی تصدیقات
حدیث	کتاب الآثار
فنون عصریہ	الف (1) تاریخ ہند از عہد سلطان محمود غزنوی

سال چہارم

فن	اسمائے کتب
تفسیر	ترجمۃ القرآن از سورۃ آل عمران تا سورۂ مریم
فقہ	کنز الدقائق تا کتاب النکاح
	شرح وقایہ جلد ثانی تا کتاب العتاق
اصول فقہ	اصول الشاشی تمام
معانی	مختصر المعانی تا ختم فن ثانی، تلخیص المفتاح صرف فن ثالث
منطق	سلم العلوم تا ختم تصورات
فلسفہ	ہدیہ سعیدیہ (نصف اوّل)

1947ء(2)تاریخ اسلام خلفائے راشدین،بنی امیہ،بنی عباس،تاریخ سلطنت ترکی
(3)بلدیات(مبادی علم مدنیت)
(ب)(2)جغرافیہ جزیرۃ العرب ودیگر بلاد اسلامیہ(4)جغرافیہ عالم(خطودار)

حدیث	الفیتہ الحدیث
فنون عصریہ	(1)جنرل سائنس(مبادی کیمیاء وطبعیات حیوانات ونباتات(فطری) (2)اصول حفظان صحت(ب)(1)دستور ہند کے بعض ضروری ابواب(2)مبادی معاشیات (3)چند جدید فلسفیوں کے نظریات وسوانح

سال پنجم

فن	اسمائے کتب
فقہ	ہدایہ ربع اول
	ہدایہ ربع ثانی
عربی ادب	مقامات حریری 10 مقالے
منطق	ملاحسن تا جنس
اصول فقہ	نورالانوار تا قیاس
عقائد	عقیدہ الطحاوی (تمام)
معانی وبیان	البلاغۃ الواضحہ

سال ششم

فن	اسمائے کتب
تفسیر	جلالین شریف تمام (دو گھنٹے روزانہ)
اصول تفسیر	الفوز الکبیر شریف تمام (دو گھنٹے روزانہ)
اصول فقہ	حسامی تمام
فلسفہ	میبذی تمام
عربی ادب	دیوان المتنبی تا ختم قافیہ دال
	تمرین عربی،انشائے محادثہ
	تجوید یا خوشنویسی

سال ہفتم

فن	اسمائے کتب
فقہ	ہدایہ آخرین تمام (دو گھنٹے روزانہ)
عقائد وکلام	شرح عقائد نسفی تمام
تفسیر	بیضاوی سورۃ بقرہ سوا پارہ
حدیث	مشکوٰۃ شریف (تمام)
اصول حدیث	شرح نخبۃ الفکر (تمام) (دو گھنٹے روزانہ)
فرائض	سراجی تمام

اختیاری مضامین

فن	اسمائے کتب
اصول تفسیر	تلخیص الاتقان
اصول حدیث	مقدمہ ابن صلاح
کلام	مسامرہ
منطق	حمداللہ
ادب	دیوان حماسہ (باب الادب والحماسہ)
	النثر الجدید

سال ہشتم دورہ حدیث

فن	اسمائے کتب
حدیث	بخاری شریف تمام
	مسلم شریف تمام
	ترمذی شریف تمام
	ابوداؤد شریف تمام
	نسائی شریف
	ابن ماجہ شریف
	طحاوی شریف
	شمائل ترمذی شریف
	موطائین

درجاتِ تکمیل تکمیل تفسیر

فن	اسمائے کتب
تفسیر	تفسیر مدارک پارہ 1 تا 5
	تفسیر مدارک پارہ 6 تا 10
	تفسیر مظہری پارہ 11 تا 15
	تفسیر مظہری پارہ 16 تا 20
	تفسیر بیضاوی شریف پارہ 21 تا 25
	تفسیر بیضاوی شریف پارہ 26 تا 30
	تلخیص الاتقان

تکمیل دینیات

فن	اسمائے کتب
تفسیر	تفسیر ابن کثیر سورۃ البقرہ آل عمران
حکمت شرعیہ	حجۃ اللہ البالغہ
مناظرہ	رشیدیہ
فقہ	الاشباہ والنظائر تا فن اول
اصول فقہ	توضیح تلویح
اصول حدیث	مقدمہ ابن صلاح
حدیث فقہ	مقدمہ فتح الباری، بدایۃ المجتہد، تدریب الراوی

تکمیل ادب

نظم

دیوان حسان بن ثابتؓ

سبعہ معلقہ تا 3

(نثر)

اسالیب الانشاء

جرائد ورسائل

(تاریخ)

تاریخ الادب العربی

معانی وبیان

البلاغۃ الواضحہ

(انشاء)

مقالات عربی

(مطالعہ)

حیاتی احمد امین۔الایام ڈاکٹر طٰہٰ حسین

عبرات۔المنفلوطی۔عبقریات محمود العقاد

تکمیل معقولات

قاضی مبارک تا (امہات المطالب)

حمداللہ تا شرطیات

صدرا تا بحث صورت جسمیہ

شمس بازغہ تا بحث مکان ص 40

شرح عقائد جلالی تا بحث اصلح ص 72

مسلم الثبوت 4 باب

مطالعہ

مقدمہ ابن خلدون

رسالہ حمیدیہ

ضمیمہ نمبر 1 (ب)

طبقات مشاہیر علماء دیوبند

محدثین

مولانا احمد علی سہارنپوری
مولانا رشید احمد گنگوہی
مولانا محمد قاسم نانوتوی
مولانا محمد مظہر نانوتوی
مولانا محمد یعقوب نانوتوی
شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی
مولانا فخر الحسن گنگوہی
مولانا خلیل احمد سہارنپوری
مولانا عبد العلی میرٹھی
مولانا علامہ انور شاہ کشمیری
شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی
مولانا محمد اسحاق امرتسری
مولانا بدر عالم میرٹھی
مولانا محمد ادریس کاندھلوی
مولانا عبد العزیز گجرانوالہ
مولانا فخر الدین مرادآبادی
شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوری
مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی
مولانا سید محمد یوسف بنوری
مولانا ماجد علی جون پوری
مولانا عبد الغفار مئوی
مولانا ظفر احمد عثمانی
مولانا شبیر احمد عثمانی
مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی
مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری
مولانا عبد الرحمٰن کامل پوری

مفسرین

شیخ الہند مولانا محمد محمود حسن دیوبندی
مولانا عبد الرحمٰن امروہوی
حکیم الامتہ مولانا اشرف علی تھانوی
مولانا شبیر احمد عثمانی
مولانا احمد علی لاہوری
مولانا احمد سعید دہلوی
مولانا حسین علی پنجابی
مولانا محمد ادریس کاندھلوی
مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
مولانا علامہ شمس الحق افغانی

مولانا غلام اللہ خان
مولانا قاضی زاہد الحسینی
مولانا اخلاق حسین قاسمی

متکلمین اسلام

مولانا محمد قاسم نانوتوی
مولانا رحیم اللہ بجنوری
مولانا مرتضی حسن چاند پوری
مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی
مولانا قاری محمد طیب قاسمی
مولانا علامہ محمد ابراہیم بلیاوی
مولانا شبیر احمد عثمانی
مولانا علامہ شمس الحق افغانی
مولانا سید مناظر احسن گیلانی
مولانا علامہ خالد محمود
مولانا قاضی مظہر حسین

مصنفین و مورخین

مولانا محمد قاسم نانوتوی
مولانا اشرف علی تھانوی
مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی
مولانا مناظر احسن گیلانی
مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی
مولانا قاری محمد طیب قاسمی
مولانا سعید احمد اکبرآبادی
مولانا محمد زکریا شیخ الحدیث سہارنپوری
مولانا سید محمد میاں دیوبندی
مولانا قاضی زین العابدین
مولانا نور الحسن شیرکوٹی
مولانا یعقوب الرحمٰن
مولانا محمد منظور نعمانی
مولانا سرفراز احمد صفدر
مولانا سید نور الحسن بخاری
مولانا قاضی محمد اطہر مبارک پوری
مولانا محمد تقی عثمانی
مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی
مولانا اخلاق حسین قاسمی

فقہا

مولانا رشید احمد گنگوہی
مولانا مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی
مولانا سعادت علی سہارنپوری
مولانا اشرف علی تھانوی
مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی
مولانا اعزاز علی امروہوی

مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی
مولانا مفتی محمد سہول بھاگیوری
مولانا مفتی ریاض الدین بجنوری
مولانا مفتی محمد فاروق
مولانا مفتی کفایت اللہ میرٹھی
مولانا مفتی سید مہدی حسن شاہجہانپوری
مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی
مولانا مفتی نظام الدین اعظمی
مولانا مفتی محمد اسمٰعیل بسم اللہ سورتی
مولانا مفتی احمد سعید اجراڑوی
مولانا فقیر اللہ رائے پوری
مولانا مفتی محمود سرحدی
مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی
مولانا مفتی محمد یوسف آزاد کشمیر
مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی
مولانا مفتی عبدالرحیم لاجپوری
مولانا مفتی عبدالکریم گمتھلوی
مولانا مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی
مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی
مولانا مفتی منظور احمد مظاہری
مولانا ابوالقاسم نعمانی
مولانا مفتی عبدالرحمٰن دہلی
مولانا مفتی شبیر احمد مدرسہ شاہی
مولانا قاضی مجاہد الاسلام
مولانا مفتی ابوزید باندہ

اصحاب تدریس

مولانا محمد یعقوب نانوتوی
مولانا سید احمد دہلوی
مولانا احمد حسن امروہوی
شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی
مولانا منفعت علی
مولانا عبدالعلی میرٹھی
مولانا عبدالمومن دیوبندی
مولانا محمد مظہر نانوتوی
مولانا غلام رسول خاں ہزاروی
مولانا محمد صدیق انبہٹوی
مولانا کریم بخش سنبھلی
مولانا محمد ابراہیم بلیاوی
مولانا خیر محمد جالندھری
مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری
مولانا محمد صدیق کشمیری
مولانا محمد عبدالسمیع دیوبندی
مولانا زین العابدین اعظمی
مولانا محمد یحیٰی سہرامی
مولانا مفتی محمد سہول بھاگلپوری
مولانا محمد اعزاز علی امروہوی

مولانا محمد مراد پاک پٹنی
مولانا سید اصغر حسین دیوبندی
مولانا محمد رسول خاں
مولانا عبدالحق اکوڑوی
مولانا حمید الدین فیض آبادی
مولانا محمد حیات سنبھلی
مولانا محمد احسن کان پوری
مولانا عبدالستار معروفی
مولانا بشیر احمد بلند شہری
مولانا معراج الحق دیوبندی
مولانا محمد حسین بہاری
مولانا شکر اللہ اعظمی
مولانا علی احمد اعظمی
مولانا عبدالصمد

مبلغین اسلام

مولانا محمد الیاس کاندھلوی
مولانا سید مرتضیٰ حسن بجنوری
مولانا محمد یوسف کاندھلوی
مولانا قاری محمد طیب
مولانا ابوالوفا شاہجہانپوری
مولانا محمد ادریس سکروڈوی
مولانا سید معظم علی
مولانا محمد قاسم شاہ جہانپوری
مولانا عبدالجبار حصاروی
مولانا محمد علی جالندھری
مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادی
مولانا احتشام الحق تھانوی
مولانا عبیداللہ بلیاوی
مولانا محمد عمر پالن پوری
مولانا سید اسعد مدنی
مولانا قاری محمد صدیق
مولانا محمد سالم قاسمی
مولانا عبدالعلیم فاروقی

حضرات مشائخ

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی
مولانا رشید احمد گنگوہی
مولانا خلیل احمد سہارن پوری
مولانا اشرف علی تھانوی
مولانا سید حسین احمد مدنی
مولانا محمد علی مونگیری
مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری
مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندی
مولانا ضرغام الدین فیض آبادی
مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری
مولانا عبدالغفور عباسی مدنی
مولانا احمد علی لاہوری

مولانا مفتی محمد حسن

مولانا قاری محمد طیب قاسمی

مولانا اسعد اللہ رام پوری

مولانا منت اللہ رحمانی

مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری

مولانا قاری فخر الدین گیاوی

مولانا عبد الجبار

مولانا ابرار الحق ہردوئی

مولانا قاری محمد صدیق

مولانا محمد طلحہ کاندھلوی

مولانا خیر محمد جالندھری

مولانا محمد زکریا

مولانا عبد الحق اکوڑوی

مولانا شاہ عبد الغنی پھولپوری

مولانا مسیح اللہ خاں جلال آبادی

مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی

مولانا احمد علی آسامی

مولانا سید اسعد مدنی

مولانا انعام الحسن کاندھلوی

مجاہدین و قائدین ملت

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی

مولانا سید حسین احمد مدنی

مولانا خلیفہ غلام محمد دین پوری

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

مولانا محمد صادق کراچی سندھ

مولانا احمد علی لاہوری

مولانا سید محمد میاں دیوبندی

مولانا احتشام حسین تھانوی

مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا محمد میاں منصور انصاری

مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

مولانا سجاد حسین بہاری

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

مولانا مفتی محمود سابق وزیر سرحد

مناظرین اسلام

مولانا محمد قاسم نانوتوی

مولانا خلیل احمد سہارنپوری

مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری

مولانا سید ارشاد احمد فیض آبادی

مولانا احمد حسن لاہوری

مولانا سید مرتضیٰ احسن چاندپوری

مولانا اسعد اللہ رام پوری

مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی

مولانا منظور احمد نعمانی	مولانا نور محمد ٹانڈوی
مولانا عبداللطیف اعظمی	مولانا عبدالسلام فاروقی لکھنوی
مولانا عبدالحکیم لکھنوی	مولانا قاضی محمد مظہر حسین
مولانا عبدالستار تونسوی	مولانا لال حسین اختر
مولانا محمد حیات فاتح قادیان	مولانا علامہ خالد محمود
مولانا محمد اسمٰعیل کٹکی	مولانا امام علی دانش لکھیم پوری

صحافی واہل قلم

مولانا سید مناظر احسن گیلانی	ایڈیٹر ماہنامہ القاسم دارالعلوم دیوبند
مولانا منظور احمد نعمانی	ایڈیٹر ماہنامہ الفرقان بریلی ولکھنو
مولانا سعید احمد اکبرآبادی	ایڈیٹر ماہنامہ برہان دہلی
مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی	آپ کی ادارت میں دسیوں رسائل جاری ہوئے
مولانا مظہر الدین بجنوری	روزنامہ الامان دہلی
مولانا شائق عثمانی	عصر جدید کلکتہ
مولانا عامر عثمانی	ماہنامہ تجلی دیوبند
مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی	الحرم میرٹھ
مولانا حبیب الرحمٰن بجنوری	منصور اور الخلیل ہفتہ وار
مولانا عبدالوحید صدیقی	نئی دنیا
مولانا ازہر شاہ قیصر	ماہنامہ دارالعلوم دیوبند (سابق ایڈیٹر)
مولانا حامد الانصاری غازی	مدینہ بجنور اور جمہوریت دہلی
مولانا محمد تقی عثمانی	البلاغ کراچی
مولانا سمیع الحق	الحق اکوڑہ خٹک
مولانا مفتی محمد یوسف لدھیانوی	بینات بنوری ٹاؤن کراچی
مولانا عبدالعلی	البدر کاکوری
مولانا محمد صادق علی بستوی	نقوش حیات بستی

مولانا اسیر ادروی — ترجمان اسلام بنارس، سہ ماہی

مولانا اعجاز احمد اعظمی — المآثر مئو، سہ ماہی

مولانا مفتی محمد سلمان منصور پوری — ندائے شاہی مرادآباد

مولانا نور الحسن راشد — احوال وآثار مفتی الٰہی بخش اکاڈمی کاندھلہ

مولانا محمد ہاشم القاسمی — الفیصل حیدرآباد

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی — بحث ونظر پٹنہ سہ ماہی

مولانا رضوان القاسمی — صفا، جامعہ سبیل السلام حیدرآباد

حبیب الرحمٰن قاسمی — ماہنامہ دارالعلوم دیوبند

مولانا کفیل احمد کیرانوی — آئینہ دارالعلوم، دیوبند (پندرہ روزہ)

مولانا نور عالم امینی — الداعی (عربی)

مولانا محمد سالم جامعی فاضل دیوبند — ہفت روزہ الجمعیۃ دہلی

ضمیمہ نمبر 2

تراجم شائع کردہ سائنٹیفک سوسائٹی

Translations published by the scientific Society.

(1) Bollen's "Ancient History of Egypt."

(2) Persian Translation of "Exoos's History of China."

(3) Bollen's "Ancient History of Greece."

(4) Scott Burn's "Modern Farming."

(5) William Senior's "Political Economy."

(6) Elphinston's "History of India."

(7) Harris's "Electricity."

(8) Willinson's "Geography" Compiled from various English works.

(9) Selection from Mill's "Political Economy."

(10) Sir John Malcolm's "History of Persia."

(11) Todhunter's "Mansuration."

(12) Todhunter's "Trigonometry."

(13) Todhunter's "Algebra for beginners."

(14) Todhunter's "Theory of Equation."

(15) Galbraith and Haughton's "Scientific Manual Euclid."

(16) Galbraith and Haughton's "Scientific Algebra."

(17) Todhunter's "Euclid."

(18) Bernard Smith's "Arithmetic" for Schools.

(19) Bernad Smith's "Algebra for Schools.

(20)Galbraith's "Arithmetic."

(21) Todhunter's "Algebra for Colleges and Schools."

(22) Todhunter's "Plain Coordinate Geometry."

(23) Todhunter's "Integral Calculus."

(24) Todhunter's "Differential Calculus."

ضمیمہ نمبر 3 (الف)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قابل اساتذہ و معلمین کی فہرست

نام	تعلیم	مضامین
1۔ڈاکٹر ذاکر حسین خان	ایم اے، پی ایچ ڈی (برلن)	معاشیات۔انگریزی۔جرمن
2۔ڈاکٹر سید عابد حسین	ایم اے، پی ایچ ڈی (برلن)	فلسفہ و تعلیم
3۔ای۔جے کیلاٹ	ایم اے، (مدارس)	تاریخ وسیاسیات
4۔طاہر الیس محمدی	ایم اے، ایل ایل بی (بمبئی)	معاشیات و انگریزی
5۔محمد مجیب	بی اے (آکسن)	انگریزی و تاریخ ہند وروسی
6۔دیوی داس گاندھی		ہندو اخلاقیات و ہندی و تکلی
7۔مس گرڈا فلسپیرن	(برلن)	جرمن اور کنڈر گارٹن
8۔مولانا خواجہ عبدالحی		تفسیر القرآن
9۔مولانا محمد اسلم جیراجپوری		عربی و تاریخ اسلام
10۔مولانا سید شرف الدین مومن ٹونکی		فارسی و اردو
11۔سید نذیر نیازی	بی۔اے (جامعہ)	تاریخ اسلام و ہند
12۔مولوی شفیق الرحمٰن	بی۔اے (جامعہ)	معاشیات
13۔ارشاد الحق	بی۔اے (علیگ)	انگریزی
14۔علی احمد خان	بی۔ایس۔سی (جامعہ)	سائنس
15۔سعید انصاری	بی۔ایس۔سی (جامعہ)	اردو و تاریخ ہند و لندن
16۔مولوی سعد الدین انصاری ندوی	(جامعی)	اسلامیات و چرخہ
17۔برکت علی	ایف۔ایس۔سی (علیگ)	ریاضی
18۔اختر حسن فاروقی	آرٹسٹ (لکھنو)	ڈرائنگ
19۔عبدالحی		نجاری و نقاشی
20۔شیخ محمد مفتاح الدین		اردو و حساب
21۔منشی علی محمد خان		خطاط
22۔عبدالغفار مدھولی	جامعی نارمل (موگا)	اردو
23۔سید نور شاہ	ایف۔ایس۔سی، بی ٹی (علیگ)	حساب
24۔سید احمد علی آزاد	جامعی نارمل (موگا)	معلومات عامہ
25۔محمد عثمان		اردو
26۔مولوی فضل الرحمٰن	(افغانی)	اسلامیات

ضمیمہ نمبر 3 (ب)

جامع ملّیہ اسلامیہ کے وائس چانسلرز کا تصویری ریکارڈ

Maulana Mohammed Ali Johar
(1920-1923)

Mr. Abdul Majeed Khwaja
(1923-1925)

Dr. Zakir Husain
(1926-1948)

Prof. Mohammad Mujeeb
(1948-1973)

Prof. Masud Husain Khan
(1973-1978)
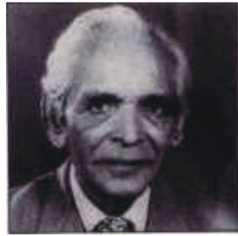
Mr Anwar Jamal Kidwai
(1978-1983)

Prof. Ali Ashraf
(1983-1989)

Dr. Syed Zahoor Qasim
(1989-1991)
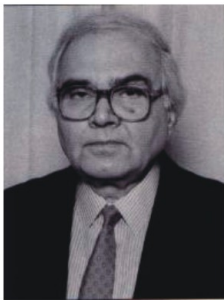
Prof. Bashiruddin Ahmad
(1992-1996)

Lt. Gen. M.A. Zaki
(1996-1999)

Mr. Syed Shahid Mahdi
(2000 - 2004)
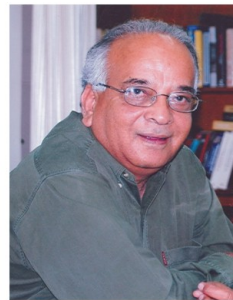
Prof. Mushirul Hasan
(2004 - ....)

ضمیمہ نمبر 4 (الف)

انجمن حمایت اسلام کا تصویری ریکارڈ

1946ء قائداعظم انجمن حمایت اسلام کے ایک ظہرانہ میں شریک ہیں۔
قائداعظم کے ہمراہ فاطمہ جناح نواب مظفر خان صدر انجمن اور نواب افتخار حسین خان ممدوٹ بھی تشریف فرما ہیں۔

ضمیمہ نمبر 4 (ب)

سندھ مدرسۃ الاسلام کا تصویری ریکارڈ
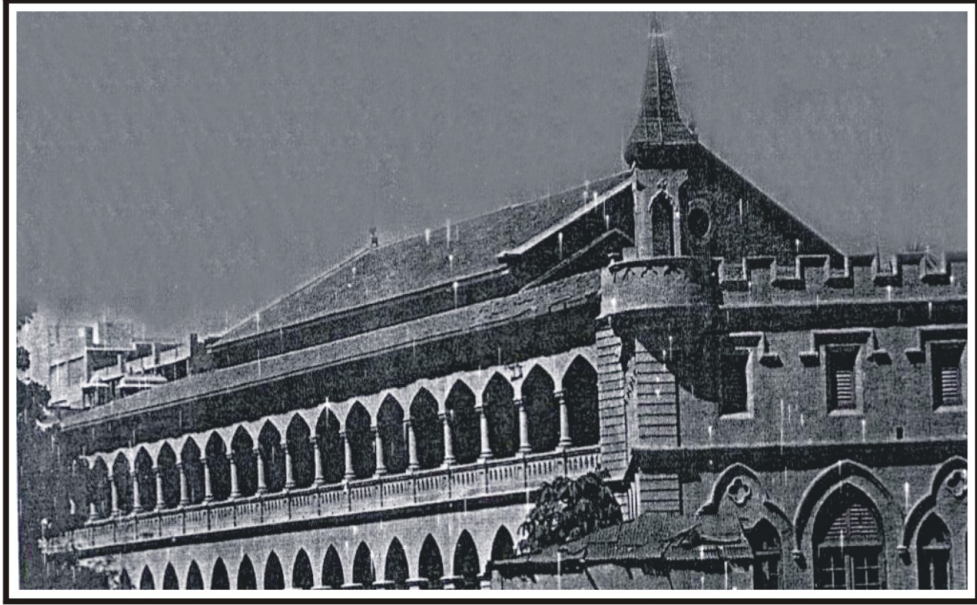
سندھ مدرسۃ الاسلام کی عمارت جس کا نقشہ جیمس اسٹریچن نے تیار کیا۔
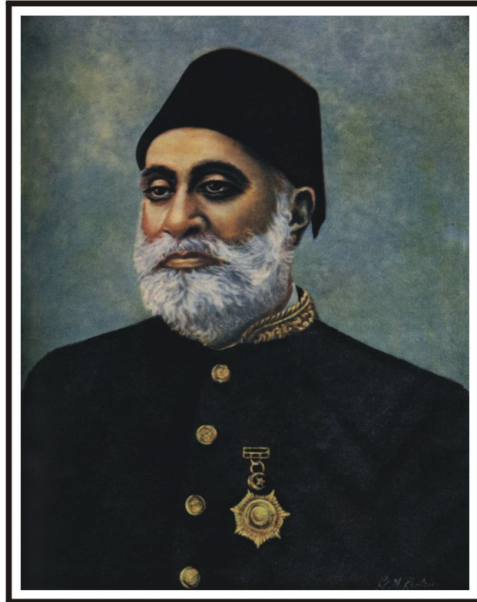
بانیٔ سندھ مدرسۃ الاسلام حسن علی آفندی

ضمیمہ نمبر 4 (ج)

اسلامیہ کالج پشاور کی تصویری جھلکیاں

1948ء میں قائداعظم اور فاطمہ جناح اسلامیہ کالج پشاور میں
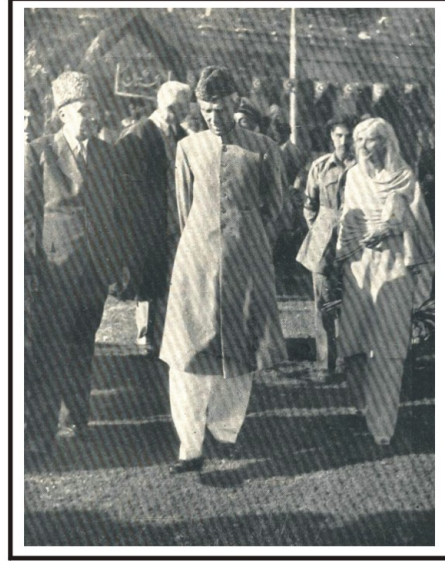
قائداعظم اور فاطمہ جناح اسلامیہ کالج پشاور میں جب قائداعظم نے فرمایا تھا:
"Nothing is dearer to my heart than to have a University in N.W.F.P."
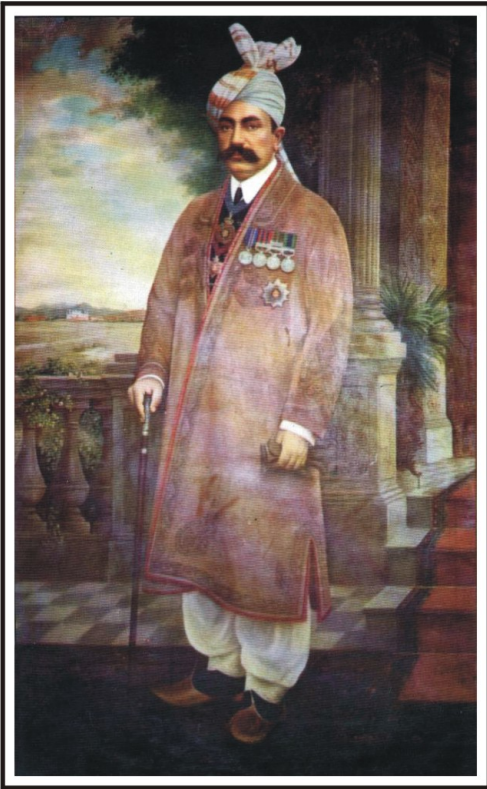
بانی عبدالقیوم خان

چیف کمشنر صوبہ سرحد روس کیپل

ضمیمہ نمبر 4 (ج)

اسلامیہ کالج پشاور کی تصویری جھلکیاں

اسلامیہ کالج کی مسجد

اسلامیہ کالجیٹ اسکول
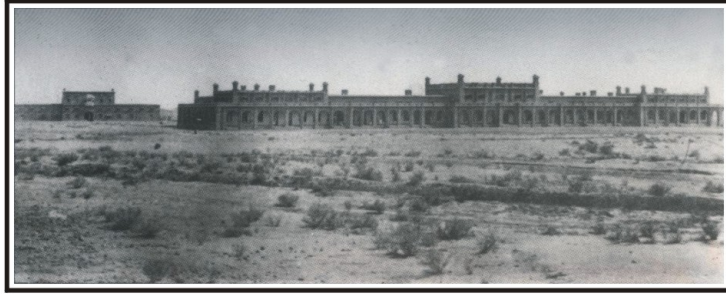
1913 ء میں اسلامیہ کالجیٹ اسکول
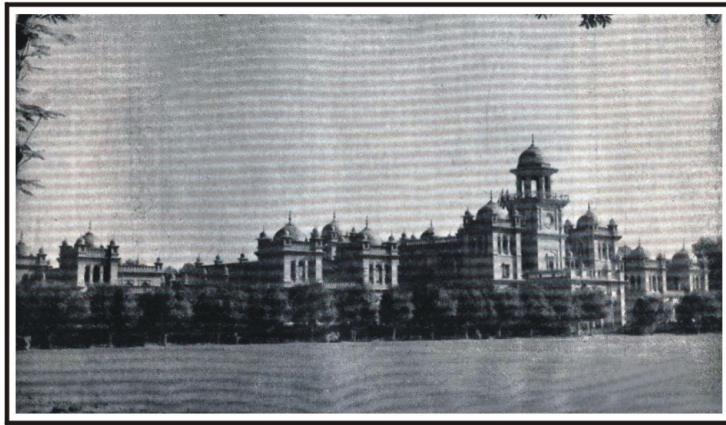
اسلامیہ کالج پشاور کی مرکزی عمارت

ضمیمہ نمبر 5 (الف)

دارالاسلام کی تصویری جھلکیاں

دارالاسلام پٹھان کوٹ کے قریب بہنے والی نہر کا ایک منظر

دارالاسلام پٹھان کوٹ کا عمومی منظر
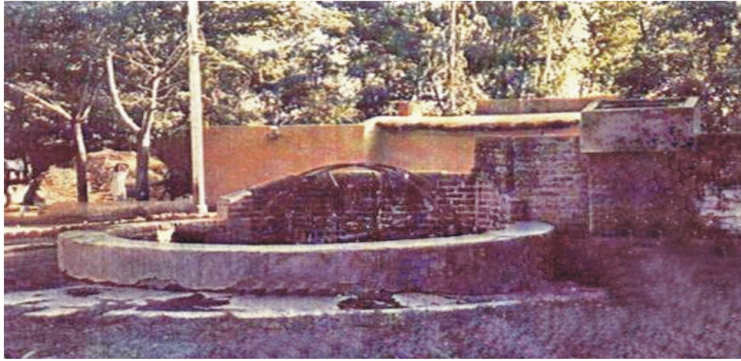
دارالاسلام پٹھان کوٹ کے کنویں کا عقبی منظر

ضمیمہ نمبر 5 (ب)

دارالاسلام کا سرٹیفکیٹ آف میمورنڈم

Dar-ul-Islam Trust

Registered under Act XXI of 1860

Name of the Association.

The name of the Association shall be Dar-ul-Islam Trust.

Office of Association.

The registered office of the Association shall situate in Dar-ul-Islam, village Jamalpur, District Gurdaspur. Punjab.

Objects of the Association.

(a) To manage the institute named Dar-us-Islam, situate at Jamalpur, District Gurdaspur, for the purpose of the exposition and propagation, by all legitimate means, of Islamic religion, culture and history.

(b) To manage and develop the Waqf estate which has been assigned as such for the benefit of the above institute by K.S. Niaz Ali Khan in a duly registered deed, dated 3rd March 1936, as well as any other properties, funds, revenues, etc., accruing to the Dar-ul-Islam Trust in form of Waqfs, or otherwise.

List of Members.

1. Mian Nizam-ud-Din, Landlord, Barud Khana Street, Lahore.
2. Khan Sahib Sheikh Mohammad Nasib, Bar-at-Law. Gurdaspur.
3. Khan Sahib Chaudhri Niaz Ali Khan, Landlord, Jamalpur Tahsil Pathankot, District Gurdaspur.
4. Chaudhri Rahmat Ali, Deputy Collector Canals, Sheikhupura.
5. Khan Bahadur M. Fateh-ud-Din, M.B.E, Deputy Direactor of Agriculture, Jullundur City.
6. Maulana Mohammad Asad (Leopold Weiss), Journalist, Model Town, District, Lahore.
7. Maulana Sayyad Abdul- Ala Maududi, Journalist, Kucha Pandit, Delhi.

Sd/- Abdulala Maudoodi.

ضمیمہ نمبر 5 (ج)

دارالاسلام کا سرٹیفکیٹ آف رجسٹریشن آف سوسائٹیز

Certificate of Registration of Societies.

ACT XXI OF 1860.

No. 90 of 1937-1938

I hereby certify that Dar-ul-Islam Trust
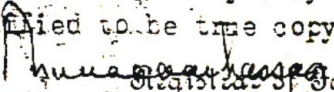
has this day been registered under the Societies Registration Act, XXI of 1860.

Given under my hand at Lahore.

this 22nd day of December

One thousand nine hundred and thirty seven.

Fee Rs. 50/- (fifty only).

Certified to be true copy.

Sd/- Ram Lal
Registrar of Joint Stock Companies.
Punjab.

Assistant Registrar
Joint Stock Companies West Punjab

J. S. C. 36.
MFP—664 JSC—12436—(M-1256)—18-12-45—2,000.